اِک دیا جلائے رکھنا



ماہا ملک کا ایک اور خوبصورت ناول۔۔۔۔ان لوگوں کی داستان جو کبھی نا اُمید نہیں ہوتے اور ہمیشہ آس کا دیا جلائے رکھتے ہیں

اک دیا جلائے رکھنا

مصنفہ: ماہا ملک

علم و عرفان پبلشرز
34-اردو بازار لاہور
فون042-7352332-7232336

نام کتاب	....	اک دیا جلائے رکھنا
مصنف	....	ماہا ملک
ناشر	....	گل فراز احمد
		علم و عرفان پبلشرز، اُردو بازار لاہور
سرورق	....	حنا شیخ
کمپوزنگ	....	فہیم سلطان
پروف ریڈنگ	....	رانا عبدالمجید
سن اشاعت	....	اپریل 2007ء
مطبع	....	جوہر رحمانیہ پرنٹرز، لاہور
قیمت	....	-/240 روپے

ملنے کے پتے

سیونتھ سکائی پبلیکیشنز : غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ، 40-اردو بازار، لاہور۔ فون 7223584

علم و عرفان پبلشرز : 34-اردو بازار لاہور فون 042-7352332-7232336

پیش لفظ

شعاع ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والا ناول کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

میں ان تمام قارئین کی تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے اس ناول تکمیل کے دوران مجھے اپنی معزز آرا سے نوازا اور اپنے خطوط سے میری حوصلہ افزائی کی۔ خاص طور پر ان سطور کے ذریعے میں بہن شازیہ چوہدری اور بہن عائشہ مسعود (لاہور) تک اپنی نیک خواہشات پہنچانا چاہوں گی۔

کسی بھی کتاب کو کامیاب بنانے کے لیے جتنی کوشش رائٹر کو کرنی پڑتی ہے۔ اتنی ہی کوشش پبلشر کو کرنی پڑتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ میں میری کتابیں یہ بلبلیں یہ تتلیاں، جو چلے تو جاں سے گزر گئے، میرے خواب ریزہ ریزہ کے حقوق اشاعت حاصل کرنے کے بعد علم و عرفان پبلشر نے اس ذمہ داری کو میری توقعات سے زیادہ بہتر طور پر ادا کیا ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

دعا گو

صائمہ اکرم چوہدری

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

انتساب

زندگی کی قوس قزح کے سب سے حسین رنگوں

سارہ اور آمنہ

کے نام

فجر کی نماز پڑھ کر اس نے جانماز تہ کر کے رکھی اور آنگن میں نکل آئی

جاتی ہوئی سردیاں تھیں۔ فضا میں پھیلی تمازت جسم کو ایک خوشگوار احساس بخشتی تھی۔ اس نے نل میں پائپ لگایا اور پھولوں سے لدے پودوں کو پانی سے بھگونے لگی۔ مٹی سے اٹھتی خوشبو اور خوشبو سے سرشار ٹھنڈک نے اس کا احاطہ کر لیا۔

پودوں کو پانی دیکر اس نے سیڑھیوں کے نچلے حصے کے کونے میں رکھا باجرے کا ڈبہ اٹھایا اور چھت پر چلی آئی۔ پنجرے کا دروازہ کھلتے ہی سفید سفید کبوتر غٹر غوں کرتے باہر نکلنے لگے۔ اسے یہ منظر ہمیشہ سے بے حد خوبصورت، زندگی سے بھرپور لگا کرتا تھا۔ جب چھت پر سورج کی مستانی، روپہلی کرنیں اور سفید جھاگ جیسے کبوتر ایک ساتھ بکھرا کرتے تھے۔ کبوتروں کو دانہ ڈال کر وہ حسب معمول اس وقت تک انہیں محویت سے تکتی رہی جب تک نیچے سے اماں کی آواز نہیں آ گئی۔

"آئی اماں!" اس نے چونک کر جواب دیا۔ باجرے کا ڈبہ اٹھایا اور سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آ گئی۔

"نیلی۔ بیٹی چائے کا پانی رکھ دو اور جگا دو سب کو۔"

"جی اماں! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" اس نے غور سے ماں کا زرد چہرا دیکھا۔

"آج پھر دل خراب ہے۔" انہوں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"اچھا۔ پھر آپ لیٹ جائیں۔ ناشتا میں بنالوں گی۔"

"کالج کیسے جاؤ گی؟"

"آج چھٹی کر لیتی ہوں۔ ویسے بھی آج نہ تو کوئی خاص پیریڈ ہے اور نہ ہی میرا دل چاہ رہا ہے جانے کا۔ آج آپ آرام کریں اور پورا دن۔ کام میں کرلوں گی۔"

اس نے ماں کو تسلی دی اور باورچی خانے میں چلی آئی۔ چائے کا پانی رکھا اور رات کا گوندھا ہوا آٹا نکال کر پیڑے بنانے لگی۔

"بجو۔ ! کالج نہیں جاؤ گی؟" شبنم نے کسلمندی سے آنکھیں ملتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی۔

"نہیں۔ موڈ نہیں ہے۔ پھر اماں کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے ناں۔ وقار بھائی جاگ گئے ہیں؟" اس نے پراٹھا بیلتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں۔ باتھ روم میں ہیں۔ جلدی سے ان کا ناشتا تیار کر دیں۔ نہاتے ہی شور مچائیں گے۔" وہ بھی پیڑھی سرکا کر وہیں بیٹھ گئی۔

"تمہیں بھی نہیں جانا آج؟" اس نے شبنم کے اس طرح اطمینان سے بیٹھنے پر اسے حیرانی سے دیکھا۔

"آپ کو دیکھ کر میں نے بھی ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔" وہ مسکرائی۔ "یوں بھی یونیفارم ...... کافی گندا ہو رہا ہے۔ کل سستی میں مجھ سے دھویا ہی نہیں گیا۔"

"اچھا۔" اس نے ایک لمحے کو سوچا۔ "پھر تم یوں کرو، ذرا یہ پراٹھا سینکو، میں عنبرین کو بتا آؤں کہ میں کالج نہیں جاؤں گی۔ ورنہ وہ میرا

انتظار کرتی رہے گی۔"

"بیلن اور چمٹا شبنم کو تھما کر اس نے دروازے پر لٹکا دوپٹا اُتارا اور ہاتھ جھاڑتی ہوئی باہر نکل آئی۔

گلی کا دروازہ کھول کر پہلے اس نے باہر جھانکا۔ گلی اس وقت سنسان تھی۔ دوپٹا سر پر اوڑھتے ہوئے وہ باہر نکل آئی۔ عنبرین کا گھر دو گھر چھوڑ کر تھا۔ دونوں ساتھ کالج جاتی تھیں لہٰذا عنبرین اس کا انتظار ضرور کیا کرتی تھی۔

"السلام علیکم خالہ۔" دروازہ عنبرین کی امی نے کھولا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کالج نہیں جاؤ گی؟"

"جی خالہ۔ یہی کہنے آئی ہوں۔ عنبرین سے کہیں، میرا انتظار نہ کرے۔"

"نیلم کی بچی۔" عنبرین نے کمرے میں ہی اس کی گفتگو سن لی تھی۔ کلکلاتی ہوئی آنگن میں نکل آئی۔ "رات کو ہی بتا دیتیں تو میں بھی چھٹی کر لیتی، صرف تمہاری وجہ سے تیار ہوئی ہوں صبح صبح اُٹھ کر۔ اور محترمہ نے مزے سے چھٹی کر لی۔"

"سوری عنبرین۔ دراصل اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ناں۔ اس لئے۔" اس نے معذرت کی۔ "تم فوزیہ کے ساتھ چلی جاؤ۔"

"نہیں رہنے دو۔ میرا بھی دل نہیں چاہ رہا۔ میں بھی نہیں جاتی۔"

"اچھا۔ چلو ٹھیک ہے۔ پھر کام وغیرہ سے فارغ ہو کر آجانا۔" وہ مسکرائی۔

"اوں ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نہیں تم آؤ گی۔ ہمیشہ میں ہی آتی ہوں تمہارے گھر۔"

"چلو منظور ہے۔ میں کام سے فارغ ہو کر آؤں گی۔"

وہ ہاتھ ملا کر باہر نکل آئی۔

"کہاں گئی تھیں نیلو؟" گھر میں داخل ہوتے ہی وقار بھائی پوچھنے لگے۔

"عنبرین کو بتانے گئی تھی چھٹی کا۔ آپ نے ناشتا کر لیا بھائی؟"

"ہوں۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"بھائی! اماں کی دوائی ختم ہو گئی ہے۔ یاد ہے نا آپ کو؟ اس نے ہائیک صاف کرتے ہوئے بھائی کو یاد دہانی کرائی۔

"ہاں گڑیا یاد ہے۔ واپسی میں لیتا آؤں گا۔ اور کچھ؟ وہ مسکرائے۔

"اور کچھ نہیں۔" وہ مسکراتی ہوئی اندر چلی آئی۔

ذوالفقار اپنی کتابیں سیٹ کر رہا تھا اور باتھ روم میں شاید مریم تھی۔

"زلفی! ناصر جاگ گیا؟" اس نے ریشم کو جھنجھوڑتے ہوئے ذوالفقار سے پوچھا۔

"جی بجو۔ ناشتا کر رہا تھا ابھی تو۔" اس نے پین میں سیاہی چیک کر کے اسے جیب میں رکھا۔

''اسے بھی ساتھ لے کر جانا۔ ہمیشہ چھوڑ جاتے ہو۔ پھر وہ بے چارا پیدل جاتا ہے۔ ریشم اٹھتی ہو یا ایک جھانپڑ رسید کروں۔''

''اٹھتی ہوں ناں بجو۔'' اس نے نیند سے بھری آنکھیں کھولیں۔ ''جانے یہ صبح اتنی جلدی کیوں ہو جاتی ہے۔''

''سورج کی آپ سے دشمنی جو ٹھہری۔'' ذلفی ہنسا۔ ''صرف آپ کو چڑانے کے لئے جلدی آ جاتا ہے۔''

''ذلفی کے بچے تم چپ کر کے کالج جاؤ۔'' نیلم نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ جانتی تھی کہ نرم و نازک مزاج کی ریشم فوراً چڑ جاتی۔ ''اور ریشم تم جلدی سے اٹھ کر تیار ہو جاؤ اور ناشتا کر کے جانا۔ تمہاری وجہ سے مریم بھی لیٹ ہو جاتی ہے۔''

وہ اسے جگا کر انعم کی جانب متوجہ ہوئی۔ وہ بے حد چھوٹی تھی اور اسے بہت لاڈ و پیار سے جگانا ہوتا تھا۔



''شبنم! میں ذرا عنبرین کی طرف جا رہی ہوں۔ دروازہ بند کر لو آ کر۔'' اپنے پکائے ہوئے حیدر آبادی بینگن پیالے میں نکال کر اس نے شبنم کو آواز دی۔

''آ رہی ہوں۔ بجو۔ آپ بھیڑ جائیں دروازہ۔'' اندر سے اس کی آواز آئی۔

''اُف توبہ! یہ شبنم بھی کس قدر سست الوجود ہے۔''

وہ بھنا کر اندر چلی آئی۔ شبنم حسب معمول اپنے کرتے کی کڑھائی میں مصروف تھی۔

چھوڑ لو آنکھیں، یہ باریک باریک ٹانکے لگا کر۔ پڑھتے ہوئے سر میں درد ہوتا ہے۔''

اچھا بات سنو۔ انعم آنے والی ہو گی۔ اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانا ورنہ دو لقمے لے کر اٹھ جائے گی۔ اور تھوڑی دیر اس کے ساتھ لیٹ جانا تا کہ وہ نیند پوری کر لے اپنی۔ رات کو پڑھانے بیٹھو تو آگے پیچھے گرتی ہے نیند کے مارے۔''

وہ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہدایت نامہ جاری کر رہی تھی۔

''جی۔ آپ دیر سے لوٹیں گی کیا؟''

''بس ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ جاؤں گی۔''

وہ باہر نکلی تو شبنم نے اندر سے کنڈی لگائی۔ اور آگے کی جانب پہلا قدم اٹھاتے ہی اس کی نگاہ سامنے والے مکان کے آگے بنی سیڑھیوں پر گئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اپنی مخصوص دوسری سیڑھی پر بیٹھا، وہ لاتعلقی سے تنکا چبا رہا تھا۔

سر جھکائے تیز تیز قدم اٹھاتی وہ عنبرین کے دروازے تک پہنچی اور دروازہ کھلا پا کر شکر ادا کرتی ہوئی تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔

''کیا کوئی بھینس پیچھے لگی ہوئی ہے؟'' تار پر کپڑے پھیلاتی ہوئی عنبرین اسے دیکھ کر زور سے ہنسی۔

''بھینس تو بے چاری جانور ہے معصوم، بے زبان۔ زیادہ خطرہ تو انسان سے ہوتا ہے۔''

اس نے گہرا سانس لے کر چنگوں کا پیالہ اسے تھمایا۔

"وہی ہوگا۔" عنبرین نے اسے غور سے دیکھا۔

"ہوں۔" اس نے سر ہلایا۔

"کچھ کہہ دیا کیا؟" اس نے رازداری سے پوچھا۔

"مجال ہے اس کی۔" اس کا چہرا سرخ ہوگیا۔ "دونوں چپلیں اس کے سر پر توڑ دوں گی۔"

"چہ خوب!" وہ طنزیہ بولی۔ "وہ صرف خاموشی سے گھورتا ہے تو محترمہ سر پر پیر رکھ کر بھاگتی ہیں اور جس دن کچھ بولے گا تو اس کے سر پر چپلیں توڑیں گی۔"

دونوں باتیں کرتی ہوئی اندر کمرے میں آگئیں۔

"زیادہ ڈر تو خاموشی سے لگتا ہے ناں۔ اس کی آنکھیں بڑی خطرناک ہیں۔ جھرجھری آجاتی ہے مجھے تو۔" نیلم نے چشم تصور میں اسے دیکھ کر ایک بار پھر جھرجھری لی۔

"واہ چنگن!" عنبرین نے خوشی کی چیخ بلند کی۔ "مزا ہی آجائے گا آج تو۔"

"کپڑے دھو لیے تم نے؟" وہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ہاں ناں۔ بس آخری قمیص پھیلا رہی تھی جب تم آئیں تو۔"

"بس تو پھر جلدی سے روٹیاں پکا لو۔ بھوک لگی ہے بہت۔"

"روٹیاں امی پکا گئی تھیں۔ تم یہیں بیٹھی رہو۔ میں لاتی ہوں نکال کر۔" وہ جانے کو مڑی۔

"چلو میں بھی باورچی خانے میں ہی چلتی ہوں۔ وہیں کھائیں گے کھانا۔"



''ہاں گڑیا! بھائی کو آنے دو۔ ان دونوں کی پٹائی لگوائیں گے۔''

کس کی پٹائی لگ رہی ہے بھئی۔'' اندر آتے وقار بھائی بولے۔''اور کون لگا رہا ہے؟''

''بھیا۔ بھیا۔'' انعم چھلانگ مار کران تک پہنچی۔'' ناصر بھائی اور ریشم آپی مجھے اور نیلی بجو کو تنگ کر رہے تھے۔ ہے نا نیلی بجو؟''

وقار بھائی نے ہنستے ہوئے اسے اٹھا کر گود میں بٹھایا اور اس کے گال چوم لیے۔

سب سے چھوٹی، گڑیا جیسی بہن سے وہ بے تحاشا محبت کرتے تھے اور گڑیا کا نام بھی انہوں نے ہی اسے دیا تھا۔

''بھیا۔ ان کو ڈانٹیں!'' اس کی تسلی نہ ہوئی تھی۔

''کیوں بھئی۔ کیوں تنگ کرتے ہو میری گڑیا کو؟ ہاں؟'' وقار بھائی نے ان دونوں کو آنکھیں دکھائیں تو دونوں نے منہ چھپا کر مسکراہٹیں چھپالیں۔

''زلفی کہاں ہے؟'' وقار بھائی کو گھر آ کر سب سے پہلا خیال ذوالفقار کا آتا تھا کہ وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں پہنچ کر لڑکے خود کو خود مختار اور ہر قسم کی جواب دہی سے آزاد تصور کرتے ہیں۔

کالج سے تو گھر ہی لوٹا تھا بھائی۔'' پانی کا گلاس لیے اندر آتی مریم نے جواب دیا۔''ابھی شام کو ہی کہیں نکلا ہے۔ اسے دراصل کچھ ٹیوشنز مل رہی ہیں، شاید انہی کا پتا کرنے گیا ہو۔''

''ٹیوشنز؟ ہزار مرتبہ سمجھایا ہے اسے کہ پہلے اچھی طرح سے پڑھ لے جو پڑھنا ہے۔ صرف پڑھائی پر توجہ دے اپنی۔ پھر کیوں یہ ادھر ادھر کے چکروں میں پھنسا رہتا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے میں بنا کہے لا کر دیتا ہوں پھر کیوں یہ ان الجھنوں میں مبتلا رہتا ہے؟''

وقار بھائی کو غصہ آ گیا۔

''نہیں بھائی۔ میرا خیال ہے وہ کسی کتاب کا پتا کرنے گیا ہے۔'' نیلم گھبرا کر بولی۔'' ویسے بھی اس کے پاس وقت ہی کہاں ہے کہ وہ ادھر ادھر مارا مارا پھرے۔ وہ بے چارا تو بس ہر وقت پڑھتا ہوا ہی نظر آتا ہے۔''

''آنا بھی چاہیے اسے۔'' وہ خفگی سے بولے۔'' سائنس پڑھ رہا ہے آخر۔ اگلے سال انجینئرنگ کالج میں داخلہ لے گا۔ نمبر اچھے لانے کے لئے پڑھنا تو پڑے گا ناں۔''

''ریشم! شبنم سے کہو، بھائی کو کھانا گرم کر کے دے۔'' نیلم نے ریشم کو مخاطب ہو کر کہا۔

''نہیں ابھی نہیں۔ میں تھوڑی دیر میں کھاؤں گا۔ یہ دوائیاں اُٹھا لو اماں کی۔ اور بھئی، ہماری گڑیا نے آج اسکول میں کیا کیا پڑھا۔''

اور وہ دوبارہ انعم کی طرف متوجہ ہو گئے۔



"لاحول ولا قوۃ۔" جلی ہوئی کالی پیاز کے ٹکڑے دیکھ کر وہ بھنا اٹھا۔ "یعنی صرف پندرہ منٹ میں کچن میں غیر حاضر رہا ہوں اور تو نے اپنا منہ کالا کر لیا۔"

اندر آتی جمنا زور سے ہنسی۔

"جمنا! ہزار مرتبہ کہا ہے کہ میرا کام بگڑے تو یا پھر پہلے دانت نمائش کے لئے پیش مت کیا کرو۔ کیونکہ جس وقت میرا کوئی کام خراب ہو۔ میرا دل چاہتا ہے سامنے آنے والی ہر شے کو توڑ ڈالوں اور تصور کرو۔ ٹوٹے ہوئے دانتوں کی بدولت تم مزید کتنی بھیانک ہو جاؤ گی۔"

کفگیر ہلا ہلا کر اس نے جمنا کو لیکچر دیا۔

"میں کیا بولی بابو؟" ٹھوڑی پر انگلی جما کر جمنا نے مخصوص حیرت کا اظہار کیا۔

"تمہاری بیسنی ہنسی تمہارے بولنے سے زیادہ چڑاتی ہے۔ تمہارے کالے رنگ کی قسم جمنا! میرا دل تمہاری مکروہ ہنسی سن کر اس جلی ہوئی پیاز اور تمہاری جلی رنگت سے زیادہ جل گیا ہے۔"

اندر آتے بہروز کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جبکہ جمنا گھبرا کر باہر نکل گئی تھی۔

"اگر جمنا اس گھر سے چلی گئی ناں تو عمر بھر یہ جلی ہوئی پیاز ہی کھایا کرنا۔ کولر سے پانی بھرتے ہوئے وہ بولے۔

"ب۔ بھا۔ ئی۔ آپ!" اس کی آدھی جان اس تصور نے فنا کر ڈالی کہ بہروز نے جمنا سے اس کی گفتگو سن لی تھی۔ "آپ کب آئے؟"

"بس ابھی آیا ہوں۔ جس وقت آپ انتہائی عالمانہ اور منتخب قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔"

"نہیں۔ بھائی جان! دراصل میں یہ کہہ رہا تھا۔ میں چاہتا ہوں کوئی وقت ایسا نہ آئے کہ جب جمنا کو اپنے حسن جہاں سوز سے واقفیت حاصل ہو جائے اور تب اسے ہم، ہماری ہستیاں اور ہمارا گھر اپنے حسن دائمی کے آگے فانی نظر آنے لگے اور وہ بیک جنبش ابرو ہمیں چھوڑ کر چلتی بنے۔ اس لئے میں اسے دلبرداشتہ کرنے کی اپنی سی کوشش کرتا رہتا ہوں۔"

"کس سے؟" انہوں نے مسکراہٹ گلاس میں چھپائی۔

"اس کی بے بہا خوبصورتی سے۔"

"شہروز۔ بہت بری۔ بہت ہی بری بات ہے۔" انہوں نے پانی پینے کے دوران اپنی تمام تر ہنسی پر قابو پا کر گلاس رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ بے چاری دن اور رات ہماری خدمتوں میں مصروف ہے اور تم اگر اس کا ادب نہیں کر سکتے، اس کی عزت نہیں کر سکتے تو کم از کم بدتمیزی تو مت کیا کرو۔ یعنی یہ انداز تخاطب۔"

"ہے بھایا۔ ایک اسی بچے کے دم سے تو رونق ہے ہمارے گھر کی۔" جمنا نے ان کی ڈانٹ سن لی تھی اندر آ کر بولی۔ "یہ بولے تو آواز ہوتی ہے گھر میں۔ اب آپ اس کا منہ بھی بند کرو گے۔؟ ہم ناہی برا مانیں تو تم کاہے برا مانتے ہو؟"

"جمنا! اب اس کو تمیز تو سکھا لینے دو۔" بچہ نہیں رہا بڑا ہو گیا ہے۔"

"ہمارواسطے تو بچہ ہی ہے۔" اس نے شہروز کے ہاتھ میں کفگیر لے لیا۔ "اب بتاؤ کیا کھانا ہے۔"

"جمنا! میں نے دو گوشتہ بریانی بنانے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔ براہو حیدر صاحب کا جنہوں نے عین پیاز کے عالم شباب میں فون کر دیا۔ میرا مطلب ہے پیاز گولڈن براؤن ہونے والی تھی۔ میں فون سن کر آیا تو کیا دیکھتا ہوں۔ ہانڈی میں دُھواں اُٹھ رہا ہے اور پیاز کالی ہے۔" "وہ دیکھو جلا گھر کسی کا۔ وہ ٹوٹے ہیں کس کے ستارے۔"

جمنا خاموشی سے چاول صاف کرنے لگی۔

"بس یہی برائی ہے جمنا تم میں۔" اس نے بہروز کے باہر جانے کا اطمینان کر کے پھر بولنا شروع کیا۔ "جس بات پر رونا ہو، اس پر تم ہنس ہنس کر میرے کانوں کے پردوں میں سوراخ کر ڈالتی ہو اور جب میں ہنسانے کی کوشش کرتا ہوں تم خاموش رہ کر میری حس ظرافت کو چیلنج کرتی ہو۔ آخر ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ہمارے خیالات اس قدر مختلف کیوں ہیں جمنا؟" اس نے آواز میں رقت پیدا کی۔

"شہروز۔" باہر سے عفت خانم کی آواز آئی۔ "مت تنگ کرو اسے اور باہر آؤ کچن سے۔"

"اوہ۔ امی جاگ گئیں۔" اس نے دانتوں میں زبان دبائی۔ اچھا جمنا بائی، بائی ظالم سماج آڑے آیا اور ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر گیا۔ لیکن تم فکر مت کرو۔ میں پھر کوئی موقع نکالوں گا۔ جی بھر کر باتیں کرنے کا۔"

"شہروز۔"

"آیا امی۔" وہ تیر کی طرح باہر نکلا تھا۔



"چاند پھر نکلا۔ مگر تم نہ آئے۔"

کن اکھیوں سے پہلے اس نے برابر والی کرسی پر کتاب پڑھتے بھائی کو دیکھا پھر برابر والے گھر کے ٹیرس پر کھڑی اس ماہ رو کو۔

"فیروز بھائی! آپ کو اب چشمہ لگوا لینا چاہئے۔" کینو چھیلتے ہوئے اس نے بھائی کو مشورہ دیا۔

"کیوں بھئی۔" اس نے ذرا کی ذرا کتاب پر سے نگاہ اُٹھائی۔ میری نظر بالکل پرفیکٹ ہے۔ مجھے تو مطالعے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔"

"میں قریب کی نہیں۔ دور کی نظر کی بات کر رہا ہوں۔ دور کی نظر آپ کی یقیناً کمزور ہے۔"

"کیا مطلب؟" اس نے کتاب بند کر کے بھنویں اُچکائیں۔

"نہیں کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔" وہ کھسیا کر ہنسا۔ "آپ پڑھیں کتاب پڑھیں۔ ارے جمنا بائی چائے لاؤ۔ بلکہ اب تو پائے لاؤ۔"

اس نے ہانک لگائی۔

"لاتی ہوں۔ بھابالاتی ہوں۔ بس تم تو شور مچانا جانتے ہو۔"

ہانپتی ہوئی جمنا ٹرے اٹھائے قریب آئی۔

"یہ بھابا کیا ہوتا ہے جمنا؟ کتنی مرتبہ سمجھایا ہے تمہیں کہ اب تم بمبئی میں نہیں ہو۔ اتنا عرصہ ہو گیا تمہیں یہاں آئے ہوئے پھر بھی گڑبڑ کر جاتی ہو۔ خدانخواستہ میڈیکل میں تمہارا داخلہ ہو جاتا تو نزلے کے مریض کو گیس کی دوا دیتیں تم۔"

"اُف خدایا۔ شہروز۔ یار کتنا بولتے ہو تم۔" فیروز نے جھنجلا کر کتاب بند کی۔

"ارے میں ہی تو بلبل ہوں اس گلستان کی۔ میں بھی چپ ہو جاؤں تو ہمارا یہ اُداس پیارا گھر کسی شہرِ خموشاں کا نقشہ پیش کرنے لگے۔ بہروز بھائی جان ہیں تو وہ چشمہ لگائے کسی فائل میں غوطہ زن رہتے ہیں۔ آپ ہیں تو...... کبھی غالب میں گم ہیں تو کبھی حافظ کے الفاظ سے مسحور، حیران و پریشان گم صم بیٹھے ہیں۔ امی جان کی تو بات ہی کیا ہے۔ منہ کھولتی ہیں تو صرف مجھے ڈانٹنے کے لیے۔ الفاظ ہوتے ہیں کہ سنسناتے تیر۔ سیدھے میرے دل میں ترازو ہوتے ہیں۔ ایسے میں میں جمنا کے حسن و دوآتشہ کی مدح سرائی کی کوشش کروں تو بھائی جان میرے بخیے اُدھیڑتے ہیں۔" چاند تکے چھپ چھپ کے اونچی مجبور ہے۔ گاؤں تو آپ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ جمنا تم ہی انصاف کرو۔"

اس نے دائیں جانب گردن موڑی تو علم ہوا کہ جمنا جا چکی تھی۔

"اوہ۔ بروٹس۔ یو ٹو۔" اس نے سر تھاما۔

فیروز کو مجبوراً مسکرانا پڑا۔

"اپنی جیب میں سر درد کی گولیاں رکھا کرو تم۔" چائے کے کپ اُٹھاتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔

"کیوں بھائی؟"

"تاکہ تمہاری طویل اور لایعنی گفتگو جب دوسروں کو شدید قسم کے سر درد میں مبتلا کر دے تو کم از کم اس غریب کو گولی تو وقت پر دستیاب ہو جائے۔"

"سر درد؟ دیکھا فیروز بھائی۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ آپ کو اپنی نظر چیک کرانی چاہیے۔ آپ کے سر میں درد میری گفتگو سے نہیں نظر کی کمزوری سے ہوا۔ ویسے کسی کی بری نظر بھی ہو سکتی ہے۔" معنی خیزی سے بولتے ہوئے سامنے ٹیرس پر نگاہ ڈالی جواب خالی تھا۔

"بری نظر؟" وہ مسکرایا۔ "ہمیں کس کی نظر لگنی ہے یار!"

"ہائے یہ ادائے بے نیازی!" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "یہ تری معصومیت ہے یا مکاری؟ حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا۔"

"یار شہروز! کبھی تو ڈھنگ کی بات کیا کرو۔" وہ چڑ گئے۔

"ہائیں، یعنی غالب کے الفاظ بھی بے ڈھنگے لگے آپ کو؟ ماشاء اللہ۔ فیروز بھائی اتنا مت پڑھیں ہم جیسے معمولی لوگ تو پھر کیڑے مکوڑے لگنے لگیں گے آپ کو۔"

"خدا کے لئے بھائی چپ ہوجا۔"

"اس نے کپ رکھ کر باقاعدہ ہاتھ جوڑے تو شہروز نے جھٹ لبوں پر انگلی رکھ لی۔



"الماس بی بی۔ الماس بی بی!" اسے سوتے سے جھنجوڑ کر جگانے والی نسرین تھی۔ "اُٹھ جائیں جی۔ صبا بی آئی ہیں۔"

"اوں ہوں۔" وہ جھنجلائی۔ "دفع ہوجاؤ نسرین۔ ورنہ سر پھاڑ ڈالوں گی تمہارا۔"

"بی بی جی۔" نسرین نے پھر جھنجوڑا۔ "اُٹھ جائیں جی۔"

"کیا مصیبت ہے" اس نے کمبل سے منہ نکالا۔ مندی مندی آنکھوں سے الارم پیس دیکھا۔

"آٹھ۔ آٹھ بجے ہیں صرف، ناممکن۔ صبا سے کہنا گھر جائے واپس۔" اس نے منہ دوبارہ کمبل میں گھسالیا۔

"تم جاؤ نسرین!" اندر آتی ہوئی صبا نے اس کی بات سن لی تھی۔ "میں خود یہ مبارک کام انجام دے لوں گی۔ اور سنو۔ چائے لے آؤ اچھی سی۔"

"جی بی بی۔" وہ مسکرائی۔

"میڈم الماس طاہر۔ اب آپ اُٹھتی ہیں یا میں کوئی ترکیب آزماؤں؟"

اطمینان سے ہاتھ باندھے اوراس کے سرہانے کھڑے ہوکر وہ بولی۔ جواب ندارد۔

"ہوں! ٹھیک ہے۔ مت اُٹھو شرافت سے۔ مجھے بھی ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکالنا آتا ہے۔"

"اس نے آگے بڑھ کر پانی سے بھرا جگ اُٹھایا۔

"اور اب میں تمہیں بتاؤں گی بھی نہیں کہ میں کیا کرنے جارہی ہوں۔"

اس نے ڈرامائی انداز میں کہنا شروع کیا۔ "تاکہ سسپنس سے تمہارا آدھا دم کمبل کے اندر ہی نکل جائے میں صرف تین تک گنوں گی۔ اگر تم نہ اُٹھیں تو ترکیب نمبر چار سو بیس تم پر آزمائی جائے گی۔ ایک۔ دو۔"

"جگ واپس جگہ پر رکھ دو۔" کمبل سے الماس کی آواز آئی۔ "تمہاری ترکیب چار سو بیس بہت پرانی اور فرسودہ ہے۔"

اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے وہ بولی۔ سرہانے رکھا کلپ اٹھا کر بال سمیٹ کر لگایا اور جمائی لی۔

"اور اب پھوٹو کہ آدھی رات کو کیوں نازل ہوئی ہو؟"

"آدھی رات؟ شرم کرو لڑکی۔ کوئی خاتون اس وقت تمہارا رشتہ بھی لاسکتی ہیں۔ جو فوراً واپس لے جائیں گی تمہیں یوں گدھے گھوڑے بیچ کر سوتے دیکھ کر۔"

اس نے کوٹ شوز اُتارے اور مزے سے کمبل میں پاؤں کر کے بیٹھ گئی۔

''شاباش نسرین۔ جیتی رہو۔'' نسرین کو چائے لاتا دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ''اور یہ تم کیا نحستی پھیلا رہی ہو اب تک؟'' اس نے الماس کو گھورا۔ ''اٹھو اور فوراً منہ دھو کر آؤ۔ مابدولت جب تک چائے سے شوق فرمائیں گے۔''

''لعنت ہو تم پر۔ وہ چپلیں پہنتے ہوئے بولی۔'' کبھی میں بھی ایسا بدلہ لوں گی کہ روح تڑپ اُٹھے گی تمہاری۔''

''یعنی میرے مرنے کے بعد لو گی بدلہ؟ واہ دوست ہو تو ایسی۔''

''آئی کیوں ہو؟'' وہ جھلائی۔

''مہمانوں کی عزت کرنے کا دستور نہیں ہے تمہارے یہاں؟'' اس نے چائے پیتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ نہ ہوتا تو تم یہاں مزے سے بیٹھ کر چائے نہ پی رہی ہوتیں۔ اپنی نیند خراب کرنے پر میں تمہیں دھکے دے کر نکال دیتی۔''

''فی الحال تو آپ صبر کر کے اٹھیں اور ساتھ چلیں میرے۔ کالج سے کچھ ضروری ڈاکومنٹس نکلوانے ہیں۔''

''کیا؟'' وہ چیخی۔ ''اس وقت کالج۔ ناممکن۔''

''وہاں سے بازار جانا ہے۔ کچھ چیزیں لینی ہیں۔ پھر وہاں سے میرے گھر۔ شام کو تمہیں واپس چھوڑ جاؤں گی یہاں۔'' اس نے الماس کی چیخ کو نظر انداز کر کے باقی کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ ''اور اب اُٹھ جاؤ یا کوئی منتر پڑھ کر پھونکوں تم پر؟''

''اٹھتی ہوں۔'' وہ خفگی سے بولی۔ ''پہلے چائے دو مجھے۔''

''شاباش یہ ہوئی نا بات۔'' وہ فوراً خوش ہو گئی۔

''اور میرے کپڑے بھی استری کر کے دینا۔'' چائے پیتے ہوئے اس نے رعب سے کہا۔

''ضرور۔ اور کچھ۔''

''پڑوسیوں کے کیا حال ہیں؟'' الماس نے شرارت سے پوچھا۔

''ہائے!'' اس نے سرد آہ بھری۔ الماس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات

دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

''چچ چچ۔'' اس نے افسوس کیا۔ ''فکر نہ کرو بچی۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ ویسے قابل افسوس بات تو یہ ہے کہ تم نے اب تک مجھے دیدار بھی نہیں کرایا ان موصوف کا۔''

''ہفتے پندرہ دن میں، میں ایک آدھ بار خود ہی دیدار کرنے کا شرف حاصل کر لوں وہی بہت ہے۔'' وہ افسردگی سے بولی۔ ''تمہیں کیا دیدار کرواؤں۔''

''چلو۔ بددل نہیں ہوتے۔'' وہ مسکرائی۔ ''پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ۔''

"ہوں!" اس نے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ اب اُٹھو اور تیار ہو جاؤ فوراً۔"

"بس پندرہ منٹ میں آتی ہوں۔"

خالی کپ ٹرے میں رکھ کر وہ باتھ روم میں گھس گئی۔



جمعے کا دن تھا۔ اماں کی طبیعت پھر خراب تھی۔ سو صبح سے اس کے سر پر بے تحاشا کام آ پڑے تھے۔ ریشم اور مریم دونوں فرسٹ ایر میں تھیں اور دونوں کے پاس سائنس تھی۔ اس پر امتحان بھی نزدیک تھے۔ وہ صبح سے پڑھنے بیٹھتیں تو اُٹھنے کا نام نہ لیتیں۔

شبنم کو بدھ کی رات سے وحیدہ چچی نے بلوایا ہوا تھا۔ ان کے گھٹنوں میں تکلیف تھی۔ اور وہ مستقل بستر پر تھیں۔ آمنہ کے شوہر نے اسے بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مہینے کے پندرہ دن آمنہ میکے میں گزارتی ہے اور پندرہ دن سسرال میں۔ اسی لئے گھر کا نظام درہم برہم ہے لہٰذا وحیدہ چچی نے شبنم کو بلوا بھیجا تو اماں سے بھی انکار نہ ہو سکا۔ یوں گھر کی ساری ذمے داری فی الوقت نیلم کے سپرد تھی۔

"بجو! کل کی بھی چھٹی ہو گی ناں۔" دوپہر میں جب وہ سارے کاموں سے فراغت حاصل کر کے انعم کو سلا رہی تھی۔ تب اس نے تصدیق چاہی۔

ہر جمعے کے دن وہ یہ سوال کرنا نہ بھولتی تھی۔

"ہوں۔" اس نے مسکرا کر اس کا ماتھا چوما۔ "اب آنکھیں بند کرو۔ اور باتیں بھی۔"

"شبنم آپا کب آئیں گی نیلی بجو۔" چند لمحوں بعد اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔

"آ جائیں گی ایک دو روز میں۔ چچی جان کی طبیعت خراب ہے ناں اس لئے گئی ہیں۔"

نیلم کو ہنسی آ گئی۔

"ہاں۔ ٹھیک کر دیں گی۔ اب آنکھیں بند کرو فوراً۔"

اس نے جھٹ سے آنکھیں بند کر لیں۔

اسے سلانے کے بعد وہ بھی کچھ دیر یونہی آنکھیں موندے لیٹی رہی پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت سونے کا مطلب پھر رات کو دیر تک جاگنا ہوتا۔ لہٰذا سونے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ اُٹھی اور چپلیں پہن کر باہر آ گئی۔

"اماں جاگ گئیں آپ؟" اماں کو برآمدے میں بچھے تخت پر لیٹے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"کھانا دوں آپ کو؟"

"نہیں۔ میں نے کھا لیا ہے۔"

"دوائی؟"

''ابھی کھالوں گی کچھ دیر میں!'' وہ آنکھیں موندے لیٹی تھیں۔

''اچھا۔اماں میں ذرا عنبرین کے گھر جا رہی ہوں۔کچھ دیر میں آجاؤں گی۔''

''ہوں۔''انہوں نے ہنکارا بھر کر اجازت دی۔

دوپٹا ٹھیک سے پھیلا کر اوڑھتے ہوئے وہ باہر نکل آئی۔سامنے والے گھر کی سیڑھیاں خالی دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور عنبرین کے گھر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

''السلام علیکم خالہ۔''دروازہ کھولنے عنبرین کی امی آئی تھیں۔

''وعلیکم السلام۔''اسے دیکھ کر جانے کیوں وہ تذبذب میں مبتلا ہوگئیں۔

''عنبرین نہیں ہے؟''انہیں دروازے پر جما کھڑا دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔

''ہاں۔ہے تو۔''انہوں نے کچھ تامل سے کام لے کر راستہ چھوڑا۔آ جاؤ۔اندر آجاؤ۔''

وہ حیران سی اندر داخل ہوئی۔

''کہاں ہے عنبرین۔''اس نے اندر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ہاں آتی ہے۔تم ذرا باورچی خانے میں بیٹھ جاؤ تھوڑی دیر کو۔''

انہوں نے جلدی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر جانے سے روکا اور باورچی خانے کی سمت دھکیل دیا۔

''یہ خالہ کو کیا ہوا ہے آج۔''اسے غصہ آ گیا ان کی اس نازیبا حرکت پر۔

بازو سہلاتے ہوئے وہ باورچی خانے میں چلی آئی اور خاموشی سے پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

''ارے نیلو! کب آئیں۔''عنبرین اپنی دھن میں ٹکن ٹرے اُٹھائے اندر داخل ہوئی تھی۔اسے دیکھ کر وہ چونک اُٹھی۔

''کچھ دیر ہوئی۔''اس نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔''تم تھیں کہاں؟''

''میں......اندر ڈرائنگ روم میں تھی۔وہ کچھ مہمان آئے ہیں۔''وہ شرما کر بولی۔

''اچھا!''وہ خاموش ہوگئی۔

''پوچھو گی نہیں۔کون مہمان؟''عنبرین شرارت سے کہتی ہوئی اس کے قریب بیٹھی تو اس نے جھکا ہوا سر اُٹھا کر اس کا چمکتا، گلنار چہرا دیکھا اور پھر چونک سی گئی۔

''اوہ۔''اس نے گہرا سانس لیا۔''تو یہ بات ہے۔ہوں۔جبھی کہوں یہ آج عنبرین بی بی بھی گلابی گلابی سی کیوں ہیں۔''

خالہ کا چند لمحوں قبل والا رویہ بھول بھال کر وہ شرارت سے ہنسنے لگی۔

''کون لوگ ہیں؟''

"امی کے دور پرے کے رشتے دار ہیں۔" وہ ماچس کی تیلی سے زمین کریدنے لگی۔

"اچھے ہیں؟" اس نے شرارت سے پوچھا۔

"ہوں!" اس نے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

آنگن میں عورتوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔شاید وہ لوگ جا رہے تھے۔

"اچھا بھئی۔پھر آئیں گے۔عنبرین کہاں ہے؟" کسی عورت نے غالباً خالہ سے دریافت کیا تھا۔

"میں ابھی آئی۔" عنبرین جلدی سے اُٹھ کر باہر نکل گئی۔

نیلم نے بھی اُٹھ کر اشتیاق سے ذرا سا باہر جھانکا۔ایک مہمان خاتون کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔

"ادھر آؤ بیٹی۔وہاں کیوں کھڑی ہو۔" انہوں نے مسکرا کر پکارا تو وہ باہر نکل آئی۔

"السلام علیکم اس نے ان لوگوں کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" تینوں مہمان خواتین نے بڑے اشتیاق سے اس کا جائزہ لیا۔

"یہ کون ہے؟" ان میں سے ایک نے خالہ سے پوچھا۔

اور تب نیلم نے دیکھا کہ خالہ کا چہرہ یکدم سفید پڑ گیا ہے اور وہ بڑی عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔اسے ان کا سابقہ رویہ یاد آیا اور اپنی غلطی کا احساس ہوا۔بلو خالہ یقیناً اسے مہمان خواتین کی نگاہوں سے روپوش رکھنا چاہتی تھی۔اور اس کے پیچھے یہی مقصد پوشیدہ ہوسکتا تھا کہ کہیں انہیں عنبرین کی جگہ نیلم پسند نہ آ جائے۔

"دوست ہے میری۔" عنبرین کے خشک لہجے نے اسے احساس دلایا کہ ابھی ابھی یہی خیال اس کے دل میں بھی در آیا تھا۔

"یہیں رہتی ہو؟" انہوں اب براہ راست اس سے پوچھا۔

"جی!" اس نے سر ہلایا۔

"پڑھتی ہو عنبرین کے ساتھ؟"

"جی ہاں۔" اس کا دل وہاں سے بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا۔

"اچھا اچھا۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں۔

عنبرین چپ چاپ باورچی خانے کی سمت چلی گئی اور خالہ ان لوگوں کے پیچھے دروازے کی جانب گئی۔

"اس کی تو منگنی ہو گئی ہے۔شادی ہے چھ ماہ بعد۔"

اس کے کانوں میں خالہ کی آواز پڑی۔

"چلو خدا مبارک کرے۔" مہمان خاتون کہہ رہی تھیں۔" ویسے ماشاءاللہ بڑی ہی پیاری بچی ہے۔"

''ہاں۔'' خالہ نے بڑی بے دلی سے ہامی بھری تھی۔

''دوسرے سرے قدموں سے چلتی باورچی خانے میں آئی۔ عنبرین برتن دھو رہی تھی۔

''اچھا عنبرین میں چلتی ہوں۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''اچھا۔ بیٹھ جاتیں کچھ دیر۔'' اس نے سرسری سا کہا۔

''پھر آؤں گی۔''

''وہ مڑ گئی۔ سامنے سے آتی خالہ کو سلام کیا اور باہر نکل گئی۔

''نجانے لوگوں نے تقدیر پر اعتماد کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔''

گھر میں داخل ہوتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ اسے بلو خالہ اور عنبرین پر غصہ آ رہا تھا۔ خود اپنی نظر میں مجرم ہی بن گئی تھی۔



''نسرین۔ کاشف کہاں ہے؟'' اس نے جھلاہٹ سے پوچھا۔

''معلوم نہیں بی بی۔'' نسرین نے ڈر کر اس کا چہرہ دیکھا۔ پورے خاندان کی یہ واحد لڑکی تھی۔

خوش ہوتی تو ایسے بالکل نئے، ان چھوئے، قیمتی ملبوسات اُٹھا کر اس کے آگے ڈال دیتی تھی تو ایسے کہ گھر سے نکل جانے کے احکامات جاری کر دیتی۔

''اُف۔'' اس نے ہتھیلی پر مکا مارا۔

''ایا۔ مجھے صبا کے پاس جانا ہے اور گاڑی نہیں ہے۔'' وہ روہانسی ہوئی۔

''وہ بائیک بھی نہیں ہے کسی لڑکے کی؟'' اس نے ڈرائیر آف کر کے پلگ نکالا اور انگلیوں سے بال سنوارنے لگی۔

''یہ لڑکے کبھی ملے ہیں گھر پر؟ صرف رات کو قیام کرنے آتے ہیں یا اکا دکا کوئی کھانے کے وقت دستیاب ہو جائے گا۔''

''یہ کیا موشگافیاں ہو رہی ہیں ہم لڑکوں کے متعلق؟'' اندر آتا عدنان اس سے مخاطب ہوا۔

''عدنان کے بچے۔ کہاں تھے تم؟'' وہ اس پر چیل کی طرح جھپٹی۔

''آ گئیں ہائیں۔'' اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ ''یعنی مجھے خبر ہی نہیں اور میرے بچے بھی ہیں؟ کہاں ہیں؟ کہاں گئے؟''

''عدنان۔'' شدید غصے میں ہونے کے باوجود اسے اس کی بے ساختہ اداکاری پر ہنسی آ گئی۔

''جی فرمائیے۔ آنسہ الماس طاہر خان۔'' وہ مؤدب ہوا۔

''تمہاری بائیک کہاں ہے؟''

''میری بائیک اچھی کھڑی ہے پورٹیکو میں۔ خیریت؟''

''چلو۔ مجھے ذرا صبا کے ہاں لے چلو۔''

''میں؟'' اس نے تھوک نگلا۔ ''اچھا مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔ چلتا ہوں۔''

اس نے کھسکنے کی کوشش کی۔ الماس نے لپک کر اس کا کالر پکڑا۔

''جان سے مار ڈالوں گی۔''

''بتانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی صلاحیتوں پر مجھے بھروسا ہے۔''

''چلتے ہو پھر؟''

''چلیے۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھر کو جینز کی جیب میں ٹٹول کر چابی کے موجود ہونے کا اطمینان کیا۔ ''اور ہاں ذرا دور ہو کر بیٹھنا۔ یوں چمٹ جاتی ہو جیسے بلا ہوں۔ دیکھنے والے نجانے کیا خیال کرتے ہوں گے؟''

''کیا؟'' وہ پلٹی ''کیا خیال کرتے ہوں گے؟''

''نیا شادی شدہ جوڑا......'' وہ بے شرمی سے ہنسا۔

''عدنان!'' وہ زور سے چیخی اور اپنے لمبے ناخن اس کے بازو میں پیوست کر دیے۔

''توبہ توبہ۔ جنگلی بلی۔ صد شکر کہ مجھ سے دو سال پہلے سے روئے زمین پر تشریف لے آئیں ورنہ عین ممکن تھا کہ یہ بھی ہو جاتا۔''

''نہیں ایسی بات نہیں۔'' اس نے ہوا کی رفتار سے بائیک آگے بڑھائی۔ ''آپ کی غیر موجودگی میں تو میں کافی شرمیلا ہوتا ہوں۔ ہاں البتہ آپ ہمراہ ہوں تو شرم دس قدم اُلٹی لوٹ جاتی ہے۔ آپ کو دیکھ کر۔''

''گرنے کا ڈر نہ ہوتا تو کھوپڑی توڑ دیتی اس وقت تمہاری۔'' اس نے ہوا میں بکھرتے، سیاہ سلکی بالوں کو سمیٹا۔

''اب میری کھوپڑی ایسی بھی نہیں کہ آپ جیسی دھان پان، نازک مزاج حسینہ بھی اسے آرام سے توڑ دے۔''

''تعریف کا شکریہ!'' وہ ہنسی۔

''بائیک روکو تو جی بھر کر بدلے لوں گی تم سے۔'' وہ اُڑتے بالوں کو چہرے سے ہٹاتی رہی۔



ٹیرس پر کھڑے دونوں نے چپس کے لاتعداد پیکٹ اڑا ڈالے تھے۔

''صبا۔اب میں پھٹ جاؤں گی۔'' آخری ریپر ایک طرف ڈالتے ہوئے اس نے پیٹ پکڑا۔

''میں کون سا بچوں گی۔'' اس نے نحیف ونزار آواز نکالی۔۔''ہائے الماس۔بہت کھالیا۔''

''کہاں ہیں وہ تمہارے در نایاب۔'' وہ جھنجلائی۔''کب سے لٹکے ہوئے ہیں۔یہ نہیں کہ ایک جھلک دکھلا جائیں۔''

''تمہاری ہی ضد ہے۔'' صبا کھلکھلا کر ہنس دی۔''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ نہیں آتے تو مہینوں نظر نہیں آتے۔''

''بڑا دیکھ بھال کر عشق فرمایا ہے محترمہ نے۔'' وہ جھنجلائی۔''میں ہوتی تو کب کا ہاتھ اُٹھا چکی ہوتی۔''

''جو دیکھ بھال کر کیا جائے وہ عشق کہاں ہوتا ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''آخر ایسی کون سی خوبی ہے حضرت میں؟''

''معلوم نہیں۔'' صبا نے کاندھے اُچکائے۔مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ وہ مجھے اچھے لگتے ہیں۔کیوں لگتے ہیں میں نے کبھی نہیں سوچا۔''

''دو مہینے ہو گئے ہیں تمہیں یہ راگ الاپتے ہوئے اتنا نہ ہو سکا کہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر حال دل ہی عرض کر دو۔''

''پاگل ہوئی ہو؟'' اس نے آنکھیں نکالیں۔''کیا تمہاری طرح میری شرم وحیا بھی کھو گئی ہے؟''

''بس شرماتی رہو ساری زندگی۔جس ٹیرس پر کھڑے ہو کر آج انہیں اکیلا دیکھتی ہو کل یہیں اسے انہیں کسی اور کے ساتھ دیکھا کرنا۔''

''ہاں۔ہو سکتا ہے یہی ہو۔'' وہ اُداس ہو گئی۔

''میری پیاری دوست کہاوت ہے کہ جو پیسے شور مچاتے ہیں تیل بھی انہی میں ڈالا جاتا ہے۔''

''وہیں یہ بھی تو کہتے ہیں کہ۔خاموشی سونا ہے۔''

''تمہارا مرض لاعلاج ہے۔'' الماس نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''الماس! مجھے وہ اچھے لگتے ہیں۔لیکن یقین جانو میں نے کبھی بھی انہیں پانے کے متعلق نہیں سوچا۔محبت اندیشہ سود وزیاں نہیں۔صرف محبت ہے۔اور شاید میری محبت اتنی مقدس اور پاکیزہ بھی اسی لیے ہے کہ ان کے لئے ہے۔''

''ہائے رے مشرقی لڑکی۔'' الماس نے مصنوعی تاسف سے سر ہلایا۔''جو اُن کا نام بھی نہیں لیتی۔''

''ان کا نام نہ لینے کی وجہ میرا مشرقی پن نہیں ہے۔'' وہ ہنسی۔''بلکہ وجہ یہ ہے کہ مجھے ''ان'' کا نام معلوم ہی نہیں ہے اور یہ بات تم بھی جانتی ہو۔''

''ہاں تو آپ کیا فرما رہی تھیں؟''

''میں کہہ رہی تھی الماس کہ میں نے اُن جیسا سلجھا ہوا، پاکیزہ پاکیزہ سا نظر آنے والا لڑکا آج تک نہیں دیکھا۔میں گھنٹوں یہاں کھڑی رہوں اگر وہ لان میں ہوتے بھی ہیں تو ایک نظر ڈال کر دوبارہ نظریں نہیں اُٹھاتے۔کوئی اور ہوتا ناں تو میری اس حرکت پر نہ صرف جواباً مجھے گھور گھور کر

دیکھتا بلکہ خط اٹھانے کے لئے معاملہ آگے بڑھانے کی کوشش بھی کرتا لیکن انہیں تو علم ہی نہیں ہوتا کہ میں کب آکر کھڑی ہوئی اور کب چلی بھی گئی۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ انہیں مجھ سے اپنی ملاقات بھی یاد نہیں آئی۔ میں ایک دو مرتبہ ان کے گھر گئی ہوں۔ایک مرتبہ سامنا بھی ہوا لیکن انہوں نے مجھے دیکھ کر کسی قسم کا کوئی تاثر ہی نہیں دیا۔"

"عجیب شخص ہے۔" الماس ہنسی۔"یہاں میری دوست اس پہلی ملاقات کی یادوں کو سینے سے لگائے بیٹھی ہے اور وہ ہیں کہ گھل کر نہیں دیتے۔"

"مجھے چاہت بھی نہیں ہے کہ وہ کھلیں۔ مجھے پسند ہی ان کا یوں تنا مارہنا ہے۔"

"چلو۔رب نے ملائی جوڑی۔اک اندھا تے اک۔"

"الماس۔" صبا نے چیخ کر اس کا منہ بند کر دیا۔



"السلام علیکم۔"

وہ تندہی سے سالن بھوننے میں مشغول تھی جب پیچھے سے آواز آئی۔

"آں۔" وہ چونک کر مڑی۔"اوہ۔آپ۔وعلیکم السلام کب آئے؟"

"چند لمحوں قبل۔" وہ مسکرائے۔

"شبنم کے ساتھ؟"

"جی۔اسی کو چھوڑنے آیا ہوں۔"

"چچی جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"شکر ہے خدا کا۔امی بھی ٹھیک ہیں۔تم تو دیکھنے بھی نہیں آئیں۔" انہوں نے ہلکا سا شکوہ کیا۔

"جی میں؟" وہ بوکھلا سی گئی۔شکوہ تو واقعی بجا تھا۔اماں اور وقار بھائی تو گئے تھے لیکن وہ نہ جا پائی تھی۔

"اصل میں یوسف بھائی! شبنم نہیں تھی ناں تو کام بڑھ گیا تھا۔ریشم اور مریم تو پڑھائی میں مصروف رہتی ہیں ناں۔تو۔"

"تو؟" انہوں نے دلچسپی سے اس کی بوکھلاہٹ دیکھی۔

"تو۔"

"بجو! کیا کر رہی ہیں۔" شبنم بھی ادھر ہی آگئی۔"کیا پکا رہی ہیں؟"

"مٹر گوشت۔" اس نے دوبارہ چمچہ چلایا۔

"یوسف بھائی۔اندر آکر بیٹھیں ناں۔یہاں کیا کر رہے ہیں۔"

"ہاں چلو۔ تمہاری بجو کی خیریت دریافت کرنے آ گیا تھا۔"

"وہ باہر چلے گئے تو وہ نجانے کس خیال میں محو ہو گئی۔

"بجو۔ روٹی میں ڈال لوں؟" شبنم، یوسف کو اندر بٹھا کر واپس لوٹی تو اسے سوچ میں گم پایا۔

"آں۔" وہ چونکی۔ "نہیں۔ بس روٹی پکانا ہی تو رہ گیا ہے۔ میں خود ڈال لوں گی۔ تم یوسف بھائی کو چائے بنا دو۔"

"اچھا۔"

وہ دوسرے چولہے پر چائے کا پانی رکھنے لگی۔

"چچی جان ٹھیک ہیں اب؟"

"جی ہاں۔ فی الحال تو ٹھیک ہی ہیں۔ لیکن بجو یہ عارضی آرام تو انہیں آ ہی جاتا ہے۔ کچھ دن گزرتے ہیں پھر وہی درد شروع۔ میں نے تو کہا چچی جان سے کہ اب بھولے ہی آ ئیں۔ کتنا آرام مل جائے گا انہیں۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ یونس بھائی کی نوکری بھی ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ پھر کوئی لڑکی نظر میں ہے ان کی؟" اس نے بے دھیانی سے پوچھا۔

"لیکن جب جواب میں شبنم ہنسنے لگی تو وہ چونک اٹھی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"ہنسنے کی بات ہے کہ جو لڑکی یونس بھائی کے لئے ان کی نظر میں ہے، وہی لڑکی یہ بات پوچھ رہی ہے۔" شبنم مسکرائی۔

"کیا مطلب؟" اس نے تیوری چڑھائی۔

"مطلب صاف ظاہر ہے مائی ڈیر بجو۔ آپ جان کر انجان بنیں تو اور بات ہے۔" وہ چائے میں پتی ڈالنے لگی۔

"ویسے چچی نے آمنہ کی شادی بھی بڑی جلدی کر دی۔" اس نے چند لمحے اس کی بات پر غور کر کے جان بوجھ کر موضوع بدل دیا۔ "اس کی اتنی عمر تو نہیں تھی کہ پہلا رشتہ آتے ہی چچی نے ہاں کر دی اور مہینے بھر بعد شادی بھی کر دی۔ اب کتنی مشکل ہو رہی ہے انہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے تائید کی۔ "چچی کو اب خود بھی افسوس ہوتا ہے ریاض بھائی کا سلوک آمنہ کے ساتھ دیکھ کر۔"

"جانے ہمارے ہاں لڑکیوں کو اتنا بڑا بوجھ کیوں خیال کیا جاتا ہے۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"جوڑے تو بہر حال آسمانوں پر بنتے ہیں۔" شبنم چائے چھاننے لگی۔ "تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے؟"

"ہاں۔ یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" اس نے تائید کی۔

"شبنم کے جانے کے بعد وہ ایک نئی سوچ سے پریشان ہونے لگی۔

چچی جان، یونس بھائی کے لئے اس کا رشتہ چاہتی تھیں۔ یہ بات انوکھی نہ تھی لیکن پریشان کن تھی۔ پریشان کن اس لئے تھی کہ جو جذبے اس نے بارہا یوسف بھائی کی آنکھوں میں ابھرتے دیکھے تھے، وہ اسے سمجھانے کے لئے کافی تھے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

یہ کوئی حالیہ بات نہ تھی۔ یہ تو اس وقت کی بات تھی جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ تب سے لے کر آج تک اس نے یوسف بھائی کا رویہ۔ ان کا لہجہ دوسرے ہر رویے، ہر انداز اور ہر لہجے سے مختلف پایا تھا۔ اور اب وہ شعور کی ان منزلوں پر تھی جہاں ایک لڑکی مرد کی ہر نگاہ پہچان لیتی ہے۔ آنکھوں کے سارے رنگ پڑھ سکتی ہے۔ اور نیلم بھی بخوبی جانتی تھی کہ یوسف اسے پسند کرتے ہیں۔ بچپن سے لے کر اب تک۔ ان کی چاہت مستحکم تھی، مضبوط تھی۔

اور ایسے میں چچی جان کے خیالات سن کر وہ پریشان ہو گئی تھی تو کوئی انوکھی بات نہ تھی۔

''بجو۔ سالن جل رہا ہے۔'' ریشم اندر آ کر چیخی تو وہ گھبرا کر ہانڈی کی جانب متوجہ ہوئی۔



''امی جی! حلوہ بنا رہی ہیں!'' اس نے خوشبو پر بے قرار ہو کر ندیدوں کی طرح کچن میں آتے ہوئے پوچھا۔

''بنا کیا رہی ہوں۔ بن گیا اب تو۔''

''اُف کتنے مزے کی خوشبو ہے۔'' وہ خوش ہوئی۔

''تو یہ کتنی ندیدی لڑکی ہے۔'' انہوں نے پیار سے اسے دیکھا۔ ''اچھا اب یوں کرو بیٹی تھوڑا حلوہ برابر میں دے آؤ۔ شعیب صاحب کے گھر۔''

''میں؟'' اس کا دم حلق میں آ گیا۔

''ہاں ہاں۔ دیکھو ناں کتنی بری بات ہے۔ عفت بیگم کتنی ہی چیزیں بھیج چکی ہیں اور ہمیں توفیق نہیں ہوئی کہ جھوٹے منہ ہی پوچھ لیں۔ ویسے تو میں خود بھی جاؤں گی۔ لیکن نہا دھو کر۔ تم ابھی جا کر یہ گرم گرم حلوہ دے آؤ۔'' انہوں نے ڈش اسے تھمائی۔

''جی۔ اچھا!''

''وہ تذبذب کے عالم میں کچن سے باہر آئی اور گیٹ کی سمت چل دی۔ ویسے تو وہ پہلے بھی ایک دو مرتبہ جا چکی تھی لیکن جب سے اس نے ٹیرس پر سے تانک جھانک شروع کی تھی تب سے ایک مرتبہ بھی نہیں گئی تھی۔ اب جاتے ہوئے خود کو چور محسوس کر رہی تھی۔

''لیکن میں نے کیا تو کچھ نہیں ہے ناں! ٹیرس پر کھڑا ہونا کوئی جرم تو نہیں جبکہ ٹیرس ہو بھی اپنا!'' گیٹ سے نکلتے ہوئے اس نے خود کو تسلی دے ڈالی۔ ''اور کسی کو کیا پتا کہ میں کیوں کھڑی ہوں اور کہاں دیکھ رہی ہوں۔''

''اللہ کرے وہ گھر پر نہ ہوں۔'' ان کی بیل بجاتے ہوئے اس نے دعا مانگی۔

تھوڑی دیر بعد گیٹ کھلا اور جمنا کی صورت نظر آئی۔

''آنٹی عفت ہیں۔''

''ہیں جی۔ آیئے ناں!'' اس نے دانت نکالے۔

وہ اندر داخل ہو گئی۔ لان میں پڑی کرسیوں کو چور نظروں سے دیکھا۔ اپنے دل کی دھڑکن پر اسے خود ہی ہنسی آنے لگی۔

"چشم ما روشن دل ما شاد!" لاؤنج میں پڑے جھولے میں لیٹا شہروز اسے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"جی۔ السلام علیکم!"

اس کے بے تکلفانہ استقبال پر وہ بوکھلا گئی۔

"جیتی رہیں۔ ویسے دعا دینے کا حق تو آپ کا ہے۔ میں چھوٹا ہوں۔" وہ مسکرا لیا۔

"جی؟"

"آپ سے نہیں، اُن" سے۔" اس نے بے تکلفی سے دانت نکالے۔

"یا خدا!" صبا کو حقیقتاً پسینہ آ گیا۔

"کیا لائی ہیں؟" اس نے آگے بڑھ کر ڈش لے لی۔ "اوہو۔ حلوہ۔ واہ کیا اشارہ ہے؟"

"کیسا اشارہ؟" وہ ہراساں تھی۔

"کھایا جو میرا حلوہ تو دل تھام لو گے۔ کہاں تک تکلف سے کام لو گے۔"

"شہروز۔ کس سے باتیں کر رہے ہو۔" سیڑھیاں اُترتی عفت خانم نے حیرانی سے پوچھا۔

"مارے گئے۔" پلک جھپکتے وہ غائب تھا۔

"ارے بیٹی۔ تم ہو۔" اسے دیکھ کر وہ مسکرائیں۔ "کب آئیں۔ آؤ بیٹھو۔"

"جی۔ بس چلتی ہوں۔ دراصل امی نے حلوہ بنایا تھا وہ لائی تھی۔ امی چنے کی دال کا حلوہ بہت اچھا بناتی ہیں۔"

"اچھا۔ اچھا۔ کہاں ہے حلوہ۔؟" عفت خانم میٹھے کی ویسے ہی شوقین تھیں۔

"جی۔ وہ۔"

"شہروز بابو لے گئے ہیں۔" جمنا خاموشی سے ہر بات سن رہی تھی۔ "ہر کسی سے اُلجھتے ہیں۔"

"عجب عادت کا ہے یہ لڑکا بھی۔ تم سے بھی الٹی سیدھی ہانک رہا ہو گا۔"

وہ خاموشی سے مسکرا دی۔

"امی جی! میں ذرا لائبریری تک جا رہا ہوں۔" بائیک کی چابیاں جیب میں رکھتا، سیڑھیاں اُترتا، فیروز اچانک ہی چلا آیا۔

"بیٹا جلدی آ جانا۔ دیر کر دیتے ہو تو مجھے الجھن ہوتی ہے۔"

"جی۔" ایک اچٹتی نگاہ صبا پر ڈال کر وہ باہر نکل گیا۔

اس کا دل جو بڑی مشکلوں سے قابو میں آیا تھا۔ پھر اسی رفتار سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔

"فیروز کو جنون ہے کتابوں کا۔" عفت خانم نے مسکرا کر اسے بتایا۔ "گھر میں ہو تو جب بھی کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ہوتی ہے۔ گھر سے نکلتا ہے تو بھی لائبریری جانے کے لئے۔"

"جی۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔ "اچھا آنٹی چلتی ہوں۔ امی شاید رات کو آئیں آپ سے ملنے۔"

"ہاں بھئی ضرور۔ میں خود تنہائی کی ماری ہوئی ہوں۔ یہ لڑکے کہاں رُکتے ہیں گھر پر۔"

"انہیں سلام کرتی وہ باہر کی سمت چل دی۔

"آتی رہا کریں۔" وہ سیڑھیوں پر بیٹھا حلوہ نوش جاں کر رہا تھا۔ "سفارتی تعلقات بہتر کرنے کے لیے دورے ضروری ہوتے ہیں۔"

"جی۔"

"جی۔" اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔

وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

"توبہ۔ یہ کتنا تیز لڑکا ہے۔ پتا نہیں کا۔ اس کو کیسے پتا چل گیا۔" اپنے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

رات کو بستر پر لیٹ کر اس نے آنکھیں موندیں تو سیڑھیوں سے اُترتا۔ بے دھیانی سے آگے بڑھتا وہ نظروں کے سامنے آ گیا۔

"فیروز!" اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔ پھر وہ خود بخود مسکرا اٹھی۔



اسے عنبرین نے بلوایا تھا کسی ضروری کام سے۔ اب وہ جلدی جلدی روٹیاں پکا رہی تھی۔

''شہزادی صاحبہ کو دیکھو۔ خود نہیں آئیں۔'' روٹی پھینکتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔

''بچو کے پیٹ میں کھلبلی ہو رہی ہے۔'' مریم ہنسی۔ ''لائیے باقی روٹیاں میں پکالوں۔ آپ بات سن آئیں۔''

''نہیں۔ بس دو تو رہ گئی ہیں۔''

''روٹیاں پکا کر دستر خوان میں لپیٹیں اور مریم کو کنڈی لگانے کا کہہ کر جلدی سے باہر نکل آئی۔

دو قدم بڑھا کر اسے غلطی کا احساس ہوا۔ سامنے ہی سڑھیوں پر وہ بیٹھا ہوا تھا۔

انہیں نظروں کے ساتھ دیکھتا ہوا۔ جو جسم میں برق سی دوڑا دیتی تھیں۔

نیلم کا دل اُچھل کر اس کے حلق میں آ گیا۔ اس نے قدموں کی رفتار مزید تیز کر دی۔ اور عنبرین کے دروازے پر جا رکی۔

اس نے جلدی جلدی دروازہ بجایا اور ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ بالکل قریب آ چکا تھا۔

اس نے پھر کنڈی بجائی۔

''سنیے!'' نیلم نے پیچھے اس کی آواز سنی اور مڑ کر دیکھا۔ وہ سفید لفافہ اس کی جانب بڑھا رہا تھا۔

''یہ لے لیجیے۔''



اسی لمحے اندر سے کسی نے دروازہ کی کنڈی کھولی۔

نیلم نے پوری قوت سے دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہوتی چلی گئی۔

''نیلو باجی۔ کیا ہوا آپ کو؟'' عنبرین کا دس سالہ بھائی بیوا اسے بے حد حیرانی سے دیکھنے لگا۔

''آں!'' اس نے دھڑکتے دل اور پھولتی سانسوں پر قابو پا کر اسے دیکھا۔ ''کک۔ کچھ نہیں۔ کنڈی لگا لو بیو۔''

دوپٹا ٹھیک کرتی وہ اندر بڑھ گئی۔ عنبرین اپنے کمرے میں تھی۔ مزے سے پلنگ پر لیٹی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔

''آ گئیں۔'' اسے آتے دیکھ کر وہ مسکرائی اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کب سے بلوایا ہوا ہے اور محترمہ اب تشریف لائی ہیں۔''

''تمہارے پاؤں میں کیا مہندی لگی تھی؟'' وہ جھلا کر بولی اور دھڑ سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

''ایں؟ کیا ہوا بھئی؟'' وہ اس رویے پر حیران ہوئی پھر غور سے اس کا زرد پڑا ہوا چہرہ دیکھا۔ نیلو۔ خیرت تو ہے؟''۔

''عنبرین۔ وہ۔'' پہلے اس نے مڑ کر کمرے کے دروازے کو دیکھا پھر دھیمی آواز میں بولی۔ ''راجا ہے ناں منحوس کہیں کا۔''

''ہاں۔ ہاں۔ کیا کیا اس نے؟'' عنبرین نے جلدی سے پوچھا۔

''وہ۔ ناں۔ خط دے رہا تھا مجھے۔'' اس نے تھوک نگل کر خشک گلے کو تر کیا۔

"کیا! خط! کہاں ہے؟"

کیا لے لیتی میں؟" وہ بھنائی۔" وہ تو خدا کا شکر ہے کہ پپو نے عین وقت پر کنڈی کھول دی ورنہ تو میرا دم دروازے پر ہی نکل جاتا۔"

"اوہو۔ ہو۔" عنبرین ہنس دی۔" وہ جو چیلیں توڑ ڈالنے کا دعویٰ تھا اس کے سر پر۔ اس دعوے کا کیا ہوا؟"

"میری جان نکل رہی ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔" نیلم نے آنکھیں نکالیں۔

"ارے بابا۔" تو اب کیوں جان نکل رہی ہے؟"

"عنبرین وہ کھل گیا ہے کم بخت اور ایسے بدمعاش قسم کے لڑکے جب کھل جائیں ناں تو جینا محال کر دیتے ہیں۔ مجھے اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ وہ پیچھا کرے گا یا کچھ کہہ دے گا۔ ڈر تو مجھے بدنامی سے لگتا ہے۔ اگر اس وقت کوئی عورت اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیتی ناں تو اس بدمعاش کا کچھ نہیں بگڑتا البتہ میں پورے محلے کی عورتوں کے لیے موضوع گفتگو بن جاتی۔ رائی کا پہاڑ بنتے کتنی دیر لگتی ہے۔"

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔" عنبرین سوچتے ہوئے بولی۔" لیکن نیلم رہنا تو تم کو بھی یہیں ہے اور اس کو بھی۔ تمہارے خیال میں کیا وہ پھر یہ حرکت نہیں دہرائے گا۔ اور کیا ضروری ہے کہ اگلی مرتبہ بھی کوئی نہ دیکھے۔"

"اسی بات سے تو ڈر رہی ہوں۔ بہر حال آئندہ میں کبھی اکیلی باہر نہیں نکلوں گی اور سنسان گلی میں تو کبھی نہیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک بات ہے اور جاتے وقت بھی پپو کو لے جانا۔"

"ارے ہاں۔" نیلم کو یاد آیا۔ بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ تم نے مجھے کون سے ضروری کام سے بلوایا ہے۔"

"وہ۔" عنبرین کھلکھلا کر ہنس دی۔" تم سوچو کیا بات ہو سکتی ہے۔"

"میں کیا سوچوں۔" نیلم کے الفاظ اس کے لبوں میں ہی رہ گئے۔ اس کی نگاہ کمرے کے کونے میں رکھے مٹھائی کے ٹوکرے پر پڑی۔

"ایں! یہ کیا؟ کہیں چپکے چپکے منگنی تو نہیں رچالی؟" اس نے عنبرین کو آنکھیں دکھائیں۔

"رچائی تو نہیں۔ لیکن رچانی پڑے گی۔" وہ ہنس دی۔

"پہیلیاں کیوں۔ بجھوا رہی ہو؟" وہ چڑ گئی۔" بتاؤ بھی؟"

"وہ لوگ جو اس دن آئے تھے ناں۔ وہ پھر آئے تھے کل شام کو۔"

"پھر۔" اس نے بے تابی سے پوچھا۔" ہاں کہہ دی خالہ نے؟"

"ہوں!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ تبھی تو یہ مٹھائی دے کر گئے ہیں!"

"مبارک ہو۔" اس نے عنبرین کا گال چوما۔

"خیر مبارک۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"منگنی کب ہے؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ تاریخ تو مقرر نہیں ہوئی لیکن جلدی متوقع ہے۔ شاید ایک آدھ مہینے میں۔"

"موصوف کرتے کیا ہیں۔ ہیں کیسے؟ کوئی تصویر وغیرہ نہیں ہے کیا؟" اسے ساری باتیں جان لینے کی جستجو ہو رہی تھی۔

"ہاں۔ ہے ناں۔" عنبرین اُٹھ کر الماری تک گئی اور نچلی دراز سے ایک لفافہ نکال لائی۔

"یہ دیکھو۔ دوائیوں کی کمپنی میں میڈیکل ریپ ہیں۔ انصر نام ہے۔"

"واؤ" اس نے غور سے تصویر دیکھی۔

اچھا خاصا معقول نوجوان تھا۔ بلکہ عنبرین سے کہیں زیادہ اچھا تھا۔

"واہ بھئی آپ کے تو سارے کام نمٹ گئے۔" وہ شرارت سے ہنسی۔

"ارے تم سعدیہ سے نہیں ملیں۔" اچانک عنبرین کو خیال آیا۔

"سعدیہ کون؟ تمہاری ماموں زاد آئی ہوئی ہے کیا؟"

"ہاں ناں۔ ٹھہرو میں بلا کر لاتی ہوں شاید شرما رہی ہے تم سے۔ ورنہ آ گئی ہوتی۔"

"وہ اُٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ نیلم ایک مرتبہ پھر تصویر دیکھنے لگی۔ عنبرین کی بات طے ہو جانے کی اسے دل سے خوشی ہوئی تھی۔ یوں بھی اس دن والے واقعے کے بعد وہ خود کو دل میں چور سا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل خدا کا شکر ادا کیا۔

"بھئی ان سے ملو نیلم۔" عنبرین ایک شرمائی شرمائی سی لڑکی کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئی۔ بڑی تو ہو گئی ہیں۔ لیکن بچپنا نہیں گیا۔ ہر کسی کو دیکھ کر جھجکتی ہے بے وقوف۔" اس نے سعدیہ کو نیلم کے سامنے لا کر بٹھا دیا۔ نیلم نے پُرشوق نظروں سے اسے دیکھا۔ سانولی سلونی رنگت اور خوبصورت تیکھے نقش والی وہ بڑی دلکش سی لڑکی تھی۔ لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ سجا کر اس نے نیلم کو سلام کیا۔

"تم ایک بار پہلے بھی آئی تھیں ناں۔ دو تین سال پہلے۔" نیلم نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بڑی خوبصورت ہو گئی ہو بھئی!" اس نے دھیرے سے اس کا نرم گال چھوا۔

وہ زور سے ہنس دی۔ اس کی ہنسی بھی بڑی ہی مترنم اور دلکش تھی۔

"آپ چائے پئیں گی؟" وہ نیلم سے پوچھنے لگی۔

"ہاں بھئی تم ہی پلا دو۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔" ورنہ یہاں تو کسی کو جھوٹے منہ مٹھائی کا پوچھ لینے کا بھی خیال نہیں آیا۔"

"آپ خاطر جمع رکھیے۔ شام کو امی بنفس نفیس آپ کے گھر جائیں گی مٹھائی دینے اور مجھے واقعی خیال نہیں آیا۔ سعدیہ تم چائے بنا لو تو مٹھائی بھی لے آنا۔"

"جی اچھا۔"

وہ کمرے سے نکل گئی۔ نیلم اس کی پشت پر لہراتے گھنیرے کالے بال دیکھتی رہ گئی۔

عنبرین۔ یہ سعدیہ تو بڑی خوبصورت ہوگئی ہے۔ ہے ناں۔"

"ہوں۔" اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ میں تو اس کو دیکھ کر بڑے بھائی کی حسرت میں مبتلا ہوگئی ہوں۔ میرا کوئی بڑا بھائی ہوتا تو ہر صورت اس کو اپنی بھابی بنالیتی۔ پیچو تو اتنا سا ہے بالکل۔"

نیلم خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ اپنے مہمان پروقار سے وقار بھائی کا خیال اس کے پردہ ذہن پر لہرانے لگا۔

"ارے نیلم بیٹی۔ بڑے دن بعد آئیں۔" عنبرین کی امی اندر چلی آئیں تو وہ چونکی۔

"السلام علیکم خالہ۔ کیسی ہیں؟"

"شکر ہے خدا ہے۔ اطہر کی تصویر دیکھی تم نے؟۔"

"جی۔ بہت ہی اچھے ہیں۔" وہ مسکرائی۔ "کب کر رہی ہیں منگنی اس کی؟"

"بس اب جلدی ہی فارغ کروں گی اس کو۔ خدا تمہارے بھی نصیب کھولے۔"

انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ ویسے تو ان کا انداز بہت پر خلوص تھا لیکن پھر بھی نجانے کیوں اس کے لبوں پر ایک مدھم سی، تلخ سی مسکراہٹ چھلک کر معدوم ہوئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کہہ دے کہ میری تو منگنی ہو بھی گئی ہے اور چھ ماہ بعد شادی بھی ہے۔ لیکن وہ خاموشی سے مسکرا کر رہ گئی کہ اگر انسان اپنے ظرف کے بجائے دوسرے کے ظرف سے کام لینا شروع کر دے تو سارے اچھے لوگ برے بن جائیں۔ اور پھر اولاد ہوتی بھی ایسی ہی شے ہے کہ اس کی خوشی کے لئے انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ بے چاری بلو خالہ نے تو صرف ایک معصوم سا جھوٹ ہی بولا تھا۔



"ارے تم لوٹو تو سہی۔ دیکھو تو ہم کیسا چراغاں کرتے ہیں۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔"

"ولاور چچا۔ لاڈلے سپوت سے فون پر مصروف گفتگو تھے۔

"چچی انتہائی پر شوق انداز میں ان کے سامنے بیٹھی ان کی باتوں سے اندازہ لگا رہی تھیں کہ دوسری جانب بیٹا کیا کہہ رہا ہے اور اسی حساب سے اپنے چہرے پر بھی تاثر پیدا کرتی تھیں۔

"ذرا امی کا ذوق و شوق ملاحظہ فرمایئے۔" عدنان نے مہناز کے کان میں سرگوشی کی۔ "یوں لگ رہا ہے کہ ابو کے بجائے عثمان بھائی سے یہ خود گفتگو کر رہی ہیں۔"

"چپ رہو بدتمیز۔" مہناز نے اسے گھرکا۔

"آپ سے تو بات کرنا فضول ہے مہناز باجی۔ ذرا سنس آف ہیومر نہیں ہے۔ میں اپنے ذوق کا کوئی بندہ تلاش کرتا ہوں۔"

"اس نے حاضرین پر نگاہ دوڑائی اور پھدکتا ہوا مہوش کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں میں کانا پھوسی شروع ہوگئی۔

الماس نیند سے بوجھل آنکھیں لیے، جماہی لیتی ہوئی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس نے بغور سب کو یوں ہال میں جمع دیکھا اور صوفے پر گری

گئی۔

''نسرین کہاں ہے؟'' اس نے سیماب سے پوچھا جو پوری طرح چچا جان کی جانب متوجہ تھی۔

''آں۔'' وہ چونکی۔ ''ہوگی یہیں کہیں۔''

''کیا بات ہے چچا جان کس سے بات کر رہے ہیں؟''

''عثمان بھائی سے۔'' پرجوش انداز میں بولی۔ ''عثمان بھائی کی پڑھائی مکمل ہوگئی ہے ناں۔ واپس آ رہے ہیں۔ سرجن بن گئے ہیں۔''

''وہ ایسے اترا کر بولی جیسے خود سرجن بنی ہو۔

''اچھا!'' الماس پرشوق لہجے میں بولی۔ ''کب آ رہے ہیں عثمان؟''

''پتا نہیں۔ ابو جی کی بات ختم ہو تو علم ہو۔ کب سے تو باتیں کر رہے ہیں۔''

''چچا جان نے ریسیور رکھا تو سب ان پر جیسے ٹوٹ پڑے۔''

''ارے بھئی آرام سے۔ سکون سے۔'' وہ ہنسنے لگے۔ ''اگلے ہفتے آ رہا ہے۔ صبح چھ بجے کی فلائٹ سے۔''

''ہرا!'' عدنان، کاشف اور عمران نے نعرہ ایک ساتھ پروگرام کے مطابق بلند کیا۔

''ابو جی۔ بڑی شاندار پارٹی کریں گے۔ ہے ناں۔'' عمران، بڑے بھائی کے آنے کی اطلاع پر سب سے زیادہ پرجوش لگ رہا تھا۔

''ارے میں تو گھی کے چراغ روشن کروں گی۔'' عاصمہ چچی نے سب سے پہلے اپنا پروگرام بیان کر دیا۔

''میں تو فائرنگ کروں گا ابو جی کے ریوالور سے۔'' عدنان شرارت سے بولا۔

''جوتے لگاؤں گا میرے ریوالور کو ہاتھ لگایا تو۔'' چچا جان بڑے سادہ لوح تھے۔ ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیتے تھے۔

ان کی اس معصومانہ بات پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

مہناز، الماس اور مہوش مسکراتے ہوئے ان لوگوں کا جوش و خروش دیکھ رہی تھیں۔ خوشی تو ان کو بھی بہت محسوس ہو رہی تھی لیکن سیماب، عدنان اور عمران کی خوشی تو سوا تھی۔ کہ بہر حال ان کا سگا بھائی چھ برس بعد دیارِ غیر سے لوٹ رہا تھا۔ ایک کامیاب سرجن کی صورت میں۔

''امی۔ عثمان بھائی اگلے ہفتے آ رہے ہیں۔'' مہوش نے چائے لاتی نسرین کے پیچھے پیچھے آتی راشدہ خاتون کو اطلاع دی۔

''ہاں۔ ہاں سب سن رہی تھی۔'' وہ ہنسیں۔ ''مبارک ہو بھائی صاحب۔ عاصمہ بھی مبارک ہو۔''

''خیر مبارک۔'' چچی جان نے فرطِ مسرت سے انہیں گلے سے لگا لیا۔

ایک طویل عرصے بعد سب سے لاڈلے، سب سے بڑے بیٹے کے آنے کی خوشی ان کے چہرے کو گلنار بنا رہی تھی۔

''نسرین۔ مٹھائی ہو تو لے آؤ۔ ہم مٹھائی کھائیں گے۔ ہے ناں عمران۔'' کاشف نے خواہش کا اظہار کر کے عمران سے تصدیق چاہی۔

''ہاں!'' اس نے مکا لہرایا۔

باقی لوگ ان دونوں کو دیکھ کر ہنس دیے۔



"اماں۔ہم وقار بھائی کی شادی کریں گے۔" اماں کے سر میں تیل ڈالتے ہوئے اس نے اپنی خواہش کو الفاظ کا جامہ پہنا ہی دیا۔

"اچھا۔" اماں ہنس دیں۔ "کس سے؟"

"پتا ہے اماں۔ عنبرین کی ماموں زاد بہن آئی ہے سکھر سے۔اماں وہ اتنی خوبصورت، اتنی پیاری ہے کہ کیا بتاؤں۔" جوش سے اس کے ہاتھ تیز تیز مالش کرنے لگے۔

"سچ بجو۔" پاس مریم اور ریشم بھی ٹی وی پر آتے ڈرامے کو بھول بھال کر اس کی جانب متوجہ ہو گئیں۔ "وہ بہت پیاری ہے؟"

"بہت۔تم خود دیکھ لینا۔" اماں کے بال سمیٹ کر وہ ان کے آگے آ کر بیٹھ گئی۔ "اماں میرا تو دل چاہ رہا تھا اسے اٹھا کر اپنے گھر لے آؤں۔عنبرین بھی یہی کہہ رہی تھی کہ اگر اس کا کوئی بڑا بھائی ہوتا تو وہ فوراً سعدیہ کو اپنی بھابی بنا لیتی۔سچ اماں۔ وقار بھائی کے ساتھ اس کی جوڑی بڑی اچھی لگے گی۔"

"پاگل لڑکی۔" اماں ہنس دیں۔ "جس کے سر پر پانچ بہنوں کا بوجھ ہو وہ اتنی جلدی کہاں ان باتوں پر توجہ دے گا۔پہلے تم لوگوں کے فرض سے تو فارغ ہو لے وہ غریب۔"

"اماں!" اس نے لاڈ سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "اماں ہمیں اتنا شوق ہے پیاری سی بھابی لانے کا۔بس اماں آپ اسے دیکھ لیں پہلے۔"

"اچھا بابا۔میرے کان کیوں کھا رہی ہے۔جا پہلے بھائی سے پوچھ لے۔"

"کیا بات ہے بھئی۔" وقار بھائی تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے وہیں آ گئے۔ "کس بات کی اجازت مانگی جا رہی ہے؟"

"آپ کی شادی کی۔" تینوں ایک ساتھ بول کر ہنس پڑیں۔

"ہائیں؟" وہ حیران ہوئے۔ "کیا مطلب؟"

"شادی کا مطلب نہیں آتا آپ کو؟" مریم شوخی سے بولی۔

"شادی کا مطلب تو آتا ہے لیکن ڈائریکٹ میری شادی؟" وہ بھی ہنس دیے۔ "یہ تم چاروں جو بانس کی طرح لمبی ہوتی جا رہی ہو تمہیں کس خانے میں فٹ کروں گا؟"

"بھائی۔آپ اسے دیکھیں تو۔" نیلم نے دہائی دی۔

"نہ بابا۔" انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "فی الحال تو میں صرف تم لوگوں کو اچھی طرح دیکھ بھال لوں وہی کافی ہے۔تیسرے کسی فرد کی تو جگہ ہی نہیں۔"

''بھائی۔ ہمیں اتنا شوق ہے بھابی لانے کا۔'' ریشم نے منہ بسورا۔

''چند ابر بات اپنے وقت پر بھلی لگتی ہے۔'' انہوں نے اسے رسانیت سے سمجھایا۔ ''اور اب تم اُٹھو اور بھائی کو اچھی سی چائے بنا کر دو۔''

''جی اچھا۔'' وہ اُٹھ کر باورچی خانے کی سمت چل دی۔

''گڑیا سو گئی؟ وہ نیلم سے پوچھنے لگے۔

''ہوں!'' اس نے سر ہلایا۔

''اس کا ہوم ورک کروا دیا تھا؟''

''جی۔ شبنم شام سے لگی ہوئی تھی۔ پوئمز وغیرہ یاد کروا رہی تھی۔''

''شبنم ہے کہاں؟'' انہوں نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔

''چھوٹے کمرے میں ہے۔ دن رات اپنی آنکھیں کمزور کرتی رہتی ہے کڑھائی کر کر کے۔''

''اچھا ہے کرنے دو۔'' اماں بولیں۔ ''کم از کم اسے اتنا احساس تو ہے ناں، کچھ نہ کچھ رکھتی تو رہتی ہے۔ آئندہ کے لئے۔ ایک تم نکھٹو ہو۔''

''اماں مجھ سے نہیں پھوڑی جاتی آنکھیں۔''

''بیزار کن موضوع چھڑتے پر اس نے بھی وہاں سے اُٹھ جانا مناسب جانا اور ریشم کے پیچھے پیچھے کچن میں چلی آئی۔

''ریشم! چائے میں بھی پیوں گی۔'' پیڑھی کھسکا کر وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

''جی۔ اچھا۔''

''اور میں بھی۔'' شبنم بھی چلی آئی۔

''تمہیں فرصت مل گئی۔'' اس نے شبنم کو گھورا۔

''ہاں۔ بس کل تک مکمل کر لوں گی۔'' اس نے پیر پسار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''پھر کیا ہو گا؟'' وہ ہنسی۔ ''پرسوں سے کوئی نیا پروجیکٹ شروع کر دو گی۔ کوئی کپڑا رکھا ہوا ہو گا تم نے سنبھال کر۔''

''اماں سے کہہ رہی تھیں۔'' آتی ہوئی مریم بولی۔ ''وہ جو ہرا جوڑا اماں لائی تھیں ناں پچھلے سال۔ وہ مانگ رہی تھیں۔ اب اس پر خدا جانے کیا بیل بوٹے بنائیں گی۔''

''تو تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' وہ چڑ گئی۔ ''شوق ہے میرا۔''

''شوق کے ساتھ ساتھ جہیز بھی بن رہا ہے'' ریشم شوخی سے بولی۔ اور وہ چاروں ہنس دیں۔

''سچ شبنم۔ تم نے عنبرین کی کزن کو نہیں دیکھا۔ اتنی پیاری ہے۔ میں تو وقار بھائی سے کہہ رہی تھی شادی کر لیں۔ راضی ہی نہیں ہوئے۔''

''اچھا۔ کیا کہتے ہیں؟'' وہ دلچسپی سے پوچھنے لگی۔

''کہہ رہے ہیں کہ تم سب جو بانس جیسے قد نکال رہی ہو تمہیں کس خانے میں فٹ کروں۔''

''ویسے بجو کہتے تو ٹھیک ہیں۔'' ریشم بولی۔ آپ اور شبنم آپی تو فارغ ہو لیں پہلے۔''

''اچھا تم چپ رہو۔'' وہ بھنائی۔

''کیوں بجو۔ ہمیں اتنا شوق ہے آپ کی شادی کا۔'' مریم نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ''پتا نہیں ہمارے گھر رشتے آنے کب شروع ہوں گے۔''

حسرت سے کہی ہوئی اس بات پر نیلم اور شبنم کو بے ساختہ ہنسی آئی۔

''میری تو دو ہی خواہشیں ہیں۔'' ان دونوں کے ہنسنے سے بے نیاز وہ بولتی رہی۔ ''ایک نیلم بجو کی شادی اور دوسری زلفی کے انجینئر بننے کی۔''

''اور میری خواہش ہے وقار بھائی کی دلہن لانے کی۔'' نیلم بھی حسرت سے بولی۔ پتا نہیں میری یہ خواہش کب پوری ہوگی۔''

گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے وہ اس سوچ میں گم ہوگئی۔ باپ جیسے شفیق اور مہربان بھائی سے اسے ناقابل بیان محبت تھی۔ وہ بچپن سے ہی ایسے تھے۔ نرم اور سادہ مزاج۔ ان سب کا بے انتہا خیال رکھنے والے۔ سب بہن بھائیوں سے بے تحاشا پیار کرنے والے۔

سات سال پہلے جب ان لوگوں کے والد کا انتقال ہوا تھا تب انہیں لگتا تھا جیسے کسی نے ان سب کو ایک لق و دق صحرا میں لا کھڑا کر دیا ہو۔ اماں ان سب کو دیکھتی تھیں اور بہت بار بار کر رو یا کرتی تھیں۔ اور ان کے اسی رونے نے شاید وقار بھائی کو ان کی عمر سے دوگنا بڑا کر دیا تھا۔ وہ اس وقت انٹر کا امتحان دے رہے تھے۔ امتحان دینے کے بعد انہوں نے اپنی تمام خواہشات کا گلا گھونٹ کر خود کو شاید ہمیشہ کے لیے اپنے گھر والوں کے لیے وقف کر دیا۔

ان کے والد واپڈا کے محکمے میں ایک اچھی پوسٹ پر تھے۔ ان کے ایک گہرے دوست نے اپنی کوششوں سے اپنے تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے وقار بھائی کو اسی محکمے میں ایک خالی جگہ پر رکھوا دیا۔ وقار بھائی نے ٹیوشنز پڑھائی۔ پارٹ ٹائم جاب کیں۔ پرائیویٹ امتحان دیتے رہے اور بالآخر اپنی محنت اور لگن سے ایک اچھی پوست تک پہنچ گئے۔

نیلم چونکہ باقی بہن بھائیوں سے بڑی تھی اور ان سب کی نسبت زیادہ حساس بھی۔ اس لیے باقیوں کی نسبت اس کے دل و دماغ پر اپنے بھائی کی انتھک محنت کا احساس زیادہ گہرا نقش تھا۔ اس نے انہیں صبح سے رات گئے تک بے تکان کام میں مصروف دیکھا تھا۔ اور یہ احساس بہت شدید تھا کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا تھا اپنے بہن بھائیوں کی خوشیوں اور ان کے روشن مستقبل کے لئے کیا تھا۔ اسی احساس کی بنا پر اس کے دل کی جڑوں میں اپنے پیارے بھائی کی محبت، اور ان کے احسان جمے بیٹھے تھے۔

انہوں نے ان سب کو اتنا پیار، اتنا تحفظ دیا تھا کہ شاید اُن کا حقیقی باپ بھی نہ دے پاتا۔ جس وقت ان کے والد کا انتقال ہوا، انعم ایک مہینے کی تھی۔ اس نے تو اپنے باپ کے لمس کو بھی ٹھیک طرح سے محسوس نہ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وقار بھائی انعم کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔

''بجو۔ کس سوچ میں گم ہیں آپ؟'' ریشم نے اس کا کاندھا ہلایا تو وہ چونک گئی۔

''آں۔ کچھ نہیں۔''

''یہ چائے لیں ناں۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

''ہوں اس نے کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔



سب لوگ عثمان بھائی کو لینے ایئر پورٹ گئے ہوئے تھے..... اتفاق سے اسے صبح ہی انفلوئنزا کا اٹیک ہوا تھا۔ لہٰذا ان سب کے ساتھ جانے کی شدید خواہش کو دل میں ہی دفن کر کے، اب وہ بستر میں گھسی ہوئی تھی۔

''بی بی۔ چائے اور لا دوں؟'' نسرین پوچھ رہی تھی۔

''نہیں نسرین۔ ابھی نہیں۔'' اس نے بوجھل آواز میں کہا۔ ''تم جاؤ میں خود بلا لوں گی اگر ضرورت ہوئی تو۔''

اسے بھیج کر وہ آنکھیں موند کر انگلیوں سے کنپٹیاں دبانے لگی۔

جس وقت وہ سب شور مچاتے اندر داخل ہوئے وہ غنودگی کے عالم میں تھی۔ نیچے سے آتی شور وغل کی آوازوں پر اس کے حواس بیدار ہو گئے۔

چادر لپیٹ کر اس نے چپلیں پہنیں اور سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

''آیئے آیئے۔ میڈم الماس طاہر خان۔'' عدنان نے اس کا ہمیشہ والا استقبال کیا۔ صوفے پر بیٹھے عثمان خان نے دلچسپی سے اپنی گلابی چہرے والی کزن کو دیکھا۔

''کیسی ہو الماس؟'' وہ مسکرائے۔

''فی الحال تو ٹھیک نہیں ہوں۔'' وہ بھی مسکرائی۔ ''امید ہے جلدی ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''ضرور!'' وہ مسکرائے۔

''بیٹا! تم اگر آرام کرنا چاہو تو کرلو۔ یہ شیطانوں کا ٹولہ تو رات گئے تک یونہی تمہارے اردگرد جما رہے گا۔'' راشدہ خاتون نے انہیں جیسے ڈرایا۔

''میں بھی تو یہی چاہتا ہوں چچی۔ ترسا ہوا ہوں ان چہروں اور ان آوازوں کو۔''

''خصوصاً میرے چہرے کو'' عدنان بے تابی سے بولا۔

''اور میری آواز کو۔'' کاشف نے بھی تیزی دکھائی۔

''کیوں بھائی جان وہاں گدھے نہیں ہوتے؟'' عمران نے بڑی معصومیت سے سوال کیا تو سوائے ان دونوں کے سب زور سے ہنس

دیے۔

"پتا ہے بھائی۔ہم لوگ بڑی شاندار پارٹی ارینج کریں گے آپ کے آنے کی خوشی میں۔" سیماب بھائی سے جڑی بیٹھی تھی۔

"اچھا۔" وہ ہنس دیے۔

"ہوں۔اور پتا ہے بھائی۔ان لڑکیوں نے پروگرام بنایا ہے آپ کو پھانسنے کا۔اپنی چڑیلوں جیسی ڈھیروں سہیلیاں بلالیں گی اور آپ سے ان میں کسی ایک کو پسند کرنے کا کہہ کر آپ کی قوت حوصلہ اور قوت فیصلہ آزمائیں گی۔" عدنان نے اسے اطلاع پہنچائی۔

"چڑیل ہوں گے آپ کے دوست۔" سیماب چڑ گئی۔

"جی نہیں۔چڑیل مونث ہوتی ہے ہمیشہ۔میرے سارے دوست تو بھوت ہیں کم بخت۔"

"اس کے اطمینان سے بولنے پر عثمان بھائی کو ہنسی آ گئی۔

"پھر۔بھائی پسند کریں گے ناں ان میں سے کسی ایک کو۔" مہوش نے بے صبری سے پوچھا۔

"کیوں بھئی۔ضروری ہے ان میں سے ہی کسی کو پسند کرنا۔" انہوں نے شرارت سے پوچھا۔" ان کے علاوہ کوئی لڑکی پسند کرنے کی اجازت نہیں ہے کیا؟"

"اجازت ہے۔بالکل ہے۔لیکن جو کریں جلدی کریں۔ہم چاہتے ہیں۔ہنگامہ،ہلا گلا۔جو کہ آپ کی رسم سہرابندی پر کیا جائے گا۔"

"میں نے سنا تھا تم بہت بولتی ہو۔" انہوں نے چپ چاپ بیٹھی،سب کی باتیں سنتی الماس کو مخاطب کیا۔" میں نے غلط سنا تھا یا اس وقت خاموش ہو؟"

"آپ نے ٹھیک سنا تھا۔" وہ ہنسی۔" لیکن میرا سر اس وقت درد سے پھٹ رہا ہے۔"

"چلو۔تم پھر جا کر آرام کرلو۔رات کے کھانے پر باتیں ہوں گی۔"

"ہوں۔" وہ سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔" میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"عثمان کی نگاہیں اس کے تعاقب میں اوپر تک گئیں۔

نرم و نازک،اکھڑ اور مغرورانہ مزاج والی یہ گلابی سی لڑکی انہیں پہلی نگاہ میں بھا گئی تھی۔اس کے شانوں پر لہراتے سیاہ سلکی بال ان کی نگاہوں میں اپنی لچک چھوڑ گئے تھے۔

"بھائی۔" عدنان نے ان کو بلایا۔" کہاں ہیں؟"

"یہیں ہوں۔" وہ چونک کر ہنس دیے۔



سارے گملے ہٹا کر پائپ سے نکلتی پانی کی تیز دھار سے وہ دیوار کو دھو رہی تھی۔ شلوار کے پائنچے پنڈلیوں تک چڑھائے، دوپٹا کمر سے باندھے، بڑی تندہی سے اپنے کام میں مگن نیلم کو برآمدے میں موڑھے پر بیٹھے یوسف بڑی محویت اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

جانے ان کی نگاہوں کی تپش تھی یا کوئی اور وجہ کام کرتے کرتے اس نے گردن موڑ کر دیکھا اور اس کے ہاتھوں سے پائپ نکل کر فرش پر گر گیا۔

جلدی جلدی پائنچے نیچے کر کے اس نے دوپٹا کھولا اور نل بند کر کے اندر آ گئی۔

''آپ کب آئے؟'' اسے حیرانی تھی۔

''تھوڑی دیر ہوئی۔'' وہ ہنس دیے۔

''بتایا کیوں نہیں؟'' اسے شرمندگی تھی اپنے سابقہ حلیے پر۔

''کیوں بتاتا؟'' انہوں نے شرارت سے اسے گھورا۔

''دروازہ کس نے کھولا۔''

''معلوم نہیں۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ''کھلا ہوا تھا۔ ویسے یہ سوالات کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ کیا کوئی بڑا جرم سرزد ہو گیا مجھ سے؟''

''جی۔ جی نہیں تو۔''

''وہ ہنس دیے۔''

''اماں سے مل لئے آپ؟''

''بیٹھو تو جاؤ۔'' انہوں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ چچی سو رہی ہیں۔''

''اچھا۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''ناصر مجھے بتائے بغیر نکل گیا گھر سے۔ تبھی دروازہ کھلا ہوا تھا۔''

''اور اگر میرے بجائے کوئی چور وغیرہ گھس آتا تو؟''

''تو؟ مر جاتی میں اور کیا ہوتا۔'' وہ ہنسی۔

''نہیں بھئی۔ اب اتنا ظلم مت کرنا۔'' وہ آہستہ سے بولے۔

''چائے لاؤں آپ کے لئے؟''

''اوں ہوں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پلیز بیٹھی رہو۔''

''ان کا انداز کچھ جداگانہ تھا۔ نیلم کی دھڑکن بے ربط ہونے لگی۔

''نیلم۔'' وہ کہتے کہتے ہونٹ دانتوں میں دبا کر رہ گئے گویا جو کچھ کہنے جا رہے تھے وہ ان کے اپنے لئے بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔

اس حساس نے نجانے کیوں اسے ایک تقویت سی بخشی اور وہ اپنی گھبراہٹ بھول کر ان کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہونے لگی۔

''جی کہیے؟'' اب وہ قدرے شرارت سے بولی۔

''میں۔'' انہوں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''میں کہہ رہا تھا کہ۔''

نیلم نچلا ہونٹ دبا کر ہنسی روکنے لگی۔

''اچھا۔ چلو چائے ہی بنا دو۔ انہوں نے بڑی بے چارگی سے کہا۔ گویا اقرار کیا کہ اقرار محبت کے لیے جرأت رندانہ چاہیے۔

نیلم زور سے ہنس دی۔

''اچھا۔ لاتی ہوں۔''

''ہنستی ہوئی وہ باورچی خانے میں آ گئی۔ ماچس جلا کر جلتی ہوئی تیلی کو غور سے دیکھنے لگی۔ کتنے رنگ تھے جلتے ہوئے شعلے میں۔ ناچتا، تھرکتا شعلہ اسے بڑا خوبصورت زندگی سے بھرپور لگا۔

کبھی کبھی ایسے دن آ جاتے ہیں کہ شعلوں سے کھیلنے کو دل کرتا ہے۔ اس کی زندگی میں بھی شاید زندگی کی بھرپور، خوبصورت حرارت سے مزین وہ دن آ گئے تھے۔

باہر بیٹھے یوسف اسے اچانک تمام دنیا سے اچھے لگنے لگے تھے۔



''میں نے تمہیں اسی لیے بلوایا ہے۔'' وحیدہ بیگم نے انگلی پر لگا کتھا چاٹا اور پاندان بند کر کے تخت کے کونے پر رکھ دیا۔

''بس تو امی شام کو چلتے ہیں۔ آپ مٹھائی منگوا لیجیے۔'' آمنہ نے گود میں سوتی مومنہ کو آہستگی سے تخت پر لٹایا۔ ''آپ کو تو معلوم ہے ریاض کی طبیعت کا۔ آج ہی موڈ خراب کر لیا تھا صبح سے۔ اگر میں زیادہ دن رہ گئی تو مہینہ بھر بات نہیں کریں گے۔''

''ہاں بیٹی۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''جانتی ہوں ان مردوں کی خصلت کو میں۔ عمر گزاری ہے میں نے یہی کچھ دیکھتے اور سہتے۔ تم فکر مت کرو۔ کل صبح انشاء اللہ میں تمہیں واپس پہنچوا دوں گی۔ اور پھر اپنے گھر کی ہی بات ہے۔ زبیدہ سے کہوں گی کہ ابھی جواب دو۔ اور اس بے چاری نے کون سے تکلفات میں پڑنا ہے۔ پانچ بیٹیاں ہیں اس غریب کی۔ اس کا تو بوجھ ہلکا ہوگا۔ پھر میرے یونس اور یوسف بھی تو لاکھوں میں ایک ہیں۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ چچی جان فوراً ہاں کہہ دیں گی۔'' آمنہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''بس امی جلد از جلد یہ قصے نمٹائیں تاکہ آپ کو کچھ آرام ملے۔ آپ کی حالت دیکھ کر میرا بہت دل کڑھتا ہے۔ ویسے بھی نیلم اور شبنم دونوں ہی عادتاً بھی بہت اچھی ہیں۔ وہ روایتی ساس بہو والا معاملہ تو ہوگا ہی نہیں۔ یہ ڈراما تو ہماری سسرال میں چلتا ہے۔''

"ہاں بیٹی۔ اپنے اور پرائے میں یہی فرق ہوتا ہے۔ اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے۔ اور پھر مجھے بھی وہ دونوں ایسی ہی عزیز ہیں جیسی تم۔ شبنم سے تو مجھے دلی محبت ہے۔"

"میری ساس تو کچھ اور ہی امید لگائے بیٹھی ہیں آپ سے۔" آمنہ دھیرے سے بولی۔

"وہ کیا؟"

"وہ سوچتی ہیں کہ اگر یونس بھائی کی شادی ثریا سے ہو جائے۔"

"لاکھ سوچیں وہ۔" وحیدہ بیگم نے جل کر اس کی بات کاٹ دی۔ "ایک تو مجھے یہ وٹہ سٹہ ہی پسند نہیں ہے۔ دوسرے تمہاری ساس اور تمہارے میاں نے مجھے مایوس بھی بہت کیا ہے۔ میں تو بیٹی دے کر پچھتا رہی ہوں۔ اور ایک روگ مزید پالوں۔ نہ بابا۔ میری اپنی بھتیجیاں کیا کم ہیں کسی سے لاکھوں میں ایک ہیں۔"

"ثریا بری تو نہیں ہیں امی۔" وہ دبے لفظوں میں بولی۔

"میں نے برائی کی اس کی؟ بچی تو وہ ماشاءاللہ بہت فرماں بردار اور لائق ہے لیکن بیٹی دودھ کا جلا تو چھاچھ پھونک کر پیے گا ہی۔ میں مزید کوئی تجربہ کروں بھی کیوں؟ شادی سے پہلے تو ریاض میاں بھی بہت مؤدب اور خوش گفتار بنتے تھے۔ اصل بھید تو بعد میں کھلتے ہیں۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہی تھی۔ مجھے تو خود بھی ثریا کی نسبت نیلم ہی پسند ہے۔" آمنہ خاموش ہو گئی۔

"ارے یوسف میاں ادھر تو آؤ۔" وحیدہ بیگم نے اندر آتے یوسف کو بلایا اور دوپٹے کے پلو میں بندھے روپے کھولنے لگیں۔

"السلام علیکم بھائی جان۔" آمنہ نے اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ کب آئیں آمنہ؟"

"صبح آئی تھی۔ ریاض چھوڑ گئے تھے۔"

یوسف جھک کر تخت پر سوتی ہوئی مومنہ کو پیار کرنے لگے۔

"یہ لو۔ ذرا پانچ کلو مٹھائی تو لے آؤ کسی اچھی سی دکان سے۔"

"پانچ کلو۔ خیریت؟" انہیں حیرت ہوئی۔

"تم لے آؤ۔ خیریت ہی ہے۔" وہ مسکرائیں۔

"پھر بھی پتا تو چلے چپکے چپکے میرا کہیں رشتہ تو طے نہیں کر دیا؟" وہ شرارت سے ہنسنے لگے۔

"وہی کرنا ہے۔" آمنہ بھی ہنس دی۔ "شام کو جا رہے ہیں میں اور امی جان۔"

"کہاں؟" وہ یک لخت سنجیدہ ہو گئے۔

"زبیدہ کے ہاں جا رہی ہوں تمہاری اور یونس کی بات کرنے۔" وحیدہ بیگم نے انہیں آگاہ کر دینا مناسب جانا۔ "یونس کے لیے نیلم کو

اور تمہارے لیے شبنم کو مانگوں گی۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" وہ پریشان ہو گئے۔

"لو۔ یہ کیا بات ہوئی۔" وہ حیران ہوئیں۔ "میاں جیسے ہوتا آیا ہے ویسے ہی ہوگا۔ کوئی انوکھا کام نہیں کروں گی میں۔"

"نہیں امی۔ یہ نہیں ہوسکتا۔" وہ گھبراہٹ میں ان کے پاس آبیٹھے۔ "م......میں شبنم سے شادی نہیں کرسکتا۔ میں۔ میں۔"

"کیا میں، میں کی رٹ لگائی ہے۔ اور کیوں نہیں کرو گے شبنم سے شادی؟" وہ آگ بگولہ ہو گئیں۔ "کان کھول کر سن لو یوسف۔ شبنم مجھے بے حد عزیز ہے اور اس گھر میں دُلہن بن کر آئے گی وہ۔"

"بے شک آئے لیکن یونس بھائی کی دُلہن بن کر۔ امی۔ میں۔" وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ دل کی بات زبان پر کیسے لائیں۔ ماں کے سامنے کبھی اس طرح نہ کھلے تھے۔ ایک حجاب کا پردہ ہمیشہ حائل رہا تھا۔

"یوسف۔ میں نے تمہیں فیصلہ سنایا ہے تمہاری رائے نہیں مانگی۔" انہوں نے دوٹوک کہا۔ "اور میں نے کبھی تم لوگوں کو اجازت بھی نہیں دی ان معاملات میں ٹانگ اڑانے کی۔ مجھ سے ہرگز یہ مت کہنا کہ تمہیں کوئی اور لڑکی پسند ہے اور تم کہیں اور شادی کرنا چاہتے ہو۔ شبنم کو میں نے ہمیشہ تمہاری دُلہن کے روپ میں دیکھا ہے۔ اور میں اپنے فیصلے میں، ہرگز کوئی ترمیم نہیں کروں گی۔"

"امی۔ امی پلیز۔" انہوں نے التجا کی۔ "زندگی میری ہے۔ فیصلہ کرنے کا حق آپ کا سہی لیکن کم از کم میری خوشیوں کا کچھ تو خیال کریں۔"

"کیا چاہتے ہو؟" انہوں نے خشمگیں نگاہوں سے انہیں گھورا۔

"میں نیلم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" نظریں پھیر کر انہوں نے دل کی بات کہہ دی۔

"نیلم میں ایسی کیا خوبی ہے جو شبنم میں نہیں ہے؟" انہوں نے دریافت کیا۔

"شبنم میں ایسی ہزاروں خوبیاں ہوں جو نیلم میں نہ ہوں لیکن مجھے بہرحال نیلم پسند ہے۔"

"دیکھو یوسف میاں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ زبیدہ سے مجھے مانگنا صرف شبنم کا ہاتھ تھا۔ لیکن وہ یہ اعتراض اُٹھا سکتی ہیں کہ بڑی کو چھوڑ کر چھوٹی کو کیوں مانگ رہی ہو لہٰذا سوچ بچار کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں کو ایک ساتھ مانگ لوں۔"

"امی! آپ کا فیصلہ بجا سہی۔" انہوں نے ان کی بات کاٹ ڈالی۔ "صرف ذرا سی ترمیم کر لیجیے۔ شبنم کو یونس بھائی کے لیے مانگ لیں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" وہ بھنائیں۔ "چھوٹی کو بڑے کے لیے اور بڑی کو چھوٹے کے لیے۔"

"حرج بھی کیا ہے؟"

"دنیا والوں سے کیا کہوں؟ یہ کہ لاڈلے سپوت نے عشق بڑی سے فرمالیا ہے؟"

"مجھے دنیا والوں کی پروا نہیں ہے اور یہ کوئی ایسی بری یا انوکھی بات تو نہیں۔ دُنیا میں لاکھوں لوگ پسند سے شادی کرتے ہیں۔"

"کرتے ہوں گے۔ ہمارے خاندان میں ابھی یہ بے حیائیاں عام نہیں ہوئیں۔ میں زبیدہ سے کیا کہوں گی؟ اور وہ خود کیا سوچے گی اپنی بیٹی کے متعلق۔"

"اس بے چاری کیا قصور؟" وہ جھلا کر رہ گئے۔

"جانتی ہوں کہ ایسے معاملات میں لڑکیاں کتنی نروٹھ ہوتی ہیں۔" وہ تختی سے بولیں۔

"میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں میاں۔ عمر گزری ہے اس جہاں میں میری۔ میں کہے دیتی ہوں یہ عشق کا بھوت اُتار ڈالو۔ شادی تمہاری شبنم سے ہی ہوگی۔"

"بے وجہ کی ضد ہے امی یہ۔" وہ تیزی سے بولے۔ "اور اگر آپ ایک لایعنی بات پر ضد کر سکتی ہیں تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ نہیں کرنی مجھے شادی۔"

راستے میں پڑے موڑھے کو لات مار کر گراتے ہوئے وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے گھر سے نکل گئے۔

"اب کیا ہوگا امی؟" آمنہ فکرمندی سے بولی۔

"کچھ نہیں ہوگا۔" انہوں نے بے پروائی سے ہاتھ جھاڑا۔ "چڑھ جاتے ہیں عقل پر ایسے بھوت اس عمر میں۔ خود ٹھیک ہو جائے گا۔"

"لیکن فی الحال ہمارا چچی جان سے بات کرنا مناسب نہ ہوگا۔" وہ تذبذب سے بولی۔

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ سوچ کر بولیں۔ "خیر دیکھا جائے گا۔ اب ایک دو دن ٹھہر جاتے ہیں۔ شام کو یونس آئیں تو تم چلی جانا اپنے گھر۔"

"جی۔" اس نے سر ہلا دیا۔



"بس یار۔ عثمان جب سے آئے ہیں ناں۔ ایک ہنگامہ برپا ہے گھر میں۔ سارا سارا دن تو یہ لوگ گھومتے رہتے ہیں۔ چھٹیں ہی ختم ہونے میں نہیں آرہی ہیں۔ میں نہیں آسکی تھی تو تم آجاتیں۔"

ریسیور، کان اور بائیں کندھے کے بیچ میں دبائے، نیل پالش ریموور سے صاف کرنے کے ساتھ ساتھ وہ صبا سے باتیں بھی کر رہی تھی۔

"بس میں بھی تمہارا ہی انتظار کرتی رہی۔ اور تم سناؤ تمہارے کزن کیسے ہیں؟" منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی جھاڑتے ہوں گے۔"

"بالکل غلط اندازہ لگایا ہے آپ نے۔" وہ ہنس دی۔ "عثمان تو بہت ڈیسنٹ آدمی ہیں۔ بہت بااخلاق اور باوقار۔ لگتا ہی نہیں۔ کہ انہوں نے زندگی کے سات آٹھ سال باہر گزارے ہیں۔ بڑی گاڑھی اردو بولتے ہیں۔"

"اچھا۔" صبا کو حیرت ہوئی۔ "سرپرائزنگ۔"

"ارے تم آؤ تو سہی میں ملواؤں گی تمہیں۔ دیکھنا کس قدر متاثر کن شخصیت ہے عثمان کی۔ میں تو حقیقتاً ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔"

''اچھا!'' صبا شوخ ہوئی۔ ''چلیے آپ بھی کسی سے تو متاثر ہوئیں۔ ورنہ آج تک تو صرف دوسروں کو متاثر کرتی آئی ہیں۔''

''الماس کھلکھلا کر ہنس دی۔

''تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمہاری چچی کا ارادہ ان کی شادی کا ہے فوری طور پر۔'' صبا پوچھنے لگی۔

''ہاں۔ ذکر تو کیا تھا انہوں نے ایک آدھ بار۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔ ''اب دیکھو کہاں جا کر نظر ٹھہرتی ہے۔''

''اگر اپنے گھر میں کسی پر ٹھہر گئی تو؟'' وہ بدستور شوخی اور شرارت پر آمادہ تھی۔

''اوہ۔'' الماس اس کا مطلب سمجھ کر زور سے ہنسی۔ ''ہاں۔ ایسا ناممکن تو نہیں۔''

''پھر۔ تمہارا کیا ریسپانس ہوگا الماس؟'' صبا نے دلچسپی سے پوچھا۔

''میرا ریسپانس!'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ میں انکار نہیں کروں گی۔''

''سچ۔'' صبا اُچھل پڑی۔

''ہاں ہاں۔ تم عثمان کو ایک نظر دیکھ لو۔ ان سے چند لمحے باتیں کر لو تو تمہیں خود ہی اندازہ ہو جائے کہ کوئی لڑکی جو کسی دوسری جگہ انٹرسٹڈ نہ ہو۔ وہ عثمان کے لیے ہرگز انکار نہیں کرے گی۔ ان کا ساتھ تو کسی بھی لڑکی کو پراؤڈ کر سکتا ہے۔''

''بھئی اب تو مجھے واقعی اشتیاق ہو گیا ہے ان سے ملنے کا۔ کب رکھ رہے ہو تم لوگ پارٹی؟''

''بس اگلے ہفتے کسی بھی دن۔''

''اچھا۔ تم آ جاؤ ناں کسی دن۔ اتنی ساری باتیں جمع ہو گئی ہیں۔'' صبا نے اصرار کیا۔

''ہاں میں آؤں گی ایک دو دن میں۔ عثمان کے لیے کوئی گفٹ بھی لینا ہے ناں۔ دونوں ہی چلیں گے ساتھ۔''

''او۔ کے۔ خدا حافظ۔''

''اللہ حافظ۔''

''وہ فون رکھ کر ریمور کی بوتل بند کرنے لگی اور روئی کا پھاہا ٹیبل پر رکھی کرسٹل کی ایش ٹرے میں ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

''اوہ۔'' پیچھے والے صوفے پر عثمان کو بیٹھا دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔ ''آپ۔''

''جی میں۔'' وہ مسکرائے۔ ''کیوں میرا وجود پریشانی کی علامت ہے کیا؟''

''جی نہیں۔'' اس نے بالوں کو جھٹک کر اپنی ازلی خود اعتمادی بحال کی۔ ''کب آئے آپ؟''

''بس ابھی۔ جب تم نے فون بند کیا۔'' انہوں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں صبا سے بات کر رہی تھی۔'' وہ جانے کا ارادہ ملتوی کر کے ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''میری بہت ہی اچھی اور واحد دوست ہے۔ آپ سے ملنے کا شوق ہو رہا ہے۔''

"ظاہر ہے۔" وہ ہنس دیے۔ "اتنی تعریفیں سنے گی تو شوق تو ہوگا ہی۔"

"اوہ۔" وہ ہونٹ سکیڑ کر انہیں غور سے دیکھنے لگی۔ "آپ کو کیسے علم کہ میں نے اس سے آپ کی تعریفیں کی ہوں گی؟"

"بھئی اب چھپ کر گفتگو سننے کا الزام مت لگانا۔ یہ تو میں نے ویسے ہی کہہ دیا۔ ازراہ تفنن۔"

"اوہ گاڈ۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے تو آپ ذرا سلیس قسم کی زبان استعمال کیا کریں۔ یہ تفنن اور تنزل مجھے نہیں آتے۔"

"ہا۔ ہا۔" انہوں نے چھت کو دیکھتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "کمال ہے۔ آپ اپنی زبان سے اس قدر نابلد ہیں؟"

وہ برا مان گئی۔

"آئی ایم سوری۔ میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہ تھا۔"

"آپ سے کس نے کہا کہ میں شرمندہ ہوں؟" اس نے بڑی ادا سے بال جھٹکے۔

عثمان بڑی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔

بڑی کشش، بڑا سحر تھا اس میں۔ عجب بانکپن کی ادا تھی، عجب غرور آمیز بے نیازی تھی۔ بقول غالب۔ سادگی و پرکاری، بے خودی وہشیاری۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟" وہ نگاہوں کی تپش سے گھبرانے والی، شرمیلی قسم کی لڑکی نہ تھی بلکہ وہ نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر مخاطب کی محویت سے اپنے حسن کا خراج وصول کیا کرتی تھی۔

"جو دیکھ رہا ہوں جلد ہی بتا بھی دوں گا۔" وہ مسکرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کے چلے جانے کے بعد وہ تھوڑی دیر تک وہیں بیٹھی ان کے الفاظ پر غور کرتی رہی پھر کاندھے اچکا کر خود بھی کھڑی ہو گئی۔



"ناممکن؟" اندر آتے ہوئے وہ مایوسی سے بولی۔ "مجھے تو لگتا ہے میں آپ کے "ان" کا دیدار کرنے کا شرف حاصل کر ہی نہ پاؤں گی۔"

"گیلے بالوں میں برش کرتی صبا، ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اس کا عکس دیکھ کر ہنس دی۔

"تو اس کا مطلب ہے پچھلے آدھے گھنٹے سے آپ اس لیے نیرس پر گئی ہوئی تھیں۔

"ظاہر ہے۔ گدھا تو میں ہوں نہیں جو ان کے لان کی ہری ہری گھاس دیکھ کر خوش ہوتی رہوں۔"

"اور اتنے بے وقوف تو وہ بھی نہیں ہیں جو مارچ کی اچھی خاصی گرم دھوپ میں صرف آپ کو دیدار کرانے کی خاطر اس وقت لان میں چہل قدمی فرمائیں۔"

"اوہو۔ یعنی اقربا پروری کی حد کر دی تم نے صبا۔" الماس نے آنکھیں نکالیں۔ "جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں تمہاری نئی نویلی محبت کو اور میرے سامنے تم اُن کی سائیڈ لے رہی ہو؟"

"سائیڈ کہاں لے رہی ہوں" کوٹ شوز میں پیر گھساتے ہوئے وہ بولی۔ "حقیقت بیان کر رہی ہوں میں۔"

"ویسے نام مجھے پسند آیا ہے۔ فیروز احمد۔" الماس نے سوچ کر کہا۔

"وہ خود بھی پسند آئیں گے۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "اب چلیں؟"

"ظاہر ہے۔ میں کب سے تمہارے تیار ہونے کا انتظار کر رہی ہوں۔ اب مزید کس بات کا انتظار کروں۔"

"الماس نے بیڈ پر رکھا شولڈر بیگ اُٹھایا اور ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی ہو کر برش کرنے لگی۔

"میں امی کو بتا دوں۔ تم برش کر کے باہر آجاؤ۔"

"صبا کہتی ہوئی باہر نکلی۔ برش جگہ پر رکھ کر وہ اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔

"امی! ہم لوگ کچھ دیر میں آجائیں گے۔" صبا نے کچن میں کام کرتی امی کو بتایا اور الماس کے ہمراہ میں باہر نکل آئی۔

"تمہیں کچھ نہیں لینا؟" الماس کار کا دروازہ کھولتے ہوئے اس سے پوچھنے لگی۔

"اوں ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی پرسوں ہی تو میں اور امی شاپنگ کر کے آئے ہیں۔ اور امی کے ساتھ جانے کا فائدہ یہ ہوتا کہ میں بہت سی ایکسٹرا چیزیں بھی خرید لیتی ہوں۔ جن کی مجھے قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔"

"اچھا!" اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ "پھر تو جلدی ہی لوٹ آئیں گے کیونکہ مجھے صرف عثمان کے لیے گفٹ ہی لینا ہے۔"

"کیا دو گی؟"

"جو پسند آجائے۔"

"اس نے کاندھے اچکا دیے اور صبا نے دل تھام لیا۔ کیونکہ الماس جب گھر سے فیصلہ کر کے جاتی تھی کہ اسے۔ کیا خریدنا ہے تب بھی وہ غیر مطمئن عادت کی وجہ سے چیز منتخب کرنے میں گھنٹوں لگا دیتی تھی چہ جائیکہ اس نے ابھی کچھ سوچا ہی نہ تھا۔

''آج تو گھر لوٹنا مشکل ہے۔'' اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور الماس ہنس دی۔

اور اس کا خدشہ درست نکلا۔ دو گھنٹے تک الماس نے صرف چیزیں دیکھنے میں ہی گزار دیے۔

''الماس۔ میں نے توبہ کی جو میں کبھی تمہارے ساتھ بازار آؤں۔'' مختلف پرفیومز چیک کرتی الماس سے اس نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

نجانے کتنے پرفیومز شوکیس سے نکلوا کر وہ کاؤنٹر پر ڈھیر کر چکی تھی اور ابھی مزید نکلوانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

''کیا ہے صبا۔ اب گفٹ دے تو انسان اچھا دے۔ سر سے بوجھ تو نہیں اتارنا ناں؟''

''صبا بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''ہیلو گرلز۔'' کسی کے انتہائی بے تکلفی اور خوشدلی سے مخاطب کرنے پر دونوں نے چونک کر نووارد کو دیکھا۔

''اوہ آپ۔'' صبا نے سامنے کھڑے شہروز کو دیکھ کر گہرا سانس لیا۔

''جی میں۔'' وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر ذرا سا جھکا۔ ''اب یہ مت کہیے گا کہ پہچانا نہیں۔''

''نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔'' صبا مسکرا دی۔

''ہائیں!'' اس نے کاؤنٹر پر رکھی پرفیوم کی بوتلیں دیکھ کر حیرانی سے کہا۔ ''خدانخواستہ کہیں آپ چھاپہ مارنے تو نہیں آئیں؟ کیا کسی نے مخبری کی ہے کہ یہاں اسمگلنگ کا سامان فروخت ہوتا ہے؟''

''آپ کی تعریف؟'' الماس نے برا سا منہ بنایا۔

''ہائے! پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

''یہ شہروز ہیں۔'' صبا مسکرائی۔ ''ہمارے برابر والے مکان میں رہتے ہیں۔''

''او۔'' الماس نے ہونٹ سکیڑ کر اس کا جائزہ لیا۔

''ماشاءاللہ کہہ دیجیے۔ مجھے بہت جلدی نظر لگ جایا کرتی ہے۔'' وہ مسمسی سی صورت بنا کر بولا۔

صبا کو ہنسی آگئی جبکہ الماس کے ابرو کھنچ گئے۔

''ان کو کسی ڈاکٹر نے مسکرانے سے پرہیز بتایا ہے؟'' وہ رازداری سے صبا سے پوچھنے لگا۔

''میں فضول باتوں پر ہنسنا یا مسکرانا حماقت سمجھتی ہوں۔'' الماس نے اپنی پشت پر اس کی سرگوشی سن لی تھی۔

آپ نے آج کر لیے پکائے ہیں؟'' وہ بدستور صبا سے مخاطب رہا۔

''جی نہیں!'' وہ اس کا مطلب نہ سمجھ پائی۔

''بھولیاں؟''

"وہ کیا ہوتی ہیں؟" وہ مزید حیران ہوئی۔

"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!" وہ مایوس ہو گیا۔ "دونوں سہیلیوں کی سینس آف ہیومر کمزور ہے۔"

اس بات پر الماس بے ساختہ ہنس دی۔

"لیجیے۔" وہ صبر سے گویا ہوا۔ "مسکرائیں بھی تو میری ہی بات کی نفی کے لیے۔ بائی دا وے خریدنا کیا چاہ رہی ہیں آپ؟"

اس کے سامنے چیزوں کا ایک ڈھیر دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"اپنے کزن کے لیے گفٹ لینا ہے کوئی اچھا سا۔ کچھ پسند ہی نہیں آ رہا۔" وہ مایوسی سے بولی۔

"کس ٹائپ کے ہیں آپ کے کزن؟"

"کیا مطلب؟"

"بھئی کیسا ذوق رکھتے ہیں؟ کیا پسند کرتے ہیں؟ اگر میری طرح شوخ و شریر اور خوش مزاج ہوں تو جو کچھ دیں گی الحمدللہ کہہ کر قبول کر لیں گے۔ بہروز بھائی جیسے سوبر اور کم گو ہوئے تو انہیں کف لنکس، کوئی مینٹل پین یا صوفیانہ سے رنگ کی ٹائی ہی پسند آئے گی۔ فیروز بھائی کی طرح کتابی کیڑا ہوئے تو مشکل ہے کہ کتابوں کے سیٹ کے علاوہ کوئی شے پسند آئے۔"

"ونڈر فل!" الماس اچھلی۔ "ہاں صبا انہیں مطالعے کا بے اندازہ شوق ہے۔ میرا خیال ہے انہیں کتابوں کا اچھا سا سیٹ پریزنٹ کروں۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" فیروز کا ذکر آتا اور صبا کے لب نہ مسکراتے، بھلا کیسے ممکن تھا۔

"تھینک یو سو مچ مسٹر شیروز" الماس نے پہلی مرتبہ بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ "آپ بڑے کام کے آدمی نکلے۔"

"جی ابتدائے عشق ہے" اس نے گردن خم کی۔

"جی؟" الماس نے تیزی سے تیور بدلے۔

میرا مطلب ہے آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔" اس نے گھبرانے کی ایکٹنگ کی، صبا اور الماس دونوں ہنس دیں۔

"آپ دونوں خواتین کے انداز کہہ رہے ہیں کہ اب مجھے چلنا چاہیے۔" اس نے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ "ہاں مس صبا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ

چمن اُداس ہے یارو، صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

اس نے "وہ" پر زور دیا۔

"کون؟" صبا کا رنگ پل بھر میں تبدیل ہو گیا۔

''فیض احمد فیض۔'' وہ زور سے ہنسا۔ ''تو آپ نے جواب میں کچھ کہنا ہے؟''

''جی؟ کس کے جواب میں؟؟'' وہ فوراً ہراساں ہو جایا کرتی تھی۔

''شعر کے۔ جواب میں! ڈرتی کیوں ہیں اتنا؟'' وہ مسکرایا۔ ''مت ڈرا کریں۔ راز کی بات یہ ہے کہ میں آپ کا ہم خیال ہوں۔ اوکے لیڈیز۔ پھر ملیں گے۔'' مڑ کر وہ خراماں خراماں چلا گیا۔

''یہ کچھ کچھ پاگل ہے یا تم دونوں اشاروں میں باتیں کر رہے تھے؟'' الماس نے اسے گھورا۔

''میری تو اپنی خاک سمجھ میں نہیں آیا۔'' صبا جھنائی۔ ''کیا کہہ جاتا ہے کچھ پلے نہیں پڑتا۔ بس اتنا مجھے پتا ہے کہ اسے میرے معاملے کا کچھ کچھ علم ہے۔''

''کچھ کچھ نہیں بہت کچھ۔'' الماس سوچ کر بولی۔

''اب یہاں سے کچھ نہیں لینا تو چلیں؟ صبا اکتا کر بولی تھی۔

''ہاں چلو۔''

دونوں آگے بڑھ گئیں۔

٭......٭......٭

''امی حضور!'' جھولے میں الٹے لیٹ کر پینگیں کھاتے ہوئے اس نے عفت خانم کو مخاطب کیا۔

''جی بیٹے حضور۔ فرمائیے۔''

''امی حضور۔ ہمارا دل اس تنہائی اور ویرانی خانہ ساز سے اکتا گیا ہے۔''

عفت خانم کو ہنسی آ گئی۔

''تم کیا بکتے ہو شہروز میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''یہ گلہ صرف آپ ہی کو نہیں۔ بہت سے۔ بلکہ سارے لوگوں کو ہے۔'' وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ میری عام فہم اور سادہ زبان کیوں نہیں سمجھ پاتے۔''

''اس لیے کہ تم عام فہم اور سادہ زبان میں بات کرتے ہی نہیں ہو۔''

''فی الحال تو ہم یہ فرما رہے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو ناصر کاظمی کا دیوان محسوس کر رہے ہیں۔ یعنی تنہا، اداس اور افسردہ۔''

''وہ کیوں بھئی۔''

''وہ اس لیے کہ اپنے دل کی بات کہنے اور سننے کے لیے ہمیں ایک اچھے سامع کی ضرورت ہے جو اس گھر میں دستیاب نہیں۔ جتنا بے وفا نکلی۔ ہم سے مڈبھیڑ ہوتی بھی ہے تو دامن بچا کر گزر جاتی ہے۔''

''تمہاری بے سروپا اور لایعنی باتوں کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے۔اور جمنا کو میں نے خود منع کیا ہے تمہیں سرچڑھانے سے۔''

''ہائیں!'' اس نے حیرت کا انتہائی اظہار کیا۔یعنی دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف۔اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی؟ والدہ محترمہ ہم آپ سے یہ امید نہ رکھتے تھے۔شہزادہ سلیم کا دل ٹوٹ گیا۔''

عفت خانم مسکراتی رہیں۔

''خیر۔یہ بحث طلب مسئلہ بعد میں نمٹایا جائے گا ہم اپنے اصل کی طرف لوٹتے ہیں۔ہم کہہ رہے تھے کہ اب ہم ماشاءاللہ عاقل و بالغ ہو چکے ہیں اور اب اس گھر میں شہنائی کی آواز گونجنی ہی چاہیے۔''

''ہیں؟'' انہوں نے آنکھیں نکالیں۔''بے شرم لڑکے حیا کرو۔تم سے دو بڑے بھی ہیں۔مجال ہے جو کبھی اس بے حیائی کا مظاہرہ کیا ہو۔''

''امی حضور ہم اس سے بحث کر چلتے ہیں۔جو رستہ عام ہو جائے۔ویسے آپ نے ہماری باتوں کا انتہائی غلط مطلب اخذ کیا ہے۔ہم نے شہنائی کی آواز کو اپنے عاقل و بالغ ہونے سے ہرگز نہیں ملایا۔ہمارا اشارہ ''انہی'' دو بڑوں کی جانب تھا۔''

''ہاں!'' انہوں نے گہری سانس لی۔''میں خود بھی یہی چاہتی ہوں۔نجانے بہروز کو کس بات کا انتظار ہے۔''

''ارے امی آپ بھائی جان کے انتظار پر کیوں جاتی ہیں۔بالآخر وہ ایک مشرقی لڑکے ہیں۔بھلا اپنے منہ سے کیسے کہہ دیں؟''

''خاموش رہو تم۔میں نے خود اس سے بات کی ہے اس معاملے پر۔وہ کہتا ہے ابھی نہیں۔''

''چلیے،فیروز بھائی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ہاں فیروز بھی ماشاءاللہ اس قابل ہے۔''

''اس قابلیت سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔خود کفیل ہیں۔'' اس نے لقمہ دیا۔

''کیا؟'' وہ چونکیں۔

''کچھ نہیں۔'' وہ اطمینان سے بولا۔''آپ گفتگو جاری رکھیے۔''

''ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ بہروز کی کہیں بات ہو جاتی تو فیروز کے لیے بھی لڑکی دیکھتے۔''

''دیکھنے کی کیا ضرورت ہے امی۔لڑکی تو دیکھی دکھائی ہے۔وہ کیا مثل ہے لڑکی بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔''

''ہائیں؟ کس لڑکی کی بات کر رہے ہو تم؟'' وہ حیران ہوئیں۔

''یہ اپنے پڑوس میں ہی رہتی ہیں،صبا۔''

''صبا!'' وہ سوچ میں گم ہوئیں۔ہاں وہ بچی بھی ماشاءاللہ بہت پیاری ہے۔''

''جی ہاں۔'' اس نے سنجیدگی سے سرہلایا۔''بچی تو پیاری ہے۔کھوٹ تو اپنے ہی بچے کی آنکھوں میں ہے۔''

''کیا؟''

"جی کچھ نہیں۔"

اندر آتے فیروز احمد کو دیکھ کر اس نے گفتگو موقوف کی۔

"السلام علیکم۔" وہ ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ "کیا ہو رہا ہے۔"

"تمہاری ہی باتیں ہو رہی تھیں۔" وہ مسکرائیں۔

"اچھا بھئی کس سلسلے میں؟"

"شہروز کہتا ہے کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔" وہ ہنس کر بتانے لگیں۔ "اور لڑکی بھی اس نے خود ہی ڈھونڈ نکالی ہے۔ یہ اپنی صبا۔ توقیر علی صاحب کی بیٹی۔" فیروز کے چہرے کی رگیں یکا یک تن گئیں۔

"اس کی باتوں میں مت جایا کریں امی۔" وہ خشک اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "فضول ہانکنے میں اس کا ثانی نہیں ہے۔ آپ پلیز کھانا لگوا دیں بہت بھوک لگی ہے۔"

"میں خود لگاتی ہوں۔"

"وہ اُٹھ کر کچن کی سمت چلی گئیں۔

"تمہیں اور کوئی کام ہے یا نہیں؟"

فیروز نے شہروز کو گھورا جو دوبارہ اوندھا لیٹ کر جھولا جھولنے لگا تھا۔

"جی مجھ سے کچھ کہا؟" اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"ہاں اب معصوم بن جاؤ۔" وہ تپ گیا۔ "بس جب دیکھو الٹی سیدھی حرکتوں میں مصروف ملو گے۔ یار کچھ ڈھنگ کے بندے بنو۔"

"کیا کروں بھائی۔ اب میں ہی ہوں سب کا خیال رکھنے والا۔ سب کی خبر گیری کرنے والا۔ ورنہ یہاں کون کس کو پوچھتا ہے۔ آپ خود ہی دیکھیں کیا شان بے نیازی پائی ہے۔" "وہ" کہہ رہے تھے

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب!

دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

اور آگے فرماتے ہیں۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

"یا الٰہی۔" فیروز احمد نے سر تھام لیا۔ "یہ کیا لڑکا ہے؟"

"چچ چچ۔" شہروز نے افسردگی سے کہا۔ "یہ بھی نہیں پوچھا کہ کون؟"

"کیا کون؟" اس نے گھورا۔

"کچھ نہیں بھائی آپ کھانا کھائیں۔ میں تو آپ کی جانب سے بس اتنا کہہ دوں گا کہ:۔

بربادیٔ دل جبر نہیں فیض کسی کا

وہ دشمن جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

"اوفوہ۔" وہ بھنا کر وہاں سے اُٹھ گیا۔

"باغوں میں پڑے جھولے۔" وہ با آواز بلند گانے لگا۔ "جمنا ذرا ادھر تو آؤ۔ شہزادہ سلیم کب سے تمہارے منتظر ہیں۔"

"کہو؟" وہ ہاتھ پونچھتی چلی آئی۔

"یہ دیکھو۔" اس نے کیلے کے خالی چھلکے کے پیچھے ماچس کی تیلی لگا کر اسے پیش کیا۔

"یہ گل نادر ہم نے خاص طور پر تمہارے لیے باغ خاص سے منگوایا ہے۔ قبول کرو انار کلی۔"

جمنا بھنا کر پلٹ گئی۔

"ہائے!" اس نے سرد آہ بھری۔ "اس بھری دُنیا میں کوئی بھی ہمارا نہ ہوا۔"



آنکھیں موندے، بظاہر سوتی ہوئی وہ زندگی کی حسین ترین لمحوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

وہ لمحات جب دل نے اعلان بغاوت کیا تھا اور دل و دماغ کی سلطنت اچانک چھن گئی تھی وہ اتنے کمزور کردار کی یا نا تواں ارادوں کی لڑکی نہ تھی لیکن بات دراصل مخالفت کی مضبوط اور بلند شخصیت کی تھی۔ اس طاقتور کشش کی تھی جو کبھی کبھی ہی کسی ایک واحد شخص کے کردار کے کسی پہلو میں نظر آتی ہے اور اس بری طرح سے متاثر کر ڈالتی ہے کہ سانس لینے اور سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

صبا، فیروز احمد سے اپنی پہلی ملاقات کو کیسے بھول سکتی تھی۔ اس دن سے لے کر اب تک وہ محض اسی خیال سے تو جہاں تصور آباد رکھا کرتی تھی۔

اسے چند ضروری نوٹس تیار کرنے تھے جن کے لیے کچھ اہم معلوماتی کتابوں کی ضرورت تھی۔

"یہ تو بہت پرانی کتب ہیں۔" بک ہاؤس کے کاؤنٹر پر موجود سیلز مین نے لسٹ دیکھ کر کہا تھا۔ "فی الحال تو آپ کو دستیاب نہیں ہو سکتیں۔"

"پھر؟" اس نے مایوسی سے لسٹ واپس لی۔ "اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"اگر آپ انتظار کر سکیں تو میں آپ کو منگوا کر دے سکتا ہوں ایک ہفتے کے اندر اندر۔"

"پلیز اگر آپ یہ کتب منگوا دیں تو میں بہت شکر گزار رہوں گی" اس نے ممنونیت سے کہا۔

''آپ یہ لسٹ میرے پاس چھوڑ جائیں۔انشاءاللہ اگلے ہفتے آپ کو مل جائیں گی۔''

''جی ضرور۔'' اس نے لسٹ واپس کی۔ ''میں فون کرکے معلوم کرلوں گی۔''

نجانے وہ کس خیال میں تھی کہ کاؤنٹر پر رکھا شاپر اٹھا کر اطمینان سے باہر نکل آئی۔

غالباً سیلز مین سے باتیں کرتے وقت وہ مسلسل اس شاپر پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی اور لاشعوری طور پر وہاں سے ہٹتے ہوئے اسے اٹھا بھی لیا تھا۔

''سنیے محترمہ۔'' پیچھے سے کسی نے اسے ٹھنڈے پرسکون لہجے میں پکارا تھا۔

''جی۔'' وہ حیرانی سے مڑ کر اس بظاہر بااخلاق اور پروقار نظر آنے والے نوجوان کو گھورنے لگی۔

درمیانے قد اور سانولی رنگت کا وہ ایک پرکشش نوجوان تھا جس کے متناسب نقوش میں بلا کی جاذبیت تھی۔اپنی چمکتی ہوئی ذہین نگاہیں وہ اس پر جمائے کھڑا تھا۔

''میں یہ شاپر چیک کرنا چاہتا ہوں۔جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔'' وہ انتہائی سنجیدہ تھا۔

''کون شاپر؟'' وہ غائب دماغی اور حیرانی سے بولی۔ ''یہ۔یہ کس کا ہے؟''

''غالباً میرا۔'' وہ طنزیہ بولا۔ ''اس میں جو کتابیں ہیں میں ان کا نام بھی بتاسکتا ہوں۔ویسے آپ کافی باذوق چور ہیں۔بشرطیکہ آپ یہ کتب بیچ دینے کا ارادہ نہ رکھتی ہوں۔''

''وہ.....دیکھیے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ رو دینے کو ہوگئی۔میں انتہائی شرمندہ ہوں آپ سے۔''

''آپ کو ہونا بھی چاہیے۔چوری کرنا بڑا قبیح فعل ہے۔''

''دیکھیے مسٹر۔بخدا میں انتہائی غائب دماغی کا مظاہرہ کر بیٹھی ہوں۔یہ یقیناً آپ کی ہی کتابیں ہیں۔یہ لے لیجیے پلیز۔''

''اوہ۔بے حد شکریہ!'' اس نے انتہائی کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ''آپ کا بڑا احسان ہوگا مجھ پر۔ورنہ چوری کی ہوئی اشیاء واپس کرنا اصول کی بات ہے تو نہیں۔''

''آپ۔آپ اس سے پوچھ لیں۔سیلز مین سے۔'' اسے رونا آگیا۔ ''میں اکثر یہاں آتی ہوں۔''

اس جملے پر وہ بے ساختہ ہنس دیا تھا پھر دوسرے ہی لمحے سنجیدہ بھی ہوگیا۔

''آتی ہوں گی ضرور۔مجبوری ہے آپ کی۔''

''سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کرکے اس نے اپنا شاپر اس کے ہاتھ سے لیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی بائیک تک جا پہنچا۔

بائیک اسٹارٹ کرکے ایک نگاہ غلط دور کھڑی صبا پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

وہ وہیں کھڑی دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتی رہی جو در حقیقت اشک ندامت تھے۔پھر گھر آکر دوسرے بہت سے کاموں میں مصروف ہو

کر بھی وہ اس نوجوان کو نہ بھلا پائی۔ دن گزرتے گئے وہ بار ہا بک ہاؤس گئی کہ شاید کبھی اتفاق سے کہیں وہ دوبارہ دکھائی دے جائے۔ لیکن وہ پھر کبھی وہاں نہ ملا۔

اور جب دوبارہ دکھائی دیا تو مارے حیرت کے صبا کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی وہ تو بے خیالی میں ٹیرس پر کھڑی دھوپ سینک رہی تھی جب اس کی نگاہ برابر والے گھر کے لان پر پڑی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھے نوجوان پر پڑی تھی۔ وہی نوجوان جو اسے بک ہاؤس کے باہر ملا تھا اور جسے وہ کب سے تلاش کر رہی تھی۔ وہ اس کے بالکل برابر والے گھر میں رہتا تھا۔ باعث حیرت بات تھی۔

اور تب سے نجانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے دیکھا کرتی تھی۔ کبھی چھپ کر کبھی بنا چھپے کبھی انتہائی محویت سے کبھی یونہی بے خیالی میں۔ بس وہ اسے دیکھتی تھی اور اسے دیکھنا اچھا ہی تھا۔ وہ بس اتنا جانتی تھی۔ بعض لوگ باعث خوشی ہوتے ہیں چاہے ان سے ملو، چاہے ان سے گفتگو کرو یا محض ان کو دیکھو۔ کیوں ہوتے ہیں یہ معلوم ہو یا نہ ہو کیا فرق پڑتا ہے۔

بند آنکھیں کھول کر اس نے وال کلاک کو دیکھا۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ اٹھ کر اس نے سرہانے رکھا دوپٹا اوڑھا اور آہستہ آہستہ چلتی اس دروازے تک آئی جو ٹیرس پر کھلتا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ٹھنڈی۔ مستانی، بہار کی خوشگوار ہوا اس کے وجود سے ٹکرائی۔ وہ خود بخود مسکرا اٹھی۔ ننگے پاؤں ماربل کے فرش پر رکھتی وہ ریلنگ تک چلی آئی پھر چونک اٹھی۔

دوسری جانب لان میں فیروز احمد موجود تھا۔ کسی کی سحر انگیز، دلکش شخصیت کے بارے میں دیر تک سوچ کر جب اچانک اسے نگاہوں کے سامنے پایا جائے تو بڑا مدھر، بڑا سرور آمیز احساس دل میں گھر کرتا ہے۔

دونوں کہنیاں ریلنگ سے ٹکائے وہ شوخ اور سرور سی، فیروز احمد کو دیکھتی رہی۔ وہ ٹیلی فون سیٹ گود میں رکھے کوئی نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

دو تین مرتبہ اس نے نمبر ڈائل کیا پھر اچانک اس کی نگاہ صبا پر پڑی۔ وہ جو محویت سے اسے تک رہی تھی۔ چونک کر سیدھی ہو گئی۔ جبکہ وہ بدستور اسے گھور رہا تھا۔

پھر وہ کھڑا ہوا۔ فون سیٹ کرسی پر رکھا اور چلتا ہوا لان کے آخری سرے تک گیا۔ کیاری پھلانگ کر گیٹ سے نکلا اور پھر صبا نے دیکھا کہ وہ اس کے گھر کے گیٹ پر آ کر رکا تھا۔

کال بیل کی آواز نے صبا کو اندر تک سرد کر دیا۔ دھڑکتے، شور مچاتے دل کے ساتھ وہ مڑ کر اندر بھاگی تھی۔



تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی وہ نیچے آئی۔ نجمہ بیگم شاید نہا رہی تھیں۔ ان کا بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا اور باتھ روم کے بند دروازے کے پیچھے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ تذبذب کے عالم میں وہیں کھڑی انگلیاں مسلتی رہی۔ اتنی دیر میں کال بیل ایک مرتبہ پھر بج اٹھی۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے گا۔ شکایت کرے گا اس کی ڈھٹائی اور بے شرمی کی۔ ڈانٹے گا۔ شرمندہ کرے گا۔ یا امی سے ملنا چاہے گا۔

"اوہ خدا۔ مجھے بچالے۔" گیٹ کھولتے ہوئے اس نے دعا مانگی اور نم آنکھوں سے سامنے کھڑے فیروز احمد کو دیکھا۔

"جی؟" اس نے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔

"زحمت دینے پر معافی چاہتا ہوں۔" اس نے ایک لمحے کو نظر ملا کر ہٹالیں۔

"مجھے ایک فون کرنا ہے ضروری اور ہمارا فون۔ خراب ہے یا ون وے ہو گیا ہے۔"

"اوہ!" ایک گہرا سانس اس کے سینے سے آزاد ہوا اور دم بحال ہو گیا۔

"وہ اب خاموش کھڑا منتظر نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"جی۔ آیئے ناں!" اس نے ہٹ کر راستہ دیا۔

"شکریہ! آپ اکیلی ہیں؟" وہ قدم بڑھا کر وہ متذبذب سے رکا۔

"جی نہیں۔" وہ مسکرا دی۔ "امی ہیں گھر پر۔ آپ آیئے پلیز۔"

"اس کی رہنمائی کرتی وہ اسے فون تک لائی۔

"کر لیجیے۔" فون کی طرف اشارا کر کے وہ مڑ کر کچن کی طرف آ گئی۔

بڑی عجلت میں اس نے چائے کا پانی رکھا اور کپ نکالنے لگی۔ چند لمحوں پیشتر والی گھبراہٹ اچانک خوشی آمیز گھبراہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اس کے گھر آیا تھا۔ یہ احساس دل کو عجب سرشاری بخش رہا تھا۔ جلدی جلدی چائے بنا کر اس نے کپ ٹرے میں رکھے اور باہر نکل آئی۔

اندر پہنچی تو وہ ریسیور رکھ رہا تھا۔

"کر لیا فون؟" صبا نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی۔ شکریہ!" اس نے ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے۔ "ضروری کام نہ ہوتا تو آپ کو زحمت نہ دیتا۔"

"زحمت!" وہ ہنس دی۔ "اس میں زحمت کی کیا بات ہے؟ آپ ہمارے پڑوسی ہیں اور پڑوسیوں کا تو بڑا حق ہوتا ہے۔ آپ بیٹھیں ناں کھڑے کیوں ہیں۔ چائے لیجیے!"

"چائے؟" وہ حیران ہوا۔ ارے یہ تکلیف کیوں کی آپ نے۔ میں اب چلوں گا۔"

"پلیز اب بن گئی ہے تو پی لیں!" اس نے جیسے التجا کی۔

"پھر کبھی سہی۔" اس نے گھڑی دیکھی۔ "مجھے ذرا جلدی ہے۔ مائنڈ نہ کیجیے گا۔" اور پھر جلدی سے مڑا اور باہر نکل گیا۔

اس نے ٹرے افسردگی سے میز پر رکھ دی اور وہیں کھڑی تھوڑی دیر قبل اس کے وجود کی موجودگی کا احساس محسوس کرتی رہی۔

بڑے نفیس پرفیوم کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ صبا اس صوفے کو گھورنے لگی جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر دھیرے سے ٹیلی فون سیٹ کو چھوا۔

اس نے اسے تھاما ہوگا۔ اس کی انگلیوں نے نمبر ڈائل کیے ہوں گے۔ اس ریسیور کو اس نے کانوں سے لگایا ہوگا۔ اس کے لبوں سے نکلتے بولوں نے اسے چھوا ہوگا۔

اس نے ریسیور اٹھا کر کانوں سے لگایا پھر خود ہی ہنس دی۔

"صبا۔ بیٹی کون آیا تھا۔ بیل بجی تھی ناں؟" گیلے بال تولیے سے پونچھتے ہوئے نجمہ بیگم وہیں آگئیں۔

"جی؟" وہ چونکی۔ "وہ۔ وہ۔ فیروز آئے تھے امی۔ شعیب صاحب کے بیٹے۔ فون کرنا تھا انہیں۔"

"اچھا اچھا۔ تم کس کو فون کر رہی ہو؟" مڑتے ہوئے انہیں خیال آیا۔

"جی میں؟ ہاں وہ الماس کو کر رہی تھی۔ نمبر ہی نہیں ملا۔"

اس نے جھٹ ریسیور رکھ دیا۔ اور اپنی غیر حاضر دماغی کو کوسنے لگی۔

"یہ چائے کس کی ہے؟"

"آپ کے لیے ہی بنائی ہے۔ اپنا کپ لے لیجیے۔" وہ مسکرا دی۔

"اچھا۔"

وہ کپ اٹھا کر باہر نکل گئیں تو وہ ہنس دی۔

میرے جیسے بن جاؤ گے جب عشق تمہیں ہو جائے گا
دیواروں سے ٹکراؤ گے جب عشق تمہیں ہو جائے گا



کالج سے واپسی پر اس کا موڈ سخت آف تھا۔

اس راجا کی صورت سے اسے سخت نفرت ہو گئی تھی۔ اسے غالباً سیڑھیوں پر بیٹھ کر نیلم کے آنے جانے کا انتظار کرنے اور اسے گھورنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام ہی نہ تھا۔ صبح جس وقت وہ جانے کو نکلی تھی وہ وہیں بیٹھا تھا اور نیلم کو دیکھ کر اس نے بڑے ہی عامیانہ انداز میں ہائے کہا تھا۔

اب واپس آتے ہوئے اس نے دیکھا وہ وہیں بیٹھا، پتھر کے صنم گا رہا تھا۔

یونیفارم تبدیل کر کے وہ کچن میں آئی۔ اماں روٹیاں پکا رہی تھیں۔

''لائیں اماں میں پکا لوں!''

''بس پکا لیں میں نے۔ تم کھانا کھاؤ۔ سالن نکال دوں؟''

''نہیں۔ میں خود نکال لوں گی۔'' وہ نل سے ہاتھ دھونے لگی۔ ''ریشم اور مریم نہیں لوٹیں اب تک؟'' وہ پیڑھی کھسکا کر بیٹھ گئی۔

''نہیں کہاں لوٹی ہیں اب تک۔ ان بے چاریوں کا کالج بھی تو دور ہے۔''

''انعم سو بھی گئی اتنی جلدی؟'' سالن نکالتے ہوئے اس نے استفسار کیا۔

''ہاں آتے ہی کھانا کھایا اور سو گئی۔''

''وہ خاموش ہو کر کھانا کھانے لگی۔

''تم اب اور کتنے دن کالج جاؤ گی؟''

''بس اماں۔ دو مہینے اور ہیں پھر میرے امتحان ہو جائیں گے۔ بس اس کے بعد چھٹی!''

''تو کچھ پڑھا بھی کرو بیٹی۔ میں نے کب سے تمہیں پڑھتے نہیں دیکھا۔''

''کیا کروں اماں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''کس وقت میں پڑھا کروں۔ سب سے بڑی بیٹی ہونا بھی ایک مشکل ہے۔ گھر کے دھندے ہی جان نہیں چھوڑتے۔ اب دیکھیں ناں، کتنے کپڑے جمع ہو گئے ہیں۔ کھانا کھاتے ہی دھونے بیٹھ جاؤں گی۔''

''چلو تم رہنے دو۔ میں دھو ڈالوں گی۔ تم اپنی پڑھائی کرلو۔''

''ایک دن سے کیا ہوتا ہے اماں۔'' وہ ہنس دی۔ ''پڑھنا تو روزانہ کا مسئلہ ہے ناں۔ خیر آپ فکر نہ کریں۔ میں اب رات میں پڑھا کروں گی۔ ویسے بھی ایک دو دن بعد سے کالج جانا بند کر دوں گی میں۔''

''وہ کیوں؟'' وہ حیران ہوئیں۔

''کورس پورا ہو گیا ناں اماں۔ اب کالج میں بیکار مکھیاں مارنے سے بہتر ہے کہ انسان گھر میں رہ کر سکون سے پڑھائی کرلے۔''

''ہاں پھر تو ٹھیک ہے۔'' وہ مطمئن ہو کر دستر خوان میں روٹیاں لپیٹنے لگیں۔

''السلام علیکم۔'' اندر آتی مریم اور ریشم نے حسب معمول بلند آواز میں سلام کیا۔

''کیا پکایا ہے اماں؟'' ریشم نے بے تابی سے پوچھا۔

''بھنی ہوئی دال ہے۔'' نیلم نے پانی کا گلاس لبوں سے ہٹایا۔ ''بڑی مزے دار پکائی ہے اماں نے۔ گرم گرم کھالو ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

''پتا ہے بجو۔ ایک اتنی امیر لڑکی سے میری دوستی ہوئی ہے کالج میں۔'' ریشم نے سالن نکالتے ہوئے اسے بتایا۔ ''ثانیہ نام ہے اس کا۔ کل اس کے بھائی کی برتھ ڈے ہے۔ مجھے انوائٹ کیا ہے۔''

''جاؤ گی تم؟'' اس نے اپنی پلیٹ دھو کر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بجو۔ میں کیسے جا سکتی ہوں۔ اگر گئی تو گفٹ بھی تو ان کی حیثیت کے مطابق ہی دینا ہوگا ناں اور پھر میرے پاس تو کوئی ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہیں۔''

''ڈھنگ کے کپڑے تو جب ہوں جب تم ڈھنگ سے کپڑے استعمال کرو۔ اتنے اچھے اچھے کپڑوں کا وہ حشر کرتی ہو کہ کپڑا بے چارا بھی کان پکڑ لیتا ہے۔ اور جہاں تک گفٹ کا تعلق ہے تو وہ تو تمہیں اپنی پاکٹ منی سے خریدنا چاہیے ناں۔''

''پاکٹ منی؟ تو پاکٹ منی سے گفٹ خرید لوں تو سارا مہینہ کیسے گزاروں؟''

''چلو ان جھگڑوں سے بچنے کے لیے نہ ہی جاؤ تو بہتر ہے۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔

''جی میں کہاں جانے کا کہہ رہی ہوں۔'' اس نے کندھے......اچکائے۔ ''ویسے غزالہ تو جائے گی۔'' غزالہ، ریشم کی بیسٹ فرینڈ تھی۔

''جانے دو اسے۔''

وہ کہہ کر باہر نکل آئی۔ ابھی اسے کپڑے جمع کرنے تھے۔ دھونے تھے۔ پھیلانے تھے اور دن تیزی سے ڈھل رہا تھا۔

سب کے میلے کپڑے اکٹھے کر کے اس نے بے زاری سے ڈھیر کو دیکھا اور ٹب میں واشنگ پاؤڈر ڈالنے لگی۔

جس وقت وہ سفید کپڑوں کو دھو کر نیل لگا رہی تھی تب بیل بجی۔ اس نے اندر کی جانب دیکھا۔ کمروں کے بند دروازے اعلان کر رہے تھے سب لوگ سو رہے ہیں۔

گہرا سانس بھر کر اس نے ہاتھ پونچھے اور گیٹ کھولنے چل دی۔

''ارے چچی جان آپ۔ السلام علیکم!'' اس کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ ''آمنہ تم؟ کیسی ہو؟''

وہ چچی جان سے گلے لگ کر آمنہ سے ملی۔

''اوہو۔ بھئی ہماری بھانجی کے کیا حال ہیں۔'' آمنہ کی گود سے مومنہ کو لے کر وہ ان کے پیچھے پیچھے اندر چلی آئی۔

بیل کی آواز پر اماں بھی اٹھ گئی تھیں اور ریشم، مریم اور شبنم بھی۔

''السلام علیکم چچی''

"وہ سب خوش ہو گئی تھیں۔

"جیتی رہو۔جیتی رہو۔" انہوں نے باری باری سب کو گلے سے لگایا۔

"آمنہ۔تمہارے سسرال والوں نے تم پر بین لگا رکھا ہے کیا؟" شبنم نے شکوہ کیا۔"اب تو مہینوں میں کہیں جا کے تمہاری شکل نظر آتی ہے۔"

آمنہ ہلکے سے ہنس کر رہ گئی۔اس کی شادی سے پہلے شبنم اور آمنہ میں بے انتہا دوستانہ تھا۔دونوں ہم پیالہ و ہم نوالہ ہوا کرتی تھیں۔

"شبنم تم مومنہ کو سنبھالو،میں ذرا باقی کپڑے دھو لوں۔"

نیلم،شبنم کو مومنہ دے کر باہر آ گئی اور کپڑے دھونے لگی۔

چچی جان اور آمنہ کی اچانک آمد نے اسے کچھ مشکوک کر ڈالا تھا۔شبنم سے چچی جان کے خیالات سن کر اور یوسف کی کچھ کہہ ڈالنے کی کوشش نے اسے پہلے ہی الجھنوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔

"نجانے چچی یونہی آئی ہیں یا کسی خاص مقصد کے تحت۔" شرٹ کا کالر برش سے صاف کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔"اور اگر چچی نے یونس بھائی کے لیے۔اماں تو فوراً ہاں کہہ دیں گی۔"

"وہ اتنا پریشان ہوئی کہ کپڑے دھونا چھوڑ کر اُٹھ کر باورچی خانے میں چلی آئی۔اور بے وجہ ہی چائے کا پانی رکھ دیا۔

ریشم باورچی خانے میں آئی تو وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔

"نیلی بجو!" اس نے پیار سے بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔

"آں۔ہاں۔" وہ چونکی۔

"مبارک ہو بہت بہت۔" ریشم بے اندازہ خوش تھی۔

"کک۔کیوں۔" وہ ہکلا گئی۔سینے میں دل بے قابو ہونے لگا۔

"آپ کی بات طے ہو گئی ہے۔چچی آپ کا رشتہ مانگنے آئی ہیں۔اماں نے اتنی جلدی ہاں بھی کہہ دی۔میں ذرا زلفی کو جگاؤں۔اماں نے مٹھائی منگوانے کا کہا ہے۔"

وہ عجلت میں بتا کر باہر بھی نکل گئی اور نیلم کے ہاتھ پاؤں بالکل سرد ہو گئے۔

"یونس یا یوسف!یوسف یا یونس؟"

اس کی نظروں کے آگے چہرے جلنے بجھنے لگے۔

"نیلی بجو۔" مریم خوش خوش اندر آئی تھی۔کیا کر رہی ہیں؟"

"آں!" اس نے پریشان نگاہیں اس پر جمائیں۔"چائے بنا رہی ہوں۔"

''خوشی کی خبر سنیں گی؟'' وہ شوخی سے بولی۔

''یا خدا!'' اس کے صبر وضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس کی جان نکل رہی تھی!

''آپ کی بات طے ہو گئی ہے۔'' وہ ہنسی۔

''کس سے؟'' بالآخر وہ چیخ ہی پڑی۔

''یوسف بھائی سے۔'' وہ مسکرائی۔

''اوہ!'' سکون کی لہریں اس کے وجود میں بتدریج اترتی گئیں۔

''کیا ہوا بجو آپ کو؟'' مریم نے اب جو اپنی خوشی کے حصار سے نکال کر اس کا زرد پڑتا چہرا دیکھا تو وہ پریشان ہو گئی۔

''کچھ نہیں!'' وہ مسکرا دی۔ بے رونق اور زرد چہرے کی رونق اور گلابیاں بحال ہو گئیں۔

''پتا ہے یونس بھائی کی بات بھی طے کر دی ہے چچی نے۔''

''اچھا!'' اب اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ''کس سے؟''

''آمنہ باجی کی نند ہیں ناں ثریا ان سے۔''

''چلو۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔''

''سچ سچ بتائیں بجو۔ کون سی بات زیادہ خوشی کی ہے؟'' وہ شوخی سے پوچھنے لگی۔ تو نیلم ہنس دی۔

اس کا مسکراتا، مطمئن چہرا ہی کہہ رہا تھا کہ اس کے لیے کون سی بات زیادہ خوشی کی تھی۔

''ویسے بھی یونس بھائی بھی آتے ہی ہوں گے مٹھائی لے کر چچی جان کہہ کر آئی ہیں انہیں''

مریم اپنی دانست میں اسے معلومات فراہم کر رہی تھی جبکہ وہ تو مسکراتے لبوں کے ساتھ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

''اور پتا ہے بجو۔ چند دنوں میں آپ کی منگنی بھی ہو گی۔''

''کیا کیا سن آئی ہو۔ اسے ہنسی آ گئی۔

''لو۔ اندر سب طے ہو رہا ہے۔ اماں تو اتنی خوش ہیں جیسے اسی انتظار میں تھیں کہ کب چچی بات کریں اور کب وہ ہاں کہیں۔

''اچھا۔ تم ذرا چائے چھان لو۔ مجھے باقی کپڑے دھونے ہیں۔''

ویسے تو اس کا موڈ کسی بھی کام کو کرنے کا نہ تھا لیکن بہر حال اب دل مطمئن تھا۔



''تو خیر سے آپ بھی پیا کو پیاری ہوئیں۔'' عنبرین نے شوخی سے کہا تو نیلم دھیرے سے ہنس دی۔

''کب دلہن رہی ہو۔انگوٹھی خیر سے؟''

''جلدی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کوئی تقریب تو ہوگی نہیں۔بس چچی جان آ کرانگوٹھی پہنا جائیں گی۔''

''چلو بھئی۔خدا مبارک کرے۔ویسے نیلم ''اُس'' بے چارے کا کیا ہوگا؟'' وہ رازداری سے بولی۔ ''بے موت ہی مر جائے گا۔''

''کون؟'' وہ حیران ہوئی۔ ''کس کی بات کر رہی ہو؟''

''اوہو۔اتنی کمزور یادداشت ہے محترمہ کی۔وہی آپ کا عاشق صادق راجا۔جو آپ کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر گھنٹوں دھوپ میں تپتا ہے۔''

''لاحول ولا۔'' وہ جھلا گئی۔ ''دفع کرو اس منحوس کے ذکر کو۔''

''ٹھیک ہی تو گاتا ہے بے چارا۔'' عنبرین ہنس دی۔ ''پتھر کے صنم تجھے ہم نے محبت کا خدا جانا۔''

''عنبرین خدا کے لیے۔'' وہ عاجز ہوئی۔

''نیلم! تجھے ترس نہیں آتا اس پر؟''

''نفرت ہے مجھے اس کی صورت سے بھی۔'' وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔ ''کجا اس پر ترس کھاؤں۔''

''توبہ ہے نیلم۔ایسا بھی کیا بگاڑ لیا اس نے تمہارا۔'' عنبرین نے اسے گھورا۔

''خیر دفع کرو اسے۔تم بتاؤ تمہارے سسرال والے کب آ رہے ہیں؟'' نیلم نے موضوع کی کوفت سے بچتے ہوئے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''فی الحال تو کچھ نہیں کہلوایا انہوں نے۔''

''تم کچھ پڑھ بھی رہی ہو عنبرین! معلوم ہے ڈیڑھ مہینہ رہ گیا ہے ایگزام میں۔'' اس نے اپنے ساتھ ساتھ اس کو بھی ڈرایا۔

''پڑھ لیں گے یار!'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''ہم نے بی اے کی ڈگری لے کر کون سا تیر مارنا ہے۔سسرال جا کر روٹی ہانڈی ہی کرنی ہے۔''

''اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ایگزام میں کمپارٹ لے لیں۔'' وہ ہنس دی۔

''خدا نہ کرے۔'' اب وہ بھی دہل گئی۔ ''بھئی میں نہیں دوں گی دو دو مرتبہ پیپر۔''

''بس تو پھر شروع کرتے ہیں پڑھنا۔'' نیلم بولی۔ ''یا تو تم آ جایا کرو یہاں یا میں تمہارے گھر آ جایا کروں گی۔''

''ہوں۔'' اس نے فکرمندی سے سر ہلایا۔ ''کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔'' یار نیلم یہ پیپر دیے بغیر ڈگری نہیں مل سکتی؟''

''نیلم زور سے ہنس دی۔

''یا شادی کرنے کے لیے بی اے ہونا ضروری ہوتا ہے؟'' وہ پھر بولی۔

نیلم ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی۔

"کیوں بھئی تمہارے سسرال والوں نے شرط رکھی ہے کہ لڑکی کا بی اے ہونا ضروری ہے۔"

"تم بغیر بیپر دیے رچالو شادی۔" وہ اب تک ہنس رہی تھی۔

"میرے بس میں ہوتا تو یہی کرتی۔" وہ مایوسی سے بولی۔ "مگر اب۔ پڑھنا ہی پڑے گا۔"

"چچ چچ چچ۔" نیلم نے مصنوعی تاسف کا اظہار کیا۔

"اب لڑکیاں بے چاریاں کیا کیا کریں۔ گھر کا کام کریں۔ جہیز کی چیزیں بنائیں۔ پڑھائی کریں کتنا ظلم ہے ناں نیلم۔"

"واقعی!" اس نے سر ہلایا۔

"تم مذاق سمجھ رہی ہو؟" میں سنجیدہ ہوں!" وہ ناراض ہوئی۔

نیلم ایک بار پھر ہنس دی۔ عنبرین چند لمحے اسے گھورتی رہی پھر خود بھی ہنس دی۔



وسیع و عریض لان میں رنگ و بو کا ایک سیلاب موجزن تھا۔ دلاور خان فخریہ انداز میں عثمان کا ہاتھ تھامے اسے لوگوں سے متعارف کرا رہے تھے۔

"کاش کہ میں بھائی کی جگہ ہوتا۔" عدنان نے سوفٹ جوس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مہوش سے کہا۔

"اچھا! پھر کیا تیر مارتے؟" اس نے مذاق اُڑانے والے انداز میں اس کو دیکھا۔

"بس۔ پھر ایسے ہی اتراتا میں جیسے بھائی اترا رہے ہیں۔ وہ کیا شان ہے۔ کیسے عمدہ انسان لگ رہے ہیں!"

"ہاں لگ تو رہے ہیں لیکن اترا بالکل بھی نہیں رہے۔" مہوش نے دوسری بات کی تائید کرتے ہوئے پہلی کی تردید کی۔

"دل میں تو اترا ہی رہے ہوں گے۔"

"ہونہہ بے وجہ ہی۔ تمہارے جیسے چھچھورے تھوڑا ہی ہیں۔" اس نے ناک چڑھائی۔

"بھائی تو میرے ہیں۔" وہ ہنسا۔ "تم کیوں جل رہی ہو۔"

"میں اس بات پر نہیں جل رہی کہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔ بھائی تو وہ میرے بھی ہیں۔ چچا زاد سہی، غصہ تو مجھے تمہارے چھچھورے پن پہ آرہا ہے۔" مہوش اطمینان سے بولی۔

"بس بس۔ زیادہ فری نہیں۔" وہ منہ بنا کر دوسری جانب بڑھ گیا۔

الماس نے تیسری بار اپنی گوری کلائی پر بندھی نازک سی رسٹ واچ دیکھی۔ اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئی۔

"لگتا ہے کسی بڑی اہم شخصیت کا انتظار ہو رہا ہے۔" اس کے قریب آتے عثمان نے بغور اسے دیکھا۔

"جی۔" وہ چونکی۔ "صبا کا انتظار ہے۔ میری واحد سہیلی۔"

"واحد سہیلی؟" وہ مسکرائے۔ "بڑی عجیب بات ہے کہ کسی انسان کا صرف ایک دوست ہو اتنی بڑی دنیا میں۔"

"اس معاملے میں میں بہت منفرد...... ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"ہوں!" وہ ہنکارا بھر کر رہ گئے۔ چند لمحے اسے دیکھتے رہے پھر دھیمے سے بولے۔

"اچھی لگ رہی ہو۔"

"ہمیشہ کی طرح؟" الماس شرارتی ہوئی۔

"ہمیشہ سے کچھ زیادہ۔" انہوں نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو قریب لا کر "کچھ" اشارہ کیا۔ الماس بال جھٹک کر ہنس دی۔

"لیٹ ہونے پر معذرت خواہ ہوں۔ مجھے کچھ مت کہنا۔"

"صبا کی آمد پر وہ دونوں چونکے۔

"صبا میں خون پی جاؤں گی تمہارا۔" الماس اسے دیکھ کر غرائی۔ "ٹائم کو شرم نہیں ہے تم میں۔"

"میں نے کہا تھا کہ مجھے کچھ نہ کہا جائے۔" صبا گھبرا کر بولی۔ "سوسوری الماس۔ کوشش کے باوجود۔"

"وہ کوشش ہی کیا جو کامیاب نہ ہو۔" عثمان جو دلچسپی سے دونوں کی لڑائی دیکھ رہے تھے ہنس کر بولے۔

"آں۔ آپ کی تعریف؟" صبا کو پہلی بار ان کی وہاں موجودگی کا احساس ہوا۔

"اوہ۔ ہاں صبا۔ یہ ہیں عثمان۔ میرے فرسٹ کزن۔ جن کے اعزاز میں یہ پارٹی سیلیبریٹ کی گئی ہے۔" الماس نے مسکراتے ہوئے تعارف کرایا۔ "اور عثمان۔"

"یہ صبا ہیں آپ کی واحد سہیلی۔" انہوں نے بات کاٹ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے۔" الماس بھی ہنس دی۔

"کیا کر رہی ہیں آپ آج کل۔" عثمان، صبا سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگے۔

"میں نے ریسنٹلی بی ایس سی کیا ہے الماس کے ساتھ۔ آج کل ایم ایس سی میں ایڈمیشن لینے کا سوچ رہی ہوں۔"

"بڑا اچھا خیال ہے ضرور کیجیے۔ ایم ایس سی۔ میں لڑکیوں کی اعلا تعلیم کا بڑا حامی ہوں۔"

"اچھا!" وہ مسکرائی۔ "پھر سمجھائیے ناں الماس کو۔ یہ مزید پڑھنا نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟" وہ حیرانی سے الماس کی جانب گھومے۔ "کیوں الماس؟"

"اُفوہ۔ عثمان میں بیزار ہو چکی ہوں پڑھ پڑھ کر۔" اس نے ناک سکوڑی۔ "زندگی میں کیا سائنس کی ان موٹی موٹی کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے؟"

عثمان کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

"مثلاً۔ اور کیا چاہتی ہو تم زندگی میں؟" انہوں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"فی الحال صرف سکون!" وہ آرام سے بولی۔ "اور سائنس کی بکس سے کم سے کم دوفٹ کا فاصلہ۔"

صبا اور عثمان ہنسنے لگے۔

"اچھا بھئی۔ آپ دونوں سہیلیاں انجوائے کریں۔ میں مہمانوں سے نپٹتا ہوں۔" انہوں نے مسکرا کر صبا سے اجازت چاہی۔

"لگتا ہے پورا شہر انوائٹ کیا ہوا ہے آپ نے۔" صبا نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔

"بات ہی ایسی ہے ناں۔" وہ دھیرے سے ہنسے۔ "آپ بھی چونک اٹھیں گی۔"

"کون سی بات ہے؟" صبا اور الماس دونوں چونکیں۔

"سرپرائز ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے ایک جانب بڑھ گئے۔

"کیسے لگے میرے فرسٹ کزن؟" الماس نے قریبی کرسیوں کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"اچھے۔ بہت اچھے۔ ڈیسنٹ، ویل مینرڈ!" صبا نے سراہا۔ اور ہاں۔ ایک بات اور وہ یہ کہ تم آج بہت ہی اچھی لگ رہی ہو کیوٹ!"

"تھینکس۔" اس نے بال اپنی مخصوص ادا سے جھٹکے۔ "ابھی عثمان بھی یہی کہہ رہے تھے۔"

"کیا؟" صبا نے اشتیاق سے پوچھا۔

"یہی جو تم نے کہا۔" وہ مسکرائی۔

بیریٹ گرین کرتا شلوار اور نفیس کڑھائی کا دوپٹا اوڑھے الماس اپنے مخصوص امیج سے بڑی مختلف اور بڑی منفرد لگ رہی تھی۔ لائٹ پنک میک اپ نے اس کے چاند چہرے کو دلکش سی چمک بخش دی تھی۔ وہ کبھی بھی بالوں کو باندھ کر نہیں رکھتی تھی۔ سیاہ، چمکدار اور سلکی بال اس کے حسن کا ایک خاص حصہ تھے جو اس کے شانوں پر ہمیشہ پریشان رہتے اور جنہیں وہ وقفے وقفے سے ایک خاص اسٹائل سے جھٹکا کرتی تھی۔

"اور صبا! تمہارے پڑوسی ٹھیک جا رہے ہیں؟" الماس شرارت سے پوچھنے لگی۔

"پڑوسی!" صبا کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ "اوہ الماس۔ ایک بڑی ایکسائٹمنٹ کی بات تو میں نے تمہیں بتائی ہی نہیں۔"

"وہ کیا؟" الماس کے چہرے پر دلچسپی کی لہر دوڑی۔

"فیروز ہمارے گھر آئے تھے۔"

"رئیلی؟" الماس بھنویں اچکا کر مسکرائی۔

صبا اسے اس دن والا واقعہ سنانے لگی جب فیروز فون کرنے آیا تھا۔

''سچ الماس۔ میری تو جان ہی نکل گئی تھی جب میں نے انہیں اپنے گیٹ تک آتے ہوئے دیکھا تو میں کچھی بس آج تو پکی پکی بے عزتی ہوگئی۔''

''واٹ نان سنس۔'' الماس نے منہ بنایا۔ ''بے وقوف ہو تم۔ کس بات پر بھلا وہ بے عزتی کریں گے۔ تم نے ڈاکا مارا ہے ان کے گھر؟''

''ڈاکا تو نہیں مارا لیکن ایک عدد چور ضرور چھپا ہے میرے دل میں۔'' وہ ہنسی۔

''چور تو مسٹر فیروز احمد خود بھی ہیں۔'' الماس ہنسی۔

''وہ کیسے؟'' صبا نے اسے دیکھا۔

''میری پیاری سی فرینڈ کا دل جو چرا لیا ہے۔'' وہ ہنسنے لگی۔

''ویسے الماس کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی کو خبر ہی نہ ہو، ایک بندہ دن رات اسے دیکھتا ہے۔ کبھی چھپ کر کبھی بغیر چھپے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' الماس سوچ کر بولی۔ ''ویسے جب ان کے چھوٹے بھائی کو پتا چل گیا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ انہیں خود کو بھی پتا نہ ہو؟''

''اُف۔ وہ!'' صبا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''پٹاخہ ہے پٹاخہ۔''

''دیور ہے تمہارا۔'' الماس ہنستے ہوئے بولی۔

''یہ کس کے دیوروں کی بات ہو رہی ہے۔ کیا میری بات ہے کوئی؟''

اچانک عدنان ان کے سروں پر تھا۔

''یہ تم کہاں سے ٹپک پڑے۔'' الماس نے اسے گھورا۔

''آسمان سے ٹپکا تھا کئی سال قبل۔'' اس نے مسکین سی صورت بنائی۔ ''ویسے میں آپ دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے قطعاً لاعلم ہوں۔ صرف دیور کا لفظ سنا تھا اور چونکہ حال سے مطابقت رکھتا ہے، اس لیے کنفرم کرنے چلا آیا۔''

''دیور کا لفظ۔ کس کے حال سے مطابقت رکھتا ہے؟'' صبا حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

''میرے اور کس کے۔'' اس نے گردن جھکائی۔

''تم!'' الماس ہنسنے لگی ''آپ بھلا کس بدنصیب کے دیور ہو گئے؟''

محترمہ۔ اپنی شان میں خود گستاخیاں مت کیجیے۔'' وہ چڑ کر بولا۔ ''اس کام کے لیے دوسرے کافی ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ آپ کا رشتہ میرے بڑے بھائی محترم عثمان خان سے طے پا چکا ہے اور ابھی چند لمحوں میں آپ کو ایک عدد ڈائمنڈز سے بھری رنگ پہنائے جانے کا احتمال ہے۔''

''کیا؟'' الماس چیخی۔ ''تم حواسوں میں ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے کسی نے نہیں بتایا۔''

''اب میں جو بتا رہا ہوں۔'' وہ اترانے لگا۔

''تمہیں تو عادت ہے بکواس کی۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"جلد ہی میری انفارمیشنز کے معتبر......ہونے کا یقین آپ کو آجائے گا۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"اُف الماس۔آج تمہاری منگنی ہے؟" صبا کو بھی یقین نہ تھا۔

"ٹھہرو۔میں امی سے پوچھتی ہوں۔" وہ تیزی سے اٹھ کر چلی گئی۔

صبا خوشی سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔مختلف لوگوں کا جائزہ لیتی رہی۔

نجانے کیوں اسے آج کل یوں تنہا اور خاموش بیٹھنا بڑا اچھا لگنے لگا تھا۔اس کا دل چاہتا پہروں اسی طرح بیٹھی رہے۔لوگ ہنستے رہیں۔ بولتے رہیں۔اس کے آس پاس سے گزرتے رہیں لیکن کوئی اسے مخاطب نہ کرے۔اس کی تنہائی اور اس کی سوچوں میں دخل نہ دے۔اس کے خیالوں کے تسلسل میں خلل نہ پڑے۔اور جانے کیا بات تھی کہ جب بھی وہ خاموش ہوتی تنہا ہوتی، سوچ میں ہوتی۔اس کے پردہ دماغ پر صرف ایک شبیہہ اُبھرتی اور باقی سارے چہرے معدوم ہو جاتے۔

"حد ہے یہ تو۔یعنی میں ایک عاقل و بالغ، پڑھی لکھی لڑکی اور۔اور۔یہ رویہ!" بڑبڑاتی ہوئی الماس اس کے قریب آ کر بیٹھی۔

"کیا ہوا؟" صبا اپنے خیالوں سے چونکی۔

"ہونا کیا ہے۔عدنان ٹھیک کہہ رہا تھا۔" وہ سخت بھنائی ہوئی تھی۔

"یعنی۔آج انگیجمنٹ ہے تمہاری؟"

"ہاں۔"

"لیکن تم خفا کیوں ہو؟" صبا حیران ہوئی۔تمہیں عثمان پسند نہیں ہیں؟ لیکن اس دن تو تم کہہ رہی تھیں کہ کوئی بھی لڑکی جو کسی اور جگہ انٹرسٹڈ نہ ہو کبھی بھی اس پروپوزل کو ریجیکٹ نہیں کرسکتی اور یہ کہ عثمان کا ساتھ کسی بھی لڑکی کو پراؤڈ کرسکتا ہے۔"

"میں اب بھی یہی کہتی ہوں صبا۔لیکن۔"

"کیا تم کہیں اور۔" صبا کو انتہائی حیرانی تھی۔

"بچ۔صبا۔جان سے مار ڈالوں گی میں تمہیں۔" وہ جو پہلے ہی غصے میں تھی، مزید تپ کر بولی۔

"یعنی اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو تم لاعلم ہوتیں کیا؟"

"پھر۔کیا وجہ ہے اس غصے اور پریشانی کی؟"

"مجھے غصہ اس بات پر ہے صبا کہ لاکھ عثمان ایک بہترین انسان سہی۔ہر لحاظ سے بہترین سہی پھر بھی کسی نے مجھ سے جھوٹے منہ نہیں پوچھا؟ امی تک نے نہیں؟ مہناز تک نے نہیں؟ یہ تو انتہائی بیک ورڈ رویہ ہے۔مجھے اپنی فیملی سے کم از کم یہ امید نہ تھی۔میری مرضی اس معاملے میں شامل کرنا تو در کنار کسی نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ آج میری انگیجمنٹ ہے۔"

"دراصل سب تمہیں سرپرائز دینا چاہ رہے تھے۔" صبا نے رسانیت سے سمجھایا۔

"خاک سرپرائز۔" وہ جلی ہوئی تھی۔ "مجھے اس سرپرائز سے خوشی نہیں دُکھ ہوا ہے۔"

"ایسے نہیں کہتے الماس۔" صبا عاجز ہوگئی۔ "اب موڈ ٹھیک کرلو پلیز۔ بہرحال یہ کوئی غلط فیصلہ تو نہیں ہے ناں؟ تمہارے حق میں ہونے والا ایک بے حد بہترین فیصلہ ہے۔"

"پھر بھی۔ ان لوگوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں کوئی کٹھ پتلی تو نہیں۔ میں تو کبھی کسی دوسرے کی پسند سے لائے ہوئے کپڑے تک نہیں لیتی۔ ہر معاملے میں ذاتی فیصلے کی قائل ہوں۔ پھر اتنا بڑا فیصلہ مجھ سے پوچھے بغیر۔" اس نے ناپسندیدگی سے سر جھٹکا۔

"لیٹ اٹ گو الماس۔"

"اٹس ٹو مچ صبا!"

"رنگ کون پہنائے گا تمہیں؟" اس نے موضوع تبدیل کردیا۔

"عاصمہ چچی۔" اس نے سانس بھرا۔

"چلو۔ میں تو وش کردوں تمہیں۔" اس نے الماس کے گال پہ پیار کیا۔ "اور اب مسکرا دو پلیز۔ دیکھو وہ بندہ جو سامنے کھڑا ہے اتنا معمولی نہیں کہ اس کے جملہ حقوق مل جانے پر بھی یہ سڑی سی شکل بنا رکھی جائے۔"

"الماس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور مسکرا دی۔



میرے خیالوں پہ چھائی ہے

اک صورت متوالی سی

نازک سی شرمیلی سی

معصوم سی بھولی بھالی سی

رہتی ہے وہ دور کہیں

اتا پتا معلوم نہیں

کوکو جنا۔ کوکو جنا

وحید مراد کے اسٹائل میں وہ بڑی دیر سے باورچی خانے کے سامنے ڈانس کر کر کے تالیاں بجا رہا تھا۔

عفت خانم مارکیٹ گئی ہوئی تھیں اور اس نے جنا کو ستانے کا بڑا اچھا موقع نکالا تھا۔

"بے بھایا۔ وہ بے زار ہو کر دروازے تک آئی۔" کب تک ہمارا کان کھاؤ گے؟"

"جب تک ظالم سماج مارکیٹ میں ہے۔ ہاہاہا۔ جنا بائی۔ پھنس گئیں ناں آج؟"

"ہم شکایت کریں گے تمہاری۔" اس نے انگلی نچائی۔

"ڈر جائے جو شکایتوں سے وہ جوان ہم نہیں۔" ڈانس کرنے سے چونکہ سانس پھول چکا تھا لہٰذا وہ کولر سے پانی نکالنے لگا۔" اور یوں بھی امی کہاں تمہاری شکایتوں پر دھیان دیتی ہیں۔ انہیں اپنا سب سے چھوٹا سب سے لاڈلا بیٹا بہت عزیز ہے۔ جان چھڑکتی ہیں مجھ پر۔ یوں۔"

"اس نے ذرا سا پانی جنا پر چھڑکا۔

"لو۔ بگوڑا لا۔" وہ بھنائی۔

"شہروز۔" فیروز سیڑھیاں اترتا آرہا تھا۔

وہ لپک جھپک کچن سے نکل کر لاؤنج میں پڑے جھولے پر جالیٹا پھر سر نکال کر بولا۔

"جی بھائی؟"

"میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔"

"لائبریری تک؟" اس نے معصومیت سے بات کاٹی۔

"آں؟" وہ چونکا، پھر سر اٹھا کر اسے گھورا۔" کیوں؟ لائبریری کا خیال کیوں آیا تمہیں؟"

"بب۔ بس بھائی۔ یونہی۔ شوق بھی کتنا ہے آپ کو کتابیں پڑھنے کا۔ کچھ لوگوں کو آپ کو پڑھنے کا شوق ہے۔" آخری کا جملہ اس نے بڑبڑانے پر اکتفا کیا۔

"لائبریری تو نہیں۔ ایک دوست کے پاس جا رہا ہوں۔ امی آئیں تو بتا دینا۔ دیر ہو جائے تو پریشان ہو جاتی ہیں۔ گاڑی کہاں ہے؟"

"گاڑی تو بہروز بھائی جان لے گئے ہیں۔"

"اور امی؟"

"رکشا میں گئی ہیں۔"

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔ میں بائیک لے جاتا ہوں۔"

"اس نے انگلیوں سے بال سیٹ کیے اور جنا کو گیٹ بند کر لینے کا کہتا ہوا نکل گیا۔

انشا جی دُنیا والوں میں بے ساتھی، بے دوست رہے۔

جیسے تاروں کے جھرمٹ میں تنہا چاند، اکیلا چاند

شہروز رقت بھری آواز نکال کر گانے لگا۔

"جنا بائی۔ آخر ہم اس وقت تنہا کیوں ہیں؟" پھر اس نے سنجیدگی سے پالک صاف کرتی جنا کو مخاطب کیا۔" تم نے ہامی بھری ہوتی تو کیا

ہم یہ وقت دیکھتے؟"

"کاہے کی ہامی؟" وہ مصروف تھی۔اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔

"ہائے ہائے۔پوچھتے ہیں وہ کہ کاہے کی ہامی۔کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔بتلا کر ابی سے جوتے کھائیں کیا۔"

"کتنا بولتے ہو تم لڑکے؟" جمنا نے اسے گھورا۔

دیواروں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے

ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے

جمنا کو ہنسی آ گئی۔اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

"کاش کہ اس گھر میں کوئی دھنک کی ہنسی بھی گونجتی۔" اس نے سرد آہ بھری۔"کوئی مترنم آواز، کوئی غنچہ کھلنے کی صدا، چڑیوں کی چہچہاہٹ، لیکن نہیں جمنا جی نہیں۔فی الوقت تو اس گھر کے صحن اور دالان میں زلزلے آتے ہیں تمہاری مسکراہٹوں سے۔آندھیاں چلتی ہیں تمہاری ہنسی سے۔تم مت ہنسا کرو جمنا بائی۔میرا دل دہلتا ہے آئے ہائے۔" وہ پہلو بدل کر اٹھتا ہو گیا۔

"بس بول چکے؟" وہ بھنا کر بولی۔

"ابھی کہاں۔ابھی تو ٹریلر دکھایا ہے۔" اس نے چھیڑے جانے پر پھر سر اٹھایا۔"ویسے تم نے نوٹ کیا جمنا کہ میں اتنا کیوں بولتا ہوں۔"

"عادت دی ہے خدا نے۔اور کیوں۔"

"اوں ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔"عادتاً تو میں بہت شرمیلا اور کم گو ہوں۔مخالفین کو رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اصل میں میرے زیادہ بولنے کی وجہ یہ ہے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اور ہنستے رہنا چاہتا ہوں۔اگر میں نے بھی بولنا اور ہنسنا چھوڑ دیا تاں جمنا بائی تو اس گھر کی دیواریں لفظوں کو ترسیں گی۔آوازوں کی بھیک مانگیں گی۔" اس نے ہاتھ لہرا لہرا کر تقریر کی۔

"اندر کا حال تو ہم ہی جانیں گے، باہر سے دیکھنے والوں کو یہ گھر ایک بھوت بنگلے کی مانند نظر آئے گا۔آسیب زدہ اور خاموش۔جنات کا مسکن۔اور کبھی کبھار تمہیں باہر نکلتا دیکھ کر شکوک و شبہات پر تصدیق کی مہر آپ ہی آپ ثبت ہو جائے گی جمنا بائی۔ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر میں نہ بولوں تو کون ہے اس گھر میں جو بولنے کی ذمے داری قبول کرے گا۔یہ ذمے داری کوئی معمولی نہیں ہے۔بڑا بوجھ ہے میرے ناتواں کاندھوں پر۔کچھ سمجھیں۔"

"ہاں سمجھے۔" وہ اطمینان سے بولی۔"تو بولو ماں کو کہ بہو لے آئیں۔"

"ہائے ہائے۔میرے منہ کی بات چھین لی جمنا جی۔لیکن کس سے کہوں؟ کیسے کہوں؟ اب سب سے چھوٹے بیٹے کے سر پر سہرا سب سے پہلے سجے، یہ بھی بھلا نہیں لگتا۔لوگ باتیں بناتے ہیں اور مشکل یہ ہے کہ بڑے دو راضی نہیں ہیں۔"

"تو کرو راضی۔"

''کروں؟ میں کروں؟ کیسے؟'' وہ بھنایا۔

''ڈھونڈ لڑکی۔''

''لڑکی۔ بہروز بھائی جان کی عمر معلوم ہے تمہیں۔ اب ان کے لیے لڑکی نہیں عورت ڈھونڈنی پڑے گی۔ کہہ مت دینا ان سے۔ فیروز بھائی۔ بیچ بیچ۔ بے چارے سمجھتے ہیں اچھی لڑکیاں کتابوں کے ڈھیروں میں دفن ہیں۔ ڈھیر کھنگالے جاتے ہیں۔ کھنگالے جاتے ہیں۔ اب انہیں کون بتائے کہ بھائی آپ کی نظر کمزور ہے۔ چشمہ لگوائیں۔ شام کو لان میں ٹہلا کریں۔ آس پاس کے ٹیرس چیک کیا کریں۔ شاید کوئی کام کی چیز نظر آجائے۔ ہائے۔ میں غریب کس کس کو سمجھاؤں جا کر۔ ویسے ایک آئیڈیا ہے جنا میرے ذہن میں۔''

''کیا ہے؟''

''خیال...... بڑا شاندار قسم کا ہے۔ ہو سکتا ہے، یونہی کسی کا بھلا ہو جائے۔''

''کس کا؟'' جنا محض اس کی باتوں کو جاری رکھنے کے خیال سے ایک آدھ لفظ بول دیتی تھی۔

''ہے کوئی۔''

''اس نے کچھ دیر سوچا۔ چٹکی بجائی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ شرٹ کھینچ کر پتلون کے اندر کی۔ سامنے لگے دیوار گیر آئینے میں دیکھا بال سیٹ کیے۔

''کہاں جاتے ہو؟''

''ابھی آتے ہیں۔'' وہ مسکرایا۔ اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ چاروں سیڑھیاں ایک جست میں پھلانگیں اور تیز تیز قدم اُٹھاتا گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔

چند لمحوں بعد وہ برابر کے گیٹ پر کھڑا کال بیل بجا رہا تھا۔

گیٹ کھلنے پر اس نے دیکھا نجمہ بیگم سامنے تھیں۔

''اوہ۔'' وہ ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔ ''السلام علیکم آنٹی۔''

''وعلیکم السلام۔'' وہ مسکرائیں۔ ''آؤ اندر آؤ۔''

''نن نہیں۔ میرا مطلب ہے آنٹی۔ میں میسج دینے آیا تھا آپ کو۔ امی نے کہلوایا ہے کہ کل رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں۔ میرا مطلب ہے آپ اور صبا۔''

''اچھا۔'' وہ حیران ہوئیں۔ ''کوئی تقریب ہے؟''

''کوئی تقریب یونہی۔ اکیلی ہوتی ہیں ناں امی تو ہم لوگوں نے سوچا۔''

''اس نے تو سوچا تھا صبا گیٹ کھولے گی۔ جو جی میں آئے گا کہہ دے گا، اب الفاظ ترتیب دینا مشکل ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے آنٹی پھر؟''

''اچھا بیٹا۔امی سے کہنا، ہم لوگ انشاءاللہ ضرور آئیں گے۔تم اندر آؤ ناں۔''

''بس جی۔پھر کبھی۔اور ہاں وہ صبا کو بھی لائیں ساتھ۔''

''ہاں ہاں ضرور۔''

''الٹے قدموں سے وہاں پھولا سانس لے کر لوٹا۔''

''کہاں تھے؟'' جمنا نے اسے واپس آتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''ہم وہاں تھے جہاں سے ہم کو بھی خود اپنی خبر نہیں آتی۔'' جواب حسب معمول اونٹ کی کل تھا۔

''ہاں جمنا۔وہ امی سے کہنا یہ جو برابر والی آنٹی ہیں ناں، کل آئیں گی ہمارے گھر رات کو۔کہلوایا ہے انہوں نے۔اور تم کھانا ذرا اچھا بنا لینا۔دو تین ڈشیں رکھ لینا کوئی سی۔''

''ہے؟'' جمنا نے حیرت کا اظہار کیا۔''کون بولا آ کے؟''

''بس بول دیا کوئی۔'' وہ بھنایا۔''تم امی سے کہنا مت بھولنا۔''

''کھانے کا خود کہلوایا؟'' اسے اب تک حیرت تھی۔

''کوئی خود سے کھانے کا کہلواتا ہے کیا؟'' وہ چڑا۔''رات کو آنے کا کہا ہے تو ظاہر ہے ہم بغیر کھانا کھلائے تو بھیجیں گے نہیں۔بس جمنا بائی!تم بال کی کھال اُتارتی ہو۔''

''تو بھلا ناراض کیوں ہوتے ہو۔''

''نہیں ہوتے۔'' اس نے فوراً دانت نکالے۔''اچھا اب ما بدولت اپنے کمرے میں جاتے ہیں۔مقصود کچھ مطالعہ ہے۔امی حضور آئیں تو ہمیں کھانے کے وقت نیچے بلا لیا جائے۔ہم نہیں آئیں گے، پھر کھانا اوپر بھیج دیا جائے۔''

''شاہانہ انداز میں چلتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

جمنا مسکراتے ہوئے اسے جاتا دیکھتی رہی۔



نوٹس تیار کرتے کرتے اس نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا
موسم بڑا خوبصورت ہو رہا تھا۔ بادلوں کے نیلے اور سرمئی ٹکڑے آسمان پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور دور سورج مغرب میں اُترتا نظر آ رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہیں بجو؟" پاس بیٹھی ریشم نے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ مسکرائی۔ "آسمان دیکھ رہی ہوں۔"

"کتنے رنگ بکھرے ہوئے ہیں ناں۔" وہ شرارت سے پوچھنے لگی۔

"ہاں۔"

"کہاں؟" میں تو آپ کے چہرے کی بات کر رہی ہوں۔" وہ ہنسی۔

"نیلم نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا۔

"بہت بولتی ہو ریشم۔ مریم کہاں ہے؟"

"نیچے ہے۔ شاید اماں کے پاس ہے۔"

"اسے بھی اوپر بلا لو ناں۔ کتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔"

"جی ہاں۔ ویسے جب سے چچی جان آ کر گئی ہیں، موسم تب سے اچھا ہی ہو رہا ہے۔"

"ریشم!" نیلم نے اسے گھورا۔

پاس بیٹھی کڑھائی کرتی شبنم زور سے ہنس دی۔

"بجو۔"

"کہو؟" وہ دوبارہ نوٹس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"چچی جان کہہ رہی تھیں کہ وہ جلد رسم ادا کرنے آئیں گی۔"

"اچھا۔" اس نے دلچسپی ظاہر نہ کی۔ پین دانتوں میں دبا کر کتاب کے صفحے پلٹنے لگی۔

"آپ کو خوشی نہیں ہو گی؟" ریشم نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"فی الحال تو مجھے صرف ایک بات سے خوشی ہو گی وہ یہ کہ میری انگریزی کی تیاری اچھی ہو جائے۔"

"توبہ بجو۔ بڑی بور ہیں آپ۔" وہ اس کی باتوں سے اکتا کر شبنم کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "شبنم آپی آپ بتائیں۔ ہم کیسے کپڑے بنوائیں گے نیلم بجو کی منگنی میں؟"

"بھئی، میں تو وہ فیروزی سوٹ سلواؤں گی جس میں میں نے رنگین دھاگوں سے کڑھائی کی ہے۔"

''شبنم آپی۔ایک وہ اورنج سوٹ بھی تو ہے۔'' ریشم ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''وہی جس پر آپ نے شیشوں کا کام کیا ہے۔''

''ہاں۔وہ بھی ہے۔''

''پھر۔وہ تو بے کار پڑا ہے ناں یونہی۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا؟'' شبنم نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ''مجھے تمہاری نیت صاف نہیں لگتی۔''

''ہے بھی نہیں۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''وہ سوٹ مجھے کافی اچھا لگتا ہے۔''

''اچھا۔یعنی آنکھیں میں پھوڑوں اور مزے آپ اُڑائیں۔''

''کیا ہے شبنم آپی۔ذرا سی کڑھائی ہی تو ہے۔'' وہ لاڈ میں آ کر بولی۔

''اچھا اچھا سوچوں گی۔'' اس نے موضوع بدل دینے کی غرض سے کہا۔

''جلد فیصلہ کر لیجیے گا تاکہ پھر میں انکار ہونے کی صورت میں کچھ اور سوچوں۔''

''تینوں اس بات پر ہنسنے لگیں۔

''السلام علیکم۔''

''ان کی ہنسی کی آواز میں ایک مدھم سی آواز اُبھری۔تینوں چونک اُٹھیں۔

سامنے یوسف کھڑے تھے۔فریش چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے۔سفید کرتا شلوار میں وہ بڑے جاذب نظر آ رہے تھے۔

''السلام علیکم یوسف بھائی۔'' شبنم اور ریشم ایک ساتھ بولیں۔

نیلم نے بے اختیار نظریں جھکالی تھیں۔اس سے نہ سلام کا جواب دیا جا سکا اور نہ سلام کیا جا سکا۔بے وجہ ہی وہ کتاب کے صفحے پلٹنے لگی۔

''اور لڑکیو! کیسی ہو؟'' نیلم پر ایک نگاہ ڈال کر وہ ریشم کے مقابل بیٹھ گئے۔

''آپ سنائیے۔فی الحال تو آپ کی خیریت دریافت کی جانی چاہیے۔'' ریشم شوخی سے بولی۔

''وہ کیوں؟'' وہ ہنسے۔

''یہ بھی میں بتاؤں۔'' اس نے کن اکھیوں سے نیلم کو دیکھا۔ ''ویسے اب ہم آپ کو دولہا بھائی کہا کریں گے۔کیسا لگے گا آپ کو؟''

''بہت اچھا۔'' انہوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''یوسف بھائی چائے پئیں گے یا شربت؟'' شبنم چپلیں پہنتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

تمہارے ہاتھوں کی بنی ہوئی مزے دار چائے۔'' وہ خوش دلی سے بولے۔ ''تم جانتی ہو تمہاری بنائی ہوئی چائے میں کتنے شوق سے پیتا ہوں۔''

''میں ابھی لاتی ہوں۔'' وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

"آئیں یوسف بھائی۔ چھت پر ٹہل لگائیں۔ دوسروں کے گھروں میں جھانکتے ہیں۔ بڑا مزا آتا ہے۔" ریشم نے آفر کی۔

"نہ بھئی۔" وہ گھبرا گئے۔ "پٹواؤ گی کیا؟"

"اچھا بابا نہیں جھانکتے، ٹہلتے تو ہیں۔"

"چلو۔" وہ راضی ہو گئے۔

نیلم دبی دبی مسکراہٹ لیے کتاب پر جھکی رہی۔ کبھی کبھی یونہی نگاہ اٹھا کر دیکھ لیا کرتی۔

تھوڑی دیر ٹہل لگا کر وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ ریشم دور دیوار پر کہنیاں جمائے تاکا جھانکی کرتی رہی۔

ان کے آ کر بیٹھنے پر نیلم کے ہاتھ سست پڑ گئے۔

"نیلی۔" انہوں نے ہولے سے اسے پکارا۔

"جی۔" جھکی پلکوں کے تلے اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"خوش ہو؟"

"جواب میں وہ صرف ہولے سے ہنس دی۔

"امی اب جلد ہی شادی کی تاریخ رکھوانے آئیں گی۔" انہوں نے اسے مطلع کیا۔

"شادی کی تاریخ؟" اس نے اس بات پر حیرانی سے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "اتنی جلدی؟"

"کتنی جلدی؟" وہ ہنسے۔ "تمہیں کیا اعتراض ہے اگر جلدی ہے بھی تو؟"

"لیکن ابھی تو مجھے ایگزام دینا ہے۔"

"ہاں تو دے لو۔" وہ اطمینان سے بولے۔ "اب اتنی بھی جلدی نہیں ہے لیکن تمہارے امتحانوں کے فوراً بعد چند لمحے دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ نیلم اتنی کم گو نہ تھی اور یوسف سے باتیں بھی کیا کرتی تھی لیکن آج اسے ایک عجیب سا حجاب محسوس ہو رہا تھا۔

"نیلم۔" پھر یوسف نے خاموشی کو توڑا۔ "شادی کے بعد تم اگر امی جان کا رویہ کچھ اور محسوس کرو تو خود کو سنبھال لینا۔ میرا مطلب ہے ہو سکتا ہے تمہیں ان کے رویے میں فرق محسوس ہو لیکن پلیز میری خاطر تم خود پر کنٹرول کر لینا۔"

"کیا مطلب؟" یہ بات اس کے لیے بڑی عجیب اور غیر متوقع تھی۔ اس نے حیرانی سے یوسف کو دیکھا۔

"امی جان نے یہاں کچھ نہیں کہا۔" وہ کچھ ہچکچائے۔

"آپ بتائیے کیا بات ہے۔ اگر چچی جان نے کچھ کہا بھی ہوگا تو کم از کم میں لاعلم ہوں۔" وہ سکون سے پوچھنے لگی۔

"دراصل۔ امی میرا رشتہ شبنم کے لیے لانا چاہ رہی تھیں۔ اور یونس بھائی کا تمہارے لیے۔" انہوں نے اس سے کچھ نہ چھپانے کا فیصلہ کرتے ہوئے بتایا۔

''اوہ۔'' وہ شاکڈ ہوئی۔لیکن چند لمحوں کے لیے۔''پھر؟''

''پھر میں نے اپنی پسند کا اظہار کر دیا۔تم جانتی تو ہو گی نیلم۔میں ہمیشہ سے تمہارا ساتھ پانے کا متمنی ہوں۔ہر چند کہ میں نے آج تک تم سے کچھ نہیں کہا لیکن حقیقت سے تم بھی بے خبر نہ ہو گی۔امی جان نے اس پسند میں تمہیں بھی گھسیٹ لیا۔''

''نیلم ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔وہ جان گئی تھی کہ چچی جان نے کیا سمجھا ہو گا۔اسے ان کا رویہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا لگا تو تھا لیکن اس نے گہرائی سے سوچا نہ تھا اور یوں بھی یوسف کا ساتھ ملنے کی نوید ہی ایسی تھی کہ اس نے دوسری کوئی بات محسوس ہی نہ کی تھی۔

''دراصل امی ہمیشہ سے شبنم کو پسند کرتی رہی ہیں۔'' یوسف نے بات جاری رکھی۔'' کیونکہ آمنہ کی سہیلی ہونے کے ناتے سے اس کا ہمارے گھر آنا جانا زیادہ رہا ہے۔اسی لیے قدرتی طور پر شبنم تمہاری نسبت امی اور آمنہ کے زیادہ قریب ہے۔لیکن یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔میں تمہیں اور تمہاری نیچر کو سمجھتا ہوں تم اتنی اچھی ہو کہ جس کے قریب رہو گی وہ خود بخود تمہیں چاہنے لگے گا۔اور پھر امی جان کی وقتی ناراضگی ہے۔تم بھی ان کی بھتیجی ہو شبنم کی طرح۔''

''چچی جان راضی کیسے ہوئیں؟'' اس نے سر جھکا کر پوچھا۔

''یونس بھائی کی وجہ سے۔'' وہ مسکرائے۔''وہ ثریا کو پسند کرتے ہیں۔انہوں نے ہی امی سے کہا کہ نیلم اور شبنم تو میری بہنوں کی طرح ہیں۔ان سے تو شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔بس پھر امی نے انکے لیے ثریا کو مانگ لیا اور چونکہ یہاں تم بڑی ہو اور میری پسند بھی لہٰذا انہیں مجبور ہو کر ہامی بھرنا ہی پڑی۔''

''مجبور ہو کر؟'' اس نے زیر لب دہرایا۔

یوسف کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔انہوں نے وہ بات کہہ دی تھی جو کسی بھی لڑکی کے احساس پر تازیانہ بن کر پڑتی۔

''میں نے کہا ناں۔نیلم۔تم اتنی اچھی ہو کہ ہر کسی کو خود سے محبت کرنے پر مجبور کر دیتی ہو۔مجھے یقین ہے تم چند روز میں امی جان کا دل جیت لو گی اور پھر وہ تمہیں ناپسند نہیں کرتیں۔آخر یونس بھائی کے لیے انہوں نے تمہارا انتخاب اپنی مرضی سے کیا تھا ناں۔وہ تمہیں بھی چاہتی ہیں۔لیکن بس۔فی الحال انہیں تھوڑا غصہ ہے اور شبنم کو بہو نہ بنا سکنے کا افسوس۔پلیز نیلم میری خاطر تم ذرا صبر سے کام لینا میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں بولو میرا ساتھ دو گی ناں؟''

نیلم نے جھکا ہوا سر اثبات میں ہلا دیا۔فی الحال وہ یہ سب کچھ سن کر اور جان کر ٹینس ہو گئی تھی۔وہ خود بھی یوسف کو پسند کرتی تھی لیکن وہ ہر گز نہیں چاہتی تھی کہ یہ بات کسی کو پتا چلے۔وہ اسے کوئی غلط معنی پہنائے۔اور پھر وحیدہ چچی! وہ پرانے خیالات کی عورت تھیں اور لڑکا لڑکی کی پسند کو انتہائی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی تھیں اور پھر اس نے تو یہ بات کبھی خود سے بھی نہ کہی تھی۔نہ ہی کبھی یوسف کو ایسا کوئی احساس ہونے دیا تھا کہ وہ انہیں چاہتی ہے۔کجا یہ کہ یہ بات وحیدہ چچی کے علم میں آ گئی اور انہوں نے اس بات کو غلط رنگ میں سوچا۔

''کیا سوچنے لگیں نیلم؟''

"جی۔" وہ چونکی۔ "کچھ بھی نہیں۔"

شبنم کے چائے لانے تک ریشم بھی ان کے پاس آ کر بیٹھ چکی تھی۔

"یہ تکلف کیوں؟"

"چائے کے ساتھ سینڈوچز اور شاہی ٹکڑے دیکھ کر یوسف بول اُٹھے۔

"سینڈوچز بازار کے ہیں اور شاہی ٹکڑے میں نے بنائے ہیں۔اماں کی ہدایت پر۔" شبنم نے اطمینان سے بتایا۔ "دراصل اب آپ اس گھر کے بڑے داماد ہیں۔ ہونے والے ہی سہی۔ سو آپ کی خدمت ہمارا فرض ہے۔"

"پھر تو میں روز روز آنے لگوں گا۔" وہ ہنسے۔

"رپہ سلسلہ بند ہو جائے گا اماں کی طرف سے۔" ریشم ہنسنے لگی۔

"اچھا!" وہ مایوس ہوئے۔

یوسف کے چلے جانے کے بعد وہ چھت پر بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔مریم بھی آ کر ان کی گفتگو میں شریک ہو گئی تھی۔

"بجو۔" یکایک ریشم نے اسے مخاطب کیا۔ "آپ یوسف بھائی کو پسند کرتی ہیں؟"

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ "یہ کیا بات پوچھی تم نے؟"

"میرا مطلب ہے اگر آپ کا رشتہ کہیں اور ہوتا تو دُکھ ہوتا آپ کو؟"

"بے وقوفوں جیسی باتیں مت کیا کرو۔" وہ ذرا غصے سے بولی۔ "مجھے بھلا کیا فرق پڑتا۔وہ یوسف ہوں یا کوئی اور۔بس جہاں اماں نے ہاں کہہ دی۔"

"میں نے تو یونہی پوچھا تھا ناراض کیوں ہوتی ہیں۔" وہ مسمسی صورت بنا کر بولی۔

"ہر جمعرات کو ٹی وی کے آگے بیٹھ کر شوق سے پوری فلم دیکھتی ہو ناں، یہ باتیں اسی کا نتیجہ ہیں۔"

نیلم نے اسے مزید ڈانٹا۔وہ جانتی تھی ریشم جس عمر میں تھی اس میں لڑکیوں کے ذہن کتنے کچے اور ناپختہ ہوتے ہیں اور ایسی باتوں کا کس قدر اثر قبول کرتے ہیں سو وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ذہن میں کوئی بھی ایسا ویسا خیال جڑ پکڑے۔

غالباً یہ بات اس نے یوسف کو کافی دیر نیلم سے محو گفتگو دیکھ کر اخذ کر لی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ لوگ دوسری باتیں کرنے لگیں اور بات آئی گئی ہو گئی۔



کھلی ہوئی کھڑکی پر لہراتے سفید جالی کے پردے کے عقب میں چمکتے چاند کی دودھیا روشنی سے کمرا روشن ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی مستانی ہوا کا کوئی جھونکا جب براق پردے سے ٹکراتا تو پورے کمرے میں رات کی رانی کی بھینی بھینی مہک پھیل جاتی۔

الماس کارپٹ پر کشن رکھ کر نیم دراز تھی۔ ڈیک پر مدھم سروں میں بجتی موسیقی لطف اندوز ہو رہی تھی۔ رات کو سونے سے قبل کچھ دیر وہ اپنی پسند کی موسیقی سننے کی عادی تھی۔ اس عمل کے بغیر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور رہا کرتی تھی۔

دروازے پر ہلکے سے دستک ہوئی تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ ریموٹ سے ڈیک کو آف کیا اور گھڑی کی چمکتی سوئیوں کو دیکھا وقت کا اندازہ کیا۔ ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔

اُٹھ کر اس نے لائٹ جلائی اور بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

”آپ؟“

دروازے پر کھڑے عثمان کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ ”اس وقت؟“

”ہاں وقت تو کافی نامناسب ہے!“ وہ مسکرائے اور بغور دیکھنے لگے۔

سفید لیس کی نائٹی میں وہ بے تحاشا حسین لگ رہی تھی۔ میک اپ سے مبرا چہرا بڑا فریش اور جاذب نظر دکھائی دیتا تھا۔ نیند سے بوجھل غلافی، سیاہ آنکھیں وہ ان پر حیرانی سے جمائے کھڑی تھی۔

”آپ اندر آجائیں۔“ الماس نے ہٹ کر انہیں راستہ دیا۔

”نہ نہیں۔ میرا خیال ہے یہ مناسب نہ ہوگا نیچے لان میں چلیں؟ کچھ دیر ٹہل لیتے ہیں۔“

وہ تھوڑی دیر خاموش کھڑی رہی۔ یہ وہ وقت تھا جب اسے سخت نیند آنا شروع ہوئی تھی لیکن عثمان کا انداز بتاتا تھا کہ وہ اس سے کوئی خاص بات کہنا چاہ رہے تھے۔

”دل نہیں چاہ رہا؟“ عثمان نے اسے غور سے دیکھ کر اس کے تاثرات کا اندازہ لگانا چاہا۔ ”یا کوئی اور بات ہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ اس نے اپنی ازلی لاپروائی سے شانے جھٹکے۔ ”چلیے چلتے ہیں۔“

دونوں ایک دوسرے کی ہمراہی میں قدم اُٹھاتے، سیڑھیاں اور برآمدے طے کرتے باہر آگئے۔

”کتنی خوبصورت رات ہے۔“ عثمان نے رات کی رانی کی خوشبو اپنے اندر اُتارتے ہوئے آسمان پر چمکتے چاند کو دیکھا۔

”اچھا!“ وہ ہنس دی۔ ”ایسی کون سی خاص بات ہے اس رات میں؟“

”تمہیں چودھویں کی راتیں پسند نہیں؟“ انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا جو لان میں جلتے لیمپ کی دودھیا روشنی میں خود بھی ایک چاند کی طرح اجلی اور روشن نظر آتی تھی۔

”مجھے تو ساری راتیں ایک سی لگتی ہیں۔“ اس نے بال جھٹکے۔ ”گرمیوں کی راتیں ہوں تو اے سی آن کر کے مزے سے سو جاؤ۔ سردیاں

ہوں تو بلینکٹ میں دبے رہو۔ چاند کا کیا کرنا ہے؟"

"بڑی بدذوق ہو۔" انہوں نے ہنس کر کہا۔

"شاید!" اس نے اعتراف کرلیا۔ "صبا بھی آپ کے ہی جیسی ہے۔ اسے بھی یہ باتیں بہت اٹریکٹ کرتی ہیں۔"

"کون سی باتیں؟"

"یہی۔ پورے چاند کی راتوں کی، خوشبو کی، پھولوں کی شاعری کی۔ ارے ہاں۔ وہ کتابیں پسند آئیں آپ کو؟" اسے اپنے دیے ہوئے گفٹ کا خیال آیا۔

"بے حد۔ بڑا عمدہ انتخاب ہے۔" انہوں نے سراہا۔

"صبا کا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی۔ "مجھے لٹریچر وغیرہ کے بارے میں کچھ علم نہیں۔"

"ویسے تحفہ اپنی پسند سے دینا چاہیے۔" وہ دبے دبے انداز میں بولے۔

"میں نے کہا ناں۔ مجھے ان چیزوں کے بارے میں زیادہ علم نہیں۔"

عثمان ایک بار پھر اسے غور سے دیکھنے پر مجبور ہوگئے۔ اس کا یہی مختلف و منفرد انداز تھا جو انہیں متاثر کرتا تھا۔ وہ کچھ نہ بھی بولتی تب بھی اس کا ہر انداز اپنے اردگرد موجود ہر شے سے ایک خاص لاتعلقی اور بے نیازی کا اظہار کرتا تھا۔ جیسے اسے کسی شے اور کسی شخص سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ جیسے دُنیا میں ایک اسی کی ذات نمایاں اور باقی ہر شے مدھم ہو، مٹی مٹی سی ہو۔ جیسے وہ کسی چیز، کسی بھی شخص سے متاثر نہ ہونے کی قسم کھا کر دُنیا میں آئی ہو۔

"آپ۔" الماس نے بمشکل روکا۔ "کچھ کہنا چاہ رہے تھے؟"

"ہاں!" انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "چاہتا ہوں۔"

"تو کہیے ناں پھر؟"

"الماس۔"

وہ ٹہلتے ٹہلتے گلابوں کی کیاری کے نزدیک رُک گئے۔ "میرا خیال ہے تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے۔"

"شکایت! آپ سے۔ میرا خیال ہے مجھے کوئی شکایت نہیں۔" وہ حیران ہوئی۔

"نہیں۔ تم بھول رہی ہو۔" انہوں نے جیسے کچھ جتایا۔

"تو یاد دلا دیجیے۔" وہ مسکرائی۔

"غالباً engagement کے اچانک اعلان نے تمہیں دُکھ دیا ہے۔"

"او۔" اس نے ہونٹ سکیڑے۔ "آپ سے کس نے کہا؟"

''گلاب کے پھولوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ پوچھنے لگی۔

''مہتاز نے۔ ویسے یہ بات غیر اہم ہے کہ مجھ سے کس نے کیا کہا۔ اہم بات یہ ہے کہ میں تمہاری شکایت دور کرنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا۔'' وہ استہزائیہ ہنسی۔ ''اب؟ بھلا کیسے؟''

''یوں سمجھو کہ ہماری کوئی منگنی وغیرہ نہیں ہوئی۔ تصور ہی کر لو۔'' وہ مسکرا کر کہنے لگے۔

''اچھا۔'' وہ شرارت سے بولی۔ ''چلیے کر لیا تصور پھر۔''

''اب مجھے بتاؤ۔ میں پروپوز کرتا ہوں تمہیں۔ کیا جواب ہے تمہارا؟''

''الماس کو اس کھیل میں ان کی سنجیدگی پر ہنسی آ گئی۔

''پہلے یہ بتائیں۔'' پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے مجھے پروپوز کیوں کیا؟''

''اچھی لگی ہو مجھے۔ دنیا کی ہر لڑکی سے مختلف۔ محبت ہو گئی ہے تم سے۔''

''الماس نے گہری نظروں سے انہیں دیکھا۔

''سچ کہہ رہے ہیں یا محض ایک گھسا پٹا جملہ دہرا رہے ہیں۔ اس لیے کہ یہ جملہ کسی نہ کسی سے زندگی میں ایک بار کہنا ہی ہوتا ہے۔''

''نہیں۔'' وہ مسکرائے۔ ''میرے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ ورنہ زندگی کے اتنے برس میں نے یہ جملہ کہے بغیر نہ گزارے ہوتے۔''

''الماس دھیرے سے ہنس دی۔''

''میرے پروپوزل کا جواب تو دو الماس۔''

''جواب اثبات میں ہی کیوں؟ تمہیں انکار کا حق تو حاصل ہے۔'' ''جواب اثبات میں ہے۔'' وہ مسکرا دی۔

''بدلہ چکا رہے ہیں؟''

''یہی سمجھ لو۔'' وہ مسکرائے۔

''اثبات میں اس لیے کہ آپ ایک خوبصورت شخصیت کے حامل، سلجھے ہوئے انسان ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔ وسیع النظر ہیں۔ اور ایک بات میں پہلے بھی کسی سے کہہ چکی ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کے ساتھ کسی بھی لڑکی کو پراؤڈ کر سکتا ہے۔ آپ کے پروپوزل کو ''نہ'' کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے میرے پاس۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ مطمئن ہو گئے۔ ''اب ذرا ہاتھ لاؤ۔''

''انہوں نے ایک چھوٹی سی ڈبیا کھولی۔ اندر ایک خوبصورت رنگ جگمگا رہی تھی۔

''یہ کیا؟'' الماس کو حیرت ہوئی۔ ''میری انگلی میں انگیجمنٹ رنگ موجود ہے عثمان؟''

''میں نے کہا ناں اس بات کو بھول جاؤ۔ میں چاہتا ہوں اس نئے تعلق کی ابتدا سے ہی ہر کام تمہاری مرضی اور خوشی کے مطابق ہو۔ میرا خیال ہے میری چوائس کی انگوٹھی، میرے ہاتھ سے پہن کر تمہیں زیادہ خوشی ہوگی۔'' وہ رنگ ڈبیا سے نکالتے ہوئے بولے۔

''آف کورس۔'' وہ شرارت سے ہنسی اور ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''نئے تعلق کی ابتدا مبارک ہو الماس!'' رنگ اس کی انگلی میں ڈال کر انہوں نے ہاتھ چھوڑا۔

''شکریہ!'' وہ مسکرائی۔ ''آپ کو بھی مبارک ہو۔''



بڑے اہتمام سے پریس کیے ہوئے کپڑے پہن کر اس نے قد آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ دھانی کپڑوں پر سرسوں کے پھول کھلے ہوئے تھے اور اس کا سراپا بڑا شگفتہ اور کھلا کھلا لگ رہا تھا۔ بڑی احتیاط سے اس نے چہرے کو ہلکے ہلکے گلابی میک اپ سے سجایا۔ بالوں کو برش کر کے پیلے چینڈ میں جکڑا اور ''ربما'' اسپرے کر کے بالکل تیار ہوگئی۔

''صبا بیٹی۔ کتنی دیر ہے؟'' نجمہ بیگم دروازہ کھول کر اندر آئیں تو وہ بلیک ویلوٹ کے کوٹ شوز میں پاؤں ڈال رہی تھی۔

''امی میں بالکل تیار ہوں۔'' اس نے وال کلاک پر نظر دوڑائی۔ ''چلیں؟''

''ہاں بالکل۔''

دونوں ماں بیٹی تو قیر صاحب کو بتا کر باہر نکل آئیں۔

بیل بجاتے ہوئے صبا نے دیکھا۔ اس کا ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اندر دل دھڑک دھڑک کر طوفان بپا کیے ہوئے تھا۔ ماتھے پر آتے پسینے کے قطروں کو اس نے آہستگی سے ٹشو پیپر میں جذب کر لیا۔ دل کو بیک وقت بے طرح خوشی بھی تھی اور عجب طرح کا خوف بھی۔

''بندہ آداب بجا لاتا ہے۔''

''گیٹ کھلنے کے ساتھ ہی یہ آواز کانوں سے ٹکرائی تو وہ چونکی۔ سامنے شہروز کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''السلام علیکم آنٹی۔'' اس نے زوردار سلام جھاڑا۔

''وعلیکم اسلام۔ جیتے رہو۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''آیئے۔ ہم لوگ آپ کے ہی منتظر تھے۔'' ان کے آگے آگے چلتے ہوئے وہ بولا۔

''لیکن ہم لوگ تو بالکل وقت پر پہنچے ہیں۔'' وہ بے ارادہ بول گئی۔

''کہاں۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''وہ ابھی چند لمحے قبل نکلے ہیں۔''

''کون؟'' نجمہ بیگم چونکیں۔

صبا نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

"چوہے۔" وہ فوراً بولا۔ "چوہے، آنٹی اور کون۔ ابھی بھوک شروع کرنے کی مہم پر نکلے ہیں میرے پیٹ میں، اور اب اودھم مچائے ہوئے ہیں۔"

نجمہ بیگم اور صبا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ صبا نے دل ہی دل میں اس کی برجستگی کی داد دی۔ وہ جانتی تھی، وہ جملہ اس نے فیروز کے لیے کہا تھا۔ اس کے گھر سے چلے جانے کے خیال نے اس کے اندر اداسیاں بھر دیں۔ اپنا آنا اسے بے معنی لگنے لگا۔

نجمہ بیگم اور عفت خانم باتوں میں مصروف ہوگئیں تو وہ بے مقصد ہی ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگی۔

"یہ چہرا اس قدر اُترا اُترا کیوں ہے؟" شہروز نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سرگوشی کی۔ "باہر گیٹ پر تو بڑا چہک رہا تھا۔"

"آپ ہر معاملے پر اسی طرح سوچ و بچار کرنے کے عادی ہیں کیا؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"نہیں۔ صرف چند خاص معاملات پر۔" وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔ "اور صرف چند خاص لوگوں پر۔ جو مجھے اچھے لگنے لگیں۔"

"صبا خاموشی سے مسکرا دی۔

"میرے بھائی ہیں ناں فیروز۔ شاید آپ نے بھی دیکھا ہوا نہیں۔" اس نے معصوم بن کر بات شروع کی۔ "وہ بڑے شوقین ہیں مطالعے کے۔ سی ایس ایس کی تیاری کر رہے ہیں ناں۔ بس ہر وقت کتابوں میں منہ دیے بیٹھے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کی نگاہ کمزور ہوگئی ہے۔ کب سے کہہ رہا ہوں بھائی نگاہ چیک کرالیں سنتے ہی نہیں۔ چشمہ لگوالیں تو کچھ افاقہ ہو شاید۔"

"آپ کو ان کی نگاہ کی کمزوری کا علم کیسے ہوگیا؟" وہ مسکرا دی۔

"یہ بھی بھلا پوچھنے کی بات ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "ذرا ذرا سے فاصلے کی چیزیں انہیں صاف دکھائی نہیں دیتیں۔ اب فرض کریں، وہ لان میں ہوں۔"

"شہروز۔ بیٹا جمنا سے کہو کھانا لگا دے۔" عفت بیگم نے اس کی بات کاٹ دی تو صبا نے سکون کا سانس لیا۔

"امی حضور۔ تاک کر حملہ کرتی ہیں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اُٹھ گیا۔

صبا مسکراتے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔ اسے یہ لڑکا بہت اچھا، بہت ہی اچھا لگا تھا۔ اسے دیکھ کر، اس سے مل کر اپنائیت کا ایک گہرا تاثر اُبھرتا تھا۔ جیسے اس سے ہمیشہ کی شناسائی ہو، جنموں کی دوستی ہو۔ اسے لگا جیسے وہ شہروز سے ہر بات کہہ سکتی ہو۔ ہر کیفیت سے اسے آگاہ کر سکتی ہو۔ پھر اس نے سوچا اسے اس کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنا اپنا سا شخص خود ہی سب کچھ جانتا تھا اور دل کی گہرائیوں سے اس کا ہمدرد تھا۔

"اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی بھلا؟"

"کھانے کی میز پر کئی ڈشیں موجود دیکھ کر نجمہ بیگم نے اپنائیت سے کہا۔

"کوئی تکلف نہیں آنٹی۔" چاولوں پر ہاتھ صاف کرتے شہروز نے جلدی سے کہا۔ "آپ کا اپنا گھر ہے جمنا نے آپ لوگوں کو بالکل اپنا جان کر یہ چیزیں بنائی ہیں۔ کھا کر آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔"

''شہروز!'' عفت بیگم نے اسے پیار سے گھورا۔ ''خاموشی سے کھانا کھاؤ۔ غضب خدا کا، پانچ برس کا تھا یہ جب جمنا اس گھر میں آئی تھی۔ اسی کے ہاتھوں میں پلا بڑھا ہے اور مجال ہے جو ذرا تمیز سے، ادب سے مخاطب کرے۔ دن بھر اسی کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ عجب لڑکا ہے۔''

''ہمارا اپنا بچہ ہے۔'' جمنا نے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ''ہمیں برا نہیں لگتا اس کی باتوں کا۔ جو چاہے کہے۔ ہمارے تو کلیجے کی ٹھنڈک ہے یہ۔''

''ہاں جمنا۔'' اس نے فوراً محبت بھری آواز نکالی۔ ''میں بھی یہی کہتا ہوں کہ تم سے ہی اس گھر کی رونق ہے۔ تم تو میری آنکھوں کا موتیا ہو۔ میرے دل کا سوراخ۔ جگر کا پیلیا۔''

پانی پیتی صبا کو اچھو لگ گیا۔ عفت بیگم نے اسے ان بے ہودہ ڈائیلاگز پر کڑے تیوروں سے گھورا جبکہ جمنا اور نجمہ بیگم کے اس کی بات سمجھ میں ہی نہیں آئی۔

کھانے کے بعد وہ سب باہر لان میں آ بیٹھے۔

''صبا۔'' شہروز نے اسے مخاطب کیا۔ ''مطالعہ سے دلچسپی ہے آپ کو؟''

''کیوں نہیں۔'' وہ مسکرائی۔ ''مجھے تو جنون ہے کتابیں پڑھنے کا۔''

''اچھا۔ چلیے آیئے پھر۔'' وہ کھڑا ہوا۔ ''آپ کو ایک لائبریری دکھائیں۔''

''واقعی؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کی ہمراہی میں وہ گھر کے اندرونی حصے میں آ گئی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دونوں اوپر کی منزل پر آ گئے۔

''کس کا کمرا ہے یہ؟'' شہروز نے دروازہ کھولا تو وہ اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''اپنا ہی سمجھیے۔'' اس نے کہہ کر شرارت سے نچلا لب دانتوں میں دبا لیا۔

''واؤ۔'' اس نے ادھر ادھر گھوم کر شیلف سے جھانکتی کتابوں کو دیکھا۔ ''اتنی بے تحاشا بکس۔''

شہروز راکنگ چیئر پر دراز ہو کر اسے دلچسپی سے کتابیں دیکھتے ہوئے دیکھتا رہا۔

مختلف کتابوں پر سے ہوتی ہوئی صبا کی نگاہ سائیڈ ٹیبل پر رکھی تصویر پر گئی۔

''اوہ۔ شہروز۔'' وہ بے اختیار مڑی۔ ''یہ۔ یہ ان کا کمرا ہے؟''

''جی!'' وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر مسکرایا۔ ''انہیں کا ہے۔ کم از کم اتنی کتابیں، ضخیم قسم کی۔ میرا معدہ افورڈ نہیں کر سکتا۔ ویسے آپ گھبرا کیوں گئیں۔ میرے بھائی ہیں۔ کوئی آسیب یا بھوت پریت تو نہیں جن کے کمرے میں آ کر آپ کا رنگ اُڑ جائے۔''

''نن۔ نہیں۔'' وہ مسکرائی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔ نجانے تم کیا سمجھتے ہو۔''

''میں تو کچھ نہیں سمجھتا۔'' اس نے بھولی سی صورت بنائی۔ ''میں تو بہت معصوم ہوں۔''

''تمہارے جو بڑے بھائی ہیں۔بہروز۔'' اس نے بات پلٹ دی۔''وہ کہاں رہتے ہیں؟؟ بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔''

''بہروز بھائی بزنس سنبھالتے ہیں ناں۔ابو کی وفات کے بعد سے سارا کام انہیں کے کاندھوں پر آ گیا۔مصروف زندگی گزارتے ہیں۔ گھر آنے کی فرصت بھی کم کم ملتی ہے انہیں۔''

'' نیچے بائیک کا مخصوص ہارن بجا تو شہروز نے چونک کر پہلے گھڑی کو اور پھر صبا کو دیکھا۔وہ بے خبری کے عالم میں کسی کتاب کا دیباچہ پڑھنے لگی۔

''صبا۔آپ یہیں ٹھہریں۔میں کافی لاتا ہوں۔جمنا بنا چکی ہوگی۔''

''جلدی آ جاؤ۔'' وہ ایک نظر ڈال کر بولی۔

شہروز کے کمرے سے نکلنے کے بعد اس نے کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی اور آہستہ آہستہ چلتی فیروز کی تصویر تک آ گئی۔سنہرے فریم میں مقید، مسکراتی، زندگی سے بھرپور تصویر تھی۔صبا نے اسے اُٹھایا اور بغور دیکھنے لگی۔

چمکتی ذہین آنکھیں، کشادہ پیشانی، سیاہ ہلکے گھنگھریالے بال، ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ۔

صبا اسے پکڑے، دیکھتی ہی چلی گئی۔

بائیک کھڑی کر کے وہ لان میں بیٹھی امی اور نجمہ کو سلام کرتا اندر چلا آیا۔کچن میں شہروز اور جمنا کی آوازیں آ رہی تھیں۔جانے شہروز اسے کیا بنانا سکھا رہا تھا۔

مسکراتے ہوئے وہ اوپر چلا آیا۔

کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے اسے ایک جھٹکا لگا۔اس کے بیڈ کے کنارے ٹکی ہوئی۔ہاتھ میں پکڑی اسی کی تصویر میں کھوئی وہ لڑکی اسے ایسا بم لگی جو کسی نے اس کے دماغ میں بلاسٹ کر دیا ہو۔ایک ساتھ کئی دھماکے ہوئے۔ذہن میں کئی تصویریں بن کر مٹیں۔مٹ کر دوبارہ بنیں۔

''کون ہو تم؟'' وہ بولا تو اس کی آواز اس کا لہجہ اس کے اپنے قابو میں نہ تھا۔شدتِ جذبات سے پھٹتا لہجہ، کانپتی درشت آواز۔

چونک کر کھڑی ہوتی صبا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔تصویر اس کی گود سے پھسل کر نیچے کارپٹ پر گر گئی۔

''کس کی اجازت سے داخل ہوئیں میرے کمرے میں۔'' وہ چند قدم آگے بڑھا۔

صبا کا خوف اور دہشت سے برا حال ہو گیا۔وہ تو کوئی اور تھا۔کوئی پاگل، جنونی جو خود اپنے آپ میں نہ تھا۔

''م۔م۔'' اس کی آواز گلے میں پھنس گئی۔

''اس سے پہلے کہ میں تم پر ہاتھ اُٹھاؤں۔دفع ہو جاؤ یہاں سے۔چلی جاؤ اپنا منحوس وجود لے کر۔گیٹ لاسٹ۔'' وہ بری طرح چیخا۔

نجانے کہاں سے اس کے بے جان قدموں میں اتنی توانائی آ گئی کہ وہ پاگلوں کی طرح دوڑی۔دوڑتی چلی گئی۔

سیڑھیاں چڑھتے شہروز سے وہ بری طرح سے ٹکرائی تھی۔ کافی کے کپ اور ٹرے، سیڑھیوں پر گر کر نیچے تک لڑھکتے چلے گئے۔ سیڑھیوں پر بہتی کافی کی طرح صبا کے آنسو بھی رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

''صبا۔صبا کیا ہوا ہے؟'' شہروز نے اسے کاندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔



اس کے لبوں سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا، صدمے اور خوف سے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اس متین، سنجیدہ، بردبار لڑکے کو وہ ایک پاگل، جنونی شخص کے روپ میں دیکھے گی، اس کے وہم وگمان میں نہ تھا۔

شہروز اب خاموش کھڑا اسے آنسو پونچھتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں شرمندگی تھی، تاسف تھا۔

شہروز۔صبا۔بیٹا کیا ہوا؟''

عفت خانم، نجمہ بیگم اور جنا آوازیں سن کر حیران پریشان آئی تھیں۔

''صبا۔صبا بیٹی۔'' نجمہ بیگم نے جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر اسے خود سے لپٹایا۔ ''کیا ہوا ہے بیٹی؟''

''ارے آنٹی۔بس دیکھ لیا ہے آپ کی بیٹی کو۔'' شہروز عفت سے ہنسا۔ ''بس اتنا سا دل ہے کسی جتنا۔ میں نے کتاب میں نقلی چھپکلی رکھ دی تھی، اس پر نگاہ پڑتے ہی یہ حال ہو گیا ہے ان کا۔ بھلا نقلی چھپکلی سے بھی کوئی ڈرتا ہے؟ وہ تو کاٹتی بھی نہیں۔''

صبا خاموش کھڑی نچلا ہونٹ چباتی رہی۔

''شہروز۔تم اس قدر بدتمیز ہو چکے ہو کہ تمہیں آئے گئے کا بھی لحاظ نہیں رہا۔'' عفت خانم نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''وہ بچی کتنے خلوص سے آئی ہے۔اور تم نے یہ کیا ہے اس کے ساتھ۔''

''امی جان۔وہ۔'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا۔ ''دیکھیے ناں، انہوں نے بھی تو بدلہ چکا لیا ہے۔ ہمارے کپ بھی توڑ ڈالے اور کافی بھی ضائع کر دی۔''

''خاموش رہو بدتمیز۔ آؤ بیٹی میرے ساتھ آؤ۔ یہ لڑکا تو بالکل میرے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ آخر اس سے بڑے بھی دو ہیں۔ کس قدر بردبار بچے ہیں۔ یہ تو نجانے کس پر گیا ہے۔''

وہ صبا اور نجمہ کے ہمراہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ جنا ٹرے اٹھا کر اس میں کپوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جمع کرنے لگی۔

سارے ٹکڑے اٹھا کر اس نے اوپر دیکھا۔ وہ سب سے اوپری سیڑھی پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں تھا۔

''اب کاہے کو منہ لٹکا کر بیٹھ گئے ہو؟ جاؤ جا کر مناؤ بچی کو۔ پہلے ہی گھر خالی رہتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی آ جائے تو تم ایسا سلوک کرتے ہو۔''

اس نے ایک نگاہ بڑی غائب دماغی سے اس پر ڈالی جیسے جو کچھ بھی اس نے کہا وہ اس کے آس پاس سے کانوں سے ٹکرائے بغیر گزر گیا ہو۔

پھر وہ اٹھا اور سیڑھیاں پھلانگتا نیچے آیا اور لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ صبا اور نجمہ بیگم جانے کے لیے تیار تھیں۔ عفت خانم ان سے معذرت کر رہی تھیں۔

''صبا۔ آئی ایم سوری۔'' وہ اس کے قریب پہنچ کر بولا۔ میں حقیقتاً قصوروار ہوں۔ کیا آپ مجھے معاف نہیں کریں گی؟''

صبا خود پر کافی حد تک قابو پا چکی تھی۔ اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی اُتری تو اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ وہ بہت نرم طبیعت، نازک مزاج کی لڑکی تھی۔ اس طرح کے رویوں سے اس کا کبھی سامنا نہ ہوا تھا۔ وہ بھی اس شخص کی طرف سے جسے اس نے نجانے کیا سمجھا ہوا تھا۔ فی الحال تو اس کا اپنا وجود اس کے قابو میں نہ تھا۔ کہیں دل من مانی کر رہا تھا۔ کہیں آنسو اور کہیں سانسیں۔ وہ جلد از جلد اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔

ان دونوں کو خدا حافظ کہہ کر دونوں ماں بیٹی باہر نکل گئیں تو عفت خانم اس کی جانب مڑیں۔

''شہروز۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ آج تم نے بہت غلط رویے کا مظاہرہ کیا ہے۔ شرارت اور بدتمیزی کے درمیان ایک حد ہونی چاہیے، تبھی شرارت بھی قابل برداشت رہتی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں امی۔'' وہ قدرے اُداسی سے بولا۔ ''آج بہت غلط رویے کا مظاہرہ ہوا ہے، اور بہت غلط شخصیت کے ساتھ۔ آئی ایم سوری۔''

عفت خانم نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ اس طرح شرمندہ اور اداس نظر آتا، کبھی ممکن نہ تھا۔ انہوں نے بڑھ کر اسے خود سے لپٹا لیا۔

''میرا بیٹا۔ میں جانتی ہوں ایسا نہیں ہوا۔ بس آج غلطی کر بیٹھا۔''

وہ خاموش کھڑا رہا۔

''چلو اندر چلیں۔ یہاں مچھر بہت ہیں۔''

''آپ چلیں امی۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

ان کے اندر جانے کے بعد وہ دیر تک وہیں لان میں ٹہلتا رہا۔ رات کی پرچھائیوں کی طرح اس کی سوچ کی پرچھائیاں بھی گہری ہوتی جا رہی تھیں۔



وہ چاروں اسٹور میں گھسی صندوق میں سر دائے بیٹھی تھیں

''بجو۔ کہیں ناں شبنم آپی سے کہ یہ سوٹ مجھے دے دیں۔'' ریشم ایک بار پھر منمنائی۔

اس نے صندوق کے کھلتے ہی سب سے پہلے اپنا من پسند سوٹ نکال کر گود میں دبا لیا تھا۔ اورنج کھلتے ہوئے رنگ پر شبنم نے بڑی محنت

سے شیشوں کا کام کیا تھا۔اور یہ سوٹ اس نے اپنے جہیز کے لیے رکھا ہوا تھا۔

"ابھی میں کیسے کہہ سکتی ہوں۔" نیلم نے بے بسی سے کہا۔ "یہ تو تم خود کہو اس سے۔"

شبنم دونوں کی باتوں سے بے نیاز بنی اپنے لیے کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہیں شبنم آپی آپ؟" مریم جھنجلائی۔ "کیا خزانہ چھپا رکھا ہے آخر اس میں۔"

"ایک فیروزی سوٹ تھا ناں۔جس پر میں نے بلوچی کام کیا تھا۔وہ ڈھونڈ رہی ہوں۔"

نیلم اور یوسف کی منگنی کی تقریب منعقد کیے جانے کا مژدہ جب سے اماں نے سنایا تھا۔ان تینوں کو صرف کپڑوں اور زیوروں کے ذکر سے دلچسپی رہ گئی تھی۔شبنم اس سلسلے میں خود کفیل تھی،کہ اس کے پاس ہر وقت کافی تعداد میں کپڑے موجود ہوا کرتے تھے۔یہ اس کا واحد شوق تھا جس پر وہ اپنے سارے پیسے خرچ کر دیا کرتی تھی۔جبکہ ریشم اور مریم کھانے پینے اور فلم دیکھنے کی زیادہ شوقین تھیں اور ان کی پاکٹ منی زیادہ تر اسی مقصد کے تحت صرف ہوا کرتی تھی۔

"ہاں۔مل گیا۔"

"بالآخر اس کی تلاش سودمند ثابت ہوئی اور اس نے اپنا گوہر مقصود پا لیا۔

"واقعی شبنم۔یہ تو بڑا ہی خوبصورت کام ہے۔" نیلم نے سوٹ اس کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے اسے سراہا۔ "پہلے تو میں نے اتنے دھیان سے اسے دیکھا ہی نہیں تھا۔"

"کہیے۔آپ کے جہیز میں رکھ دوں؟" وہ شرارتی ہوئی۔

"نہیں۔تمہاری محنت ہے،تم ہی پہنو۔" نیلم مسکرا دی "ہم تینوں کو ہمارے گلٹو پن اور کاہلی کی سزا ملنی چاہیے۔"

"شبنم آپی۔ریشم نے اسے ملتجیانہ نظروں سے دیکھا اور گود میں چھپائے سوٹ کی جانب اشارا کیا۔

"چلو کیا یاد کرو گی کس دریا دل بہن سے پالا پڑا تھا۔" شبنم نے شیخی بگھاری۔ "لے لو۔"

"ہرا۔" اس نے نعرہ بلند کیا اور باہر نکل گئی۔

مریم وہیں بیٹھی منہ بسورتی رہی۔

"اب تمہیں بھی کچھ چاہیے ہوگا؟" شبنم نے اسے گھورا۔

"نہیں رہنے دیں" وہ جل کر بولی۔ "میں جھاڑنیں اور صافیاں ملا کر ایک عالی شان لباس تیار کر لوں گی۔"

نیلم اور شبنم قہقہہ مار کر ہنس دیں۔مریم خود بھی ان کی ہنسی میں شریک ہو گئی۔

"تمہیں ایک عدد سوٹ سے نواز دیتے ہیں۔" اس نے صندوق میں ہاتھ گھسایا۔ "لیکن خیال رکھنا،اس دن دہاڑے پڑنے والے ڈاکے کا جب اماں کو علم ہوگا ناں تب ایسی شاہکار گالیاں اور کوسنے سننے کو ملیں گے کہ نئے کپڑوں کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔"

تینوں ایک بار پھر ہنس دیں۔

اماں صبح سے حکیم سے دوائی لینے کے لیے نکلی ہوئی تھیں اور تاحال نہ لوٹی تھیں۔ اور ان کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اسٹور کی چابیاں اڑائی تھیں۔ ورنہ اماں کی موجودگی میں یہ صندوق اس مقصد کے لیے کھلتا، یہ ناممکن تھا۔ بقول ریشم کے یہ "جادوئی صندوق" کسی پری نے اماں کو اس ہدایت کے ساتھ عطا کیا تھا کہ اسے کسی لڑکی کی شادی کے موقعے پر ہی کھولا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ صندوق از خود خالی ہو جائے گا۔

مریم بھی ایک عدد سوٹ کے ساتھ خوشی خوشی باہر نکل گئی تو شبنم صندوق بند کر کے تالا ڈالنے لگی۔

"شبنم!" نیلم نے اسے فکرمندی سے مخاطب کیا۔

"جی بجو کہیے۔"

"اماں سخت خفا ہوں گی۔ ہیں ناں؟"

"کیا ہے بجو۔ ایسے خوشی کے موقعے روز روز تھوڑا ہی آتے ہیں زندگی میں۔ اور ہم کون سا نئے کپڑوں کے حریص ہیں۔ یہ تو بحالت مجبوری ایسا کرنا پڑا۔ تقریب آ ہی گئی ہے تو کپڑے تو بنوانے پڑیں گے ناں۔ چاہے بازار سے خریدیں چاہے پہلے سے رکھے ہوئے بنوائیں۔"

"کہتی تو تم ٹھیک ہو لیکن اماں کو کون بتائے گا۔ وہ تو فوراً ہی غصے میں آ جائیں گی۔"

"میں بتادوں گی۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "بلکہ سمجھا دوں گی۔"

"میرا خیال ہے اماں آ گئی ہیں۔" نیلی بولی۔

"نہیں۔ پورا ایک بج رہا ہے۔ اس وقت زلفی آتا ہے کالج سے۔ وہی ہوگا۔"

دونوں بہنیں اسٹور بند کر کے باہر آئیں تو دیکھا کہ ریشم اور مریم، یوسف کے کان کھا رہی تھیں۔

"السلام علیکم۔" دونوں نے ساتھ سلام کیا۔

"وعلیکم اسلام۔ کیا حال ہے بھئی۔" وہ بشاشت سے مسکرائے۔ "کیا ہو رہا ہے۔"

"آپ ہی کی منگنی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔" شبنم ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

"منگنی کی۔" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئے۔

"جی ہاں۔ ان دونوں چڑیلوں نے میرے اتنے قیمتی سوٹ ہتھیا لیے ہیں۔" اس نے ان دونوں کو ہنستا دیکھ کر گھورا۔ "اور میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتی کہ خوشی کا موقع ہے اور خوشیاں تو ہمیں ویسے بھی ترس ترس کر ملتی ہیں۔"

یوسف خاموش ہو کر نیلم کو دیکھنے لگے۔ ان کی نظروں میں ایک اُلجھن سی تھی۔

"یوسف بھائی! اچھی جان تاریخ رکھنے کب آئیں گی؟" ریشم نے بے تابی سے پوچھا۔ "انہوں نے ذکر تو کیا ہوگا آپ سے؟"

"نیلم، یوسف کی خاموشی اور اُلجھن کو بھانپ چکی تھی۔ وہیں دیوار سے ٹک کر ان کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

"دیکھو لڑکیو۔ یوں کرو کہ شبنم کے سوٹ اسے واپس کردو۔ جب بھی تقریب طے پائے گی میں خود تم دونوں کو مارکیٹ لے جا کر تمہاری پسند کے کپڑے دلواؤں گا۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا۔" شبنم کا جوش کچھ سرد پڑ گیا۔ "ابھی آپ لوگوں کا ارادہ نہیں ہے کیا؟ لیکن آمنہ نے تو کہا تھا کہ چچی جان فوراً تقریب رکھنا چاہتی ہیں۔"

"وہ۔ دراصل، امی کی یہی خواہش ہے کہ فی الحال اس تقریب میں مؤخر کر دیا جائے۔" بالآخر وہ سچ بولنے پر مجبور ہو گئے۔

"لیکن کیوں؟" وہ تینوں ایک ساتھ بولی تھیں۔

نیلم نے ایک نظر یوسف پر، پھر اپنی بہنوں پر ڈالی۔ تینوں کے چہرے اتر گئے تھے۔ وہ جانتی تھی انہیں اس کی منگنی کرنے کا کتنا شوق تھا۔ کتنے دنوں سے وہ پلاننگ میں لگی ہوئی تھیں اور وہ چچی جان کے انکار کی وجہ بھی سمجھ سکتی تھی۔ منگنی کرنا چاہتی تھیں لیکن شبنم کی۔ اب جب شبنم ہی ان کی بہو نہیں بن رہی تھی تو انہیں تقریب سے کیا لینا دینا تھا۔

"بھئی۔ اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چند دنوں کے لیے ملتوی ضرور کر دیا ہے۔ لیکن پروگرام تو اپنی جگہ ہے۔" یوسف نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

بیل بجنے کی آواز پر ریشم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ناصر اور انجم اسکول سے آ گئے ہوں گے۔ میں انہیں کھانا نکال دوں۔" مریم بھی کہتی ہوئی اس کے پیچھے کمرے سے نکل گئی

"آپ چائے پئیں گے یوسف بھائی؟" شبنم نے ماحول کی سنجیدگی سے گھبرا کر کھنچاؤ کو کم کرنا چاہا۔

"ہاں۔ ضرور۔" وہ مسکرائے۔ "تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پینے ہی تو آتا ہوں میں۔"

"وہ مسکرا کر باہر چلی گئی۔ نیلم کھڑی دیوار پر انگلی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتی رہی۔

"نیلی۔" انہوں نے سانس بھر کر اسے مخاطب کیا۔

"جی!"

"یہاں آؤ۔ بیٹھو یہاں۔"

"اس نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اور دیوار کے پاس سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

سنو نیلی۔ یوں بددل کیوں نظر آ رہی ہو؟"

"یوسف! آپ جانتے ہیں ناں، ہمارے گھر سے خوشی ذرا ہٹ کر ہی چلتی ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اماں تو کہتی ہیں کہ انہیں لفظ خوشی سے ہی خوف محسوس ہونے لگا ہے کہ نجانے اس کی تہہ میں کیا چھپا ہوا ہو۔ مجھے ایسا لگنے لگا ہے یوسف کہ اس خوشی کی تہہ میں بھی میرے لیے کوئی انجانا دکھ چھپا ہوا ہے۔"

"بری بات ہے نیلم۔" انہوں نے قدرے سخت لہجے میں سرزنش کی۔ "کیوں بے وجہ کی اندیشوں کا شکار ہو رہی ہو۔ اس طرح سوچنے کا انداز فوری طور پر بدل ڈالو۔ شاید میں نے تمہیں امی کے خیالات سے آگاہ کر کے غلطی کی ہے۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ ہم دونوں زندگی کے ہر معاملے پر ایک ساتھ سوچیں، ہر گتھی کو مل کر سلجھائیں۔ تم تو آغاز پر ہی ہمت ہار بیٹھی ہو۔"

"شاید میں بہت کم ہمت ہوں۔" اس نے اعتراف کیا۔

"جانتی ہو نیلم۔ جو لوگ اس طرح برملا اپنی کم ہمتی کا اظہار کرتے ہیں، بسا اوقات قسمت انہیں بری طرح آزماتی ہے۔"

"خدا نہ کرے۔" وہ خوفزدہ ہو گئی۔ "کیوں بدفالیں منہ سے نکال رہے ہیں۔"

"نہیں۔ یہ فال نہیں ہے۔ میں تمہیں سمجھنا چاہ رہا ہوں بزدلی کے اس خوف سے نکلو۔ تکلیفوں اور معمولی معمولی پریشانیوں کو فیس کرنا سیکھو اور خوشیوں کو خود آگے بڑھ کر اپنا لینے کا حوصلہ پیدا کرو ورنہ وقت از خود ایسا کرنا سکھاتا ہے اور پتا ہے نیلم، وقت بڑا سخت گیر معلم ہوتا ہے۔"

"چائے تیار ہے جناب۔" شبنم ٹرے اُٹھائے اندر داخل ہوئی۔ "کیا بات ہے؟ یہ شکلوں پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"

اس نے غور سے دونوں کو دیکھا۔

"تمہاری بہنا کو سمجھا رہا ہوں کہ معمولی باتوں کو دماغ پر طاری کر کے اداس رہنا کس قدر بے وقوفی اور نادانی ہے۔" وہ مسکرائے۔ "اب معلوم نہیں میری باتیں کہاں تک سمجھ میں آئی ہیں۔"

"کیوں بجو۔ کیا ہوا ہے؟" وہ پریشان ہوئی۔

"نہیں کچھ نہیں۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"دراصل۔ منگنی کے مؤخر ہو جانے سے یہ کبیدہ خاطر ہو گئی ہیں۔"

"اُفوہ۔ اتنی سی بات۔" شبنم ہنس دی۔ "ارے ہم منگنی کریں گے اور بڑی دھوم دھام سے چچی جان آئیں نہ آئیں۔ ہم خود گا بجالیں گے۔"

"یہ ہوئی نا مردوں والی بات۔" یوسف خوش ہوئے۔

"اور بجو۔ مجھے نہیں پتا تھا آپ کو منگنی کا اتنا شوق ہے۔" وہ شرارت سے بولی۔

نیلم ہنس دی۔

"ارے تمہاری بجو کو تو محض منگنی کا شوق ہے۔ مجھ سے پوچھو، مجھے تو شادی کا شوق ہے۔" یوسف نے ٹھنڈی آہ بھری۔

نیلم نے انہیں گھورنے کی کوشش کی مگر شبنم کی ہنسی میں اسے بھی شریک ہونا پڑا۔

"ناصر اور اقسم آ گئے ہیں؟" اس نے بات ٹالنے کی غرض سے پوچھا۔

"نہ صرف وہ دونوں بلکہ ہم دونوں بھی آ گئے ہیں۔" وقار بھائی، زلفی کے ہمراہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

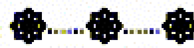
یوسف اُٹھ کر ان سے ملنے گئے تو نیلم اور شبنم اُٹھ کر باہر آ گئیں۔

''اماں آ جائیں تو دسترخوان لگا لیتے ہیں۔'' شبنم نے اظہار خیال کیا۔

''ہوں۔ٹھیک ہے۔'' اس نے سر ہلا دیا۔

اس کا دماغ مسلسل اُسی نہج پر سوچ رہا تھا۔ اسے علم تھا حمیدہ چچی ثریا کو بھی کچھ اتنا خاص پسند نہیں کرتیں اور اس سے بھی انہیں زیادہ انسیت نہ تھی۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ نجانے وہ اس گھر میں دل سے قبول بھی کی جائے گی یا نہیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ دعاؤں کو کس قدر جامع اور مکمل ہونا چاہئے۔ اس نے یوسف کو پالینے کی دعا ضرور کی تھی لیکن اس سے آگے کبھی کچھ نہ سوچا تھا۔

یوسف کے چلے جانے کے بعد اس کی سوچوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔



بستر پر لیٹ کر چھت پر نگاہیں جمائے وہ عجب خالی الذہنی کا شکار ہو رہی تھی۔

کیا ہوا تھا اور کیوں ہوا تھا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

فیروز اس کا آئیڈیل تھا۔ ایک دیوتا تھا جسے اس نے من مندر میں بسا رکھا تھا۔ اپنے آئیڈیل کو وہ اس رنگ میں دیکھے گی، بھلا اس نے کب سوچا تھا۔ اس کے تصور میں تو وہ چمکتی آنکھیں بستی تھیں۔ مسکراتے لب رچتے تھے۔ کشادہ پیشانی جگمگاتی تھی۔ وہ آنکھیں دھواں دھواں کیسے ہو گئیں۔ ان سے لہو کیوں بہہ نکلا تھا۔ وہ چہرا کن جذبات کے زیر اثر مسخ ہوا تھا۔ اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔

''کیا وہ پاگل ہے؟ ذہنی مریض ہے؟ جنونی ہے؟''

''مختلف سوالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

فون کی بیل بجنے پر اس نے سوچی سوچی آنکھوں کو مسلا اور اُٹھ کر بے دلی سے ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو۔صبا بات کر رہی ہیں؟'' دوسری جانب سے گمبھیر آواز آئی۔

وہ دھک سے رہ گئی۔ ہر چند کہ اسے بہت کم بولتے سنا تھا لیکن وہ اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتی تھی۔

''جی!'' وہ آہستگی سے بولی۔

اس کا تنفس خود بخود تیز ہونے لگا۔

''میں فیروز احمد ہوں۔ آپ پہچانتی ہیں ناں مجھے۔'' وہ رُک رُک کر بول رہا تھا۔

''جی۔جی۔'' اس نے تھوک نگلا۔

''صبا مجھ میں نہیں آتا بعض باتیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور کہاں ختم ہوتی ہیں۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

''اور مجھے تو یوں بھی لوگوں سے بات کرنے کا زیادہ تجربہ ہے نہ سلیقہ۔ آپ کے ساتھ کل جو کچھ بھی ہوا، مجھے اس پر افسوس بھی ہے

اور شرمندگی بھی۔ دراصل میں آپ لوگوں کی آمد سے بے خبر تھا ورنہ آپ کو اپنے کمرے میں دیکھ کر اتنا شاکڈ نہ ہوتا۔ بہرحال غلطی صرف میری ہے اور میں اس کے لیے شرمسار ہوں۔"

"لیکن۔ میں اس رویے کی وجہ سمجھ نہیں سکی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"وجہ!" اس نے گہری سانس بھری۔ "بہت سے رویوں کی وجہ بہت گہرائیوں میں دفن ہوتی ہیں مس صبا۔ انہیں وہاں سے نکالنے اور کسی کے سامنے پیش کرنے کے تصور سے ہی پورا وجود ہل جاتا ہے۔ اس لیے رہنے دیں۔ آپ ہماری پڑوسی ہیں اور پہلی مرتبہ ہمارے گھر آئی تھیں۔ میں اس واقعے پر ایک مرتبہ پھر آپ سے معافی مانگتا ہوں۔"

"وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن لائن ڈسکنکٹ کی جا چکی تھی۔ وہ ریسیور کو بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔ نجانے اس شخص کی ذات میں کون سے بھید چھپے تھے۔ اس کا دھیما لہجہ، اس کی شرمندگی، شرمساری، اس کا دل پانی پانی ہونے لگا تھا۔

اپنی جگہ سے ہٹ کر وہ دریچے میں آ کھڑی ہوئی۔

کس نے بکھیرا ہے تمہیں فیروز احمد۔" اس نے افق پر نظریں جما کر اس کے تصور کو مخاطب کیا۔ "اپنا آدھا بوجھ مجھے بخش دو۔ نجانے کبھی مجھے اس قابل بھی سمجھو گے یا نہیں۔"

اس نے پلکوں کو جھپک کر آنکھیں صاف کیں اور مڑ گئی۔



تیز ہوا سے بکھرتے بالوں کو سمیٹتی، ہنستی مسکراتی الماس مسلسل عثمان کی نگاہوں کی زد میں تھی۔

"دیکھو لڑکی۔" عدنان نے مہوش کے کانوں میں سرگوشی کی۔ "بھائی جان کے کیمرے کے فوکس میں کون ہے۔؟"

"ظاہر ہے کہ ان کی منگیتر ہوں گی۔" اس نے منہ بنایا۔ "لیکن آپ کو دوسروں کی فکر کیوں کھائے جا رہی ہے۔ آپ یہاں پکنک منانے آئے ہیں یا جاسوسی کرنے۔"

"جاسوس اگر پکنک منانے جاتے ہیں تو پیشہ ترک کر کے نہیں جاتے۔" وہ ہنسا۔ "ہم جہاں رہتے ہیں اپنی دونوں آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔"

"کسی دن کوئی جل کر پھوڑ ڈالے گا یہ آنکھیں۔" عمران منہ پر کیپ رکھے لیٹا تھا۔ وہیں سے بولا۔ مہوش کھلکھلا کر ہنس دی جبکہ عدنان بھنا اٹھا تھا۔

ان کا پورا خاندان کینجھر جھیل پر پکنک منانے آیا ہوا تھا۔ سب نے مل کر پہلے کھانا کھایا تھا، گرم گرم چائے پی تھی پھر عمر کے حساب سے ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ الماس، مہناز، سیماب اور عثمان ساتھ بیٹھے تھے جبکہ عدنان، عمران، کاشف اور مہوش نے ان سے ذرا ہٹ کر پڑاؤ ڈالا تھا۔ عاصمہ چچی اور راشدہ بیگم چادر بچھا کر نیم دراز تھیں۔

الماس کے والد طاہر خان عرصہ دراز سے سعودی عرب میں مقیم تھے۔ اسی لیے وہ لوگ اپنے چچا دلاور خان اور ان کی فیملی کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے کیونکہ ان کا کوئی بڑا بھائی بھی نہیں تھا۔ الماس، مہناز اور مہوش تین بہنیں تھیں اور کاشف ان کا اکلوتا بھائی۔

عثمان دلاور خان کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان سے چھوٹی سیماب تھی اور پھر عدنان اور عمران تھے۔

دونوں گھرانوں میں بلا کا اتحاد و اتفاق تھا۔ کسی کو احساس ہی نہیں ہو پایا تھا کہ یہ دو خاندان ہیں۔ سب حقیقی بہن بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی تکلیفوں پر روتے بھی تھے اور لڑتے جھگڑتے، روٹھتے منتے بھی رہتے تھے۔

کیوں بھئی عثمان بھائی۔" عدنان نے اپنی جگہ سے ہی ہانک لگائی۔ "جھیل کی سیر نہیں کرنی آپ کو؟"

"کیوں نہیں کرنی۔" وہ مسکرائے۔ "پکنگ ادھوری تھوڑا ہی چھوڑنی ہے۔ چلو بیٹھو تم سب۔"

"ہم سب؟ اور آپ؟ وہ معنی خیزی سے مسکرایا۔ "آپ نے کسی کے ساتھ اکیلے بیٹھنا ہے کشتی میں؟"

"کیوں، کوئی حرج ہے اس میں؟" وہ دل کشی سے مسکرائے۔ "ویسے میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ جو جو بیٹھنا چاہے کشتی میں اسے ساتھ لے جاؤ۔ میرا فی الحال یہیں بیٹھ کر ایک کپ چائے پینے کا موڈ ہے۔"

"چلو بھئی۔ اٹھ کھڑی ہو میری ٹیم۔" اس نے اٹھ کر باقاعدہ اعلان کیا۔

"لیکن آپ کو کیپٹن کس نے بنایا ہے؟" مہوش نے اسے چڑایا۔

"ارے ہم پیدائشی لیڈر ہیں۔" وہ اترایا۔ "یہ خصوصیات پیدائشی ہوتی ہیں۔"

"جس جس نے پیدائشی لیڈر کے ساتھ جانا ہے، جائے۔ ہم تو دوسری کشتی میں بیٹھیں گے۔" مہوش نے اعلان بغاوت کیا۔ جس کے نتیجے میں سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔

"ہائیں۔" وہ بھنایا۔ "یعنی فوج میں بغاوت پھیل چکی ہے۔ کوئی بات نہیں۔ ہم بھی باغیوں کو منہ نہیں لگائیں گے۔ بلکہ جلد ہی اس کی سرکوبی کے لیے کسی کو بھیجیں گے۔ چلیں الماس، ہم چلتے ہیں۔"

الماس بھی نجانے کس موڈ میں تھی۔ مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیے کشتیوں کی جانب بڑھ گئے۔

"جائیں عثمان بھائی۔ آپ کی منگیتر کو آپ کا بھائی پٹیاں پڑھا رہا ہے۔" مہناز نے ان کی توجہ مبذول کرائی۔ "آپ بھی جائیں۔"

"مجھے اپنے بھائی پر بھروسا ہے۔ ہاں اگر آپ کو اپنی بہن پر بھروسا نہ ہو تو آپ جائیں۔"

سب نے تالیاں بجا کر ان کی برجستگی کی داد دی۔

"کہیے۔ منگیتر پسند آئے۔" اس نے کشتی میں بیٹھ کر اسے چھیڑا۔ "انجوائے کر رہی ہیں موسم کو؟"

"کس موسم کو؟" اس نے مسکرا کر چہرے پر آتے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹا۔

''دل کے موسم کو۔'' وہ معنی خیزی سے مسکرایا۔

''دل کا موسم بھی کوئی موسم ہوتا ہے کیا؟'' وہ زور سے ہنس دی۔

''ارے۔ چچ چچ چچ۔'' اس نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''کیسی غیر رومانی لڑکی ہے جسے دل کے موسموں کی خبر نہیں رہتی۔ ارے اندر کا موسم اندر کا۔ جو زندگی میں ایک عدد محبوب کے آنے سے کھل جاتا ہے۔ کلیاں چٹخنے لگتی ہیں۔ خوشبوئیں مہک اٹھتی ہیں۔ پروا چلنے لگتی ہے۔ بے وجہ ہنسنے کو، مسکرانے کو دل چاہتا ہے اور وہی محبوب کبھی روٹھ جائے تو بہار خزاں میں بدل جاتی ہے۔ پیلے پیلے زرد پتوں کا موسم آجاتا ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے ہر سو چھا جاتے ہیں اور ارد گرد کچھ دکھائی نہیں دیتا۔''

''الماس مسکراتے ہوئے اس کی باتیں سنتی رہی۔

''کیا آپ کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس نے بے حد رازداری سے پوچھا۔

''اوں ہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم نے ٹھیک کہا تھا۔ میں پریکٹیکل لڑکی ہوں اور قطعی غیر رومانی ہوں۔''

''ہائے میرا بھائی۔'' اس نے سر تھام لیا۔

''کیوں، کیا ہوا؟ الماس نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''ارے وہ تو پھولوں، خوشبوؤں اور چاندنی راتوں کا شیدائی ہے۔ اس پر باہر کے موسم اتنے اثر انداز نہیں ہوتے جتنا کہ اندرونی موسم اور ایک آپ ہیں جنہیں دل کے موسموں کی خبر نہیں رہتی۔''

''ہونہہ۔'' اس نے مخصوص انداز میں بال جھٹک دینے پر اکتفا کیا۔

''سچ سچ بتائیں آپ کو عثمان بھائی پسند نہیں؟'' اس نے پھر رازداری دکھائی۔

''ہاں۔ بحیثیت ایک انسان وہ بہت اچھے ہیں۔ جیسے میں اور بہت سے لوگوں کو پسند کرتی ہوں اسی طرح انہیں بھی کرتی ہوں۔ بس یہ ہے کہ۔ وہ کہتے کہتے رک سی گئی۔

''کہیے کہیے۔ مجھ سے آپ ہر طرح کے خیالات شیئر کر سکتی ہیں۔''

''دراصل عثمان بہت سنجیدہ طبع ہیں۔ ان کے اندر ٹھہراؤ ہے۔ وہ۔ وہ اس جھیل کی طرح لگتے ہیں۔ پرسکون اور خاموش، اور میں ایک شور...... مچاتی، جھاگ اڑاتے منہ زور دریا جیسی ہوں۔ بس یہ ڈفرنس مجھے اکثر ڈسٹرب کرتا ہے۔''

''یہ ڈفرنس تو ہم سب کو بھی ڈسٹرب کرتا ہے۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔

''کیا کہا۔؟'' وہ ہوا کے شور کی وجہ سے سن نہ سکی۔

''کچھ نہیں۔ دیکھیے دیکھیے۔ وہ سب باغی چلے آرہے ہیں۔''

اس نے الماس کی توجہ اس ان کی طرف بڑھتے ٹولے کی جانب مبذول کرائی۔

''کیوں بھئی لیڈر صاحب۔یہ بندھی ہوئی کشتی پر بیٹھنے کی کیا تک تھی۔آپ تو جھیل کی سیر کرنے اٹھے تھے؟''عمران نے اسے چڑایا۔''کوئی راضی نہیں ہوا آپ دونوں کو بٹھانے پر؟''

''دراصل ہم کچھ ڈسکشن میں مصروف تھے۔''عدنان نے اترانا مناسب سمجھا۔''جو آپ سب کی موجودگی میں ہم کرنا نہیں چاہتے تھے،سو یہ راستہ اپنانا پڑا۔''

''یہ فاؤل ہے۔''سیماب چلائی۔''کیوں بھئی الماس،ایسی کون سی بات ہے جو ہم لوگوں سے چھپائی جا رہی ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔''وہ مسکرا دی۔''یہ عدنان تو یونہی بکواس کرتا ہے اور تم لوگ اس کی بات پر یقین بھی کر لیتے ہو۔اس نے یہاں لا کر مجھے ادھر ادھر کی باتوں میں لگا لیا اور مجھے خیال ہی نہیں آیا۔''

''اس لیے کہ میں بحیثیت ایک کیپٹن کے اپنی ٹیم کو پیچھے نہیں چھوڑ سکتا۔''وہ ہنسا۔

''چلیے کیپٹن صاحب۔پھر بنگ کرائیں کشتی کی۔''کاشف نے کیپ سنبھالی۔

''چلیے۔''وہ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

دور بیٹھے عثمان خان سب کے ساتھ چلتی الماس کو بغور دیکھ رہے تھے۔نجانے کیا بات تھی اس لڑکی میں کہ انہیں دنیا جہاں سے عزیز ہو گئی تھی۔ان کے دل میں سب سے پہلے کبھی کسی وجود کو اپنانے کی خواہش اس شدت سے نہ ابھری تھی۔وہ خوش اندام،خوش جمال لڑکی انہیں پوری طرح سے اپنا اسیر کر چکی تھی اور اسے خود کو اس بات کا احساس تک نہ تھا۔وہ سب کشتی میں سوار ہو چکے تھے۔اور کشتی تیزی سے جھیل کے نیلے پانیوں میں آگے بڑھ رہی تھی۔الماس کا سبز آنچل بڑی دیر تک ان کا نظروں میں لہراتا رہا تھا ایک سانس بھر کر وہ جائے نکالنے لگے تھے۔



جمنا نے لاؤنج سے آتے جاتے کئی بار بغور اسے دیکھا۔وہ اپنی مخصوص حالت میں موجود تھا۔جھولے میں الٹا لیٹا ہاتھ سے زمین میں آڑی ترچھی لائنیں کھینچ رہا تھا۔لیکن آج اس پر وہ مخصوص کیفیت طاری نہ تھی۔بلکہ آج ہی کیا،پچھلے دو دن سے وہ اداس اداس چپ چپ سا تھا۔

''کیا ہوا ہے۔''بالآخر وہ پوچھ بیٹھی۔

''کسے؟''

''تم کو۔اور کس کو۔کس کی بات بری لگ گئی ہے؟''

''کسی کی نہیں۔''وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔

''پھر کاہے کو دو روز سے یہ بوتھا سجائے ہو۔نہ ہنستا،نہ بولتا۔''

''ہمارا ہنسنا بولنا سب کو برا ہی تو لگتا تھا نا۔چھوڑ دیا ہم نے۔''

''ہائے۔ایسا نہ کہو۔کون بولا تمہیں ایسا۔ہم تو تمہاری خوشی میں خوش ہوتے ہیں۔تمہارے چپ رہنے سے ہم کتنا گھبرا جاتے ہیں۔

وحشت ہوتی ہے۔

"یہ وحشت ہی تو تھی جس نے ایسا کام کروایا تھا مجھ سے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیسی غلطی ہو گئی۔"

"کیسی؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ایسی۔" اس نے بری سی شکل بنا کر دکھائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چلے؟"

"وہیں جہاں ہمیں جانا چاہیے۔" وہ عفت خانم کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"جمنا حیرانی سے پل میں تولہ پل میں ماشہ اس لڑکے کو دیکھتی رہ گئی۔

"امی حضور۔"

دروازہ کھول کر اس نے اپنا منہ اندر کیا۔

"کیا شہزادہ سلیم اندر آسکتے ہیں؟"

"عفت خانم مغرب کی نماز کے بعد کی دعائیں پڑھ رہی تھیں، مسکرا دیں۔

"آؤ۔"

"اس کے قریب آنے پر انہوں نے اس کا چہرا دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کے دونوں کانوں اور ماتھے پر پھونک ماری۔

"واہ!" اس نے خوش ہو کر آنکھیں پٹپٹائیں۔ "ہماری کھوئی ہوئی یادداشت واپس آ گئی۔ کون سا وظیفہ تھا امی حضور؟"

"بس زیادہ بک بک نہیں۔" انہوں نے مسکرا کر اسے پیار سے دیکھا۔ "کہو کیا کام ہے؟"

"بس یونہی آپ کی یاد ستا رہی تھی۔" اس نے ان کی گود میں سر رکھ لیا۔ "آپ جانتی ہیں شہزادہ سلیم آپ کو کس قدر چاہتے ہیں۔"

"جمنا کیا کر رہی ہے؟" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ "آج اسے ستانے کا موڈ نہیں ہے؟"

"نہیں۔ جب کوئی چڑنا چھوڑ دے تو ہم اسے ستانا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ہمارا سب سے پہلا اصول ہے۔ امی!"

"جی۔ امی کی جان۔ کہو۔"

"ہم بور ہو رہے ہیں۔"

"پھر۔ کیا کیا جائے؟"

"چلیں۔ پڑوس میں چلتے ہیں۔ صبا سے ملنے۔"

"بہت پسند آ گئی ہے صبا۔" وہ ہنسیں۔

"کیوں، آپ کو پسند نہیں؟" وہ سیدھا ہوا۔

"کیوں نہیں۔ ماشاءاللہ بہت پیاری، سلجھی ہوئی بچی ہے۔ مجھے بھی بہت پسند ہے۔"

"جی ہاں۔ اب معلوم نہیں انہیں الجھے ہوؤں کو سلجھانا آتا ہے یا نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ہماری باتوں میں مطلب آج سے پہلے کبھی ہوا ہے امی حضور؟" وہ مسکرایا۔ "چلیں اب اٹھیں بھی۔ ورنہ رات ہو جائے گی۔"

"ہم نے ان لوگوں کو کہلوایا بھی تو نہیں ہے۔ نہ معلوم گھر پر ہوں بھی یا نہیں۔"

"ارے گھر پر ہی ہوں گے۔ نہ بھی ہوئے تو کون سا دس میل دور جانا ہے۔ یہی برابر والا گھر تو ہے۔"

وہ اٹھ کر ان کی الماری تک گیا اور ان کی شال ہینگر سے نکال لایا۔

"چلیے فٹافٹ اوڑھ لیں۔"

"بڑا ضدی لڑکا ہے۔"

وہ اٹھ کر شال اوڑھنے لگیں۔

گیٹ کھولنے صبا ہی آئی تھی۔ انہیں دیکھ کر مسکرا دی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ امی ہیں تمہاری گھر پر؟"

"جی ہاں آنٹی۔ آپ اندر آئیں ناں۔"

"صرف آنٹی۔ میں واپس چلا جاؤں؟" اس نے سر نکالا۔

"کیوں بھئی۔ پھر میں کس سے باتیں کروں گی۔" وہ مسکرائی۔

"یہ ہوئی ناں بات۔"

عفت خانم کو نجمہ بیگم کے پاس بٹھا کر دونوں لان میں چلے آئے۔

"گرمیاں آگئی ہیں ناں!" وہ بات کرنے کی غرض سے بولی تھی۔

"جی ہاں۔ بس آنے والی ہیں!" اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ "صبا۔ کیا ہوا تھا؟"

اس کے اچانک پوچھ لینے پر وہ نظر چرا کر رہ گئی۔

"بتائیں ناں۔"

"شہروز۔ پہلے تم ایک بات سچ سچ بتاؤ۔ تمہارے بھائی بیمار ہیں؟"

"بیمار۔ بالکل نہیں۔"

''میرا۔میرا مطلب ہے، کیا وہ ذہنی طور پر کچھ ڈسٹرب رہتے ہیں؟''

''وہ ہمارے گھر کی سب سے پرسکون شخصیت ہیں۔آج سے قبل میں یہی سمجھتا تھا لیکن اب مجھے علم ہوا ہے کہ ان کے اندر بھنور پڑتے ہیں۔طوفان اُٹھتے ہیں۔انہوں نے آپ سے کیا کیا تھا صبا؟''

''کچھ بھی نہیں۔بس اچانک انتہائی سخت لہجے میں مجھے باہر نکل جانے کے لیے کہا۔وہ۔وہ اپنے آپے میں نہیں تھے۔جس طرح کسی کو دماغی دورہ پڑے اور اسے کچھ علم نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، کیا کر رہا ہے۔'' اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔

شہروز خاموش ہو کر کیاریوں کو دیکھنے لگا تھا۔

بولو ناں شہروز۔ایسا کیوں ہوا؟''

''صبا۔بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ جن میں بظاہر بندہ صحت یاب ہو جاتا ہے لیکن وہ اندر کہیں گہرائیوں میں اپنی جڑیں چھوڑ دیتی ہیں اور یہ جڑیں بڑی مضبوط، بڑی زہریلی ہوتی ہیں۔یہ زخم اندر ہی اندر رستے رہتے ہیں اور انسان کو خبر نہیں ہوتی۔اور جب خبر ہوتی ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔آپ کو پتا ہے صبا، ہمارے پورے گھر کو اندر ہی اندر ایک بیماری کھائے چلی جاتی ہے۔''

صبا حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگی۔

''ہمارے والد شعیب احمد صاحب زمین دار تھے۔ایک انتہائی سخت گیر اور بے رحم انسان۔انہوں نے زندگی بھر اپنی اولاد کو اپنے مزارعوں کی طرح سمجھا۔ہنٹر کی نوک پر سرکس کے جانوروں کی طرح نچاتے تھے وہ ہمیں۔میں تو خیر بہت چھوٹا تھا۔بہروز بھائی جان اور فیروز بھائی کے ذہنوں پر ان کے سخت رویوں نے اپنا اثر بری طرح سے چھوڑا ہے۔ان کی شخصیتیں مسخ کر دی تھیں ابو نے۔ابو کے انتقال کے بعد امی نے بڑی مشکلوں سے انہیں سنبھالا۔انہیں ایک کارآمد فرد بنانے کے لیے اپنی ہستی مٹا دی۔بھائی جان نے بزنس اور زمینیں سنبھال لی، وہ مصروف ہو گئے اور اس طرح انہوں نے خود کو متوازن کر لیا۔فیروز بھائی ان کی نسبت بہت نازک طبع اور نرم دل انسان ہیں۔انہوں نے خود کو محدود کر لیا اور پھر کبھی اپنی قائم کردہ حدوں سے باہر نہ آ سکے۔وہ خول جو انہوں نے روز اول سے خود پر چڑھایا، آج بھی اتنا ہی مضبوط اور سخت ہے۔ہم سب کی محبتیں اور توجہ بھی اس خول کو چٹخانے میں ناکام رہی ہیں۔انہوں نے خود کو کتابوں کی دُنیا میں گم کر لیا ہے۔انسانوں سے زیادہ وہ کتابوں پر اعتماد کرتے ہیں جو دُکھ نہیں دیتیں۔اذیت نہیں پہنچاتیں۔جانتی ہو صبا، بہروز بھائی جان شادی کیوں نہیں کرتے۔انہیں ڈر ہے کہ کہیں وہ بھی ابو کی طرح نہ بن جائیں۔انہوں نے کبھی یہ بات کسی سے کہی نہیں لیکن میں جانتا ہوں۔نجانے دوسرے لوگ بھی جانتے ہیں یا نہیں۔یہ موضوع تو ایسا ہے کہ ہم گھر والے بھی آپس میں اس موضوع پر بات کرنے سے کتراتے ہیں۔اور فیروز بھائی! وہ بے چارے اپنی زندگی میں پیش آنے والے ایک حادثے سے متاثر ہوتے ہیں کہ اب تک سنبھل نہیں پائے۔''

''کیسا حادثہ؟''

''بس۔نہ ہی پوچھیں۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔''اس میں بھی ابو کی ذات نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔میرا فرشتہ صفت بھائی، تو ڈ

چھوڑ دیا ہے اس کی شخصیت کو۔ کس شدت سے اس کے دل دماغ مجروح ہوئے تھے مجھے اب اندازہ ہوا ہے۔ صبا! ایک وعدہ کریں۔"

"کیسا وعدہ؟" وہ گم صم تھی۔

"میرے بھائی کو زندگی کی جانب واپس لائیں گی ناں۔"

"لیکن شہروز یہ میرے بس میں کب ہے؟"

"ہے صبا۔ کیوں نہیں ہے۔ محبتیں تو بڑا اثر رکھتی ہیں۔ نشتر کی طرح اندر تک اُتر جاتی ہیں اور مریض کو خبر تک نہیں ہوتی۔ آپ محبت کرتی ہیں ناں بھائی سے؟"

"تم بھی پوچھ رہے ہو؟" اس نے نظریں جھکا کر گلہ کیا۔

"وہ مسکرا دیا۔

"بس تو پھر وعدہ کریں۔ اس کی محبت کو محض ایک جذبہ نہیں رہنے دیں گی۔ اسے تریاق بنائیں گی۔ اس زہر کا جو میرے بھائی کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ انہیں اندر سے دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔"

"تم میری مدد کرو گے شہروز۔"

"آپ بھی پوچھ رہی ہیں؟" اس نے اس کا سوال لوٹایا۔

"وہ مسکرا دی۔

"چلیں۔ اب اچھی سی چائے پلائیں۔"

"اوہ خدایا۔ میں تو بھول ہی گئی۔" وہ چونکی۔ "آنی کیا سوچیں گی۔ چلو چائے بناتے ہیں۔"

دونوں اُٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گئے۔



''امی جی۔'' بہروز نے دستک دے کر اندر جھانکا۔ ''حاضر ہو سکتا ہوں؟''

''آؤ بیٹے۔'' وہ نیم دراز کسی اسلامی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور سر پر دوپٹہ برابر کرنے لگیں۔

''کوئی خاص کام تھا جس کے لیے اب تک جاگ رہی ہیں۔'' وہ مسکرائے۔

''ہاں۔ بہت خاص۔ یہاں بیٹھو میرے پاس۔'' انہوں نے سرک کر ان کے لیے اپنے برابر جگہ بنائی۔

''جی امی کہیے۔'' وہ مؤدبانہ انداز میں مخاطب ہوئے۔

''بیٹا۔ بہت دیر سے آنے لگے ہو آج کل۔''

''امی۔ کام بہت پھیل گیا ہے۔ خدا نے بڑی برکت دی ہے کاروبار میں۔ اسی حساب سے مصروفیات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ دیر سے آنا میرا شوق نہیں مجبوری ہے۔'' وہ بات ختم کر کے مسکرائے تھے۔

''بہروز۔'' وہ سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ بولنے لگیں۔ ''بیٹا مختصر ترین الفاظ میں میرا مدعا یہ ہے کہ اب میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔ بڑا فرض ہوتا ہے ماں باپ پر۔ میں چاہتی ہوں اپنی زندگی میں سارے فرائض سے سبکدوش ہو لوں۔''

''خدا آپ کو لمبی عمر دے آپ کا سایہ سلامت رکھے ہمارے سروں پر، لیکن امی۔''

''ماں کے یوں اچانک قطعی انداز سے یہ ذکر چھیڑنے پر وہ الجھ سے گئے تھے۔

''ہاں ہاں کہو۔ جو کچھ تمہارے دل میں ہے کہہ دو۔ اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو بتاؤ۔''

''نہیں امی جی۔'' وہ ہولے سے ہنس دیے۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل شادی۔''

عفت بیگم نے غور سے ان کی صورت دیکھی۔

''دیکھو بہروز۔ اب یہ محض میری خواہش ہی نہیں بلکہ اب تمہاری شادی ہمارے گھر کی ایک اہم ضرورت بن چکی ہے۔ اب اس گھر کے سناٹے میری روح میں اُترنے لگے ہیں۔ تھکن محسوس ہونے لگی ہے مجھے۔ نجانے تم اور فیروز اس اہم اور مبارک فریضے سے کیوں نگاہیں چرائے بیٹھے ہو۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ محض یہ ذکر ہی تم دونوں کو ایک عجیب سے ذہنی کھنچاؤ کا شکار کر دیتا ہے۔ شہروز چھوٹا ہے لیکن مجھے وہ تم دونوں کی نسبت زیادہ باشعور اور سمجھدار نظر آتا ہے۔ اس کے اندر وقت کی ضرورتوں کو پہچاننے کی صلاحیت تم دونوں کی نسبت زیادہ ہے۔ کیا تمہیں محسوس نہیں ہوتا کہ اس گھر میں کسی چیز کی انجانی کمی ہے؟''

بہروز خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے تھے۔

''دیکھو بیٹا۔ اب مجھ پر ترس کھاؤ۔

''امی جی۔ خدا کے لیے۔ ایسی باتیں مت کیجیے۔'' وہ عاجزی سے بولے۔ ''میں نے کبھی انکار تو نہیں کیا۔''

''لیکن ٹال ہمیشہ جاتے ہو۔'' انہوں نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''اور آج میں تمہیں ٹالنے کا موقع بھی نہیں دوں گی۔ مجھے ایک واضح اور قطعی جواب چاہیے۔ یا تو مجھے اپنی پسند سے آگاہ کر دو یا پھر مجھے کہو تو میں لڑکی ڈھونڈوں۔''

وہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئے۔

''کہو بیٹا۔ کچھ تو کہو۔''

''ٹھیک ہے امی جان۔ جیسے آپ کی خوشی۔'' وہ آہستہ سے بولے۔ ''میری محض چند شرائط ہیں۔''

''ہاں ہاں بیٹا۔ ہر کام ویسے ہی ہوگا جیسا تم چاہو گے۔'' ان کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ ان کے لیے یہ کیا کم خوشی کی بات تھی کہ انہوں نے ہامی بھر لی تھی۔ ورنہ آج تک تو وہ کسی نہ کسی بہانے سے پہلوتہی کرتے جاتے تھے۔

''پہلی بات تو یہ کہ میں کسی کا بوجھ ہلکا کر کے خوشی محسوس کروں گا۔ کسی ایسے گھرانے کی لڑکی ہو جہاں جہیز کی کمی کی وجہ سے لڑکیوں کو بوجھ خیال کیا جاتا ہے۔ ہم لوگ جہیز وغیرہ قطعی نہیں لیں گے بلکہ شادی کا سارا خرچہ ہماری طرف سے ہوگا۔''

''اور کچھ؟'' بیٹے کے خیالات سے آگاہی ہونے پر ان کے لب مسکرا اٹھے۔

''مجھے کوئی حور پری بھی نہیں چاہیے۔ بس میرے جیسی عام شکل و صورت کی ہو۔ سلجھی ہوئی شخصیت ہو۔ بات چیت کرنے کا، اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ ہو، اور بس۔''

دروازے سے کان لگائے، سب کچھ سنتا ہوا شہروز مسکرایا۔ پھر وہاں سے ہٹ کر تیزی سے چلتا ہوا کچن میں آ گیا۔ جمنا، بہروز کے لیے کھانا نکال رہی تھی۔

''سنو۔ جمنا۔ جلد از جلد اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا سلیقہ سیکھ لو۔ باقی ہر شرط تم ماشاءاللہ پوری کرتی ہو۔''

''ہیں؟'' وہ مڑ کر اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ ''کیا بولے؟''

''بھئی۔ میرے کاندھوں پر تمہارا بڑا بوجھ ہے۔ پہلی شرط پوری ہوئی۔ شکل و صورت میں عام تو کیا، عام سے بھی۔ خیر گزارا ہے۔ دوسری شرط تمام ہوئی۔ اب رہ جاتی ہے تیسری شرط۔ خیر فکر نہ کرو۔ ہم تمہیں سب سکھا دیں گے۔''

''وہ جھلا کر پلیٹوں کی جانب متوجہ ہوگئی۔

وہ مسکراتا ہوا باہر نکلا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ بہروز باہر کھڑے انتہائی سنجیدگی سے اسے گھور رہے تھے۔ اس نے تھوک نگلا، دو قدم آگے بڑھا پھر بھاگتا ہوا عفت خانم کے کمرے میں گھس گیا۔

''بھئی جمنا۔ کیا دیر ہے کھانے میں؟'' وہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''ابھی لاتے ہیں۔ تم بیٹھو کھانے کی میز پر۔''

وہ لبوں پر آئی مسکراہٹ جھٹکتے ڈائننگ روم کی جانب بڑھ گئے۔

"بدتمیز کہیں کا۔" وہ زیرِ لب بڑبڑائے تھے۔



"میرا خیال ہے تم قطعاً پاگل ہو چکی ہو۔" الماس نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا تھا۔

"کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔ "اس میں بھلا پاگل پن کی کون سی بات ہے۔"

"ارے یہ اندھا عشق پاگل پن اور دیوانگی نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ ایک دماغی مریض کے عشق میں محترمہ گرفتار ہوئیں سو ہوئیں اوپر سے اسے ٹھیک کرنے، زندگی کی جانب لانے کے وعدے وعید بھی ہو رہے ہیں۔ وہ تو اس کا بھائی ہے۔ اس نے تو بھائی کی محبت میں آ کر تمہیں شیشے میں اتار لیا۔ میں پوچھتی ہوں تمہاری عقل کہاں جا سوئی ہے۔"

"الماس پلیز۔" وہ شدید ہرٹ ہوئی تھی اس کی باتوں سے۔

"دیکھو صبا۔ میں تمہاری دوست ہوں۔ کچھ غلط کرو گی تو تمہیں روکنا میرا فرض ہے۔"

"لیکن میں کچھ غلط نہیں کروں گی الماس۔ کیا تمہیں اس بات کا یقین نہیں ہے؟"

"میں آگے کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ فی الوقت تمہارا رویہ غلط ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ وہ شخص ایک نارمل انسان نہیں ہے، تمہیں اس کے بارے میں مزید سوچنے سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ نہ کہ تم اس کے پیچھے اپنی زندگی داؤ پر لگا دو۔"

"اچھا!" وہ استہزائیہ ہنسی۔ "یعنی محبت اور خودغرضی میں تمہارے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے۔"

"ہونہہ۔ محبت وحبت۔ فضول باتیں۔ میں ان سب باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔" اس نے اپنے ریشمی بال جھٹکے۔ "میرا خیال تو یہ ہے صبا۔ لڑکیوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ انتہائی سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ جس شخص سے وہ خود کو ذہنی طور پر وابستہ کریں، پہلے اسے اچھی طرح جانچ لیں۔ ہر پہلو سے پرکھ لیں۔ وہ جسمانی اور معاشی طور پر مضبوط ہو تب آگے بڑھیں، ورنہ۔ تو محبت۔"

صبا ہولے سے ہنس دی۔

"شاید میری باتیں تمہارے سر کے اوپر سے گزر رہی ہیں؟" اس نے ابرو چڑھائے۔ "صبا۔ فار گاڈ سیک کچھ عقلیت پسندی سے کام لو۔"

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

وہ ہولے سروں میں گنگنائی۔

"دیکھو صبا۔ تم کتنی ہی رومان پسند اور جذباتی کیوں نہ ہو۔ یہاں تمہیں میری بات ماننی ہوگی۔"

"کیا کروں؟"

"اس شخص کو دیکھنا، ملنا تو کجا سوچنا بھی چھوڑ دو۔" اس کا لہجہ قطعی تھا۔

"یہ ممکن نہیں ہے الماس۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ "کیا تم کسی سے محبت نہیں کرتیں جو میری کیفیت کو سمجھ سکو؟ عثمان سے بھی نہیں؟"

"شاید۔ تم ٹھیک کہتی ہو صبا۔" وہ چند لمحے سوچ کر بولی۔ "عثمان۔ صرف میرے فیانسی ہیں اور کچھ نہیں۔ میں اپنے دل میں ان کے لیے کوئی خاص جذبہ محسوس نہیں کرتی۔ محبت کیا شے ہے، کیسے ہو جاتی ہے، میں نہیں جانتی۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ ہر بات کو منطق اور توجیہہ کے اصولوں پر پرکھنا ضروری ہے۔ ورنہ انسان اپنی جذباتیت کے ہاتھوں نقصان اٹھاتا ہے۔"

"دیکھو الماس۔ جس شخص کو جسمانی، ذہنی اور معاشی طور پر پرکھ کر اپنایا جائے کیا اس میں آگے چل کر کوئی نقص پیدا ہونا ممکن نہیں؟ اور اگر اس میں نقص پیدا ہو جائے تو کیا ہمیں چاہیے کہ اصول منطق اور اصول توجیہہ پر پرکھ کر اسے بھی چھوڑ دیں؟"

"آف کورس!" وہ اطمینان سے بولی تھی۔ "میں ہر شخص کو یہ حق دیتی ہوں۔ اگر مجھ میں کوئی نقص پیدا ہو جائے اور عثمان مجھے چھوڑ دیں تو میں ان سے کوئی شکوہ کرنے کی مجاز نہیں ہوں گی۔"

"صبا محض اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"میری باتوں پر غور کرلو صبا۔ اچھا طرح سوچ سمجھ لو، پھر کوئی فیصلہ کرنا۔ ورنہ پچھتاؤ گی۔"

"جس طرح زندگی کے ہر معاملے پر سارے پوائنٹس تمہارے ذہن میں کلیئر ہیں الماس، اسی طرح میرے بھی اپنے کچھ ذاتی خیالات ہیں۔ کچھ اصول ہیں زندگی گزارنے کے لیے۔ میں زبان بھی دے چکی ہوں اور دل بھی۔ پیچھے ہٹنا اب ممکن نہیں رہا۔ محبت میں دو اور دو چار نہیں ہوتے۔ فیصلہ کر چکی ہوں اور میں پچھتاؤں گی بھی نہیں۔"

وہ کہیں دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ الماس تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہی پھر کاندھے اچکا کر رہ گئی۔



امتحانات میں چند دن ہی رہ گئے تھے۔ وہ تیزی سے اپنے نوٹس مکمل کرنے میں منہمک تھی کہ باہر سے آتی آوازوں نے اسے چونکا دیا۔

"بجو۔" چند لمحوں بعد اچھلتی کودتی ریشم اندر آئی تھی۔ "وحیدہ چچی اور آمنہ باجی ہوئی ہیں۔ مٹھائی اور پھول لے کر۔"

"اچھا۔" اس نے قلم بند کیا اور کاغذات سمیٹنے لگی۔

"پتا ہے کیوں!" اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"مجھے کیا خبر!"

"شادی کی تاریخ رکھنے۔ مزا ہی آ گیا۔ جو کپڑے آپ کی منگنی کے لیے بنوائے تھے وہ اب آپ کی شادی میں پہنیں گے۔"

"شادی؟" وہ ہکا بکا رہ گئی۔

اس قدر جلد سارے مراحل طے ہوں گے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اماں اس کی اور شبنم کی شادی ساتھ کرنا چاہتی تھیں تاکہ کچھ بچت کر سکیں۔ اسی لیے آج کل وہ شبنم کے لیے کسی مناسب رشتے کے انتظار میں تھیں۔

''نجانے اماں کیا جواب دیں۔''

''ماں کی پریشانی کا خیال کر کے وہ خود بھی بے چین ہو گئی۔اسے ماں اور بڑے بھائی سے جنون کی حد تک محبت تھی۔اور اس کی وجہ سے وہ کسی پریشانی یا اُلجھن کا شکار ہوتے،اس کے لیے یہ از حد تکلیف دہ صورت حال تھی۔

''کیا ہوا بجو۔آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟'' ریشم نے غور سے اس کی اچانک اُتر جانے والی صورت دیکھی۔

''نہیں۔ایسی کوئی بات نہیں۔شبنم کہاں ہے؟''

''وہیں بیٹھی خوش ہو رہی ہیں۔آج تاریخ رکھ دی گئی تو ہم رات کو گانے گائیں گے۔''

''اچھا فضول باتیں مت کرو۔'' وہ چڑ سی گئی۔'' جاؤ جا کر چائے کا پانی رکھو۔میں بازار سے کچھ منگواتی ہوں۔''

وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں آئی۔چچی جان نے پیار سے اس کی پیشانی چومی لیکن وہ جانتی تھی اس پیار کی تہہ میں کس قسم کے جذبات موجزن تھے۔اسے ان کا انداز بناوٹی محسوس ہوا۔وہ آمنہ کی بیٹی کو لے کر باہر آ گئی۔

''بجو۔'' تھوڑی دیر بعد ہی شبنم بھی باہر تھی۔''کیا بات ہے۔آپ اتنی اداس کیوں لگ رہی ہیں۔ہم سے بچھڑنے کا غم ہو رہا ہے؟''

''اماں نے کیا کہا شبنم؟'' اس نے شبنم کی بات سنی ان سنی کر دی۔

''دو مہینے بعد کی تاریخ رکھ دی ہے۔'' وہ مسکرائی۔

اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''کیوں۔اس میں اس قدر حیرانی و پریشانی کون سی بات ہے بھلا؟''

''اماں نے وقار بھائی سے بھی صلاح مشورہ نہیں کیا؟''

''اماں اور وقار بھائی آپس میں مشورہ کر چکے ہیں۔میرے سامنے ساری باتیں طے ہوئی ہیں۔''

''اچھا۔'' وہ ہنوز بے یقینی کا شکار تھی۔اماں مطمئن ہیں؟''

''بہت خوش ہیں۔اپنی بیماری تک بھلا بیٹھی ہیں۔'' وہ ہنسی۔'' اب آپ بھی یہ اوپری صورت ہٹائیں اور اصلی چہرا دکھائیں۔ہنستا مسکراتا۔''

وہ ہنس دی۔

درحقیقت اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ یا تو چچی جان منگنی کو ہی موخر کیے دے رہی تھیں اور کہاں اب ڈائریکٹ شادی کی تاریخ لینے آ پہنچی تھیں۔

''نجانے اندر ہی اندر کیا ہو رہا ہے۔'' وہ خود سے بولی تھی۔عجیب ہیں وحیدہ چچی بھی۔''

''شام اُتری تو شبنم،مریم اور ریشم ڈھولکی منگوانے کے در پے ہو گئیں۔

"تم لوگوں کا دماغ چل گیا ہے کیا۔" وہ ہنس رہی تھی۔

"آپ سے کون کہہ رہا ہے گانے کو۔ ہم خود گائیں گے اپنے ذاتی گلے سے۔" مریم بولی تھی۔

دونوں نے اس کی تائید کی۔

"بھئی جو جی میں آئے سو کرو۔ میں تو عنبرین کی طرف جا رہی ہوں۔"

وہ اٹھ کر کپڑے بدلنے چل دی۔

وہ جس وقت عنبرین کے گھر پہنچی وہ لوگ ذوالفقار سے کہہ کر ڈھولک منگوانے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔

"کیا بات ہے۔ بڑا کھل رہا ہے چہرا۔" عنبرین نے اسے بغور دیکھا۔

"وحیدہ چچی دو ماہ بعد کی تاریخ رکھ گئی ہیں ناں۔ شبنم وغیرہ ڈھولک منگوا کر گانے گا رہی ہیں۔"

"تمہاری شادی طے ہوگئی ہے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہوں!" اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"بتا تو رہی ہوں۔" وہ ہنسی۔

"جبھی یہ لڈو پھوٹ رہے ہیں۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے بھئی۔ میری شادی طے ہو جائے تو میں تو ہر وقت دانت نکالتی رہوں۔"

نیلم کو ہنسی آگئی۔

"یوسف بھائی آئے تھے؟" وہ تفتیش کرنے لگی۔

"نہیں۔ آج تو نہیں آئے۔"

"ہاں کیسے آتے بھلا۔ اتنا ڈرتے جو ہیں اپنی ماں سے۔" وہ ہنسی۔ "سچ کہتی ہو نیلم، پہلے دن سے قابو میں رکھنا۔ ورنہ ماں سے اتنا ڈرنے والے مرد بیوی کو خوش نہیں رکھتے۔"

"چھوڑو ان فضول باتوں کو

"پہلے ہی اُلجھن کا شکار تھی۔ ان باتوں سے اسے کوفت ہونے لگی۔

"تمہارے ہی بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا۔ اگر اظہر بھائی اپنی امی سے ڈرتے ہوں تو تم کیا کر سکتی ہو بھلا؟"

''اوں ہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔'' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں ان سے ملی تو نہیں ہوں لیکن ان کی بہنوں سے ان کی ساری معلومات مجھے پہنچتی رہتی ہیں۔ وہ بڑے من موجی قسم کے بندے ہیں۔ ایسے لوگ بیوی کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔''

نیلم کو اس تجزیے پر ہنسی آنے لگی۔ وہ عنبرین کی فطرت سے واقف تھی۔ وہ محض خود کو مطمئن کرنے کے لیے اپنے ہی حق میں دلیلیں دیتی رہتی تھی خواہ وہ دوسرا متفق ہو یا نہ ہو۔ شاید وہ ہر معاملے میں دوسروں سے اپنا تقابل کرتے رہنے کی عادی تھی اور پھر ہر مقابلہ وہ جیتنا بھی چاہتی تھی اس لیے بیشتر باتیں وہ محض خود کو مطمئن کرنے کے لیے کرتی تھی۔

نیلم کچھ دیر اس کے منگیتر کی تعریفیں سنتی رہی۔ اس کی شکل و صورت کی، عادت کی، معاشی طور پر مستحکم ہونے کی۔ پھر وہ بور ہو گئی تو اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں چل دیں۔ بیٹھو بھی۔''

''پھر آؤں گی۔'' وہ بولی۔''شبنم اور ریشم انتہائی خفا ہوں گی۔ وہ مجھے روک رہی تھیں۔ مگر میں آ گئی۔ تم چلو میرے ساتھ۔''

''نہیں اب رات ہو گئی ہے۔ میں کل آؤں گی۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔''

''وہ باہر نکل آئی۔

''سنیے۔''

''دروازہ بند کر کے وہ چند قدم ہی بڑھی تھی کہ اس آواز پر اس کے قدم جم گئے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ کھلے گریبان کے ساتھ اس کے مقابل تھا۔

''کیا بات ہے؟'' وہ سخت لہجے میں بولی۔

''یہ لے لیں۔'' اس نے پھر لفافہ آگے کیا۔

''کیا ہے اس میں؟'' بڑی بدتمیزی سے اس نے پوچھا تھا۔

''پڑھ لیں۔ میری بے قراریوں کا حال ہے۔''

''تم کس قسم کے انسان ہو۔'' وہ ذرا تیز آواز میں بولی۔'' کوئی کام نہ کاج سوائے یہ بے ہودہ حرکتیں کرنے کے کبھی کوئی ڈھنگ کا کام بھی کیا ہے؟ فلمیں دیکھ دیکھ کر تمہارے دماغ الٹ چکے ہیں۔ آپے سے باہر ہو گئے ہو۔ میں تمہارے محلے کی لڑکی ہوں۔ بہن سمجھنے کے بجائے عزت دینے کے بجائے دن رات چیچھا کرتے ہو۔ بے ہودہ گانے گاتے ہو۔ قابل نفرت شخص ہو تم۔

اس کے ہاتھ سے لفافہ جھپٹ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیا اور آگے بڑھی ہی تھی کہ وہ سامنے آ گیا۔

دیکھو نیلم پری۔ یہ اچھا نہیں کیا تم نے۔ راجہ کی محبت کو ٹھکرا رہی ہو۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ میں کتنا چاہتا ہوں تمہیں؟''

"راستہ چھوڑو میرا۔" وہ تند لہجے میں بولی۔

نہ جانے اس وقت سب کہاں جا سوئے تھے۔گلی دور تک سنسان پڑی تھی۔

"میں تمہیں ہر راستے میں کھڑا ملوں گا۔یہ بتاؤ رشتہ بھیج دوں تمہارے گھر؟"

"تھوکتی ہوں میں تم پر۔اور میرا رشتہ طے ہو چکا ہے۔"

وہ اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھنے لگی تھی کہ اس نے اچانک اس کی کلائی پکڑ لی۔

"جان سے مار ڈالوں گا اسے۔"

اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور دوسرے ہاتھ سے زناٹے دار طمانچہ اس کے گال پر دے مارا

پھر وہ دوڑتی ہوئی اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔



وہ چھت پر بیٹھی بڑی محویت سے کبوتروں کو دانہ چگتے دیکھ رہی تھی۔پاس بیٹھی شبنم نے کئی مرتبہ سر اٹھا کر اس کی محویت اور انہماک کو محسوس کیا۔

"نیلو!"

"ہوں۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا اور باجرے کا ڈبہ بند کرنے لگی۔"کہو!"

"کیا بات ہے میں محسوس کر رہی ہوں، پچھلے چند دنوں سے آپ ذہنی طور پر کچھ ڈسٹرب ہیں۔"

اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"نہیں بھئی، ایسا تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"پھر اتنی اُلجھی اُلجھی سی، بے کل بے کل کیوں رہتی ہیں۔"

"اچھا؟ واقعی؟" اسے خود بھی حیرت ہوئی۔"تم نے ایسا محسوس کیا ہے کیا؟"

"محسوس کیا ہے تبھی کہہ رہی ہوں نا۔" وہ ہنس دی۔"کیا بات ہے یوسف بھائی سے کوئی ان بن چل رہی ہے کیا؟"

وہ قدرے شوخ ہوئی۔

"یوسف سے۔" وہ مزید حیران ہوئی۔"اُن سے بھلا میری ان بن کیوں ہونے لگی؟"

"بھئی، یہ جو تعلقات خاطر ہوتے ہیں، ان میں یہ چھوٹی موٹی رنجشیں، گلے شکوے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔" وہ سادگی سے بولی۔

نیلم بے ساختہ ہنس پڑی۔

"بھئی، تم سے کس عقل مند نے کہہ دیا کہ میرا ان سے کوئی خاص "تعلق خاطر" ہے؟" شبنم نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟''

''نیلی بجو! میں آپ کی بہن ہوں۔ اتنی قریب ہوں آپ سے۔ آپ اپنی سوچیں مجھ سے چھپاتی ہیں؟''

''مثلاً۔ کیا چھپایا ہے میں نے تم سے؟'' وہ ہولے سے مسکرا کر پوچھنے لگی۔

''آپ اور یوسف بھائی ایسے ہی تو اس بندھن میں نہیں بندھ گئے ہیں نا۔ پسند تو دونوں کرتے ہیں ایک دوسرے کو، اور کوئی ایسی بات کہو تو آپ اتنی حیران بن جاتی ہیں کہ دوسرا بندہ شرمندہ ہو جائے کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا۔''

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔

''دیکھو شبنم!'' پھر وہ بولی۔ ''بات یہ ہے کہ ایسی کوئی بات تو کبھی میرے اور یوسف کے درمیان بھی ڈسکس نہیں ہوئی۔ ہم نے کبھی اس موضوع پر آپس میں کوئی بات نہیں کی، وہ مجھے کتنا پسند کرتے ہیں، یہ میں نہیں جانتی، میرے دل میں ان کے لیے کیا ہے، وہ نا واقف ہیں۔ پھر بھلا تعلق خاطر کیسا؟ بس ہم دونوں یہ جانتے ہیں کہ ہماری منگنی ہو گئی ہے اور ہماری شادی ہونی ہے۔ اس حوالے سے کبھی کبھار یوسف کوئی مذاق کر دیتے ہیں اور تم لوگ سنجیدہ ہو جاتی ہو!''

''اچھا بھئی۔ اب رہنے بھی دیں وضاحتیں۔'' وہ جھلا کر بولی۔ ''تو یہ کتنے غیر رومانی لوگ ہیں۔ اچھا ہے ایک دوسرے سے ہی نپٹ گئے۔ کسی اور کے حصے لگتے تو وہ بے چارا سر پیٹتا اپنا۔''

نیلم نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔

''اچھا! مثلاً اگر یوسف سے تمہاری منگنی ہو جاتی تو؟''

''سر پیٹتی اپنا، کہہ تو رہی ہوں۔ ارے زندگی کا سارا لطف ہی اس عمر میں، اور ان رشتوں کی ان چھوٹی چھوٹی سی باتوں میں تو چھپا ہے۔ کسی کے لیے دل میں کوئی خاص جذبہ رکھنا، اسے محسوس کرنا، دوسرے شخص پر عیاں کرنا۔ میں تو جذبے، مسکراہٹیں، گنگناہٹیں شیئر کرنے کی قائل ہوں۔ میں تو چاہوں گی، میں جہاں سے گزروں میرا محبوب وہاں اپنی نگاہیں بچھا دے۔ میں سامنے رہوں تو اس کا چہرہ ٹیوب لائٹ کی طرح چمکے، مجھے نہ پا کر آنکھوں کی ساری روشنیاں گل ہو جائیں، اسے اور کچھ نظر ہی نہ آئے، وہ میرا دیوانہ ہو، یہ بات ساری دنیا کو خبر ہو، ساری دنیا مجھے رشک بھری نظروں سے دیکھے۔ اس کی محبتوں کے غرور سے میرا سر ہمیشہ بلند رہے۔ آپ کی طرح میں کبھی گردن جھکا کر یوں نہ منمناؤں کہ ''وہ مجھے کتنا پسند کرتے ہیں، میں نہیں جانتی۔''

نیلم ہنس دی۔

''چلو، میری دعا ہے، تمہاری ہر خواہش خدا پوری کرے۔''

''مہربانی بابا سائیں!'' اس نے دونوں ہاتھ باندھ کر سر جھکایا۔ ''بس آپ کا آشیرباد ہی تو چاہیے۔''

شبنم اٹھ کر نیچے چلی گئی تو وہ وہیں بیٹھی ان باتوں پر غور کرتی رہی۔

''ٹھیک ہی تو کہتی ہے شبنم۔'' پھر اس نے سوچا۔ ''زندگی میں کتنی حرارت ہے، اسے کسی کی نظروں میں اپنے گالوں پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور میں حرارت و خوشی سے عاری زندگی گزارتی ہوں۔ خوش ہوتی ہوں تو محض پل بھر کے لیے، پھر آنے والے وقت کے نا قابل فہم اندیشے میرا دل دبوچ لیتے ہیں۔ نہ جانے کیوں میں اپنی خوشیوں کو ان واہموں سے ڈھک دیتی ہوں جن کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ بس پرچھائیاں ہیں۔ میں پرچھائیوں سے ڈر کر نا خوش رہنے والی لڑکی۔ میں شبنم کی طرح کیوں نہیں ہوں؟ وہ اپنے محبوب کی محبت ساری دنیا پر عیاں کر کے سربلند ہونا چاہتی ہے اور میں یوسف کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں، مبادا کوئی کچھ غلط نہ سمجھے۔ کوئی غلط سمجھے بھی تو کیا؟ یوسف میرے ہیں۔ میرے لیے ہیں۔ ان کی چاہتوں پر حق ہے میرا، اپنا حق بھی چھپ چھپ کر وصول کرو۔ کہاں کی دانائی ہے۔ میں یوسف سے نظریں جھکا کر ملتی ہوں۔ کہیں وہ میری نظروں میں اپنا عکس نہ دیکھ لیں۔ ان کا عکس انہی سے چھپانا کس قدر بے وقوفی کی بات ہے۔ آخر میں اس قدر پہرے کیوں بٹھاتی ہوں خود پر۔ اپنی ذات کے اندر اتنی گہرائی میں کیوں دفن ہوں۔''

''نیلی بجو!'' ریشم نے اس کی سوچوں کے سلسلے کو توڑا۔ ''آئیں نا نیچے، اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہیں؟''

اس نے خود سے الجھنا موقوف کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔



وہ سو کر اٹھی تو حسب عادت تھوڑی دیر کے لیے ٹیرس پر چلی آئی۔ کھلے بالوں میں انگلیاں چلا کر اس نے برابر والوں کے لان میں دیکھا اور اگلے ہی لمحے دل کی ساری کلیاں پھول بن گئیں۔

فیروز احمد اپنے لان میں موجود تھے۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا وہ کیاریوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''کیا بات ہے اس شخص میں ایسی؟'' وہ ہولے سے بڑبڑائی۔ ''عام سا شخص ہے، عام سا حلیہ ہے، پھر بھی ساری دنیا سے الگ لگتا ہے۔ اس کی ادائیں اتنی انوکھی انوکھی سی کیوں ہیں۔ یہ بیٹھا ہوا ہو تو اس کے سامنے بیٹھ کر تکتے رہنے کو جی چاہتا ہے، چل رہا ہو تو اس کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے قدم بے تاب ہونے لگتے ہیں۔ بولتا ہے تو رواں رواں ہمہ تن گوش ہو کر اس کے الفاظ کا حرف حرف اپنے اندر جذب کرنے لگتا ہے۔ کسی کی ہستی کو انتہائی شدت سے رد کیا جائے تو اس کا ردعمل کیا یہ احساسات و جذبات ہوتے ہیں جو میرے ہیں؟ میں سامنے ہوتی ہوں تو اسے خبر تک نہیں ہوتی۔ میری نظروں کی تپش، میرے جذبوں کی شدت اس قدر بے اثر ہو جاتی ہے، میری پرستش، میری ریاضتیں، یوں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ مجھے تو محض ایک نگاہ ہی کافی ہے فیروز احمد، صرف میں یہ جان سکوں کہ تم مجھ سے، میرے حال سے واقف ہو۔''

تھک کر وہ ریلنگ سے ٹیک لگا کر نڈھال سی کھڑی ہو گئی۔

''صبا!''

آواز پر وہ چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا شہروز اپنے لان میں کھڑا اسے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ فیروز اب وہیں پڑی کرسیوں میں سے

ایک کرسی پر بیٹھ کر چائے پی رہا تھا۔

"کیا کر رہی ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"تو یہاں آجائیں نا!"

صبا نے ایک نظر لاتعلق بیٹھے فیروز پر ڈالی۔

"تم آجاؤ شہروز!"

"نہیں آپ آیئے۔ کرکٹ کھیلتے ہیں۔ آیئے نا پلیز!"

اس کے اصرار پر وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ الماری کھول کر کپڑوں کا جائزہ لینے لگی، پھر کچھ سوچ کر اس نے پٹ بند کیے اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لینے لگی۔

"اس نے کب نظر اٹھا کر تمہیں دیکھا ہے صبا بی بی جو سنورنے چلی ہو!"

"وہ استہزائیہ ہنسی۔ برش اٹھا کر بالوں میں پھیرا اور پلٹ کر باہر نکل گئی۔

"آیئے جناب!" وہ اس کے آنے تک بیٹ اور بال لا چکا تھا۔

"کیا ہے شہروز! مجھے کھیلنا ویلنا نہیں آتا۔ چلو باتیں کرتے ہیں۔"

"باتیں۔ باتیں تو ساری عمر کریں گے۔" اس نے کن انکھیوں سے فیروز کو دیکھا۔ "اور کھیلنا نہیں آتا تو ہم سکھا دیں گے۔ ارے جناب! آدمی کو کچھ اور آئے نہ آئے کھیلنا ضرور آنا چاہیے۔ جو کھیلنا نہیں جانتے ہار جاتے ہیں۔"

"جو کھیلنا جانتے ہیں، وہ بھی تو کبھی کبھی ہار جاتے ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"جی ہاں۔ لیکن سارے داؤ پیچ آزما کر ہارا جائے تو ہارنے میں بھی مضائقہ نہیں اور گر کی بات یہ ہے صبا بی بی کہ بعض گیم ہار کر ہی جیتے جاتے ہیں۔ ارے ارے بھائی! آپ کہاں چلے؟"

"اس نے اُٹھ کر اندر جاتے فیروز کو مخاطب کیا۔

"کیوں؟" وہ پلٹا۔ "مجھ سے کچھ کام ہے؟"

"ہمارے پاس کوئی امپائر نہیں ہے۔" اس نے مسکین سی صورت بنائی۔ "اور میں قسم سے بڑا بے ایمان ہوں۔ صبا رونے لگیں گی۔"

"کیا مطلب!" اس نے حیرانی سے بھنویں اچکائیں۔ "میں کیا کروں؟"

"ہماری گیم میں تھوڑی دیر کے لیے شریک ہو جائیں نا۔ پلیز بھائی!" اس نے لجاجت سے کہا۔

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ صبا نے بڑی محویت سے اسے دیکھا۔

''آپ ہنسنا بھی جانتے ہیں؟'' اس نے سوچا تھا۔

قطعاً غیر متوقع طور پر وہ پلٹ کر آ گیا۔

''جی فرمایئے حضرت!'' وہ شہروز سے مخاطب تھا۔ ''کیا کرنا ہے مجھے؟''

''فیلڈنگ بھی کیجیے اور امپائرنگ بھی۔''

''دو کام بھلا میں کیسے کر سکتا ہوں۔'' وہ ہنسا گیا۔

''اچھا۔ تو لیجیے۔ بال کرائیں۔ صبا آپ بیٹنگ کریں۔ میں دو دو کام کر سکتا ہوں۔''

''شہروز! ایمان سے مجھے کھیلنا نہیں آتا۔'' صبا نے لجاجت سے کہا۔

پھر اس نے سنجیدگی سے بال پکڑے فیروز کو دیکھا۔ نجانے کیوں اسے ہنسی آنے لگی۔

(کھیل میں بھی اس درجہ سنجیدگی!)

''وہ سامنے والی دیوار پر بال لگی تو چوکا اور اگر جنگلا باہر نکلی اور اسے بال لگی تو چھکا۔'' شہروز انہیں حدود سے آگاہ کر رہا تھا۔

صبا اور فیروز بے اختیار ہنس دیے۔

''کیا بگاڑا ہے اس نے تمہارا؟'' صبا ہنستے ہوئے بولی۔

''ہم سر سے پاؤں تک سنورے ہوئے ہیں۔ ہمارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔'' اس نے فخریہ بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ''چلیں بھائی بال کرائیں۔''

صبا کو کہاں بیٹ سنبھالنا آتا تھا۔ وہ پہلی بال پر آؤٹ ہو گئی۔ اور پھر وہ بال کو دیکھ بھی کہاں رہی تھی۔ اس کے بعد شہروز بیٹ لے کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک زبردست شاٹ لگا کر بال کو غائب کر چکا تھا۔

''آپ لوگ ٹھہریں، میں ابھی بال ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔''

بیٹ وہیں ڈال کر وہ بھی جن کی طرح غائب ہو گیا۔

صبا ہونقوں کی طرح کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔

''آپ بیٹھ جائیں۔'' فیروز نے کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لڑکا تو کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔''

صبا قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آپ۔ آپ نے میرے اس دن کے رویے پر مجھے معاف کر دیا ہے نا؟''

''اس نے اچانک عجلت میں پوچھا تھا۔

وہ چند لمحوں کے لیے گڑبڑا گئی۔

''جی۔ جی!'' پھر وہ اتنا ہی بول سکی۔

''شکریہ!'' وہ مڑا اور بڑے بڑے قدم اُٹھاتا ہوا اندر چلا گیا۔ وہ لب کھول کر رہ گئی۔

''نجانے یہ مجھ سے اس قدر گریزاں کیوں رہتے ہیں۔'' اس نے مایوسی سے سوچا۔

''ہائیں۔ آپ اکیلی بیٹھی ہیں؟'' وہ سر پر تھا۔ ''کہاں گئے حضرت؟''

''وہ تو کب کے اندر چلے بھی گئے۔'' وہ اداسی سے مسکرائی۔ ''تمہاری پلاننگ کچھ زیادہ کامیاب رہی نہیں۔''

''چچ چچ چچ۔'' اس نے سر ہلایا۔

''تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا

بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو!''

''ہائی داوے آپ تھے کہاں؟'' صبا نے اسے گھورا۔

''جادوئی گیند آگے آگے تھی اور میں پیچھے پیچھے۔ بڑی مشکلوں سے گلی کے نکڑ پر جا کے قابو کیا ہے اسے۔''

''شہروز! اگر آئندہ تم نے ایسی کسی بے کاری پلاننگ میں مجھے شامل کرنا چاہا تو نا میں آنا چھوڑ دوں گی۔'' اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے اسے تنبیہ کی۔

''اوہو۔ یعنی پلاننگ کے ''بیکار'' ہونے پر اعتراض ہے۔ فکر مت کرو۔ آئندہ انہیں رسیوں سے جکڑ کر جاؤں گا۔ تاکہ میدان سے بھاگنے کی کوئی کوشش بھی نہ کر سکیں۔''

''شہروز!'' وہ روہانسی ہوئی۔ ''پلیز۔ ان کی نظروں میں میرا امیج خراب مت کرو۔ وہ بچے تو نہیں ہیں جو ان حرکتوں کو سمجھ ہی نہ سکیں۔!''

''صبا۔ دیکھیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا نا۔ وہ کیا کہا ہے غالب نے۔

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔

اور پھر آپ مجھ سے وعدہ بھی کر چکی ہیں تعاون کا، صبا! بجھنے کی کوشش کریں ہم دونوں فیروز بھائی کے بھلے کے لیے کریں گے جو کچھ بھی کریں گے۔''

''ہم ڈاکٹر نہیں ہیں شہروز۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''بھائی بھی بیمار نہیں ہیں۔'' وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ''بس ایک گرہ ہے ان کے ذہن میں، کسی وقت بھی کھل جائے گی، آپ انہیں تھوڑی سی توجہ دیں! صبا اس طرح کہ وہ اسے محسوس کریں۔ یوں سرسری طور پر انہیں اپنے ہونے کا احساس مت دلائیں۔ اس احساس میں قوت پیدا کریں۔''

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے اسے تسلی دی۔

''شہروز! میں اپنی عزتِ نفس کسی بھی قیمت پر مجروح نہیں ہونے دوں گی۔ میں ان کے لیے کچھ کروں گی بھی تو یہ سوچ کر نہیں کہ مجھے لازماً

ان کی زندگی کا حصہ بننا ہے۔ تم بھی ایسا ہر خیال فی الحال اپنے ذہن سے نکال دو۔"

"ہائے۔ یہ مشرقی لڑکیاں!" اس نے تاسف سے سر ہلایا۔ "ارے بابا! میں کون سا زبردستی آپ کا ہاتھ پکڑ کر اس گھر میں لا رہا ہوں۔ مجھے تو ذاتی طور پر آپ بہت پسند ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اور بھائی میں انڈراسٹینڈنگ ہو جائے۔ میں نے یہ تو کبھی نہیں سوچا کہ آپ کی بھی ایسی کوئی خواہش ہے یا نہیں۔ میں تو اپنی خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور بائی دا وے یہ "ان" اور "اُن" سے پیچھے کیوں نہیں آتیں آپ؟ نام لیا کریں بھائی کا، ورنہ میں بھی آپ کو "بھابی" کہنا شروع کر دوں گا۔"

"شہروز!" اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"بس یہی منظر تو دیکھنا چاہ رہا تھا میں۔" اس کا لہجہ شرارتی ہوا۔ ارے یار! یہ فیروز بھائی اتنے بدذوق ہوں گے، مجھے علم نہ تھا۔ نہ صرف وہ بلکہ آپ بھی حد درجہ بدذوق ہیں۔"

"وہ کیسے؟" وہ حیران ہوئی۔

"میں نظر نہیں آیا تھا آپ کو؟" اس نے مسکین صورت بنا کر پوچھا۔ "میں بھی تو اکثر ان میں ہوتا تھا ان کے ساتھ۔!"

صبا کو ایک بار پھر ہنسی آ گئی۔



"بجو! دیکھیں کون آیا ہے!"

"ریشم اور مریم یوسف کو پکڑ کر اندر لا رہی تھیں۔

"ارے بھئی مجھے چھوڑو تو سہی، میں خود بھی چل سکتا ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے بولے۔

"نہیں جناب۔ آپ کا کیا بھروسا۔ اتنے دن بعد نجانے کیسے یاد آ گئی ہماری۔" ریشم نے شکوہ کیا۔

"ہماری نہیں۔ نیلی بجو کی!" مریم مسکرائی۔

"مریم!" نیلم نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"توبہ ہے بجو آپ سے بھی۔ ذرا ذرا سی بات پر آنکھیں دکھاتی ہیں۔" اس نے منہ بنایا۔

"آپ لوگ باتیں کریں، میں اور مریم چائے بنا کر لاتے ہیں!" ریشم نے مریم کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور دونوں باہر نکل گئیں۔

"باہر اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے اور تم اندر کمرے میں گھسی بیٹھی ہو!" انہوں نے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

"میں سلائی کر رہی تھی نا!" اس نے ہاتھ میں پکڑی قمیص غیر شعوری طور پر چھپانا چاہی۔

"ذرا دکھاؤ تو۔ کیا سیا جا رہا ہے!"

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر قمیص لے لی۔

گہرے نیلے رنگ کی قمیص پر سفید موتیوں کا کام تھا۔ یہ اس کے جہیز کے کپڑے تھے۔

"واہ بھئی۔ بڑے خوبصورت کپڑے ہیں۔ تمہارے ہیں؟"

"جی!" اس نے شرما کر اثبات میں سر ہلایا۔

"ہوں۔ گویا تیاریاں جاری ہیں۔"

"انہوں نے اس کے چہرے پر بکھرتے رنگ دل چسپی سے دیکھے۔

"آپ اکیلے آئے ہیں؟" اس نے موضوع سے گھبرا کر اسے تبدیل کرنا چاہا۔ "چچی جان یا آمنہ وغیرہ نہیں آئیں؟"

"امی کو میں آمنہ کے گھر ہی چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ ثریا سے ناپ کے کپڑے وغیرہ لینا تھے پھر میں یہاں چلا آیا۔"

"چلیں باہر چل کر بیٹھتے ہیں!" اس نے کمرے میں پھیلی خاموشی اور تنہائی سے گھبرا کر کہا۔

"باہر صحن میں نہیں بلکہ چھت پر بیٹھیں گے۔ موسم بڑا اچھا ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

دونوں اٹھ کر باہر آ گئے۔ اماں، شبنم اور وقار بھائی بازار گئے ہوئے تھے۔ ناصر اور انجم برآمدے میں بیٹھے اپنے بستے ٹھیک کر رہے تھے۔ ریشم اور مریم کچن میں گھسی ہوئی تھیں۔

"بڑی خاموشی ہے۔" یوسف نے ادھر ادھر دیکھا۔ "کہاں ہیں سارے لوگ؟"

"مارکیٹ گئے ہیں۔ کچھ چیزیں وغیرہ خریدنی تھیں۔ ذوالفقار ٹیوشن پڑھنے گیا ہوا ہے۔ باقی سب تو گھر پر ہی ہیں۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔

"ریشم۔" پھر اس نے ریشم کو آواز دی۔ "ہم لوگ چھت پر ہیں چائے وہیں لے آؤ۔"

"اچھا بجو!" اس نے جواب دیا۔

پھر دونوں کے ہنسنے کی آواز آئی۔

"بڑی بے ہودہ لڑکیاں ہیں۔" وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کیوں بھئی؟" یوسف حیران ہوئے۔ "کیا کیا ہے بے چاریوں نے۔"

"ہر بات کا غلط مطلب اخذ کرتی ہیں۔ ذرا سنجیدگی نہیں ہے مزاجوں میں!" کبوتروں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"چھوٹی عمریں ہیں ان کی۔ شوخ طبیعت کا ہونا لازمی امر ہے!" یوسف نے ان کی طرفداری کی۔

"ارے جناب! آپ ہمیشہ کی سنجیدہ طبع۔ خاموش مزاج۔ ہمیں یہی تو ایک شکایت ہے!" نیلم نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''آپ کو یہ شکایت ہے مجھ سے؟''

''کیوں نہیں ہونی چاہیے؟'' انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ میں بھی انسان ہوں۔ کبھی کبھی میرا بھی دل چاہتا ہے کسی طرح تمہاری آنکھوں کی تحریر کو پڑھ سکوں۔ تمہارے دل میں کیا ہے جان سکوں۔ لیکن تم!'' انہوں نے گہری سانس بھری۔ ''اپنے جذبات کو ناقابلِ معافی جرم سمجھ کر چھپاتی ہو!'' اس کے لہجے میں حقیقتاً شکایت تھی۔

''یوسف!'' وہ اس انکشاف پر چند لمحوں کے لیے ہونق سی ہوگئی۔ ''آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ سے ہر بات اپنے منہ سے کہوں۔''

''ہمیشہ نہیں نیلی۔ لیکن کبھی تو!'' انہوں نے گلہ کیا۔ ''میں کئی دنوں تک نہیں آتا۔ محض تمہارے لبوں سے یہ سننے کے لیے کہ تم نے مجھے مس کیا۔ ہر کوئی شکایت کرتا ہے، ایک تم ہی کچھ نہیں کہتیں۔ میں نے امی جان سے زندگی میں کسی بات کی ضد کی تو وہ تمہارے حصول کے لیے کی۔ تم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم بھی اس مسئلے کو سلجھانے میں میری مدد کروگی بلکہ تمہیں یہ سب کچھ جان کر شاک لگا۔ کیا واقعی یہ محبت یک طرفہ ہے؟ قطعاً یک طرفہ؟''

نیلم نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔ وہ انہیں شدت سے پسند کرتی تھی، لیکن یہ بات کہنے کے لیے اسے پلِ صراط پر سے گزرنا پڑتا۔

''یوسف! آپ میرے کہے بغیر نہیں سمجھ سکتے؟''

''کیا؟''

''یہی کہ!'' وہ اُلجھن کا شکار ہوگئی۔

''کہ تم بھی مجھے چاہتی ہو؟'' انہوں نے اچانک پوچھا۔

''جی!'' وہ بے ساختہ بول گئی اور وہ بھی انتہائی زور دے کر۔

یوسف کے قہقہے نے اسے احساس دلایا کہ وہ کیا بول گئی ہے۔ وہ جھینپ کر رہ گئی۔

''کس بات پر اتنا ہنسا جا رہا ہے؟'' ریشم ٹرے کے ساتھ نمودار ہوئی۔

نیلم نے اس کے آجانے پر سکون کا سانس لیا۔

''ہماری آپس کی باتیں ہیں۔'' وہ خوشدلی سے بولے۔ ''تمہیں کیا لڑکی؟''

وہ مسکرائی اور ٹرے ان کے سامنے رکھ دی۔''

''پھر یہ لوازمات؟'' وہ اُلجھے۔ ''میں آنا چھوڑ دوں گا۔''

''کتنے دن کے لیے؟'' ریشم ہنسی۔ ''ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد تو آپ تیاریاں ساتھ لانی ہے۔ تب بھی نہیں آئیں گے کیا؟''

یوسف لاجواب ہو کر سر کھجانے لگے

تھوڑی دیر میں مریم بھی اوپر چلی آئی تو وہ ریشم اور مریم کو یوسف کے پاس چھوڑ کر نیچے آگئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اماں اور وقار بھائی اسے

یوسف کے ساتھ بیٹھا پاتے۔ کچن میں آ کر وہ بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ نجانے کب اسے احساس ہوا کہ وہ گنگنا رہی تھی اور بے تحاشا خوش تھی۔

''زندگی کا سارا لطف ہی اس عمر میں، اور ان رشتوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں چھپا ہوا ہے!''

اسے شبنم کی بات یاد آئی۔

''ٹھیک کہا تھا شبنم نے!'' اس نے مسکرا کر سوچا۔ ''بنا کسی بات کے دل میں کلیاں چٹک اٹھتی ہیں۔ بے وجہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ اچھا ہوا جو یوسف کو میرے جذبات سے آگاہی ہو گئی۔ آخر تھوڑا سا خوش ہونے کا تو ان کا بھی حق ہے۔!''

اپنی سوچ پر اسے ایک بار پھر ہنسی آ گئی۔

''کیا بات ہے بجو؟ اکیلے اکیلے ہنس رہی ہیں؟'' شبنم تھکی ہاری اندر داخل ہوئی۔

''ہمیں بھی سنائیں، کون سا لطیفہ یاد آ گیا؟''

''تمہاری صورت ذہن میں آ گئی تھی۔ بس آ گئی ہنسی!'' اس نے شبنم کو چڑایا۔

''سچ سچ کہیں۔ میری صورت ذہن میں آ گئی تھی یا یوسف بھائی کی۔ اکیلے میں تو آپ انہیں کو یاد کر سکتی ہیں۔ ہمارے نصیب ایسے کہاں؟'' وہ پانی نکال کر پینے لگی۔

''انہیں یاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ وہ اوپر چھت پر تشریف رکھتے ہیں۔'' اس نے اسے مطلع کیا۔

''ہائیں۔ کب آئے وہ؟ آج کیسے راستہ بھول پڑے!'' وہ بے ساختہ خوش ہوئی تھی۔

''تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے قبل آئے تھے۔ ریشم اور مریم بیٹھی ہیں ان کے پاس۔''

''بڑی نکمی ہیں یہ لڑکیاں!'' اسے غصہ آیا۔ ذرا عقل نہیں ہے۔''

''کیوں؟'' نیلم نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ ''کیا ہوا؟''

''ارے اتنی عقل تو ہونی چاہیے انہیں اگر گھر میں کوئی نہیں ہے تو یوسف بھائی کو آپ سے باتیں کرنے دیں۔ بیٹھ گئیں جڑ کر، وہ بے چارے آپ سے ملنے آتے ہوں گے، اور سالیوں سے مل کر چلے جاتے ہیں۔''

''نیلم زور سے ہنس دی۔

''بے فکر رہیں اماں جان! وہ مل چکے ہیں مجھ سے؟'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ہائے سچ!'' وہ خوش ہوئی۔ ''بالکل اکیلے میں؟''

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

''پھر کیا باتیں کیں؟''

اس کے پرشوق انداز پر اسے پھر ہنسی آ گئی۔

''اونہہ۔ فسق رہیے!'' وہ جھلا کر باہر نکل گئی۔

''توبہ ہے ان لڑکیوں سے۔'' وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''نجانے یہ کیا گل کھلائیں گی۔ ان کی منگنیاں ہوں گی تو پہرے بٹھانے پڑیں گے ان پر!''



''بھائی!''

''ہوں کہو!'' اس نے کتاب پر سے سر اٹھایا۔

''یہ......صبا ہیں نا۔ برابر والی پڑوسن!'' بڑی معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کر استفسار کیا، فیروز کے لبوں پر اس تعارف پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہاں ہیں! پھر؟'' وہ پھر کتاب کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''کیسی ہیں؟''

''کیا مطلب؟'' اس نے نظروں میں اُلجھن بھرا کر اسے گھورا۔

''میرا مطلب ہے۔'' وہ گڑبڑایا۔ ''یعنی۔ کیسی ہیں؟''

''یار شہروز! کبھی تو ڈھنگ کی بات کر لیا کرو۔'' وہ عاجزی سے بولا۔ ''ہر وقت یہی اوٹ پٹانگ باتیں، اوٹ پٹانگ حرکتیں۔ اب میں کیا بتاؤں وہ کیسی ہیں۔ ظاہر ہے اچھی بھلی خاتون ہیں۔''

''خاتون؟'' وہ اُچھل پڑا۔ ''یا الٰہی خیر! بھائی۔ وہ خاتون ہرگز نہیں ہیں۔ لڑکی ہیں لڑکی۔ چشم۔ انتہائی ضروری چیز! پھر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''اچھا پھر؟'' وہ زچ ہوا۔ ''لڑکی سہی۔ لیکن موضوع گفتگو کیوں ہیں اس وقت؟''

''بھائی۔ ہمیں ان سے دوستی کر لینی چاہیے۔'' اس نے بالآخر مدعا بیان کیا۔

''ہماری دشمنی تو نہیں ہے ان سے۔'' وہ بے زاری سے صفحے پلٹنے لگا۔

''میرا مطلب یہ ہے بھائی۔ وہ بے چاری اکلوتی ہیں ناں اس لیے بڑی تنہائی محسوس کرتی ہیں۔ شدت سے خود کو تنہا سمجھتی ہیں۔ ہم لوگ ان کا دل رکھنے کے لیے اگر تھوڑی سی توجہ، ذرا سا وقت دے دیا کریں تو کیا حرج ہے؟''

''کوئی حرج نہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔

اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں سن رہا تھا۔

''بھائی۔ وہ بہت ریفائنڈ، بہت سوبلائزڈ ہیں۔ اتنی سوفٹ نیچر ہے ان کی۔ مجھے تو بہت پسند ہیں وہ!'' اس نے ہمت نہیں ہاری۔

''اچھا!'' وہ دھیرے سے ہنسا پھر دراز میں خالی کاغذات نکال کر کچھ لکھنے بیٹھ گیا۔

''انہیں مطالعے کا بھی بڑا شوق ہے۔ بڑا اچھا ذوق رکھتی ہیں محترمہ!''

''ہوں!'' وہ بری طرح سے مصروف ہو چکا تھا۔

شہروز نے گہری سانس بھری اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''چل بھائی شہروز۔ تیری دال ابھی بہت سخت ہے!'' اس نے خود کو مخاطب کیا۔

''واہ صبا بی بی! کیا چن کر پتھر ڈھونڈا ہے سر پھوڑنے کو!''



دروازے پر دستک ہوئی تو وہ دریچے میں سے ہٹ کر دروازے تک آئی۔

''اوہ آپ!'' باہر کھڑے عثمان کو دیکھ کر وہ ہولے سے مسکرائی۔ ''آیئے!'' اس نے ہٹ کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا

''کیا کر رہی تھیں؟ میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا تمہیں؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ خوش دلی سے بولی۔ ''بالکل فارغ تھی۔ صبا کو یاد کر رہی تھی۔ بہت بے مروت لڑکی ہے۔ بھولتی ہے تو مہینوں شکل نہیں دکھاتی!''

''چلو بھئی۔ اتنی تو خوش قسمت ہیں مس صبا کہ تم انہیں یاد تو کرتی ہو۔!''

''میں کچھ نہیں؟'' اس نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

''اگر موڈ ہو تو آؤٹنگ کے لیے چلیں؟'' انہوں نے سوال جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔

''کون کون چل رہا ہے؟''

''میں اور تم!'' اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا

''ٹھیک ہے۔ میں چینج کرلوں۔ واپسی میں مجھے صبا کے گھر اتار دیجیے گا۔''

''اوکے۔ میں نیچے منتظر ہوں!'' وہ باہر جاتے ہوئے بولے۔

''بس پانچ منٹ!''

''اور واقعی ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ سفید لباس زیب تن کیے ان کے سامنے تھی۔

''خواتین کو اس قدر پنکچول کم ہی پایا ہے!'' وہ گھڑی دیکھ کر مسکرائے۔

''ہر کام وقت پر کر لینا ہی کامیابی ہے۔ میں کامیاب زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔''

وہ ان کی ہمراہی میں چلتے ہوئے بولی۔

"کہاں کے ارادے ہیں؟" عدنان، کاشف اور عمران انہیں سیڑھیوں پر ہی ٹکرا گئے۔

"بس یونہی ذرا آؤٹنگ کا پروگرام ہے۔ چلتے ہو؟" عثمان نے انہیں آفر کی۔

"نہیں بھئی۔ الماس کے ساتھ کون جائے!" عدنان نے منہ بنایا۔ "بور کریں گی!"

"میں تو بہت تھکا ہوا ہوں!" عمران نے جماہی لی "سوؤں گا۔"

"مجھے تو ایک دوست سے ملنے جانا ہے" کاشف نے گھڑی دیکھی۔ "ٹھیک اسی وقت!"

"شیطانوں کی ٹولی۔" الماس نے دانت پیسے۔ "سب سمجھتی ہوں میں!"

"تینوں ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔"

"آؤ۔" انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے متوجہ کیا تو وہ چونک کر آگے بڑھی۔

"کسی اچھی سی جگہ سے کافی پیتے ہیں!"

"میں کافی کم پیتی ہوں۔" وہ فوراً بولی۔ صحت خراب ہوتی ہے!"

"بڑا خیال ہے صحت کا۔ اس حساب سے تو تمہیں اتنا نازک نظر نہیں آنا چاہیے؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

"صحت موٹاپے سے مشروط نہیں ہے۔" اس نے بال جھٹکے۔

"ہاں بھئی، ہمیں کیا خبر ہم نے کون سی ڈاکٹری پڑھی ہے۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ مسکرا دی۔

میرا مطلب یہ ہے کہ میں موٹا نظر آنے کے لیے نہیں بلکہ حسین نظر آنے کے لیے اپنا خیال رکھتی ہوں۔ اچھی صحت حسن کی ضامن ہے!"

"تمہیں کس نے بتایا کہ تم حسین نظر آتی ہو!" انہوں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

"میں روز آئینہ دیکھتی ہوں!" اس کے لہجے میں تفاخر کا احساس تھا۔ "اور میں بہت حقیقت پسند ہوں۔"

"درحقیقت تمہارا یہی انداز مجھے بہت پسند ہے!" انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"کون سا انداز؟" اس نے بھنویں اچکائیں۔

"تمہارے نزدیک تمہاری اپنی ذات بہت اہمیت رکھتی ہے، یہ بات مجھے بہت اپیل کرتی ہے!"

"آف کورس، ہر انسان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت اس کی اپنی ذات کی ہوتی ہے۔" وہ شانے جھٹک کر بولی۔ "یہ کوئی انوکھی بات تو نہیں۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جتنی اہمیت انسان خود کو دیتا ہے، وہ واقعی اتنا اہم ہے بھی یا نہیں۔ یہ توازن بگڑ جائے تو بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ انسان جتنی عزت خود کو دینا چاہے دے۔ لیکن پہلے خود کو اس مقام عزت تک پہنچائے تم سمجھ رہی ہو نا میرا پوائنٹ آف ویو!"

"شاید آپ مجھ پر طنز کر رہے ہیں؟"

"بخدا نہیں۔" وہ جلدی سے بولے۔ "یہ تو یونہی خیالات کی ایک بحث چل نکلی۔ اس میں میری یا تمہاری ذات براہ راست انوالو نہیں ہے۔"

"پھر چھوڑیے ان بے کار باتوں کو۔" وہ بے زاری سے بولی۔ "خالی خولی نظریاتی بحث کی میں تو ہرگز قائل نہیں ہوں۔ جب تک بندے کی ذات کسی مسئلے میں براہ راست انوالو نہ ہو، اس پر توجہ دینا فضول ہے!"

"یعنی تم باتوں کی گہرائی میں جانا پسند نہیں کرتیں؟" اُنہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہرگز نہیں۔ بے وجہ دریا میں کودنے کی میں قائل ہی نہیں۔"

"ایسے لوگ قیمتی پتھروں سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ بھی تو سوچو!"

"جن چیزوں کی ضرورت میں اپنی زندگی میں محسوس ہی نہیں کرتی، ان کے لیے پریشان ہونے سے کیا فائدہ؟" وہ مسکرا دی۔

عثمان چند لمحوں کے لیے کسی گہری سوچ میں کھو گئے تھے۔



"بے وجہ دریا میں کودنے کی میں قائل ہی نہیں ہوں۔"

وہ کتاب کھولے بیٹھے تھے لیکن ذہن الماس کی باتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ نجانے کیوں اس وقت انہیں اس کی باتیں رہ رہ کر یاد آ رہی تھیں۔

"مجھے تو ساری راتیں ایک سی لگتی ہیں۔" اس نے کہا تھا۔ "گرمیاں ہوں تو اے۔ سی آن کر کے سو جاؤ۔ سردیاں ہوں تو بلینکٹ میں دبے رہو۔ چاند کا بھلا کیا کرنا ہے!"

"عثمان نے بے دلی سے کتاب بند کی اور اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔

"مجھے لٹریچر وغیرہ کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں۔"

"اُنہوں نے اپنے کمرے میں چاروں طرف شیلف سے جھانکتی کتابوں پر نظر دوڑائی۔

"کیا میں نے جلد بازی میں ایک غلط فیصلہ کر لیا ہے؟" اُنہوں نے خود سے سوال کیا۔

"کیا میں ایک ایسی لڑکی کے ساتھ ساری زندگی گزار سکتا ہوں جسے رویوں سے زیادہ چہروں پر غور کرنے کی عادت ہو؟ جسے پورے چاند کا بھرپور نظارہ بھی اپنی جانب متوجہ کرنے اور سوچنے پر مجبور کر دینے میں ناکام رہتا ہو؟ جو محض خود میں گم رہتی ہو۔ اپنی ذات سے ایک قدم آگے جا کر سوچنا بھی اسے مشکل لگتا ہو؟"

وہ بے چین ہو گئے۔

"سوچ لو عثمان خان۔ ابھی بھی وقت ہاتھ سے نکلا نہیں ہے۔ تم جیسا شخص کیا اتنے سطحی انداز سے سوچ سکتا ہے کہ محض چہرے سے متاثر ہو کر زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر ڈالے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ تم محض ایک چہرے ہی سے ہارے ہو۔"

"وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے الماری تک آئے۔ اسے کھولا اور سب سے نچلے خانے سے ایک فریم شدہ تصویر نکالی۔

یہ الماس کی تصویر تھی۔ منگنی والے دن کی تصویر۔ گرین کپڑوں میں۔ مسکراتی ہوئی الماس کا چہرہ بار بار دیکھنے پر بھی ان کا جی سیراب نہ ہو پاتا تھا۔

چمکتا ہوا چاند سا مکھڑا، شانوں پر بکھرے سیاہ چمکدار بال، سفید دانتوں کی لڑی وہ حسن کی مکمل تفسیر لگتی تھی۔

"چھوڑ سکتے ہو شان خان؟"

"انہیں یوں لگا وہ مغرور حسینہ ان سے مخاطب تھی۔

گہری سانس بھر کر انہوں نے تصویر میز پر رکھ دی۔

"بڑا زعم تھا ہمیں کہ ہم چہروں سے متاثر نہیں ہوتے۔" پھر انہوں نے مسکرا کر سوچا۔" ظاہری حسن سے شکست نہیں کھاتے۔ نقلی جواہرات کا سودا نہیں کرتے۔ خوب پرکھ کر ہیروں کو چنتے ہیں۔ لیکن الماس بیگم! ہم تم سے اپنی ہار تسلیم کرتے ہیں! اب تم کندن نکلو یا محض مٹی بھر راکھ، تمہیں چھوڑ دینا ہمارے بس میں نہیں۔"

میز پر بچی الماس کی تصویر تفاخر کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔



"غزالہ۔ پیریڈ نہیں لینا ہے کیا؟" ریشم کلاس روم کی طرف جا رہی تھی، غزالہ کو پاؤں پسارے بیٹھا دیکھ کر ٹھٹھک کر رکی۔

"اوں ہوں۔ موڈ نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"موڈ نہیں ہے؟" وہ مزید حیران ہوئی۔" پیریڈ سے کیا تعلق؟ تمہیں معلوم ہے ہی۔ آر ابھی تمہیں ڈھونڈتی ہوئی آ جائے گی۔"

"اسے پھولوں کی ایک پلیٹ کھلا دوں گی چھٹی میں؟" وہ ہنسی۔" اور آج تم اکیلی کیسے دکھائی دے رہی ہو؟ مریم نہیں آئی؟"

"نہیں۔ اس کے سر میں درد تھا۔ نیلی بجو اور شبنم آپی کو مارکیٹ جانا تھا۔ اس لیے بھی اس نے چھٹی کر لی۔ چلو ناں پیریڈ لیتے ہیں۔!"

"نہ بابا معاف کرو۔ یہ کیمسٹری تو میرے سر کے اوپر سے کم از کم دس فٹ کے فاصلے سے گزرتی ہے۔ بلکہ آج تم بھی چھوڑ دو پیریڈ!"

"مسز انصاری سے پٹنا نہیں ہے مجھے!" ریشم نے منہ بنایا۔

"ایک اتنی مزے کی چیز دکھاؤں گی تمہیں۔" اس نے لالچ دیا۔

"اچھا۔ کیا ہے؟"

"چلو پچھلے گراؤنڈ میں چلتے ہیں!" وہ بیگ سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"وہی۔ آر۔"

"ارے گولی مارو۔ آؤ نا!" وہ اس کا ہاتھ تھام کر چلتی چلی گئی۔

"اگر مریم ہوتی تو کبھی پیریڈ مس کرنے کی اجازت نہ دیتی!" اس نے سوچا۔

"ہاں اب بولو۔" پچھلے گراؤنڈ میں آ کر نیم کے چوڑے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "ایسی کیا توپ چیز ہے جس کے لیے تم نے مجھ سے پیریڈ مس کروایا ہے!"

"میرے منگیتر کی تصویر اور اس کا خط!" وہ اطمینان سے بولی۔

"ہائے سچ!" وہ اُچھل پڑی۔ "جلدی دکھاؤ نا!"

"اب کیوں اُچھل رہی ہو؟" وہ زور سے ہنس دی۔

"دکھاتی ہو یا جاؤں میں!" وہ فوراً خفا ہوئی۔

"اچھا بابا۔ یہ دیکھو!"

اس نے تصویر نکال کر اسے دکھائی۔ ریشم دلچسپی سے جائزہ لینے لگی۔ اچھا خاصا خوبرو نوجوان تھا۔ نشیلی آنکھوں اور ماتھے پر بکھرے بالوں سے ہیرو بننے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔

"ہوں۔ اچھے ہیں ہمارے دولہا بھائی۔" وہ مسکرائی پھر اگلے ہی لمحے خفا ہوئی۔ "بدتمیز لڑکی۔ تم نے منگنی کر لی اور ہمیں مدعو کرنا تو درکنار مٹھائی تک کو نہیں پوچھا!"

"کھلا دوں گی مٹھائی بھی۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "منگنی کی باقاعدہ کوئی رسم نہیں ہوئی۔"

"رشتہ دار ہیں تمہارے؟"

"بس دل کا رشتہ ہے!" وہ قہقہہ مار کر ہنس دی۔

"مطلب!" اس نے نظروں میں اُلجھن بھر کر اسے دیکھا۔

"تو بہ ریشم! تم تو بالکل ہی گئی گزری ہو۔ اچھا یہ دیکھو ان کا خط!" اس نے ایک تہہ شدہ کاغذ اسے تھمایا۔

"نہ بابا۔ دوسروں کا خط نہیں پڑھتے، وہ بھی اس قدر رازداتی!" اس نے جھجک کر اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے۔

"ارے تو میں خود کہہ رہی ہوں تم سے۔ تم کون سا چھپ کر بغیر اجازت کے پڑھو گی، لو پڑھو نا!"

ریشم نے کاغذ لے کر اس کی تہوں کو کھولا اور خاموشی سے پڑھنے لگی۔ پھر چند لائنیں پڑھ کر اس نے خط واپس تہہ کر دیا۔

"کیا ہوا؟" غزالہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں۔ بس رکھ لو۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "اچھا چلو اب پیریڈ لیتے ہیں!"

"میں تو اب ہرگز نہیں لے سکتی پیریڈ۔" وہ گھڑی دیکھ کر بولی۔ "مجھے گھر جانا ہے۔"

"ابھی سے؟ ابھی تو ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے۔"

''تو رہے میں تو تھک گئی ہوں!'' وہ بیگ کاندھے سے لٹکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اچھا پھر کل ملیں گے۔''

''اچھا۔!'' وہ لب ہلا کر رہ گئی۔

''عجیب ہے یہ غزالہ بھی!''

اسے جاتا دیکھ کر وہ زیر لب بڑبڑائی پھر کاندھے اچکا کر کلاس روم کی سمت چل دی۔



''مریم۔!'' اس نے سونے کی کوشش کرتی مریم کو ہلایا۔ سو گئی ہو کیا؟''

''کسی سوتے ہوئے شخص کو جھنجوڑ کر یہ پوچھنا کہ سو چکا ہے، انتہائی غیر اخلاقی حرکت ہے۔ بہر حال میں جاگ رہی ہوں۔ فرمایئے!''

اس نے ریشم کی جانب کروٹ لی۔

''پتا ہے مریم۔ آج غزالہ اپنے منگیتر کی تصویر اور خط لائی تھی۔''

''اچھا۔!'' یک لخت اس کی آواز میں بھی اشتیاق جھلکنے لگا۔

''کب ہوئی اس کی منگنی؟''

''منگنی تو نہیں ہوئی۔ بس یونہی بات ہو گئی ہے۔''

''کیسا ہے اس کا منگیتر؟''

''اچھا ہے۔ بڑا ہینڈسم ہے۔ لیکن کچھ چھچھورا ہے۔'' اس نے منہ بنایا۔ مریم کو ہنسی آ گئی۔

''اچھا۔ تمہیں کیسے خبر؟''

''ارے ایسا بے ہودہ خط لکھا تھا اس نے، مجھے تو پڑھ کر شرم آنے لگی۔ گال گرم ہو گئے میرے۔''

''ہائیں۔ تمہیں کس حکیم نے مشورہ دیا تھا اس کا خط پڑھنے کا؟'' وہ ہنستا اٹھی۔ ''جانتی ہو کس قدر غیر اخلاقی حرکت ہے؟''

''جانتی ہوں۔ وہ غزالہ ہی شو مار رہی تھی نا۔ زبردستی پڑھنے کو دیا مجھے۔ میں نے دو سطریں پڑھ کر واپس کر دیا۔

''ریشم!'' یہ غزالہ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔'' مریم نے کچھ سوچ کر اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''کیا مطلب ہے ٹھیک نہیں لگتی؟ ٹھیک ٹھاک لڑکی ہے تم تو بس یونہی شک کرنے لگتی ہو۔''

''نہیں۔ کہیں کچھ گڑبڑ ہے ضرور۔ پتا ہے کالج میں ساری لڑکیاں کہتی ہیں کہ وہ کلاسیں چھوڑ کر کسی لڑکے کے ساتھ چلی جاتی ہے!''

''لڑکیاں تو ہر کسی کے متعلق بکواس کرتی رہتی ہیں۔'' وہ جل گئی۔ ''بے وجہ بے چاری لڑکی کو بدنام کرنے سے کیا حاصل۔ بس یہ ہے کہ ذرا سی چھچھوری ہے۔ شو مارنے کی عادت ہے اسے۔ اور کچھ نہیں۔''

''تم کیوں اتنی طرف داری کر رہی ہو؟''

''مجھے دوسروں پر شک کرنے کی بیماری نہیں ہے۔''

''شک کرنا کبھی کبھار سودمند بھی ثابت ہوتا ہے۔انسان بہت سے نقصانات سے بچ نکلتا ہے۔''

''کیا ہوگیا ہے تم دونوں کو؟'' شبنم کی نیند میں بھری آواز آئی

''یہ چٹر پٹر چھت پر جا کر کرلو، ہماری نیند تو خراب مت کرو۔''

''ایک تو یہ شبنم آپی!'' ریشم نے بولنا چاہا۔

''شی۔!'' مریم نے اسے ٹھوکا دے کر خاموش کر دیا۔



''السلام وعلیکم آنٹی!''

''وعلیکم السلام۔'' عفت خانم نے سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرا کر جواب دیا۔

''شہروز نہیں ہے؟'' اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

''تم بیٹھو آتا ہوگا۔اس کا ایڈمیشن ہوگیا ہے یونیورسٹی میں، اسی خوشی میں ادھر ادھر دوڑا پھر رہا ہے۔''

''سچ!'' صبا کو حقیقتاً خوشی ہوئی۔''کس ڈیپارٹمنٹ میں؟''

''بی۔بی اے میں۔اس کا ارادہ بھی بہروز کے ساتھ بزنس میں ہاتھ بٹانے کا ہے۔بہروز نے کہا ہے پہلے تعلیم مکمل کرو پورے دھیان کے ساتھ،اس کے بعد کسی کام کا سوچنا!'' وہ چشمہ صاف کرتے ہوئے بولیں۔

''بالکل ٹھیک کہا اُنہوں نے۔'' اس نے تائید کی۔

''بہروز تو بہت کم عمر تھا جب گھر کی ذمہ داری آپڑی اس پر بے چارے کو بہت شوق تھا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا۔اب چاہتا ہے کہ اس کے بھائی اس کے حصے کی تعلیم بھی حاصل کریں۔'' وہ ہنس دیں۔

وہ خاموش ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔یہ سوبری، نرم طبیعت خاتون اسے بہت پسند تھیں،انہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اُنہوں نے بڑی کٹھن راہیں طے کی ہیں۔ان کے چہرے سے ہی ان کے باہمت اور پرعزم ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

''کتنا پرسکون گھر ہے!'' اس نے سوچا۔''چپے چپے پر اپنائیت بکھری معلوم ہوتی ہے،مبارک ہوں گے وہ قدم جو یہاں اُتریں گے!''

''خاموش کیوں بیٹھی ہو بیٹی! کچھ بات کرو۔'' اُنہوں نے محبت سے اسے دیکھا۔''امی کو کیوں نہیں لے آئیں ساتھ۔؟''

''امی ایک عزیزہ سے ملنے گئی ہیں۔میں اکیلی تھی،سوچا یہاں آجاؤں۔''

''اچھا کیا۔یہ گھر تو ترستا ہے لوگوں کو۔لڑکے سارا دن باہر ہوتے ہیں۔میں اکیلی دیواروں سے سر پھوڑتی ہوں۔!''

''جنا کہاں ہے آنٹی؟''

''اپنے کوارٹر میں ہوگی۔ وہ بے چاری بھی تھک جاتی ہے سارا دن کام کر کے۔''

''نہ صرف کام سے بلکہ شہروز کی باتیں بھی تھکاتی ہوں گی اسے۔'' وہ ہنسی۔

''ہاں، یہ بھی ہے۔'' وہ بھی ہنس دیں۔ ''خیر، میں نے بھی علاج ڈھونڈ نکالا ہے ان سارے مسئلوں کا۔''

''وہ کیا آنٹی؟'' اس نے دلچسپی سے انہیں دیکھا۔

''لاہور میں میری رشتے کی ایک بہن رہتی ہیں۔ ان کی بیٹیوں کا سنا ہے، بڑی لائق اور فرمانبردار لڑکیاں ہیں۔ سوچتی ہوں انہیں تار دے کر بلوالوں۔ بہروز اور فیروز کے لیے، اچھا ہے لڑکے بھی ان سے مل لیں گے۔ اُٹھنا بیٹھنا دیکھ لیں گے، پھر راضی ہوئے تو دونوں کی شادی کر دوں گی؟''

''جی!'' وہ نظر جھکا کر رہ گئی۔

دل کی ساری روشنیاں اُنہوں نے پھونک مار کر بجھا دی تھیں۔

''ہیلو ہیلو۔'' وہ شور مچاتا اندر آیا تھا۔ ''تو یہاں ہیں محترمہ۔ میں گھنٹہ بھر سے آپ کی تیل بجا رہا ہوں۔ کوئی شنوائی ہی نہیں۔''

''کہاں تھے تم؟'' اس نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

''اتنی پھیکی مسکراہٹ؟'' اس نے غور سے صبا کا اترا چہرہ دیکھا۔ ''کیا بات ہے امی جی۔ ڈانٹ پلائی ہے کیا اکیلے میں؟''

''کیوں بھئی۔ اتنی پیاری سی بچی ہے۔ میں بھلا کیوں ڈانٹنے لگی۔ ہاں یہ بور ضرور ہو رہی تھی۔ اب ہم بوڑھے لوگ تم نوجوانوں کی دلچسپی کی باتیں تو نہیں کر سکتے نا!''

''جایئے امی حضور۔ آپ نے ہماری سہیلی کو بور کیا، ہم آپ سے ناراض ہیں۔ چلیں صبا، باہر چلتے ہیں۔''

وہ دونوں اُٹھ کر باہر چلے گئے۔

''ٹھیک کہہ رہا تھا فیروز!'' اُنہوں نے مسکراتی نظروں سے دونوں کا پیچھا کیا۔ شہروز اور یہ پسند کرتے ہیں ایک دوسرے کو۔ عمر میں شاید ایک آدھ سال کا فرق ہو، لیکن اس سے بھلا کیا ہوتا ہے۔ دونوں کتنا خوش نظر آتے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ۔ بہروز اور فیروز کی بات ہو جائے تو میں نجمہ بیگم سے بات کروں گی۔ اچھی جوڑی رہے گی۔ خدا نظر بد سے بچائے۔''



''اے محترمہ!'' اس نے گم صم سی صبا کے چہرے کے آگے ہاتھ ہلایا۔

''آں!'' وہ کسی گہرے خیال کی زد سے باہر آئی۔ ''کہو؟''

''کیا ہے بھئی۔'' وہ چڑ گیا۔ ''یعنی مجھ سا ہینڈسم، شاندار پرسنالٹی کا بندہ آپ کے سامنے موجود ہے اور آپ کہیں اور کھوئی ہوئی ہیں۔ ذرا میری آنکھوں پر دھیان دیجیے، یہ بھی کسی سمندر سے کم معلوم نہیں ہوں گی آپ کو۔ کئی جزیرے پوشیدہ ہیں اس بحر بے کنار میں، ذرا اترئیے تو، اترئیے۔

ارے دیکھیں ادھر۔!"

"اس نے صبا کا چہرہ ذرا سا اونچا کیا۔

"ہائیں۔صبا!" اس کی آنکھوں میں پانی دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔" کیا ہوا ہے بھئی۔بتائیں نا!"

"کچھ نہیں شہروز۔" اس نے جلدی سے آنکھوں کے کنارے انگلی کو پورے سے خشک کر لیے" بس یونہی!"

"بس یونہی؟ بس یونہی تو آپ بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ہنس سکتی ہیں، بول سکتی ہیں، گا سکتی ہیں۔یہ "بس یونہی" کیسا؟"

"جانے دو۔تم سناؤ۔آنٹی بتا رہی ہیں ایڈمیشن ہو گیا تمہارا!" اس نے بات بدلی۔" کتنے بدتمیز ہو مٹھائی تو دور کنار، چینی کے ایک چمچ تک کو نہیں پوچھا۔"

"اچھا۔ایڈمیشن پر گفتگو کرنی ہے؟" وہ ہنسا۔" چلیں کر لیتے ہیں، یہ آنسو کا بھید بعد میں کھوج لیں گے۔ہاں تو ایڈمیشن ہو جانے پر مجھے مبارک ہو، بہت بہت۔مجھے بھی آج ہی یہ خبر ملی ہے۔مٹھائی تو بڑی معمولی سی چیز ہو جائے گی آپ جیسی خاص الخاص ہستی کے لیے آپ کو تو اچھا سا ڈنر کرانا چاہتا ہوں کسی اچھی سی جگہ پر جو کہ ممکن ہو سکا تو آج ہی کر لیں گے۔فیروز بھائی کے ہاتھ پیر جوڑ کر انہیں بھی لے چلیں گے۔اور اب بتائیں کہ آپ رو کیوں رہی ہیں؟"

جلدی جلدی اپنی بات کا اختتام کر کے وہ انتہائی معصومانہ چہرہ بنا کر اسے دیکھنے لگا۔صبا جو بڑی محویت سے اسے دیکھ رہی تھی۔جلدی سے دوسری جانب دیکھنے لگی۔

"صبا! میں ناراض ہو جاؤں گا۔" اس نے دھمکی دی۔

"اچھا۔واقعی؟" صبا نے اس بات پر مسکرا کر اسے دیکھا۔

"میں بھی رو دوں گا۔وہ بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر۔" اس نے اگلی دھمکی دی۔

"اچھا۔رو کر دکھاؤ۔!"

شہروز نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں، جتنا سامنے آجائے تو رونا بھی ممکن ہو سکے گا۔جتنا۔ارے بھئی جتنا۔"

صبا بے اختیار ہنستی چلی گئی۔

"اچھا نہیں بتاتا؟" اس نے گہری سانس بھری۔" چلیں بھئی مرضی ہے آپ کی۔ہمارا بھلا کیا حق، کیا اختیار جو ہم کچھ پوچھ سکیں۔"

"آنٹی ابھی ذکر کر رہی تھیں، تمہاری کوئی کزنز وغیرہ ہیں۔" اس نے مجبوراً سر جھکا کر کہنا شروع کیا۔" وہ چاہتی ہیں کہ انہیں یہاں بلوا لیں تاکہ بہروز بھائی اور فیروز انہیں دیکھ لیں۔"

''اوہ!'' اس نے معنی خیزی سے کہا۔ ''تے فیر؟''

''پھر کچھ بھی نہیں۔'' اس نے شرمندگی سے انگلیاں چٹخائیں۔ ''مجھے یونہی رونا آ گیا۔''

''اور اس روز کیا ارشاد فرما رہی تھیں محترمہ؟'' وہ ہنسنے لگا۔ ''ایسی ہر بات اپنے دل سے نکال دو اور فلاں ڈھمکاں اور یہ اور وہ؟''

''مجھے پتا تھا۔ تم مذاق اُڑاؤ گے، اسی لیے میں نہیں بتا رہی تھی۔''

''نہیں نہیں۔ میں مذاق نہیں اُڑا رہا۔ میں کسی کے دلی جذبات کی تضحیک نہیں کرتا۔ چلیں خیر اندر چلتے ہیں چائے بناتے ہیں۔ ہر وقت میرے ساتھ جڑی بیٹھی رہتی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی والدہ میری والدہ سے اوپری اوپر کچھ طے کر لیں۔''

''شہروز۔!'' صبا نے مسکراہٹ چھپا کر اسے گھورا۔

''ویسے میں کچھ اتنا برا بھی نہیں۔'' وہ مزید شریر ہوا۔ ''کیا خیال ہے؟''

''میں ابھی عفت آنٹی کو بتاتی ہوں۔''

''ہا۔!'' اس نے سانس بھری! ''ہم تو ہر حالت میں تیرے تو نے بھی ہمیں اپنا سمجھا؟'' دونوں ہنستے ہوئے اندر کی جانب بڑھ گئے۔

بائیک اسٹارٹ کرتے فیروز احمد کے کانوں میں محض اس کا آخری جملہ ہی پڑ سکا تھا یا پھر وہ بے ساختہ ہنسی کی آواز جواب تک آ رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔

''چھوٹے بھائی صاحب! بڑے گل کھل رہے ہیں۔ دُعائیں دینا ہمیں، ابھی تک تمہارے دل کی آواز تمہارے کہے بغیر ہی پہنچا دی۔ حضرت فرما رہے تھے، وہ بڑی ریفائینڈ، بڑی سویلائزڈ ہیں۔ بڑی سوفٹ نیچر ہے ان کی۔ خیر، خوش رہو میاں!''

وہ بائیک سڑک پر لے گیا۔



''اب بس بھی کرو شبنم!'' نیلم نے اسے ٹوکا۔ ''کیا آنکھیں اچھی نہیں لگتیں؟ محروم مت ہو جانا بصارت سے اس شوق کے پیچھے!''

''لیجیے!'' وہ طنز سے بولی۔ ''ایک تو جناب کے جہیز کے لیے رات دن ایک کیے دے رہی ہوں اوپر سے مجھ پر ہی نزلہ گر رہا ہے۔''

''تم نے بھی تو حد کر رکھی ہے۔ صبح، دوپہر شام ایک ہی کام، جہیز نہ ہو گیا، آفت قیامت ہو گئی۔ کیا مر جاؤں گی شادی کرتے ہی، بعد میں دے دینا جو کچھ رہ جائے!'' وہ سخت بھنائی ہوئی تھی۔

''کیا ہو گیا بجو؟'' اس نے مسکرا کر قمیص ایک طرف رکھ دی۔ ''کیوں خفا ہو رہی ہیں؟''

''ایک تم ہی تو ہو جس سے میں ذرا کھل کر باتیں کر لیتی ہوں۔ تم نے بھی قسم کھا رکھی ہے مصروف رہنے کی، ریشم اور مریم اپنی پڑھائی میں لگی رہتی ہیں۔ باقی رہے لڑکے تو وہ اپنے دھندوں میں لگے رہتے ہیں۔ میں اور اماں ٹکر ٹکر ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں۔''

شبنم ہنس دی۔

''پتا ہے بجو۔ سب سے زیادہ میں یاد کروں گی آپ کو۔''

''جی نہیں۔'' وہ بھی ہنس پڑی۔ ''سب سے زیادہ انجم یاد کرے گی مجھے۔ اسے میں نے ہی تو پالا ہے۔''

''میں یوسف بھائی کو وارننگ دوں گی کہ آپ کو ہر روز ملوانے کے لیے لے آئیں۔ جس دن بھی ناغہ ہوا ہم چاروں بہنیں دعا واپس لے لیں گی۔''

''ہاں۔ ایسے ہی تو فرماں بردار ہیں نا تمہارے یوسف بھائی!''

''آپ کے صرف یوسف ہیں۔'' شبنم نے ٹوکا ''بھائی کہنا ہمارا حق بنتا ہے!''

''میں نے بھی ''تمہارے یوسف بھائی'' ہی کہا ہے!'' وہ ہنس دی۔

شبنم نے غور سے اسے دیکھا۔

''بڑی نکھرتی جا رہی ہو جیسے جیسے دن قریب آ رہے ہیں۔ قربتوں کا اثر تو سن رکھا ہے۔ قربتوں کے خیالات کا اثر دیکھ رہے ہیں!''

''اچھا۔ بکو مت!'' وہ جھینپ گئی۔ ''ایک تو میں تمہارے ان تجزیوں سے تنگ آئی ہوئی ہوں۔ ذرا منہ سے کوئی بات نکلی نہیں اور تم نے پکڑی نہیں۔''

''ہاں تو خود سے تو کچھ کہتی ہیں نہیں آپ۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''اب ہم لفظ اور جملے ہی پکڑیں گے۔''

''لفظ اور جملے نہ ہوئے مچھلیاں ہو گئیں۔'' ریشم نے اندر آتے ہوئے اس کا جملہ سنا تھا۔ ''بھلا کیوں پکڑیں گی شبنم آپی؟''

''یہ ہماری بہنوں کی بات ہے تمہیں اس سے کیا؟'' وہ دوبارہ قمیص کی جانب متوجہ ہو گئی۔

''اور میں اور مریم کون ہیں؟'' وہ بری طرح سے چڑ گئی۔ ''ہم بہنیں نہیں ہیں تو کیا بھائی ہیں؟ کیا آس پڑوس سے آ گئے ہیں اس گھر میں؟''

"شبنم نے محض مسکرا دینے پر اکتفا کیا۔

"آپ بھی کرتی ہیں شبنم آپی!" وہ بڑبڑانے لگی۔ "اپنی ڈیڑھ انٹ کی مسجد الگ بنا لیتی ہیں ہم تو جیسے۔"

"ارے ارے۔" نیلم گھبرا کر بول پڑی۔ "کیا ہو گیا ریشم۔ ایسی کیا بات ہو گئی؟"

"پھر بتائیں۔ کیا باتیں کر رہے تھے آپ لوگ؟" وہ دھم سے اس کے قریب بیٹھی۔ "میں اور مریم تو ترستے ہیں آپ دونوں کی شریک گفتگو بننے کے لیے۔ اب ہم اتنی بھی چھوٹی نہیں ہیں۔"

آخری جملہ اس نے کمال معصومیت سے ادا کیا تھا۔ نیلم اور شبنم مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔

"نہیں بھئی، جناب تو چھت کو چھوتی ہیں۔" شبنم نے اسے چھیڑا۔

"اور نہیں تو کیا۔ آپ سے لمبا قد ہو گیا ہے میرا۔" وہ خوشی سے بولی۔ "اور اگلے سال پورے اٹھارہ سال کی ہو جاؤں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے پھر اگلے سال سے ہم بھی تمہیں شریک گفتگو کر لیا کریں گے۔ شریک گفتگو ہونے کے لیے تمہاری عمر کم از کم اٹھارہ سال تو ہونی ہی چاہیے نا!"

شبنم کو اسے چھیڑنے میں لطف محسوس ہو رہا تھا۔

ریشم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ حقیقتاً خفا ہو گئی۔ نیلم نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر اسے خود سے لپٹا لیا۔

"اسے مت چھیڑا کرو شبنم۔ یہ بڑی نازک طبع ہے۔ دیکھو کیسا سرخ کر لیا ہے اس نے اپنا چہرہ۔"

اس نے ریشم کا چہرہ ذرا سا اونچا کیا۔

"بے وقوف ہے یہ تو۔" شبنم بھی اس کے قریب ہو گئی۔ "چلو ہم تمہیں رعایت دیتے ہوئے ایک سال کا انتظار موقوف کرتے ہیں اور آج سے شریک گفتگو کر لیتے ہیں۔ خوش؟" نیلم اور شبنم پھر ہنس دیں۔

"مذاق نہ اڑائیں میرا۔" وہ سخت خفا تھی۔ "مریم ہوتی تو ہم دونوں بھی مقابلہ کر سکتے تھے آپ دونوں کا۔"

"تو بھئی اس میں اتنا متاسف ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی آتی ہو گی مریم بھی۔" شبنم مسکرائی۔

"ہم بھی اپنی باتیں آپ دونوں سے چھپایا کریں گے۔ ہم بے وقوف نہیں ہیں جو ایک ایک بات آ کر بتائیں۔"

"اوہو! بس چندا ختم کرو۔ اتنا بھی کیا خفا ہونا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ شبنم مجھے یوسف کے حوالے سے چھیڑ رہی تھی۔ اسے بھی مجھ سے یہی شکایت ہے کہ میں اپنی کیفیات چھپائے رکھتی ہوں۔

اس پر ہی یہ کہہ رہی تھی کہ آپ خود سے تو کچھ نہیں بتاتیں ہم آپ کے جملے ہی پکڑیں گے۔"

نیلم نے اسے پوری بات سے آگاہ کیا۔

"تم بے وجہ مجھ پر شک مت کیا کرو۔" شبنم نے منہ بنایا۔ "یہ مجھے بھی کوئی خاص لفٹ نہیں کراتیں۔ میں ہی پیچھے پڑی رہتی ہوں ان

کے۔ بلکہ میں تو سوچ رہی ہوں تمہارے اور مریم کے گروپ میں شامل ہو جاؤں۔ وہاں پھر بھی کہنے اور سننے کے لیے کچھ تو ملے گا۔"

ریشم بے اختیار ہنس دی۔

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟" نیلم مسکرائی۔ "چند دن اور برداشت کرلو مجھے پھر تو یہی ہونا ہے۔"

"ویسے نیلی بجو! بہت بری بات ہے یہ۔ بہنوں کو آپس میں بہت کلوز ہونا چاہیے۔ اپنی ہر سوچ شیئر کرنی چاہیے!" ریشم نے اسے سمجھایا۔ "میں اور مریم بہترین دوست اور بہترین رازداں ہیں۔"

"انہوں نے تو عالباً ہر چیز کو یوسف بھائی کے لیے سینت سینت کر رکھا ہوا ہے۔" شبنم ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے پھر اپنی کڑھائی کی جانب متوجہ ہوگئی۔ "حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی۔"

"یا خدا۔ تم لوگ تو جان کھا جاتی ہو۔" نیلم بھنائی۔ "میرا یوسف سے کوئی ایسا لمبا چوڑا افیئر نہیں چلا جو بتانے کو میرے پاس رنگین و دلچسپ باتوں کا ایک ڈھیر ہو۔ وحیدہ چچی رشتہ لائیں، اماں نے ہاں کر دی اور بس میری بھی یوسف سے اتنی ہی اور وہی گفتگو ہوتی ہے جو تم لوگ ان سے کرتی ہو۔ نجانے کیا جاننا چاہتی ہو!"

"توبہ! کیسی سڑیل سی بہن ہے ہماری!" ریشم نے منہ بنایا۔ "میری منگنی کردیں تو میرے پاس تو رنگین دلچسپ باتوں کا ڈھیر تو کیا پورا پہاڑ ہو!"

"شرم کرو لڑکی۔" شبنم نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ "دو عدد بڑی بہنوں کی موجودگی میں اس قدر کھلی باتیں!"

"کیا ہے آپی انسان کو جذبات کے اظہار میں کھلا ہی ہونا چاہیے ورنہ نیلی بجو کی طرح راتوں کو بڑبڑاتا ہے نیند میں۔" وہ زور سے ہنسی۔ "اور پھر اب تو آپ دونوں مجھے گروپ میں شامل کر ہی چکی ہیں۔"

"کیا کہا؟" نیلم نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ "میں کیا نیند میں بڑبڑاتی ہوں؟"

"ریشم اور شبنم اس کے چونکنے پر محظوظ ہو کر ہنس دی تھیں۔

"بولو نا! کیا کہتی ہوں میں؟"

"کیوں پریشان ہو رہی ہیں بجو!" شبنم اطمینان سے بولی۔ "ایسی ویسی کوئی بات تو نیند میں بھی نہیں کرتیں۔ بس یونہی ادھر ادھر کی باتیں کر لیتی ہیں۔ کبھی خواب میں اماں سے یہ پوچھ لیتی ہیں آج کیا پکے گا یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ تم صبح اسکول جانا ہے اب سو جاؤ۔ ورنہ آنکھ نہیں کھلے گی۔"

ریشم ہنس ہنس کر بے حال ہوگئی۔

نیلم پریشانی سے منہ کھولے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"اب ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟" شبنم سوئی میں دھاگا ڈالنے لگی۔ "کہہ تو رہی ہوں یونہی عام سا روزمرہ کا کوئی ایک آدھ جملہ بڑبڑا دیتی

ہیں اور پھر کس کو اتنی فرصت ہے کہ وہ اپنی نیند خراب کر کے آپ کی بڑبڑاہٹوں پر دھیان دے۔"

"میں کبھی کبھار آیت الکرسی پڑھ کر دم کرنا بھول جاتی ہوں!" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "بس تب ہی ایسا ہوتا ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے!" اس نے کاندھے اچکائے۔ "اب میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں!"

"ہائے بجو جس دن آپ نے خواب میں یوسف بھائی سے باتیں کرنی ہوں نا۔ اس دن آیت الکرسی پڑھنا بھول جایئے گا۔ اور میں آپ کے برابر سو جاؤں گی۔ ٹھیک؟"

ریشم نے خوش ہو کر کہا تھا۔ نیلم نے اس کے گال پر ایک چپت رسید کی اور پھر تینوں بہنیں کھلکھلا کر ہنس دیں۔



وہ ہاسپٹل سے تھکے ہارے لوٹے تھے۔ نسرین کو مرکزی دروازے پر ہی بلیک کافی کا کہتے ہوئے وہ لاؤنج میں چلے آئے۔

"السلام علیکم!"

صوفے پر قریباً گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے اُنہوں نے کارپٹ پر دراز ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھی الماس کو سلام کیا۔

اس نے مڑ کر دیکھا اور ریموٹ سے ٹی وی کا والیم کم کیا۔

"آپ کب آئے؟"

"جب کوئی شخص سلام کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حال قریب میں ہی وارد ہوا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"کبھی تو کوئی آسان سی بات کر لیا کریں عثمان!" اس نے لانبی مخروطی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کی۔

"آپ ایسی باتوں کی عادت ڈال لیجیے نا!" وہ شگفتگی سے مسکرائے۔

(نجانے ایسی کیا بات ہے اس لڑکی کی نگاہ پڑتی ہے تو تھکے ہوئے دل و دماغ جیسے منور و معطر ہو اٹھتے ہیں۔)

"مجھے ایسی مشکل مشکل باتیں نہ کرنی آتی ہیں نہ سمجھنا آتی ہیں۔" وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر ان کے برابر آ بیٹھی۔

"چلیں۔ کوئی بات نہیں ہے۔ بعض لوگ خاموش بیٹھے ہوئے بھی اچھے لگتے ہیں۔"

"اتنے اشاروں میں باتیں مت کیا کریں۔ صاف صاف کہیں کہ میں خاموش بیٹھ کر بھی اچھی لگتی ہوں۔ یہ "کچھ لوگ" کیا ہوتا ہے؟"

"جو مزہ پس پردہ رہنے میں ہوتا ہے، وہ منہ در منہ بات میں کہاں الماس بی بی!"

"اُنہوں نے سانس بھری۔ "کبھی پردوں میں رہ کر دیکھیے۔ پردہ تو ہر شے کا حسن دوبالا کر دیتا ہے۔"

الماس کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"کیوں ہنسیں آپ؟" اُنہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"جہاں پردہ آ جائے وہاں حسن دکھائی ہی کب دے گا جو اس کو دوبالا ہونے کا موقع ملے۔" وہ بولی۔ "ایک چیز صاف طور پر نظر

آئے ،سنائی دے، سمجھ میں آئے تو بات بھی بنے!"

"چچ چچ چچ" عثمان نے تاسف سے سر ہلایا۔ "یعنی آپ واقف ہی نہیں ہیں کہ غالب کیا کہہ گئے ہیں۔"

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

پردہ تو وہاں ہوتا ہے جہاں آنکھوں پر پڑا ہو۔ عقل پر پڑا ہو، ورنہ تو کوئی پردہ نہیں!"

"ایک دیوان غالب مجھے بھی لا دیں۔" وہ جل کر بولی تھی۔ "کم از کم آپ کی گفتگو کا کوئی سرا تو میرے ہاتھ لگے گا۔ قسم سے کیمسٹری کی طرح سر سے گزر جاتی ہے!" عثمان بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

"پھر تو آپ کو بہت سی کتابیں دینی پڑ جائیں گی۔ دیوانِ غالب کے ساتھ شرح دیوان غالب اور پھر فرہنگ آصفیہ۔ آپ کی تعلیم تو کافی مہنگی پڑ جائے گی مجھے۔ کیوں؟"

"اور ایک طریقہ بھی ہے میرے پاس!" الماس بڑے اطمینان سے بولی۔ "آپ اپنا دیوان غالب کہیں چھپا دیں یا گم کر دیں۔ نہ آپ پڑھیں گے نہ مجھے پریشانی ہو گی!"

"یعنی ایسی لڑکی سے شادی کر لوں جو غالب کو نہ سمجھے؟" انہوں نے اسے چھیڑا۔ "مجھے تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

"بڑی بات تو یہ ہے کہ انسان کو جو کچھ کہنا ہو، اپنے ذاتی الفاظ میں کہے۔ غالب یا شیکسپیئر سے جملے اُدھار نہ لیتا ہو۔" الماس نے منہ بنایا۔

"ارے یہ اُدھار تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ اظہار ہوتا ہے عقیدت مندی کا۔ اس بات کا کہ جو بات کتنی ہمارے لیے مشکل تھی اسے ان لوگوں نے کتنا سہل کر دیا ہے۔"

"یا پھر یہ اظہار ہو سکتا ہے اپنی علمیت اور قابلیت کا۔" اس نے منہ بنایا۔ "سامنے والے شخص کو یہ جتانا کہ آپ کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔"

"ارے ارے۔ آپ شاید برا مان گئیں!" وہ دھیرے سے ہنس دیے۔

"ظاہر ہے!" اس نے جھٹکے سے بال پیچھے کیے۔ "آپ بار بار مجھے یہ احساس دلاتے ہیں کہ میں علم دوست نہیں ہوں، میرا مطالعہ وسیع نہیں ہے، میں غالب و اقبال سے بے خبر ہوں، ایسے میں تنگ آ کر میں برا ہی منا سکتی ہوں۔"

"بات محض یہ ہے الماس!" عثمان نے سنجیدگی سے کافی کا کپ واپس میز پر رکھا۔ "کہ انسان جس شخص کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہے، اس شخص کی زندگی میں اپنی پسند کی ہر شے کو شامل دیکھنا چاہتا ہے۔"

"یہ تو بے ایمانی ہے۔ ہر انسان کو اختیار حاصل ہے کہ جو چاہے اپنائے، جیسے چاہے رہے۔ اب اگر میں کتابیں پڑھنے سے الرجک ہوں تو آپ کی خاطر زبردستی پڑھنا شروع نہیں کر سکتی۔"

"نہیں، بخدا الماس! میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ میرے لیے خود پر جبر کر کے کچھ کریں۔ وہ ہولے سے مسکرائے۔" دراصل میں

نظریاتی بحث شروع کر دیتا ہوں، میری عادت سمجھ لیں۔ رویوں پر غور کرنا، پھر ان کا بغور تجزیہ کر کے کوئی رائے قائم کرنا میرے اپنے رویے کا ایک حصہ ہے۔ میں نے آج تک جتنے بھی دوست بنائے، ہم سب میں یہ قدر مشترک ہے۔ اب غیر شعوری طور پر میں آپ سے گفتگو کے دوران بھی یہ ساری باتیں شروع کر دیتا ہوں، آپ کے اور اپنے رویوں کا اور عادتوں کا تجزیہ کرنا شروع کر دیتا ہوں اور آپ سمجھتی ہیں کہ میں آپ پر طنز کر رہا ہوں یا آپ کی ذاتی پسند یا ذاتی رائے کی مخالفت کرتا ہوں ایسی کوئی بات نہیں ہے الماس!"

وہ اکتائے ہوئے سے انداز میں ان کی بات سن رہی تھی۔

"کیا ہوا؟۔"

"انہوں نے دل چسپی سے اس کے اکتائے ہوئے اثرات کو دیکھا۔

"شاید آپ بور ہو گئیں۔؟"

"کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے عثمان۔ میں اور آپ ایک دوسرے کے لیے انتہائی ناموزوں ہیں پھر میں کچھ ٹینس ہو جاتی ہوں!" وہ بے دلی سے کینوس دیکھتے ہوئے بولی۔

عثمان یکلخت سنجیدہ ہو گئے۔ واضح طور پر ان کا چہرہ بے رنگ ہوا تھا۔ انہوں نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے تھے لیکن اندر آتی ٹولی کو دیکھ کر دوبارہ بند کر لیے۔

"ہیلو ہیلو۔ یہاں تو بڑی محفل جمی ہوئی ہے بھئی۔" عدنان دھم سے الماس کے برابر آ بیٹھا۔ "ہم خواروں کی طرح باہر لان میں بیٹھے ہیں۔"

"اچھا۔ یعنی تم چار پانچ ساتھ بیٹھے خوار ہو رہے تھے۔ اور ہم دو نے محفل جما رکھی ہے؟" الماس نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

"آدمی آدمی کی بات ہے نا۔ اب میرے شاندار بھائی جان تو جہاں بیٹھ جائیں محفل وہیں جم جاتی ہے۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے۔

وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں

اور باہر بیٹھے تھے آپ کے بھائی صاحب محترم کاشف طاہر خان۔ آداب محفل سے قطعی نابلد، تعلیم و تربیت سے بے بہرہ۔"

کاشف نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے چھلانگ لگائی اور اس کی گردن دبوچ لی۔

"ہاں اب کہو کیا کہہ رہے تھے!"

"لیجئے۔ ثبوت دستیاب ہوا۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز نکالی۔

"کاشف چھوڑ دو اسے۔" الماس نے بھائی کو آنکھیں دکھائیں۔ "کیا بدتمیزی ہے یہ!"

"دیکھیں نا اسے۔ کیا کہہ رہا ہے مجھے!"

"جو تم ہو وہی کہہ رہا ہے۔" مہوش کسی بات پر عدنان کی سائیڈ لے لیتی، ممکن نہ تھا۔ لیکن اس وقت نجانے کس موڈ میں تھی۔

''اچھا بھئی۔ آپ لوگ انجوائے کریں!'' عثمان اچانک کھڑے ہوئے۔ ''میں کچھ دیر آرام کرلوں۔''

''ارے بھائی کہاں چلے!''

''عدنان، کاشف سے علیحدہ ہوا۔

''ہم لوگ تو مذاق کرتے ہی رہتے ہیں۔ آپ برا مان گئے کیا!''

''ارے بالکل نہیں بگ بوائے۔'' اُنہوں نے مسکرا کر اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ''اس عمر میں بھی سب کچھ چلتا رہے تو اچھا ہے۔ ورنہ آدمی مجھ جیسا ہو جاتا ہے۔ بورنگ!'' پھر وہ مڑے اور سیڑھیوں کی طرف چل دیے۔

''آج بھائی کچھ موڈ میں نہیں ہیں؟'' عدنان نے الماس کی جانب رخ کیا۔ ''کیا بات ہے؟''

''تمہارے بھائی ہیں، پوچھ لو جا کر!'' اس نے شانے اُچکائے۔

''جی ہاں، وہ بھائی ہیں تو آپ بھی تو بھابی ہیں۔ ہونے والی ہی سہی۔ آپ کو ان کی مزاج آشنائی کا دعویٰ تو ہونا چاہیے نا!''

''فی الحال تو مجھے ایسا دعویٰ نہیں ہے۔'' وہ مسکرائی۔

حیرت ہے!'' وہ بڑبڑایا۔

''ارے یار عدنان!'' کاشف نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ''وہ اصل بات جس کے لیے ہم یہاں آئے تھے، وہ تو بتاؤ الماس باجی کو۔''

''ارے ہاں یاد آیا۔ محترمہ الماس طاہر خان۔ میرے ایک دوست کی بہن کی منگنی ہے۔ اس نے بہت اصرار اور بڑی محبتوں سے انوائیٹ کیا ہے۔ رات کو غزلوں کا پروگرام ہے چلیں گی؟''

''میں کیا کروں گی چل کر؟'' اس نے منہ بنایا۔ ''میں وہاں کسے جانتی ہوں؟''

''محترمہ! صرف آپ کو نہیں جانا۔ میں، کاشف، عدنان، مہوش سب جا رہے ہیں۔ البتہ ممتاز باجی اور سیماب نے منع کر دیا ہے اور میرے دوست نے بہت اصرار کیا ہے کہ اپنی سسٹرز کو ضرور لے کر آنا۔ اور عثمان بھائی کی منگیتر کی حیثیت سے آپ کو لانے پر تو اس نے اصرار کی انتہا کر دی ہے۔ اب پلیز آپ انکار مت کیجیے!''

''لیکن!'' وہ زچ ہوئی۔

''باجی! شام غزل بھی ہے!'' کاشف نے لالچ دیا۔

''مجھے بڑا شوق ہے نا غزلیں سننے کا!'' اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''روتی پیٹتی موسیقی، بلکتے سسکتے اشعار صبا سے میرا جھگڑا اسی بات پر ہوتا ہے کہ وہ غزلیں سننے پر اصرار کرتی ہے اور میں اپنی پسند کی فریش کر دینے والی موسیقی سننا چاہتی ہوں۔''

''ارے آئیڈیا!'' عدنان نے چٹکی بجائی۔ ''صبا کو بھی لے چلتے ہیں۔ آپ کی کمپنی بھی ہو جائے گی اور میری سسٹرز میں بھی اضافہ ہو

جائے گا۔"

"اوہ یس!" الماس نے آنکھیں سکیڑ کر سوچا۔ "یہ ہو سکتا ہے۔ چلو ٹھیک ہے پھر۔ صبا کو فون کرتی ہوں۔ وہ مان گئی تو پروگرام پکا۔"

"مجھ سے بات کرا دیجیے۔" عدنان منمنایا۔ "میں کہوں گا تو وہ ضرور مان جائیں گی!" الماس نے اسے گھور کر دیکھا پھر سب کی ہنسی سن کر وہ خود بھی مسکرا دی۔



"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم ایسا کیوں کرتی ہو؟" ریشم نے زچ ہو کر پوچھا۔

"کیا مطلب کیوں کرتی ہوں۔ سبھی محبت میں یہی ایسا کرتے ہیں۔" درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر وہ بڑے اطمینان سے بولی تھی۔

"محبت؟ یہ اچھی محبت ہے، جو تمہیں کالج سے بھاگنے پر مجبور کرتی ہے، تمہیں پڑھنے سے روکتی ہے۔ کتنی لڑکیاں تمہیں اس کے ساتھ بائیک پر جاتے دیکھتی ہوں گی۔ تم بدنام ہو جاؤ گی غزالہ!"

"بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا!" وہ فخر سے مسکرائی۔

"اچھا۔ اب میرا وقت ضائع مت کرو۔ مجھے لائبریری جانا تھا۔ ضروری نوٹس تیار کرنے تھے اور تم مجھے یہاں لے آئی ہو یہ فضول قصے سنانے کے لیے۔" وہ اپنی کتابیں اٹھانے لگی۔

"یہ فضول قصے ہیں!" غزالہ بھنائی۔ "تم نے عمر کہاں گزاری ہے ریشم۔ اتنے مزے مزے کی باتیں تمہیں فضول لگتی ہیں۔ تم چلنا کسی دن میرے ساتھ، میں تمہیں ان سے ملواؤں گی۔ تم خود دیکھو گی کہ کتنی دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ ہنس ہنس کر میرے تو پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔"

"مجھے اپنے پیٹ میں بل نہیں ڈالنے۔" ریشم ہنسی۔ "یہ ایسا ہی ٹھیک ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

"کل ملتے ہیں پھر۔!" اس نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

"دیکھیں گے!"

"وہ آرام سے چلتی ہوئی لائبریری کی سمت بڑھنے لگی۔ مریم اپنی کسی دوست کے ساتھ پریکٹیکل کرنے میں مصروف تھی۔ شادی کی تیاریوں میں ہاتھ بٹانے کی وجہ سے وہ کچھ دن کالج آ نہیں پائی تھی، اسی لیے اسے دگنی محنت کرنی پڑتی تھی اور غزالہ موقع نکال کر ریشم کو پکڑ لیتی تھی۔

"ارے تم یہاں ہو۔!"

"اس نے مریم کو پہلے سے لائبریری میں پا کر حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں! اور تم تو مجھ سے نوٹس بنانے کا کہہ کر آئی تھیں۔" اس نے سرگوشی کی۔ "کہاں غائب ہو گئی تھیں؟ میں کب سے یہاں بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی ہوں!"

"مجھے غزالہ لے گئی تھی، پچھلے گراؤنڈ میں۔ اس کے قصے، کہانیاں تمام نہیں ہو پاتے۔ اس کی امی سے کہوں گی جلد از جلد شادی کر دیں اس

کی۔ کم از کم اس کا شوق تو پورا ہو۔ دل بھر کر گھوم پھر لے۔ اپنے ہیرو کے ساتھ۔"

اپنا بہت سا وقت ضائع ہونے پر وہ سخت بھنائی ہوئی تھی۔

"ایک تو یہ غزالہ مجھے زہر لگتی ہے۔" مریم بھی چڑ گئی۔ "کیوں ہر وقت چپکی رہتی ہے وہ تم سے؟"

"اللہ جانے۔" اس نے کاندھے اچکائے۔

"میں سوچ رہی ہوں، پہلے کینٹین چل کر کچھ کھا پی لیں۔ پھر آ کر پڑھتے ہیں۔ اس طرح خالی پیٹ تو پڑھنا بھی مشکل ہے۔"

"اچھا۔!" ریشم نے ایک لمحے کو سوچا۔ "چلو پھر اٹھو!"

"دونوں اُٹھ کر لائبریری سے نکل آئیں۔

"ریشم!" ساتھ چلتے ہوئے مریم نے اسے کسی گہری سوچ سے پکارا۔

"ہوں۔"

"یہ غزالہ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔ آخر یہ کیوں ایک اجنبی لڑکے کے ساتھ پارکوں، ہوٹلوں اور سینماؤں میں ملتی ہے۔ اگر وہ لڑکا یونہی شغل بازی کر رہا ہو تو؟"

"کیا خبر!" وہ آہستگی سے بولی۔ "کہتی ہے کہ وہ بھی سنجیدہ ہے اس معاملے میں جان چھڑکتا ہے اس پر!"

"جو لڑکے سنجیدہ ہوتے ہیں نا ریشم۔ انہیں لڑکی کی عزت اپنی عزت سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ اور کوئی اپنی عزت کو اس طرح سر بازار لے کر نہیں پھرتا۔ اس لڑکے کو اتنا احساس نہیں ہے کہ جب غزالہ اس کے ساتھ ہوتی ہے تو کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔ غزالہ کے ابو، کوئی بھائی، رشتہ دار وغیرہ پھر کیا حشر کریں گے وہ اس بے چاری کا گھر پہنچنے پر۔ وہ خود تو اپنے گھر جا کر مزے سے سو جائے گا۔"

"اتنی عقل ان دونوں میں ہوتی تو یہ حرکتیں ہی کیوں کرتے!" ریشم استہزائیہ ہنسی۔

"اور تمہاری عقل کہاں جاسوئی ہے؟ مزے سے لے کر اس کے قصے سنتی ہو کسی چکر میں نہ پھنس جاؤ اس لڑکی کی وجہ سے!"

"میں کس چکر میں پھنسوں گی بھلا؟ میں تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی ہوں۔ بس اس کا دل نہ ٹوٹے، اس خیال سے اس کی بکواس سن ضرور لیتی ہوں!"

"میرا تو مشورہ یہ ہے کہ سنا بھی مت کیا کرو۔ پتھر پر بوندیں گرتی رہیں تو اپنا نشان ضرور چھوڑتی ہیں۔ اور تم ہو بھی کچھ خر دماغ!"

"کیا؟" اس عزت افزائی پر اس نے بہن کو گھور کر دیکھا تھا۔ کیا کہا؟"

"کچھ نہیں!" وہ جلدی سے کینٹین میں گھس گئی "آؤ پکوڑے کھاتے ہیں!"



"جمنا پیاری!" اس نے بڑے دلار سے اسے پکارا تھا! "اگر تمہیں فرصت ہو تو میری قمیص میں ایک بٹن تو ٹانک دو۔!"

جمنا نے مسالا پیسنا موقوف کر کے اسے دیکھا۔

"روز روز بٹن توڑ کر لے آتے ہو۔ بھایا! کس سے کشتی لڑتے ہو؟ ہماری انگلیوں میں تو سوراخ ہو گئے ہیں!"

"دیکھوں ذرا!" اس نے جمنا کا ہاتھ پکڑ کر بغور معائنہ کیا۔ "ارے جمنا بائی! یہ سوراخ نہیں ہیں، انھیں درازیں کہتے ہیں اور سب کی انگلیوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ ایک انگلی، پھر ایک دراز۔ پھر ایک انگلی پر دراز۔ پھر ایک انگلی!"

جمنا نے بھنا کر اپنا ہاتھ چھڑایا تھا۔

"لو۔ یقین ہی نہیں آتا تمہیں تو ہماری باتوں پر..... چلو شام کو کسی انگلیوں کے ڈاکٹر کے پاس چل کر سوراخوں کی دوا لے آئیں گے۔ بس خوش؟"

"ہاں خوش۔" وہ پھر مسالا پیسنے لگی۔ "تم بھی خوش رہو اور ہمارے منہ نہ لگو۔"

"ہائے۔ یہ طرز تغافل، یہ ادائے بے نیازی۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "ہمارا بھی اس دنیا میں کوئی پوچھنے والا ہوتا تو ہم کیوں تمہارا یہ گندم گوں مکھڑا دیکھتے، ٹھیک ہے جمنا بھائی! ہم بھی یونیورسٹی کو خیر باد کہہ کر کسی نزدیکی سلائی کڑھائی کے سینٹر میں داخلہ لے لیتے ہیں، تمہارے احسانوں سے تو بچے رہیں گے۔"

"ہم مسالا پیس کر ہی ٹانکیں گے بٹن۔ اب آگے سے جو مرضی بولتے رہو!"

"ہم کھانا پکانے کا کوئی اچھا سا کورس بھی کر لیں گے۔" وہ مزید پر جوش ہوا۔ "تاکہ مسالا پیسنے کی زحمت سے بھی بچی رہو۔ پھر ٹھاٹ سے چارپائیاں توڑنا۔ ہم پورا گھر سنبھال لیں گے۔ امی حضور غالباً یہی چاہتی ہیں کہ ان کے تجاہل عارفانہ سے عاجز آ کر کوئی لڑکا خود آگے بڑھے اور بہو کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ امی حضور کسی بھی ممکنہ زحمت سے بچی رہیں اور گھر میں ساس، بہو کا جھگڑا ہو نہ فتنہ فساد!"

"ہم بتائیں گے باجی کو۔" جمنا نے دھمکی دی۔

"تم باجی کو بتا دو یا اپنی چاچی کو۔ ہم ڈرنے والوں میں سے نہیں ہیں۔" اس نے ہاتھ ہلایا۔

"آخر کار یہی ہونا تھا۔ کسی نہ کسی کو تو احتجاج میں پہل کرنی ہی تھی نا۔ تم دونوں خواتین کے خطرناک عزائم کی بو مجھ جیسا جہاں دیدہ وجہاں بیں ہی سونگھ سکتا ہے۔ تم دونوں اس گھر پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے شوق میں ہم تین لڑکوں کو کنوارا پنے کی موت مار رہی ہو۔ لیکن کان کھول کر سن لو جمنا بائی۔ بہروز فیروز تمہاری محلاتی سازشوں کا شکار ہو سکتے ہیں لیکن شہروز احمد! ہا، ہا، ہا ہرگز نہیں۔ ہم اپنی سیاسی بصیرت سے ان فتنہ پردازیوں کا خاتمہ کر کے کورٹ میرج کر لیں گے۔ کیا سمجھیں؟ ہائیں یہ کون ہے۔؟"

"اپنا دایاں کان کسی کی گرفت میں پا کر وہ مڑا۔

"ام۔ امی حضور! یعنی شہنشاہ اکبر۔ اور شہزادہ سلیم انارکلی کے ہمراہ باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے دھر لیے گئے۔ لیکن امی حضور، دیکھیے،

انار کلی تو مسالا پیس رہی ہے۔ارے امی، میرا کان ہائے اللہ!" وہ درد سے چیخا۔"

"کیا بکواس ہو رہی تھی؟" وہ اپنی مسکراہٹ آخرکار ضبط نہ کرسکیں۔

"بکواس۔یعنی کروا وخائی۔اچھا کان تو چھوڑیں۔پلیز امی!"

وہ اپنا کان چھڑا کر سہلانے لگا۔

"سارا قصور جمنا کا ہے۔"

"لو۔اب ہم پر تہمت ڈال دو۔" وہ بھنائی۔

تو اور کیا۔نہ تم بتن ٹانکنے سے انکار کرتیں نہ ہمیں فلفل درازیوں کا موقع ملتا!"

"کس کا؟" وہ تعجب سے بولی۔

عفت خانم کو ہنسی آ گئی۔

"توبہ ہے شہروز۔تمہاری زبان کون سے مربے کھاتی ہے۔مجال ہے جو ذرا کمزوری محسوس کرے۔فضول ہانکے چلے جاتے ہو۔"

"واہ واہ۔امی حضور! یہ انصاف نہیں ہے۔ہم ہرگز فضول ہانکنے والوں میں سے نہیں ہیں۔بلکہ اس سلسلے میں تو ہم میر کے معتقد ہیں۔وہ کیا فرماتے ہیں۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا

مستند ہے میرا فرمایا ہوا!!

ان کی طرح ہمارا ہر سخن بھی اک مقام سے ہوتا ہے!

وہ جا کر مزے سے جھولے میں لیٹ گیا

"اچھا۔گویا وہ کورٹ میرج والی بات مستند سمجھوں!" اس کے پاس آتے ہوئے انہوں نے آنکھیں نکالیں۔

"کورٹ میرج؟" وہ سیدھا ہوا؟" ہم نے تو کوڑی پیراج کا ذکر کیا تھا امی حضور! آپ کورٹ میرج سمجھیں؟ ہائے! بڑی سیدھی ہے میری ماں!"

"اچھا! اور کون سے پیراجوں کا ذکر کر رہے تھے اب بتا دو اپنی سیدھی ماں کو۔بیٹا جی۔ماں اتنی بھی سیدھی نہیں ہے!" وہ ہنسی تھیں۔

وہ کھسیانا ہو کر سر کھجانے لگا۔

ہم تو۔ہم تو۔یونہی مسخرہ پن کر رہے تھے۔آپ جانتی ہیں ناشہزادوں کے چونچلے۔کوئی مسخرہ دستیاب نہ ہو تو خود ہی مسخرہ بن جاتے ہیں۔!"

"اچھا لاؤ قمیص دو۔کہاں سے بٹن توڑ لائے ہو۔!"

''وہ پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''بائیں۔بجن نہ ہوئے کچی کیریاں ہوگئیں جو ہم پڑوس میں خان صاحب کے ہاں سے چپکے سے توڑ لائیں گے۔ہم تو بجن کہیں گرا آئے ہیں!''اس نے اُٹھ کر قمیص ماں کو تھمائی۔

''اپنی بیوی کے کانوں کے لیے کوئی ایسی اچھی سی چیز بنوالو۔جس سے وہ جب چاہے اپنے کان بند کر سکے۔''انہوں نے مشورہ دیا

''ہم نے دو ڈھیاں سنبھال رکھی ہیں۔''وہ سنجیدگی سے بولا۔''ایک اس کان میں لگا دیں گے ایک اُس کان میں۔''

عفت خانم زور سے ہنس دیں۔

''اس کو بھی بتا دیا ہے۔اپنی منصوبہ بندی کے بارے میں؟''

''کس کو؟''اس نے تعجب سے ماں کی شکل دیکھی۔

''ہونے والی بیوی کو۔اور کس کو!''وہ بے نیازی سے بجن ٹانکنے لگیں۔

''مت نوچیں اس دل کے زخموں کو امی حضور!''اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔''کسی کو اس کی محرومیوں کا احساس دلانا کوئی اچھی بات نہیں۔!''

''مت بناؤ ماں کو!''اُنہوں نے گھورا۔

''بنی بنائی مل گئی ہے،شکر ہے اس اللہ کا!''وہ اطمینان سے پھر لیٹ گیا۔''ہم اپنا اسٹیمنا کیوں ضائع کریں۔اب یا تو ہم بھابیاں بنائیں گے یا۔!

جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ شرمایا۔

''اب آگے اپنے منہ سے کیا کہیں!''

''عفت خانم بے اختیار ہنس دیں۔

''کتنا شوق ہے اس لڑکے کو۔بس چلے تو آج برات لے جائے اپنی!''

''لیجیے!''وہ طنز سے بولا۔''یعنی یہ الزام بھی مجھ غریب کے سر پر۔ارے امی حضور!میں اپنی برات لے جانے کے چکروں میں نہیں رہتا۔''

''ہاں تمہارا تو کورٹ میرج کرنے کا خیال ہے نا!''انہوں نے بیٹے کی بات کاٹی۔

''لاحول ولا۔ارے امی جان!آپ سنجیدہ ہو گئیں۔''وہ کچھ گھبرا سا گیا۔''یقین کریں میں مذاق کر رہا تھا۔بس وہ جمنا سے ذرا چھیڑ چھاڑ چل رہی تھی۔''

''اب کیوں سٹی گم ہوگئی؟''انہوں نے مسکرا کر بیٹے کو دیکھا۔''ویسے میرے بچے اتم جہاں اشارا کرو گے،تمہاری ماں سر کے بل جائے گی،تمہیں ایسی کسی حرکت کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔''

"ہائے!" اس نے حسب عادت آہ بھری۔ "کب سے تو اشارے پر اشارے دیے جا رہا ہوں۔ لال بتی، ہری بتی، پیلی بتی، ہر بتی جلا بجھا کر دیکھ لی۔ پر جسے سمجھنا ہے، وہ سمجھتے ہی نہیں۔۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے۔

اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک

اک عرض تمنا ہے، سو ہم کرتے رہیں گے

"کسے کیا سمجھانا ہے مجھ سے کہو!" انہوں نے پرخلوص آفر کی۔ "میں پیغام پہنچادوں گی تمہاری ماں اتنی بھی نکمی نہیں ہے۔ بیٹا جتنی تم سمجھتے ہو۔"

"ارے اپنی پیاری سی ماں سے تو ہمیں بہت سے کام نکلوانے ہیں ابھی۔" وہ لاڈ سے ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گیا۔ "پر جتنا کچھ ہمیں کرنا ہے سو وہ ہمیں ہی کرنا ہے!" عفت خانم نے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"بہت بڑا ہو گیا ہے میرا بیٹا! مجھے تو خبر تک نہیں ہوئی!"

"اتنا بڑا نہیں ہوا کہ بتن خود ٹانک سکوں۔" وہ قدرے جھینپ گیا۔

"خیر!" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اتنا بڑا تو کوئی مرد بھی نہیں ہو پاتا۔"

"امی جی!" اس نے موقع دیکھ کر بات کا آغاز کرنا چاہا۔

"جی بیٹا جی! کہیے!"

"بہروز بھائی جان کے لیے کوئی لڑکی اب تک نہیں دیکھی آپ نے؟"

"تمہاری رشتے کی بہنیں رہتی ہیں لاہور میں۔ شاید تم نے کبھی کسی شادی وغیرہ میں دیکھا ہو۔ نبیلہ اور عقیلہ، سوچتی ہوں خود جاؤں ملنے یا انہیں بلوالوں۔ بہروز اور فیروز دونوں کی ساتھ کرنا چاہتی ہوں میں۔۔!"

"ہرگز نہیں" اس نے منہ بنایا۔ "اس گھر میں دو بہنیں ہرگز نہیں آسکتیں۔"

"وہ کیوں!" انہوں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"بس! کہہ جو دیا۔" وہ زچ ہوا۔

"پھر بھی۔ کوئی معقول وجہ بھی ہو!"

"بے حد معقول وجہ ہے میرے پاس!"

"وہ کیا!" وہ اس کی جانب پوری طرح متوجہ ہوئی تھیں۔

"دیکھیے نا! وہ دونوں بہنیں تو ایک طرف ہو جایا کریں گی اور "میری والی" اکیلی رہ جائے گی۔ بھئی گھروں میں دیورانی جیٹھانیوں کے جھگڑے تو ہوا ہی کریں گے نا" اس نے بات ختم کر کے آنکھیں پٹپٹائیں۔

''افوہ۔تو گویا ابھی سے ''اپنی والی'' کی اتنی فکر ہے!'' وہ مسکرائیں۔

''آخر اس کا خیال بعد میں بھی میں نے ہی کرنا ہے۔ابھی سے کرلوں تو کیا حرج ہے۔بس امی حضور کہہ دیا ہم نے وہ بہنیں تو اس گھر میں آئیں گی ہی نہیں۔''

''اچھا بابا۔تم لڑکیاں دیکھ تو لینے دو۔کون سا میں فوراً ہی ہار پھول ڈال کر لے آؤں گی۔رہی تمہاری والی کی بات تو آخر میں بھی تو اسی گھر میں رہوں گی، میں اس کی ہم نوا بن جایا کروں گی۔پھر جمنا تو اپنی ہے ہی اپنی۔ہمارا پلڑا تو سب سے بھاری ہوگا!''

''جمنا؟ ارے امی حضور جمنا تو جس بیڑے میں ہو، وہ بیچ دریا میں ڈوبے گا۔پار لگنا تو دور کنار۔جمنا کو تو میں ہرگز اپنے گروپ میں شامل نہیں کروں گا۔سوچیے ذرا۔ابھی سے اس نے میرے بٹن ٹانکنے چھوڑ دیے ہیں، بعد میں کیا کرے گی۔''

''ہاں کرو ہماری برائیاں۔'' وہ پیچھے ہی کھڑی تھی۔''یہی صلہ ہے ناہماری ریاضتوں کا۔اپنا بچہ جان کر پالتے ہیں اس پر بھی شکایتیں۔''

''ارے۔جمنا پیاری!'' اس نے پورے دانت نکال دیے۔''تم کب آئیں۔بس یہی خرابی ہے اس زبان میں، اس کی دو آنکھیں نہیں ہیں۔نہ دائیں دیکھتی ہے نہ بائیں، بس چل نکلتی ہے۔خیر تم دل چھوٹا نہ کرو۔آیندہ تم اس زبان سے اپنے خلاف ایک لفظ نہیں سنو گی انشاءاللہ آیندہ میں خوب دیکھ بھال کر تمہاری برائی کروں گا۔''

جمنا، جھلا کر وہاں سے چلی گئی جب کہ عفت خانم نے گھورنے کا آغاز کر دیا تھا۔وہ زبان دانتوں میں دبا کر چپکا ہو رہا۔



وہ بیٹھی انعم کو پڑھا رہی تھی جب زلفی اور وقار بھائی آئے۔

''السلام وعلیکم۔'' انہوں نے آتے ہی حسب عادت سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام۔!'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کھانا نکالوں بھائی!''

''ہاں۔ذرا ہاتھ منہ دھولیں پھر کھانا بھی کھاتے ہیں!'' وہ انعم کو گود میں لے کر بیٹھ گئے۔

''اور کتنا پڑھ لیا ہماری گڑیا نے؟''

''بہت ضدی لڑکی ہے، مجال ہے جو اپنی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی پڑھ جائے!'' اس نے پیار بھری شکایت کی۔

''دیکھو گڑیا! نیلی پھو سے جتنا پڑھنا ہے نا بس ابھی پڑھ لو۔پھر یہ تمہیں دستیاب نہیں ہو سکیں گی۔''

وہ انعم سے مخاطب تھے۔نیلم مسکرا دی۔

''پھو کہاں چلی جائیں گی؟ یوسف بھائی کے گھر؟'' اس نے پنسل رکھ کر سوال کیا۔

''اچھا! گویا محترمہ کو خبر سب ہے!'' وقار بھائی قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔''ہم بے وجہ چھوٹی سی گڑیا سمجھ کر بہلا رہے تھے۔''

نیلم اور زلفی بھی ہنس دیے۔

"اور تیاری مکمل ہے ناں!" اقتم کو اس کی جگہ واپس بٹھاتے ہوئے وہ نیلم سے مخاطب تھے۔

"جی بھائی۔!"

"اور کچھ چاہیے ہو، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، بغیر کسی جھجک یا شرم کے کہہ دینا میں نہیں چاہتا میری بہنوں کو بعد میں کوئی پریشانی ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بھائی! مجھے تو اُلٹا یہ شرمندگی رہتی ہے کہ میں بہت کچھ لے جا رہی ہوں۔ باقی بہنوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔"

"ارے تم فکر مت کرو۔ میں اتنے سالوں سے جو کچھ کر رہا ہوں وہ سب تم لوگوں کے لیے ہی تو ہے۔ تم سب اپنے گھروں میں خوش اور مطمئن رہو۔ اسی لیے تو اتنی محنت کرتا ہوں میں۔"

"پھر بھی بھائی! وحیدہ چچی نے بہت جلدی کی۔ شبنم کا کوئی اچھا رشتہ مل جاتا تو ایک ساتھ آپ دونوں کے فرائض سے عہدہ برآ ہو جاتے۔"

"سب کا اپنا اپنا نصیب ہے گڑیا! تم کیوں فکر کرتی ہو۔ جب تک میں زندہ ہوں تم میں سے کسی کو بھی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"خدا آپ کو لمبی زندگی دے۔ اور بہت سی خوشیاں!" اس کی آنکھیں حقیقتاً لبریز ہو گئیں۔

"اچھا چلو کھانا نکال دو۔ میں جب تک منہ دھولوں!"

"وہ اُٹھ کر باورچی خانے میں آ گئی۔ اپنے بھائی کی انتھک محنت اور قربانیوں کا اثر اس کے دل پر بہت گہرا نقش تھا۔ وہ جب بھی سوچتی تھی، دیر تک ان کی عظمت کا اعتراف کرتی رہتی۔ وہ اگر کسی بھی موقع پر ہمت ہار دیتے یا ذرا سی خود غرضی کا مظاہرہ کرتے تو ان کے خاندان کا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا لیکن جس ہمت اور جس سلیقے سے وہ اس گاڑی کو چلا رہے تھے، وہی جانتے تھے۔

"کیا کر رہی ہیں بجو!" شبنم بھی وہیں آ گئی۔

"کھانا نکال رہی ہوں، بھائی اور زلفی آ گئے ہیں نا!"

"لائیں، میں نکالتی ہوں۔ آپ اب آرام کریں۔ جانتی ہیں نا اگلے ہفتے مایوں بیٹھنا ہے آپ نے۔"

"اگلے ہفتے بیٹھنا ہے نا!" وہ مسکرائی۔ "ابھی تو مہندی نہیں لگ گئی میرے ہاتھوں میں۔"

"آپ کو شوق ہے تو ہم ابھی لگا دیتے ہیں۔" وہ شریر ہوئی۔

"بکومت!" وہ جھینپ کر باہر نکل گئی تھی۔



لپ اسٹک کا فائنل ٹچ ہونٹوں پر دینے کے بعد اس نے اپنا جائزہ کافی تنقیدی نگاہ سے لیا۔

"میرا خیال ہے کہ میں کالے کپڑوں میں اچھی لگتی ہوں۔ کیوں الماس؟" اس نے آئینے ہی میں الماس کے عکس کو کھوجنا چاہا لیکن ناکام رہی۔

''الماس۔'' پھر اس نے مڑ کر آواز دی۔ ''کہاں ہو؟''

''کہاں ہو سکتی ہوں!'' ٹھنڈی سانس بھر کر وہ ٹیرس سے لوٹی تھیں۔ صبا ہنس دی۔

''دیکھنا چاہتی ہوں اس در نایاب کو۔'' وہ اس کے ہنسنے سے جھنجلا کر بولی۔

''اتنے کوئی خاص نہیں ہیں۔ تمہارے عثمان خان کی پرسنالٹی زیادہ اچھی ہے!'' وہ مسکرائی تھی۔

''خیر۔ وہ تو ہے لیکن پھر بھی حضرت کا کچھ اتا پتا تو ہو۔ تمہاری چوائس قابل داد ہے یا ایویں سی ہے ہم بھی کچھ کہہ سکیں!''

''نہیں، مایوسی تو خیر تمہیں نہیں ہوگی۔'' وہ مسکرائی۔ ''لیکن ہو سکتا ہے تم مجھے ادا بھی نہ دو!''

''داد تو فی الوقت میں تمہیں دے رہی ہوں!'' الماس اسے بغور دیکھنے لگی۔ ''کالے کپڑوں اور براؤن میک اپ نے تمہارے حسن کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ یو آر لکنگ پریٹی۔''

''تھینک یو!'' وہ مسکرائی۔ ''اب چلیں؟''

''عدنان کا بچہ گاڑی لائے گا تو چلیں گے نا!'' وہ زچ ہو کر بولی۔ ''آٹھ بجے تیار رہنے کا حکم صادر فرما کر گئے تھے حضرت اور اب ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں ان کا کچھ پتا نہیں۔''

''الماس! یہ بغیر دعوت کے جانا مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔'' صبا سوچ کر بولی۔

''اچھا اب خاموش رہو۔ کوئی دسویں بار یہ بات کہہ رہی ہو تم۔ کہا تو ہے عدنان کے دوست نے بڑے اصرار سے بلایا ہے ساری بہنوں کو۔ سیماب اور مہناز تو جا نہیں رہی ہیں ان کی جگہ تم ہو۔ کیا فرق پڑتا ہے!''

اس نے پھر نازک کلائی پر بندھی نازک سی رسٹ واچ دیکھی۔

''نیچے گاڑی کا ہارن بجا تو دونوں چونک اٹھیں۔

''میرا خیال ہے عدنان آ گیا ہے!'' صبا بولی۔

''خیال نہیں مجھے یقین ہے، کیونکہ وہ ہماری گاڑی کا ہارن ہے۔ چلو اٹھو!'' دونوں اٹھ کر نیچے چل دیں۔ نجمہ بیگم کو بتا کر دونوں باہر آ گئیں۔

''کہاں تھے محترم؟'' الماس حسب توقع عدنان سے الجھ پڑی تھی۔ ''کتنی مرتبہ کہا ہے بالکل ٹھیک ٹائم بتا کر جایا کرو۔''

''مجھے یقین تھا۔ بٹلر صاحبہ جھگڑنے کو تیار بیٹھی ہوں گی۔ ارے ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔ اسی میں دیر ہو گئی۔ اب بیٹھیں جلدی کریں۔''

صبا ان باتوں سے بے نیاز برابر والے گیٹ کی جانب جی جان سے متوجہ تھی جہاں ابھی ابھی فیروز احمد کی بائیک آ کر رکی تھی۔

''اس نے بھی نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور ایک نظر نے اسے کتنا مطمئن، کتنا تازہ کر دیا تھا۔ وہی جانتی تھی۔

''چلو صبا! بیٹھو!''

الماس نے اس کے لیے دروازہ کھولا تھا پھر اسے کہیں اور پا کر خود بھی وہاں دیکھا۔

''اوہ!'' آہستگی سے وہ اس کے قریب ہوگئی۔ ''حسرت؟''

''ہوں۔'' اس نے ہولے سے ہنکارا بھرا۔

''پاس!'' الماس نے فوراً قرارداد منظور کرلی تھی۔

صبا ہولے سے ہنس کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ دل ہلکا ہوکر فضاؤں میں پرواز کرنے لگا تھا۔

پیار کرنے والوں کو ایک نگاہ کافی ہے

اس کے قناعت پسند دل کی تمنائیں اتنی محدود تھیں کہ اسے ایک نگاہ ہی بہت لگتی تھی۔ اس نگاہ سے آگے جاکر وہ بہت کم سوچتی تھی، شاید اس لیے کہ یہ نگاہ بھی کبھی کبھار قسمت سے ملتی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' الماس نے اسے مخاطب کیا تھا۔

وہ چونکی تو اپنے اردگرد رنگ و بو کا ایک طوفان پایا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے سر جھٹکا۔ ''کتنے لوگ ہیں نا اس تقریب میں!''

''اور تم اس تقریب سے باہر کہیں موجود ہو۔'' الماس مسکرائی۔ ''ہے نا؟''

''وہ مجھے دیکھ رہے تھے ناں الماس!''

اس کے لہجے پر، الماس بے اختیار ہنس دی۔

''تم۔ تم بہت جذباتی ہو صبا۔ اتنی جذباتیت اچھی نہیں ہوتی۔''

بغیر جذبوں کے دل ایسا ہوتا ہے جیسے بغیر پانی کے کنواں۔ سوکھا اور خشک جذبوں کی بھاری پکھا اور ہوتی ہے۔''

''پھر بھی۔ یہ جذبوں کا پانی دل کو اگر سیراب رکھتا ہے تو سراب بھی بہت دکھاتا ہے۔ انسان حقیقت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ حقیقت پسند بنو صبا۔ جس کی ایک نگاہ تم پر سحر پھونک دیتی ہے۔ اس کے الفاظ میں تمہارے لیے کیسا طلسم ہوگا، میں محسوس کرسکتی ہوں۔ پلیز! خود کو کنٹرول کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں نقصان اٹھانا پڑ جائے۔''

''میں ایک بار پہلے بھی کہہ چکی ہوں الماس۔ محبت اور کاروبار میں بہت فرق ہوتا ہے!''

''بہر حال۔ فیصلہ تم نے ہی کرنا ہے۔'' الماس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''میں ہر شخص کو یہ حق اور یہ اختیار دیتی ہوں۔''

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرادیں۔

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں

جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

آواز تھی کہ جادو تھا! دونوں چونک کر اسٹیج کی جانب متوجہ ہوئی تھیں۔

"کون ہے یہ!" الماس نے گہرے اشتیاق سے پوچھا۔

"پتا نہیں کون ہے البتہ آواز جادو ہے۔" صبا بھی دلچسپی سے مغنی کو دیکھ رہی تھی۔

ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن

مری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں!

وہ بڑے جذب، بڑی لگن سے گا رہا تھا۔ آواز میں بہت لوچ، بے حد گہرائیاں تھیں، لہجے میں گمبھیرتا وجود میں اُترتی محسوس ہو رہی تھی۔

غزل ختم کر کے اس نے سامعین کو جیسے کسی طلسم سے آزاد کیا تھا۔ تالیاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ صبا نے تالیاں بجاتے بجاتے رُک کر الماس کو دیکھا۔ دائیں ہتھیلی ٹھوڑی کے نیچے جمائے وہ بڑی محویت سے اسٹیج کو تک رہی تھی۔

"اے!" صبا نے اسے کہنی ماری۔ "کیا بدذوقی ہے یہ۔ کم سے کم اسے خراج عقیدت تو پیش کردو۔"

الماس نے مسکرا کر تالی بجادی۔

اس نے دوسری غزل شروع کر دی تھی۔ مجمع پر ایک بار پھر سکوت چھا گیا تھا۔

اجاڑ دے میرے دل کی دنیا، سکوں کو میرے تباہ کردے

مگر مری التجا ہے تجھ سے ادھر بھی اپنی نگاہ کردے!"

صبا نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں بند کیں اور دوسرے ہی لمحے وہ کسی اور جہان میں پہنچ گئی۔

اس نے بائیک روکی تھی، پھر وہ نیچے اُترا تھا اور ایک ثانیے کے لیے اس نے صبا کو دیکھا تھا۔ وہ لمحہ بھر کی جھلک، وہ ایک پل کی خوشی، دل نے کس طرح سے سنبھال کر محفوظ کرلی تھی۔ وہ آپ ہی آپ مسکرا دی۔

تالیوں کی گونج سے وہ گھبرا کر حال میں لوٹی تھی۔ آنکھیں کھول کر اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ الماس وہاں نہیں تھی۔

"الماس۔۔!" اس نے آواز دی۔

وہاں اتنے لوگ اور اتنی آوازیں تھیں کہ اسے اُلجھن ہونے لگی۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر وہ الماس کی تلاش میں آگے بڑھ گئی۔

رائل بلیو، چمکتے کام والے کپڑوں میں ملبوس الماس اسے دور سے ہی نظر آ گئی۔ اسٹیج کے دائیں جانب کھڑی وہ کسی سے محوِ گفتگو تھی۔

صبا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس تک پہنچی۔

"میں بہت کم کسی سے متاثر ہوتی ہوں۔" الماس کہہ رہی تھی۔ "لیکن آپ کی آواز روح کے اندر تک اُتر جاتی ہے۔"

"صرف آواز نا!" وہ ہنسا تھا۔ "شاید کبھی آپ نے غور سے آئینہ نہیں دیکھا۔ ورنہ آپ کو خبر ہوتی کہ روح میں اُترنے والے چہرے بھی ہوتے ہیں۔"

الماس مدھم سروں میں ہنسی تھی۔

''الماس۔!'' صبا نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔''میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں اور تم یہاں چلی آئیں۔ مجھے بغیر بتائے۔''

''ارے صبا۔'' وہ چہکی۔''ان سے ملو۔ یہ رضا مراد ہیں۔ ابھی کی آواز پر تم آنکھیں بند کیے مراقبہ کی سی کیفیت سے دوچار تھیں۔ اور رضا! یہ میری بہت اچھی دوست ہے صبا!''

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔!'' وہ مسکرایا۔

بلاشبہ اس کا چہرہ بھی پرکشش تھا اور شخصیت بھی۔

صبا بھی رسماً مسکرائی، اور الماس کی جانب متوجہ ہوگئی۔

''چلیں؟''

''آں! اچھا تم چل کر عدنان کو ڈھونڈو۔ میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔''

صبا نے ٹھنڈی سانس بھری اور پلٹ کر عدنان کی تلاش میں آگے بڑھ گئی۔

''عجیب لڑکی ہے یہ بھی۔'' وہ بڑبڑا رہی تھی۔



''امی حضور۔ ہم سخت بور ہو جائیں گے؟''

وہ دو گھنٹے سے برے برے منہ بنا رہا تھا۔

''کیوں بھئی۔ صبا ہے نا۔ وہ تمہیں بور نہیں ہونے دے گی!'' وہ مسکراتے ہوئے چادر لپیٹنے لگیں۔''اور پھر تمہاری اس دن رات کی بوریت کا علاج ہی ڈھونڈنے جا رہی ہوں میں۔''

''صبا! صبا کیا آپ کی جگہ لے سکتی ہیں؟'' وہ بھنایا۔''وہ میری کیلی ہیں اور آپ میری امی ہیں۔ اب میں ان کی گود میں اپنا سر رکھ کر تو نہیں لیٹ سکتا نا؟ وہ میرے بالوں کے بکھرنے پر انہیں انگلیوں سے تو نہیں سنواریں گی نا!''

''عفت خانم زیرلب مسکرانے لگیں۔

''کیسا بے ڈھنگا لڑکا ہے۔ مجال ہے جو ذرا سوچ سمجھ کر بولے۔''

''کیا سوچوں؟ بالکل سچ کی بات کی ہے میں نے۔'' وہ چڑا۔''بہروز بھائی جان کے لیے لڑکی یہاں بھی دستیاب ہو سکتی ہے۔ لاہور جانا ضروری ہے؟''

''بیٹا! جو بات رشتے داروں اور عزیزوں کی ہوتی ہے وہ غیروں میں کہاں ہے۔ اب اپنی لڑکیاں اس گھر میں آئیں گی تو مجھے بھی فکر نہیں ہوگی۔ خاندان سے بڑا فرق پڑتا ہے۔''

"دیکھیے امی اگر آپ فیروز بھائی کی بات وہیں طے کر آئیں تو میں شادی کا بائیکاٹ کروں گا۔ یہ وارننگ ہے میری جانب سے۔"

"عجیب لڑکا ہے!" وہ بھنائیں۔ "شہروز! بیٹا آخر بات کیا ہے۔ کیوں نہ کر کے آؤں میں اس کا رشتہ؟ اس سے تمہیں کچھ بیر ہے کیا؟"

وہ زچ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر سیڑھیوں سے اُترتے فیروز کو دیکھ کر اس کی جیسے مشکل آسان ہوئی۔

"دراصل فیروز بھائی کی پسند کا جو معیار ہے نا امی حضور، وہ قدرے بلند ہے!"

"اس نے فیروز کو سنانے کے لیے بلند آواز میں کہا۔" وہ بھائی جان کی طرح نہیں ہیں جنہیں لڑکی دکھائے بغیر بھی دولہا بنانا شروع کر دیا جائے تو وہ الحمدللہ کہہ کر سہرابندی کی رسم کروالیں گے اور اس کا حسب نسب تک جانے بغیر تین مرتبہ دل سے ہاں کہہ دیں گے۔ وہ فیروز بھائی ہیں، جو عین قاضی صاحب کے منہ پر تین مرتبہ "نہیں" کہہ کر رعب سے اُٹھ کر چل دیں گے۔"

کن انکھیوں سے اس نے دیکھا تھا کہ فیروز چند لمحوں کے لیے وہیں سیڑھیوں پر رک گیا تھا۔

"ارے تو میں کون سی زور زبردستی کر رہی ہوں کسی کے ساتھ۔" عفت خانم کا موڈ ذرا سا آف ہو گیا۔ تصویر لے آؤں گی حضرت کو دکھانے کے لیے انکار کر دیا تو چپ چاپ واپس بھجوا دوں گی۔"

"کیا بات ہے امی!" وہ باقی کی سیڑھیاں عبور کرتا ان تک آگیا۔ "کوئی مسئلہ ہے؟"

"امی جان لاہور جا رہی ہیں نا بھائی جان کا رشتہ کرنے۔ تو کہہ رہی ہیں کہ آپ کی بات بھی وہیں پکی کر آئیں گی۔" اس نے معصومیت سے انکشاف کیا۔

"ہائیں!" عفت خانم بھڑک اُٹھیں "کیسے میسنے ہوتے جا رہے ہو شہروز! میں نے بھلا یہ کب کہا کہ میں اس کی بات پکی کر آؤں گی۔ میں تو محض تصویر لانے کی بات کر رہی تھی۔"

"نہیں امی پلیز!" فیروز یکلخت سنجیدہ ہوا تھا۔ "مجھے نہیں دیکھنی کوئی تصویر۔"

"یعنی بغیر دیکھے اقرار؟" شہروز نے حیران ہونے کی اداکاری کی۔

"یار! تم تو چپ کرو۔" وہ بھنایا "دیکھیں امی۔ میں نے ابھی کوئی شادی وادی نہیں کرنی ہے۔ فی الحال میرا ذہن اس چیز کو بالکل قبول نہیں کرتا۔ اور پھر یہ ایک زندگی کا معاملہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کوئی لڑکی میرے نام سے وابستہ ہو کر اس گھر میں آئے اور ساری عمر روتی رہے۔ پلیز! آپ صرف بہروز بھائی کی بات کر کے آئیں۔" وہ بات مکمل کر کے باہر نکل گیا تھا۔

"ہم نہ کہتے تھے!" اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ "بعد میں آپ کو ہی مشکل ہوتی!" عفت خانم اسے گھور کر رہ گئیں۔

"نجانے کیا بھید ہے۔" وہ فکرمندی سے بڑبڑا رہی تھیں۔ کیوں یہ لڑکا شادی کے نام سے یوں بدکتا ہے۔ آخر اس لڑکے کا ہوگا کیا!"

"جو بھی ہوگا، اچھا ہی ہوگا!" اس نے اطمینان سے ٹانگیں پساریں۔ "ائیرپورٹ کتنے بجے جائیں گی؟"

"پانچ بجے۔" انہوں نے بے دھیانی سے جواب دیا۔ "مجھے تو اس فیروز کی فکر کھائے جاتی ہے۔ نہ اسے زندگی کے کسی مشغلے میں کوئی

دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ نہ انسانوں سے اسے کوئی انس، لگاؤ ہے۔ ماں تک کے پاس یوں بیٹھتا ہے، جیسے کسی اجنبی خاتون کے ساتھ بیٹھا ہو۔ اُکھڑا اُکھڑا، خاموش خاموش۔"

وہ ہونٹ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے کچھ سوچنے لگا تھا۔



لہروں نے اس کے پیروں میں بڑی آہستگی سے دم توڑا تھا۔ ریت پر اپنے گورے پیر جمائے وہ دور کھڑے جہازوں کو دیکھ رہی تھی۔ عثمان نے ایک نظر گلابی نیل پالش سے سجے میدے جیسی رنگت والے نرم و نازک پیروں پر ڈالی پھر مسکرا کر اس کے قریب چلے آئے۔

"کیا بات ہے۔ بڑی خاموش سی ہو۔"

اس نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

"نہیں، خاموش تو نہیں ہوں۔ آپ ہی کچھ نہیں بول رہے ہیں تو میں کیا بات کروں؟"

"یہ تو کوئی جواز نہ ہوا۔ جسے بات کرنی ہو وہ از خود بات کرتا ہے۔ دوسرے کے بولنے کا انتظار تو نہیں کرتا۔"

"آپ مجھے کسی خاص مقصد کے تحت یہاں لائے ہیں؟"

ڈوبتے سورج کی روشنی میں اس نے پاس کھڑے عثمان کو بغور دیکھا۔

"ہاں۔" وہ مسکرائے۔ "دراصل میں محسوس کر رہا تھا کہ تمہیں مجھ سے کچھ شکایتیں ہیں جن کا تم اظہار نہیں کرتیں۔ میں نے سوچا، شادی سے پہلے ہمیں ایک دوسرے کی فطرت سے، عادات سے اچھی طرح باخبر ہو جانا چاہیے تاکہ بعد میں یہ شکایتیں دلوں میں نہ پیدا ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب اکثر و بیشتر میں اور تم یوں آؤٹنگ کے لیے نکلا کریں گے۔ اس طرح ایک دوسرے کے مزاج سے جلد واقفیت ہو جائے گی۔"

"آپ مجھ میں کیا تبدیلی چاہتے ہیں؟" اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"میں تو تم میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتا۔ تم جیسی ہو، مجھے اچھی لگتی ہو۔"

"کیا بات پسند ہے آپ کو مجھ میں؟"

"ہر بات!" وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "تم گریس فل ہو، خود اعتماد ہو، اپنی ذات پر بھروسا کرتی ہو۔ یہی باتیں مجھے اپیل کرتی ہیں۔"

"لیکن ہماری پسند، ناپسند بہت مختلف ہیں۔"

"یہ کوئی خاص مسئلہ نہیں ہیں۔ میں انسانی حقوق کا بہت بڑا علم بردار ہوں۔" وہ ذرا سا ہنسے تھے۔ "اب تم مجھے بتا سکتی ہو کہ تمہیں مجھ میں کیا شکایتیں ہیں!"

"کوئی خاص نہیں۔" اس نے ذرا سا رخ موڑا۔ "بس یہ کہ میں اظہار چاہتی ہوں، ہر لمحہ، ہر وقت۔ اور آپ اتنے خشک مزاج ہیں کہ اپنی منگیتر سے کتابوں پر بحث شروع کر دیتے ہیں۔ یہ نظریاتی بحث تو ہم دس سال بعد بھی کر سکتے ہیں، کتابیں تو اس وقت بھی ہوں گی۔ لیکن ہمارے پاس

انجوائے کرنے کے لیے یہ وقت نہیں ہوگا!"

"عجیب لڑکی ہو تم!" عثمان کی نگاہوں میں اُلجھن اُبھری۔ "ایک طرف تو تم افسانوی باتوں سے الرجک ہو تم نے کہا تھا نا یہ پورے چاند کی باتیں، پھولوں اور خوشبوؤں کی باتیں تمہیں پسند نہیں۔ دوسری طرف تم کہتی ہو کہ حقیقت پسندانہ گفتگو بھی تمہیں اچھی نہیں لگتی انسانوں پر بحث، نظریوں اور رویوں پر بحث سے تم کتراتی ہوں، میں سمجھ نہیں سکا الماس تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں۔میں تو بس عام سی باتیں کرنا پسند کرتی ہوں۔" وہ خود بھی لمحہ بھر کیلئے اُلجھ گئی تھی۔ "جو آپ کو کرنی آتی ہی نہیں ہیں۔چلیں واپس چلیں!"

"نجانے کیوں وہ عثمان کی کمپنی میں ایک عجیب سی اُلجھن کا شکار ہو جایا کرتی تھی۔اسے لگتا تھا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کو محض برداشت کر رہے ہیں۔اس نے ذرا سا رُخ موڑ کر انہیں اپنے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دیکھا۔سفید شرٹ اور گرے پینٹ میں ملبوس، دراز قامت اور سیاہ بالوں والے عثمان خان یقیناً متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔لیکن اسے بھی دعویٰ تھا کہ وہ بہت کم لوگوں سے متاثر ہوتی تھی۔اپنی ذات کے سورج کے آگے کسی اور کے چراغ کی روشنی کو تسلیم کرنا اسے ہمیشہ بہت مشکل لگا تھا۔

دوسری جانب وہ کسی گہری سوچ میں تھے، یہ لڑکی انہیں اپنے تصور سے بھی زیادہ مختلف اور مشکل لگی تھی۔نجانے وہ کیا چاہتی تھی۔نجانے اس کو کون سا رویہ بھاتا تھا۔کس وقت کون سی بات اچھی لگتی تھی۔ لان کے سبز پرنٹڈ سوٹ میں وہ بڑی خوش جمال، خوش اندام معلوم ہو رہی تھی۔ان کے دل میں شدت سے اسے اپنانے اور اس کے لبوں پر مسکراہٹیں بکھیر دینے کی خواہش جاگنے لگی۔

اس کی بے نیازی جتنی بڑھتی جاتی تھی عثمان خان کا دل اسی قدر اس کی جانب مائل ہوتا چلا جاتا تھا۔

"الماس!" گاڑی میں بیٹھ کر وہ اچانک اس کی جانب مڑے۔ "شادی کرلیں!"

"جی!" اس نے بھنویں اچکائیں۔ "ابھی؟ اس وقت؟"

"نہیں یار؟" وہ ہنس دیے "گھر چل کر ابو سے بات کرتا ہوں۔ دراصل میں اب شادی کرلینا چاہتا ہوں۔"

"میں ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔ "اور پھر امی کا ارادہ ہے کہ جب تک مہناز کا رشتہ کہیں نہیں ہو جاتا، تب تک وہ میری شادی نہیں کریں گی۔"

"میں خود چچی جان سے بات کر لیتا ہوں۔!"

"فی الوقت آپ گھر تو چلیں!"

وہ ان کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی۔

اُنہوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور سیدھے ہو کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگے۔



"بجو۔ آپ ہم سے ملنے آتی رہا کریں گی نا!" آنسو پونچھتے ہوئے ریشم نے اسے مخاطب کیا۔

وہ بے اختیار ہنس دی۔

"ظاہر ہے بھئی، اور اس میں بھلا یوں آنسو بہانے کی کیا بات ہے؟"

"لو۔ ایک تو خود نہیں رو رہیں اور ہمیں بھی رونے نہیں دے رہی ہیں۔" وہ ٹھنکاتی بولی۔

"اصل میں یوسف بھائی اتنے اچھے ہیں کہ بجو کو یہاں سے جانے کا کوئی افسوس ہی نہیں ہے۔" شبنم اس کا جوڑا تاکتے ہوئے بولی۔

"اب اتنے بھی اچھے نہیں ہیں۔" مریم بھی روہانسی تھی۔ "ہماری بجو کو لے جا رہے ہیں۔"

"تم سب نے جانا ہے۔ صرف میری بات ہی نہیں ہے، ابھی تو شبنم نے جانا ہے، پھر مریم نے، پھر اس نک چڑھی سی ریشم نے۔"

"جی نہیں۔ میں آپ ہی بے مروت نہیں ہوں۔ اپنی اماں اور اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ تنک کر بولی۔

"دیکھیں گے ہم بھی!" شبنم ہنسی۔ "جب وقت آئے گا تو سب کو تاتا کرتی چل دو گی۔!"

"سوائے ریشم کے وہ سب ہنس دی تھیں۔

"عنبرین باجی کی بے مروتی دیکھو۔" مریم کچھ سوچ کر بولی۔ "ان کی سب سے بہترین دوست کی شادی ہے اور یہ تک نہیں پوچھا کہ کوئی کام تو نہیں ہے۔ مہمانوں کی طرح ایک مرتبہ آئیں اور دو گھڑی بیٹھ کر چلی گئیں۔"

"دفع کرو۔ ہم نے ان سے کون سے پہاڑ سر کروانے تھے۔" شبنم نے سر جھٹکا۔ "خدا کا شکر ہے اس نے کسی کا محتاج نہیں کیا۔"

"بجو۔ ذرا پہن کر تو دکھائیں نا۔ یہ پیلا دوپٹہ کیسا لگتا ہے آپ پر۔!"

"ریشم نے گوٹا کناری سے سجا دوپٹہ اس کے سر پر ڈال دیا۔

"ہائے بجو! کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔"

تینوں بہنیں کام چھوڑ کر اس سے لپٹ گئیں۔

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر یوسف اندر آئے تھے۔

"السلام علیکم!"

"ہائے۔ یوسف بھائی۔ یہ بے ایمانی ہے۔ ہماری بہن کو مایوں کے جوڑے میں ابھی سے دیکھنے آ گئے۔" ریشم چیخی۔

نیلم نے دوپٹہ اُتار دیا اور شرما کر سر جھکا لیا۔ اسے یوسف کے یوں چلے آنے کی ہرگز توقع نہ تھی۔

"دولہا میاں سے صبر نہ ہو سکا۔" شبنم بھی ہنس رہی تھی۔ "اب چند ہی دن تو رہ گئے ہیں۔"

"ذلفی کہاں ہے؟"

"ان کی آواز پر سب نے چونک کر انہیں دیکھا۔ انتہائی سنجیدہ چہرے اور گمبھیر لہجے کے ساتھ وہ پوچھ رہے تھے۔

"پتا نہیں۔ بتا کر نہیں گیا۔ کیا بات ہے یوسف بھائی؟"۔ شبنم اچانک کھڑی ہوئی تھی۔

"اور ناصر؟"۔

"نجانے ایسی کیا تحریر تھی ان کے چہرے پر چاروں بہنوں کے چہرے سفید پڑ گئے۔

"کیا بات ہے یوسف؟"۔ نیلم گھبرا کر ان کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔

"بولیں نا پلیز۔!"

"نیلی۔ وقار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" وہ انتہائی مدہم لہجے میں بولے! "وہ ہاسپٹل میں ہے۔"

سب کی بے اختیار چیخوں سے کمرا ابھر گیا تھا۔

"وقار بھائی کو کیا ہوا ہے، کیسے ہیں وہ؟"

"ہر کسی نے انہیں تقریباً جھنجھوڑ دیا۔

"صبر۔ صبر بیٹا!" انہوں نے ریشم اور مریم کو لپٹا لیا۔ "وہ بالکل ٹھیک ہے۔" نیلم دیوار سے لگی انہیں ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔

وہ یوسف کے تاثرات بخوبی پہچانتی تھی۔ اور وہ قسم کھا سکتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اس کا بھائی خیریت سے نہیں ہے۔ کوئی اس کے اندر چیخ رہا تھا کہ جس لمحے سے وہ خوف زدہ تھی، وہ آن پہنچا تھا۔ اسے یقین تھا وہ لوگ اپنا پیارا بھائی کھو بیٹھی ہیں۔

آنکھیں بند کر کے وہ گرتی چلی گئی۔



اس نے بڑی بے دلی سے ایک نگاہ در و دیوار پر ڈالی تھی۔ شام کی ملگجی دھوپ اب دیواروں سے پرے کہیں جا رہی تھی۔

برآمدے کے فرش پر بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگائے لگائے وہ تھک چکی تھی۔ ایک کونے میں وحیدہ چچی بیٹھی سروتے سے چھالیہ کتر رہی تھیں۔ آمنہ ان کے پاس بیٹھی اپنی بیٹی کی فراک بھی تبدیل کر رہی تھی اور کچھ بولتی جا رہی تھی۔

شبنم ٹرے میں چائے کے کپ رکھے اندر آئی۔

"بجو! چائے پی لیں۔"

اس کے پاس بیٹھ کر اس نے بڑی محبت سے اسے مخاطب کیا۔

"شبنم بیٹی! اسے کچھ کھلا دو۔ خالی چائے تو اور سینہ جلائے گی اندر جا کر۔" وحیدہ چچی نے دور سے ہی اپنا فرض پورا کیا اور پھر آمنہ سے محو گفتگو ہو گئیں۔

نیلم اور شبنم نے ایک دوسرے کے خشک مگر دکھ سے بوجھل آنکھوں میں جھانکا۔

"کچھ کھائیں گی بجو؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا اور چائے کا کپ اُٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔
شبنم نے سب کو چائے دی اور آ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔
وقار بھائی کے انتقال کو آج دسواں دن تھا۔ عجیب سانحہ تھا جسے کسی کے دل و دماغ قبول ہی نہیں کرتے تھے۔ ایک برفیلی دُھند سب کے احساسات پر چھائی ہوئی تھی۔
ریشم اور مریم گم صم بیٹھی ایک دوسرے کو تکا کرتی تھیں۔ نیلم اور شبنم سر جھکائے گھر کے چھوٹے چھوٹے کام نمٹاتی رہتیں اور بار بار جا کر اماں کا حال پوچھتی رہتیں۔
جس گھر میں نہایت دھوم دھام سے خوشیوں کی آمد متوقع تھی، وہاں دُکھوں کے تاریک سائے بنا دستک دیے اندر آ کر ہر سمت میں پھیل گئے تھے۔
"کیا ہوا ہے؟" نیلم اکثر اپنے آپ سے پوچھتی تھی۔ "یہ کیا ہوا ہے؟ کیا یہی ہونا تھا؟" اور جواب میں وہ اپنے دل کی مدھم اور بوجھل دھڑکنیں سنا کرتی تھی۔
آج وحیدہ چچی اور آمنہ بھی سامان سمیٹ رہی تھیں۔ ان دونوں کے ہوتے ہوئے تو پھر بھی ایک آدھ جملہ، ایک آدھ آواز کانوں میں پڑ جاتی تھی۔
"اب کون اس جامد سناٹے کو توڑنے کی ہمت کرے گا؟" نیلم انہیں روانگی کی تیاری کرتا دیکھ کر سوچ رہی تھی۔
"اچھا بیٹی!" باری باری سب سے مل کر انہوں نے پاس آ کر اسے گلے سے لگایا۔ "اب تمہیں ہی سنبھالنا ہے چھوٹے بہن بھائیوں کو۔ ہمت سے کام لینا۔"
"جملہ تھا کہ عیسیٰ کا قم! وہ جیسے یک لخت زندہ ہوئی تھی۔
"مجھے؟" اس نے سوچا "مجھے سنبھالنا ہے سب کو؟ یہ سب اب میری ذمے داری ہیں؟ اور میں؟ مجھے کون سنبھالے گا؟"
ایک کونے میں کھڑی وہ بے شمار سوالوں کی زد میں آ گئی تھی۔
کیا یہی وہ لمحہ تھا جس سے وہ خوفزدہ رہتی تھی۔ کیا یہی وہ دُکھ تھے جن کے قبل از وقت ادراک نے اسے کبھی پوری طرح سے خوش نہ ہونے دیا تھا۔
"نیلی بجو۔ چلیں، اندر چلیں۔"
ریشم نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے رُک کر اسے بغور دیکھا اور اس کے چہرے پر رقم دُکھ کے گہرے تاثر سے گھبرا کر اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے آئی۔ ریشم کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ وہ اس سے لمبی ہو گئی تھی۔



''آخر آپ کو ہوا کیا ہے؟'' وہ اس کے کان میں چیخا تھا۔ ''کیا آپ کی دوستی امی حضور سے تھی؟ مجھے تو اب تک یہ غلط فہمی رہی کہ آپ میری دوست ہیں۔ صبا! دس از ناٹ فیئر!''

''شہروز!'' وہ بھنا اٹھی۔ ''تم واقعی اتنے ہی معصوم ہو۔ جتنا بنتے ہو؟''

''ہائیں۔'' اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ ''یعنی کہ میں بنتا ہوں؟ لیکن کیوں۔ وضاحت کیجیے۔ میری کس ادا سے یہ اندوہناک انکشاف ہوا آپ پر؟''

''دیکھو شہروز! ایسے اچھا نہیں لگتا۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''آنٹی لاہور گئی ہوئی ہیں تو ان کی غیر موجودگی میں میں تمہارے گھر نہیں آسکتی۔''

''ارے امی ہی گئی ہیں ناں۔ فیروز بھائی تو گھر ہی ہیں۔'' اس نے ہاتھ ہلایا۔

صبا کو ہنسی آگئی۔

''اطلاعاً عرض ہے کہ تین عدد مردوں کی موجودگی میں ایک عدد خاتون کی عدم موجودگی والا گھر ایک عدد لڑکی کے جانے کے لیے انتہائی غیر مناسب ہے۔ یہ نہایت واضح الفاظ میں میرا مدعا ہے۔ امید کرتی ہوں کہ آپ اپنی تمام تر معصومیت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سمجھ گئے ہوں گے۔''

''ہوں!'' اس نے چند لمحے تفکر کیا۔ ''تو یہ بات ہے۔ گویا جمنا کا وجود آپ کے نزدیک اتنا غیر اہم ہے کہ آپ اسے تسلیم ہی نہیں کرتیں۔ اور گویا آپ مجھے ایک سیلی کی نہیں ایک خاتون کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ یہ بات ہے؟'' بات ختم کر کے اس نے صبا کو خطرناک تیوروں سے گھورا۔

''اچھا بابا۔ تم جیتے میں ہاری۔'' صبا نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''اب میرا سر مت کھاؤ اور جا کر امی سے پوچھ لو جو پوچھنا ہے۔''

پچھلے ایک گھنٹے کی مسلسل بحث سے وہ عاجز آگئی تھی۔

''تم انسان تو نہیں ہو سکتے شہروز۔ کوئی اسپیشل مخلوق اتاری ہے اللہ میاں نے آسمان سے۔ بھلا انسان میں اتنا اسٹیمنا ہو سکتا ہے؟'' وہ بڑبڑا رہی تھی۔

جبکہ وہ اس کی بڑبڑاہٹوں کو نظر انداز کرتا ہوا اٹھ کر سیدھا اندر کی سمت چل دیا تھا۔

''السلام علیکم آنٹی۔'' اس نے کچن کے دروازے پر کھڑے ہو کر اندر جھانکا۔

''وعلیکم السلام۔'' مچھلی فرائی کرتی نجمہ بیگم نے مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرائیں۔ ''کیسے ہو بیٹا۔ امی آگئیں۔''

''جی نہیں۔ ابھی تک نہیں آئیں اور صبا مجھے انتہائی بور کر رہی ہیں۔'' اس نے منہ بنایا اور اندر آکر اسٹول گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''اچھا!'' وہ ہنس دیں۔ ''وہ کیسے؟''

''میں نے پروگرام بنایا تھا کہ آج ہم مل کر کوئی اچھی سی ڈش بنائیں گے۔ یعنی میں، جمنا اور صبا۔ لیکن وہ مسلسل انکار کیے جا رہی ہیں۔''

''دراصل تمہاری امی گھر پر نہیں ہیں اس لیے وہ ہچکچا رہی ہوگی۔'' وہ مسکرا دیں۔ ''تم ایسا کرو کہ اپنی وہ ڈش یہاں ہمارے کچن میں بنالو۔''

''جمنا اس سلسلے میں انتہائی تعصبی ہے۔ وہ کبھی یہ برداشت نہیں کرے گی کہ اپنی سلطنت چھوڑ کر کسی اور کی مملکت میں قدم رکھے۔ اور میں تو آج تک صبا کو اپنی دوست سمجھتا رہا ہوں۔ آج مجھے علم ہوا کہ وہ تو امی کی دوست ہیں مجھ سے وہ محض مروتاً ہی بات کرتی ہیں۔''

''اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' صبا کی ہنسی پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دروازے میں کھڑی تھی۔

''چلو۔ بناتے ہیں تمہارے مزے سے قیمہ کریلے۔ اور یاد رکھو میرا حصہ صرف اس صورت میں ہوگا اگر ڈش مزے دار بنی تو۔ ورنہ اس میں میرا کوئی ہاتھ نہ ہوگا۔''

''یعنی آپ صرف خوشیوں کی ساتھی ہیں۔ غموں میں ساتھ نہ دیں گی؟''

''ہرگز نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''چلیے گزارا ہے۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''ورنہ آج کل تو لوگ خوشیوں میں بھی ساتھ دینے سے کتراتے ہیں۔ آپ کم سے کم اس پر تو راضی ہیں۔''

''امی! میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ جاؤں گی۔'' صبا نے نجمہ بیگم کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

''جلدی آ جانا بیٹی۔'' انہوں نے ایک تذبذب بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

''جی بہتر۔'' دونوں باہر نکل آئے۔

''شہروز!'' وہ باہر آ کر رک گئی۔

''حکم؟'' اس نے سینے پر ہاتھ باندھے۔

''دیکھو۔ آئندہ تم الٹی سیدھی ضدیں نہیں کرو گے۔'' اس نے وارننگ دی۔ ''تم بچے نہیں ہو۔''

''بہتر جناب۔'' وہ خوش دلی سے ہنسا تھا۔ ''اب چلیں؟''

''چلو۔'' وہ دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے۔ کچن میں پانی پیتے فیروز نے گلاس لبوں سے ہٹا کر انہیں دیکھا تھا۔

''شہروز بے فکری سے آگے بڑھ کر کیبنٹ کھولنے لگا تھا جبکہ وہ اس کی گہری نگاہ سے گڑبڑا کر رہ گئی تھی۔

''السلام علیکم۔'' اس نے کچھ سمجھ میں نہ آنے پر سلام ہی پیش خدمت کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے مخصوص سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کیا ہو رہا ہے حضرت؟'' وہ شہروز سے مخاطب تھا۔

''بغاوت!'' جواب حسب متوقع تھا۔ ''بغاوت ہو رہی ہے بھائی۔ جمنا کی مطلق العنانی کے خلاف کھلا احتجاج آج کا کھانا ہم خود بنائیں گے اور ہر شے تہس نہس کر ڈالیں گے۔ آج جمنا کو علم ہوگا کہ زندہ دل لوگوں کا کچن کیسا ہونا چاہیے۔ نہ صرف یہ بلکہ زندہ دل لوگوں کی ڈائننگ ٹیبل کیسی ہونی چاہیے۔ کیوں صبا؟''

وہ ادھر ادھر دیکھ کر رہ گئی
"یار! سدھر جاؤ!"
"بھائی!" وہ عاجزی سے بولا۔ "اس واحد نصیحت کو دہرا دہرا کر آپ تھکتے نہیں ہیں؟ بخدا میرے کانوں کے اندر جیسے ایک تختی آویزاں ہے جس پر سدھر جاؤ۔ جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ آخر میری شخصیت میں بگڑنے کی ایسی کون سی واضح علامات ہیں جن پر آپ کو اتنی گہری تشویش ہے؟"
"کتنا بولتے ہو یار تم۔" وہ بھنا گیا۔ "اتنی توجہ اگر کسی ڈھنگ کے کام پر دو تو شاید کچھ بن ہی جاؤ۔"
"آپ تو اتنا کم بولتے ہیں بھائی!" اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ "پھر؟"
صبا نے بمشکل ہنسی پر قابو پایا تھا جبکہ وہ اسے گھورتا ہوا نکل گیا تھا۔
"کس قدر بدتمیز ہو تم شہروز۔" صبا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ "حد کر دی تم نے!"
"میں بھی کیا کروں۔ کہاں تک ان کے یہ فہمائشی کلمات سنتا رہوں۔ اس گھر میں اگر کسی فرد پر اعتراضات والزامات کی ایک بوچھاڑ مسلسل ہے تو وہ میں ہوں۔ یہ تیر ونشتر آخر میرا ہی مقدر کیوں؟"
وہ اس کے اسٹائل پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔
"اور ذرا خود کو دیکھئے!" وہ طنزیہ بولا۔ "ان پر ایک نگاہ پڑتے ہی کیسی مسرور وشادمان نظر آنے لگتی ہیں۔ 'بکھری بکھری' سے 'نکھری نکھری' ہو جاتی ہیں یک لخت ہی۔ اس پر بھی مجھ سے ہی شکایت کرتی ہیں۔ شہروز! تم ایسے ہو تم یوں کرتے ہو، تم بچے نہیں ہو۔ واہ صبا بی بی! واہ کچھ اصول وفا ہم سے سیکھ لیجیے۔"
وہ پیاز چھیلنے لگا۔
"اے لو۔ بھایا! کیا کرنے لگے؟" جمنا دروازے پر نمودار ہوئی تھی۔
"لیجیے ان کی ہی کمی تھی۔ جمنا بائی! ہم نے کہا تھا ناں کہ آخر کار تنگ آ کر بہو کے فرائض ہم خود ہی سرانجام دینے لگیں گے۔ تو خوش ہو جاؤ۔ بالآخر وہ مبارک دن آن پہنچا ہے۔ آج سے ہم کچن سنبھالنے کا آغاز کرتے ہیں۔"
"ارے بھایا! تم پھر ہمارا کام بڑھانے لگے۔ ہم شکایت کریں گے باجی سے۔ آ لینے دو انہیں۔ لڑکا ہے کہ آفت قیامت۔ اودھم مچائے رکھنا آتا ہے بس۔"
وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن سے نکل گئی۔
"ملاحظہ فرمایا صبا بی بی آپ نے۔" وہ اس کی جانب مڑا۔ "اب رہ گئے بھائی جان۔ ذرا ان کو آ لینے دیجیے۔ سب سے پہلی گولہ باری مجھ غریب کی ہی ذات پر ہوگی۔ کسی دن انچی ٹیپ سے گردن ناپ کر دیکھوں گا میں۔ آخر یہ کتنی پتلی ہے؟"

باہر رکھے فون کی بیل پر اس نے پھر پلٹ کر اسے دیکھا۔

"یہاں میں آپ کو اتنے اطمینان سے بیٹھ کر تنقیدی جائزہ لینے کے لیے نہیں لایا ہوں۔ ذرا فون سن کر آئیں اور پھر میرا ہاتھ بٹائیں۔ کریلے جنا ہائی نے صاف کر دیے ہیں۔ آپ فرائی کر لیجیے۔"

اس نے اس حکم نامے پر اسے گھورا اور باہر آ کر فون کی جانب بڑھی۔ جب تک وہ فون کے قریب پہنچی۔ بیل بند ہو چکی تھی۔

"مس صبا۔" گمبھیر لہجے پر وہ چونک کر مڑی۔ فیروز احمد عین اس کے مقابل موجود تھا۔

"جی!" نجانے وہ کیوں ہراساں ہو جایا کرتی تھی۔

"مجھے کچھ کہنا ہے آپ سے۔ پلیز! مائنڈ مت کیجیے گا۔"

اس نے ایک نگاہ کچن کی سمت ڈال کر کہا تھا۔

صبا اس کی سنجیدگی سے اپنی جانب مرکوز آنکھوں میں دیکھ کر رہ گئی۔

"جی! کہیے۔" وہ آہستگی سے بولی تھی۔

دل تھا کہ پھڑ پھڑا کر قابو سے باہر ہونا چاہتا تھا۔ یہ احساس کہ وہ اس سے مخاطب تھا اور کچھ کہنا بھی چاہتا تھا کس قدر ولولہ انگیز اور بھرپور تھا کہ اس کے سارے جسم کا خون جیسے بجلی کی رفتار سے دوڑنے لگا۔

"صبا بات یہ ہے کہ۔" اسی وقت وہ کچن سے نکل کر آیا تھا۔

"صبا بی بی! کہاں ہیں آپ۔ کام چور کہیں کی۔ کام سے ڈر کر یہاں چلی آئیں۔" فیروز لمحہ بھر کے لیے رُکا پھر کچھ سوچ کر سیڑھیاں پھلانگ گیا۔

صبا کو زندگی میں پہلی مرتبہ شہروز پر غصہ آیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ ایسے کیوں گھور رہی ہیں؟" وہ سہم گیا۔

"بے وقوف!" وہ جھنجلا گئی۔ "اب کھڑے کیا ہو۔ چلو۔ پکاؤ چل کر کھانا۔"

❀......❀......❀

"پھر اب کیا ارادے ہیں تم لوگوں کے؟" عنبرین ریشم سے مخاطب تھی۔

نیلم نے خاموش نظروں سے اسے دیکھا۔ نجانے کیوں اب اسے ہر کسی سے دلی بیزاری محسوس ہوتی تھی۔

"ارادے کیسے۔" ریشم نے جرنل پر سے سر اٹھایا تھا۔ "اماں کہہ رہی تھیں سادگی سے رخصتی کریں گے۔"

"ہاں بھئی۔ جلدی کرو جو کرنا ہے۔ نیلم کی حالت دیکھ کر مجھے تو بڑا دکھ ہوتا ہے۔ خدا کسی لڑکی کی قسمت میں ایسے دلدوز حادثے نہ لکھے۔ غریب کی شادی میں چند دن رہ گئے تھے۔"

بلو خالہ نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

ریشم اور شبنم ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

"عنبرین باجی اور ان کی امی مجھے تو زہر لگتی ہیں۔"

ان کے جاتے ہی ریشم نے اپنی رائے کا کھلا اظہار کرنے میں باک نہ سمجھا۔

"انسان کو اور کچھ آئے نہ آئے، کم از کم گفتگو کا سلیقہ اور تمیز ہونی چاہیے۔ کہاں، کس وقت، کس کے سامنے بولنا ہے اور کیا نہیں۔ اس کا ہنر ضرور آنا چاہیے۔ کیا ان لوگوں کو اپنی ہمدردیوں کے بنڈل نیلی بجو کے آگے ڈھیر کرنے ضروری ہیں؟ کیا انہیں اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ ان کی ذہنی کیفیت کیا ہے۔ اور ان کے تاسف اور ہمدردی کے بے پناہ اظہار سے ان میں مزید کیا تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں؟"

"جانے دو ریشم" شبنم بے دلی سے بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ "جاہل کے منہ لگنے سے عقلمندوں نے یونہی تو منع نہیں کیا۔ ہر طرح سے آدمی کا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ اور جاہل پھر بھی جاہل ہی رہتا ہے۔"

"لیکن میں کسی دن عنبرین باجی سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ ہمارے گھر تشریف نہ لایا کریں۔ اور آئیں تو ہم سے کہہ سن لیں جو کہنا سننا ہے۔ نیلی بجو کے کان نہ کھایا کریں۔ ہائے نیلی! اب کیا ہوگا۔ اب تمہارا گھر کیسے چلے گا۔ اب تمہاری باقی بہنوں کا کیا ہوگا۔ ظاہر ہے۔ ایسے سوالات کے جواب تو نیلی بجو کے پاس بھی نہیں ہیں۔

"ہاں!" شبنم نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ "ایسے سوالات کے جوالات تو ہم میں سے کسی کے پاس بھی نہیں ہیں ریشم۔"

باہر بیٹھی نیلم ان کی ساری باتیں بغور سن رہی تھی۔

"وقار بھائی کہا کرتے تھے، جب تک میں زندہ ہوں تم میں سے کسی کو بھی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو کیا اب۔ اب جب کہ وہ زندہ نہیں ہیں۔ فکروں اور پریشانیوں کا یہ ناقابل برداشت بوجھ اس زمین کے کسی حصے پر پھینکا جا سکتا ہے؟ یا خدا! تو ہی ہر مشکل کو آسان بنانے والا ہے۔"

بھیگی پلکوں کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔



"نہ تو میں کسی سے زیادہ میل جول رکھنا پسند کرتی ہوں اور نہ ہی کسی کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے کی اجازت دیتی ہوں۔ چند اصول ہیں جن پر سختی سے کاربند ہوں۔ ان میں سے ایک اصول اپنی شخصیت، اپنی ذات کی حفاظت کا بھی ہے۔ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے تمام تر ممکنہ پہلوؤں پر غور کر لینا اور نقصان ہوتا دیکھ کر قدم واپس لے لینا میری خصوصیت ہے لیکن۔ میں مانتی ہوں رضا صاحب۔ یہ اسٹیپ لینے سے پہلے میں کچھ بھی سوچ سمجھ نہ پائی بس عجب سی بے اختیاری کا شکار ہو گئی۔"

اپنی بات مکمل کر کے اس نے سامنے بیٹھے اس پرکشش نوجوان کو دیکھا۔ لائٹ گرین چیک کی شرٹ اور بلیک پینٹ میں اس کا جسم بے حد

شاندار لگ رہا تھا۔

آپ یقین کریں یا نہ کریں۔لیکن حقیقت یہ ہے الماس، کہ جو کچھ بھی آپ نے کہا، گویا یہ بھی میرے دل میں ہے کہ مصداق میری اپنی کیفیات بھی کچھ ایسی ہی ہیں۔ میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ اسٹیج پر پرفارم کرتا ہوں۔ روزانہ نجانے کتنی لڑکیوں سے ملاقات ہوتی ہے۔لیکن آپ! آپ کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ آئی، اس نے دیکھا اور فتح کر لیا، والی بات ہے۔''

وہ درمیان میں رُک کر سگریٹ سلگانے لگا۔

''اوہ۔آپ اسموکنگ سے الرجک تو نہیں ہیں؟'' وہ دفعتاً چونکا تھا۔

الماس نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا اور اس کے سگریٹ سلگانے اور کش لے کر دھواں فضا میں بکھیرنے کے انداز کو بغور دیکھتی رہی۔

''اس روز پروگرام کے بعد جب آپ نے مجھ سے کانٹیکٹ نمبر مانگا تھا تو مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ مجھے فون کریں گی۔ دراصل آپ کو دیکھنے اور بات کرنے سے آپ کا جو تصور اُبھرتا ہے، جو امیج بنتا ہے وہ ایک مغرور، سرپھری اور محض اپنی ذات کو فوقیت دینے والی لڑکی کا امیج ہے۔لیکن آپ نے فون کیا اور آپ سے گفتگو ہوئی تو احساس ہوا کہ آپ مختلف ہیں۔ اس قدر مختلف کہ انسان متوجہ ہونے پر مجبور ہو جائے۔''

وہ طمانیت کے بھرپور احساس کے ساتھ مسکرائی تھی۔

''ہاں! اکثر لوگ یہی کہتے ہیں۔''

''تب تو اپنی شخصیت کے سحر میں آپ بھی مبتلا ہو گئی ہوں گی۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس مجھے اپنا آپ اچھا لگتا ہے۔عثمان کہتے ہیں کہ میں اپنی ذات کو اہمیت دیتی ہوں اور انہیں میری یہی کوالٹی پسند ہے۔''

''موصوف کون ہے؟''

''عثمان!'' وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں مبتلا ہوئی۔''میرے کزن بھی ہیں اور۔ میرے منگیتر بھی۔''

''آپ انگیجڈ ہیں!''

''جی!'' الماس نے غور سے اس کی شکل دیکھیں۔

وہ جس قدر نارمل تھا، اتنا ہی رہا۔ اس کے چہرے کا رنگ برقرار رہا تھا۔ اطمینان سے وہ سگریٹ پھونکتا رہا۔

''اور آپ؟ کچھ اپنے بارے میں بھی بتائیں؟'' اس نے جوس کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

''ارے!'' وہ ہنس دیا۔''ہم جیسے لوگوں کے پاس اپنے بارے میں بتانے کے لیے رکھا ہی کیا ہے۔ اپنی ذات اور ذات سے متعلق معلومات تو آپ جیسے بڑے لوگوں کے پاس ہوتی ہیں۔ ہمارے پاس تو بس ایک نام ہوتا ہے۔ مجھے رضا مراد کہتے ہیں! اور بس!''

''پھر بھی۔'' الماس نے بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔''ایک مکمل ذات تو بہر حال ہر کسی کے پاس ہوتی ہے۔ اور ذات ہے تو اس کے متعلق

معلومات بھی ہوتی ہیں۔ویسے میں نے یونہی برسبیل تذکرہ پوچھ لیا ہے۔آپ نہ بتانا چاہیں تو زور زبردستی نہیں ہے۔"

وہ پھر ہنس دیا۔

"لوگ حسینوں سے بات کرنے اور بڑھانے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں اور آپ کہتی ہیں کہ میں بتانا نہیں چاہ رہا۔ارے الماس بی بی! بتانے کو ہے ہی کیا؟ میں، اس دُنیا میں قطعاً اکیلا ہوں۔ ماں باپ عرصہ ہوا گزر چکے ہیں۔تعلیم پوری کرنے کا موقع ستم ہائے روزگار نے دیا نہیں۔آواز اچھی پائی تھی۔اسی کو پیٹ بھرنے کا وسیلہ بنالیا۔اور بس۔"

"بڑے دل گرفتہ لگتے ہیں۔" وہ شگفتگی سے مسکرادی۔

"جی نہیں۔" بڑے جی دار لوگ ہیں ہم۔دل گرفتگی اور شکستگی سے کوسوں دور رہنے والے۔کوئی ربط و تعلق برقرار رہا تو جان جائیں گی آپ۔"

الماس نے پرس میں سے کچھ نوٹ نکالے اور چھوٹی سی ٹرے میں ڈالے۔

"میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔" وہ کھڑی ہوئی۔"چلیے! آپ کو ڈراپ کردوں۔"

"نوازش!" وہ ادا سے سر جھکا کر بولا تھا۔"اسی بہانے غریب خانہ بھی دیکھ لیجیے۔کبھی جی میں کوئی نیکی آجائے تو عزت بخش دیجیے گا۔"

الماس کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اس جھنکار کا شکریہ۔لیکن وجہ؟" وہ مسکرایا۔

الماس نے اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

آپ کا طرزِ گفتگو بڑا دلچسپ ہے۔" وہ مسکرائی تھی۔

شکریہ!" اس نے بال سنوارے

مرے سخن کا قرینہ ڈبو گیا کو .... کہ جس کو حال سنایا اسے فسانہ لگا

وہ اس کے ساتھ چلتے چلتے گنگنایا تھا



سونے سے پہلے وہ حسبِ عادت مدھم سروں میں بجتی موسیقی کو سن رہی تھی۔لیکن آج دماغ کہیں اور تھا۔ اس کے ذہن...... میں کہاں کسی کی کہی ہوئی کوئی بات یا جملے محفوظ رہتے تھے۔لیکن نجانے کیا سحر تھا اس آواز اور اس لہجے میں۔وہ مسلسل کھوئی ہوئی تھی۔

"لیکن آپ! آپ کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔"

"آپ مختلف ہیں۔اس قدر مختلف کہ انسان متوجہ ہونے پر مجبور ہو جائے۔"

"اس جھنکار کا شکریہ۔لیکن وجہ؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''کیسا دلچسپ شخص ہے۔ کیسا سحرانگیز!'' اس نے سوچا۔ ''عثمان کہتے تھے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا میں کیا چاہتی ہوں۔ میں خود بھی ایک کنفیوژن کا شکار ہوگئی تھی۔ کہ کہیں میری ہی مینٹلیٹی میں کچھ گڑبڑ تو نہیں۔ لیکن اب میں عثمان کو بتا سکتی ہوں۔ کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ میں ملواؤں گی انہیں رضا سے۔ آخر انہیں بھی تو علم ہونا چاہیے کہ گفتگو کیا ہوتی ہے اور دلفریب انداز گفتگو کیسا ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ان کی طرح دقیق، سمجھ میں نہ آنے والی باتیں کر کے ہی دوسروں کو متاثر کیا جائے۔ متاثر کن انداز کئی طرح کے ہوتے ہیں۔''

وہ دھیرے دھیرے سے اپنے سلکی بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی اور سوچتی رہی۔

''دوستی کرنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔ رضا صاحب! لیکن میں نے کہا ہے ناں کہ میں ہر قدم بہت احتیاط سے اور بہت سوچ سمجھ کر اٹھاتی ہوں۔ اس لیے آپ کی اس پیشکش کا جواب بھی بہت سوچ سمجھ کر ہی دوں گی۔ کیونکہ دوستی محض ایک لفظ نہیں۔ ایک وسیع مفہوم رکھنے والا تعلق ہے۔ اور تعلقات کے معاملے میں تو میں یوں بھی بہت محتاط ہوں۔ ورنہ صبا میری واحد سہیلی نہ ہوتی۔ صبا۔''

وہ مسکرا دی۔

''ہاں! صبا کو بھی بتانا ہے۔'' اس نے ایک نگاہ ڈیڑھ بجاتے وال کلاک پر ڈالی۔ ''لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو وہ فیروز احمد کے سنگ نجانے کن وادیوں کی سیر میں مشغول ہوگی۔''

ریموٹ سے ڈیک آف کر کے وہ نرم بستر پر دراز ہوگئی تھی۔



وحیدہ چچی اور اماں نجانے کیا بات کر رہی تھیں۔ نیلم کا مارے اضطراب کے برا حال تھا۔ کبھی وہ باورچی خانے میں جا پہنچتی تو کبھی برآمدے میں اور کبھی پلٹ کر کمرے میں آجاتی۔

''بجو! کیا بات ہے۔''

ریشم نے اسے بے چینی کی انتہا پر محسوس کر کے ہمدردانہ انداز میں پوچھا۔ سانحہ تو ایسا تھا کہ ہر کسی نے اسے احساس کی تمام تر شدتوں کے ساتھ محسوس کیا تھا لیکن۔ نیلم کے ساتھ تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی دماغی الٹ پھیر کا شکار ہوگئی ہو۔''

''آں۔ کچھ نہیں۔ شبنم کہاں ہے؟''

''حالانکہ وہ جانتی تھی کہ شبنم وہیں کمرے میں موجود تھی۔

''وحیدہ چچی کے پاس ہیں۔ بلاؤں؟''

''آں۔'' وہ پھر چونکی۔ ''نہیں رہنے دو۔''

''کیسی ہیں یہ بجو بھی۔'' ریشم نے اسے دیکھ کر افسوس سے سوچا۔ ''کسی سے کچھ نہیں کہتیں۔ اکیلے اکیلے نجانے کیا کیا سوچ کر کڑھتی رہتی

ہیں۔"

"شبنم!" نیلم نے اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر بے تابی سے پکارا تھا۔

"جی بجو۔ کہیے!"

"اس نے ایک تھکی تھکی سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"وحیدہ چچی کیا بات کرنے آئی ہیں؟"

"یہ کہ اگلے جمعے کو آپ کا اور یوسف بھائی کا نکاح نہایت سادگی سے کر دیا جائے گا۔ محض گھر کے افراد ہوں گے۔" اس نے عام سے انداز میں اطلاع دی۔

"اماں نے کیا کہا؟"

"اماں کیا کہیں گی؟" شبنم نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ "ظاہر ہے، یہ تو ہونا ہے۔ وقار بھائی کے چالیسویں کو بھی ہفتہ بھر ہو گیا۔ اب بھلا کس بات کی دیر۔"

"نہیں۔ نہیں شبنم!" وہ پریشانی سے بڑبڑائی۔ "تم منع کرو اماں کو۔"

"ہائیں؟" شبنم بھونچکا رہ گئی۔ "وہ کیوں؟"

"دیکھو شبنم! وقار بھائی مجھ پر بہت بڑی ذمے داری ڈال گئے ہیں۔ تم جانتی ہو، ہمارے پاس جمع شدہ جو کچھ بھی ہے وہ کتنا ہے۔ کتنے دن اور گزارا ہو سکتا ہے اس گھر کا۔ زلفی ابھی بہت چھوٹا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ وہ ایک دم وقار بھائی جتنا بڑا ہو جائے۔ پڑھائی چھوڑ کر ان ذمے داریوں کا بوجھ اٹھا لے جو اس کے ناتواں کاندھوں کے لحاظ سے بہت زیادہ بھاری ہیں اور پھر وہ ذہنی طور پر بھی وقار بھائی جیسا حساس اور پروا کرنے والا نہیں ہے۔"

"یہ سب ٹھیک ہے نیلی بجو۔ ہم سب بھی جانتے ہیں۔" شبنم اُلجھ گئی۔ "لیکن آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"میں چاہتی ہوں شبنم! کہ جب تک زلفی کسی قابل نہیں ہو جاتا، میں فرائض سنبھالوں۔"

شبنم نے حیران ہو کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔ وہ ایک دم کتنی بڑی، کتنی بہادر نظر آنے لگی تھی۔

"کون سے فرائض بجو؟" ریشم اور مریم بھی اسکے قریب آ گئیں۔

"میں نوکری کر لوں گی۔"

"اور شادی؟" مریم کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"ابھی نہیں۔ کم از کم دو سال تک نہیں۔ یہی بات میں اماں سے کہنا چاہتی تھی لیکن ہمت نہیں ہوئی خود سے کچھ کہنے کی۔ اسی لیے میں چاہ رہی تھی کہ شبنم یہ بات ان سے کہے کہ وحیدہ چچی سے بات کر لیں۔"

"نہیں۔ بجو۔ وہ کبھی نہیں مانیں گی۔ اور آپ اگر یہ سوچ رہی ہیں کہ اماں یہ بات مان لیں گی تو یہ بھی آپ کی غلط فہمی ہے۔ بھلا ہمیں اپنا تماشا بنوانا ہے کہ شادی ملتوی کر کے آپ سے نوکری کروائیں۔ میں اماں سے ایسی ویسی کوئی بات نہیں کروں گی۔"

"تو میں خود کرلوں گی۔" وہ سر جھکا کر آہستگی سے مگر مضبوط لہجے میں بولی تھی۔

"بجو! نوکری کرنا ہوئی تو ہم خود کرلیں گے۔ یہ ہمارا اپنا بوجھ ہے ہم اُٹھا لیں گے۔ خدا آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں دے۔ بھلا ہم میں سے کون چاہے گا کہ آپ کے راستے میں آتی خوشیوں کو ہٹا کر وہاں ذمے داریوں کے وزنی پتھر رکھ دے۔" ریشم تیزی سے بولی تھی۔

"میرے راستے میں کون سی خوشیاں ہیں ریشم!" اس کی آواز بھرا گئی۔ "میں یہ کیسے گوارا کرسکتی ہوں کہ تم سب کو، جو میرے اپنے ہو، میرا خون ہو، حالات کے دلدل میں پھنسا کر چھوڑ کر کسی کا سہارا تھام کر آگے نکل جاؤں۔ وقار بھائی ہم سب کا سائبان تھے۔ وہ ہمیں کس طرح سے پال رہے تھے، یہ میں جانتی ہوں۔ اور ان کے بعد کیا کیا مسائل درپیش آسکتے ہیں۔ اس کا اندازہ بھی تم میں سے کسی کو اس قدر نہیں ہوسکتا جتنا کہ مجھے۔"

"خدا پالنے والا ہے نیلی بجو۔ کیوں فکر مند ہوتی ہیں؟" شبنم نے اسے رسان سے سمجھایا۔

"خواہ مخواہ کی اُلجھنوں میں خود کو گرفتار نہ کریں اور سب کچھ خدا پر چھوڑ دیں۔ اتنا بڑا حادثہ۔ اتنا بڑا غم تھا۔ کس طرح سے سہ گئے ہم سب۔ کوئی تصور بھی کرسکتا تھا کہ یہ سب کچھ بھی ہوسکتا ہے؟ اب آپ آتی ہوئی خوشیوں کو یوں نہ جھڑکیں۔ میں یہ بات پھر آپ کے لبوں سے نہ سنوں۔ اگلے جمعے کو آپ کی رخصتی ہے۔ آپ ذہنی طور پر خود کو تیار کریں۔"

وہ کہہ کر باہر نکل گئی تھی۔ ریشم اور مریم اس سے لپٹ گئیں۔ جبکہ وہ مسلسل کسی گہری سوچ میں تھی۔



فون کی بیل نجانے کب سے بج رہی تھی۔ نہا کر خود کو گاؤن میں لپیٹتی وہ تیزی سے باہر نکلی تھی۔

"ہیلو۔" گیلے بالوں کو ایک طرف جمع کرتے ہوئے اس نے ریسیور اُٹھایا۔

"ہیلو۔ صبا بات کر رہی ہیں؟"

کسی نے آہستگی سے پوچھا تھا۔ آواز وہ لاکھوں آوازوں میں شناخت کرسکتی تھی۔ اس کا دل لمحہ بھر کے لیے دھڑکنا بھولا تھا۔

"جی ہاں۔ فیروز صاحب؟"

"جی!" اس کے لہجے میں تھوڑا تحیر آیا۔ "آپ پہچان گئیں؟"

"جی۔ کہیے۔ کیسے یاد کیا؟"

"صبا۔ چند روز ہوئے ملاقات ہوئی تھی آپ سے۔ اور میں نے کہا تھا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ غالباً آپ کو یاد ہوگا۔"

"جی۔" اس کا سانس اٹکنے لگا۔ "مجھے یاد ہے۔ لیکن آپ نے کہا تو کچھ بھی نہیں تھا۔"

"اسی لیے تو فون کیا ہے۔"

''وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا۔ صبا اس دوران اپنے دل کی دھڑکنوں کو گنتی رہی۔ آخر وہ کہنا کیا چاہتا ہے جس کے لیے لفظوں کے انتخاب میں اتنی دیر لگ رہی ہے۔ مختصر سے لمحات میں اس کا دل سو خوش فہمیوں اور ہزاروں اندیشوں کا شکار ہوا۔

''دیکھیں مس صبا! بعض احساسات ایسے ہوتے ہیں جنہیں لوگ زمانے بھر سے چھپا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ خوشبو کی طرح چاروں طرف پھیل جاتے ہیں۔ جذبوں کو راہ اظہار مل ہی جاتا ہے۔ کبھی نظروں سے، کبھی لفظوں سے اور کبھی محض ایک تبسم سے۔

وہ ٹھنڈے پانی سے تازہ نہا کر نکلی تھی لیکن اس کا پورا جسم پسینے میں ڈوب گیا۔ وہ کیا کہنے جا رہا تھا؟ کیا وہ سب کچھ جسے سننے کے لیے اس نے ایک طویل انتظار کیا تھا۔

''آپ سن رہی ہیں نا؟''

''جی۔ جی ہاں۔'' وہ گھبرا کر بولی۔

''میں کہہ رہا تھا صبا! کہ یہ جذبات و احساسات اتنے کومل اور اتنے پاکیزہ ہوتے ہیں کہ ان کا پردوں میں رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ورنہ انسان اتنے خوبصورت جذبوں کا حامل ہوتے ہوئے بھی لوگوں کی باتوں اور تنقیدوں کا نشانہ بن سکتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''جی۔ جی نہیں۔''

''دیکھیں مس صبا! ہو سکتا ہے کہ یہ بات آپ کو بری لگے۔ لیکن میں نے شہروز کا بڑا بھائی ہونے کے ناتے اپنا فرض جانا کہ یہ سب کچھ آپ سے کہہ دوں۔ میں یہ سب شہروز سے بھی کہہ سکتا تھا۔ لیکن ایک تو وہ انتہائی بے پروا اور کھلنڈرا ہے۔ ہو سکتا ہے سرے سے سمجھ ہی نہ پائے کہ میں کیا سمجھانا چاہتا ہوں۔ دوسرے میں اس کا بھائی ہوں۔ بڑا ہوں۔ اس ناتے سے ہمارے درمیان ایک حجاب ہے جسے میں اٹھانا مناسب نہیں سمجھتا۔ آپ بہت سمجھدار، سلجھی ہوئی شخصیت ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں، شہروز جیسے شخص کے لیے آپ جیسی ہی لڑکی ہونی چاہیے۔ جو اسے زندگی کی اونچ نیچ اور اچھے برے کی پہچان کرا سکے۔ اسی لیے میں یہ بات آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے رُکا تھا۔ صبا ریسیور تھامے دم بخود کھڑی تھی۔ اس میں اتنی سکت بھی نہ رہی تھی کہ اس کی باتوں پر احتجاج کا ایک لفظ بھی منہ سے نکال سکے۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس کو سمجھ کر وہ مجسم پتھر کی بن گئی تھی۔

''صبا! میں پسندیدگی یا محبت کے جذبے کو برا نہیں سمجھتا۔ یہ بھی نہیں کہتا کہ اس کا سرے سے اظہار ہی نہ کیا جائے۔ ایک حد میں رہ کر میل ملاپ پر بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن جس حد پر پہنچ کر انسان اٹھتی انگلیوں کا نشانہ بننے لگے وہاں سے میرے اعتراض کی حد بھی شروع ہو جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شہروز یا آپ میری پسند یا ناپسند کی پابند نہیں ہیں۔ پھر بھی میں یہ کہنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ان دنوں جبکہ امی گھر پر نہیں ہیں آپ دونوں کا یوں آزادانہ ملنا اچھا نہیں لگتا۔ لوگ بظاہر بہت انجان اور لاتعلق نظر آتے ہیں لیکن سب دیکھتے ہیں اور سب سمجھتے ہیں۔ مجھ سے خود کئی دوستوں نے پوچھا ہے کہ تمہاری والدہ اگر لاہور گئی ہیں تو یہ خاتون کس سے ملنے آئی ہیں؟ صبا! کہنا میرا حق تو نہیں لیکن مجھے بہت محسوس ہوا۔ شاید اس لیے کہ میں اپنے دل میں آپ کے لیے بہت سا خلوص، بے حد احترام رکھتا ہوں۔ مائنڈ مت کیجیے گا صبا! شہروز بہت بے وقوف سا لڑکا ہے وہ ان

نزاکتوں کو نہیں سمجھتا، انہیں سمجھنا اور اسے بھی سمجھانا اب آپ کا کام ہے۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ میرا مدعا پوری طرح سمجھ چکی ہیں؟"
اس نے ایک طویل گہرا سانس بھرا۔ اسے حقیقتاً چکر آ رہے تھے۔



بڑے بڑے پتھروں پر آمنے سامنے بیٹھی وہ دونوں سرمئی اور جھاگ اڑاتے پانیوں کو تک رہی تھیں۔
"میں اس قدر ڈپریسڈ ہوں الماس کہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "مجھے بتاؤ! میں کیا کروں؟"
الماس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔
میں نے تو تمہیں بہت سمجھایا تھا صبا! لیکن تمہیں ہی اصرار تھا۔ بتاؤ بھلا، کیا ملا تمہیں؟"
"مجھے مزید دکھی مت کرو الماس!" اس کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش آ گئی۔ "مجھے مت بتاؤ کہ میری کیا کیا غلطیاں ہیں۔ میرے قصور مت گنواؤ۔ بس مجھے تسلی دو اور دعا کرو کہ مجھے صبر آ جائے۔ میری بے قراریاں لمبی نیند سو جائیں۔ مجھے اس پتھر دل شخص کے سحر انگیز خواب نہ دکھائی دیں۔"
الماس نے دکھ سے اسے دیکھا اس کے نرم ہاتھ پر اپنا مخروطی انگلیوں سے سجا سفید ہاتھ رکھ دیا۔
"صبا! اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ اسے ایک غلط فہمی ہی تو ہوئی ہے جو دور بھی کی جا سکتی ہے!"
"مجھے خوش فہمیوں کے سراب مت دکھاؤ الماس۔" اس نے چہرے پر تھکن سے ہاتھ پھیرا۔ "اب میں مزید کچھ سوچنا نہیں چاہتی۔"
"چلو۔ تمہاری مرضی۔" الماس نے سکون سے گہرا سانس بھرا۔ "میں تو خود بھی دل سے یہی چاہتی تھی۔ ایک اُلجھن تھی مجھے۔ ایک خوف سا تھا تمہاری طرف سے۔ چاہتی تھی تمہیں کسی طرح واپس لے آؤں۔ بہتر ہوا کہ تمہیں خود ہی احساس ہو گیا۔"
"کیا کروں الماس۔" وہ دکھ سے مسکرائی۔ "تمہاری طرح مضبوط اعصاب کی مالک نہیں ہوں میں۔ نہ ہی ایسی کوئی غیر معمولی قوت ارادی میرے حصے میں آئی ہے۔"
"اچھا۔ دفع کرو اب اس ٹاپک کو۔" الماس نے بال جھٹکے۔ "اب میری سنو۔ ایک شخص ہے۔ مجھے اچھا لگنے لگا ہے۔ دوستی کرنا چاہتی ہوں اس سے۔ بولو، کر لوں؟"
"صبا نے نظروں میں اُلجھن بھر کر اسے دیکھا۔ "کون ہے؟"
"وہی۔ رضا مراد۔" وہ مسکرائی۔ "وہ گلوکار۔ جس کی آواز سن کر تم آنکھیں بند کر کے مراقبے میں مشغول ہو گئی تھیں۔"
"وہ؟" صبا نے چند لمحے سوچا۔ "وہ پھر کہاں مل گیا تمہیں؟"
"اس رات جب میں اس سے ملی تھی ناں، تو اس کا کانٹیکٹ نمبر لے لیا تھا میں نے۔ ایک آدھ مرتبہ فون پر بات ہوئی۔ ایک مرتبہ اس نے ملنے کی فرمائش کی تو ملاقات بھی ہو گئی۔ اب وہ چاہتا ہے کہ یہ باتیں اور یہ ملاقاتیں ایک تسلسل سے ہوں۔ یعنی کہ دوستی۔"

''اور تم کیا چاہتی ہو؟'' وہ اپنا مسئلہ بھول کر کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''چاہتی تو میں بھی یہی ہوں۔'' وہ کندھے اُچکا کر مسکرائی۔ ''پتا ہے صبا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو سمجھنے جاننے کی خواہش من میں اُبھری ہے۔''

''کیا تم اپنے حواسوں میں ہو الماس؟'' وہ ہولے سے چیخی۔ ''جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو؟ تم انگیجڈ ہو۔ کچھ عرصے بعد تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ یہ کیسا کھیل شروع کرنے جارہی ہو تم؟''

الماس نے ذرا سا برا مان کر اسے دیکھا۔

''میں نے یہ کب کہا صبا کہ میں اس سے شادی کرنے والی ہوں یا اس سے ملنے کے بعد میں انگیجمنٹ توڑنا چاہتی ہوں۔ یہ تو محض ایک وقتی تعلق ہوگا۔ میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتی۔''

''تم ایک مشرقی لڑکی ہو الماس۔ وقتی تعلقات کی بات تمہارے لبوں سے اوپری سی لگتی ہے۔'' صبا نے اس کا لہجہ محسوس کر کے مفاہمتی انداز اختیار کیا۔ ''اور پھر ذرا اپنے الفاظ پر غور کرو۔ تم اسے جاننے اور سمجھنے کی خواہش اپنے اندر محسوس کرتی ہو ناں۔ تو کان کھول کر سن لو کہ یہ ایک نہایت خطرناک آرزو ہے۔ وہ راہ ہے جو صرف آگے کی سمت جاتی ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے اور پلٹنے کا اس میں کوئی امکان نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ اس راہ پر چل پڑیں تو رُک نہیں سکو گی الماس۔''

''تمہارا مطلب ہے مجھے اس سے محبت وحبت جیسی کوئی شے ہوجائے گی، میں اس کی فرقت میں ویسے ہی آہیں بھروں گی جیسی تم فیروز احمد کی جدائی میں بھرتی ہو۔ تمہاری طرح مجھے بھی تنہا رہنے، غزلیں سننے کا شوق ہوجائے گا اور پھر یا تو میں علم بغاوت بلند کر کے اس سے شادی کرلوں گی یا پھر اس کے فراق میں تڑپ تڑپ کے جان دے دوں گی۔ وہاٹ نان سنس صبا!''

اس نے تیز تیز بول کر دوسری جانب رُخ کرلیا۔

صبا کچھ دیر کے لیے خاموش رہ گئی تھی۔

''تمہیں احساس نہیں ہوتا الماس۔ لیکن کبھی کبھی تم بڑی دل دُکھانے والی باتیں کرتی ہو۔ جذبات پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ ٹھیک ہے اگر تم خود کو عام انسانوں کی سطح سے بلند خیال کرتی ہو اور اگر تم سمجھتی ہو کہ تم مختلف انداز میں تعلقات کو ہینڈل کرتی ہو تو تمہاری مرضی۔ تمہیں سمجھانا اسی طرح میرا بھی فرض بنتا ہے جس طرح مجھے سمجھانا تمہارا فرض ہے۔ ہم دونوں کو اپنے فرائض پوری ذمے داری کے ساتھ سرانجام دینے ہیں لیکن کرنا وہی ہے جو اپنا من چاہے۔''

بات مکمل کر کے اس نے الماس کو ذرا مسکرا کر دیکھا تھا۔

''لیکن یاد رکھنا، میں نے تمہاری بات نہ مان کر نقصان اُٹھایا ہے۔ اور ایک عدد دل کا نقصان کچھ ایسا معمولی بھی نہیں ہوتا۔''

''یہیں آکر تو ہماری راہیں مختلف ہوجاتی ہیں۔'' الماس ہنس دی۔ ''زندگی میں جن باتوں اور جن چیزوں کی تم بہت پروا کرتی ہو، میں

انہیں سرسری سے انداز میں دیکھ کر آگے بڑھ جاتی ہوں۔ مجھ جیسے لوگ یہ دل ول کے نقصان ذرا کم ہی اُٹھاتے ہیں۔"

"کاش! تمہارے جیسی سائیکولوجی میری بھی ہوتی۔"

وہ ہولے سے بول کر رہ گئی تھی۔



الگنی پر سے کپڑے اتارتی آہستہ آہستہ انہیں ایک جگہ جمع کرتی، وہ مسلسل کسی سوچ میں تھی۔

دور گھروں کی چھتوں پر بچے پتنگیں اڑا رہے تھے۔ ان کا شور اتنا فاصلہ عبور کر کے بھی اس کے کانوں میں پہنچ رہا تھا۔

"حاضر ہو سکتا ہوں؟"

آواز پر اس نے چونک کر سیڑھیوں کی جانب دیکھا۔ یوسف کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"جی آیئے۔ السلام علیکم۔"

اس نے ہاتھ میں تھامے کپڑے چارپائی پر رکھ دیے۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو؟"

انہوں نے ڈوبتے سورج کی روشنی میں اس کے پیلے، ستے ہوئے چہرے کی جانب دیکھا۔

"ٹھیک ہوں!" وہ آہستگی سے کہہ کر چارپائی کے کونے پر ٹک گئی۔ "بیٹھیے۔"

"شکریہ!" وہ بھی قدرے فاصلے پر بیٹھ گئے۔

خاموشی کے چند لمحات ان کے درمیان آئے۔ جس میں وہ انگلیاں چٹخا کر ان سے کہنے والے الفاظ کو جمع کرتی رہی۔ ناصر نے بتایا تھا۔ تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو۔ کیا واقعی تم نے پیغام بھجوایا تھا یا یہ ان لڑکیوں کی شرارت ہے؟"

انہوں نے اس کے چہرے پر لرزتے سایوں کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی! میں نے ہی ناصر کو بھیجا تھا۔"

"خیریت؟" وہ اس کے انداز سے اُلجھ گئے۔ "کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"جی ہاں۔ خاص بات ہے۔ ایک مسئلہ ہے جسے آپ کی مدد سے سلجھانا چاہتی ہوں میں۔" وہ اٹک اٹک کر کہہ رہی تھی۔

"ہاں ہاں۔ کہو۔ ایسی کون سی بات ہے جو مجھ سے کہتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہو رہی ہے۔ میں نے کتنی مرتبہ سمجھایا ہے نیلی، مجھ سے اپنے دل کی ہر بات بلاتکلف کہہ دیا کرو۔"

اس نے نظریں اُٹھا کر ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں گہری اپنائیت کے سوا کچھ نہ تھا۔

"یوسف! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہماری شادی کچھ عرصے کے لیے ملتوی ہو جائے؟"

''اس نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے لجاجت سے کہا تھا۔ ان کی نگاہوں میں یک لخت ڈھیر ساری اُلجھنیں بھر گئیں۔

''کیوں؟''

''یوسف۔ آپ واقف تو ہیں ہمارے حالات سے۔'' وہ سر جھکا کر کہنے لگی۔ ''وقار بھائی کے بعد ایک میں ہی ہوں جو اپنے تمام مسائل کا بھرپور ادراک رکھتی ہوں۔ اگر میں بھی شادی رچا کر فی الفور یہاں سے چلی گئی تو یہ گھر ان گنت مسائل کی آماجگاہ بن جائے گا۔''

لیکن تم کیا کرنا چاہتی ہو؟ وہ ہنوز الجھن کا شکار تھے۔

''میں نوکری کرنا چاہتی ہوں یوسف۔ اس گھر کو فی الحال میری اشد ضرورت ہے۔ زلفی کی تعلیم ابھی درمیان میں ہے۔ شبنم باہر کی دُنیا سے قطعاً ناواقف، اور پھر اسے آتا بھی کیا ہے۔ ریشم، مریم، ناصر۔ یہ سب بہت چھوٹے اور نا سمجھ ہیں۔''

''بس ایک تم ہی جہان بھر کا شعور اور عقل لے کر آئی ہو۔'' وہ چڑ گئے۔ ''تم بھلا کیا کرو گی۔''

''پھر بتائیں۔ کون کرے گا؟''

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کب تک؟ کیا زندگی بھر ملازمت کرنے کا ارادہ ہے؟ مسائل کی کوئی خاص عمر نہیں ہوتی نیلم! جہاں پہنچ کر یہ دم توڑ دیں۔ یہ تو زندگی کے ساتھ ہیں۔ آج ایک، کل دوسرا، پرسوں تیسرا مسئلہ درپیش ہوگا۔ تم کہاں تک سب کا بوجھ اُٹھاؤ گی۔ بہتر یہی ہے کہ سب ابھی سے اپنا بوجھ خود اُٹھانے کی عادت ڈال لیں۔''

''میرے بہن بھائی رُل جائیں گے یوسف۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''صرف چند سالوں کی بات ہے۔ زلفی کسی قابل ہو جائے۔''

''زلفی کو کسی قابل ہونے میں ابھی چار پانچ سال ہیں نیلم۔'' وہ بھنا گئے۔ ''اور تم جانتی ہو، میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔''

''چار پانچ سال نہیں۔ دو یا تین سال۔'' اس نے آس سے پوچھا تھا۔ ''اتنا انتظار تو آپ کر سکتے ہیں ناں یوسف؟''

''تمہیں کون سی لاکھوں کی نوکری مل جائے گی نیلم۔'' انہوں نے پہلو بدلا۔ ''محض چند ہزار۔ کیا کرو گی تم؟''

''اور یہ چند ہزار بھی نہ ہوں تب؟ تب اس گھر کی گاڑی کیسے چلے گی؟ لازمی زلفی کو اپنی پڑھائی چھوڑنی ہوگی اور میری بہنوں کو گھر سے نکلنا پڑے گا۔ میں یہ سب ہوتا نہیں دیکھ سکتی یوسف!''

''اور تم! تم نہیں نکلو گی گھر سے؟''

میں۔ میری بات رہنے دیں!'' اس نے سر جھکا لیا۔

''لیکن میں؟ میں کیا کروں۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟'' ان کی آواز سے بے بسی مترشح تھی۔ ''مجھ سے کیا چاہتی ہو تم؟''

''چچی جان کو منا لیں۔ ایسا صرف آپ کر سکتے ہیں یوسف۔'' اس نے بے حد لجاجت سے کہا تھا۔

''تم خود کیوں نہیں کہہ دیتیں اپنی اماں سے۔'' وہ بے رُخی سے بولے۔ ''آج تک میں ہی سب کچھ کہتا سنتا ہر الزام اپنے سر لیتا آیا ہوں۔ اب تو تمہاری باری ہے نیلم بی بی!''

"یوسف؟" وہ ششدر رہ گئی۔

اس قدر بے بزنجی۔اس کے دُکھ سے،اس کے مسائل سے اتنی بے پہلو تہی۔اس نے کبھی گمان بھی نہ کیا تھا۔

"ہاں نیلم! مجھے احساس ہوا ہے کہ میں کس قدر بے وقوف ہوں۔ایک سراب کے پیچھے بھاگتا رہا ہوں۔کب سے تمہاری خواہش کر رہا ہوں۔نجانے کب سے۔شاید تم نے چلنا بھی نہ سیکھا تھا۔اور تم۔تم پتھر کا ایک بت ہو جس تک کسی کی پوجا،کسی کی دعا نہیں پہنچتی۔کتنا خوش تھا میں کہ ملن کی گھڑیاں قریب آ پہنچی ہیں۔سب کچھ کہنے،سب کچھ سننے کا وقت آ گیا ہے۔لیکن یہاں آ کر بھی تمہیں اگر کچھ یاد ہے تو اپنے مسئلے،اپنی الجھنیں۔میری خواہشوں اور خوشیوں کی ابھی بھی تمہاری نگاہ میں کچھ اہمیت نہیں ہے۔میں تمہیں خوشیاں دینا چاہتا ہوں بے وقوف لڑکی!اور تم آنکھیں بند کیے دُکھوں کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔"

"وہ بات ختم کر کے ایک نگاہ اس پر ڈال کر کھڑے ہو گئے۔

"بھاگو۔جہاں تک تمہاری ہمت ہے بھاگو۔" وہ مڑ کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔

"سنیئے!" اس نے پکارا تھا۔"آپ مجھے میرے سوال کا جواب دیے بغیر جا رہے ہیں۔" نجانے اچانک اس میں اتنی ہمت،اتنی مضبوطی کہاں سے آ گئی تھی۔

"میں نے پوچھا تھا۔آپ میری مدد کریں گے؟ آپ میرا انتظار کر سکتے ہیں یا نہیں؟"

انہوں نے مڑ کر برہمی سے اس کی جانب دیکھا۔"نہیں۔"

"تو آپ وحیدہ چچی سے کچھ نہیں کہیں گے؟"

"نہیں۔" ان کے لہجے میں حد درجہ مضبوطی تھی۔

"تو سنیئے۔میں آپ سے شادی کرنے سے انکار کرتی ہوں۔میرا انکار جا کر اپنی والدہ کی خدمت میں پیش کر دیجیے اور اگر آپ یہ بھی نہیں کر سکتے تو ان کی اگلی آمد پر میں یہ کام خود سرانجام دے لوں گی۔"

وہ جیسے منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔پوری آنکھیں وا کیے وہ انتہائی حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

اس نے کپڑے سمیٹے اور انہیں اُٹھا کر ان کے قریب سے گزر کر جانے لگی تو اچانک یوسف نے اس کا بازو سختی سے تھام لیا۔

"جانتی ہو۔کیا کہا ہے تم نے؟۔"

"جی۔بہت اچھی طرح سے سمجھتی ہوں کہ میں نے کیا کہا ہے۔"

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"اگر آپ میرا انتظار نہیں کر سکتے تو یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"انہوں نے ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑا اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ گئے۔وہ بھی آگے بڑھنا چاہتی تھی لیکن قدموں نے جیسے

اُٹھنے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

کپڑوں کا ڈھیر اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گرتا چلا گیا۔ دل میں کہیں ایک ٹیس سی اُٹھی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے چہرا ڈھانپ کر وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ آنسو تھے کہ ایک روانی سے بہتے ہی چلے جا رہے تھے۔



کیلکولیٹر سے سر اُٹھا کر وہ کاغذ کی جانب متوجہ ہوا پھر کاغذ قلم ایک جانب سرکا کر کچھ سوچنے لگا۔

''جمنا۔ جمنا بائی!'' اس نے ہانک لگائی تھی۔

''کہو۔'' وہ ہاتھ پونچھتی اندر آئی۔

''آج کیا تاریخ ہے؟''

''یہ کیا دھرا ہے تمہارے سامنے کیلنڈر۔ دیکھ لو اس میں۔''

''بڑی کام چور ہوتی جا رہی ہو جمنا۔'' اس نے جمنا کو گھورا۔ ''ذرا سی زبان ہلانے میں تکلیف ہوتی ہے۔''

پھر وہ کیلنڈر کی جانب متوجہ ہوا۔

''ہوں! آج بیس تاریخ ہے اور منگل کا دن ہے۔ کچھ یاد ہے جمنا تم نے کریلے کس دن صاف کیے تھے؟

م۔ میرا مطلب ہے جب میں نے اور صبا نے قیمہ کریلے پکائے تھے۔'' جمنا کو اپنی جانب گھورتا پا کر اس نے وضاحت کی۔

''بھایا! کبھی تو کوئی کام کی بات کر لیا کرو۔ یونہی آوازیں لگا لگا کر ہمارا کام خراب کرتے ہو۔''

''مثلاً۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''کیا کر رہی تھیں آپ؟ کون سے اہم سائنسی تجربات میں مصروف تھیں جن کی کامیابی یا ناکامی پر انجانی اہم انقلابی تبدیلیاں رونما ہونے کے روشن امکانات ہیں۔

''اچار ڈال رہے ہیں۔ محنت کا کام ہے۔ تمہاری طرح فارغ بیٹھے کاغذ نہیں بھرتے رہتے۔'' اسے زور سے ہنسی آئی تھی۔

''واہ جمنا بائی۔ بڑے پتے کی بات کی ہے۔'' وہ اُٹھ کر فون تک آیا۔

''تمہاری یادداشت کا امتحان لینے سے بہتر تو یہی تھا کہ میں خود صبا سے پوچھ لیتا۔ نمبر ملا کر اس نے مڑ کر جمنا سے کہا اور اسے نہ پا کر کھسیانا ہو کر دوسری جانب جاتی بیل سننے لگا۔

''ہیلو۔ السلام علیکم آنٹی۔'' سلسلہ ملنے پر وہ بولا۔

''میں شہروز بات کر رہا ہوں۔ صبا سے بات کرا دیں۔ کہاں گئی ہیں؟ اچھا ٹھیک ہے۔ آئیں تو ان سے میرا سلام کہیے گا۔''

ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ دانتوں سے نچلے لب کو کاٹنے لگا۔ دس دن سے اوپر ہو گئے تھے۔ نہ وہ آئی تھی، نہ اس نے فون کیا تھا۔

وہ چند لمحے ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا پھر ایک فیصلہ کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں بعد وہ اس کے گیٹ پر موجود بیل کا بٹن دبا رہا تھا۔

وہ جانتا تھا۔ گھر کے اندرونی حصے سے اس بیرونی گیٹ تک کافی فاصلہ تھا جسے نجمہ بیگم کبھی کبھار ہی عبور کیا کرتی تھیں۔ بیل کی آواز پر زیادہ تر صبا ہی گیٹ کھولنے آتی تھی۔

"کون؟" انٹرکام پر ابھرنے والی آواز وہ بخوبی پہچانتا تھا۔

"کون ہے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"آپ شاید میرا نام سن کر بھی مجھے نہ پہچانیں۔ اس لیے رہنے دیجیے۔"

غصہ اس قدر ٹوٹ کر آیا تھا کہ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ بے رُخی سے کہہ کر وہ پلٹ آیا۔ کمرے تک کا فاصلہ اس نے چند لمحوں میں طے کر لیا تھا۔ جمنا اندر آئی تو وہ جوتوں سمیت بستر پر اوندھا دراز تھا۔ جمنا نے اس کی چیزیں سمیٹتے ہوئے اسے بغور دیکھا۔

وہ سیدھا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ "جمنا بائی۔"

"کہو۔"

"دُنیا کیسی جگہ ہے؟"

جمنا نے ایک نظر اس کے معصوم چہرے پر ڈالی اور مسکرا دی۔

"تمہارے جتنے تھے تو ہمیں تو بہت اچھی لگتی تھی۔"

"اچھا! اس زمانے میں لوگ ایک دوسرے کی محبتوں اور چاہتوں کا مان رکھتے ہوں گے۔ اعتبار اور خلوص کو ٹھیس پہنچانے سے پہلے سو مرتبہ سوچتے ہوں گے۔ ایسا ہی تھا ناں جمنا بائی؟ وقت گزرنے سے زمانہ بدل گیا ہے یا تمہاری سوچیں؟"

"نہیں!" اس نے گہرا سانس لیا۔ "بھایا! نہ زمانہ بدلا نہ سوچیں۔ بس لوگوں کو پہچاننے کا سلیقہ آ گیا۔"

"لوگوں کو پہچاننے کا محض سلیقہ ہی ہوتا ہے یا کوئی طریقہ بھی ہوتا ہے؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کوئی طریقہ ہوتا ہو۔ تو ہمیں بھی دکھا دو جمنا بائی۔"

جمنا پر سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہ دروازے میں کھڑی صبا پر پڑی تھی۔

"اوہ۔ آپ!" وہ بے اختیار طنزیہ بولا تھا۔ "آپ تو کسی سہیلی کے ہاں گئی تھیں ناں۔ ابھی لوٹی ہیں؟ سیدھی یہاں چلی آئیں، گھر نہیں گئیں؟"

صبا نے نظریں جھکا لیں۔ وہ بھی رُخ موڑ کر منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اندر آ گئی۔

"کیسی ہو بیٹا۔ ٹھیک تو ہو۔ اتنے دن ہو گئے صورت ہی نظر نہیں آئی تمہاری۔"

جمنا اسے دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔ "ہم نے شہروز میاں سے بھی پوچھا۔ صبا بی بی کہاں ہیں۔ پر ان کا حال تو تمہیں خبر ہی ہے۔ ہر بات کا الٹا جواب بولتے ہیں۔"

"اچھا۔ جمنا بائی۔ اب آپ کو زحمت نہ ہو تو دو کپ چائے بنا دیں۔" شہروز نے مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر اسے مخاطب کیا۔

"زحمت کیسی۔ ہم ابھی لاتے ہیں۔" وہ فوراً کمرے سے نکل گئی۔

صبا آہستگی سے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی تھی۔ وہ اپنے کاغذات الٹ پلٹ کرنے لگا۔

"شہروز۔!"

"جی۔ فرمایئے؟" وہ ہنوز مصروف رہا۔

"دیکھو۔ مجھے کسی کو منانا نہیں آتا۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"ہم ایک مرتبہ خفا ہو جائیں تو پھر ہمیں بھی منانا نہیں آتا۔" اس نے حد درجہ سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"لیکن۔ لیکن تم خفا کیوں ہو؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

"وہ۔" وہ چمک کر بولا۔ "واہ صبا بی بی۔ اچھی رہی۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے۔ خیر جانے دیجیے۔ جن سے میں ناراض ہوتا ہوں انہیں اپنی خوش ذوقی سے محظوظ نہیں کرتا۔ یعنی ابھی بھی آپ پوچھتی ہیں کہ ناراضگی کی وجہ کیا ہے۔ کیا آپ واقعی اتنی ہی معصوم ہیں جتنا کہ بنتی ہیں۔"

"دیکھو شہروز! مجھے مجبوراً یہ سب کچھ کرنا پڑا۔" اس نے ہتھیلیاں مسلیں۔ "تم تو اتنے امیچور رہو کہ حالات کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتے۔ بس وہ کرنا چاہتے ہو جو تمہارے من میں سما جائے۔ لیکن میں کچھ عقل، کچھ شعور رکھتی ہوں ناں۔"

"اچھا؟" اس نے مصنوعی حیرانی کا مظاہرہ کیا۔ "کیا واقعی؟ یعنی گھر پر رہ کر بھی گھر میں موجود نہ ہونے کا تاثر دینا اعلا شعور ہونے کی نشانی ہے۔ اپنی معصوم پیاری سی ماں سے فون پر بار بار جھوٹے بہانے بنوانا عقلمندی کی دلیل ہے؟ واہ میری اچھی دوست! آپ تو واقعی بہت عقلمند، بہت باشعور ہیں۔ کیا پیش کروں انعام میں؟"

صبا کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی۔

"مت ہنسیے۔ زہر لگ رہی ہیں مجھے اس وقت۔ اگر آپ مجھ سے صاف صاف کہہ دیتیں کہ شہروز! مجھ سے ملنے مت آنا اور نہ ہی میں تم سے ملنے آؤں گی تو قسم سے مجھے اتنا دکھ، اتنی تکلیف نہیں ہوتی۔ لیکن آپ نے انتہائی نامناسب رویہ اختیار کیا۔ مجھے اس پر اتنا ہی افسوس ہے جتنا ہونا چاہیے۔"

"معاف نہیں کرو گے؟"

اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ بگڑا۔ "پہلے فرمایئے۔ کیا وجہ ہے اس بے رخی کی؟"

''بتادوں گی۔اتنی جلدی بھی کیا ہے۔'' وہ مسکرائی۔

شہروز نے اس کی جانب دیکھا۔

''مجبوری یہ ہے کہ آپ میری بڑی اچھی کزن ہیں۔کم از کم میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں۔اس سے بڑی مجبوری یہ ہے کہ عنقریب اور انشاءاللہ آپ اس گھر میں میری بھابی صاحبہ کے روپ میں جلوہ افروز ہونے والی ہیں لہٰذا آپ سے بنا کر رکھنے میں ہی میری عافیت ہے۔اس لیے فی الوقت میں ناراضی کے جذبات کا اظہار موقوف کرتا ہوں چلیے باہر چل کر چائے پیتے ہیں۔''

''چلو۔'' وہ مسکرادی

دونوں اُٹھ کر مسکراتے ہوئے کمرے سے نکل آئے۔اسی لمحے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے فیروز احمد نے رُک کر دونوں کو باہر نکلتے دیکھا تھا۔

صبا پر جیسے شرمندگی کی منوں اوس گری تھی۔

''السلام علیکم بھائی۔'' وہ رُک کر بھائی سے علیک سلیک کرنے لگا۔''کب آئے؟''

''ہوں!'' وہ چونکا۔''ابھی آیا ہوں۔''

''آیئے۔چائے پی لیں ہمارے ساتھ۔''

''ہاں۔تم چلو میں ذرا چینج کرلوں۔''

''آیئے ناں صبا۔پھر بن گئیں پتھر کی۔'' وہ اسے دیکھ کر چڑ گیا۔''میرے بھائی ہیں یا سامری جادوگر۔''

وہ چونکی اور اس کے پیچھے مرے مرے قدم اُٹھانے لگی۔



بستر پر نیم دراز وہ کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے عجب سوچ پریشاں میں گرفتار تھی۔

''کیا سوچتے ہوں گے وہ۔ کیا امیج رہ گیا ہوگا میرا ان کی نظروں میں۔'' بار بار یہی ایک خیال اسے آتا تھا اور دل و دماغ کی دُنیا کو زیر و زبر کر دیتا تھا۔

''میں اپنے دل میں آپ کے لیے بہت سا خلوص، بے حد احترام رکھتا ہوں۔'' اس نے کہا تھا۔ ''اور اب؟ اب اس دل میں میرے لیے کیا جذبات ہوں گے؟'' وہ اضطراب کے عالم میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''کیا سوچا ہوگا انہوں نے کہ کس قدر ڈھیٹ اور بے پروا لڑکی ہے۔ جسے خود اپنی عزت کا خیال نہیں ہے۔''

وہ دروازہ کھول کر ٹیرس پر چلی آئی۔ خوبصورت مہکتی ہواؤں کا استقبال بھی اس کی کیفیت میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہ کر سکا۔

''یہ شہروز۔ کبھی کبھی کتنی اُلجھنوں میں گرفتار کر دیتا ہے مجھے۔'' اس نے اُلجھ کر سوچا۔

''کیوں میں اس کی اتنی پروا کرتی ہوں۔ کیوں اس کے کہے پر آنکھیں بند کر کے عمل کر لیتی ہوں۔''

''خلوص کا جواب خلوص اور مان کا جواب مان ہوتا ہے صبا بی بی۔'' کسی نے اس کے اندر سے جواب دیا تھا۔

''جو شخص تمہیں در خور اعتنا نہیں جانتا..... اس کے لیے اس قدر حساس ہو کہ راتوں کی نیند اُڑ گئی ہے اور جو تمہارے آگے پیچھے پھرتا ہے، تمہارے چہرے پر ذرا سی خوشی دیکھنے کے لیے سو سو جتن کرتا ہے، اس پر تمہیں غصہ آ رہا ہے۔''

''وہ ریلنگ سے ٹیک لگائے لگائے یک لخت مسکرا دی۔

شہروز کا گول، معصومیت سے بھرپور چہرا اس کے دماغ کی اسکرین پر روشن ہو گیا۔

''تھوڑے سے عرصے میں سگے بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز ہو چکے ہو مجھے تم!'' اس نے محبت سے سوچا۔ ''اور وہ تمہارے احمق بھائی! فرما رہے تھے کہ جذبوں کو راہ اظہار مل ہی جاتی ہے۔ کبھی نظروں سے، کبھی لفظوں سے اور کبھی ایک تبسم سے۔ کون ان سے پوچھے کہ حضرت! ذرا یہ تو فرمائیے کہ اب تک کتنے جذبوں کی خوشبو آپ تک پہنچی ہے۔ کتنی نظروں کو پہچانا ہے آپ نے کتنے لفظوں پر غور کیا ہے۔''

وہ مڑی اور کمرے میں آ کر ٹیلی فون سیٹ اُٹھا کر بیڈ پر لے آئی۔

''ہیلو۔'' سلسلہ ملنے پر اس نے کہا تھا۔

''فیروز صاحب؟''

''جی۔ بات کر رہا ہوں۔ خیریت؟'' دوسری جانب وہی مخصوص سنجیدگی تھی۔

''سنیے۔ مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ جو کچھ بھی آپ نے سمجھا اور سوچا، وہ یکسر غلط ہے۔''

''جی؟'' وہ ایک لمحے کے لیے حیران ہوا۔

''جی۔ میرے اور شہروز کے درمیان ایسا کوئی تعلق، کوئی جذبہ نہیں جیسا آپ نے سمجھا۔ میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ وہ پیارا سا

لڑکا مجھے اپنے بھائیوں کی طرح عزیز ہو گیا ہے اور وہ بھی مجھے اپنی بہن سمجھتا ہے اسی حوالے سے ہم ملتے ہیں اور بلاتکلف ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی ہمارے ملنے پر اعتراض کرے یا ناک بھوں چڑھائے تو نہ میں اس کی پروا کروں گی نہ ہی شہروز۔ نیتیں صاف ہوں تو ایمان پختہ تر ہو جاتے ہیں۔"

دوسری جانب سے وہ جیسے سانس روکے اس کی بات سن رہا تھا۔

"آپ نے فون کیا۔ تو اتنی بے نیازی سے اتنی بات مکمل کر کے بند کر دیا جیسے میں آپ کی کہی ہر بات سننے اور خاموشی سے مان لینے کی پابند ہوں۔ کیا آپ نے مجھ سے اپنے اندازوں کی تصدیق کروا لینے کی ضرورت محسوس کی؟ آپ نے مجھ سے پوچھا کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں وہ کس حد تک درست ہے؟ شکر ہے، کہیں کے حکمران نہ ہوئے۔ ورنہ کس قدر ظالم اور مطلق العنان ہوتے۔"

بات مکمل کر کے اس نے کھٹ سے ریسیور رکھ دیا اور پھر سکتے کی سی حالت میں بیٹھی رہ گئی۔

"یہ میں نے کیا کیا؟" اس نے خود سے پوچھا تھا۔

"یہ میں ہی تھی؟ یہ سب کچھ میں نے کہا اور اس لہجے اور اس انداز میں کہا؟" اسے بے تحاشا حیرت ہو رہی تھی۔

پھر یکا یک اس نے ہنسنا شروع کر دیا اور ہنستی ہی چلی گئی۔



وہ اتم کو پڑھا رہی تھی جب ریشم نے آ کر اسے وحیدہ چچی، آمنہ، یونس اور یوسف کی آمد کی اطلاع دی۔

ایک لمحے کے لیے تو اسے لگا جیسے اس کے جسم سے جان نکل گئی ہو پھر ایکا ایکی اس نے ہر خوف کو خود پر سے جھٹکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں بیٹھے ہیں یہ لوگ؟" وہ اٹھ کر چپلیں پہننے لگی۔

"اماں کے پاس۔" ریشم نے اس کی تیاری کو حیرانی سے دیکھا۔

بھلا آج تک اس نے کب اس طرح سب کے درمیان جا کر بیٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہیں بجو؟" اس نے اپنے اندازوں کی تصدیق چاہی۔

"وہیں۔ سب سے ملنے۔"

"کچھ منگوا لوں ناصر سے؟ مٹھائی وغیرہ؟"

"نہیں۔" اس نے دوٹوک لہجے میں کہا تھا۔ "بس چائے بنا کر لے آؤ۔"

ریشم کے چہرے پر فکرمندی کے اثرات نمایاں ہوئے۔ اسے اپنی دبو، بزدل سی بجو میں اچانک ہی بڑی انقلابی تبدیلیاں نظر آنے لگی تھیں۔

وہ چند لمحے کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر مریم کی تلاش میں بھاگی۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو حسب توقع اندر کا منظر کچھ حوصلہ افزا نہ تھا۔ آنے والے سبھی افراد عجیب سے موڈ میں تھے۔

"السلام علیکم۔" اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" محض یوسف بھائی کی جانب سے جواب آیا۔

"نیلم!" وحیدہ چچی نے اسے مخاطب کیا تھا۔ ادھر آؤ بیٹی۔ ذرا یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو۔" وہ خاموشی سے ان کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ اس دوران اس نے ایک نگاہ اماں کے قریب بیٹھے یوسف پر ڈالی تھی۔ ایک بے حسی سی اپنے چہرے پر طاری کیے وہ خاموشی سے بیٹھے زمین کو گھور رہے تھے۔

"جی چچی۔ کہیے۔" وہ بے حد پرسکون تھی۔

"بیٹی! کیا یہ سچ ہے کہ تم نے شادی سے انکار کر دیا ہے؟"

"نہیں۔" وہ قدرے توقف سے بولی۔

یوسف نے حیرانی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"میں نے شادی سے انکار نہیں کیا۔ محض ایک شرط رکھی ہے۔" اس نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔ "میں تو صرف انتظار چاہتی ہوں۔ ذرا سا انتظار، جو کر لینے میں میرا خیال ہے کوئی حرج بھی نہیں۔"

"بے وقوف لڑکی۔" اماں بھنا کر بولی تھیں۔ "نیلم! تمہارا دماغ ٹھکانے پر تو ہے؟ کس سے پوچھ کر یہ الٹے سیدھے فیصلے کیے ہیں تم نے؟ بھائی کے ساتھ کیا مجھے بھی مرا ہوا تصور کر لیا ہے تم نے؟"

"اماں۔" وہ تڑپ کر بولی تھی۔

"مجھ سے پوچھا؟ کوئی مشورہ مانگا؟ خود کو اتنا بڑا کب سے سمجھنا شروع کر دیا ہے تم نے؟"

"اماں! حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی مانے یا نہ مانے۔ میں اتنی ہی بڑی ہو چکی ہوں۔ وقار بھائی کے جانے سے میری از خود ہی جگہ بن گئی ہے جوان کی تھی۔ اور جو فیصلہ میں کر چکی ہوں وہ اٹل ہے۔ اسے رد کرنے کا اختیار میں آپ کو بھی نہیں دوں گی۔"

"نیلم!" اماں کی آواز میں گھبراؤ تھا۔ "مجھے مزید غم نہ دے میری بچی۔"

"میرا خیال تو یہ ہے زبیدہ۔" وحیدہ چچی اچانک بولی تھیں۔ "کہ نیلم نے ایک درست فیصلہ کیا ہے۔"

"اماں نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔ نیلم بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہو وحیدہ۔" اماں گڑبڑا کر بولیں۔ "دیکھو تم دل پر مت لو۔ بچی ہے، پیش آنے والے حادثے سے دماغی طور پر مجروح ہے۔ بچی کیا ہم سب کے دل جیسے دکھتے ناسور بن گئے ہیں۔ ایسے میں الٹی سیدھی سوچیں دماغ میں آ ہی جاتی ہیں تم فکر مت کرو۔ میں اسے سمجھا لوں گی۔"

"چچی۔" اس نے انہیں مخاطب کیا۔ "میں نے جو فیصلہ کیا ہے، بدلنے کے لیے نہیں کیا۔ اگر آپ یہاں آئی ہیں تو یقیناً کچھ سوچ کر ہی آئی ہوں گی۔ کہیے۔ آپ کی صلاح کیا ہے؟"

"دیکھو بیٹی۔ برا مت ماننا۔" وہ جیسے سب کچھ کہنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ "بات اصل میں یہ ہے میرا اپنا ارمان تو یہ تھا کہ یوسف میاں کے لیے شبنم کا ہاتھ مانگوں۔ پھر حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ یوسف میاں سے تمہاری منگنی ہو گئی۔ اب اگر تم اس رشتے سے انکاری ہو تو ہماری خواہش تو وہی ہے۔ جمعہ کو نکاح تو ہونا ہے۔ تمہارا نہ سہی شبنم کا سہی۔"

"نیلم کے اعصاب پر جیسے بم گرا تھا۔ چچی ایسے نازک موقع پر بھی اس درجے مطلب پرستی کا مظاہرہ کر سکتی ہیں اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

"وحیدہ۔" تحیر کے عالم میں اماں بس اتنا ہی کہہ پائی تھیں۔

دروازے سے لگ کر کھڑی شبنم یک لخت گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

نیلم نے ایک نگاہ وحیدہ چچی پر اور اگلی یوسف پر ڈالی۔ وہ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں تھے۔ ماں کی بات پر کسی ردعمل کا مظاہرہ نہ کرنا اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ وہ سب کچھ طے کر کے آئے تھے۔

اسے لگا وہ بے اعتباری کی کھردری چٹان پر سے پھسلتی چلی جا رہی ہے۔ یوسف نے اسے اچانک ہی بالکل بے وقعت قرار دے دیا تھا۔

"بس اتنا ہی جذبہ تھا؟ اتنا ہی حوصلہ؟"

اس کی شکایت سے لبریز نظروں نے یوسف سے پوچھا اور جواباً وہ دوسری سمت دیکھنے لگے تھے۔

"ٹھیک ہے چچی جان۔" وہ اچانک بڑے ٹھنڈے، پرسکون لہجے میں بولی تھی۔ جمعے کو آپ لوگ آ جائیں۔ ہمیں یوسف کے لیے شبنم کا رشتہ منظور ہے۔"

اماں ہونق ہو کر اس کی شکل دیکھ رہی تھیں اور دروازے میں پردہ تھام کر کھڑی شبنم کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خلا میں معلق ہو۔



وہ حسب معمول صبح کی نماز پڑھ کر اوپر چلی آئی تھی۔ باجرے کا ڈبا اٹھائے وہ بیچ چھت پر کھڑی تادیر کسی سوچ میں گم رہی۔

اسی چھت پر وہ نوٹس کی تیاری کے دوران لاشعوری طور پر یوسف کی منتظر رہا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی وہ بالکل غیر متوقع طور پر چلے آتے تھے۔ ان کے آنے کی خبر ملتے ہی دل کی دھڑکنوں میں ایک عجب، انوکھا شور برپا ہو جایا کرتا تھا۔ انگلیاں مرتعش ہو جاتی تھیں اور پلکیں کانپا کرتی تھیں۔

اور یوسف کی باتیں! ان کی باتیں اسے دنیا جہاں کی باتوں سے الگ لگتی تھیں۔ ان کے الفاظ، انکے جملے وہ کس طرح سے حفظ کر لیتی تھی پھر اکیلے میں ان باتوں کو سوچنا بستر پر لیٹ کر انہیں دل میں دہرانا اور پھر اندھیرے میں مسکرا دینا کتنا خوش کن تجربہ ہوتا تھا۔

شبنم نے جب اسے بتایا تھا کہ وہ کبھی کبھی سوتے میں بڑبڑاتی بھی ہے تو وہ کیسے سہم گئی تھی۔ نجانے وہ کیا کچھ بول جاتی ہو۔ نجانے لاشعور کی تہوں سے کیا کچھ برآمد ہوتا ہو۔ اظہار کے کیسے کیسے رنگ اس کے اندر ہولی مچائے رکھتے تھے۔ جاگتے میں تو یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی رنگ اس کے چہرے پر آ جاتا لیکن نیند میں کیا خبر زبان سے کیا نکلے۔ کیسے مخمصے میں پڑ گئی تھی وہ۔ اس نے سوچا تھا۔ شادی کے بعد وہ یوسف کو یہ بات ضرور بتائے گی اور وہ ہنس کر کہیں گے۔

"اور رکھو دل میں باتیں۔ جاگتے میں نہیں تو سوتے میں تو لبوں پر آئیں گی ناں۔"

اور یوسف اس طرح سے پلک جھپکتے میں بدلے تھے۔ وہ یقین کرنا چاہتی بھی تو اب اسے یقین نہ آتا تھا لیکن یقین نہ کرنے کی اس کے پاس کوئی وجہ بھی ہی نہیں۔ کیا سوچ کر خود کو کوئی جھوٹی تسلی دیتی۔

ایک سرد آہ بھر کر وہ پنجرے تک چلی آئی اور جھک کر دروازہ کھول دیا۔

سفید سفید کبوتر ساری چھت پر پھیل گئے۔ کبھی یہ نظارہ اس کے دل کو بہت بھایا کرتا تھا لیکن دل کی آنکھ میں آنسو ہوں تو باہر کی دنیا کبھی بھی لبوں پر مسکراہٹ نہیں بکھیرتی۔ وہ غائب دماغی سے باجرہ بکھیرتی رہی۔

کتنی آسانی سے وہ اسے مسترد کر کے شبنم سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئے تھے۔ یہ سوچ دودھاری تلوار کی طرح اس کے دل کی نازک رگوں کو کاٹتی چلی جاتی تھی۔ بے اختیار کوئی سسکی، کوئی سرد آہ اس کے لبوں سے نکلا کرتی تھی۔

اس نے ایسے شخص سے محبت کی تھی؟ ایسے کھوکھلے شخص سے؟ اتنے سطحی انسان پر اعتبار کیا؟ اپنی ذات کا سارا مان سونپ دیا؟ اب کہاں جائے؟ کس سے اپنا غرور واپس مانگے؟

وہ ہتھیلی میں باجرہ مسلتی رہی۔ آنسو اس کا چہرا بھگوتے رہے۔

"لیکن میں نے کب خود کو ان کے سامنے بے قیمت کیا؟" پھر اس نے آنسوؤں سے بھیگا چہرا اوپر اٹھا کر سوچا۔ "کب ان کی محبت کا دم ان کے سامنے بھرا ہے؟ میرے سارے جذبے، ساری سوچیں تو صرف مجھ ہی تک محدود رہی ہیں۔ میرا مان تو ابھی بھی میرے پاس ہی ہے۔ میں نے آپ سے محبت کی ہے یوسف۔ ضرور کی ہے، تمام تر شدتوں سے کی ہے لیکن میں آپ کو یقین دلا دوں گی کہ میں نے آپ کو کبھی نہیں چاہا۔ کبھی بھی نہیں۔ گزرے لمحوں میں کسی ایک ساعت کے لیے بھی نہیں۔ جس طرح آپ نے میرے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی ہے اسی طرح کا ایک جھٹکا آپ بھی تو اپنے وجود میں محسوس کریں۔ آپ کی ذات کا غرور بھی تو ریزہ ریزہ ہو کر بکھرے۔ آپ تو مجھ سے سب کچھ کہہ چکے ناں؟"

دوپٹے سے آنکھیں رگڑ کر وہ ایک طوفان اپنی دھڑکنوں میں پوشیدہ کیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جس وقت وہ اتر کر نیچے آئی اماں باورچی خانے میں جا چکی تھیں۔

"اماں! آپ کیوں چلی آئیں یہاں۔" وہ جلدی سے ان کے پاس پہنچی۔ "میں دانہ ڈالنے چھت پر گئی تھی بس آ ہی رہی تھی۔"

"کوئی بات نہیں!" وہ سوگوار لہجے میں بولی تھیں۔ "میں چائے بنا رہی ہوں۔ تم بھی پی لو۔"

''پی لوں گی۔ ذرا ایک دو پراٹھے بنالوں۔ وقار بھا۔'' وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔

''زلفی کالج جانے کے لیے اُٹھتا ہی ہوگا۔ اُٹھتے ہی ناشتے کے لیے شور مچائے گا۔''

اماں دوسری طرف منہ کر کے چائے چھاننے لگیں لیکن ان کی پلکوں پر چمکتے موتی اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکے تھے۔

وہ بھی لبوں کو دانتوں میں کاٹتی آٹا نکال کر گوندھنے لگی۔

''رہنے دو نیلی بیٹی! میں کرلوں گی۔''

''کیوں اماں؟'' وہ افسردگی سے بولی۔ ''روز ہی تو کرتی ہوں یہ سب۔''

''اب تو چند دنوں کی بات ہے۔ پھر تم چلی جاؤ گی۔''

''میں کہیں نہیں جاؤں گی اماں۔'' اس نے انکی بات کاٹ دی۔ ''میں اپنا فیصلہ سنا چکی ہوں۔ اور میرے ساتھ زور زبردستی مت کیجیے گا۔''

''پاگل نہ بنیں بجو!'' وہ پیچھے سے چہرا خشک کرتی شبنم دروازے پر کھڑی تھی۔ ''یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے۔ جیتے جاگتے انسانوں کی زندگی کا معاملہ ہے۔''

''میں نے کب مذاق کیا ہے شبنم؟'' وہ حیران ہوئی۔ ''میں تو خود یہی کہہ رہی ہوں کہ میں اس معاملے میں انتہائی سنجیدہ ہوں۔''

''پلیز بجو۔ ختم کریں۔'' وہ جھنجلائی۔ ''میں کیا آپ کو اس قدر بے حس اور خود غرض نظر آتی ہوں کہ بہن کے لیے سجائی گئی مہندی اپنے ہاتھوں پر رچا کر بیٹھ جاؤں گی؟ اور جو کام آپ کرنا چاہتی ہیں، وہ میں بھی کر سکتی ہوں۔ آپ وقار بھائی کی جگہ لے کر اس گھر کو سہارا دینا چاہتی ہیں ناں تو اس کام کے لیے میرا کاندھا حاضر ہے آپ وہ کریں جو آپ کو کرنا ہے۔''

''میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں شبنم! میں وہ سب کچھ کرنا چاہتی ہوں جو مجھے ہی کرنا ہے اور اب یہ طے ہے کہ مجھے یوسف سے شادی نہیں کرنی۔''

''آپ کو غصہ ہے کہ انہوں نے یہ قدم کیوں اُٹھایا؟'' شبنم نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ ''اور غصے میں آ کر آپ اتنی شدتوں سے یہ انکار کر رہی ہیں۔ یہی بات ہے ناں بجو؟''

''مجھے غصہ ضرور آیا تھا شبنم! لیکن تھوڑی سی دیر کے لیے۔'' اس نے رسان سے بولنے کی کوشش کی۔ ''میں نے بارہا تمہیں سمجھایا ہے کہ میرا جس طرح کا تعلق تم یوسف سے جوڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ غلط ہے۔ وہ میرے لیے صرف ایک کزن کی طرح رہے ہیں۔ اس سے آگے کچھ نہیں اور پھر غصہ مجھے کس بات پر آتا؟ ان کے انکار سے پیشتر میں خود شادی سے انکار کر چکی ہوں۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ انکار نہیں کر سکتے تو میری جانب سے انکار سمجھیں۔ اب میری جگہ انہیں کسی لڑکی سے تو شادی کرنی ہی ہے، تو تم کیوں نہیں؟''

''مت کیجیے ایسی باتیں۔'' اس نے خفگی سے چہرا دوسری جانب پھیر لیا۔ ''میں کہہ چکی ہوں ایسا حشر تک ممکن نہیں ہے۔ چار دن بعد رخصتی ہے اور آپ کی ہے۔ آپ اپنا ذہن صاف اور دماغ ٹھکانے پر رکھیے۔''

''شبنم!'' وہ دکھ سے بولی۔ ''کس طریقے سے بات کر رہی ہو؟''

''پھر کیا کروں بجو میں؟'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''آخر آپ کی اس انوکھی ضد کا جواب کیا ہو سکتا ہے؟''

''یہ ضد نہیں شبنم۔'' وہ زور دے کر بولی۔ ''وقت کی ضرورت کے پیش نظر کیا گیا ایک انتہائی اہم اور مناسب فیصلہ ہے۔''

''اس نے ایک نظر چوکی پر بیٹھی، پتھر بنی ماں پر ڈالی۔

''اماں! اماں! آپ سمجھائیں ناں اسے۔ یہ کیوں نہیں سمجھتی۔''

''تم سب اپنی اپنی مرضی کے مالک ہو بیٹا۔ جو جی میں آئے کرو۔ اماں نہ پہلے کچھ تھی۔ نہ اب ہے۔ سمجھو اماں ہے ہی نہیں۔''

وہ اٹھیں اور آہستگی سے چلتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

شبنم بھی مزید کچھ کہے بغیر اُٹھ کر ان کے پیچھے چل دی۔

اس نے ایک گہرا سانس بھرا اور توا چولہے پر رکھ دیا۔ ابھی تو اسے کئی مرحلے طے کرنا تھے۔ ابھی کئی امتحان باقی تھے۔ لیکن اتنا اسے یقین تھا کہ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گی۔ اسے اپنے حوصلوں پر پورا اعتماد تھا۔



کیا بات ہے۔ تم اتنی چپ چپ کیوں رہنے لگی ہو؟" غزالہ نے خلاؤں میں تکتی ریشم کو مخاطب کیا تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بے دلی سے بولی۔ "جب سے بھائی ہمیں چھوڑ گئے ہیں، دنیا میں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"ایسے مت کہو۔ مرنے والے تو چلے جاتے ہیں۔ زندوں کو تو اسی دُنیا میں رہنا ہوتا ہے ناں۔ اسے پسند بھی کرنا ہوتا ہے۔ یہاں دل بھی لگانا ہوتا ہے۔" اس نے جیسے اسے پچکارا۔ "چلو میں تمہیں اچھی سی چاٹ کھلاتی ہوں۔"

"اوں ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے نہیں کھانی۔"

"ایک تو اتنے دن بعد کالج آئی ہو۔ اس پر بھی یہ رونی صورت بنا کر بیٹھی ہوئی ہو۔ مریم کیوں نہیں آئی؟"

اس کی مرضی۔ مجھے نیلی بجو نے کہا کہ بہت چھٹیاں ہوگئی ہیں۔ اب کالج جانا شروع کر دو۔ ورنہ میرا تو اپنا دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

"تمہاری بجو کی شادی کب ہے؟"

"پتا نہیں۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"کیوں؟" "تمہاری چچی نے بات نہیں کی؟"

"کی ہے۔ لیکن پتا نہیں کس کی شادی ہے اور کب ہے۔"

"کیا مطلب؟" غزالہ نے حیرانی سے اس کی صورت دیکھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ اُلجھ کر رہ گئی۔ "دراصل گھر کی صورت حال کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ نیلی بجو کہتی ہیں، انہوں نے شادی نہیں کرنی۔ شبنم آپی کہتی ہیں، انہوں نے شادی نہیں کرنی۔ وحیدہ چچی کہتی ہیں، اب انہیں شبنم کا رشتہ چاہیے۔ اماں، وہ تو کچھ کہتی ہی نہیں۔"

غزالہ نے کچھ سمجھ کر اور کچھ نہ سمجھ کر اسے دیکھا۔

"اسی لیے اتنی پریشان لگتی ہو؟" وہ ہمدردی سے بولی تھی۔

"تو اور کیا اس کی آواز بھرا گئی۔" کتنے خوش تھے ہم سب کتنے مطمئن اور اب اچانک اتنی ساری مصیبتیں آن پڑیں۔ گھر میں جس سے بات کرو، وہ کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ مریم کو بھی پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ یا تو سوتی رہتی ہے، یا روتی رہتی ہے۔ بالکل بات نہیں کرتی۔"

"چچ چچ چچ۔" غزالہ نے اظہار افسوس کیا۔ "تم ایسا کرو میرے گھر آجایا کرو۔ ہم دونوں مل کر پڑھا بھی کریں گے۔ باتیں بھی کیا کریں گے۔"

"وقار بھائی تھے تو مجھے ساری دوستوں کے گھر لے جایا کرتے تھے۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ذلفی تو کسی کام کا نہیں ہے۔ ہر بات پر ڈانٹ دیتا ہے۔ اور نا صر۔ وہ تو ہر وقت مجھ سے لڑائی رکھتا ہے تاکہ میں کوئی کام نہ کہہ سکوں۔"

"چلو کسی دن میں آؤں گی تمہارے گھر۔ مقصد تو مل بیٹھنا ہی ٹھہرا ناں۔"

ریشم نے اسے دیکھا اور اُداسی سے مسکرا دی۔

"تمہارے منگیتر صاحب کے کیا حال ہیں؟" اس نے رسماً پوچھ لیا۔

"اے۔ون۔" وہ چٹخارہ لے کر شروع ہوئی۔ "پتا ہے کل ہم لوگوں نے چائنیز کھانا بھی کھایا اور خوب گھومے پھرے۔"

ریشم حیرانی سے آنکھیں وا کیے اس کی باتیں سننے لگی۔ اور وہ ایک مرتبہ شروع ہوتی تو جیسے رُکنا بھول جاتی تھی۔



"بی بی صاحب! آپ کا فون ہے۔" نسرین کارڈلیس اسے تھما گئی تھی۔

اس نے میگزین سائیڈ ٹیبل پر دھرا اور فون کان سے لگایا۔

"ہیلو۔"

"رضا مراد بات کر رہا ہوں۔ کیسی ہیں؟"

"وہ۔ آپ!" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کہیے، کیسے فون کیا؟"

"یہ تو نہیں کہوں گا کہ بہت دنوں سے آپ کو یاد کر رہا تھا۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "بس بیٹھے بیٹھے آپ کا خیال آ گیا۔ میں نے نمبر ڈال کر لیا۔"

اس نے اپنے گالوں پر ہلکی سی آنچ محسوس کی۔

"اچھا؟" وہ ہلکے طنز سے بولی تھی۔ "نوازش۔"

"ناراض ہو گئیں؟" وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ "ارے الماس بی بی! آپ بھی کوئی بھولنے والی شے ہیں۔ جو ایک مرتبہ مل گیا، مجھے آپ کا ہو گیا۔ دراصل میں ایک کانسرٹ کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ کئی مرتبہ سوچا، آپ کو فون کروں لیکن موقع دستیاب نہ ہو سکا۔ آج لوٹا ہوں اور لوٹتے ہی سب سے پہلا کام یہی کیا ہے۔ یعنی آپ کو فون کیا ہے۔"

وہ طمانیت سے مسکرائی۔

"اور سنائیے۔ کیسی ہیں آپ۔ مزاج اچھے ہیں؟"

"بالکل!" وہ بشاشت سے بولی۔ "آپ کا کانسرٹ کیسا رہا؟"

"پتا نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "میرا تو جانے کا موڈ ہی نہیں تھا۔ لیکن پیسے کی خاطر کرنا پڑتا ہے سب کچھ۔"

"موڈ کیوں نہیں تھا؟" جانے وہ کیا سننے کی خواہش مند تھی۔

"پھر کب مل رہی ہیں آپ؟" اس نے واضح طور پر اس کا سوال نظر انداز کیا۔ "اور کہاں؟"

"میں نے کب کہا کہ میں آپ سے مل رہی ہوں یا ملنا چاہتی ہوں؟" وہ مسکرا دی۔

''تو کیجیے ناں۔ میں نے بھی تو یہی پوچھا ہے۔'' وہ ہنس دیا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ رضا کے بارے میں وہ ہنوز کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی۔

''چلیے۔ نہ سہی!'' وہ لمحہ بھر توقف کر کے بولا۔ ''آپ تو غصے کا شکار ہو گئیں۔ مجھے تو آپ کا دوٹوک رویہ ہی بھاتا ہے۔''

''میں نے کہا تھا کہ میں ہر کام سوچ سمجھ کر کرتی ہوں۔'' وہ رسانیت سے بولی۔ ''ابھی تو میں آپ کو ٹھیک طرح سے جانتی بھی نہیں۔ اس طرح بغیر سوچے سمجھے بغیر ملنا کیسے شروع کر دوں؟''

''ملنا شروع تو آپ کر چکی ہیں۔'' وہ ہنس دیا۔ ''اب تو اس سلسلے کو جاری رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ کریں گی آپ۔ خیر۔ سوچ لیجیے۔ کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ ہم تو آپ کے ہر فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کریں گے۔''

''لیکن آپ۔ آپ کیوں اس سلسلے کو جاری رکھنا چاہتے ہیں؟''

''بری بات الماس بی بی۔'' وہ قدرے شوخی سے بولا تھا۔ ''اپنی ذات عزیز ہونی چاہیے لیکن اس قدر نہیں کہ ہر لمحہ دوسروں کی زبان سے اظہار کی خواہش کی جائے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ نچلا لب دانتوں میں دبا کر بولی۔

''مطلب آپ سمجھتی ہیں۔'' وہ دھیرے سے ہنسا۔ ''اجازت چاہتا ہوں۔''

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے لیکن وہ سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔



''جمنا! کیا خیال ہے گھر کی سیٹنگ میں کچھ تبدیلی نہ لائی جائے۔'' وہ حشمت خانم کا فون آنے کے بعد سے بڑا ایکسائٹڈ ہو رہا تھا۔

''کرتے رہو جو کرنا ہے۔'' وہ اپنے کام میں منہمک تھی۔

اس نے بھنا کر اسے دیکھا۔

''مجال ہے جو زندگی میں کسی بات پر تم نے میرا ساتھ دیا ہو۔ میں کہہ رہا ہوں۔ عرض کر رہا ہوں کہ امی جان اتنے دن بعد واپس تشریف لا رہی ہیں۔ ان کے ہمراہ دو معزز مہمان خواتین بھی ہوں گی تو کیا اس گھر میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہیں ہونی چاہیے۔''

''مہمانوں کا کمرا ہم نے صحیح کر دیا ہے۔ تم پریشان مت ہو۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔

''نجانے کون سی غلطی ہو گئی کمرے میں جو تم نے صحیح کر دی ہے۔'' وہ جل کر بولا۔ ''ڈسٹنگ ہی کرائی ہو گی وہ بھی اس طرح کہ میز جھاڑتی ہو تو مٹی جوں کی توں اٹھا کر بیڈ پر رکھ دیتی ہو۔''

جمنا نے ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر پھلوں کی ٹوکری اٹھا کر کچن کی سمت چل دی۔

''تنہا چاند، اکیلا چاند۔'' اس نے تاسف سے سر ہلایا اور گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ''امی حضور آ جائیں تو جمنا بیگم کی ایک کی سو شکایتیں کروں گا۔

امی کہہ کر بھی گئی تھیں کہ شہروز کا خیال رکھنا۔ میرا بچہ، میرا لال ابھی چھوٹا ہے۔"

"ہاں تو باجی نے تم کو بھی بولا تھا ناں کہ جنا بائی کو ستانا نہیں۔" وہ مڑ کر واپس آئی۔ "اور فضول بولنے کو بھی منع کیا تھا ناں؟ باورچی خانے میں جانے سے بھی روکا تھا؟ تم باز آئے جو جنا بائی تمہارا خیال رکھے؟"

"ہمارا گھر ہے۔ ہماری مرضی ہوگی ہم جائیں گے۔" وہ بڑی شان سے بولا۔ "ہماری اپنی زبان ہے، جتنی چاہیں گے استعمال میں لائیں گے اور ہماری اپنی جنا بائی ہے۔ جتنا چاہیں گے ستائیں گے۔"

جنا نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اسکے سر پر ایک چپت جمائی۔

باہر گاڑی کا ہارن بجا تو وہ چھلانگ مار کر صوفے سے اترا آیا اور باہر کی سمت لپکا۔ جنا بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔

باہر فیروز احمد گاڑی کی ڈکی سے سامان نکال رہے تھے اور عفت بیگم دو لڑکیوں کے ہمراہ اندر آرہی تھیں۔

"امی حضور" وہ سیدھا جا کر ان سے لپٹ گیا۔ "کہاں رہ گئی تھیں۔ اتنے سارے دن لگا دیے۔ ہم سخت ناراض ہیں آپ سے۔ ہمارا تو دنیا میں جی ہی نہیں لگتا تھا۔"

"اچھا۔ دیکھو تو میں مہمان بھی ساتھ لائی ہوں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے علیحدہ کیا۔

"بڑی شکایتیں کرتے ہیں ناں کہ بات کرنے کو کوئی دستیاب نہیں ہوتا۔ اب جی بھر کر یہ قینچی سی زبان چلا نا دس پندرہ دن۔"

اس نے الگ ہو کر ساتھ آنے والی شخصیات کو دیکھا۔

"السلام علیکم۔ میں شہروز ہوں۔" اس نے دانت نکالے۔ "اور آپ میں سے ایک نبیلہ ہیں اور ایک عقیلہ۔"

دونوں ہنس دیں۔

"جی میں نبیلہ ہوں اور یہ عقیلہ ہیں۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

گوری رنگت اور لمبے بالوں والی لڑکیاں خوشگوار تاثر قائم کر رہی تھیں۔

"ماشاءاللہ کیا خوب ہیں۔ دل خوش ہو گیا کزنز سے مل کر۔" اس نے مزید باچھیں پھیلائیں۔

"آئیے۔ اندر چلتے ہیں۔"

اس لڑکے کی باتوں پر زیادہ دھیان مت دینا اور نہ ہی برا منانا۔" عفت خانم کہہ رہی تھیں۔

"بولتا ہے تو نان اسٹاپ بولتا ہی چلا جاتا ہے۔ سوچے سمجھے بغیر کہ کیا کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے، دوسرا کیا مطلب اخذ کرے گا۔ اسے پروا نہیں ہوتی۔"

"امی حضور! گویا تعریف کا سلسلہ مین گیٹ سے ہی شروع ہو گیا۔" اس نے ماں کو شاکی نظروں سے دیکھا۔ "انہیں اندر تو آلینے دیں۔ جی بھر کر میری کوالٹیز پر بحث کیجیے گا۔"

"تینوں ہنستی ہوئی اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ وہ فیروز احمد کے ساتھ سامان اُٹھانے میں مدد کرنے لگا۔

"ذرا بچ کر رہیے گا۔ امی حضور کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ یہ میری چھوٹی سی، خوبصورت سی ناک خطرات کی بو سونگھنے میں لاجواب و بے مثال ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ رُک کر اسے گھورنے لگا۔

"مطلب یہ کہ امی حضور نے مطلع ہی پیش کیا ہے۔ آگے کی غزل کیا ہے، کیسی ہے، اس کا اندازہ مطلع سے ہی لگالیں۔"



"بجو۔" وہ انتہائی درجے کی بے بسی سے بولی تھی۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ یہ کیسی ضد ہے؟"

"شبنم! میری جان۔ میری پیاری بہن۔ یہ ضد نہیں ہے۔ مان جاؤ۔ اس میں میری خوشی سمجھ لو۔ دیکھو، اب میں یوسف سے شادی کرنے پر ہرگز رضامند نہیں ہو سکتی۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ ایک بہت عمدہ رشتہ ہے۔ میں اسے مس نہیں کرنا چاہتی۔ یوسف اچھے انسان ہیں۔ تمہیں خوش رکھیں گے۔ اس بات کا یقین رکھو کہ ہماری آپس میں کوئی انوالومنٹ نہیں تھی۔"

شبنم نے گہرا سانس بھرا۔

"بجو! یہ کوئی مذاق ہے؟ ان سے آپ کی منگنی ہوئی تھی۔ ان سے آپ کی شادی ہونے والی تھی۔ سارا جہیز ہم سب نے مل کر تیار کیا۔ ہر چیز آپ کے لیے بنی اور دُلہن میں بن جاؤں؟ کوئی تک ہے؟"

"وہ منگنی تو ختم ہو چکی!" وہ اطمینان سے بولی۔ "اب تو یوں سمجھو کہ یہ ایک بالکل نیا رشتہ ہے جو تمہارے لیے آیا ہے۔ وحیدہ چچی نے تمہارے لیے کہا تھا ناں؟ جواب دو؟"

"یہ ساری کارروائی جیسے انتقامی طور پر ہو رہی ہے اور نشانہ بن رہی ہوں میں۔ کیوں۔ ایسا کیوں کر رہے ہیں سب؟" وہ رو دینے کو ہو گئی۔

نیلم نے اسے گلے سے لگا لیا۔

"نہیں شبنم! کوئی انتقامی کارروائی نہیں ہو رہی ہے۔۔ دل خراب مت کرو۔ یوں سمجھو، یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ جو کچھ ہماری پیشانی پر تحریر ہے وہی پیش آتی ہے۔ جو کچھ ہوا تھا اسے ایک خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔"

"بجو! کس قدر عجیب رشتہ ہو گیا یہ۔" وہ رونے لگی۔ "میں نے ہمیشہ انہیں آپ کے حوالے سے دیکھا ہے۔ بہنوئی سمجھا۔ ہر طرح کے مذاق کیے، اور اب۔ اب۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا شبنم!" اس کے لہجے میں دُکھ اُتر آئے۔ "دُنیا میں بھی لوگ ایسا کرتے ہیں۔ یہی کر رہے ہیں۔"

"نہیں بجو!" وہ تڑپ کر اس سے علیحدہ ہو گئی۔ "میرا دل نہیں مانتا۔ میں یہ نہیں کر سکتی۔ مجھے مجبور مت کریں۔"

اس نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

نیلم نے اس کے ہاتھوں کو تھام کر لبوں سے لگایا۔

❁......❁......❁

اب دیکھو۔ موقع ایسا ہے کہ میں اپنے دل کے ارمان پورے بھی نہیں کر سکتی۔" وحیدہ چچی کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ "میں جانتی ہوں تم لوگ اس حادثے سے پوری طور پر سنبھلے نہیں ہو۔ تمہارے دل کسی خوشی کو منانے پر رضا مند نہ ہوں گے لیکن زبیدہ دیکھو، میرے لیے تو یہی موقع ہے اپنے دل کی حسرتیں نکالنے کا۔ یہ آمنہ اور اس کی سہیلیاں کل رسم مہندی کے لیے آنا چاہ رہی ہیں۔ یونہی بیٹھ کر ایک دوگانے گا لیں گی اور بس شبنم بٹی کے مہندی بھی لگا جائیں گی۔ میں نے یہ مناسب جانا کہ پہلے تم سے اجازت لے لوں۔"

"اس میں اجازت کی کیا بات ہے وحیدہ۔" اماں نے ایک نظر کونے میں بیٹھی نیلم پر ڈالی۔

"لے آؤ بچیوں کو۔ یہ موقعے پھر کہاں آئیں گے۔ آمنہ کے کون سے دس گیارہ بھائی ہیں۔"

"نیلم بٹی!" چچی نے اسے دیکھا۔ "تمہیں تو اعتراض نہیں؟"

"اعتراض کیسا چچی؟" وہ مسکرا دی۔ "اسی بہانے ہم بھی اپنا دل بہلا لیں گے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تمہارے گھر بھی پہلی خوشی ہے۔ جو کرو، وہ کم ہے۔"

شبنم بھی قریب بیٹھی اپنی ہتھیلیوں کو آپس میں مسل رہی تھی۔

ریشم اور مریم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اٹھ کر باہر آ گئیں۔

کیوں مریم! اپنی سہیلیوں کو بھی بلا لیں؟" ریشم خوش ہو گئی تھی۔

"بے وقوف مت بنو!" مریم نے اسے جھڑکا۔ "کون سا خوشی کا موقع ہے۔"

"کیوں؟" ریشم نے حیران ہو کر اس کی صورت دیکھی۔ "اور خوشی کے موقعے کیسے ہوتے ہیں؟"

"کم از کم ایسے بے سرے نہیں ہوتے۔ یہ چچی جان، ان کی صورت مجھے زہر لگنے لگی ہے۔"

"کیوں؟"

"انہوں نے جان بوجھ کر یہ سب فساد کیا ہے۔ ہماری اتنی پیاری سی بجو کا دل توڑا ہے انہوں نے۔"

"نیلی بجو اداس ہیں مریم!" اس نے جیسے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

"تو؟ تمہیں خوش لگتی ہیں؟"

"پتا نہیں۔ مجھے تو پتا بھی نہیں چلتا ہاں۔ وہ خود تو یہی کہتی ہیں کہ خوش ہیں۔"

"کہنے میں اور ہونے میں بہت فرق ہے تمہیں ان کی آنکھیں ہر وقت گیلی گیلی سی نہیں لگتیں؟"

"ہاں لگتی تو ہیں۔" وہ سوچ کر بولی۔

"وہ بے چاری روتی ہیں ناں چھپ چھپ کر اس لیے۔" مریم افسردگی سے بولی۔ "اور شمع آپی! وہ بے چاری کون سا خوش ہیں۔ سچ ریشم! اگر میری شادی اس طرح سے ہوتی ناں۔ میری مرضی کے خلاف۔ تو میں تو زہر کھا لیتی۔"

اسی لمحے شبنم اٹھ کر باہر چلی آئی تھی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے رُک کر ان دونوں کو دیکھا۔ "کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں۔" دونوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ریشم! مریم!" نیلم بھی ان کو پکارتے ہوئے باہر آئی تھی۔ "دیکھو محلے میں اپنی سہیلیوں کو بتا آؤ کہ کل رات شبنم کی مہندی آنی ہے سب آ جائیں۔ اکٹھے بیٹھ کر گیت گائیں گے۔"

انہیں ہدایت دے کر وہ کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

ریشم نے مریم کو دیکھا۔

"بے چاری بجو۔" وہ تاسف سے محض اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی تھی



سب کے سب لان میں بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تھے، نسرین چائے کا کپ بھر بھر کر سب کو تھما رہی تھی۔

نہا دھو کر، سفید کرتا شلوار زیب تن کیے لان چیئر پر بیٹھے عثمان نے ایک نگاہ طائرانہ حاضرین محفل پر ڈالی۔

وہ، وہاں موجود نہ تھی۔ ایک بے چینی سی انہوں نے اپنے اندر محسوس کی۔ اب وہ ہاسپٹل سے لوٹتے ہی سب سے پہلے اسے دیکھنے کے خواہش مند رہا کرتے تھے اور وہ نظر نہ آتی تو وہ ایسا محسوس کرتے جیسے تھکن اُترنے کے بجائے بڑھ گئی ہو۔

"صاحب جی۔ چائے!"

نسرین نے انہیں کپ تھمایا۔

"الماس کہاں ہیں نسرین؟" انہوں نے دریافت کیا۔

"وہ جی۔ تیار ہو رہی ہیں کہیں جانا ہے انہوں نے۔"

"اچھا۔!" وہ محض اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔

"ایسا اکثر و بیشتر ہوا کرتا تھا۔ وہ لوٹتے تو وہ کہیں جانے کو تیار ہوتی۔ کبھی شاپنگ کے لیے، کبھی آؤٹنگ کے لیے کبھی کسی اور کام کے لیے۔ وہ اس سے کہنا چاہتے تھے کہ جب وہ آیا کریں، تو کچھ دیر گھر پر ہی رہا کرے چاہے آدھے گھنٹے کے لیے ہی۔ لیکن ان کے ساتھ بیٹھ کر ان سے باتیں کیا کرے، کم از کم چائے کے ایک کپ پر ہی ان کا ساتھ دے دیا کرے۔ لیکن نجانے کیوں وہ ایسا کہنے میں اپنی ہتک سی محسوس کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ ان سب باتوں کا خیال تو اسے از خود رکھنا چاہیے۔ بنا ان کے کہے۔

''کیا ابھی تک میا ہے اور میرے درمیان ایسا کوئی دلی تعلق محسوس نہیں کرتی، جس میں ایک دوسرے کے دل کی باتیں بنا کہے ہی بجھی اور پوری کی جاتی ہیں؟ کیسی عجیب بے نیازی ہے جو اس کی شخصیت کا خاصا ہے اور شاید کشش بھی۔''

''عدنان!۔''

وہ کروشیے کی بنی سیاہ قمیص پر شفون کا باریک سیاہ دوپٹہ کاندھے پر ڈالے رسٹ واچ باندھتی باہر آئی تھی۔

''مجھے صبا کے گھر چھوڑ آؤ گے؟''

اس کے آنے پر ایک دھیمی مسحور کن خوشبو پوری فضا میں پھیل گئی تھی۔ وہ کوئی بہت ہی عمدہ پرفیوم استعمال کرتی تھی۔

عثمان نے خوش گواریت کے بھرپور احساس کے ساتھ اسے دلچسپی سے دیکھا۔ ڈارک براؤن لپ اسٹک سے سجا اس کا چہرا سورج کی آخری کرنوں سے سنہری ہو رہا تھا۔ کروشیے کی سیاہ قمیص میں ملبوس خوش نما سراپا جا بجا اپنی بہاریں دکھلا رہا تھا۔

''جب آپ کی اپنی ذاتی سروس موجود ہے، تو مجھ غریب کو بے آرام کرنے سے کیا حاصل؟'' اس نے کن انکھیوں سے عثمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے حاضرین پر ایک نگاہ ڈالی۔

''کیا مطلب؟'' ماتھے پر ایک شکن ڈال کر اس نے پوچھا تھا۔

''اس کی مراد مجھ سے ہے۔'' انہوں نے پرسکون لہجے میں کہا تھا۔

''اوہ آپ کب آئے؟'' اس نے قدرے کونے میں بیٹھے عثمان کو دیکھا۔

''ابھی کچھ دیر ہوئی!'' وہ مسکرائے۔

''لیکن آپ تو تھکے ہوئے ہوں گے۔'' اس نے رسماً کہا تھا۔

''جی نہیں۔ تھکن تو اتر چکی ہے!۔'' ان کا لہجہ معنی خیز تھا۔

عدنان نے برابر بیٹھے کاشف کو کہنی مارنی چاہی، جو کہ سیماب کو لگی۔ اس نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

''اچھا! ڈراپ کریں گے مجھے؟'' اس نے جیسے کنفرم کرنا چاہا۔

''جی نہیں۔'' وہ مسکرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''میں صبا کے گھر چھوڑ آتا ہوں آپ کو۔''

''میں سمجھ نہیں پائی۔ اس بیک وقت انکار اور اقرار کا مطلب؟'' وہ ہنسی تھی۔

''سمجھنے والے سمجھ گئے۔ جو نہ سمجھے وہ اناڑی ہے۔'' عدنان گنگنایا تھا۔

''چلیے پھر۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

دونوں ساتھ ساتھ چلتے پورچ کی جانب چلے گئے۔

''امی۔'' عدنان نے بھائی کے تاثرات کا بغور معائنہ کیا تھا۔

''جی بیٹا۔ عاصمہ چچی اپنی گفتگو سے چونکی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ اب بھائی کی شادی ہو جانی چاہیے۔''

''واہ۔'' مہوش خوشی سے اچھلی۔ ''زبردست خیال ہے۔ کتنا مزا آئے گا عشان بھائی اور الماس باجی کی شادی میں۔''

''کیوں راشدہ؟''۔ عاصمہ چچی نے مسکراتے ہوئے دیورانی کو مخاطب کیا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں بچے!''

''میں بھی اسی سوچ میں ہوں۔'' وہ پُر خیال انداز میں گویا ہوئیں۔ ''بس ذرا مہناز والا معاملہ سیٹ ہو جائے تو دونوں ذمہ داریوں سے ایک ساتھ سبکدوش ہو لوں۔''

''کیا ہے امی۔'' مہناز قدرے جھنجلا کر بولی تھی۔ ''آپ نے تو میرے رشتے کو اپنے اعصاب پر سوار کر لیا ہے۔ جب قسمت میں لکھا ہو گا ہو جائے گا۔ آپ الماس کی شادی کر دیں۔''

وہ الماس کی بڑی بہن تھی، اور شکل وصورت میں اس سے ذرا مماثلت نہ رکھتی تھی۔ دونوں بہنوں میں اس درجہ فرق تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ یہ ذکر نکلنے پر بھی کبھار بے تحاشہ جز بز ہو جایا کرتی تھی۔ مہوش بھی الماس کی نسبت مہناز سے زیادہ مماثل تھی۔ لیکن چونکہ ابھی چھوٹی تھی اور قدرے پُر اعتماد بھی، لہٰذا وہ ایسے کسی بھی احساس سے بری تھی۔

مہناز کچھ دیر بعد اُٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔

''امی! آپ باجی کے سامنے یہ ذکر نہ چھیڑا کریں۔'' کاشف نے بردباری سے ماں کو سمجھایا۔

''وہ فیل کرتی ہیں۔''

''بیٹا! میں تو پوری کوشش کرتی ہوں، لیکن جب یہ ذکر اس کے سامنے نکل ہی آئے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ اور پھر اس نے بلاوجہ یہ احساس کمتری کا روگ پالا ہوا ہے۔ بھلا کیا کمی ہے مہناز میں۔ ذرا سی رنگت ہی تو دبتی ہے الماس کے مقابلے میں۔''

''خدا نے چاہا تو جلد ہی اس کا رشتہ بھی کہیں نہ کہیں طے پا جائے گا۔'' عاصمہ چچی نے دیورانی کو تسلی دی۔ ''وہ کیپٹن والے رشتے کا کیا بنا؟''

''بس ایک ہی مرتبہ آئے تھے وہ لوگ۔ تمہارے سامنے ہی ساری بات ہوئی۔''

''پھر فون نہیں آیا؟''

''آتا تو کیا تمہیں نہ بتاتی۔'' انہوں نے جٹھانی کو شکایت بھری نظروں سے دیکھا۔

''خدا خیر کرے گا۔'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''میں وضو کر لوں۔ مغرب ہونے والی ہے۔''

راشدہ بیگم بھی ان کی تقلید میں کھڑی ہوئی تھیں۔



''کیا بات ہے، آج کل آپ کسی سوچ میں گم نظر آتی ہیں۔'' گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے عثمان نے ایک نظر برابر بیٹھی الماس پر ڈالی۔

''آج کل؟'' اس نے بھنویں اُچکا کر انہیں دیکھا۔

''جی ہاں۔ میرا خیال تو یہی ہے، ہو سکتا ہے غلط ہی ہو۔'' وہ مسکرائے۔

''میں تو ہمیشہ سے ہی کم گو رہی ہوں۔'' وہ بھی ہولے سے مسکرا دی۔

''بالکل۔ لیکن خاموش رہنے اور کسی خیال میں کھوئے رہنے میں خاصا فرق ہوتا ہے، جو بخوبی محسوس بھی کیا جا سکتا ہے۔

الماس کی خوبصورت کانچ جیسی چمکیلی آنکھوں میں اُلجھن بھر گئی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی تھی۔

''میں؟'' پھر اس نے دریافت کیا۔ ''میں آپ کو کسی سوچ میں گم نظر آتی ہوں؟''

''جی ہاں!'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کچھ عرصے سے؟'' وہ جانے کیا جاننا چاہتی تھی۔

''ہوں!'' وہ مسکرائے۔

''کسی اُلجھن کا شکار لگتی ہوں؟''

عثمان دھیرے سے ہنس دیے۔

''اس قدر پریشان کیوں ہو گئی ہیں آپ؟ کوئی اُلجھن واقعی درپیش ہے آپ کو؟ اگر ہے تو آپ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی پریشانی شیئر کر سکتی ہیں۔''

انہوں نے ایک نگاہ پھر اس پر ڈالی۔

وہ اب خاموش ہو کر کسی سوچ میں گم ہو گئی تھی۔

''الماس۔!''

''جی؟ کہیے!'' وہ چونکی۔

''مجھے ایسا لگتا ہے آپ کچھ پریشان ہیں۔'' انہوں نے اس کے تاثرات کو نوٹ کیا۔

''نہیں۔'' وہ فوراً مسکرا اٹھی تھی۔ ''میں قطعاً پریشان نہیں ہوں۔ نہ ہی کسی اُلجھن کا شکار ہوں۔''

فضا مترنم ہو گئی۔ عثمان نے ایک گہرا سانس بھر کر سیٹ کی پشت پر ٹیک لگائی۔

''واپسی پر لے لوں آپ کو؟'' وہ اترنے لگی تو انہوں نے پوچھا۔

اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔

''نہیں تھینک یو۔!'' پھر وہ بولی۔ ''صبا مجھے چھوڑ دے گی، خدا حافظ!''

وہ اتر کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔

''اللہ حافظ؟''۔''وہ دھیرے سے بولے۔

جب تک وہ گیٹ پر کھڑی رہی، وہ گاڑی روکے اس کے کاندھوں پر پھیلے سلکی بالوں کو دیکھتے رہے پھر گیٹ کھل جانے پر گاڑی بڑھا کر آگے لے گئے۔



''الماس!'' وہ اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی تھی۔

''یقین نہیں آرہا اپنی آنکھوں پر۔ بدتمیز لڑکی کیا نہ آنے کی قسم کھائی تھی تم نے؟'' وہ مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

''کس کے ساتھ آئی ہو؟'' صبا نے دریافت کیا۔

''عثمان چھوڑ کر گئے ہیں۔''

''رئیلی!'' صبا کی آنکھیں چمکیں۔''انہیں بھی اندر بلا لیتیں ناں۔ میں ان سے ملواتی۔''

''پھر کبھی سہی۔'' اس نے شانے اچکا دیے۔

''سچ الماس۔! میں بہت یاد کر رہی تھی تمہیں۔'' وہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔

''اتنی ڈھیر ساری باتیں کرنی تھیں تم سے۔''

''میں بھی تو اسی لیے آئی ہوں۔'' الماس سینڈل اتار کر بیڈ پر نیم دراز ہوگئی۔''صبا! مجھے مشورہ دو۔ میں پہلے بھی تم سے اس سلسلے میں بات کر چکی ہوں۔ ایک بار پھر کرنا چاہتی ہوں۔'' صبا لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ الماس کیا بات کرنا چاہ رہی ہے۔

''وہی رضا صاحب والا معاملہ ہے؟''

''ہوں!'' الماس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم نے پھر فون کیا تھا؟''

''میں نے نہیں۔ اس نے کیا تھا۔ صبا! وہ مجھ سے پھر ملنا چاہتا ہے۔ اس تعلق کو بڑھانا اور برقرار رکھنا چاہتا ہے۔''

''اور تم؟ تم کیا چاہتی ہو؟'' صبا نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''الماس تذبذب کا شکار ہوگئی تھی۔

''میں۔!'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔''پتا نہیں صبا، میں کیا چاہتی ہوں۔ شاید میں خود بھی نہیں جانتی؟''

''تو پھر کوئی بھی فیصلہ مت کرنا۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ درحقیقت تم کیا چاہتی ہو، اور جب یہ سمجھ لو تو پھر پہلے یہ فیصلہ کرنا کہ جو کچھ تم چاہ رہی ہو آیا وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ الماس! تم کسی بھی مشکل کا شکار ہو سکتی ہو۔''

''الماس مسکرا دی۔''اتنا سیریس مت لو۔''

''کیوں۔یہ بات مذاق میں اُڑا دینے والی تو ہرگز نہیں ہے نجانے کیا ہو، کیسا ہو، کیوں ان جھمیلوں میں پڑتی ہو میری دوست۔کیا کمی ہے تمہیں۔''

صبا اُلجھ کر رہ گئی تھی۔

''نجانے کیا مشکل ہے!''الماس اپنے لیے اس کی پریشانی دیکھ کر ہنس دی۔''شاید یہی مشکل ہے کہ کوئی مشکل نہیں۔''

صبا چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں!''اس نے سر جھکا لیا۔''ایسے ہی کچھ یاد آ گیا تھا۔''

دراصل اسے الماس کی باتیں یاد آ گئی تھیں، جو وہ صبا کو تنبیہہ کے طور پر کیا کرتی تھی۔اور کبھی کبھی صبا کو ان باتوں سے بڑا خوف محسوس ہوا کرتا تھا۔اسے ایسا لگتا جیسے وہ واقعی تباہیوں کے دہانے پر کھڑی ہو، اور آج اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے الماس اپنی ہی کہی ہوئی باتیں بھول کر خود تباہیوں کی سمت بڑھ رہی ہو۔

وہ اسے روکنا چاہتی تھی۔لیکن وہ جانتی تھی الماس اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کے جملہ اختیارات اپنے قبضے میں رکھتی تھی۔

''کیا سوچنے لگی ہو؟''الماس نے اُکتا کر اس کی صورت دیکھی۔''شاید تم اس بات کو پسند نہیں کرتیں، اور اس موضوع پر بات بھی نہیں کرنا چاہتیں۔خیر، جانے دو۔میں اس اُلجھن کو خود ہی سلجھا لوں گی۔تم اپنی سناؤ کیسی گزر رہی ہے۔''

''راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔''وہ مسکرا دی تھی۔



اُبٹن گھول کر اس نے اپنا ہاتھ غور سے دیکھا اور اس میں آتی خوشبو کو محسوس کیا۔کیسی خوشبو تھی۔ارمانوں سے بھری۔آرزوؤں کو جگاتی۔

سر جھٹک کر وہ اپنا ہاتھ کپڑے سے صاف کرنے لگی

''نیلی بجو۔اُبٹن دے دیں۔''

ریشم گوٹے سے سجا زردو پٹہ شانوں پر پھیلائے خوش خوش اس کی سمت آئی تھی۔نیلم نے تھال اسے تھما دیا۔

''چلیں ناں بجو!باہر صحن میں اتنا مزا آ رہا ہے۔''

''تم چلو۔میں شبنم کے پاس ہوں۔''

اس نے بات مکمل کر کے نگاہ اس پر جمائی تھی۔

کانوں پر پڑے چاندی کے جھمکے ہلاتی وہ تھال لے کر مڑ رہی تھی۔

"یہ ریشم!" نیلم جیسے سانس لینا بھول گئی تھی۔ "یہ اتنی بڑی ہو گئی ہے اور مجھے خبر ہی نہیں۔ اتنی بھرپور، اتنی دل آویز!"

وہ دیکھتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی تھی۔ ریشم جا چکی تھی، لیکن اس کا مکمل وجود اب تک نیلم کی نگاہوں میں تھا اس نے تو کبھی ریشم پر غور بھی نہ کیا تھا۔ وہ کیسی ہے، کیسے کپڑے پہنتی ہے، وہ پٹہ ڈھنگ سے اوڑھتی بھی ہے یا نہیں۔ اس پر تو یہ انکشاف ابھی۔ اچانک ہی ہوا تھا۔ کہ وہ ریشم، جسے وہ اب تک چھوٹی سی بچی سمجھ کر لاڈ پیار میں اٹھاتی ہے، ایک مکمل، جاذب نظر سراپے میں ڈھل چکی ہے۔ اس کا چہرہ کسی نو عمر بچی کا نہیں، ایک نوجوان خوبصورت لڑکی کا چہرا ہے۔

"بجو۔" مریم اندر آئی تھی۔ "باہر چلیں ناں۔"

"تم چلو مریم۔ میں شبنم کے پاس ہوں۔ وہ اکیلی رہ جائے گی ناں۔"

وہ گہرا سانس بھر کر خیالوں سے باہر آئی۔

مریم اسے بغور دیکھتے ہوئے باہر چلی گئی۔ صحن سے لڑکیوں کے گیت گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر بیٹھی ان گیتوں کے بولوں کو سنتی رہی، پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گئی۔

شبنم زرد لباس میں ملبوس، اماں سے لپٹی رو رہی تھی۔

"شبنم!" اس نے اسے اماں سے الگ کیا۔ "کیا کر رہی ہو۔ بری بات ہے یہ!"

"بجو! کتنا برا کیا ہے ناں آپ لوگوں نے میرے ساتھ۔" وہ بلک رہی تھی۔ "مجرم لگ رہی ہوں اپنے آپ کو۔"

"کیا بے وقوفی ہے، کیا حماقت ہے؟" اس نے شبنم کو خود سے لپٹا لیا۔ "ایسا الٹا سیدھا کیوں سوچ رہی ہو۔ شادی ہے تمہاری۔ اچھی اچھی باتیں سوچو، فریش رکھو خود کو۔"

"بجو۔ یہ کپڑے تو آپ کے لیے بنے تھے ناں۔ اس دوپٹے کو میں نے آپ کے لیے سجایا تھا۔"

"ختم کرو۔ بھول جاؤ ان باتوں کو۔ نہ تو کوئی کسی دوسرے کے حصے میں لکھا ہوا نوالہ چھین سکتا ہے، نہ کسی کی ہتھیلیوں پر کھنچی لکیروں کو اپنے ہاتھ پر سجا سکتا ہے۔ سمجھیں تم! یوسف سے شادی تمہاری قسمت تھی۔ اس لحاظ سے یہ سب چیزیں تمہارے لیے بنی تھیں۔ بس ہم لوگ ہی غلط فہمی کا شکار رہے۔"

"آپ۔ آپ قسم کھائیں۔ آپ خوش ہیں ناں۔" اس نے آنسو پونچھ کر غور سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔ میں بہت خوش ہوں شبنم۔ وقار بھائی کے بعد تم سب کی ذمہ داری میں نے پوری دیانت اور سچائی کے ساتھ قبول کی ہے، اور میں بہت خوش ہوں کہ سب سے پہلی ذمہ داری سے اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے سبکدوش ہو رہی ہوں۔ رہا یوسف کا معاملہ، تو وہ بہت اچھے انسان ہیں، بہت خیال رکھیں گے تمہارا، لیکن یقین جانو شبنم، اب میرا دل انہیں کسی طور قبول نہ کرتا۔ مجھے خوشی ہے کہ ان کی شادی تم سے ہو رہی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے سے بہت جلدی مانوس ہو جاؤ گے۔ اور پھر دیکھنا کتنی خوشگوار زندگی گزرے گی تمہاری انشاءاللہ۔"

شبنم قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ نیلم اس کے پاس بیٹھی رہی۔ اماں بھی گزشتہ دنوں کی نسبت آج کافی پرسکون لگ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر وہ وحشت آج مفقود تھی۔ جو وقار بھائی کے بعد مستقلاً اپنا ڈیرہ جمائے ہوئے تھی۔ تینوں ماں بیٹیاں ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔

"بجو۔ اماں۔" ریشم نے اندر آ کر بچوں کی طرح شور مچایا۔

"وہ لوگ آ گئے ہیں شبنم آپی، پتا ہے یوسف بھائی خود بھی آئے ہیں۔"

شبنم نے خاموشی سے سر جھکا لیا اور نیلم کا دل اس زور سے دھڑکنے لگا۔ جیسے کوئی خشک پتا آندھیوں کی زد پر آ گیا ہو۔

یوسف کا سامنا اور وہ بھی ایسے نازک موقعے پر۔ اپنی بے بسی پر اسے رونا آنے لگا۔ وہ کہیں چھپ بھی تو نہیں سکتی تھی۔

"جاؤ بیٹی۔ اٹھو تم بھی تو جاؤ۔"

اماں نے اسے مخاطب کیا تو وہ اپنے خیالوں میں چلتی آندھیوں سے باہر آئی، اس نے دیکھا ریشم اور مریم جا چکی تھیں۔ شبنم اور اماں نیچے دری پر بیٹھی تھیں۔ اور وہ تنہا کھڑی اپنی سوچوں سے مخاطب تھی۔

اماں اسے عجب دکھ بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے وہ اس کے حال سے تھوڑی بہت نہیں بلکہ مکمل طور پر واقف ہوں۔

وہ جلدی سے نظریں چرا کر باہر نکل آئی۔

آمنہ اپنی سہیلیوں کے ہمراہ خوشی خوشی گانے گا رہی تھی۔ ساری لڑکیاں دائرہ بنا کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بیچ میں موم بتیوں سے روشن تھال رکھے تھے۔

ریشم اور مریم بھی دولہا والوں سے روایتی اختلافات بھلا کر ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ سب ایک دوسرے میں مگن تھے۔ کسی کی توجہ اس کی جانب نہ تھی۔ سکون بھرا سانس لے کر وہ ذرا سا پیچھے ہٹی اور دیوار کے پاس پہنچ گئی۔

"خوش ہو؟" کسی نے نہایت قریب سے مخاطب کیا تھا۔ وہ بری طرح چونکی۔

یوسف اس سے حد درجہ نزدیک کھڑے تھے۔ آنکھوں میں شکایت اور جہاں بھر کے گلے اور عجب بے بسی لیے وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے جلدی سے نظر جھکا لی۔

"جی!" وہاں سے ہٹتے ہوئے وہ جواب دینا نہ بھولی تھی۔ "حد درجہ خوش بھی ہوں، اور مطمئن بھی۔"

پھر وہ تیزی سے وہاں سے ہٹ کر لڑکیوں میں آ کر بیٹھ گئی۔ تالیاں بجا کر گانے والیوں کا ساتھ دینے لگی۔ لیکن دل کی حالت جیسے اس کے چہرے پر درج تھی

"بجو!" ریشم نے جھک کر اس کے کان میں کہا تھا۔ "کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔؟"

"ہاں۔" اس نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

"اتنا زرد چہرا؟ برسوں کی بیمار لگ رہی ہو۔"

''وہ خاموشی سے سب کے بیچ سے اُٹھ کر اندر آ گئی۔ یہاں آ کر اسے مزید پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔

یوسف اماں کے پاس بیٹھے تھے۔ شبنم اُٹھ کر دوسرے کمرے میں جا چکی تھی۔ اسے ناچار وہیں بیٹھنا پڑا۔

''وحیدہ کیوں نہیں آئی؟'' اماں پوچھ رہی تھیں۔

''امی! کل یونس بھائی کی سسرال گئی تھیں۔ وہاں انہیں اس قدر تھکن محسوس ہوئی، کہ بخار چڑھ گیا۔ اسی لیے انہوں نے آج گھر پر ہی رہ کر آرام کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ کل کی تقریب کے لیے کمر باندھ سکیں۔''

''وہ ڈھیر سارے ہنسے تھے۔ اس قدر چھپکی اور بے جان ہنسی نیلم نے پہلی مرتبہ ان کے لبوں پر دیکھی تھی۔ نجانے کیوں اسے قدرے سکون محسوس ہوا۔ اس کے دل کی دنیا اُجاڑ کر خوش وہ بھی نہ تھے۔

پھر اسے اپنی خوشی پر آپ ہی ڈھیروں ندامت ہوئی، وہ اس کی بہن کی زندگی میں حصہ دار بننے جا رہے تھے، ان کے دکھی ہونے کا مطلب شبنم کا دکھی ہونا تھا۔ اور ان کی خوشی درحقیقت شبنم کا سکون اور اطمینان تھی۔

''جاؤ بیٹی! تم شبنم کے پاس چلی جاؤ۔ وہ شاید رو رہی ہے!'' اماں نے اسے پھر سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر محبت سے کہا تھا۔

وہ اُٹھ کر باہر نکل گئی۔

''یوسف۔'' اماں نے انہیں نہایت رسان سے مخاطب کیا تھا۔

''جی۔ جی چچی جان!'' وہ جاتی ہوئی نیلم کی پشت پر جھولتی چوٹی کو دیکھ رہے تھے، سٹپٹا کر بولے۔

''بیٹا! جو کچھ ہوا اس پر بحث یا تبصرہ کرنے سے تو اب کچھ حاصل نہیں ہے۔ میں بس اتنا کہوں گی کہ ضد میں آ کر جو کچھ بھی تم نے کیا ہے، اس کے منفی اثرات شبنم پر نہ پڑنے پائیں، میری بچی کو دکھ مت دینا یوسف! نہ کبھی اس پر یہ ظاہر ہونے دینا کہ یہ تعلق محبت اور یقین کا نہیں محض ضد اور انتقام کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ جس سے تم بدلہ لینا چاہتے تھے، سو لے چکے۔ شبنم بے قصور ہے!''

اماں چپکے چپکے رو رہی تھیں۔

یوسف خاموشی سے بیٹھے لب کچلتے رہے۔ اُنہوں نے اماں کی ساری باتیں بغور سنی تھیں لیکن نہ اُنہوں نے ان کی کسی بات کی تردید کی نہ ہی تائید۔ وہ خاموش بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔

''بھائی!'' آمنہ، مومنہ کو لیے اندر چلی آئی۔ ''چلیے بھئی، دلہن کی بہنیں آپ کی منتظر ہیں۔ ہم لوگوں نے تو اپنا کام نپٹا لیا ہے۔''

''اس کے چمکتے چہرے سے خوشی عیاں تھی۔ شبنم اس کے بچپن کی دوست اور راز داں تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی کوئی بڑی خواہش پوری ہونے جا رہی ہے۔

یوسف اُٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل گئے۔ ان کی چال نہایت سست اور قدم بوجھل تھے جیسے جو کچھ بھی اُنہوں نے کیا اس پر اندر سے متاسف ہوں۔ پچھتا رہے ہوں۔

وہ بچھی ہوئی کرسی پر جا کر بادل نخواستہ بیٹھ گئے۔ ریشم اور مریم نے انعم کوان کی گود میں بٹھا دیا اور ہنسی مذاق کرتی رہیں۔ انہوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن وہ پھر انہیں آخر تک نظر نہ آئی۔



رات کافی بیت چکی تھی، پلنگ پر وہ ساکت لیٹی ایک اندرونی خلفشار کا شکار تھی۔ نہ دل کو سکون آ رہا تھا۔ اور نہ آنکھوں میں نیند تھی۔

آنے والی کل کا تصور اسے بے کل و بے چین کیے دے رہا تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ کیا ہوا تھا۔ کیا ہو رہا ہے، اور کیا ہوگا۔ لیکن وہ مسلسل شک اور اعصاب شکن وسوسوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ کچھ تھا جو اسے مطمئن نہ ہونے دے رہا تھا۔ وہ خوش ہونا چاہتی تھی۔ لیکن کچھ تھا جو اسے خوشی سے دور کر رہا تھا۔ جذبے آہستگی سے اُٹھتے، دل میں ایک ہلچل سی ہوتی پھر سب کچھ دب کر رہ جاتا تھا۔

''واوا'' اس کے برابر لیٹی نیلم نے نیند میں ایک آہ بھری اور کروٹ لے کر سیدھی ہوگئی۔

شبنم نے محسوس کیا، وہ سوتے میں مسلسل کسمسا رہی تھی، جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہو۔

''یوسف!'' وہ پھر بڑبڑائی تھی۔ ''کہاں جا رہے ہیں؟''

''شبنم اپنی ساری اُلجھنوں کو بھول کر حیرانی سے اس کی بڑبڑاہٹ کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

''مت جائیں یوسف۔ مجھے چھوڑ کر۔!''

وہ مٹے مٹے سے، ادھورے ادھورے سے لفظ بول رہی تھی۔ لیکن گہرے سناٹے میں شبنم کو سب کچھ بالکل صاف سمجھ میں آ رہا تھا۔

''ہاں۔ میں چاہتی ہوں آپ کو۔ میرا یقین کریں یوسف۔ میں چاہتی ہوں۔ کیوں دھوکا دیا مجھے، کیوں مان توڑا، کیوں۔ آہ۔!'' اس نے پھر کروٹ بدل لی تھی۔ پھر اس کے بعد وہ کچھ نہ بولی۔ شبنم اُٹھ کر بیٹھ گئی، اس کے اندر طوفان اُٹھنے لگے۔ اس کی سانسیں اتھل پتھل ہونے لگیں۔

''اتنا بڑا دھوکہ۔ بجو!'' وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے بیٹھی تھی ''میرا وجود رہ گیا تھا۔ ایک دوسرے سے انتقام لینے کے لیے؟''

''وہ اس کی نیند میں کہی باتوں پر غور کرتی رہی۔ خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی کہ جو کچھ نیلم نے نیند میں کہا اور جو کچھ اس نے جاگتے میں سنا، وہ محض ایک دھوکہ تھا۔ وہ صرف کسی ڈراؤنے خواب کا اثر تھا۔ اور کچھ بھی نہیں۔

لیکن وہ ایک لمحہ جو دلوں میں یقین بن کر اُترتا ہے۔ اس پر گزر کر آگے بڑھ چکا تھا۔ اسے پورا پورا یقین تھا کہ نیلم نے حالت اضطراب میں اپنے جذبات کی صحیح صحیح عکاسی کی ہے۔

باقی کی تمام رات جاگتے اور روتے گزری تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی نئی زندگی کی بنیاد جو کہ محض ایک لاحاصل ضد پر رکھی گئی ہے۔ اس پر وہ اپنا آشیانہ کس طرح اور کیوں کر تعمیر کر پائے گی۔

صبح اس نے چڑیوں کی چہچہاہٹ اور مؤذن کی آواز ایک ساتھ سنی اور آہستگی سے اُٹھ کر وضو کرنے چل دی۔



وہ گہری نیند میں تھی جب نجمہ خاتون نے اسے ہلایا۔

"صبا۔صبا بیٹی!"

"جی۔!" اس نے مندی مندی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ "کیا بات ہے امی؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"وہ شہروز آیا بیٹھا ہے۔ میں نے بتایا بھی کہ تم ابھی سوئی ہو،لیکن وہ کہہ رہا ہے کہ جگا دیں۔"

"اچھا!" وہ اُٹھ کر شانوں پر دوپٹہ پھیلانے لگی۔ "نجانے کیا بات ہے!"

وہ بال سمیٹتی ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔

"روم جل رہا تھا اور نیرو! بانسری بجا رہا تھا کم بخت! وہ اسے دیکھ کر بھنایا

"کیا مطلب؟" وہ ابھی بھی نیند کے زیر اثر تھی۔

"بند کیجیے یہ جمائیاں لینا۔غضب خدا کا۔میرے حقوق پر اس طرح سے دن دہاڑے ڈاکہ پڑے تو میری نیند ساری زندگی کے لیے اُڑ جائے اور محترمہ قیلولہ بھی فرماتی ہیں!"

"شہروز!" اسے ہنسی آ گئی۔ "بھائی میرے! کبھی تو کوئی آسان،سیدھی،آسانی سے سمجھ میں آ جانے والی بات کر لیا کرو۔کیا غضب ہو گیا ہے؟"

"لو جی! انہیں ابھی کچھ علم ہی نہیں!" اس نے منہ بنایا۔ "ارے صبا بیگم! امی حضور کی جانب سے نہایت شاندار شعر آیا ہے۔۔جواب دیجیے ورنہ ہار جائیں گی آپ!"

صبا چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔جانتی تھی، ابھی خود سے ہی سیدھی بات کرے گا۔

"وہ عدد دو شیزائیں،قد تقریباً پانچ فٹ پانچ انچ،رنگ گورا،بال لانبے،آنکھیں کجراری،ناک متوالی،سلیقہ مند،باشعور،اعلیٰ تعلیم یافتہ، ہم عمر،ہم وزن،ہم بحر،ہم قافیہ!"

وہ بات مکمل کر کے معصومیت سے اسے دیکھنے لگا۔

صبا نے لبوں میں ہنسی دبائی اور سنجیدگی سے اسے دیکھتی رہی۔

"لاہور سے برآمد ہو کر یہاں درآمد کی جا چکی ہیں" وہ مزید بولا۔ "نبیلہ و عقیلہ برائے بہروز و فیروز!"

"اوہ۔!" وہ پوری بات سمجھ گئی۔

"جی!" وہ زور دے کر بولا۔ "اشارے کنائے نہ کرتی ہیں نہ سمجھتی ہیں۔ارے عشق کرنے والوں کی تو ایسی صورت ہی نہیں ہوتی جیسی آپ کی ہے!"

"پھر کیسی ہوتی ہے،تمہاری صورت جیسی؟" وہ اپنے ناخن دیکھنے لگی۔

''ارے صبابی بی! خدا وہ دن جلد دکھائے، جب ہمیں کسی سے عشق ہو جائے۔ پھر ہم آپ کو بتائیں گے کہ یہ کیا ہوتا ہے اور کیسے کیا جاتا ہے۔ ایسا دھواں دار، زوردار زنّاٹے دار عشق کریں گے اور ڈنکے کی چوٹ پر کریں گے کہ دنیا دیکھے گی!''

''ان منصوبہ بندیوں سے آگاہ کرنے کے لیے ہی نیند میں مخل ہوئے ہیں آپ میری؟'' اس نے قدرے اُکتا کر کہا۔ ''یہ سب کچھ تو میں سنتی ہی آئی ہوں اور سنتی رہوں گی!''

''لاحول ولا قوۃ۔ یعنی حد ہو گئی۔ صبابی بی! اچھا ہوا جو پتھر ٹکرایا ہے یعنی میں سر مار مار کر لہولہان کر لیتا ہوں اور آپ پر اثر نہیں ہوتا۔ میں غریب بندہ ان ہم قافیہ بجنوں کو دیکھ کر محض آپ کی محبت میں اپنی نیندیں اُڑا چکا ہوں اور آپ فرما رہی ہیں کہ میں آپ کی نیند میں مخل کیوں ہوا؟ جائیے جا کر آرام سے سو جائیں، اور جب جاگیں تو ذرا اپنے ٹیرس پر جا کر ہمارے لان میں ضرور جھانکیے گا۔ تب کہیں جا کر آپ کی عقل شریف میں یہ بات آئے گی کہ میں آپ کی نیند میں مخل کیوں ہوا ہوں۔''

وہ اٹھا اور اسے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ لب کاٹتے ہوئے کچھ سوچتی رہی جو کچھ وہ کہہ گیا تھا۔ وہ پوری طرح سے سمجھ چکی تھی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ شہروز کی طرح دھواں دار زوردار اور زنّاٹے دار عشق نہ کر سکتی تھی۔ اور نہ ہی کرنا چاہتی تھی۔ آہستہ سے کھڑی ہو کر وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔



''الماس!''

''جی؟'' اس نے لہروں پر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ ''کہیے؟''

''کبھی کسی سے محبت کی ہے آپ نے؟''

''وہ دھیرے سے ہنس دی۔ ہوا سے بکھرتے بالوں کو سمیٹ کر ایک طرف ڈالا اور گلاسز اُتار کر برابر میں رکھ لیے۔

''نہیں۔!'' پھر وہ بولی ''کبھی بھی نہیں۔ اور شاید کبھی کر بھی نہ پاؤں۔''

''کیوں؟'' اس نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

''اس لیے کہ جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے، محبت کے جذبے میں محبّ سے زیادہ محبوب کا کمال ہوتا ہے۔ کسی کی شخصیت اتنی مکمل، اتنی پر کشش ہوتی ہے کہ انسان سب کچھ بھول کر صرف اسی ایک شخص کی ذات سے وابستہ ہو جانے کی کوشش کرتا ہے!''

''ہوں۔!''

''اور اس کے مقابلے میں اپنی ذات کی نفی کر دیتا ہے۔ خود کو مکمل طور پر فراموش کر ڈالتا ہے۔''

''جی۔ بالکل۔!''

''مسئلہ یہ ہے رضا صاحب! کہ اپنی ذات کو فراموش کرنا مجھے نہ آتا ہے نہ کبھی آئے گا۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو بچھاری نہیں، دیتا

بننا پسند کرتے ہیں۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں۔" وہ ہنس دیا۔ ہر کوئی دیوتا بننا ہی پسند کرتا ہے۔ بھلا اپنی پوجا کروانا کس کو برا لگے گا۔ اصل بات ہی یہی ہے کہ کوئی شخصیت ایسی ٹکراتی ہے کہ انسان اپنی انا کے استھان سے اُتر کر پجاریوں کی صف میں ازخود شامل ہو جاتا ہے۔!"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ کہ محبوب کو اتنا پاورفل ہونا چاہیے کہ محبت کرنیوالا خود کو کمزور محسوس کرے۔ اور مجھے خود کو کمزور یا کمتر محسوس کرنے کے خیال ہی سے سخت کوفت ہوتی ہے۔ میں اپنے آپ کو کسی دوسرے کے مقابلے میں سرنگوں نہیں کر سکتی اور جو لوگ جھکنا نہیں جانتے، وہ بھلا کسی سے محبت کیسے کر سکتے ہیں۔؟"

"گڈ!" وہ مسکرا دیا۔ "اتنا غرور؟"

"آپ غرور کہہ لیجیے۔ میں تو اسے اپنی ذات کی سب سے بڑی خوبی سمجھتی ہوں۔"

"ظاہر ہے!" وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ "بھلا ایک مغرور شخص یہ کیسے تسلیم کرے گا کہ وہ مغرور ہے۔ وہ تو اسے اپنی ذات کی خوبی ہی گردانتا ہے!"

"الماس نے قدرے برا مان کر اس کی جانب دیکھا۔

"ایسے مت دیکھا کیجیے!"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں خود کو اتنا پاورفل نہیں سمجھتا۔ میں بڑا کمزور سا بندہ ہوں۔"

الماس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"آپ کے والد آپ لوگوں کے ساتھ نہیں رہتے؟"

"نہیں! وہ باہر ہوتے ہیں۔ کیوں؟ آپ کو یہ خیال کیسے آ گیا؟"

"بس یونہی، اس روز آپ اپنی فیملی کے بارے میں بتا رہی تھیں تو میں نے سوچا تھا کسی روز پوچھوں گا آپ سے!"

"ایک بات بتا دوں رضا صاحب! میں اپنی فیملی سے متعلق گفتگو پسند نہیں کرتی۔"

"اوہ۔ آئی ایم سوری!" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "کوئی خاص وجہ؟"

"وجہ بتانا بھی فیملی پر گفتگو کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔" وہ مسکرائی۔ "اب چلیں؟"

"پھر کب ملیں گے؟"

"پتا نہیں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ "آپ کو الوداع کہتے ہوئے مجھے یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ اب میں آپ سے دوبارہ ملوں گی بھی یا نہیں۔ پھر وقت کا تعین کیسے کر سکتی ہوں؟"

''کیوں؟'' اس کی نظروں میں اُلجھن اُبھری۔ ''ایسا کیوں سوچتی ہیں آپ؟''

''پتا نہیں۔ بہرحال میں ہر مرتبہ ایسا محسوس کرتی ہوں جیسے یہ ہماری آخری ملاقات ہو، میں بہت عجیب سی لڑکی ہوں، مجھ سے کبھی بھی کوئی غلط توقع وابستہ مت کیجیے گا۔ چلیے میں آپ کو ڈراپ کر دیتی ہوں۔''

دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

''کوئی آپ سے پوچھتا نہیں ہے کہ آپ کس سے ملنے جاتی ہیں؟''

''امی میرا اکیلے نکلنا پسند نہیں کرتی، ویسے تو میں کسی نہ کسی کے ساتھ ہی کہیں آتی جاتی ہوں۔ لیکن آپ سے ملنا ہو تو میں عموماً شان سے گاڑی لے آتی ہوں۔ وہ مجھے نہ گاڑی دینے سے انکار کرتے ہیں نہ اکیلے باہر نکلنے سے۔''

''بہت چاہتے ہوں گے آپ کو!''

''پتا نہیں!'' اس نے کاندھے اچکائے۔ ''میں کیا کہہ سکتی ہوں، اُنہوں نے کبھی اظہار نہیں کیا کہ وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ اور چاہتے بھی ہیں یا نہیں۔''

''بڑی زیادتی ہے یہ تو آپ کے ساتھ!'' وہ مسکرایا۔ ''یا وہ خوش ذوق نہیں!''

وہ دھیرے سے مسکرا دی تھی۔



بالوں پر پراندہ ڈالتے ہوئے نیلم اپنے عکس کو آئینے میں غور سے دیکھ رہی تھی۔ گہرے نیلے لباس میں اس کی رنگت واضح طور پر پیلاہٹیں لیے ہوئے۔ ہونٹوں پر سجی گلابی لپ اسٹک بھی اس کے چہرے کو تازگی کا احساس بخشنے سے قاصر تھی۔

"بجو!" ریشم بھی سنوری اندر داخل ہوئی۔ "چلیے ناں! بارات آنے ہی والی ہے۔"

"ہوں!" وہ محض اتنا ہی کہہ سکی۔

ریشم نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور پھر خاموشی سے باہر نکل گئی۔

"جو قربانیاں دیتے ہیں وہ خود کو یوں رحم کا نشانہ نہیں بناتے!"

کسی نے اس کے اندر چپکے سے کہا تھا۔ نجانے کیوں اس کی پلکیں بھیگی تھیں۔ وہ خود بھی صحیح وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

خود پر قابو پا کر وہ دوسرے کمرے میں آئی تو سرخ لباس میں شبنم نظریں جھکائے بیٹھی تھی، اس نے سب کے اصرار کے باوجود میک اپ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ محض لپ اسٹک لگا کر ماتھے پر چھوٹا سا ٹیکہ سجا لیا تھا۔ اس سادگی میں بھی نجانے کہاں سے اس پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا۔

نیلم نے بے ساختہ بڑھ کر اسے گلے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اپنے جذبات کی بے ساختگی اور روانی میں اسے یہ محسوس نہ ہو سکا تھا کہ دوسری جانب سے کسی بھی قسم کی جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تھا۔ شبنم کسی بت کی مانند ساکت تھی۔

"بجو! شبنم آپی! بارات آگئی ہے!"

"مریم پر جوش انداز میں اندر داخل ہوئی۔

"اچھا!" نیلم آنکھیں صاف کرتی کھڑی ہوئی۔ "چلو باہر چل کر خواتین کا استقبال کریں۔"

"کس بات پر رو رہی ہیں بجو۔؟" دیوار پر نگاہیں جمائے وہ سوچ رہی تھی۔

"بہن کے رخصت ہونے پر، اپنی آرزوؤں کی سیج پر کسی اور کو بٹھا کر، یا اپنی ضد پر بہن کو قربان کرنے پر، ان آنسوؤں کی درحقیقت کیا وجہ ہے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد نکاح پڑھا دیا گیا۔ شبنم نے نہایت خاموشی اور سنجیدگی سے بنا آنسو بہائے نکاح نامے پر دستخط کر دیے تھے۔

"شبنم آپی کا رویہ نارمل نہیں لگتا!"

"مریم نے ریشم کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"کیا مطلب؟" اس نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے آنکھیں پٹپٹائیں۔ "کیا کر رہی ہیں وہ؟"

"تم تو واجد درجے کی کھامڑ ہو ریشم!" وہ ہنس دی۔

تصویریں بنوانے کے لیے یوسف کو لا کر شبنم کے پہلو میں بٹھایا گیا تو کونے میں کھڑی نیلم چپکے سے باہر نکل گئی۔

"نیلی بجو!" ریشم نے اسے پکارنا چاہا تھا۔

''شی!'' مریم نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

وہ باہر آ کر نسبتاً پرسکون گوشے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ ادھر ادھر دیکھ کر اس نے اپنے آنسو پونچھے اور قریبی میز پر رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

''نیلم۔!'' اس نے اپنے پیچھے عنبرین کی آواز سنی مگر مڑ کر نہیں دیکھا۔

''یہاں کیوں کھڑی ہو؟'' وہ اس کے مقابل آ کر کھڑی ہوئی۔ ''اندر چلو نا!''

''اندر گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔'' اس نے بمشکل خود پر قابو پا کر جواب دیا تھا۔

''کیوں؟''

''نجانے کیوں نیلم کو ایسا لگا جیسے اس نے طنزیہ مسکراہٹ کو لبوں میں دبایا تھا۔

''لوگ زیادہ ہیں ناں اس لیے!'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''بہت سے لوگوں کی وجہ سے گھٹن ہو رہی ہے یا محض ایک شخص کی موجودگی سے؟'' نیلم نے نگاہوں میں اُلجھن بھر کر اسے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے، اب تمہیں یوسف بھائی کو اپنے بہنوئی بلکہ بھائی کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے، ایسے نہیں سوچو گی تو گھٹن تو ہو گی ہی۔!''

نیلم بہت ٹھنڈے مزاج کی لڑکی تھی لیکن اس وقت اس کا دل چاہا کہ وہ تھپڑ مار کر اس کا چہرہ بگاڑ دے۔

''کیا فضول باتیں کر رہی ہو عنبرین۔ انسان کو سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیے!'' اس نے سرد لہجے میں کہا تھا۔

''بگڑ کیوں رہی ہو۔ یہ تو میں تمہارے ہی بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ آخر میں تمہاری دوست ہوں۔ اچھا خیر اب میں چلتی ہوں۔ پھر آؤں گی!''

اس نے سر ہلا دینے پر اکتفا کیا۔

''لوگ جان بوجھ کر کسی کو دُکھ کیسے پہنچا لیتے ہیں!'' اس نے سوچا تھا۔

رخصتی کا وقت آیا تو وہ تمام تر کوششوں کے باوجود خود پر قابو نہ پا سکی اور شبنم سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''کیوں جی۔ یہ کس بات کے آنسو ہیں۔'' کسی حس مزاح سے عاری شخص نے غالباً سب کو ہنسانے کی کوشش کی تھی۔ ''بہن کی رخصتی کے یا خود یوسف میاں کی دلہن نہ بن سکنے کے غم کے!''

نیلم جھجک کر شبنم سے علیحدہ ہو گئی۔ ساتھ ساتھ چلتے یوسف سے اس کی نظریں ٹکرائیں تو اس کی حالت مزید غیر ہونے لگی، کیا تھا ان نگاہوں میں؟ شکوہ، تاسف، پچھتاوے، دُکھ کے سائے۔

وہ تیزی سے سب کے درمیان سے نکلتی ہوئی اندر چلی گئی۔



"خدا نے میرا ارمان پورا کیا!" وحیدہ چچی نے اس کا سر چوما۔ "خوش رہو بیٹی! سدا سہاگن رہو۔ پانی پھر گیا تھا میری امیدوں پر، جب یوسف نے نیلم سے منگنی کی ضد کی تھی۔ شکر ہے مولا تیرا تو نے میرے بیٹے کو سیدھا راستہ دکھایا۔!"

"سر جھکائے بیٹھی شبنم پر سے سات سمندروں کا پانی گزر رہا تھا۔ ایک مدھم سی آس کی جوت جو دل کے کسی کونے کھدرے میں روشن تھی، تیز ہوا کے ایک جھونکے سے بجھی اور دل کی دنیا میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔

"امی!" آمنہ نے بھنا کر کہا تھا۔ "چلیں آپ آرام کریں۔"

"ارے ہاں۔ اب میں چلوں۔" وہ بمشکل کھڑی ہوئیں۔ "سلامیاں ولامیاں صبح دیکھی جائیں گی، بہت دیر ہو چکی ہے۔!"

"اپنا عیم شحیم وجود گھسیٹتی وہ باہر نکل گئیں۔

"شبنم!" آمنہ نے جھک کر اس کے گھونگھٹ میں جھانکا۔ "امی کی باتوں کو سنجیدگی سے مت لینا۔ تمہیں بہو کے روپ میں دیکھ کر خوشی سے نجانے کیا اول فول بول رہی ہیں۔"

اس نے نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

"اچھا میں چلتی ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو دروازہ بجا دینا!"

"وہ باہر نکل گئی۔ وہ کافی دیر تک اسی حالت میں کمرا کڑائے بیٹھی رہی۔ پھر اس نے جیسے تھک کر تکیے سے ٹیک لگائی۔

سامنے دیوار پر لگی گھڑی رات کے ڈھائی بجا رہی تھی۔



بالکونی میں کھڑے، وہ دور چمکتی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں تھے۔ انگلیوں کے درمیان سلگتا ہوا سگریٹ دبا ہوا تھا۔ یہ دبا بھی پچھلے چند نہایت اذیت میں گزارے ہوئے دنوں کی دین تھی ورنہ انہوں نے زندگی میں کبھی دھواں دیتی، سلگتی چیزوں کا تصور نہ کیا تھا۔ انہیں تو زندگی سے بھرپور مسکراتی، زندہ رہنے کی امنگیں جگاتی چیزوں سے پیار تھا۔

جیسی اس کی آنکھیں تھیں! ایک بوجھل سانس بھر کر انہوں نے اپنا سر دیوار سے ٹکا دیا۔ وہ سیاہ جگمگاتی آنکھیں بھلا وہ بھول سکتے تھے۔ ان آنکھوں میں دُنیا دیکھنے کی خواہش تو انہوں نے پل پل کی تھی۔ اس خواہش کے آکٹوپس نے تو ان کے دل کی گہرائیوں تک رگ رگ کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ اسے کیسے بھول سکتے تھے۔

"کس قدر سنگدل، کیسی سفاک۔" انہوں نے بے بسی سے لب کاٹے۔ "اس قدر معصوم۔ سادہ چہرا اتنا بے ضرر دکھائی دیتا وجود اور دل اس درجہ سخت۔ رکھنے والے نے بہت چن کر نام رکھا تھا۔ نیلم بی بی تمہارا۔ اور اس سنگ سے سر پھوڑنا میرا ہی مقدر ٹھہرا تھا۔"

ایک گہرا کش لے کر انہوں نے جلتا سگریٹ نیچے گلے میں پھینک دیا۔

"میری ریاضتوں، ساری عمر کی محبتوں اور چاہتوں کا کیسا انوکھا صلہ دیا ہے تم نے مجھے۔ زندگی بھر کے لیے ایک نہ دکھائی دینے والے جہنم

میں جھونک دیا ہے میرے وجود کو۔ اب میں نجانے کب تک اذیت ناک سوچوں کے اس تپتے صحرا میں تنہا بھٹکا کروں گا جہاں نہ کوئی سنگ میل ہے نہ کوئی نخل سایہ دار۔ اور تم تمہیں کیا فرق پڑا۔ تم تو بہت خوش بھی ہو اور مطمئن بھی۔ ہر چند کہ تمہارا چہرا وہ نہیں کہتا جو تم زبان سے کہتی ہو لیکن کیا خبر، تمہاری آنکھوں میں تیرتی نمی اور تمہارے چہرے پر پھیلی اُداسی کی اصل وجہ کیا تھی؟ میں کس امید پر اس خوش گمانی کو دل میں جگہ دوں کہ تم مجھ سے بچھڑنے پر ناخوش تھیں۔ تمہیں میرا غم رُلا رہا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی شے نہ تھی۔ جو ہمارے درمیان آسکتی۔ راستہ تو تم نے اپنی رضا سے بدلا تھا۔ اور میں نے محض تمہیں ذرا سا آزمانے کے لیے امی اور آمنہ کے مشورے پر شبنم کا رشتہ بھیجنے پر ہامی بھرلی۔ میرا خیال تھا کہ یہ سب ہوتا دیکھ کر تم پگھل جاؤ گی۔ جھک جاؤ گی۔ ہار مان لوگی اور پھر ہم بہت جلدی ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ میں تمہیں پیار محبت سے منالوں گا۔ اور ہم ساری فکروں اور پریشانیوں سے دور ہو کر زندگی گزاریں گے۔ لیکن۔ لیکن سب کچھ اُلٹ ہو گیا۔ تم اپنی ضد کی انتہا پر جا پہنچیں اور میں امی اور آمنہ کے سامنے بے بس مجبور ہو گیا۔ اور آج اس مقام پر کھڑا ہوں جہاں سے آگے بڑھنے یا پیچھے جانے کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیا۔ چاروں سمت اندھیرا ہے۔ محض اندھیرا۔"

انہوں نے ایک نظر کلائی پر بندھی گھڑی کی چمکتی سوئیوں پر ڈالی۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔

"یہ رات، جس کے افسوں کا بہت ذکر سنا تھا۔ کسی آسیب کی مانند ہر شے پر چھپی نظر آتی ہے۔ نہ کوئی رنگ دکھائی دیتا ہے نہ کوئی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ اندھیرا، محض اندھیرا۔ وہ۔ جو اندر موجود ہے شاید میری منتظر بھی ہے۔ اس سے کوئی رشتہ، کوئی انسیت، کوئی جذباتی لگاؤ مجھے محسوس نہیں ہوتا۔ میرے پاس اسے دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر میں اندر جا کر کیا کروں؟ سوچتا ہوں تو کوئی لفظ اب سمجھ میں نہیں آتا جو اس سے کہہ سکوں۔ کس طرح دیکھوں اس کا چہرا۔ اپنی نگاہوں میں تو برسوں پہلے کسی چہرے کو دان کر چکا ہوں۔

نہ میرے پاس اس کے لیے الفاظ ہیں، نہ نظریں، نہ دل۔ پھر میں اندر جا کر کیا کروں؟ لیکن۔ لیکن یہاں کھڑے رہنے کا بھی تو کوئی جواز میرے پاس نہیں ہے۔"

"انہوں نے تھکے تھکے انداز میں سوچا پھر مڑ کر دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ سجی ہوئی سیج پر وہ ایک لاتعلق کے سے انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مسہری کی پشت سے کمر ٹکائے، دونوں پیر سمیٹے وہ دیوار کو گھور رہی تھی۔

ماتھے کا ٹیکا، کانوں کے آویزے اور کلائی کی چوڑیاں اس کے سامنے دھری ہوئی تھیں۔ دوپٹا شانے پر ٹکا ہوا تھا اور انگلیاں آپس میں الجھی ہوئی تھیں۔

ان کے اندر آنے پر اس نے ایک نگاہ گھڑی پر ڈالی دوسری ان کے چہرے پر۔ دونوں کی نظریں ملیں پھر۔ یوسف نظر چرا کر باتھ روم میں گھس گئے۔ ایک مدھم، تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری تھی۔

نہا دھو کر، کرتا شلوار پہن کر وہ باہر نکلے تو وہ جوں کی توں اسی حالت اور اسی کیفیت میں تھی۔ بالوں میں ہولے ہولے انگلیاں چلاتے وہ گھوم کر بیڈ کی دوسری سائیڈ پر آ بیٹھے۔

"سوجاؤ شبنم!" لیٹتے ہوئے وہ دھیرے سے بولے تھے۔

"کیوں جاگ رہی ہو اب تک؟"

بڑی دیر تک دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ بولی۔

"اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ میں آپ کی وجہ سے جاگ رہی ہوں، تو غلط ہے۔ میں اپنی مرضی سے جاگ رہی ہوں اور اپنی مرضی سے ہی سوؤں گی۔"

لہجہ نہ طنزیہ تھا نہ تلخ۔ اپنی بات عام سے انداز میں کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ یوسف آنکھوں پر بازو رکھے لیٹے تھے۔ لیکن کمرے کی خاموشی میں اُبھرتی آوازوں سے اس کی حرکات و سکنات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے تھے۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بکھری چیزیں درست کر رہی تھی۔ پھر اس نے الماری کھول کر عائلہ کا زیور رکھا تھا۔ اس کے بعد وہ کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد وہ نکلی تھی۔ بستر پر دراز ہوتے ہوئے اس نے بالوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا تو ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں یوسف کے چہرے اور ہاتھوں سے ٹکرائیں۔

نجانے کیوں یاسیت کی ایک بھرپور لہران کے اندر دوڑ گئی۔ محرومی اور خلش کے احساس نے ان کی رہی سہی نیند بھی اُڑا دی۔

اذانوں کی آواز پر ان کے برابر لیٹی شبنم اُٹھ کر وضو کرنے کے لیے باتھ روم میں گھسی تو انہیں اندازہ ہوا کہ ساری رات وہ تنہا نہیں جاگے تھے۔



"جلدی سے نہا دھو کر کپڑے بدلو تو میں تمہارا میک اپ کر دیتی ہوں۔"

جلدی جلدی کمرے کی بکھری چیزیں سمیٹتی آمنہ اس سے کہہ رہی تھی۔

وہ سر جھکا کر گود میں بیٹھی مومنہ کے ہاتھوں سے کھیلنے لگی۔

مومی کو ادھر بستر پر بٹھا دو۔" آمنہ نے پلٹ کر پھر اسے مخاطب کیا۔ "تم جاؤ نہاؤ، نیچے بہت سی خواتین تمہیں سلامی وغیرہ دینے کے لیے تیار بیٹھی ہیں اور پھر تمہاری بہنیں بھی آتی ہوں گی۔"

"میں ایسے ہی ٹھیک ہوں آمنہ۔" وہ بے زاری سے گویا ہوئی تھی۔ "یہ کپڑے ٹھیک ہی تو ہیں۔ نئے ہیں۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔" آمنہ نے آنکھیں نکالیں۔ "ایک دن کی دلہن اور یہ کاٹن کا سادا سوٹ۔ میں نے زری کا کام والا میرون سوٹ پریس کر دیا ہے۔ وہ پہنو اور زیور پہنو۔ ایسے اُجڑی بیٹھی ہو جیسے لاحول ولا قوۃ۔ میرا بھی دماغ خراب کر رہی ہو۔ جلدی کرو۔"

وہ آمنہ سے نہیں لڑ سکتی تھی۔ بادل نخواستہ گود میں بیٹھی مومنہ کو ایک طرف بٹھا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

نہا کر، زری کے کام کا میرون جوڑا پہن کر وہ مشق ستم بننے کے لیے آمنہ کے سامنے آ بیٹھی۔

''شبو۔'' آمنہ اس کے چہرے پر ہاتھ چلانے لگی۔ ''کیسے لگے میرے بھائی؟''

''آمنہ اس کی بچپن کی سہیلی، رازداں تھی۔ وہ دونوں اپنی ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کیا کرتی تھیں۔ ایسے میں اس سے جھوٹ بولنا یا کچھ چھپانا اس کے لیے بے حد مشکل تھا۔ پھر بھی وہ نارمل نظر آنے کی کوشش کرتی رہی۔

''کیا مطلب؟'' وہ سادے لہجے میں بولی تھی۔ ''یوسف میرے لیے نئے یا اجنبی نہیں تھے۔ میں تو انہیں اپنے بچپن سے دیکھتی چلی آرہی ہوں۔''

''پھر بھی۔ بچپن سے تو تم انہیں بھائی کی حیثیت سے دیکھتی رہی۔ پھر ان کی منگنی نیلم سے ہوئی تو تم نے انہیں بہنوئی سمجھا۔ اب شوہر کی حیثیت سے انہیں دیکھنا اور ملنا کیسا رہا؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے سر جھکا لیا۔ ''ان کی بیوی بنے ہوئے وقت ہی کتنا گزرا ہے جو میں کچھ محسوس کرسکوں۔ رات بھر کا وقت تو بہت کم ہے۔''

''مجھ سے بھی بے ایمانی؟''

آمنہ نے اسے گھورا اور مسکرا دی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور ریشم اور مریم اندر گھس آئیں۔

''السلام وعلیکم۔ ہائے شبنم آپی۔ کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔''

ریشم نے آتے ہی اس کے گال پر پیار کیا۔

''یہ تمہاری شبنم آپی کا نہیں میرا کمال ہے۔'' آمنہ مسکرائی۔

''جی نہیں۔'' ریشم نے منہ بنایا۔ ''ہماری شبنم آپی ہیں ہی بہت پیاری۔ کل بھی دلہن بن کر کتنی پیاری لگ رہی تھیں۔''

''ہم لوگ ناشتا لے کر آئے ہیں۔'' مریم نے بتایا۔ ''نیچے کچن میں رکھوا دیا ہے۔ آپ انہیں تیار کر دیں تو ناشتا کرا کے ہم انہیں گھر لے جائیں گے۔''

''نیلم نہیں آئی؟'' آمنہ نے دریافت کیا۔

''ان کے سر میں درد تھا۔ اور پھر گھر آئی خواتین کو بھی تو دیکھنا تھا۔ ان کے ناشتے وغیرہ کا انتظام کرنا تھا۔ پھر انہوں نے کہا کہ شبنم تو ویسے ہی ہمارے ساتھ گھر آہی جائے گی۔''

''میں آج نہیں چلوں گی۔'' شبنم آہستہ سے بولی۔ ''میں تھک گئی ہوں۔ آج آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

''واہ شبنم آپی۔'' ریشم نے آنکھیں نکالیں۔ ''ہم وہاں کا میں گے آپ کو؟ وہاں سو جائیے گا۔''

''نہیں ریشم! میں کل آؤں گی۔''

ریشم اور مریم ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

وہ بہت الجھی الجھی، تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔ جیسے یہ اس کی اپنی شادی نہ ہو۔ جیسے وہ میلوں کی مسافت طے کر کے کسی ایسی تقریب میں شرکت کے لیے آئی ہوئی ہو جہاں اس کی وابستگی کا کچھ سامان نہ ہو۔

"شبنم ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔" آمنہ نے ان دونوں کی اچانک خاموشی کو محسوس کر کے کہا۔ "ابھی اس کی سلامی ہوئی ہے پھر رات کو ولیمے کی تقریب ہے۔ اس کی تیاری بھی شام ہی سے شروع ہو جائے گی۔ بہتر یہی ہے کہ اسے کل لے کر جانا۔ کم از کم باتیں وغیرہ کرنے کو پورا دن تو ملے گا۔ اور پھر یہ کہہ رہی ہے کہ تھکی ہوئی بھی ہے۔ آرام کرنا چاہتی ہے۔"

"جیسی ان کی مرضی۔" مریم بولی۔

شبنم کے موڈ کو وہ تینوں واضح طور پر محسوس کر رہی تھیں۔ اس کی نظروں میں چمک اور لہجے میں خوشی کی کوئی کھنک نہ تھی۔ چہرے پر بے زاری کا انتہائی واضح تاثر لیے وہ خاموش بیٹھی تھی۔

"یوسف بھائی کہاں ہیں؟"

آمنہ ناشتا اوپر لے کر آئی اور مریم نے دریافت کیا۔

"نیچے سو رہے ہیں۔"

"انہیں جگائیں ناں۔" ریشم چہکی۔ "کیسے ہمارے ساتھ ناشتا کریں۔ ابھی زلفی ہمیں لینے آ جائے گا۔"

"سونے دو انہیں۔" شبنم نے اسے ٹوک دیا۔ "رات کو ل لینا۔"

"دیکھو، ابھی سے اپنے شوہر کی سائیڈ لینی شروع کر دی ہے اس نے۔ آمنہ ہنس کر بولی۔ "ٹھیک ہے بھئی۔ اپنے میاں کے آرام کا خیال رکھنا بھی تو اسی کا فرض بنتا ہے ناں۔"

یہ لیں شبنم آپی۔" مریم نے حلوہ اس کی سمت بڑھایا۔ "نیلم بجو نے خاص طور پر آپ کے لیے بنا کر بھیجا ہے۔"

"آپ کو پسند ہے ناں چنے کی دال کا حلوہ۔" ریشم نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"نہیں۔ اب نہیں ہے۔" اس نے قطعی لہجے میں کہہ کر چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"خالی پیٹ چائے کیوں پی رہی ہو شبنم۔ کچھ کھا لو۔" آمنہ نے اسے محبت سے مخاطب کیا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم لوگ کھاؤ۔" وہ چائے کے گھونٹ بھرتی رہی۔

وہ تینوں سر جھکا کر بے دلی سے لقمے توڑنے لگیں



شبنم آپی کو کیا ہو گیا ہے ریشم؟"
مریم اسٹیج کی طرف دیکھتے ہوئے فکرمندی سے کہہ رہی تھی۔
"پتا نہیں۔ کچھ چپ چپ سی ہیں۔" اس نے بھی اظہار کیا۔
"کچھ نہیں۔ بالکل چپ ہیں۔ ذرا ثریا باجی کو دیکھو۔ کتنی خوش اور مطمئن نظر آ رہی ہیں۔ خوشی نے ان کے چہرے پر کیسے رنگ بکھیرے ہوئے ہیں۔ بات بات پر ہنس دیتی ہیں اور شبنم آپی! پتھر کا بت بنی بیٹھی ہیں۔"
"چلو ہم دونوں ان کے پاس چل کر بیٹھتے ہیں۔"
"کیا فائدہ۔ میں ابھی گھنٹہ بھر بیٹھ کر آ رہی ہوں۔ مجال ہے جو انہوں نے ایک بات بھی کی ہو مجھ سے۔ اور تو اور نیلی بجو سے بھی کوئی بات نہیں کی۔ بس سر جھکائے بیٹھی ہیں۔"
"پر انہیں ہوا کیا ہے؟" ریشم جھنجلا کر بولی۔ "یوسف بھائی سے لڑائی تو نہیں ہو گئی؟"
"لو۔ ابھی ایک ہی دن ہوا ہے شادی کو۔" مریم نے آنکھیں نکالیں۔ "لڑائی کیسے اور کس بات پر ہو گی؟"
نیلی بجو سے منگنی کر کے توڑ دینے پر؟" ریشم نے اظہار کیا۔
"پتا نہیں۔" مریم بڑبڑائی۔
"یہ تم دونوں کیا آپس میں جڑی بیٹھی ہو؟" نیلم پیچھے سے آئی تھی۔ "جاؤ شبنم کے پاس بیٹھو تھوڑی دیر کے لیے۔"
ہم تو ہو آئے ہیں بجو۔ آپ جائیں۔"
وہ چند لمحے سوچ کر اسٹیج کی سمت بڑھی تھی۔
"آج نیلی بجو کتنی اچھی لگ رہی ہیں ناں۔" ریشم نے اسے سراہا۔
"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔" مریم مسکرائی۔ "یہ کلر کتنا سوٹ کر رہا ہے ان پر۔"
لائٹ پرپل انگرکھے اور چوڑی دار پاجامہ میں ملبوس وہ واقعی بے حد جاذب نظر لگ رہی تھی۔ چنا ہوا دوپٹا کاندھے پر ڈالے وہ اپنے دھیان میں آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک ہی یوسف اس کے سامنے آ گئے۔ غالباً انہوں نے بھی دانستہ ایسا نہیں کیا تھا۔ تبھی ایک لمحے کو بوکھلا سے گئے۔
"السلام وعلیکم!" وہ آہستہ سے بولی۔
لاکھ نہ چاہتے ہوئے بھی ٹکراؤ ہو ہی گیا تھا تو اس نے اخلاقیات بھی نبھا لیں۔
"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو؟"
انہوں نے ایک ٹھہری ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔
"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے ایک نظر اسٹیج پر ڈالی۔ "شبنم کچھ خاموش خاموش سی ہے۔ کیا وجہ ہے؟"

"مجھے کیا خبر؟" وہ تلخی سے ہنسے۔ "آپ کی بہن ہے..... آپ کو خبر ہونی چاہیے۔"
بہن اور شوہر کے رشتے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس کے مزاجوں کی صحیح صحیح خبر تو اب بہر حال آپ ہی کو ہونی چاہیے۔ کچھ کہا تو نہیں آپ نے اس سے؟" وہ بہت بے کل ہو رہی تھی۔

مثلاً کیا؟" وہ جیسے اس کی حالت سے لطف اندوز ہونے لگے۔

"میری بہن کو خوش رکھیے گا یوسف۔" آنسو پی کر سر جھکا کر وہ محض یہی کہہ سکی۔

"خوش رکھنے کا وعدہ میں نے تمہارے لیے کیا تھا، شبنم کے لیے نہیں۔"

وہ تلخی سے کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ وہ سر اُٹھا کر حیران نظروں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

"یوسف! جو رشتہ ہمارے مابین اب ہمیشہ کے لیے قائم ہو چکا ہے۔ اس کا پاس کیوں نہیں کرتے آپ کیوں ہر ملاقات پر مجھے ان گزرے ہوئے لمحات کی یاد دلاتے ہیں۔ جن کی یاد اگر دل کے پلو سے بندھی رہ گئی تو خیانت ہوگی۔ بھول کیوں نہیں جاتے۔ بھولنے کیوں نہیں دیتے۔"

وہ خیالوں میں اُلجھی کھڑی تھی۔

ذرا سے فاصلے پر سے اسٹیج پر بیٹھی شبنم نے خاموش نظروں سے ان دونوں کو محوِ گفتگو دیکھا تھا۔ اور اب نیلم کو پتھر کا بت بنا دیکھ رہی تھی۔

"اتنی زیادتی بجو۔" وہ دُکھ سے سوچ رہی تھی۔ میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ آپ اتنی ظالم ہیں۔



"امی حضور!" وہ کسی سوچ میں گم تھا۔

"جی بیٹا حضور۔ فرمائیے۔" انہوں نے مسکرا کر بیٹے کو دیکھا۔

"یہ شعر جو آپ نے چند روز قبل ارشاد فرمایا ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے یہ خواتین جو ایک خاص مقصد کے تحت یہاں وارد کی گئی ہیں۔ ان کا قیام وطعام کب تک ہمارے ذمے ہے؟"

"عفت خانم نے اسے گھورا۔

"کیوں۔ تمہیں کیا تکلیف ہے ان کے آنے سے؟"

"یہ ہم نے کب کہا؟ ہم نے تو برسبیل تذکرہ ایک سوال کیا ہے۔"

"میں انہیں کچھ کہہ کر یہاں نہیں لائی ہوں۔ نہ ہی میں نے ان کی ماں سے کوئی ایسی ویسی بات کی ہے۔ جوان لڑکوں کی ماں ہوں۔ زور زبردستی تو نہیں کر سکتی۔ کل کلاں کو کہیں کہ ماں نے اپنی مرضی مسلط کی ہے۔ میں تو لڑکیوں کو یونہی شہر گھمانے کا کہہ کر لے آئی ہوں۔ اب بہروز سے بھی پوچھ لوں گی اور فیروز سے بھی۔ لڑکیاں سامنے ہیں۔ اُٹھنا بیٹھنا، بولنا چالنا سب سامنے ہے۔ پسند کریں گے تو انہیں چھوڑ نے جاؤں گی تو بات

بھی کرآؤں گی ان کی ماں سے۔منع کریں گے تو خاموش ہو جاؤں گی۔"

سوال گیہوں جواب چنا۔" وہ مسکرایا تھا۔ہم نے کچھ اور ہی پوچھا تھا امی حضور۔"

"ارے وہ لیں گی اپنی مرضی سے جتنا رہنا ہوگا۔جانے کا کہیں گی، چھوڑ آؤں گی۔"

"بجا فرمایا۔" وہ مسکرایا۔"اب فرض کریں، وہ آپ کے کسی فرزند کو پسند کر کے عمر بھر یہیں رہنے کا تہیہ کرلیں تو ہم یہیں نکاح پڑھوا دیں گے۔کیوں؟"

"ایسے ہی حسین ہیں میرے فرزند۔" وہ برا مان گئیں۔

"بڑوں کے معاملے میں تو شبہ ہے۔ہاں سب سے چھوٹا تو ایسا ہی حسین ہے۔" وہ شرارت سے بولا۔" کلاس میں ہر لڑکی مبتلائے عشق ہے۔"

"شرم کرو۔" وہ ہنسیں۔"ویسے کلاس کی لڑکیوں کی دال تو کچھ گلتی نہیں ہے۔لاکھ مبتلائے عشق ہوں۔

"کیوں بھئی؟" اس نے ابرو چڑھائے۔"کیا خبر ہمیں کسی عشق میں بچی لیلیٰ پر رحم آ ہی جائے۔اور ہم بادل نخواستہ اس کا نذرانہ محبت قبول فرما کر اس کی عزت افزائی کر ہی بیٹھیں۔"

"کتنی لیلاؤں کی عزت افزائی کرنے کا ارادہ ہے میرے لال کا؟"

دی ون اینڈ اونلی امی حضور۔جہاں نظر آئی جب نظر آئی۔ہم سب سے پہلے آپ ہی کو مطلع کریں گے کہ دعوت نامہ چھپوا لیجیے۔بالآخر انتظار کی طویل گھڑیاں اختتام پذیر ہوئیں اور وہ مبارک ساعت آن پہنچی۔جب میاں شہروز احمد سرخ و سبری شیروانی زیب تن کیے، ہزار ہزار کے نوٹوں کا سہرا باندھے سجی ہوئی گھوڑی پر جلوہ افروز ہونے کے لیے تیار ہیں۔"

ہنسی کے بے ساختہ جھنکار پر دونوں نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

"آؤ نبیلہ بیٹی۔" عفت خانم نے سرک کر اس کے لیے جگہ بنائی۔" کہاں تھیں؟"

"جی میں کچن میں تھی۔وہ ان کے برابر آ بیٹھی۔" جمنا بائی سے نہاری بنانا سیکھ رہی تھی۔"

جمنا کو نہاری بنانا آتی ہے؟" شہروز نے حیرت سے دریافت کیا۔" وہ تو ایک عجیب و غریب سی ڈش کو نہاری کہتی ہے جس میں آٹے کی گولیاں تیر رہی ہوتی ہیں۔"

"بنائیے مت۔" وہ دلکشی سے مسکرائی۔"انہوں نے بہت مزے دار نہاری تیار کی ہے۔"

"بنتا ہے یہ۔" عفت خانم نے اسے ایک دھپ رسید کی۔" اسے بگاڑا بھی جمنا ہی نے ہے۔"

"ہمیں حیرت سے سکتہ ہو جائے گا امی حضور۔یعنی ہم بگڑ چکے ہیں اور وہ بھی جمنا بائی کے ہاتھوں؟ ہم شہروز احمد ہیں نہاری نہیں۔"

"بہت دلچسپ گفتگو کرتے ہیں آپ۔" نبیلہ پھر ہنسی تھی۔"ہنس ہنس کر کوئی بھی بے حال ہو سکتا ہے۔"

"جی شکریہ۔" وہ فوراً ہاتھ کو ماتھے تک لے گیا۔ "وہ کیا کہا ہے شاعر نے۔

کوئی تو ہے منیر جسے "قدر" ہے میری

یہ جان کر عجیب سی حیرت ہوئی مجھے

"بہت خوب۔" اندر آتا فیروز ہنسا تھا۔ "موقع کی مناسبت سے بڑی جلدی من پسند ترامیم کر لیتے ہیں شعر میں۔"

"ابی ہم فنکار لوگ ہیں۔ وقت کی ضرورت کے پیش نظر کچھ بھی کر لیتے ہیں۔"

"فیروز احمد نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر ماں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"امی! کیا پکا ہے کھانے میں؟"

"نہاری اور پلاؤ۔" انہوں نے جواب دیا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

"ایک دوست کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کھانے پر مدعو کر لیا ہے۔"

"خیر ہے۔ کچھ اور بنوانا ہو تو جمنا سے کہہ دو۔"

"نہیں۔ میرا خیال ہے یہی ٹھیک ہے۔"

وہ باہر نکل گیا تھا۔

"آنٹی۔ یہ فیروز بھائی آپ سب سے اس قدر مختلف کیوں ہیں؟" وہ دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے سادگی سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ ڈریسنگ ان کے بچپن میں ہی نکل آئے تھے۔" عفت خانم کے کچھ بولنے سے قبل ہی وہ حد درجہ معصومیت سے بولنے لگا تھا۔ "اور یہ جوان کی ناک طوطے کی مانند خم دار ہے، وہ ایک دلدوز حادثے کا نتیجہ ہے۔ ویسے بائی داوے اور بھی کچھ ہم لوگوں سے مختلف ہیں؟"

نیلم شرمندہ ہو گئی۔ "نہیں نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی۔" اس سے کچھ جواب بن نہ پڑا۔

"بکنے دو اسے۔" عفت خانم نے اسے بری طرح گھورا۔ "غضب خدا کا، زبان ہے کہ قینچی۔"

وہ اپنی عافیت خطرے میں پڑتی دیکھ کر چپکے سے اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔

"ہاں۔ میرے فیروز طبیعتاً ذرا لیے دیے رہنے والا لڑکا ہے۔ بہت دیر میں مانوس ہوتا ہے کسی سے شہروز تو خیر آفت، قیامت ہے۔ ویسے بہروز کی عادت تینوں میں سب سے اچھی ہے۔ انتہائی ملنسار اتنا ہی فرمانبردار، با ادب۔ مجھے اس سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔" عفت خانم اطمینان سے پیر سمیٹتے ہوئے بتانے لگیں۔

"ان کی شادی کر دیں ناں آنٹی! بہولانے کا دل نہیں چاہتا۔"

بس یہی تو ارمان رہ گیا ہے دل میں۔" انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "اب دیکھو خدا جب پورا کرے۔"



''مبارک ہو۔بھئی بہت بہت مبارک ہو۔''

راشدہ بیگم فون رکھ کر خوشی خوشی پلٹی تھیں۔

سب کے سب ان کی سمت متوجہ ہوئے تھے۔

''کیا بات ہے راشدہ؟'' عاصمہ چچی نے دریافت کیا۔''ایسی کون سی خوشخبری مل گئی؟''

''ارے۔انہی کا فون تھا۔کیپٹن فیاض کی والدہ کا۔انہوں نے مہناز کو پسند کرلیا ہے۔شام کو وہ لوگ انگوٹھی پہنانے آرہے ہیں۔''

''سچ۔واقعی؟''

ایک ساتھ کئی آوازیں ہال میں اُبھری تھیں۔

''مبارک ہو باجی۔'' مہوش نے مہناز کو گلے سے لگالیا جس کے چہرے پر یکلخت ہی کئی رنگ چھا گئے تھے۔

''مبارک مبارک۔'' عدنان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پر جوش انداز میں دبایا۔''ہر چند کہ لڑکے کی والدہ کی آنکھوں میں موتیا ہے پھر بھی مبارک۔''

''بدتمیز۔'' مہناز کو ہنسی آگئی۔

''الماس کہاں ہیں؟''

عدنان نے ادھر اُدھر دیکھا۔

''اوپر کمرے میں ہیں۔دوسرے فون پر کسی دوست سے باتیں کررہی ہیں۔پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے مہوش نے منہ بنا کر اطلاع دی۔

''میں انہیں مطلع کرکے آتا ہوں۔'' وہ اُٹھ کر سیڑھیوں کی سمت بڑھا۔

دستک دے کر وہ اندر داخل ہوا تو کارپٹ پر کشنز کے سہارے نیم دراز الماس سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''اچھا میں پھر بات کرتی ہوں۔'' وہ کارڈلیس تھامے کسی سے مخاطب تھی۔''او کے۔''

فون بند کرکے وہ اس کی سمت متوجہ ہوئی۔

''یعنی حد ہوتی ہے آدام بےزاری کی۔''

اس نے ایک نگاہ پنک کپڑوں میں ملبوس، سیاہ بال شانوں پر بکھرائے بیٹھی الماس پر ڈالی۔

''ہوں؟'' وہ سستی سے بولی۔''کیا ہوا ہے؟''

''نیچے ہم سب چھٹی کے مزے لوٹ رہے ہیں، موسم انجوائے کررہے ہیں۔اور آپ یہاں بند کمرے میں اے سی آن کیے، شکن آلود لباس پہنے حد درجہ سستی اور بےزاری سے کسی سہیلی سے محوِ گفتگو ہیں۔''

''خیر۔ست یا بیزار تو میں ہرگز نہیں ہوں۔'' اس نے مسکرا کر تردید کی۔

''آدم بیزار تو ہیں۔'' وہ اس کے پاس بیٹھا۔ ''ہر چند کہ یہ خبر آپ کو مجھے سنانی چاہیے تھی کہ لیکن میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ مہناز باجی کا رشتہ طے ہو گیا کیپٹن صاحب سے۔ اور شام کو وہ لوگ آ رہے ہیں۔''

''رئیلی۔'' اس کی آنکھیں چمکیں۔

''جی ہاں۔ ابھی ان کی والدہ کا فون آیا تھا۔ انہوں نے آپ کی والدہ کو فون پر ہی تمام معاملات طے کر لیے ہیں۔ شام کو مہناز باجی کی رسم منگنی ہے۔''

''اچھا۔'' وہ اٹھ کر بال سمیٹنے لگی۔ ''چلو پھر نیچے چلتے ہیں۔''

''یہ تو کہیے مٹھائی کب کھلا رہی ہیں کام بن جانے کی؟'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''مٹھائی تو تم مہناز سے مانگو۔'' وہ بالوں کو پنک بینڈ سے جکڑ رہی تھی۔

''ان سے تو الگ مٹھائی کھانی ہے۔ ان کی اپنی بات طے ہونے کی۔ آپ منہ میٹھا کرائیں کہ انتظار ختم ہوا جدائی کے دن پورے ہوئے۔'' وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے تعجب سے اس کی سمت دیکھا۔

''مطلب یہ آنسہ الماس طاہر خان، کہ مسز الماس عثمان خان بننے کے دن نزدیک آ چکے ہیں۔ یہی طے تھا ناں کہ مہناز باجی کا رشتہ طے ہو جانے پر یہ مبارک کام سرانجام دیا جائے گا۔ اب کھلایے مٹھائی۔''

وہ چند لمحوں کے لیے کسی سوچ میں گم ہو گئی تھی۔

''خوشی سے سکتہ؟''

''عدنان نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

''ارے ابھی تو میں نے محض ایک خیال ظاہر کیا ہے۔ آپ بھائی کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے بھی نکل کھڑی ہوئیں؟''

''بکومت!'' اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔

وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ سرہانے رکھا نیل فائل اٹھا کر ناخن رگڑنے لگی۔

''ہیں؟ یہ تبدیلی اور یکا یک تبدیلی کیسی؟'' وہ حیران تھا۔ ''لڑکی ہے یا موسم۔ ابھی باران برستا ہے اور دوسرے ہی لمحے چمچماتا سورج سروں پر آن کھڑا ہوتا ہے۔ بلکہ موسم بھی تھوڑے بہت مستقل مزاج ہوتے ہیں۔''

''عدنان پلیز! جاؤ تم یہاں سے۔ میں کچھ سوچ رہی ہوں۔''

''ضرور سوچیے۔'' وہ خوش دلی سے ہنسا۔ ''یہ واحد کام ہے جو آپ بہت ہی کم کرتی ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں RARELY۔ اس لیے میں ہرگز اس نیک کام میں مخل نہیں ہوں گا۔''

وہ مڑ کر کمرے سے نکل گیا۔

کھڑکیوں پر سرسراتے سفید جالی کے پردوں کو دیکھتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔



کیپٹن صاحب سب ہی کو بہت زیادہ پسند آئے تھے۔ نہ صرف وہ بلکہ ان کا پورا گھرانہ راشدہ بیگم کی خوشی قابل دید تھی۔

''نفل پڑھوں گی شکرانے کے۔ خدا نے میری سن لی۔ ایسا ہی گھر چاہتی تھی میں اپنی مہناز کے لیے۔ بہت باشعور اور ملنسار لڑکا لگتا ہے۔ اپنائیت کتنی ہے اس بچے میں۔ لگتا ہی نہ تھا کہ دوسری تیسری مرتبہ مل رہا ہے۔ سب سے گھل مل کر باتیں کر رہا تھا۔''

مہناز کے لبوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔ اس نے ابھی تک رسم کے کپڑے ہی پہن رکھے تھے سبز چمکتے کپڑوں کا عکس اس کے چہرے پر آ رہا تھا۔ غیر شعوری طور پر وہ انگلی میں پڑی انگوٹھی کو گھما رہی تھی۔

''یہ بتایئے چچی جان کہ کون سا داماد زیادہ پسند ہے آپ کو؟'' عدنان نے انہیں تنگ کرنا چاہا۔ ''کیپٹن فیاض یا عثمان خان؟''

راشدہ بیگم کے پاس بیٹھے عثمان دھیرے سے ہنس دیے۔

''بڑا تیز لڑکا ہے۔'' وہ بولے تھے۔ ''تنگ کر رہا ہے آپ کو۔''

''لو۔ میں کیوں تنگ ہونے لگی۔ میرے لیے تو دونوں ہی بیٹوں جیسے ہیں۔ ماں کے لیے تو سارے بیٹے برابر ہی ہوتے ہیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ عثمان اپنا خون ہے۔ ہاتھوں میں پلا بڑھا ہے۔ اس کی جانب دل زیادہ جھکتا ہے۔''

''یاہو!'' عدنان نے نعرہ بلند کیا۔ ''بھائی جان از بھائی جان۔''

''کیا بات ہے الماس۔'' سیماب نے اسے مخاطب کیا تھا۔ ''تم اس قدر چپ چپ سی کیوں ہو؟''

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس نے بال سمیٹ کر ایک طرف کیے۔ ''کچھ تھکن سی ہے۔''

''صبا کو بلا لیتیں ناں۔ اچھا تھا وہ بھی شریک ہو جاتی۔''

''ایسی کون سی خاص تقریب تھی جو میں اسے انوائٹ کرتی۔'' وہ مسکرائی۔

''چلو بھئی عاصمہ۔'' راشدہ بیگم کھڑی ہو گئیں۔ ''بارہ، ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔ نماز پڑھ لیں ورنہ پھر نیند ستائے گی۔ دلاور کہاں ہیں؟''

''وہ تو کب کے سونے چلے گئے۔ وہ کہاں جاگ پاتے ہیں اتنی دیر۔''

''میں بھی ذرا چینج کر لوں۔'' الماس کھڑی ہوئی۔

''چینج کر کے سوٹ جائیے گا۔'' عثمان خان نے اسے مخاطب کیا تھا۔ ''لان میں چہل قدمی کریں گے۔''

اس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر آگے بڑھ گئی۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ نیچے آئی تو ساری پلٹن کو ہال میں ٹی وی کے آگے براجمان پایا۔

''بڑی اچھی موی آرہی ہے الماس۔'' مہناز نے اپنے برابر جگہ بنائی۔

''رہنے دیجیے انہیں۔'' عدنان بول پڑا۔ ''یہ باہر لان میں چہل قدمی کریں گی۔''

الماس نے دیکھا عثمان خان ہال میں موجود نہ تھے۔ اس نے باہر کی سمت قدم بڑھا دیے۔

وہ ادھر ادھر بکھری کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھے کسی سوچ میں گم تھے۔

''ارے۔'' اسے دیکھ کر وہ چونک اُٹھے۔ ''آ گئیں آپ! میں تو سمجھ رہا تھا آپ بھی موی دیکھنے بیٹھ گئی ہیں۔''

وہ خاموشی سے ان کے سامنے آ بیٹھی۔

''اگر آپ کو نیند آرہی ہے تو بے شک جا کر سو جائیں۔'' وہ مسکرائے۔

''نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

کاٹن کے سفید سوٹ پر سفید کڑھائی کا دوپٹا اوڑھے گلابی گلابی آنکھوں سے انہیں دیکھتی، وہ سیدھی ان کے دل میں جا اُتری۔

''بولا کریں الماس! آپ اتنا کم کیوں بولتی ہیں۔''

''میں کم تو نہیں بولتی۔ لیکن بعض اوقات میں اور بعض افراد کے سامنے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا بولوں۔''

نجانے کیا بات تھی۔ اب عثمان خان کی معیت میں وہ ایک عجب جھنجلاہٹ کا شکار ہو جاتی تھی۔ اسے شدت سے محسوس ہوتا تھا کہ ان کی طبیعتیں میچ نہیں کرتیں۔ وہ کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہوئے۔

''کیا بات ہے الماس؟ آج کل آپ میں یہ تبدیلی کیسی ہے۔'' پھر وہ نرم لہجے میں گویا ہوئے۔ ''میرا خیال ہے اگر کوئی مسئلہ ہے تو ہم ڈسکس کر سکتے ہیں۔''

''نہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''وہ نفی میں سر ہلا کر گلاب کے پھولوں کو دیکھنے لگی۔

''میں امی سے کہنے والا ہوں کہ اب چچی جان سے ہماری شادی کی بات کر لیں۔''

الماس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''کیوں؟''

''کیا مطلب کیوں؟'' وہ مسکرائے۔ ''بھئی میری عمر اب شادی کی صحیح عمر سے بھی دو چار سال آگے ہی جا پہنچی ہے۔ میرا خیال ہے، اب مزید تاخیر خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔''

وہ دھیرے سے ہنسے تھے۔

''اور پھر آپ کو آخر اعتراض کیا ہے؟۔ مزید پڑھنا آپ نہیں چاہتیں۔ جاب وغیرہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے، پھر یہ انتظار کیوں؟''

''دراصل۔ دراصل میں ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔'' اس نے سر جھکا۔

''ذہنی طور پر تیار ہونے میں فقط ایک لمحہ لگتا ہے۔'' وہ مسکرائے۔ ''دولہا آپ کیوں نہیں پاتا؟ کوئی خرابی ہے مجھ میں؟''

''عثمان۔ دراصل۔'' وہ ایک کشمکش کا شکار ہوگئی۔ ''میں آپ کو سوچ کر جواب دوں گی۔''

''کس بات کا جواب؟'' وہ حیران ہوئے۔

''یہی کہ میں ابھی شادی کروں گی یا نہیں۔''

''وہ اُٹھ کر تیزی سے اندر کی سمت بڑھ گئی۔ وہ حیران نظروں سے اسے جاتا دیکھ رہے تھے۔ یہ لڑکی انہیں قدم قدم پر جھٹکے پہنچاتی، قدم قدم پر حیران کرتی تھی۔



''مہناز۔!''

''ہوں۔'' وہ ڈیک آن کر رہی تھی۔ مڑ کر اس کی سمت دیکھنے لگی۔

''ایک کام کر دو میرا۔ ویسے تو میں خود بھی کر سکتی ہوں، لیکن امی ذرا دوسرے خیالات کی ہیں، میری باتیں انہیں اکثر بری لگ جاتی ہیں، اور وہ مجھ سے ناراض بھی ہو جاتی ہیں، اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم ان سے بات کرو، تم ذرا سمجھا کر اور رسان سے بات کرتی ہو۔ مجھے اپنا نقطہ نظر سمجھنے میں ویسے بھی مشکل پیش آتی ہے۔''

وہ تفصیل سے کہہ رہی تھی۔

مہناز رک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس طرح سے تو وہ بہت کم کوئی بات کرتی تھی۔

''کہو۔ ایسی کیا بات ہے۔''

''مہناز! امی سے کہہ دینا، میں ابھی عثمان خان سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔''

''کیوں۔؟'' وہ اُلجھن کا شکار ہوئی۔

''کیا تم نہیں جانتیں۔ گھر میں آج کل یہی ایک موضوع زیر بحث ہے، عاصمہ چچی اس معاملے کو جلد از جلد نپٹا لینا چاہتی ہیں۔ یہ ان کی بہت بڑی خواہش بھی ہے، اور عثمان کی بھی۔ اور یہ تو گھر کا ہی معاملہ ہے۔ تمہیں کون سا کہیں اور جانا پڑے گا۔ اوپر والی منزل سے نیچے والی منزل میں شفٹ ہو جانا ہے، گھر وہی رہے گا، افراد وہی رہیں گے۔''

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے مجھے کوئی فرق پڑے گا۔ پورا پیٹرن آف لائف تبدیل ہو جائے گا۔''

وہ تو ہونا ہے، آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں۔ بالآخر یہی ہونا ہے، پھر یہ گریز کیسا۔''

"مہناز! صاف بات یہ ہے کہ فی الحال میرا ذہن عثمان کو قبول نہیں کر رہا ہے۔" وہ اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے کہہ گئی۔

"کیا۔؟" مہناز چیخنے پر مجبور ہوئی۔ "یہ کیا بات کی تم نے۔ ان سے تمہاری منگنی کو بھی کوئی سال بھر ہونے کو آیا ہے، اور ابھی تمہارا ذہن ہی ان کو قبول نہیں کر رہا ہے۔"

"تو میں کیا کر سکتی ہوں؟" اس نے شانے اُچکائے۔ "ایک سال تو کیا میں اگر دس سال بعد بھی یہی بات کروں تب بھی اس میں میرا کوئی قصور نہ ہوگا۔ میں نے کون سا انہیں خود پسند کیا ہے، اگر وہ میرا اپنا انتخاب ہوتے۔ تب تو میں قصوروار بھی ہوتی۔ مجھے تو اچانک یہ فیصلہ سنایا گیا تھا کہ مجھے ان کے نام کی انگوٹھی پہنائی جا رہی ہے۔ ان کا پابند کیا جا رہا ہے!"

"تو تم نے اس وقت تو کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔ نہ اس کے بعد ہی سال بھر تک تمہیں یہ دھیان آیا۔ اب شادی کی بات ہو رہی ہے تو تمہیں یہ خیال ستانے لگا ہے۔ یہ کیا تک ہے؟"

مہناز قدرے غصے میں تھی۔

"اور اس ایک سال میں تم ان کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی ہو، اتنی باتیں ڈسکس کرتی رہی ہو۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے۔" اس نے مہناز کی بات کاٹ دی۔ "یہ سب کرنے کے بعد ہی تو یہ احساس ہوا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے موزوں نہیں ہیں۔"

"الماس۔ بی سیریس!" مہناز کچھ ٹھنڈی پڑ گئی۔ "تمہیں اندازہ نہیں ہے تمہاری ضدی طبیعت کی وجہ سے امی کس قدر پریشان رہتی ہیں۔ اب جبکہ ان کے سارے بوجھ ہلکے ہوئے ہیں۔ تم پھر انہیں دُکھ دینا چاہتی ہو؟ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ دلاور چچا اور ان کی فیملی کے ہم پر کتنے احسانات ہیں! ابو نے باہر جا کر جب یہ اطلاع بھجوادی تھی کہ انہوں نے وہاں دوسری شادی کر لی ہے، اور اب ان کا امی اور ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے، تب کون تھا جو ہم سب کو سہارا دیتا، ہمارا سائبان بنتا۔ بکھر کر رہ جاتے ہم سب لیکن چچا نے بھائی کی زیادتیوں کی اس طور تلافی کی، کہ ہمیں ابو تک سے کوئی شکایت نہ رہی۔ انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں نہ صرف جگہ دی بلکہ فراخ دلی سے آدھا گھر ہمارے حوالے کر دیا۔ ہمیں پڑھایا لکھایا، کھلایا، پلایا، معاشرے میں عزت دار بنایا۔ ہمیں اپنے بچوں کی طرح سمجھا۔ ہر خواہش پوری کی۔ کون سی کمی رہنے دی انہوں نے۔ اور اب تم چاہتی ہو کہ عثمان خان کے رشتے سے انکار کر کے ہم ان کے تمام احسانات پر پانی پھیر دیں۔ انہیں دُکھ پہنچائیں؟"

"یہ سب باتیں تم کیوں کر رہی ہو مہناز؟ کیا یہ سب کچھ میں نہیں جانتی؟ ان احسانات کو بھی میں مانتی ہوں، دلاور چچا کو اپنے باپ کی جگہ سمجھتی ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان تمام احسانات کے جواب میں میں اپنے وجود کی قربانی دوں۔"

"شٹ اپ الماس۔" مہناز کا ضبط جواب دے گیا۔ "عثمان خان اتنے گئے گزرے نہیں ہیں کہ ان کے رشتے کے لیے ہامی بھرنا تمہیں اپنے وجود کی قربانی دینے کے برابر نظر آئے۔ ان کو تم سے بہتر ہزار رشتے مل سکتے ہیں۔ لیکن سوچو اگر ہمارے سروں پر چچا کا ہاتھ نہ ہوتا تو کیا تمہیں عثمان خان جیسا ایک بھی رشتہ مل سکتا تھا؟"

''میں چمک دمک پر مرنے کی عادی نہیں ہوں۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔ ''کسی شخص کے بھی احسانات سے قطع نظر میری اپنی ایک علیحدہ ذات، ایک مکمل شخصیت، ایک منفرد وجود ہے، اور اس میں کسی اور کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اگر میں کسی کو پسند نہیں کرتی یا اپنے لیے موزوں نہیں سمجھتی تو کوئی مجھ سے زور زبردستی کرنے کا کوئی حق یا اختیار نہیں رکھتا۔ میں نے تم سے ایک درخواست کی تھی، بہن سمجھ کر۔ تم نے ناصح کا رول پلے کرنا شروع کر دیا ہے، تو رہنے دو۔ میں یہ بات خود ہی کسی تک پہنچا سکتی ہوں۔''

''الماس۔!'' مہناز نے اسے دُکھ سے دیکھا۔ ''تم بہت غلط کام کرو گی۔ تم بہت سے لوگوں کو دکھ دینے جا رہی ہو، محض اس لیے کہ عثمان خان کو اپنے لیے موزوں نہیں سمجھتیں۔ کتنی بے وقوفانہ بات ہے۔''

''تمہارے لیے یہ بات بے وقوفی کی ہو سکتی ہے کیونکہ تم نے بہت اطمینان سے ایک ایسے شخص کے نام کی انگوٹھی پہن لی ہے، جس سے نہ تم کبھی ملی ہو، نہ ہی اس کے خیالات سے تمہیں کوئی آگاہی ہے لیکن میرے لیے یہ بات بہت اہم ہے۔ کہ جس شخص کے ساتھ مجھے اپنی پوری زندگی گزارنی ہے، اس سے میرا ذہن کس حد تک ملتا ہے یہ باتیں آیندہ زندگی میں بہت اہم ہوتی ہیں مہناز!''

''زندگی میں صرف اور صرف محبت اور مروت کا جذبہ اہم ہوتا ہے الماس۔ ایک بے تحاشہ محبت کرنے والا شخص تمہیں ہر حال میں خوش رکھ سکتا ہے اور یقین مانو، عثمان تم سے بے حد محبت کرتے ہیں۔''

''جو بات کہنے کی ان میں خود ہمت نہیں ہے، وہ تم مجھے بتا رہی ہو۔'' وہ تلخی سے مسکرائی۔

''بات ہمت کی نہیں ہے۔ دراصل عثمان سنجیدہ طبع متین شخص ہیں۔ وہ ایسی ٹین ایج والی باتوں سے گریز کرتے ہیں۔''

''یہی تو ساری بات ہے۔ انہیں شادی بھی کسی ایسی لڑکی سے کرنی چاہیے، جو تیس برس سے اوپر کی ہو۔ میں ہر حال میں ایسی باتوں کو پسند کرتی ہوں۔''

مہناز نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔

''جلد بازی مت کرو، الماس! تمہارا اپنا نقصان ہے۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ''میں سوچ لیتی ہوں۔ لیکن شادی ابھی نہیں۔''

''میں امی سے کہہ دوں گی۔''

''تھینک یو۔'' وہ کمرے سے نکل گئی۔



''کیسی جچ رہی ہیں۔''

وحیدہ چچی نے اس کا ہاتھ کانچ کی چوڑیوں سے بھر کر پیار سے تھاما۔

''گوری کلائیوں میں سرخ اور ہری چوڑیاں بھلی بھی بہت لگتی ہیں۔ میری شادی نئی نئی ہوئی تھی تو میں ہر وقت دونوں کلائیاں چوڑیوں سے

بھر کر رکھتی تھی۔ تمہارے چچا کو پسند تھیں ناں۔"

"وہ تو نہیں۔

"پھر کیا فائدہ ہے!" اس نے کلائیوں میں بھری چوڑیوں کو بے دلی سے دیکھا۔

"کیا سوچ رہی ہو میری جان؟"

"انہوں نے اس کی ٹھوڑی پیار سے اوپر کی۔

"ہر وقت کن سوچوں میں رہتی ہو؟ مت سوچا کرو بے کار بے کار باتیں۔ اے ہاں۔ خون ہی جلتا ہے۔ دوسروں کا کیا جاتا ہے۔"

"شبنم! یوسف بھائی اب تمہارے ہیں صرف تمہارے۔" آمنہ بولی۔ "انہیں اپنانا اور ہمیشہ اپنا بنا کر رکھنا اب تمہارا کام ہے۔ اس رویے کا مظاہرہ کروگی تو ان سے دور ہوتی چلی جاؤ گی۔ ان سے قریب ہونے کی کوشش کرو۔"

وہ کوئی تلخ سی بات کہنا چاہتی تھی، مگر محض لب کاٹ کر رہ گئی۔

ہنسنے کی آوازوں پر تینوں نے چونک کر سیڑھیوں کی جانب دیکھا۔

ثریا اور یونس بھائی آگے پیچھے ہنستے مسکراتے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ ان تینوں کو صحن میں بیٹھا دیکھ کر دونوں جھینپ سے گئے۔

"امی! ہم ذرا گھومنے جا رہے ہیں۔" یونس بھائی آ کر ان کے قریب بیٹھے۔

"شوق سے جاؤ!" انہوں نے پاندان گھسیٹ کر آگے کر لیا۔

"آپ بھی چلیے امی!" ثریا شوخی سے بولی۔

"اے لو۔ مجھے کہاں، گود میں بٹھاؤ گی؟"۔ وہ حیرت سے گویا ہوئیں۔ "اسکوٹر پر دو ہی بندے آ سکتے ہیں۔ اب یا تو یونس تمہیں گھمانے لے جائیں یا مجھے۔"

ثریا شرارت سے ہنس دی۔ وہ بے حد شوخ و شنگ لڑکی تھی۔ کسی بھی بات کا برا ماننے کے بجائے قہقہہ لگا کر ہنس دیا کرتی تھی۔

"آپ جانا چاہیں تو مجھے تو اعتراض نہیں ہے امی جان!" اس نے ان کے ہاتھ سے سروتا لے لیا اور چھالیہ کترنے لگی۔

"لیکن یونس بھائی کو ضرور اعتراض ہوگا۔" آمنہ ہنس کر بولی۔ "کیوں بھائی؟"

"بھئی مجھے تو گھومنے جانا ہے، ساتھ کون جائے گا، اس کا فیصلہ ساس، بہو آپس میں کر لیں۔"

"ارے میاں! ہم گھوم لیے جتنا اس عمر میں گھومنا تھا۔ اللہ بخشے تمہارے ابا بہت شوقین مزاج تھے، کھانا پینا، گھومنا گھامنا، یہی کچھ بھاتا تھا انہیں۔ اب تم بچوں کی عمر ہے، جتنا جی میں آئے گھومو، پھرو۔ ہنسو بولو۔ میں تو یوسف میاں اور شبنم سے بھی یہی کہتی ہوں۔"

"یوسف بھائی تو حد درجہ سنجیدہ مزاج ہیں۔" ثریا بولی۔ "میں نے تو شادی سے لے کر اب تک انہیں شبنم کو مخاطب کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ ایسا بھی کیا شرمانا!"

''اچھا بی اماں اٹھیے۔'' یونس کھڑے ہو گئے۔ ''دیر ہو رہی ہے۔''

''جی ہاں۔ جیسے میں ہی تو بیٹھی ہوں، آپ تو دروازے پر پہنچ چکے ہیں۔''

''لڑکی ہے کہ بتاشا اچھال ہے جو کوئی بات پی جائے!'' وہ ہنسے تھے۔

''لڑکیوں پر فرض ہے ناں باتیں پینا اور پیتے رہنا۔ آپ مرد حضرات کیوں نہیں پی لیا کرتے۔''

دونوں مصنوعی لڑائی لڑتے باہر نکل گئے۔

''ثریا نے تو یونس بھائی کو دو دن میں اپنی مٹھی میں کر لیا ہے!'' آمنہ دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے پر خیال لہجے میں بولی۔ ''ایک ہم ہیں! مدتیں ہو گئی ہیں، ابھی بھی ریاض سے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔''

''اے بی! تم تو ہو بھی چھوئی موئی۔'' وحیدہ چچی جھنجلا گئیں۔ ''مرد کو قابو میں رکھنے کے طور طریقے تم لوگوں کو آتے ہی نہیں ہیں۔''

''تو آپ ماں ہیں آپ نے سکھائے ہوتے ناں!'' وہ ہنسی۔

''ارے بیٹا! یہ سمجھنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ تم جیسی ناسمجھوں کو کیا خاک سمجھ میں آئیں گی۔''

ماں بیٹی کی گفتگو سے قطعی بے خبر وہ دروازے کی سمت متوجہ تھی، جہاں سے ابھی ابھی یونس بھائی اور ثریا نکل کر گئے تھے۔

ان دونوں کا ہنسنا مسکرانا۔ ایک دوسرے پر فقرے کسنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک اس ماحول کے سحر سے آزاد نہ ہو سکی تھی۔



بائیک کھڑی کر کے وہ اندر جا رہا تھا۔ جب شہروز کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"بھائی جان۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "ادھر آ جائیں ناں۔ محفل گرم ہے۔ اور جمنا جام تیار کرنے۔ م۔ میرا مطلب ہے چائے بنانے گئی ہے۔"

وہ بادل نخواستہ ادھر چلا آیا۔ لان میں پڑی کرسیوں پر عفت خانم، شہروز اور نبیلہ اور عقیلہ موجود تھیں۔

"کیسا ہوا پرچا بیٹا؟" عفت خانم نے پوچھا۔

"پرچا تو اچھا ہو گیا ہے امی۔" وہ بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔ "بس اب آپ دُعا کرتی رہیں۔"

"میری تو ساری دعائیں تم لوگوں کے لیے ہی ہیں۔" وہ محبت سے بولیں۔

"کون سے ایگزام ہو رہے ہیں؟" نبیلہ نے دریافت کیا۔

"پی۔ سی۔ ایس کا ایگزام ہے۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔ "کیا پکا ہے امی؟" وہ فوراً ہی عفت خانم کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

"بینگن!" شہروز بولا۔

فیروز احمد نے برا سا منہ بنایا۔ بینگن پکنے پر وہ کھانا ہی نہیں کھاتا تھا۔

"اروی گوشت بنا ہے بیٹے!" عفت خانم نے شہروز کو گھورا۔ "جمنا نے تمہارے لیے چاول بھی بوائل کیے ہیں۔ میرا بیٹا تھکا ہارا آیا ہے، میں بینگن پکوا کر رکھوں گی اس کے لیے؟"

"کبھی ایسا پیار ہم سے تو نہیں جتایا۔" اس نے مسکینی سی صورت بنائی۔ "میں کیا ہسپتال کے کاریڈور میں پڑا مل گیا تھا آپ کو؟"

"سنو اس لڑکے کی باتیں!" انہوں نے اسے پیار سے دیکھا۔ "تمہیں تو میں نے سب سے زیادہ پیار سے پالا ہے۔"

"سب سے زیادہ پیار تو آپ بہروز بھائی سے کرتی ہیں۔ دن رات ان کی گن گاتی ہیں۔"

وہ ہے بھی اس قابل۔ ویسے میرے بچے، ماں کے لیے ساری اولاد برابر ہوتی ہے۔ تم تینوں ہی میرے دل کی ٹھنڈک ہو۔"

"امی! میں کپڑے تبدیل کر کے کھانا کھاؤں گا!" فیروز اٹھ کھڑا ہوا۔ "چائے میرے کمرے میں بھیج دیں۔"

"اچھا بیٹے۔"

"ان کے حصے کی باتیں بھی لگتا ہے آپ کر لیتے ہیں!" نبیلہ اسے جاتا دیکھ کر بولی۔

"دیکھیے ناں! کتنا ظلم ہے مجھ پر۔" وہ معصوم بنا۔ "ایک بے چاری اکلوتی زبان اور تین بندوں کا کام۔"

"تین؟" عقیلہ ہنس دی۔

"جی ہاں۔ بہروز بھائی کے حصے کی باتیں کون کرتا ہے؟ میں ہی تو کرتا ہوں!"

"شیطان!" عفت خانم ہنس دیں۔

"کہاں ہے؟" اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ "لاحول پڑھیں۔"

''السلام علیکم۔''

صبا مسکراتی ہوئی لان میں چلی آئی۔

''وعلیکم السلام! کہاں تھیں بیٹی اتنے دنوں سے۔نظر ہی نہیں آئیں۔''

''بس آنٹی۔امی کی طبیعت کچھ خراب تھی۔معروفیت رہی۔''

وہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اچھا! پوچھنا امی کو میری طرف سے۔میں خود بھی آؤں گی۔اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟''

''اب تو خدا کا شکر ہے، کافی آرام ہے۔''

''آپ نے صبا کو شیطان کہا تھا؟''

وہ جھک کر ماں سے رازداری سے پوچھ رہا تھا۔مگر اونچے والیوم میں کہ سب کو سنائی دے جائے۔

''میں کیوں اس بچی کو ایسے لقب دینے لگی۔'' وہ بھنائیں۔''وہ تو میں نے تمہیں کہا تھا۔''

''اچھا۔اچھا۔'' وہ مطمئن ہو کر سیدھا ہوا۔''میں سمجھا آپ صبا کو کہہ رہی ہیں۔'' نبیلہ، عقیلہ اور صبا تینوں ہی ہنس دی تھیں۔

''آپ لوگ آئیں ناں ہمارے گھر۔'' وہ ان دونوں کو پرخلوص آفر کر رہی تھی۔

''جی ضرور۔عقیلہ مسکرائی۔

''کل دوپہر میں چلیں گے۔'' وہ فوراً بولا۔''یہ سوتی تھوڑا ہی ہیں۔''

''تمہیں کس نے دعوت دی ہے جو فوراً تیار ہو گئے؟'' صبا نے مذاق اڑایا۔

''ہم بہت اسپیشل لوگ ہیں ہمیں کہیں آنے جانے کے لیے کسی کی دعوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔تاہم یہ ضرور ہے کہ آپ انتہائی بے مروت اور طوطا چشم ہیں۔''

وہ برا مان کر چپکا ہو کر بیٹھ گیا۔

صبا ان دونوں سے باتیں کرتی رہی۔

''جنا بائی۔!ہم کیا کسی پہاڑی علاقے میں رہتے ہیں؟'' اس نے ٹرے لاتی جنا کو مخاطب کیا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔

''کیا ماچس کی تیلی جلا کر اس پر چائے بناتی ہو؟ اتنی دیر؟''

''فیروز میاں کو کھانا دے رہے تھے۔تمہاری طرح کرسی پر چڑھ کر نہیں بیٹھے تھے!'' وہ جل کر بولی۔

''گویا اب میرا کرسی پر بیٹھنا بھی تمہاری نظروں میں کھٹکنے لگا ہے۔یہ کوئی اقتدار کی کرسی ہے؟''

''تمہیں اُلجھنے کو کوئی نہ کوئی شخص درکار ہے!'' عفت خانم بھنا کر بولیں۔ ''تم جاؤ جمنا! روٹیاں ڈال لو۔ اس سے اُلجھ گئی تو سال گزر جائے گا، اور اس کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔''

''آنکھیں دینے سے تو ہمیں ڈر لگتا ہے، ہم سوچ رہے ہیں، وصیت نامہ میں اپنی زبان عطیہ کر جائیں گے۔'' وہ خفا ہو کر بولا۔

''کیا ضرورت ہے۔'' صبا نے ٹکڑا لگایا۔ ''وہ تو میوزیم والے خود ہی لے جائیں گے۔ دور دور سے لوگ دیکھنے آیا کریں گے۔''

نبیلہ اور عقیلہ ہنس دیں، تو وہ جز بز ہو کر بیٹھ گیا۔

''کتنی نکمی لڑکیاں ہیں۔''

''صبر نہ ہو سکا تو کچھ دیر بعد خود ہی بول پڑا۔

''یہ نہیں ہو رہا کہ کپوں میں چائے ڈال ڈال کر سب کو دے دیں۔ اب امی یہ کام کرتی اچھی لیں گی کیا؟''

''ارے ہاں! سوری۔'' عقیلہ اٹھ کر چائے نکالنے لگی۔

''صبا بی بی! کبھی مل کر پانی بھی پی لیا کریں۔'' اس نے دفعتاً توپوں کا رُخ اس کی جانب کیا۔ ''مجال ہے جو کسی کام کے لیے اپنی خدمات پیش کریں۔ ہر کام منہ سے کہنا پڑتا ہے۔ جائیے۔ یہ کپ فیروز بھائی کو دے کر آئیں۔''

صبا نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ نگاہوں سے سرزنش کی۔

''کیا گھور رہی ہیں؟ جائیں بھئی۔''

اس نے مجبوراً کپ اُٹھایا۔

''کس قدر بدتمیز، بے لحاظ لڑکا ہے۔'' عفت خانم کو در حقیقت غصہ آ گیا۔ ''رہنے دو بیٹی! جمنا لے جائے گی۔''

''جمنا کوئی مشین تھوڑا ہی ہے۔ وہ بے چاری بھی تھک جاتی ہے۔ جائیں، جائیں آپ وہ کریں جو میں کہہ رہا ہوں۔'' اس نے ہاتھ ہلایا۔

''حد ہوتی ہے شہروز! کسی بات کی۔'' عفت خانم اس کے جانے کے بعد اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔ ''وہ بچی کس قدر بوکھلا جاتی ہے، تمہاری ان حرکتوں سے۔ کیا نوکر ہے وہ تمہاری؟ خود حرے سے بیٹھے ہو، اور اس سے کام کروا رہے ہو۔''

''حرکت میں برکت ہوتی ہے امی حضور!'' اس نے مدبرانہ انداز میں سر ہلایا۔ ''کام کرنا عین عبادت ہے، اب وہ مفت میں چائے کا کپ پی کر جائیں گی۔ ہمارا ذرا سا کام بھی کر دیں تو کیا حرج ہے۔''

''لاحول ولا قوۃ۔'' وہ بھنا گئیں۔ ''کون تمہارے منہ لگے!''

''چائے کا کپ!'' اس نے مسکرا کر کپ لبوں سے لگایا۔



دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھ کر وہ کمرے کے دروازے کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ چند لمحے کچھ سوچ کر اس نے دھیرے سے دستک دی۔

''آجاؤ۔''

اندر سے وہی گمبھیر آواز آئی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ آہستہ سے دروازہ دھکیل کر وہ اندر داخل ہوئی۔

''میز پر کتابوں کا ایک ڈھیر رکھے وہ خود بھی کسی کتاب میں کھویا ہوا تھا۔

''چائے!'' اس نے کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔

فیروز احمد نے ذرا سی نظریں اٹھا کر کپ رکھتے نرم سلونے ہاتھ کو دیکھا پھر حیران ہو کر اٹھا۔

''اوہ! آپ۔'' وہ سیدھا ہو گیا۔ ''آپ نے کیوں زحمت کی۔ جنایا شہروز سے کہا ہوتا۔''

''کیا فرق پڑا؟'' وہ مسکرائی۔ ''چائے کا ذائقہ تو تبدیل نہیں ہوا ہوگا۔''

''میرا مطلب یہ نہیں ہے۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

غنیمت تھا کہ اب اس سے بات کرتے ہوئے اس کی پیشانی شکن آلود نہیں ہوئی تھی۔ کم از کم وہ اس کی صورت سے اتنا تو مانوس ہوا تھا۔

''کسی کو بیٹھ جانے کے لیے کہنا آپ کی اخلاقیات میں شامل نہیں ہے؟'' وہ مسکرائی۔

''بیٹھیے پلیز!'' وہ نادم ہوا۔ ''دراصل یہاں بیٹھ کر آپ محض بور ہی ہوں گی۔ اور میں نہیں چاہتا کہ آپ بور ہوں۔''

''جی نہیں!'' وہ پاس پڑی کرسی پر ٹک گئی۔ ''میں بور نہیں ہوتی۔ لیکن آپ کوشش کیوں نہیں کرتے کہ آپ کے ساتھ بیٹھنے والا شخص بور نہ ہو۔ کم از کم اتنی کمپنی تو دیا کریں۔''

''میں کوشش کروں بھی تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا!'' وہ سنجیدگی سے اپنی کتاب کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''آپ شہروز کی کمپنی کی عادی ہیں، میں لاکھ کوشش کر کے بھی اتنا اور اس جیسا نہیں بول سکتا۔''

اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

''آپ طنز کر رہے ہیں؟ ہر چند کہ میں آپ کو بتا چکی ہوں۔''

''نہیں نہیں۔'' وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بولا ''میں طنز نہیں کر رہا۔ بخدا اس دور میں اپنی سوچ پر شرمندہ بھی ہو چکا ہوں۔ میں نے یونہی ایک بات کہی ہے، آپ غلط معنوں میں نہ لیں۔ بات محض اتنی سی ہے صبا بی بی! کہ میں تنہائی پسند اور انتہائی کم گو شخص ہوں۔ یہاں اس کمرے میں بیٹھ کر آپ بور ہوں گی، اور کچھ نہیں بس یہی کہنا چاہ رہا تھا میں۔''

''صاف لفظوں میں کہہ دیجیے۔'' وہ مسکرا دی ''میں برا نہیں مانوں گی۔ بلکہ مت کہیے میں خود ہی چلی جاتی ہوں!''

وہ اُٹھ کھڑی ہو گئی۔

"خود کو اس قدر تنہا مت کریں فیروز۔" دروازے کے قریب پہنچ کر وہ بولی تھی۔

"اس خواب سے جاگیں گے تو یہ احساس تنہائی روگ بن جائے گا۔ ہنس کر بات کرنا، اتنا بھی مشکل نہیں۔ آزما کر تو دیکھیں۔"

وہ سر اٹھائے بڑی محویت سے اس کی کہی بات پر غور کرتا رہا۔

"اس خواب سے جاگیں گے تو۔"

"تم کیا جانتی ہو صبا بی بی! میرے خوابوں کے متعلق!"

ہونٹ کا نچلا سرا دانتوں میں دبائے وہ سوچ رہا تھا۔

"تم احساس تنہائی کی بات کرتی ہو۔ مجھے تو ہر لمحہ ہر گھڑی ایک ہجوم نظر آتا ہے۔ ہنستا، آوازیں کستا، انگلیاں اٹھاتا، پتھر اچھالتا ہجوم! اور میں لوگوں کے اس ہجوم کی نظر سے اوجھل ہو جانا چاہتا ہوں۔ گم ہو جانا چاہتا ہوں۔ اور گم ہونے کے لیے ایک اپنی ہی ذات ملتی ہے۔ مجھے کس احساس تنہائی سے ڈراتی ہو، یہ احساس مجھے مل جائے تو ایک نعمت ہوگی میرے لیے، مجھے تو آوازیں ہی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ لوگ ہی لوگ نظر آتے ہیں۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

میز پر رکھی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔



غصے میں بھری ہوئی وہ بالکونی تک آئی تھی۔

"اگر آپ میری وجہ سے ساری رات یہاں گزار دیتے ہیں، تو برائے مہربانی یہ ڈرامہ بند کریں۔ کیونکہ یہ رچایا ہوا بھی آپ ہی کا ہے، اور یوسف صاحب! ڈرامابازی سے مجھے سخت نفرت ہے۔"

"وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔ "کیا بات ہے؟"

"پھر وہ اندر چلے آئے۔

"میرے باہر کھڑے ہونے پر تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

"مجھے آپ کے اندر یا باہر ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔ "یہی بتانا چاہ رہی ہوں آپ کو۔ مت خراب کیا کریں اپنی نیند۔ میں تو ذہنی طور پر اس قدر تنہا ہو چکی ہوں کہ اب مجھے آپ کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ساری رات بالکونی میں کھڑے ہو کر گزاریں۔ بے فکر ہو کر سویا کریں، یوں بھی انتقام لے لینے کے بعد تو بڑی اچھی نیند آنی چاہیے۔"

"انتقام!" وہ چونکے۔ "کیسا انتقام؟"

وہ زہرخند ہنسی ہنس دی۔

میں دودھ پیتی بچی نہیں ہوں یوسف صاحب! جسے آپ کوئی من پسند کھلونا دکھا کر اپنے گھر لے آئے ہیں۔ ایک شعور، مکمل ہوش وحواس رکھنے والی لڑکی ہوں۔ اور مجھے نیلی بجو مت سمجھیے گا۔ ان کی بہن ضرور ہوں لیکن ان سے بے حد مختلف۔ میں دکھوں اور غموں کو اپنا مقدر سمجھ کر ان پر خاموشی سے دو آنسو بہا کر نہیں بیٹھ سکتی۔ ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتا سکتی ہوں۔ لیکن یہ میری انا کا مسئلہ ہے۔ ابھی تو احساس زیاں کی شدت سے میرا دماغ ماؤف ہے۔ مجھے کیا کرنا ہے، اس کا فیصلہ میں سوچ سمجھ کر کرنا چاہتی ہوں، لیکن آپ تو وہ کر چکے ہیں ناں، جو آپ نے کرنا تھا پھر آپ کینٹ میں کیوں حرام ہیں؟ کیا بجو کی یاد سونے نہیں دیتی۔؟"

"شبنم!" وہ غرائے۔ "اپنی حدود میں رہو۔ جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہی جو سچ ہے لیکن آپ اسے زبان تک اس لیے نہیں لا سکتے کہ آپ بزدل ہیں۔ آپ بھی اور نیلی بجو بھی۔ جو لوگ بے قصور افراد کے کاندھوں پر اپنے اپنے انتقام اور اپنی اپنی ضدوں کی بندوقیں رکھ کر چلائیں، میری نظر میں وہ اجاڑ ہے کے خود غرض بھی ہیں، اور بزدل بھی۔"

"کیا چاہتی ہو؟ کیا کہنا اور کیا سننا چاہتی ہو؟"

"سنائیں گے آپ؟" وہ طنز سے مسکرائی۔ "کہیے۔ کیا رشتہ تھا آپ کے اور بجو کے درمیان؟"

"محبت کرتے تھے ہم دونوں ایک دوسرے سے!" ۔ وہ چند لمحے اسے گھورنے کے بعد گویا ہوئے "اور کچھ؟"

وہ کچھ دیر کے لیے سناٹے میں آ گئی تھی۔

"کرتے تھے؟" پھر اس نے سر جھٹکا۔

"میں اب بھی کرتا ہوں۔ اور کچھ؟"

"کب تک کرتے رہیں گے۔ یہ بھی فرمائیے۔" اس کا سانس دھونکنی کی مانند چلنے لگا۔

"شاید ساری زندگی۔ مزید کیا سننا چاہو گی۔ کہو؟"

"جو زندگی کسی اور کے نام کر چکے ہیں، اس میں مجھے حصے دار کیوں بنایا؟ میرے ساتھ یہ بے ایمانی کیوں کی۔ جواب دیں؟"

"میں نہ تم سے شادی کرنا چاہتا تھا نہ ہی میں نے ایسی کوئی ہامی بھری تھی۔ میں امی اور آمنہ کی سازش کا شکار ہو گیا ہوں۔ اور تمہاری بے وقوف بہن کے کیے دھرے کی سزا بھگت رہا ہوں۔ سنو شبنم!"

"انہوں نے اس کے قریب آ کر اسے بازوؤں سے جکڑ لیا۔

"میں اسے نہیں بھلا سکتا۔ کوشش کے باوجود بھی نہیں۔ اور۔ اور ایسی کوئی کوشش میں کرنا بھی نہیں چاہتا۔ تم چاہو تو میں تمہیں آزاد کر کے اس ناانصافی کی تلافی بھی کر سکتا ہوں، جو مجھ سے سرزد ہو گئی ہے۔"

اسے ایک طرف ہٹا کر وہ پھر باہر نکل گئے۔

"آزاد!" وہ تلخی سے مسکرائی۔ "کیسا خوش کن لفظ ہے۔ لیکن یوسف صاحب! اب میں عمر بھر کے لیے دکھ اور صدمے کی قیدی ہو چکی

ہوں۔ اور جوزیاں آپ کر چکے ہیں، اس کی تلافی ناممکن ہے۔"



وہ سارا دن خوار ہو کر آئی تھی، اور اب تھکی ہاری، جوتوں سمیت بستر پر نیم دراز تھی۔

"کہاں گئی تھی بجو؟" ناصر اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"انٹرویو کال آئی تھیں۔ وہی انٹرویو دینے گئی تھی۔"

"آپ نوکری کریں گی؟"

"کیا حرج ہے؟" وہ مسکرائی۔ گاڑی کھینچنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا ناں!"

"کوئی مجھے کچھ نہیں بتاتا۔ لیکن میں جانتا ہوں آپ نے ہم سب کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔

"بکومت!" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ "فرض اور قربانی میں فرق ہوتا ہے۔ جو کچھ میں نے کیا، وہ میرا فرض ہے، قربانی ور بانی کچھ نہیں، اور یہ تم اتنی بڑی بڑی باتیں کب سے کرنے لگے؟"

"میں اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوں۔ سب ابھی تک مجھے بچہ ہی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ میں سب سمجھتا ہوں بجو آپ نوکری مت کریں۔ میں کر لیتا ہوں۔"

نیلم مسکرا دی۔

"باہر کی دنیا بہت خراب ہے بجو! آپ تو کبھی باہر نکلی بھی نہیں ہیں۔"

"آہستہ آہستہ سب آ جاتا ہے۔ انسان دنیا کے سارے رنگ پہچان لیتا ہے۔"

وہ کسی سوچ میں گم ہو گئی تھی۔

"بجو۔" مریم اندر آئی۔ "عنبرین باجی آئی ہیں۔"

"اُفوہ!" اسے سخت کوفت ہوئی۔ "اس وقت!"

"السلام علیکم!" وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے اندر داخل ہوئی تھی۔

"وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو!" وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

ناصر اُٹھ کر باہر نکل گیا۔

تم نے تو نہ آنے کی قسم کھالی ہے۔ میں نے سوچا، میں ہی دیکھ آؤں، جیتی ہو کہ مر گئیں!" وہ مصنوعی خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔

"ہاں تو ٹھیک ہے ناں۔ ایک بندہ مصروف ہو تو دوسرا ملنے آ جائے۔" اس نے بشاشت کا مظاہرہ کرنا چاہا۔ "چائے بنواؤں؟"

"ہاں بالکل۔" وہ اُٹھ کر باہر آئی۔

''ریشم! ذرا دو کپ اچھی سی چائے تو بنا دو۔''

''پھر آ گئیں وہ الٹی سیدھی باتیں کرنے؟''۔ وہ جل بیٹھی تھی۔ ''بجو! آپ ان سے دوستی ختم کیوں نہیں کر لیتیں؟''

''بری بات ہے ریشم!'' اس نے ریشم کو گھورا۔ ''چلو...... جلدی سے چائے بنا دو۔''

وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن کی سمت چل دی۔

''اور سناؤ کیا حال ہے۔'' وہ اندر آئی۔ ''شبنم کی شادی کے بعد تو تم آئی ہی نہیں۔ میں سمجھ رہی تھی تم خفا ہو۔''

''میں؟'' اسے حیرانی ہوئی۔ ''نہیں تو، میں بھلا کیوں خفا ہونے لگی تم سے۔''

''وہ نیلی۔ ! میں کبھی کبھار الٹی سیدھی بات کر جاتی ہوں۔ تم ناراض تو نہیں ہوناں؟''

''نہیں تو۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر کیوں نہیں آئیں اتنے دنوں سے؟''

''نوکری کی تلاش میں ہوں۔'' وہ ہنسی۔ ''سوچتی ہوں کوئی ڈھنگ کی جاب مل جائے تو اچھا ہو۔ ذرا گھر کے مسائل تھوڑے بہت نمٹ جائیں۔''

''کیسی جاب کرو گی؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''کیسی ہی ہو، ذرا ڈھنگ کی تنخواہ ملتی ہو۔ کام سے تو میں بالکل نہیں گھبراتی!''

''میرے رشتے کے ماموں ہیں۔ وہ تمہیں پلک جھپکتے نوکری دلوا دیں گے، اور تنخواہ بھی تمہاری من پسند ہوگی۔'' وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ لیکن امی نے منع کر دیا۔ انہیں لڑکیوں سے نوکری کروانا پسند نہیں ہے۔''

اس کے لہجے میں ہلکا سا غرور در آیا۔

''کون سی ماں اپنی بیٹیوں سے نوکری کروانا چاہتی ہے عنبرین۔'' نیلم سر جھکا کر بولی۔ ''لیکن مجبوری ہو تو سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پسند تو اماں بھی نہیں کرتیں۔''

''میرا مطلب یہ نہیں تھا۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''خیر، تم کہو تو میں ان سے بات کروں؟''

اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے۔ میں تو دعائیں دوں گی تمہیں بھی اور تمہارے ماموں کو بھی۔

''بس تو سمجھو تمہارا کام ہو گیا۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''احسان ہوگا تمہارا۔''

''ارے گولی مارو احسان کو۔'' اس نے ہاتھ ہلایا۔ ''ارے نیلی! تمہیں خبر ہے راجہ کتنا بدل گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

اسے یہ ذکر نکلنے پر سخت کوفت ہوئی۔ وہ راجہ کا نام تک سننا پسند نہیں کرتی تھی۔

"ارے بھئی۔ اس نے تو اپنا حلیہ بھی درست کر لیا ہے۔ انسانوں کی جون میں آ گیا ہے۔ سنا ہے کہیں نوکری بھی کر لی ہے اس نے۔"

"ہماری بلا سے، جو چاہے کرتا پھرے۔ یہ تمہیں اتنی اطلاعات کون فراہم کرتا ہے۔"

"ارے ہمارے جاسوس پورے محلے میں بکھرے پڑے ہیں۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ "ہر خبر بروقت ملتی ہے۔"

"چھوڑو عنبرین، ہمیں دوسروں کے معاملات سے کیا لینا دینا؟" اس نے اکتا کر موضوع بدل دیا تھا۔



"میں نے لاکھ کوشش کیں خود کو تمہارے سحر سے بچائے رکھنے کی۔ لیکن الماس! میں ہار گیا تم جیت گئیں۔ میں سرنگوں ہو گیا تمہارے ضوفشاں حسن کے آگے۔ میں محبت کرنے لگا ہوں تم سے۔"

الماس اس کے الفاظ اور اس کی آواز میں کھو سی گئی۔

"سن رہی ہو ناں!"

اس نے اپنا ہاتھ میز پر دھرے اس کے مخروطی انگلیوں سے سجے ہاتھ پر رکھا۔

"ہوں!" الماس نے اپنا ہاتھ ہٹایا نہیں۔

"پھر؟ کوئی جواب ہے میری بات کا تمہارے پاس؟"

الماس نے گہری سانس بھری۔

"فی الوقت تو نہیں۔" پھر وہ بولی۔ "اور شاید کبھی نہ ہو۔ اور اگر ہو بھی تو وہ نہ ہو جو تم سننا چاہتے ہو۔"

"مجھے فرق نہیں پڑتا۔ محبت کچھ مانگنے کا نہیں دینے اور دیتے ہی رہنے کا نام ہے۔ جہاں لینے کا خیال بیچ میں آ جائے، وہاں محبت نہیں رہتی سودا بن جاتی ہے۔"

"بہت خوب!" وہ مسکرائی۔ "تو جناب، کرتے رہیے محبت، مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں۔"

"میں جانتا ہوں تمہیں جھکنا پسند نہیں۔ نہ جھکو۔ بنی رہو دیوی۔"

"اور تم......"

"تمہارا پجاری!"

الماس کھلکھلا کر ہنس دی۔

"مخل ہونے پر معذرت چاہتا ہوں۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" اس آواز پر دونوں چونکے تھے۔

عثمان خان قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔

''اوہ آپ!'' چند لمحوں کے لیے وہ پزل ہوئی تھی۔



آپ کی تعریف؟'' رضا نے بھنویں قدرے سکیڑ کر انہیں دیکھا۔

گرے ٹو پیس سوٹ میں ملبوس عثمان خان حقیقتاً متاثر کر دینے کی حد تک شاندار لگ رہے تھے۔

''بیٹھیے پلیز!'' الماس کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔

''تھینک یو!'' وہ بیٹھتے ہوئے متانت سے مسکرائے۔

''رضا صاحب! یہ میرے کزن ہیں عثمان۔ میں نے پہلے بھی کئی بار آپ سے ان کا ذکر کیا ہے۔ اور عثمان! یہ میرے بہت اچھے دوست ہیں رضا مراد۔''

''نائس ٹو میٹ یو!''

''اس نے بھی کہنے پر اکتفا کیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''میں اپنے ایک دوست کے ساتھ لنچ کے لیے آیا تھا۔'' عثمان بتانے لگے۔ ''اس کے لیے ایک ضروری کال آ گئی تو لنچ کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔ پھر میری نگاہ آپ لوگوں پر پڑ گئی۔''

''ہم لوگ بھی بس اب اٹھ ہی رہے تھے!'' رضا نے گھڑی دیکھی۔ بلکہ میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔ میں تو لیٹ ہو رہا ہوں۔ ٹھیک پانچ بجے مجھے کسی سے ملنا ہے۔''

''بیٹھو رضا! میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔''

الماس کو اس کا یوں عثمان خان کے سامنے نروس ہونا برا لگ رہا تھا۔

''نہیں الماس! مجھے چلنا چاہیے۔'' وہ کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا۔ ''او کے عثمان صاحب! پھر ملاقات ہو گی۔''

''ضرور!'' عثمان نے مسکرا کر مصافحہ کیا۔

''اب ہم بھی چلیں؟'' اس کے ہال سے نکل جانے کے بعد انہوں نے الماس سے پوچھا۔

''میں تو گاڑی لے کر آئی ہوں......'' اس نے تذبذب سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ ڈرائیور سے منگوا لیں گے۔''

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

ناچار الماس کو بھی ان کی پیروی کرنی پڑی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ فی الوقت وہ خود بھی عثمان کی قربت سے بچنا چاہ رہی تھی۔ اگر وہ اس سے کوئی سوال کر بیٹھتے تو اسے کیا جواب دیتا، یہ تو ابھی اس نے خود سے بھی طے نہ کیا تھا اور لاجواب ہونا اسے قطعی ناپسند تھا۔

''گھر ہی چلیں گی نا؟'' گاڑی روڈ پر لا کر انہوں نے سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی۔

''جی ہاں۔ کیوں، آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''میں بھی گھر ہی جاؤں گا۔'' وہ مسکرائے۔ ''منزل ایک ہی ہے، فکر نہ کریں؟'' الماس خاموش ہو کر تیزی سے پیچھے بھاگتی روڈ کو دیکھنے لگی۔

''آپ کا دوست...... کیا نام تھا؟'' انہوں نے ذہن پر زور دیا۔

''رضا..... رضا مراد!''

''رضا صاحب سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ کیا کرتے ہیں؟''

''گلوکار ہیں۔ کانسرٹ وغیرہ کرتے ہیں.....'' وہ تذبذب کا شکار تھی۔

''یہ تو کوئی پروفیشن نہ ہوا۔ جاب وغیرہ نہیں کرتے؟''

ان کا انداز بدستور سرسری تھا۔ اس میں کوئی کرید یا جستجو نہ تھی۔

''فی الحال تو نہیں کرتے۔ تلاش میں ہیں۔ ایم۔ کام کیا ہے پچھلے سال۔ کوشش کر رہے ہیں بینک میں جاب مل جائے۔''

''ہوں!'' انہوں نے سر ہلایا۔ ''کب سے جانتی ہیں آپ انہیں؟''

الماس نے سر گھما کر غور سے انہیں دیکھا۔

''آپ کیا جاننا چاہ رہے ہیں عثمان؟''

''کوئی بھی صورت حال زیادہ دیر تک برداشت کرنے کی وہ عادی ہی نہ تھی۔

''میں؟'' وہ حیران ہوئے۔ ''کچھ بھی نہیں، اوہ! آئی سی! آپ غلط سمجھ رہی ہیں الماس! میرے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ نہ میں اس کو برا سمجھتا ہوں......''

وہ جیسے اس کے سوال کی گہرائی میں پہنچ گئے تھے۔

''آپ ایک میچور، بالغ نظر لڑکی ہیں۔ یقیناً اپنا اچھا برا بہتر طور پر سمجھ سکتی ہیں۔ میں تو اسی ایک خط پر اس لیے گفتگو کر رہا تھا کہ عموماً میری گفتگو آپ کے لیے غیر دلچسپ ہوتی ہے...... میں نے سوچا...... یونہی عام سی باتیں کی جائیں۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ اس میں بھی اپنی دل آزاری کا کوئی پہلو ڈھونڈ لیں گی...... بہر حال، اگر آپ نے میرے برسبیل تذکرہ کیے گئے سوالات کو دخل در معقولات میں شمار کیا ہے، تو میں معذرت چاہتا ہوں۔''

وہ بے حد سنجیدہ ہو گئے تھے۔

''آئی ایم سوری......'' وہ بولی۔ ''میں نے آپ کو غلط سمجھا؟''

اسے اپنی غلطی کا احساس تو عام طور پر کم ہی ہوتا تھا، تاہم فی الوقت اس نے معذرت کر لینا ہی مناسب جانا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عثمان اس واقعہ کو کسی بھی طور پر یاد رکھیں۔

"اٹس آل رائیٹ!" وہ نرم لہجے میں بولے۔ "لیکن میں چاہوں گا الماس کہ آپ یہ ہمیشہ یاد رکھیں کہ میں کبھی دانستہ کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جس سے آپ کو تکلیف ہو...... نہ میں شک وشبہ کا عادی ہوں نہ ہی دوسروں کی ذات پر کیچڑ اچھالنا پسند کرتا ہوں۔ آئندہ بھی اگر مجھ سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جائے تو آپ یہ یقین رکھیے گا کہ ایسا نادانستہ طور پر ہوا ہے!"

"اب جانے بھی دیجیے!" وہ مسکرائی۔

"میں سمجھتا ہوں، ہمارے جذبات واحساسات کا کلیئر ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں غلط فہمیاں نقصان دہ ہو سکتی ہیں!"

"جی!" نجانے کیوں اسے اس بات سے طنز کی بو آئی تھی۔ وہ سر موڑ کر باہر گزرتے مناظر دیکھنے لگی۔



وہ کسی کام سے صحن میں آئی تھی۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتی شبنم کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی۔

"شبنم!" وہ بے ساختہ آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی۔ "کیسی ہو...... خوش تو ہو؟"

"یہ آپ پوچھ رہی ہیں بجو!" وہ اس سے الگ ہو کر طنزاً بولی تھی۔

نیلم کو اس کا انداز بے حد عجیب لگا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ کچھ پوچھ پاتی، اندر سے مریم اور ریشم اس کی آواز سن کر باہر آ گئی تھیں۔

"شبنم آپی...... کس قدر بدتمیز ہیں آپ!" ریشم نے خوشی سے اس کا بازو تھامے کہہ رہی تھی۔ "پورے ہفتے بھر بعد آئی ہیں...... اتنی عزیز ہو گئی ہے سسرال؟"

"اچھا ہٹو تو...... میں اماں سے تو مل لوں......"

"ہاں بھئی، اسے اندر تو آنے دو۔" نیلم نے مسکرا کر بہنوں سے کہا۔

"شبنم، ریشم، اور مریم کے ساتھ اندر کی سمت بڑھ گئی...... وہ وہیں کھڑی نجانے کیا سوچ رہی تھی۔ شکوک وشبہات اس کے اندر سر اٹھا رہے تھے۔ شادی کے دن سے لے کر اب تک شبنم کا انداز بہت کچھ سمجھا دینے والا تھا، لیکن اسے یوسف سے ایسی امید نہ تھی، اس لیے اب تک یقین ہی نہ آتا تھا۔

"یہ آپ پوچھ رہی ہیں بجو؟"

"اس نے کس انداز میں کہا تھا! اسے لگا اس میں شبنم کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ وہ باورچی خانے کی سمت مڑ گئی۔

شربت تیار کر کے اندر کمرے میں آئی تو شبنم اماں کے ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔ ریشم اور مریم انتہائی پرشوق انداز میں اس کے اردگرد بیٹھی تھیں۔

"بتائیں ناں آپی...... کیا کرتی رہتی ہیں وہاں سارا دن؟" ریشم منمنائی تھی۔

"کچھ نہیں...... اپنے کمرے میں رہتی ہوں۔ سوتی رہتی ہوں یا پھر نیچے وحیدہ چچی کے پاس چلی جاتی ہوں......"

"اور ثریا باجی؟ ان سے دوستی نہیں ہوئی آپ کی؟"

"وہ گھر میں کم ہی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد وہ زیادہ تر اپنے میکے میں ہی رہی ہے۔"

"اور ایک آپ ہیں۔" مریم نے اسے گھورا۔ "آپ کا تو یہاں آنے کا دل ہی نہیں چاہتا۔ بھول گئی ہیں نا ہم سب کو؟"

"انسان پچھلی باتوں کو جس قدر جلد فراموش کردے، بہتر ہے۔" اس نے نیلم کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"لو اسکہ نہ ہوا۔ کوئی بھول ہوئی۔" ریشم ہنسا بولی۔

"یوسف میاں کیوں نہیں آئے شبنم؟ انہیں اندر آنے کا تو کہتیں۔" اماں نے موضوع بدلا۔

"میں نے کہا تھا اماں! وہ آفس ٹائم ختم ہونے پر سیدھے یہیں آجائیں گے۔"

"چلو لڑکیو! کھانے کی تیاری کرو۔ وقت کا پتا بھی نہیں چلے گا تمہاری باتوں میں اور کھانے کا وقت سر پر آجائے گا۔"

"نیلم بجو نے تو سبزی والے سے صبح ہی ٹنڈے خرید لیے تھے۔" ریشم ہنسی۔ "اب یوسف بھائی کو ٹنڈے کھلائیں گے کیا؟"

"فرج میں گوشت رکھا ہے۔" نیلم بولی۔ "میں پلاؤ اور شامی کباب بنالیتی ہوں۔ مریم سلاد اور رائتہ وغیرہ تیار کرلے گی۔"

"رہنے دیں ان کی خاطر تواضع...... "شبنم نے اسے دیکھا۔" ٹنڈے ہی پکالیں۔ کون سا کسی دعوت میں آرہے ہیں وہ۔"

"اچھا نہیں لگتا بیٹی۔" اماں نے اسے ٹوکا۔ "جاؤ نیلی! اہتمام تیاری کرلو۔" وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر آگئی۔ پیچھے ریشم اور مریم بھی چلی آئیں۔

"بجو! آپ پلاؤ بنائیں۔ کباب میں بناؤں گی۔" مریم بولی۔ "باقی کام یہ ریشم کرلے گی۔"

"ہوں!" وہ ہنوز اپنی سوچوں کا شکار تھی۔

"شبنم اور اس میں کس قدر بے تکلفی تھی۔ کتنی باتیں کیا کرتی تھیں وہ لوگ۔ اور اب شبنم اسے بمشکل مخاطب کرتی تھی۔ دوسرے لوگوں سے محو گفتگو رہتی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو بجو؟" مریم نے اس کی صورت دیکھی۔

"کچھ بھی نہیں!" وہ چاول بھگونے لگی۔ "میں سوچ رہی ہوں۔ عنبرین نے مجھے جاب کے بارے میں اب تک کچھ نہیں بتایا۔ کہہ رہی تھی، اس کے کوئی رشتے کے ماموں ہیں، وہ اس سلسلے میں میری مدد کرسکتے ہیں۔"

"یہ عنبرین باجی بھی محض باتیں ہی بناسکتی ہیں۔" ریشم کو تو موقع ملنا چاہیے تھا۔

"یونہی آپ پر رعب ڈالنے کو کہہ دیا ہوگا۔"

"نہیں خیر!" نیلم نے دوست کی سائیڈ لی۔ "اب وہ ایسی بھی نہیں ہے۔"

''بجو! آپ جاب کرلیں گی تو میں کالج جانا چھوڑ دوں گی۔'' مریم چولہا جلا کر ہانڈی رکھتے ہوئے بولی۔

''کیوں؟'' نیلم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ابھی تو آپ گھر سنبھالتی ہیں۔ کھانا پکاتی ہیں، صفائی کرتی ہیں، اماں کا خیال رکھتی ہیں۔ آپ جاب کرلیں گی تو پیچھے سے یہ سارے کام کون کرے گا؟''

''میں واپس آکر سب کرلیا کروں گی۔'' اس نے مریم کو جھڑک دیا۔ ''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ اپنی پڑھائی ضرور مکمل کرنا ورنہ انسان کسی کام کا نہیں رہتا!''

''میں پرائیویٹ امتحان دے لوں گی۔ بس بجو! میرا دل بھی نہیں چاہتا کالج جانے کو۔ آپ اکیلی اتنا سارا کام کرتی ہیں۔ یہ سوچ کر کالج میں بھی میرا دل نہیں لگتا۔ یوں بھی اب ہمیں بھی تو کچھ سلیقہ، کوئی گھرداری آنی چاہیے ناں!''

نیلم نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''تو یہ کہو کہ گھرداری کرنی ہے۔''

''کچھ بھی سمجھ لیں!'' اس نے سر ہلایا۔

''اور ریشم!'' اس نے ریشم کی طرف دیکھا۔ ''اس کے کیا ارادے ہیں؟''

''مجھے تو پڑھنا ہے بجو! بہت زیادہ پڑھنا ہے۔'' وہ جوش سے بولی۔ ''ابھی امتحان دے لوں تو پھر یونیورسٹی میں ایڈمیشن لوں گی۔''

''انشاءاللہ۔'' وہ مسکرائی تھی۔ ''وقار بھائی کو بھی بہت ارمان تھا، ہم سب کو بہت آگے تک جاتا دیکھنے کا۔''

کھانا تیار ہوا ہی تھا کہ یوسف آگئے۔ ریشم اور مریم باقی کام چھوڑ چھاڑ اندر جا کر بیٹھ گئیں۔ وہ وہیں بیٹھی چھوٹے چھوٹے کام نپٹانے لگی۔

''کام ہوا نہیں بجو؟''

''آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ شبنم نجانے کب باورچی خانے کے دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ اس کی نگاہوں میں کوئی ایسی بات تھی کہ اس نے بے اختیار نظریں چرالیں۔

''بس ذرا یہ بکھرا وا سمیٹ رہی ہوں۔ ریشم اور مریم کام کم کرتی ہیں، چیزیں زیادہ پھیلاتی ہیں۔''

''کب تک کترائیں گی بجو؟'' وہ طنز سے ہنس پڑی۔ ''بھاگنے کی کوئی حد بھی تو ہو؟ یہاں تو زندگی بھر کا ناتا ہے۔ آپ کب تک مریم اور ریشم کی بکھرائی ہوئی چیزیں سمیٹتی رہیں گی؟''

''نیلم نے سر اٹھا کر اسے حیرانی سے دیکھا۔

''شبنم! کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ کیسی باتیں کرنے لگی ہو؟''

''جو کچھ سوجھتا ہے، وہی بولتی ہوں بجو! اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے۔ جو راستہ زبردستی میرے پیروں میں ڈال دیا گیا ہے مجھے مجبوراً اسی پر چلنا ہے۔ پیر زخمی ہوتے ہیں تو زبان بھی تلخ ہوتی جاتی ہے۔''

''شبنم!'' وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ ''کیا بات ہے؟ تم خوش کیوں نہیں رہتیں؟ یوسف کا رویہ کیسا ہے تمہارے ساتھ؟ کچھ کہا ہے انہوں نے تم سے؟''

''یہ وہ سوال ہیں بجو! جن میں سے ہر ایک کا جواب آپ کے پاس موجود ہے۔ مجھ سے کیا پوچھتی ہیں آپ، پوچھنا تو مجھے چاہیے آپ سے کہ میں خوش کیوں نہیں ہوں، یوسف کا رویہ میرے ساتھ اگر برا ہے تو کیوں ہے...... مجھے پوچھنے دیں بجو کہ میرا اس سارے معاملے میں کیا قصور تھا؟''

''شبنم، میری بہن......'' وہ بری طرح گھبرا گئی۔ ''یقین کرو، میں نے تو کبھی تمہارا برا نہیں چاہا۔ اگر...... اگر مجھے علم ہوتا کہ یوسف...... اگر مجھے ان کے ارادوں کی خبر ہوتی......''

''کس بات سے بے خبر تھیں۔ بجو آپ؟'' وہ دکھ سے بولی۔ ''اس سے کہ یوسف اور آپ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں؟ یا اس سے کہ میرا رشتہ لانے کے پیچھے ایک مقصد ضد کے سوا دوسرا کوئی جذبہ نہ تھا۔ مجھ سے یہ رشتہ قبول کر لینے کی ضد بھی تو آپ ہی نے کی تھی ناں...... بے خبری میں سارے کام کرتی گئیں آپ؟''

اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ زلفی، ناصر اور انجم اندر داخل ہوئے۔

''السلام علیکم۔'' وہ تینوں بھی شبنم کو دیکھ کر خوش ہو گئے تھے۔

''بجو! سخت بھوک لگی ہے......'' ناصر نے اندر جھانکا۔ ''اور خوشبوئیں بہت کچھ بتا رہی ہیں۔''

''تم لوگ اندر چلو...... کپڑے بدلو۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔'' وہ مردہ پن سے بولی۔

شبنم کی باتوں نے اسے جیسے بالکل نچوڑ دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا، اس کے تن میں جان نہیں رہی۔

''یوسف! میں نے آپ کو کتنا غلط سمجھا تھا!''

وہ آنسو پیتے ہوئے سوچ رہی تھی۔



''ہیلو ہیلو......'' اس نے سر اندر کر کے چہکتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

''صبا نے چونک کر پیچھے دیکھا اور مسکرا دی۔

''آؤ شہروز!'' اس نے ریموٹ سے ٹی وی آف کرتے ہوئے کہا۔ ''بڑے دنوں کے بعد شکل دکھائی۔''

''ہر چند کہ دکھائی نہیں چاہیے تھی!'' وہ اس کے قریب کشن پر آ بیٹھا۔

''کیوں؟''

''آخر انتقام کا جذبہ بھی تو کوئی معنی رکھتا ہے ناں۔ آپ نے ہمارے گھر آنا چھوڑ رکھا ہے۔ انتقاماً ہمیں بھی آپ کے گھر کے سامنے سے منہ پھیر کر گزرنا چاہیے لیکن وہ کیا کہا ہے کسی شاعر نے۔

ہم وفائیں کر کے رکھتے ہیں وفاؤں کی امید

دوستی میں اس قدر سوداگری بھی جرم ہے

تو جناب! ہم فطرتاً سیدھے سادے، کرنے والے لوگ ہیں۔ آپ کی بے اعتنائی سے کیا دل برداشتہ ہوں گے۔ چلیے آئیے ملتے!''

''وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔

''ختم ہو گئی داستان غم! اب کچھ مجھ غریب بندی سے بھی سنیے اور اصل وہ جو مہمان خواتین آپ کے گھر آ کر ٹھہری ہوئی ہیں ناں، وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ جہاں بھی گھومنے جائیں گی۔ مجھے بھی ساتھ لے کر جائیں گی میں نے سوچا پتہ نہیں امی یہ سب پسند کریں بھی یا نہیں۔ یہی سوچ کر کچھ دنوں کے لیے روپوش ہو گئی تھی تاکہ آپ لوگ اچھی طرح گھوم پھر لیں تو پھر میں منظر عام پر آؤں!''

''چچ چچ چچ..... بے چاری لڑکیاں!'' اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''چاہتے ہوئے بھی وہ سب کچھ نہیں کہہ پائیں جو ان کے دل میں ہوتا ہے۔ سیدھی بات کیجیے صبا بی بی، کہ فیروز بھائی سے بچنے کے لیے یہ روپوشی اختیار کی آپ نے۔ بے چاری آنٹی کو کیوں بدنام کرتی ہیں۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ فیروز بھائی بھی آپ ہی کی ٹکر کے ہیں، نہ زیادہ، نہ کم۔ مجال ہے جو کسی موقع پر دستیاب ہوتے ہوں۔ ہم ہر جگہ ان کے بغیر گھومنے گئے اور نبیلہ بی بی کا چہرہ اترا اترا سا رہا!''

''کیا مطلب؟'' اس نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''مطلب!'' اس نے سر کھجایا۔ ''خیر جانے دیجیے۔ میں کسی کے پوشیدہ جذبات کی تشہیر پسند نہیں کرتا۔ دوسری بات یہ کہ وہ دونوں مہمان خواتین بمعہ میری والدہ محترمہ کے آپ کی والدہ محترمہ کے پاس باہر لان میں تشریف فرما ہیں۔ چل کر سواگت کیجیے اور کچھ پیٹ پوجا کا بندوبست کیجیے۔ ایمان سے، مجھے چائے کے ساتھ کچھ اسنیکس کی شدید طلب محسوس ہو رہی ہے۔''

''کتنے گھامڑ ہو شہروز!'' وہ جھلا گئی۔ ''گھنٹہ بھر سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے ہو اور یہ بات اب بتا رہے ہو۔''

وہ اٹھ کر چپلیں پہننے لگی۔

''میرا کیا قصور ہے۔'' اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ ''آپ نے ہی باتوں میں لگا دیا تھا.....''

اسے تیزی سے باہر جاتا دیکھ کر وہ بھی لپک کر اس کے پیچھے ہو لیا۔

''السلام علیکم......'' اس نے خوش دلی سے سب کو سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام.....'' عفت خانم نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ''ادھر آؤ بیٹی۔ کہاں تھیں اتنے دنوں سے؟''

وہ جا کر ان کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"گھر ہی میں تھی آنٹی! میں کہاں جاؤں گی۔ بس طبیعت کچھ ماندی ماندی تھی۔ باہر نکلنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا!"

"یہ ایسی ہی موڈی لڑکی ہے۔" نجمہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔ "یا تو روز کہیں نہ کہیں جانا ہوتا ہے یا ہفتوں گھر میں بند رہتی ہے۔"

"کیا پئیں گی آپ لوگ......" وہ نبیلہ اور عقیلہ سے مخاطب ہوئی۔ "ٹھنڈا پسند کریں گی یا چائے بنالوں؟"

"نہیں نہیں...... تکلفات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے......" عقیلہ جلدی سے بول پڑی۔ "ہم تو بس تم سے ملنے آئے ہیں۔"

"چائے بنالیں!" وہ پیچھے کھڑا ابغور سب کچھ سن رہا تھا۔ "موسم بھی اچھا ہو رہا ہے...... پکوڑوں کے ساتھ چائے بڑا لطف دے گی۔"

"عفت خانم نے اسے گھورا جب کہ تینوں ہنس دی تھیں۔

"جاؤ بیٹی...... بنالو پکوڑے......" نجمہ بیگم بھی ہنس دی تھیں۔

"وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر اندر آ گئی۔ فریزر سے شامی کباب کی ٹرے نکال کر رکھی اور چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر بیسن گھولنے لگی۔

"میں کچھ مدد کر سکتی ہوں......"

اس نے مڑ کر دیکھا، پیچھے نبیلہ کھڑی تھی۔

"شکریہ! میں بس ابھی بنا لیتی ہوں۔ تم بیٹھو ناں، وہ اسٹول رکھا ہے!"

"لاؤ...... یہ میں تل لیتی ہوں......"

اس کے لاکھ منع کرنے پر بھی اس نے شامی کباب تلنا شروع کر دیے۔ صبا نے دوسرے چولہے پر کڑھائی رکھ لی۔

"بوریت تو محسوس نہیں ہو رہی ہے یہاں؟" پکوڑے بناتے ہوئے اس نے نبیلہ سے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں۔ حالانکہ میں اور عقیلہ پہلی بار اس گھر سے دور ہوئے ہیں۔ پھر بھی بہت اچھا لگ رہا ہے۔ انجوائے کر رہے ہیں......"

"ہاں...... گھومنے پھرنے میں مزا تو آتا ہے......" اس نے سر ہلایا۔

"تم سے کتنا کہا تھا ہم لوگوں نے۔ لیکن تم تو چھپ کر بیٹھ گئیں۔" اس نے شکایت کی، صبا کھل کھلا کر خاموش ہو گئی۔

"شہروز مس کر رہا تمہیں......" وہ تلے ہوئے کباب احتیاط سے پلیٹ میں نکالنے لگی۔

"بالکل پاگل ہے وہ......" صبا ہنس دی۔

"ہر وقت، ہر لمحہ تمہارا نام ورد زبان رکھتا ہے......" نبیلہ نے مسکرا کر اسے دیکھا "تم بہت لکی ہو صبا۔ اتنے زیادہ محبت کرنے والے لوگ کسی کسی کو ملتے ہیں......"

"شہروز سب کے لیے ایسا ہے...... صرف میرے لیے نہیں۔" اس نے بات واضح کی۔

"ارے......" وہ ہنس دی۔ "یہ کیا بات ہوئی۔ جتنی اہمیت تمہاری ہے، کسی اور کی کیسے ہو سکتی ہے۔ کیا تم دونوں ایک دوسرے کو پسند نہیں

کرتے؟" وہ چائے کیتلی میں انڈیل رہی تھی۔ اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

"کیا؟ تم سے کس نے کہا؟"

"مجھے آنٹی نے بتایا ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "لیکن تم اتنی پریشان کیوں ہو گئی ہو؟ اس میں بھلا کیا بری بات ہے۔"

وہ بے حد پریشان سے کھڑی کوئی جواب سوچ ہی رہی تھی کہ شہروز اور عقیلہ اندر آ گئے۔

"یعنی دونوں خواتین حد درجہ سست اور کاہل ہیں۔ ابھی تک چند پکوڑے نہیں تلے گئے۔ ارے واہ! شامی کباب بھی! میں اپنے سابقہ الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

پھر اس نے گم صم کھڑی صبا کی آنکھوں کے آگے ہاتھ ہلایا۔

"محترمہ پریشان نہ ہوں..... ہم سب تھوڑا تھوڑا سا کھائیں گے۔"

"آں..... چلو، باہر چلو۔ میں سب وہیں لا رہی ہوں....." وہ چونک کر چیزیں ٹرے میں رکھنے لگی۔

لان میں نجمہ بیگم اور عفت خانم محو گفتگو تھیں۔

"صبا نے سب کو چیزیں سرو کیں اور خود چائے بنانے لگی۔

"تم کس الجھن میں مبتلا ہو گئی ہو؟"

نبیلہ نے اس سے چائے لیتے ہوئے اسے مسکرا کر دیکھا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں....." وہ غائب دماغی سے مسکرائی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"شاید تمہیں اچھا نہیں لگا کہ تمہارے پرسنل جذبات سے دوسرے غیر متعلقہ لوگ بھی آگاہ ہو گئے لیکن یقین مانو، مجھے تم بالکل بہنوں کی طرح عزیز ہو گئی ہو۔ تمہاری بات جیسے میری اپنی بات ہے!"

"میں تمہارے خلوص کی قدر کرتی ہوں نبیلہ....." وہ الجھ کر بولی۔ "لیکن..... لیکن ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں......"

"کیا مطلب؟" اسے حیرانی ہوئی۔

"مطلب یہ کہ عفت آنٹی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اور شہروز تو بالکل سگے بہن بھائیوں جیسے ہیں۔"

"کیا؟" وہ جیسے بے ہوش ہوتے ہوتے بچی،

"میں سچ کہہ رہی ہوں...... جانے آنٹی کو یہ غلط فہمی کیسے ہو گئی؟" وہ گہری سوچ میں تھی۔

"انہیں غالباً فیروز بھائی نے بتایا تھا۔" نبیلہ اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہولے سے بولی۔

"اوہ!" صبا نے گہری سانس بھری۔ "تو یہ بات ہے!"

"قدرے فاصلے پر بیٹھا شہروز جیسے آندھیوں کی زد پر تھا۔ اس نے ہر بات پوری طرح سنی اور سمجھی تھی۔ شرمندگی اور غم و غصے کے ملے جلے

جذبات نے اس کے پورے وجود کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

وہ کپ رکھ کر اٹھا اور تیزی سے گیٹ کی سمت بڑھ گیا۔

''یہ شہروز کہاں چل دیا؟'' عفت خانم نے حیرت سے اسے جاتا دیکھا۔

''کوئی کام یاد آ گیا ہوگا......''

''عقیلہ نے جواب دیا۔ باقی لوگ تو اپنی اپنی سوچوں میں الجھے بیٹھے تھے۔

❀......❀......❀

''اندر آ سکتی ہوں؟'' دروازے پر دستک دے کر اس نے اندر جھانکا تھا۔

بستر پر لیٹ کر چھت کو تکتا ہوا فیروز احمد اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''آیئے!'' اس نے شائستگی سے پکارا۔

نبیلہ چائے لے کر اندر چلی آئی۔

''میں نے سوچا آپ کی چائے روزانہ کی طرح ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اس لیے یہیں دینے کے لیے چلی آئی۔''

اس نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''شکریہ! ویسے آپ نے بے کار زحمت کی۔ مجھے تو ہر قسم کی چائے خاموشی سے پی لینے کی عادت ہے۔

''وہ کیوں؟'' وہ مسکرائی۔

''اپنی غائب دماغی کی وجہ سے۔'' وہ بھی دھیرے سے مسکرایا۔ ''خود چائے بناؤں تو دو دفعہ چینی ملا لیتا ہوں اور کبھی سرے سے چینی ڈالتا ہی نہیں۔ کوئی اور بنا کر لا دے تو چائے برف بن جاتی ہے اور مجھے یاد ہی نہیں رہتا کہ چائے بھی پینی ہے......''

''اس درجہ بھلکڑ پن؟'' وہ ہنسی۔ ''پھر اتنا پڑھ کیسے لیتے ہیں آپ؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

''گھر میں ہوتے ہوئے بھی آپ گھر کے لوگوں میں بیٹھنے کے بجائے اکیلے کمرے میں رہتے ہیں، یہ تنہائی پسندی ہے یا اور کچھ؟''

''جی...... مجھے تنہا رہنا اچھا لگتا ہے۔'' اسے اب نبیلہ کی موجودگی سے کوفت ہو رہی تھی۔

''بہت مختلف ہیں آپ......'' وہ اسے غور سے دیکھ کر بولی۔ ''آپ کی پرسنالٹی بہت مضبوط ہے۔ آپ کو دیکھ کر آپ جیسا ہی بننے کو جی کرتا ہے۔''

لمحہ بھر میں اس کی کیفیت بدلی تھی۔ ہونٹ بھینچ گئے اور چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ چائے کا کپ ایک طرف پٹخ کر وہ اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ نبیلہ گھبرا کر ایک طرف ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں اچانک تبدیلی کا مطلب بالکل نہیں آیا تھا۔

''کمال ہے.....'' وہ بڑبڑائی۔ ''انہیں کیا ہو گیا؟''

جمنا چائے کا کپ لے کر اندر داخل ہوئی تھی۔

''بائیں! یہ فیروز بیٹا کہاں گئے اور بیٹا تم یہاں بیٹھی چائے پیتی ہو۔ باہر چلو ناں!''

''یہ چائے میں فیروز بھائی کے لیے ہی لائی تھی۔ لیکن وہ یونہی چھوڑ کر چلے گئے۔''

ہاں.....وہ یونہی ہیں۔'' جمنا نے اطمینان سے دوسرا کپ بھی اٹھالیا۔ ''مرضی کے مالک۔ جی میں آیا تو دو کپ پئیں گے یا ایک بھی چھوڑ کر جائیں گے..... بیٹا تم باہر آؤ تمہیں گرم چائے بنا کر دیتے ہیں۔''

وہ چلی گئی۔ نبیلہ وہاں بیٹھی شیلف سے جھانکتی کتابوں کو دیکھتی رہی۔



''ارے بھئی..... یہ کیا..... یقین نہیں آتا آنکھوں پر.....'' عنبرین اسے دیکھ کر زور سے ہنسی تھی۔ ''یعنی محترمہ نے قسم توڑ ہی دی نہ آنے کی۔''

''میں نے ایسی کوئی قسم کھائی ہی نہیں تھی تو توڑوں گی کیا.....'' وہ اداسی سے مسکرائی۔

''چلو باورچی خانے میں چلتے ہیں۔ میں روٹیاں بھی ڈال لوں گی۔''

وہ اسے لے کر باورچی خانے میں آ گئی۔ بلو خالہ کپ میں چائے نکال رہی تھیں۔

''السلام وعلیکم خالہ؟''

اسے نجانے کیوں اپنا آپ ہر کسی کے سامنے شرمندہ شرمندہ، مجرم مجرم سا لگتا تھا۔ جیسے جو کچھ بھی ہوا تھا اس کا اپنا تحریر کیا ہوا تھا۔

''وعلیکم السلام۔ بڑے دن میں آئیں بیٹی؟'' انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''جی خالہ شبنم کی شادی کے بعد فرصت ہی نہیں ملتی!''

''نکالا کرو بیٹی! آیا کرو۔ جی بہلتا ہے۔ اب جو کچھ بیٹا تمہارے ساتھ ہوا قسمت تھی۔ یوں دل چھوٹا کر کے گھر میں بیٹھ جاؤ گی تو اور کملا جاؤ گی.....''

انہوں نے لہجے میں حد درجہ ہمدردی سمو کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اسے سخت کوفت محسوس ہونے لگی۔ انہی باتوں سے بچنے کے لیے اس نے یہاں کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔

بلو خالہ باورچی خانے سے نکلیں تو اس نے سکون کی سانس لی۔

''بیٹھو نیلم!'' عنبرین نے اسے پیڑھی دی۔

''عنبرین..... وہ اس معاملے کا کیا بنا؟'' وہ جلد از جلد گھر واپس جانا چاہتی تھی۔

"ہاں وہ......" وہ نجانے کیوں شرمائی۔ "امی سے پوچھ لینا!"

"کیا مطلب؟"

اس کے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ تو اس جاب کے متعلق پوچھنے آئی تھی جس کا گزشتہ دنوں عنبرین نے ذکر کیا تھا۔

"بھئی۔ ان کے گھر والے آئے تھے بات کرنے۔ امی نے تین مہینے بعد کی تاریخ دے دی ہے۔ بس سمجھو تین مہینے کا ساتھ ہے اپنا۔"

"روٹی توے پر ڈال کر اس نے مسکرا کر نیلم کو دیکھا۔

"اوہ!" بات سمجھ کر اس نے سانس بھری۔ "مبارک ہو۔"

"ان کی بہن بتا رہی تھیں کہ وہ تو بہت بے قرار ہیں۔" عنبرین ہنسی۔ "تین مہینے انہیں تین سال کے برابر لگ رہے ہیں......"

وہ خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔ عمر تو وہی تھی لیکن کچھ ہی عرصے کے تجربات نے اسے جیسے سو سال کا کر دیا تھا۔ ایسی باتوں میں دل چسپی کب کی ختم ہو گئی تھی۔

"اور تم سناؤ۔" اسے اپنی باتوں سے فرصت ملی تو اس سے پوچھنے لگی۔ "تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

"اس جاب کا کیا ہوا عنبرین۔ تم نے مجھے بتایا تھا ناں؟"

"او ہاں......" اسے یاد آیا۔ "میں نے معلوم تو کر لیا تھا لیکن میں بتانا بھول گئی۔ نیلم! تمہیں ایک کمپنی میں لیڈی آپریٹر کی جاب مل جائے گی۔ تنخواہ ڈھائی سے ساڑھے تین ہزار تک ہو سکتی ہے۔"

"بس؟" وہ ہونق رہ گئی۔ "یہ تو بہت کم ہے!"

"لو......اب تم محض بی اے پاس ہو۔ نہ کوئی ایکسٹرا کوالٹی نہ تجربہ۔ اس سے زیادہ بھلا کیا ملے گی۔ ویسے تم اپنے طور پر کوشش کر کے دیکھنا چاہو تو دیکھ لو۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ وقار بھائی کی تنخواہ تو دس ہزار کے قریب تھی۔ اس میں بھی بس عزت سے گزارہ ہو پاتا تھا۔ ان کے گھر کے افراد کے لحاظ سے دس ہزار بھی کم پڑتے تھے۔

"تین ساڑھے تین ہزار میں بھلا کیا ہو سکتا ہے؟" اس نے سوچا۔ "لیکن عنبرین بھی ٹھیک کہتی ہے۔"

"اچھا عنبرین......میں چلتی ہوں!"

"باہر اندھیرا ہوتا دیکھ کر وہ کھڑی ہوئی۔

"ارے ارے......بیٹھو ناں بھئی۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ اتنے دنوں کے بعد آئی ہو اور آتے ہی جانے کی سوچ رہی ہے۔ کھانا کھا کر جانا!"

"پھر کبھی سہی......فی الوقت تو میں نوکری کا ہی معلوم کرنے آئی تھی!"

''اگر یہ جاب کرنی ہو تو بتا دینا۔ میں تمہیں ماموں کے ساتھ بھیج دوں گی۔ ایک ہی دن میں کام ہو جائے گا۔ ویسے تنخواہ بڑھ بھی جاتی ہے!''

''وہ اسے چھوڑنے دروازے تک آئی تھی۔ نیلم نے سر ہلایا اور باہر نکل آئی۔

''السلام و علیکم جی!''

''کسی نے بڑے تپاک سے سلام کیا تھا۔ وہ جو اپنے خیال میں گم تھی، چونک اٹھی۔

''اوہ اتم۔''

راجہ کو قریب کھڑے مسکراتا دیکھ کر اس کی جان جل گئی۔

''کیسی ہیں آپ...... آپ نے تو باہر نکلنا تو کیا جھانکنا بھی چھوڑ دیا۔''

خلاف توقع وہ حد درجہ شائستگی سے بات کر رہا تھا۔ حلیہ بھی نسبتاً بہتر تھا۔

''تم نے یہ حرکتیں چھوڑیں نہیں...... سدھرے نہیں؟''

اس نے ایک تیکھی نگاہ اس پر ڈالی۔

''اجی سب کچھ چھوڑ دیا ہے ایک آپ کو پانے کے لیے۔ بس ایک نظر کرم ہو تو......'' وہ دانت پیس کر آگے بڑھ گئی۔

''تری اک نگاہ کی بات ہے، مری زندگی کا سوال ہے......'' وہ گنگنا رہا تھا۔

نیلم نے زیر لب اسے ہزاروں گالیاں دے ڈالیں۔



''بیٹی...... یہ کیا حلیہ بنائے رکھتی ہو سارا دن...... جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں تمہاری شادی کو اور تمہاری صورت دیکھ کر خوف آتا ہے۔ بکھرے بال، ملگجے کپڑے، سوکھے ہونٹ، خالی آنکھیں۔ ارے ہم نے تو سال بھر پلنگ سے پیر نہیں اتارا تھا۔ کئی سال تو گوٹے لچکے کے بغیر کپڑے نہیں بناتے تھے۔ نجانے آج کل کی لڑکیاں سادگی کے مرض میں کیوں اس قدر مبتلا ہیں۔ ریشمی جوڑوں سے انہیں کوفت ہو، بناؤ سنگھار اور زیور سے یہ کترائیں۔ اللہ کی پناہ!''

''اس نے مسلسل بڑبڑاتی چچی کو بیزاری سے دیکھا

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔

''ارے بیٹی! میں کہتی ہوں ہنسا بولا کرو۔ کیوں ایسی رونی صورت بنا کر بیٹھی ہو کہ دیکھ کر غصہ آئے۔

وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ شبنم خاموشی سے بیٹھی ہونٹ چباتی رہی۔ جو ناانصافی اس کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ اس میں ساری دنیا کو برابر کا شریک سمجھتی تھی۔ اسے ہر کسی پر غصہ آتا تھا۔ ہر بات پر جھنجلاہٹ ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا جو مخاطب کرے اسے دس باتیں سنائے۔ لیکن پھر بھی

وہ خود پر جبر کئے خاموش رہتی تھی۔

"دیکھو بیٹی......!" چچی نے آگے ہو کر رازداری سے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔ "تمہارے ہی بھلے کے لیے کہتی ہوں میاں کے دل پر تا زندگی راج کرنا چاہتی ہو تو اپنے اطوار بدلو۔"

شبنم نے ان پر ایک طنز بھری نگاہ ڈالی۔

"گر کی بات بتاتی ہوں، ایسی اجڑی بسری صورت دیکھ کر میاں سخت متنفر ہوتے ہیں۔ بڑھاپا آ جائے لیکن بیوی انہیں نک سک سے درست اور جچی ہی چاہیے ہوتی ہے۔ میری مانو تو روز یوسف میاں کے آنے سے پہلے اپنا حلیہ درست کر لیا کرو۔ خدا نے ایسی موہنی صورت دی ہے کہ بندہ نہ بھی چاہے تو نظر بار بار اٹھے۔ اور پھر مردوں کے دماغ تو اکثر بیشتر خراب ہوتے ہی رہتے ہیں۔ شادی سے پہلے ایک کے پیچھے تو شادی کے بعد میں دس کے پیچھے پڑتے ہیں۔ بیویاں ایسے ہمت چھوڑ کر بیٹھ جائیں تو مانو ایک گھر نہ بس پائے۔"

"میں کیا کروں چچی!" وہ جھنجلا کر بول پڑی۔

"ارے مرد ہو۔ ہمت پکڑو۔ میاں کو اپنا بناؤ۔"

"مجھے کیا پڑی ہے۔" وہ حد درجہ بیزاری سے بولی۔

"ہائیں!" وہ ہونٹ پر انگلی رکھ کر اسے دیکھنے لگیں، "یہ خوب کہی! تمہیں نہیں تو کس کو پڑے گی؟ کیا پڑوسن کو؟"

"خدا کے لیے چچی جان مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں!" اس نے تھک کر درخواست کی۔

"ہرگز نہیں! تم جیسی کم عقل اور جذباتی لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑنا تو مزید خرابی کا باعث بن سکتا ہے۔ تمہیں تو میں تربیت دوں گی ورنہ تم تو اپنا بستا گھر اجاڑ لوگی۔ لو اور سنو۔ میاں ایک کا ہو یا دس کا، انہیں فکر نہیں۔ چلو اب اٹھو اور وہ سرخ جوڑا پہنو جس پر میں نے منقیش ڈلوائی ہے۔"

"اف!" اسے جھرجھری آ گئی۔ "ہرگز نہیں۔"

"ارے احمق ہو کہ......" وہ سخت بگڑ گئیں۔ "کیا شادی ہوتے ہی ساس سمجھنے لگی ہو مجھے؟ پہلے تو میری بیٹیوں جیسی تھیں۔"

"میں ابھی بھی آپ کی بیٹی ہوں لیکن......" وہ زچ ہوئی۔

"بس تو پھر اٹھو۔ تمہیں میری قسم۔ وہی جوڑا پہنو اور بج سنور کر دکھاؤ مجھے!"

وہ سخت مشکل کا شکار ہو گئی۔ اسے تو زندگی سے بیزاری ہو رہی تھی۔ جینا مشکل نظر آ رہا تھا، اس پر شاہی احکامات!

ناچار وہ اٹھ کر اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔ الماری میں اس کے سارے کپڑے آمنہ نے استری کر کے لگا دیے تھے۔ چچی جان کا پسندیدہ جوڑا نکال کر اس نے انتہائی کوفت بھرے انداز میں بستر پر ڈالا اور نہانے کے لیے گھس گئی۔

"جس وقت وہ آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں پراندہ ڈال رہی تھی، یوسف تھکے ہارے اندر چلے آئے۔

"السلام علیکم!" انہوں نے اس پر نگاہ ڈالے بغیر اس کی جانب پشت کر کے بیٹھتے ہوئے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام......!" وہ ہولے سے بڑبڑائی۔

"کہاں جانا ہے؟" وہ جوتے اتارنے لگے۔

"جی؟" اسے اچنبھا ہوا۔

"امی کہہ رہی ہیں، تمہیں کہیں گھومنے جانا ہے؟"

"انہوں نے مڑتے ہوئے پوچھا پھر ایک لمحے کو ذرا سے ٹھٹکے۔ زندگی میں پہلی بار انہیں اس طرح نظر آئی تھی۔ ورنہ انہوں نے تو شادی والے دن بھی نگاہ بھر کر نہ دیکھا تھا۔

سرخ چمکتا جوڑا پہنے، لبوں پر سرخ لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل لگائے، پراندے سے سجی چٹیا آگے ڈالے وہ ان کی بات پر حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

انہوں نے اس طرح ناگواری سے نظر ہٹائی جیسے کسی نامحرم پر پڑ گئی ہو۔

"میں ذرا نہا دھولوں۔ کھانا کھالوں پھر بتا دینا کہاں جانا ہے۔" وہ تولیہ اٹھا کر باتھ روم میں گھس گئے۔

شبنم کو وحیدہ چچی پر سخت غصہ آیا۔

"کس درجہ نیچا کر رہی ہیں وہ مجھے!" جلا کر بستر پر بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔ "یعنی یوسف یہ سمجھیں کہ میں ان کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے مری جا رہی ہوں۔ بن سنور کر ان کا انتظار کر رہی ہوں...... میں...... میں کوئی بازاری عورت ہوں۔"

آنسو کاجل کو لے کر اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔

جس وقت یوسف باہر نکلے وہ کپڑے بدل، بال بکھرائے، تکیے میں منہ دیے اوندھی لیٹی تھی۔



دانتوں میں ہونٹ کاٹتے ہوئے غزالہ کسی سوچ میں تھی۔

''کیا بات ہے؟''

''ریشم نے جرنل مکمل کر کے پین بند کرتے ہوئے اس پر ایک نگاہ ڈالی۔

''آج تو بڑی چپ چپ سی ہو؟ اپنے منگیتر سے لڑائی تو نہیں کر لی؟''

''نہیں......'' وہ بے دلی سے بولی ''دو ہفتوں سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ لڑائی کس بات پر ہونی ہے۔''

''اچھا! تو نہ ملنے کی وجہ سے اداس ہو۔'' ریشم ہنس دی۔

''مسئلہ یہ ہے کہ بھائی کو شاید اس معاملے کا علم ہو گیا ہے۔'' وہ تنکا چبانے لگی۔ ''انہوں نے مجھ پر پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ اکیلے کالج نہ جاؤ۔ بے وجہ گھر سے نہ نکلو، گلی میں نہ جھانکو، چھت پر مت جاؤ...... ہونہہ!''

''تو ٹھیک ہی تو ہے غزالہ!'' وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ''تم ایک شریف لڑکی ہو اس طرح گھر والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کسی لڑکے سے باہر ملنا، گھومنا پھرنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ لڑکیوں کو اپنی عزت اور وقار کا پاس ہونا چاہیے!''

''یہ تم مریم کب سے بن گئیں؟'' اس نے منہ بنایا۔ ''ایک تو میں اس قدر پریشان ہوں اوپر سے بی اماں کی نصیحتیں! اور سر میں درد ہوتا ہے۔''

''لیکن پریشانی کا سبب کیا ہے؟'' وہ زچ ہوئی۔ اگر اتنی ہی سیریس ہو تو اپنے بھائی سے ملوا دو اس لڑکے کو!''

''پاگل ہوئی ہو؟'' غزالہ نے آنکھیں نکالیں۔ ''تمہیں ارشد بھائی کا پتا نہیں ہے۔ خود زمانے بھر میں آوارہ گردی کرتے پھرتے ہیں اور بہنوں کو اس طرح نگاہوں میں رکھتے ہیں جیسے بھاگ ہی تو جائیں گی۔ وہ تو میری کھال کھینچ کر الٹا لٹکا دیں گے اگر انہیں اس معاملے کی بھنک بھی پڑ گئی!''

''پھر آخر کرو گی کیا؟''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آتا......'' وہ فکر مندی سے بولی۔ ''اوپر سے ایک نئی مصیبت اور سر پر آ کھڑی ہوئی ہے!''

''وہ کیا؟''

''ہمارے ایک کزن ہیں۔ شریف صاحب اسم با مسمیٰ ہیں۔ حد درجہ شریف، پانچ وقت کے نمازی۔ کسی فرم میں جاب کرتے ہیں۔ ہفتہ بھر پہلے وہ امی سے بات کر کے گئے ہیں ان کی فرم کا مالک کسی غریب گھرانے کی شریف اور پاکیزہ لڑکی سے شادی کے خواہش مند ہیں۔ جہیز یا کوئی مطالبہ بھی نہیں ہے۔ بس یہ کہ لڑکی ہنر مند سلیقہ شعار ہو۔''

''تو پھر؟ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟'' ریشم نے احمقوں کی طرح اسے دیکھا۔

''ارے بدھو! امی بری طرح سے اس رشتے پر ریجھ گئی ہیں۔ انہوں نے شریف بھائی کو سختی سے تاکید کی ہے ان حضرت کو گھر لانے کی۔

اور کہا ہے کہ رشتہ ہرگز کہیں اور نہ جانے پائے۔"

"ہائے اللہ!" ریشم نے حسرت سے سانس بھری۔ "کتنا اچھا ہوتا اگر یہ رشتہ ہماری نیلی بجو کے لیے آجاتا۔"

"ہزار مرتبہ آتا!" غزالہ نے منہ بنایا۔ "میری تو جان اٹک کر رہ گئی ہے۔"

"کتنی بے وقوف ہو غزالہ تم......" ریشم نے اسے گھر کا۔ "نہ گھر کی رہو گی نہ گھاٹ کی۔ باز آؤ اس بے کار جھوٹی محبت سے اور چپ چاپ اپنے والدین کی پسند سے شادی کر لو۔ خوش رہو گی۔"

غزالہ نے اسے بری طرح سے گھورا اور کھڑی ہو گئی۔

"اچھی دوست ہو...... میں باز آئی ایسی دوست سے۔ ہونہہ!"

"غزالہ، ارے سنو تو سہی!" وہ پیچھے سے آوازیں دیتی رہ گئی۔



"آنٹی! یہ شہروز کو کیا ہو گیا ہے؟"

نیلہ فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں! میں بھی غور تو کر رہی ہوں۔ کچھ دن سے اکھڑا اکھڑا، بیزار بیزار سا لگتا ہے۔ حالانکہ میں نے کبھی اسے اس طرح نہیں دیکھا۔"

"ہمارے بچے کو نظر لگ گئی ہے۔" جمنا پیاز چھیلتے ہوئے بولی۔ "ہم شام کو مرچیں جلائیں گے۔ سفید کپڑا بھی پھیر کر جلا دیں گے۔"

"السلام وعلیکم!" فیروز احمد نے داخل ہوتے ہوئے سلام کیا۔

"تھکے ہارے انداز میں بائیک کی چابی میز پر ڈال کر وہ ستانے والے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جمنا بائی...... پانی تو پلائیں۔" اس نے جمنا کی طرف دیکھا۔

"میں لاتی ہوں۔" نیلہ کھڑی ہوئی۔

"ارے بیٹھو بیٹی...... ہم لاتے ہیں پانی......"

جمنا نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس سے پیشتر ہی کچن کی سمت بڑھ گئی تھی۔

"گھر بھر گیا ہے میرا!" عفت خانم نے مسکرا کر کہا۔ "دو بڑکیاں کیا آگئیں، ہر طرف رونق ہی رونق نظر آتی ہے۔"

وہ خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔

"آج کل فارغ ہو تو بہروز کے ساتھ آفس چلے جایا کرو۔ بیچارہ اکیلا سارا کاروبار سنبھالتا ہے!"

"فارغ کہاں ہوں امی!" اس نے نیلہ سے پانی کا گلاس لیا۔ "بس اب جلدی ہی رزلٹ آجائے گا پھر دیکھتے ہیں۔"

"آپ کے لیے چائے بنا دوں؟" وہ نرمی سے پوچھ رہی تھی۔

"جی؟ نہیں شکریہ۔" اس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ "آپ زحمت نہ کریں۔ جمنا ابھی فارغ ہو جائے گی۔"

"اس میں زحمت کی کیا بات ہے...... میں بنا لیتی ہوں چائے۔" وہ پھر مڑ گئی۔

"کیسی بھلی لڑکیاں ہیں۔" عفت خانم خوش ہو کر بولیں۔ "خوش اخلاق اور خوش سلیقہ۔"

"شیروز کہاں ہے؟ کل سے نظر نہیں آیا؟"

فیروز احمد نے بات ٹال کر ادھر ادھر دیکھا۔ ماں کے اشارے کنائے وہ بخوبی سمجھ سکتا تھا۔

"کچھ دن سے چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھتا رہتا ہے۔ نہ بات نہ چیت۔"

"کیوں؟" اس نے بھنویں سکیڑ کر ماں کو دیکھا۔ "کیا ہوا ہے اسے؟ آپ نے کچھ کہا ہے؟"

"ارے بیٹا آج تک میں نے تمہیں کب کچھ کہا ہے۔ میں بھلا کیا کہتی ہوں کسی کو۔" انہیں بیٹے کی بات بری لگ گئی۔

سوری امی! میں نے تو یونہی ایک بات پوچھی تھی۔ خیر! میں دیکھ لیتا ہوں۔"

"وہ اٹھ کر شیروز کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"کتنا ہی الگ الگ رہے...... میرا بیٹا دل سے بڑی محبت کرتا ہے سب سے!" انہوں نے فیروز کی فکر مندی پر مسکرا کر سوچا تھا۔

ہلکی سی دستک دے کر وہ اندر داخل ہوا تھا۔

"ارے...... بھائی آپ!" فیروز کو دیکھ کر اس نے کتاب بند کی۔ "آئیں۔ کوئی کام ہے؟ مجھے بلا لیا ہوتا۔"

"کیوں...... میں تمہارے کمرے میں نہیں آسکتا کیا؟" وہ مسکراتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"بالکل آسکتے ہیں۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"طبیعت خراب ہے؟" اس نے بغور بھائی کو دیکھا۔

"جی نہیں۔ خدا کا شکر ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟ امی بتا رہی ہیں، کچھ دن سے چپ چپ ہو۔ خیریت؟"

"آپ کو بھی امی کے بتانے سے علم ہوا ناں۔" وہ ہولے سے ہنس دیا۔ "ورنہ آپ کو کب کسی کی خبر رہتی ہے۔"

"کیا بات ہے؟ کوئی شکایت ہے مجھ سے!" وہ الجھ گیا۔ "بتاؤ یار! کیوں تنگ کرتے ہو؟"

"بس یہی ایک شکایت ہے آپ سے بھائی کہ آپ نے خود کو ہم سب سے بہت دور کر لیا ہے۔ اتنا کہ آپ کو ہر بات کسی اور سے پتا چلتی ہے۔ خود آپ نہ کچھ محسوس کرتے ہیں نہ سوچتے ہیں اور...... اور...... محسوس کرتے بھی ہیں تو وہ، جس کا حقیقت سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ باہر سے آنے والا شخص بھی سب سے پہلے یہی پوچھتا ہے کہ آپ سب سے الگ کیوں ہیں...... آپ اس گھر کے فرد کیوں نہیں لگتے!"

"میں تمہاری اداسی کی وجہ جاننے آیا تھا شیروز!" اس کا انداز کچھ برہم ہو گیا۔

"وجہ تو بتا رہا ہوں بھائی۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "میں اکیلا ہوں..... اور اب اس اکیلے پن کو شدت سے محسوس کرنے لگا ہوں۔ ماں کی محبت بہت کچھ ہوتی ہے بھائی لیکن بہن بھائیوں کا لاڈ پیار ایک الگ شے ہے۔ بھائی جان سے کیا شکایت کرنی کہ انکے پاس تو انکو اپنی زندگی کے لیے وقت نہیں ہے آپ کو دنیا میں ایک اپنی ذات کے سوا کچھ نہیں آتا..... بہت چاہتوں اور محبتوں سے ایک بہن کی محبت ڈھونڈی تھی میں نے...... اور، اور احساس محرومی کو ختم کرنے میں کامیاب ہوا ہی تھا کہ ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے طمانچہ مار کر پھر سے حقیقت کی دنیا میں لا کھڑا کیا ہے۔"

فیروز احمد ایک ٹک سے دیکھ رہا تھا۔

"مجھ سے کسی نے پوچھا بھی نہیں..... تصدیق کی ضرورت بھی نہیں سمجھی اور میرے پاک جذبوں کو آلودہ کر دیا گیا..... بتایئے بھائی! آپ نے مجھ سے کچھ بھی کہے بغیر، پوچھے بغیر امی سے یہ کیوں کہاں کہ میں اور صبا....."

وہ چاہتے ہوئے بھی بات مکمل نہ کر سکا۔ ادھوری چھوڑ کر ہونٹ چبانے لگا۔

"میں قصور وار ہوں شہروز!" اس نے شرمندگی سے نظریں جھکا لیں۔ "لیکن میں صبا سے معذرت کر چکا ہوں۔"

شہروز نے چونک کر سر اٹھایا۔

"کیا مطلب؟"

"صبا نے مجھے اسی طرح سرزنش کی تھی جیسے ابھی تم کر رہے ہو..... میں نے معافی بھی مانگ لی تھی اور اپنی سوچ پر شرمندہ بھی ہوا تھا۔"

"لیکن صبا نے تو مجھے نہیں بتایا!" اسے حیرت ہوئی۔

"پھر تم سے کس نے کہا؟" فیروز نے پوچھا۔

"جانے دیجیے....." اس نے منہ پھلایا۔ "اور ہاں امی حضور سے بھی آپ نے ہی معافی مانگنی ہے اور انہیں حقیقت سے آگاہ کرنا ہے۔"

"اور کچھ؟" وہ مسکرایا۔

"اور یہ کہ گھر والوں کو ان کے حصے کا وقت دیا کریں اور باہر والوں کو ان کے حصے کا......"

"بہتر جناب!" وہ خوش دلی سے ہنس دیا۔ "کوئی اور سزا ہو تو وہ بھی تجویز کر دیجیے!"

"مان لیں گے آپ؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"کہہ کر تو دیکھو!"

"صبا..... صبا سے شادی کر لیں بھائی۔"

"واٹ؟" وہ کھڑا ہو گیا۔ "یہ کیا بات کی تم نے؟"

"مجھے وہ بہت عزیز ہیں بھائی....." اس نے مسکینی صورت بنائی۔ "میں انہیں بھابھی بنانا چاہتا ہوں..... وہ بہت اچھی ہیں بھائی! میں نے آج تک اتنی اچھی لڑکی نہیں دیکھی۔ بہت سوٹ کریں گی وہ آپ کے ساتھ!"

"بے وقوفی کی باتیں مت کیا کرو شہروز!" اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔ "اپنی پڑھائی پر توجہ دو؟!"

وہ مڑ کر دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

وہ رک کر اسے دیکھنے لگا۔

"پچھلی باتیں فراموش کرنے سے زندگی آسان ہو جاتی ہے!"

"فیروز احمد کے چہرے پر کئی تاریک سائے لہرائے تھے۔ کوئی بھی جواب دیئے بغیر مڑ کر کمرے سے نکل گیا۔



رات کی تاریکی میں نیچے سے مینڈکوں کے ٹرانے اور جھینگروں کے بولنے کی آوازیں کھلی کھڑکی سے اندر آ کر کمرے میں پھیل رہی تھیں۔

اس کے سامنے کتاب میز پر اوندھی رکھی تھی اور کرسی کی پشت پر ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے وہ مختلف سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔

"گھر بھر گیا ہے میرا...... دو لڑکیاں کیا آئیں ہر طرف رونق ہی رونق نظر آتی ہے۔"

ماں کی آواز میں جھلکتی خواہش اور الفاظ میں مچلتے جذبات اس سے پوشیدہ نہ رہے تھے۔

صبا سے شادی کرلیں بھائی...... میں نے آج تک اتنی اچھی لڑکی نہیں دیکھی۔ بہت سوٹ کریں گی آپ کے ساتھ....."

گہری سانس بھر کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"کب تک فیروز احمد! آخر یہ گریز کب تک؟"

"اس نے جیسے خود سے سوال کیا۔

"کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ کس کی تلاش میں ہو؟"

"شاید اپنی ہی تلاش میں ہوں......" وہ اٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔ "برسوں پہلے اپنی آن، عزت اور پندار کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو بھی کھو دیا تھا...... میں اپنی ہی تلاش میں ہوں۔ اپنے کھوکھلے وجود کو لیے میں اپنا آپ تلاشتا پھرتا ہوں۔ ہر کسی سے نظریں چرائے، ہر ایک سے شرمندہ چھپتا پھرتا ہوں۔ کہیں کوئی مجھے پہچان نہ لے...... کہ یہ ہے فیروز احمد، شعیب احمد کا بیٹا...... یہ ہے وہ جس نے...... جس نے......

"یا خدا!" اس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔ "میں بھول کیوں نہیں جاتا!"



ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان بنی پگڈنڈی پر جیپ دوڑتی چلی جا رہی تھی۔

"امی! یہاں کتنی مٹی ہے!" شہروز نے ناک شیشے سے چپکا کر باہر جھانکا۔

"کچے راستے ہیں نا۔" عفت خانم مسکرائیں۔ "گاڑی چلے گی تو مٹی تو اڑے گی۔"

"پھر بھی اپنا گاؤں ہے بہت خوبصورت۔" بہروز نے تنقیدی جائزہ لے کر فیصلہ سنایا۔ "میں ابو سے کہوں گا کہ انٹر کے امتحان کی تیاری

میں یہیں رہ کر کروں گا۔"

"ضرور کر لینا۔ تمہارے ابو تو خود بھی تین چار مہینے تک یہیں ہیں۔ جب تک زمینوں کا تصفیہ نہیں ہو جاتا۔"

"یہ ساری زمینیں اپنی ہیں امی؟" فیروز نے حیرانی سے دور دور تک دیکھا۔

"نہیں...... سب کے علیحدہ علیحدہ حصے ہیں۔" انہوں نے مختصراً کہا۔

"شعیب احمد کے والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ بڑے بیٹے گاؤں میں ہی رہائش پذیر تھے جب کہ شعیب احمد ہمیشہ سے شہر میں رہے تھے۔ باپ کے انتقال کے بعد سب بیٹے زمینوں کا حصہ طے کرنے کے لیے ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔

معاملہ سلجھنے میں زیادہ دن لگ گئے تو انہوں نے گاڑی بھیج کر بیوی بچوں کو بھی وہیں بلوا لیا تھا۔

جیپ بڑی حویلی پہنچی تو ان کا استقبال کرنے کے لیے مرد اور بچے باہر آ گئے۔

بہروز اور فیروز کے ہم عمر کئی لڑکے وہاں موجود تھے۔

"ابھی ذرا ستا لو۔ تو پھر زمین دکھا لائیں گے تمہیں!" ان کے ایک کزن نے کہا تھا۔

"آہستہ آہستہ سب دیکھ لیں گے۔" بہروز نے مسکرا کر کہا۔ "ہم تو کافی دن ٹھہریں گے۔"

"کھانا کھا کر کچھ دیر کو سو جاؤ!" انہوں نے بیٹوں پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ "یونہی پھرنے کے لیے مت نکل جانا!"

"جی ابو!" دونوں نے نظریں جھکا لیں۔

"چچا بہت سخت مزاج کے ہیں......" ان کے کزن نے تبصرہ کیا۔ "تم لوگ ڈرتے ہو ان سے؟"

بہروز اور فیروز ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ یہ حقیقت تھی کہ شعیب احمد انتہائی سخت گیر انسان تھے۔ خصوصاً بچوں کو رعب میں رکھنے کے لیے ہر لمحہ ڈانٹ ڈپٹ اور پابندیوں کو بہت ضروری خیال کرتے تھے۔ شہروز تو انہیں دیکھتے ہی ماں کے پیچھے چھپ جاتا تھا۔

"یہ لڑکے ہیں صفت لڑکے!" وہ اکثر کہتے۔ "ذرا ڈھیل دی تو میرے سر پر چڑھ کر ناچیں گے۔"



ٹیوب ویل پر نہانے کا اپنا ہی لطف تھا۔ سارے لڑکے شرارتیں کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کو ڈبونا اور خود بھاگنا...... پانی میں پیچھے سے پیر پکڑ لینا اور پھر ہنسنا۔ انہیں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔

"فیروز...... چلو کیریاں توڑیں......" بہروز بالآخر باہر نکل گیا۔

"ابھی نہیں...... ابھی اور نہانا ہے......"

"اچھا ہم لوگ سامنے پانی میں ہیں۔ وہیں آ جانا!"

"ٹھیک......" اس نے ڈبکی لگا دی۔

"کچھ دیر نہا کر اسے احساس ہوا کہ اکیلے وہ مزا نہیں جو سب ساتھیوں کے ساتھ ہے۔ وہ باہر نکل آیا۔ سب لڑکوں نے اپنے اپنے کپڑے سامنے جھاڑیوں پر ڈال دیے تھے...... وہ اپنے کپڑوں کی تلاش میں بڑھا اور پھر رک گیا۔ اس کے کپڑے غائب تھے۔

"ان لوگوں نے ضرور میرے ساتھ شیطانی کی ہے۔......" اسے ہنسی آ گئی۔ "اپنے کپڑے پہن کر میرے کپڑے ساتھ لے گئے...... تاکہ میرا مذاق بنا سکیں۔" وہیں کھڑا ہنستا رہا۔

"میں بھی یہیں رہوں گا جب تک میرے کپڑے لا کر نہیں دیتے۔"

یکا یک بجنے والی پائل پر اس نے حیرانی سے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک درخت کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ اس کے کپڑے اٹھائے شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

"اے لڑکی...... کون ہو تم؟" وہ چیخا۔ "ادھر لاؤ میرے کپڑے!"

"ادھر آ کر لے لو......" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

فیروز کو سخت غصہ آیا۔ وہ جھنجلا کر آگے بڑھا تھا۔

"بدتمیز لڑکی...... کون ہو تم......" اس نے اپنے کپڑے چھینے۔ "میں شکایت کروں گا تمہاری!"

"ناراض کیوں ہوتے ہو...... کیا نام ہے تمہارا؟"

وہ اسے بڑی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ہر چند کہ وہ عمر میں خاصی بڑی لگتی تھی۔ بیس اکیس سال کی جوان لڑکی تھی۔ جب کہ وہ میٹرک کا طالب علم تھا۔ سولہ سترہ سال کا نوعمر لڑکا تھا۔ لیکن ڈیل ڈول شاندار ہونے کی وجہ سے اپنی عمر سے بڑا لگتا تھا۔

لڑکی لگاوٹ سے اس کے بھیگے بالوں اور مضبوط بازوؤں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کپڑے لے کر خاموشی سے مڑ گیا۔

"اے...... سو ہنے!" کہیں سے آتی آواز پر وہ چونک کر بیٹھ گیا۔

"کون؟" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

وہ برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔

"میں ہوں...... فردوس!" اسے متوجہ دیکھ کر وہ مسکرائی۔ "دروازہ کھولو ناں۔"

"تم ہو کون؟" وہ بری طرح سے چڑ گیا۔ "کیوں پیچھے پڑ گئی ہو؟"

"میں منشی کی بیٹی ہوں فردوس!" اس نے مکمل تعارف کرایا۔ "اب تو اندر آنے دو مجھے کچھ بات کرنی ہے۔"

"مجھے نہیں کرنی بات!" اس نے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔

"نجانے کون بدتمیز لڑکی ہے......"

وہ بڑبڑاتا ہوا واپس آ کر لیٹ گیا۔

ایک تو کم عمری، دوسرے باپ کی پابندیاں۔ اسے کبھی ایسے حالات سے سامنا نہ پڑا تھا۔ نہ ہی وہ اس طرح سے سوچ سکتا تھا۔ ابھی تو سوچیں اسکول کے دوستوں اور کورس کی کتابوں سے آگے ہی نہ جاتی تھی۔

فطری بھولپن کی وجہ سے اسے تو یہ بھی علم نہ ہو سکا تھا کہ وہ لڑکی اس سے آخر چاہتی کیا تھی۔

اس واقعے کو بھی وہ جلدی ہی فراموش کر گیا۔

لیکن کچھ دن بعد جب وہ اپنی ایئر گن لئے کبوتروں اور فاختاؤں کی تلاش میں تھا، وہ کسی کونے سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔

"تم پھر آ گئیں؟" وہ اسے دیکھ کر بھنا گیا۔

"دل آ جائے تو بار بار آنا پڑتا ہے......" وہ مسکرائی۔ "گاؤں کے سارے لڑکے مرتے ہیں مجھ پر"



وہ نہا دھو کر بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ ابھی ابھی ملازم اسے باہر صحن میں کھانا لگنے کی اطلاع دے کر گیا تھا۔ سارے مرد کھانے کے لیے جا چکے تھے۔ وہ رہائشی حصے میں بالکل اکیلا تھا اور وہ شاید ایسے ہی کسی موقع کی تلاش میں تھی۔

"ارے یہ کیا کر رہی ہو؟" وہ بوکھلا گیا۔

"تو شرافت کی زبان سمجھتا نہیں ہے ناں۔" وہ مسکراتی ہوئی قریب آ گئی۔ "فردوس کو آج تک کسی نے نہیں ٹھکرایا۔ تو سمجھتا کیا ہے خود کو۔"

"دور ہٹو!" اس نے ایک جھٹکے سے اسے علیحدہ کرنا چاہا۔ اچانک ہی کسی نے دروازہ بجایا تھا۔

"فیروزے۔ باہر آ کر کھانا کھا......" یہ اس کے چچا کی آواز تھی۔ "کھول دروازہ!" اور پھر وہ ہوا جس کی اسے قطعاً توقع نہ تھی۔ فردوس نے اچانک چیخ و پکار شروع کر دی۔

"جب تک اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا وہ بال بکھرا کر اپنی چنری بھی پھاڑ چکی تھی۔ اس کی آوازوں سے سارے مرد اندر آ گئے تھے۔

"چاچا...... چاچا......" وہ بھاگ کر چچا سے لپٹ گئی۔ "تمہارے بھتیجے نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے......"

وہ اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ وہ منہ کھولے ہونق بنا کھڑا تھا۔ اس کی قطعاً سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا ہوا ہے اور کیا ہونے جا رہا ہے۔

"کیوں آئی تھی تو مردانے میں؟" چچا نے اسے جھنجھوڑا

"اس نے بلایا تھا جب میں صبح کھیتوں میں تھی......"

"میں نے؟" وہ ساکت رہ گیا۔

"کمینی!" چچا نے اس کے بال پکڑ کر کس کر دو طمانچے جڑ دیے۔

"چھوڑ دو بھائی! اس لڑکی کو......" یہ شعیب احمد کی آواز تھی۔ "سزا اصل قصوروار کو ملنی چاہیے!"

"وہ باورچی خانے سے ایک مضبوط سلگتی لکڑی لے آئے تھے۔

''نہیں شعیب نہیں......''

''چچانے آگے بڑھ کرانہیں روکنا چاہا لیکن وہ غصے میں پاگل ہو رہے تھے۔

''کمینے، بدکردار......''

جلتی لکڑی بازوؤں اور پیٹھ پر اپنے نشان ہمیشہ کے لیے چھوڑتی جاری تھی لیکن جو نشانات دل و دماغ پر بن رہے تھے وہ ان جلتے زخموں سے زیادہ اذیت ناک تھے۔

''ابو......ابو......'' وہ چلا رہا تھا۔

وہ سارے مارتے مارتے باہر لے آئے تھے اور سارا گاؤں دم بخود یہ منظر دیکھ رہا تھا۔



جسم پر پڑنے والے نشانات اتنے ناپائیدار نہ تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مدھم ہوتے چلے گئے۔ لیکن وہ زخم جو روح کو لگے تھے۔ کبھی مندمل نہ ہو پائے۔ وقت گزرتا گیا لیکن اس کی سوچیں جیسے ایک مقام پر ٹھہر گئی تھی۔ آنکھیں بند کرتا تھا تو دماغ کی اسکرین پر تصویریں تھرکنے لگتی تھیں۔ بہت سے لوگ، بہت سی آنکھیں اور اس کے جسم و جان پر ایک کے بعد ایک لگتی کاری ضرب۔

وہ کانپ کر آنکھیں کھول دیتا تھا۔

ہر چند کہ اس پر لگائے گئے الزام کی حقیقت بعد میں تقریباً سب ہی پر آشکار ہو گئی تھی۔ فردوس کا باپ اپنی بیٹی کو خود شعیب احمد اور ان کے بھائیوں کے سامنے لایا تھا اور اس نے سب کے سامنے رو رو کر اپنا قصور تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن فیروز احمد کا زخمی دل اور جھکا ہوا سر پھر کبھی کسی کے سامنے نہ اٹھ سکا۔

دل و دماغ اس طرح سے مجروح ہوئے تھے کہ وہ چند ماہ بعد ہونے والے میٹرک کے امتحان میں بھی شرکت نہ کر سکا۔

عفت خانم بیٹے کے درد اور ذہنی حالت سے واقف تھیں۔ وہ اس کی دلجوئی کرتیں، اسے اُمید افزا باتیں کر کے پھر پہلے جیسا بنانے کی کوشش کرتیں، لیکن وہ اس حادثے کے بعد اپنی ذات کے جس تاریک گوشے میں جا چھپا تھا وہاں سے نکلنے کی اس کی اپنی تمام شعوری کوششیں بھی ناکام ہو جایا کرتی تھیں۔ اس نے لوگوں سے ملنا ترک کر دیا۔ دوستوں سے منہ موڑ لیا، ہر قسم کی تفریحات اور دلچسپیوں سے ہاتھ اُٹھا لیا اور ایسے میں اسے جس چیز نے سہارا دیا وہ اس کی کتابیں تھیں۔

ایک سال ضائع کرنے کے بعد اس نے میٹرک کا امتحان دیا اور اعزازی نمبروں سے پاس ہوا۔ پھر وہ ساری دُنیا کو بھول کر صرف اور صرف کتابوں کا ہو گیا۔ کوئی دوست تھا تو محض اک تنہائی، کوئی ہمدرد اور غمگسار تھا تو کتابیں اور کچھ یاد تھا تو صرف ایک حادثہ! اسے عورت ذات سے ایک عجیب قسم کا تنفر اور بے زاری محسوس ہوتی۔ اپنی ماں کے سوا وہ کسی عورت کو مخاطب کرنے یا مخاطب کیے جانے پر جواب تک دینے کا روادار نہ تھا۔

وہ یہی کام کر رہا تھا۔ جب ایک روز ایک گلابی رنگت والی لڑکی نے کالج میں اس کا راستہ روکا تھا۔

''سنیئے فیروز صاحب! مجھے ردا کہتے ہیں۔ میں آپ کی کلاس میٹ ہوں۔''

وہ خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔

''میں پچھلے کچھ دنوں سے اکاؤنٹنگ کی کلاس اٹینڈ نہیں کر سکی۔ آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں گے پلیز!'' وہ اسے پرامید نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''کلاس میں بہت سی لڑکیاں بھی ہیں۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ''آپ ان سے بہت سا وقت کیوں نہیں مانگ لیتیں؟''

اپنی بات مکمل کر کے اس نے ردا کے خفت اور شرمندگی سے سفید پڑتے چہرے پر نگاہ ڈالے بغیر قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

دوسرے دن وہ اتفاقاً کینٹین میں اس میز پر جا بیٹھا جس سے اگلی میز پر ردا اپنی سہیلی سے محو گفتگو تھی۔ وہ ہر گز ان کی جانب متوجہ نہ ہوتا اگر اسے اپنا نام سنائی نہ دیتا۔

''فیروز احمد؟'' اس کی سہیلی کھلکھلا رہی تھیں۔ ''تمہیں اور کوئی نہیں ملا؟ اس کے بارے میں تو مشہور ہے کہ اسے لڑکیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ کاریڈور سے ایسے گزرتا ہے جیسے اس کے آس پاس سے بدبودار بھینسیں گزر رہی ہوں۔ آنکھیں، ناک۔ ہاتھ پہلو سب کچھ بچاتا ہوا گزرتا ہے۔''

''کیا سمجھتا ہے خود کو؟'' وہ جھنجلائی ہوئی تھی۔ ''اتنا حسین تو نہیں ہے۔ بس عام سا ہے۔''

''ہائے!'' اس کی سہیلی نے آہ بھری۔ ''کبھی غور سے ان کی آنکھوں کو دیکھا ہے؟ کیا غضب کی سخن ور ہیں۔ میری تو عمر بھر کی داد بس وہی لوٹ کر لے جاتی ہیں۔''

اس وقت واہیات اور چھچھوری باتیں سن کر اس کے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ اس نے بے اختیاری میں ہاتھ مار کر چائے کا کپ میز پر سے گرا دیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

اس بدتمیزی پر اس کی رپورٹ بھی پرنسپل کے آفس میں پہنچ گئی تھی اور اسے فائن بھرنا پڑا تھا۔

اسے لڑکیوں سے جتنی چڑ تھی وہ شدید نفرت میں بدلتی چلی گئی۔ ہر چند کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس نے خود پر کسی حد تک قابو پانا سیکھ لیا تھا لیکن کبھی کبھی بے اختیار قسم کے ردعمل کا اظہار کر بیٹھتا تھا۔

اور اب اس کی ماں کی شدید خواہش تھی کہ وہ شادی کے لیے ہامی بھر لے اور اسے محض یہ سوچنا ہی ایک عذاب ناک کام لگتا تھا۔

''آج شہروز نے اس کے دل کے سارے ٹانکے ایک بار پھر کھول دیے تھے۔

''بھائی! گزری ہوئی باتوں کو فراموش کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔''

''اس نے کہا تھا۔ گویا وہ واقعہ اسے بھی ازبر تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی بھی اس کی ذلت اور تحقیر کے تماشے کا عینی گواہ تھا۔

اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

ایک لڑکی کی وجہ سے اس پر ایسی قیامت گزری تھی کہ اب کسی لڑکی کی اس کی زندگی میں کوئی جگہ نہ رہی تھی اور نہ جانے یہ اس کا گریز تھا یا اور

کوئی کشش تھی کہ ہر ملنے والی لڑکی اس کی جانب از خود متوجہ ہو جاتی تھی۔

اس کے پردہ خیال پر ایک لمحے کے لیے صبا کا سراپا لہرا گیا۔

"بھائی! آپ ان سے شادی کر لیں۔" شہروز کی منمناہٹ اس کے کانوں میں گونجی۔

"اسٹوپڈ!" وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔ یہی ایک کام رہ گیا دنیا میں کرنے کے لیے۔

کھڑکی سے ہٹ کر وہ اپنی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ آدھی رات بیت چکی تھی اور اس کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہ تھا۔

اور جب کوئی اس کے ماضی کے تالاب میں کنکر پھینکتا تھا۔ فیروز احمد کی کئی راتیں بے خواب گزرتی تھیں۔



"بنوا میرے ابا کی اونچی حویلی!"

وہ میز بجا بجا کر حلق پھاڑ رہا تھا۔

"یا خدا!" عفت خانم سخت جھنجلائی ہوئی تھیں۔ شہروز کے بچے ابھی تو موقع محل دیکھ کر خاموش ہو جایا کرو۔"

"اے لو!" وہ حیرت کا اظہار کر کے میز سے اترا۔ امی حضور۔ ہر چند کہ ہم آپ کی طرح آنکھوں پر عدسے نہیں لگاتے لیکن پھر بھی ہمیں ہر چیز صاف صاف، چمکتی نظر آ جاتی ہے۔ یعنی یہ موقع گانے بجانے کا نہیں بلکہ خاموش رہنے کا ہے؟ امی حضور، حالات و واقعات اس امر کی نشان دہی کر رہے ہیں کہ آپ کے چشمے کا نمبر پھر بڑھ گیا ہے۔"

"بکومت!" انہوں نے اسے جھڑکا۔

اس نے ڈانٹ پڑنے پر بری سی شکل بنائی اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

"غضب خدا کا۔ نہ جان نہ پہچان، نہ رشتے داری نہ میل ملاپ نہ ہمسائے نہ عزیز، کسی نے کہہ دیا فلاں جگہ رشتہ لے جاؤ اور یہ تیار۔ بھلا شادیاں ایسے ہوتی ہیں؟ عمر بھر کا ناتا جوڑنا ایسا ہی سہل ہے کہ آنکھیں بند کیں اور رشتہ طے کر لیا؟ گھر میں دو لڑکیاں لے کر آئی۔ سلیقہ مند، خوش شکل، خوش اخلاق، دیکھا بھالا گھرانا، بھلا اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے تھا؟ لیکن ان لڑکوں نے مجھے دق کرنا ہے سو کرنا ہے۔"

"امی حضور! دل پر کوئی زور نہیں۔" اس نے اماں کو مدبرانہ انداز میں سمجھانا چاہا۔ "بھائی جان فریفتہ ہو گئے ہوں گے "ان" پر۔"

"شہروز!" وہ مزید خفا ہوئیں۔ "شرم کرو۔ بڑا بھائی ہے تمہارا۔ کوئی بند تو لگایا کرو اس قینچی زبان کے آگے۔"

"لو! ابھی بھی اگر اسے قینچی ہونے کا طعنہ مل سکتا ہے تو میں اسے کاٹ کر پھینک دیتا ہوں۔ اتنا کام تو دنیا کی کوئی زبان نہیں کر سکتی امی جان!"

"ٹھیک کہتے ہو۔" وہ جل کر گویا ہوئیں۔

"لیکن آپ کو اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے؟"

"وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔
"خود ہی تو کہتی تھیں بھائی جان سے کہ جہاں وہ چاہیں گے آپ وہیں ان کا رشتہ طے کردیں گی۔اب انہوں نے اپنا دل کھول کر آپ کے سامنے رکھ دیا تو خفا ہو رہی ہیں؟"
"میں خفا اس لیے ہو رہی ہوں کہ رشتے ناتے اس طرح سے طے نہیں کیے جاتے۔فرم کے کسی بندے نے کہہ دیا کہ جی میرے فلاں رشتے دار بہت غریب ہیں، جہیز وغیرہ نہیں بنا سکتے۔ان کی لڑکی کے لیے پیام لے جائیں اور بہروز میاں آنکھیں بند کر کے راضی ہیں۔یہ کوئی طریقہ ہے کسی کی مدد کا؟۔نہ میں ان کے خاندان سے واقف، نہ لڑکی کے اوصاف سے واقف اور بیاہ کر لے آؤں اسے؟ کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو؟۔اور میں کہتی ہوں نبیلہ میں کیا خرابی ہے؟ ہزاروں لاکھوں میں ایک ہے۔دیکھی بھالی لڑکی ہے اپنے خاندان کی ہے۔اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے۔"
ماں کی باتیں سن کر وہ بھی سوچ میں پڑ گیا تھا۔
"لیکن امی الڑکی کو دیکھنے میں کیا حرج ہے۔آپ کو اگر ان کا خاندان وغیرہ پسند نہیں آیا تو بھائی جان علم بغاوت تھوڑا ہی بلند کردیں گے۔آپ منع کردیں گی تو وہ ضد بھی نہیں کریں گے۔"
"جانتی ہوں۔" وہ پرسوچ انداز میں بولیں۔" لیکن وہ دل میں تو کہے گا ناں کہ ماں نے اپنی مرضی چلائی تھی اس لیے بنا کسی وجہ کے لڑکی مسترد کردی ہے۔"
"بھائی جان ایسے نہیں ہیں۔" اس نے منہ پھلایا۔" آپ کا کوئی بیٹا بھی ایسا نہیں ہے۔"
"عفت خانم، عالم پریشان میں بیٹھی کچھ سوچتی رہیں۔
"پھر کب چل رہی ہیں لڑکی دیکھنے؟" وہ شرارت سے بولا۔
"چلی جاؤں گی۔ان بے چاری بچیوں کو تو ان کے گھر بیٹھوں۔بے وجہ گھر سے بے گھر کر رکھا ہے۔میں نے منہ سے کچھ کہا نہیں لیکن ماں باپ ایسے بھی انجان نہیں ہوتے۔کیا کہے گی ان کی ماں، کہ اس کی بیٹیاں کوئی نمائش میں رکھنے کی چیز تھیں۔دیکھ بھال کر واپس کر دیا۔معصوم بچیاں کیا دل لے کر جائیں گی۔ایک یہ فیروز نجانے کس دماغ کا لڑکا ہے کیا گرہ لگی ہے اس کے دماغ میں۔ماں سے بھی تو کچھ نہیں کہتا کہ دل ہلکا ہو۔خودسری میں سب باپ پر چلے گئے۔"
وہ حد درجے جھنجلاہٹ کے عالم میں مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔
غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا
وہ جھولے میں لیٹ کر گنگنانے لگا۔

عفت خانم کو بڑی دیر بعد اس کا مطلب سمجھ میں آیا تھا۔ غصے میں ہونے کے باوجود وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکیں۔

❀......❀......❀

"بجو! فارم جا رہے ہیں۔"

ریشم نے کالج سے آکر سب سے پہلی خبر سنائی۔

"کیسے فارم؟" وہ روٹیاں دسترخوان میں لپیٹ رہی تھی۔

"ایگزامینیشن فارم۔ فیس بھرنی ہے۔ ساڑھے آٹھ سو روپے۔" وہ چادر لپیٹ رہی تھی۔

"کب تک جا رہے ہیں؟" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"پرسوں آخری تاریخ ہے۔ اس کے بعد لیٹ فیس بھی بھرنی پڑے گی۔ کیا پکایا ہے۔ بجو، بڑی سخت بھوک لگی ہے۔" وہ اس کے تاثرات سے بے خبر بولتی رہی۔

"چنے کی دال۔ ذرا صبر کر لو۔ ناصر اور اقدم بھی لوٹتے ہوں گے۔ ساتھ مل کر کھا لینا۔"

"اچھا۔ پھر میں نماز پڑھ لوں۔ مریم کہاں ہے؟"

"اماں کا سر دبا رہی ہے۔"

ریشم کے اندر چلے جانے کے بعد وہ بھی وہ وہیں پیڑھی پر بیٹھی سوچتی رہی۔ کل ہی زلفی نے اس سے ڈھائی ہزار روپے لیے تھے۔ وہ انجینئرنگ پڑھ رہا تھا اور اسے اور کتابوں کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اور آج ریشم نے فیس کے پیسوں کا تقاضا کر دیا تھا۔

اسے خبر تھی چند روز بعد ناصر کو بھی فیس بھرنی ہو گی۔

بینک میں اب نہایت معمولی رقم رہ گئی تھی۔ محض چند ماہ ہی گزارا ہو سکتا تھا۔ اور وہ بھی بمشکل۔ اس نے اخبار میں اشتہار پڑھ کر جتنی جگہ اپنی درخواستیں بھیجی تھی، ان میں کسی جگہ کامیابی نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ نہ اس کی تعلیم زیادہ تھی نہ اس کے پاس کوئی تجربہ ہی تھا۔

اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے ایک بار پھر عنبرین کے پاس جانا ہو گا۔

"بجو! کیا سوچ رہی ہیں؟" مریم وہاں چلی آئی۔

"آں! کچھ نہیں۔ دسترخوان بچھا کر کھانا رکھ لو۔ سب کو بھوک لگی ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جی اچھا!" وہ پلیٹیں نکالنے لگی۔ "آپ نہانے جا رہی ہیں؟"

"ہاں۔ پھر ذرا عنبرین کے پاس جاؤں گی۔"

"جاب کا پتا کرنے؟" اس نے پلٹ کر بہن کو دیکھا۔

"ہاں!" اس نے سانس بھری۔ "لگتا ہے اس کی مدد لینی ہی ہو گی۔"

نہادھو کر وہ ناصر کو ساتھ لے کر باہر نکلی۔

"واپس بھی لینے آجاؤں بجو؟" وہ پوچھنے لگا۔

"ہاں۔آجانا۔" وہ مسکرائی۔"ایک گھنٹے بعد۔"

"ٹھیک ہے۔آپ اکیلی مت آیئے گا۔" اسے شاید خود پر بڑا فخر محسوس ہو رہا تھا۔

وہ مسکراتی ہوئی عنبرین کے گھر میں داخل ہو گئی۔

"زہے نصیب۔" وہ اسے دیکھ کر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔آج عید کا دن تو نہیں؟"

"ہاں تم نے تو جوتیاں گھس لی ہیں آآ کر۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔"شکوہ کرنا تو تمہارے منہ سے بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"میرا نکلنا تو بند کر دیا گیا ہے ناں۔" اس نے مصنوعی منہ پھلایا۔

"کیوں؟" نیلم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"امی کہتی ہیں اب گھر بیٹھو۔" وہ مسکرائی۔"زیادہ پھرو گی تو نور نہیں آئے گا۔"

"اوہ!" اس نے گہری سانس بھری۔"چلو پھر تو میں واقعی شکایت نہیں کرتی۔تم نور جمع کرو،اس دن،کے لیے۔"

"کسی کام سے آئی ہو؟" وہ شاید اس کے انداز سے سمجھ گئی تھی

"ہاں۔وہ قدرے شرمندگی سے بولی۔

"وہی جاب کا مسئلہ ہے؟"

"ہاں۔تم اپنے ماموں سے کہو کہ وہ بات کر لیں۔کوئی بھی نوکری ہو۔میں کر لوں گی۔"

"اب راضی ہو ڈھائی تین ہزار پر؟" وہ قدرے طنز سے بولی۔"اس روز تو ٹھکرا کر چلی گئی تھیں۔"

"غلطی تھی میری۔" نجانے کیوں نیلم کا دل زمین پر گڑ جانے کو چاہا۔"ویسے تمہیں کوئی پرابلم وغیرہ ہو تو رہنے دو۔"

"نہیں خیر!اب مجھے کیا پرابلم ہو گی۔میں ماموں سے کہہ دوں گی،وہ تمہیں لے جائیں گے۔"

"جب بھی ان کے پاس وقت ہو مجھے کہلوا دینا۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"ٹھیک ہے۔اچھا دیکھو میں کچھ کپڑوں پر کام بنوا کر لائی ہوں۔دیکھ کر بتاؤ کیسے ہیں۔"

وہ اسے اپنے جہیز کے کپڑے دکھانے لگی۔وہ بے دلی سے بیٹھی ہوں،ہاں کرتی رہی۔

اسے عنبرین کی بات اس درجہ بری لگی تھی کہ اس کا دل وہاں سے بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا۔لیکن بہرحال وہ اب اسے ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔اور پھر اسے ناصر کا انتظار بھی کرنا تھا۔



''شبنم۔'' ثریا اسے باہر کھڑی آواز دے رہی تھی۔

''ہاں۔اندر آجاؤ ثریا۔باہر کیوں کھڑی ہو۔''

وہ کسلمندی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''نیند اُتری نہیں؟'' وہ شرارت سے مسکراتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔

''سو تو نہیں رہی تھی۔بس عجیب سی سستی سوار تھی۔اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔''

''خیر تو ہے؟'' وہ ہنسی۔''اتنی جلدی؟''

''کیا مطلب؟'' اس نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

پھر اس کی بات سمجھ کر جھینپ گئی۔

''توبہ ہے ثریا۔تم تو بالکل''

''ہاں ہاں کہو۔کیا ہوں!'' وہ ہنسی۔''ارے شبنم! تم تو ذرا ذرا سی بات پر جھینپتی ہو۔ذرا شوخ بنو۔چنچل پن سے کام لیا کرو۔ایسی چھوئی موئی سی رہو گی تو کیا خاک یوسف بھائی کو متوجہ کر سکو گی۔''

ناگواری کی ایک لہر اس کے پورے وجود میں کرنٹ کی طرح دوڑ گئی۔نجانے کیوں ہر کوئی دانستہ اور نادانستہ طور پر اس سے یہ اظہار کرتا رہتا تھا۔کہ وہ ان دونوں میاں بیوی کے مابین قائم اس رشتے کے تمام تر پہلوؤں سے بخوبی واقف ہے۔ہر کسی کو خبر ہے کہ وہ یوسف کے لیے ایک غیر ضروری شے کی مانند ہے جسے وہ نادانستگی میں خود سے وابستہ کر بیٹھے ہیں۔اور اب اپنی غلطی پر شرمسار ہیں۔ہر کوئی اسے یوسف کو متوجہ کرنے کی جملہ تراکیب سے آگاہ کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا تھا۔

''مجھے ضرورت بھی کیا ہے انہیں متوجہ کرنے کی؟'' وہ تلخی سے بول گئی۔

''ایسے معاملات میں جوش سے نہیں ہوش سے کام لیتے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔''اپنی ہتھیلی کھولو۔''

''کیوں؟'' شبنم نے اسے حیرانی سے دیکھ کر ہتھیلی کھولی۔

''اس پر یوسف کو رکھو اور سختی سے بند کر لو۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''ہونہہ'' وہ جلا کر رہ گئی۔

''دیکھتے ہیں تمہیں یہ ہنر آتا ہے کہ نہیں۔'' وہ شرارت سے بولی۔

وہ عجیب لڑکی تھی۔ہمہ وقت اس کے انگ انگ سے شوخی و شرارت پھوٹتی رہتی تھی۔

''ارے ہاں۔اصل بات تو میں بھول ہی گئی۔'' اس نے سر پر ہاتھ مارا''شام کو امی کے گھر دعوت ہے تیار رہنا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ثریا۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''تو معذرت، تو بہانا!'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''امی نے تمہیں اور یوسف کو ضرور ساتھ لانے کو کہا ہے تیار رہنا۔ بلکہ میں خود آ کر تمہیں تیار کر دوں گی۔ اور ہاں۔'' وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔

''ایسے سر منہ لپیٹ کر مت لیٹی رہا کرو۔ لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے۔''

''ثریا!'' وہ تنبیہی انداز میں بولی۔

وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی تھی

وہ بہت دیر تک بیٹھی کوئی مناسب سا بہانا ڈھونڈتی رہی لیکن اسے کوئی عمدہ سا بہانا نہ سوجھ سکا۔

''بھلا، مجھے کون سی خوشی ملی ہے جو لوگ میرے اعزاز میں دعوتیں کرتے پھر رہے ہیں۔'' اس نے قدرے غصے سے سوچا۔ ''ایک مذاق بن کے رہ گیا ہے میرا وجود۔ یوسف کے رویے نے ہر کسی کو میری اہمیت کا احساس دلا تو دیا ہے پھر بھلا بن سنور کر، نقلی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر دعوتیں اڑانے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے۔''

وہ اپنے کڑھنے کے معمول پر عمل کرنے کا آغاز کر چکی تھی۔ ہاتھ منہ دھو کر نیچے آنے تک اس نے نجانے کتنا خون جلا ڈالا۔

یوسف کو ماں کے پاس بیٹھ کر ناشتا کرتے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس وقت تک تو وہ آفس چلے جاتے تھے۔ پھر اسے یاد آیا، آج چھٹی کا دن تھا۔

''آؤ بیٹی! تم بھی ناشتا کرو۔ میں نے ابھی تازہ پراٹھے بنائے ہیں وہ بھی دیسی گھی میں۔''

''بیٹے کو کھلائیں۔'' اس نے کڑھتے ہوئے سوچا۔ ''انہیں دوسروں کی جان جلانے کا اہم فریضہ نجانے کب تک انجام دینا ہے۔ کہیں کمزور نہ ہو جائیں۔''

''میں ذرا دیر میں کھا لوں گی چچی۔'' پھر اس نے کہا۔ ''ابھی دل نہیں چاہ رہا۔''

''کیا بات ہے؟'' وہ ذرا آگے کو ہوئیں۔ ''اٹھی بھی دیر سے ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟ کوئی اور بات تو نہیں۔''

ہر چند کہ اپنی دانست میں انہوں نے بڑی رازداری سے کام لیا تھا۔ تاہم ان کی پاٹ دار آواز شاید اوپر ثریا تک نے سن لی تھی۔

''یوسف کے سامنے ایسی بات پر اس کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ چچی کی جہالت پر اسے جس قدر غصہ آ سکتا تھا، آ گیا۔

''چچی! آپ بھی جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہیں۔'' وہ چیخ کر بولی۔

''اے لو! کیا کہہ دیا میں نے؟'' وہ برا مان گئیں۔ ''کوئی دنیا جہاں سے نرالی بات ہے؟''

''یوسف نے ہاتھ میں پکڑا ہوا نوالہ واپس رکھ دیا اور جا کر تولیے سے ہاتھ صاف کرنے لگے۔

''امی! میں ذرا ایک دوست کی طرف جا رہا ہوں۔''

''بیٹا! کبھی گھر میں بھی ٹکا کرو۔ ماں تو خیر جو تھی سو تھی۔ اب بیوی بھی تمہاری صورت دیکھنے کے لیے ترستی ہے۔''

''آجاؤں گا جلد ہی۔'' وہ مختصراً بولے۔

''شام کو آمنہ کی سسرال میں دعوت بھی ہے۔ انہوں نے خاص طور پر آنے کی تاکید کی ہے۔''

''اُف یہ دعوتیں۔'' وہ اُلجھ کر بولے۔ ''آپ لوگ ہو آیئے گا۔''

''ہائیں؟ کیا انہوں نے میرے اعزاز میں دعوت کی ہے بیٹا؟ کیا دُنیا جہان کی ریت روایتیں فراموش کر بیٹھے ہو؟ ایک وہ نیلم کیا نہ ملی تم تو۔''

''امی!'' وہ قدرے چیخ کر بولے تھے۔ ''بس بھی کریں۔''

شبنم بیٹھے بیٹھے جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ بہن کے اس انداز میں ذکر پر اس کے چہرے پر گویا شعلے دہک اُٹھے تھے۔

''آجاؤں گا میں وہیں۔ آپ لوگ خود پہنچ جایئے گا۔'' پھر پیر پٹختے ہوئے وہ گھر سے نکل گئے۔

''اچھا منہ کو آیا ہے یہ میرے۔'' وہ سخت جلال میں آگئیں۔ ''عشق عاشقی کے بھوت اُترتے ہی نہیں ہیں صاحبزادے کے دماغ پر سے۔ مزاج ٹھکانے پر لگتے ہی نہیں ہیں۔ بھیا، میں اچھی پھنسی۔''

شبنم نے چنگیر آگے سرکا کر جلدی جلدی نوالے لینا شروع کر دیے۔



شام اُترتے ہی ثریا واقعی اسے تیار کرنے چلی آئی۔

''مجھے علم تھا تم ابھی تک اسی سادہ حلیے میں بیٹھی ہوگی۔'' وہ اسے دیکھ کر بولی۔ ''اسی لیے میں نہا کر پہلے تمہیں تیار کرنے کے لیے چلی آئی۔''

وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ ابھی نہا کر آئی تھی۔ گلابی کرتے اور فیروزی شلوار دوپٹے میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ بالوں سے ٹپکتا پانی اس کا کرتا بھگو رہا تھا اور تازہ غسل کی نمی سے اس کی آنکھیں بھی گلابی ہو رہی تھیں۔

شبنم اسے تھوڑی دیر کے لیے دیکھتی ہی رہ گئی۔ کتنی عام سی لڑکی تھی وہ شادی سے قبل۔ سانولی رنگت پر عام سے نقوش تھے۔ اس نے بھی ثریا پر غور کرنے کی زحمت نہ کی تھی۔ اور اب نجانے کہاں سے اسے نے ڈھیر سارا روپ چرا لیا تھا۔ بڑی کشش اس کے چہرے پر در آئی تھی۔

''یہ یونس بھائی کی عطا کی ہوئی محبت سے حاصل شدہ خوشیوں کا اعجاز ہے۔'' اس نے آزردگی سے سوچا۔

''محبت کا بھرپور احساس ایک عام سے شخص کو بھی خوبصورت بنا دیتا ہے۔ کیسا انوکھا جذبہ ہے۔ پھولوں سے لدا ہوا پودا۔ جس جگہ بھی اُگ جائے، بہار لے آتا ہے اور۔ اور۔ میرے آنگن میں جو خزاں اُتری ہے، اس نے میرے چہرے کو کسی قدر بدصورت بنا دیا ہوگا۔ میں نے تو عرصہ ہوا آئینہ دیکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔''

کیا سوچنے لگیں؟'' ثریا نے اسے بغور دیکھا۔ ''اچانک اتنی اداس کیوں ہو گئیں۔''

''کچھ نہیں!'' اس نے سر جھٹکا۔

''پتا ہے۔ تمہاری آنکھیں اداس ہو کر بڑی خوبصورت ہو جاتی ہیں۔'' وہ مسکرائی۔ ''بھیگی بھیگی پلکیں تمہارے گالوں پر الٹی جھکی غضب کا تاثر دیتی ہیں۔ ویسے شبنم ایو آر بیوٹی فل۔''

شبنم نے نظر اٹھا کر اسے حیرانی سے دیکھا۔ ثریا نظروں میں ستائش بھرے اسے دیکھ رہی تھی۔

ابھی ابھی ثریا کو دیکھ کر وہ جن احساسات کا شکار ہوئی تھی، وہ معدوم ہو گئے۔ عرصے بعد کسی نے سراہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

''چلو جلدی سے نہا کر آؤ۔ جب تک میں تمہارے کپڑے سلیکٹ کرتی ہوں۔ دیکھنا، کیسا سجاؤں گی تمہیں۔ یوسف بھائی آ کر آج فریفتہ نہ ہوئے تو نام بدل دینا۔'' وہ ہنسی۔

شبنم کا دل اداسی سے بھر گیا۔ کتنی تہی داماں تھی وہ۔ دوسرے اسے یقین دلاتے تھے کہ آج اسے ایک آدھ نظر کی خیرات ضرور ملے گی اور حقیقت وہی جانتی تھی۔ یوسف کبھی اسکے نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ اسکی بہن کی یادوں کے گرداب میں پھنسے ہوئے تھے اور باہر نکلنا بھی نہیں چاہتے تھے۔

نہا کر وہ غسل خانے سے نکلی تو ثریا اس کے لیے روپہلی کام سے سجی گہری نیلی ساڑھی کا انتخاب کر چکی تھی۔

''یہ کیا۔ میں یہ نہیں پہنوں گی۔'' اس نے صفائی سے انکار کر دیا۔

''تم یہی پہنو گی۔'' وہ حتمی انداز میں بولی۔ ''آج میں بھی ساڑھی پہن رہی ہوں اور تمہیں بھی پہننی ہوگی۔''

''ثریا پلیز!'' اس نے التجا کی۔ ''میں نے کبھی ساڑھی نہیں پہنی۔ مجھے اس میں چلنا نہیں آتا۔''

''ایک بے ساختہ قہقہہ ثریا کے لبوں سے نکلا تھا۔

''ایک بات کہوں۔'' پھر اس نے ہنسی پر قابو پا کر رازداری سے کہا۔ ''چلنا تو سیکھ لو۔ تمہیں واقعی چلنا نہیں آتا ورنہ تم سے تم ہزاروں کو چلا سکتی ہو۔''

اس کے انکار کی ثریا کے آگے ایک نہ چلی۔ ثریا نے اس کی ساڑھی بڑی محنت سے سیٹ کی اور پھر اسے اپنا چاندی کا گلوبند اور جھمکے پہنا دیے۔ شوخ رنگ لپ اسٹک اور بلش آن سے ان کے چہرے پر گلاب کھلا دیے۔

''آج اگر یوسف بھائی تمہیں سراہے بغیر رہ کر دکھائیں تو جو چور کی سزا وہ میری۔'' وہ بڑے فخر سے بولی تھی۔

شبنم اداسی سے مسکرائی۔

''جاؤ تم بھی تیار ہو جاؤ۔ یونس بھائی آتے ہوں گے۔''

''بس میں ابھی آئی۔ اس نے چٹکی بجائی۔ ''اور دیکھو میری محنت پر پانی نہ پھیر دینا۔ کہیں میرے جاتے ہی تم کپڑے بدلنے بیٹھ جاؤ۔''

''نہیں۔'' وہ ہنس دی۔ ''فکر مت کرو۔ میں نیچے چچی کے پاس جا رہی ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے چلی آئی۔ چچی اپنا چکن کا سفید کرتا اور سفید کڑھائی کا دوپٹا اوڑھے تیار بیٹھی تھی۔

"ماشاءاللہ۔چشم بددور!" انہوں نے نظر پڑتے ہی اس کی بلائیں لے لیں۔ "کیسی چاندی صورت نکل آئی ہے۔بیٹی،یوں ہی سج دھج کر رہا کرو۔کسی کو خبر تو ہو کہ نئی نئی شادی ہے۔"

"دل کو کس طرح سے راضی کیا کروں چچی۔" اس نے گہری سانس بھر کر سوچا تھا۔"اس غریب کو کیسے قرار آئے۔اس کی بھی تو نئی نئی بربادی ہے۔حالت ماتم سے فارغ ہو تو کچھ کرنے کا سوچے۔"

ذرا دیر میں ثریا بھی گہری سبز ساڑھی میں ملبوس،ادا سے سیڑھیاں اترتی چلی آئی۔

"آداب چچی!"

"جیتی رہو۔" انہوں نے اس پر نگاہ ڈالی۔"ماشاءاللہ۔"

"ثریا مسکرا کر ان کے پاس بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ سے سروتا لے کر چھالیہ کترنے لگی۔

"کب آئیں گے یوسف؟ مغرب تو ہو چکی ہے۔"

"بس آتے ہی ہوں گے۔" اس نے گھڑی دیکھی۔"یہی ٹائم دیا تھا۔"

"باہر اسکوٹر کی آواز آئی تو وہ لپک کر اٹھی اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

شبنم سر جھکا کر تخت کی سطح پر آڑی ترچھی لائنیں کھینچنے لگی۔

"السلام علیکم۔" یونس مسکراتے ہوئے آئے تھے۔

"وعلیکم السلام۔چلیں بیٹا۔" چچی نے چٹکی بھر تمباکو منہ میں ڈالی۔

"دم تو لیں امی!" وہ ذرا کپڑے تو بدل لوں۔استری کیے ہیں ناں؟" انہوں نے ثریا سے پوچھا۔

"جی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔" جلدی سے فریش ہو کر آجائیں۔"

"فریش تو ہو لیے ہم۔" وہ شرارت سے مسکرائے۔"

ثریا کے لبوں پر مسکراہٹ ناچنے لگی۔

ایک پیکٹ اس کے ہاتھ میں تھما کر وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔ثریا نے پیکٹ کھولا۔اس میں دو گجرے لپٹے تھے۔

"ذرا پہنا دیں چچی۔" اس نے جلدی سے اپنی کلائیاں آگے کر دیں۔

پھر دفعتاً اسے کچھ خیال آیا" ایک مجھے،ایک شبنم کو۔"

"نہیں نہیں۔" شبنم نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لیے۔" مجھے پھول پسند نہیں۔میں بالکل نہیں پہنوں گی۔"

وہ ثریا کے لیے یونس بھائی کے لائے ہوئے گجرے ہرگز پہننا نہیں چاہتی تھی۔لیکن ثریا کی ضد کے آگے اس کی ایک نہیں چلی۔ثریا نے گجرا اس کی کلائی پر لپیٹ کر ہی دم لیا۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے ثریا۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''سب چلتا ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''زیادہ گہرائیوں میں جا کر مت سوچا کرو۔''

''یونس تیار ہو کر ٹیکسی لے آئے۔ گھر کو تالا لگا کر وہ سب ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

''یوسف کب آئیں گے؟'' یونس دریافت کر رہے تھے۔

''ارے جب ان کی مرضی ہو۔'' چچی صبح سے جلی بیٹھی تھیں۔ ''کب تک ان کے آنے کی گھڑیاں دیکھوں۔''

آمنہ کے سسرال میں ساس، سسر، نندیں، دیوار بھی موجود تھے۔ بڑا ابھرا ابھرا گھرانا تھا۔

ثریا ماں، بہنوں سے مل کر مزید چہکنے لگی تھی۔ چچی جان بھی ثریا کی امی سے گھریلو سیاست کے جملہ پہلوؤں پر تبادلہ خیال کرنے لگی تھیں۔

جیسے ہی وہ کاریڈور میں گھسی، کونے والے کمرے سے نکلتے ریاض سے بری طرح ٹکرا گئی۔

ساڑھی کی فال میں اس کا پاؤں پھنس گیا۔ اگر ریاض اسے دونوں بازوؤں سے نہ تھامتے تو وہ منہ کے بل گر جاتی۔

''سوری۔ سوری ریاض بھائی۔''

ان کی گرفت سے خود کو چھڑا کر وہ بمشکل بولی۔ اس کا پورا وجود ہولے ہولے کانپنے لگا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ پوری کی پوری ان کے سینے سے جا لگی تھی اور اب مارے شرمندگی اور خجالت کے اس سے بولنا محال ہو رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔''

شبنم نے نگاہ اٹھائی۔ وہ ایک سحر کا عالم میں گرفتار اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ مزید گھبرا گئی۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

''تم تو مزید خوبصورت ہو گئی ہو شبنم۔'' وہ تھوڑا قریب ہو کر بولے۔

سراہنے کا یہ انداز کسی بھائی یا بہنوئی کا سا ہرگز نہ تھا۔ وہ مزید کوئی بات کہتے ساڑھی سنبھالتی کچن کی طرف تقریباً بھاگ کر آگے بڑھ گئی۔

آمنہ روٹیاں ڈال رہی تھی۔

''بس سبھی کچھ تیار ہے۔'' وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ ''میں نے سوچا تھا، روٹیاں تم لوگوں کے آنے پر بناؤں گی ورنہ ٹھنڈی روٹیاں مزا نہ دیتیں۔''

''ہوں۔'' وہ اس کی جانب پیٹھ کر کے کولر سے پانی پینے لگی۔

''یہ ریاض بھائی کو آج کیا ہو گیا۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''یہ انداز۔''

ریاض بھائی اس کے لیے کوئی غیر یا اجنبی تو تھے نہیں۔ شادی سے پہلے وہ اکثر چچی کی بیماری کی وجہ سے ان کے گھر آ کر رہا کرتی تھی۔ آمنہ اور ریاض بھائی بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ شبنم سے ان کی اچھی خاصی بات چیت تھی۔ وہ اس سے بہت خوش ہو کر بات کیا کرتے تھے۔ عجیب سی شخصیت کے مالک تھے۔ آمنہ کے لیے نہایت تیز مزاج اور غصیلے شوہر، مومنہ کے لیے سخت گیر قسم کے باپ اور باقی لوگوں کے لیے حد درجہ شگفتہ

طبیعت اور شوخ و شنگ آدمی۔

"یوسف بھائی کہاں گئے ہیں؟" آمنہ اس سے دریافت کر رہی تھی۔ "کس وقت تک آئیں گے۔؟"

اس کے پاس دونوں سوالوں کا جواب نہ تھے۔

"پتا نہیں۔" وہ وہیں رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ "کسی دوست کے پاس جانے کا کہہ رہے تھے۔ اب خبر نہیں کہاں گئے ہیں اور کب تک آئیں گے۔"

"میں سوچ رہی تھی ان کے آنے پر ہی دستر خوان لگاتے۔"

"مرضی ہے تمہاری۔" اس کا ذہن چند لمحوں قبل رونما ہونے والے واقعے میں اٹکا ہوا تھا۔

"دوستی ہو گئی؟" آمنہ نے مسکرا کر دریافت کیا۔ "یہ تیاریاں تو بہت کچھ کہہ رہی ہیں۔"

وہ بھی محض مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

پھر سب نے کافی دیر یوسف کا انتظار کیا لیکن ان کا غالباً آنے کا ارادہ ہی نہ تھا۔ کھانا ان کے بغیر ہی کھا لیا گیا۔ تمام عرصے میں وہ ریاض بھائی کی نظریں اپنے وجود پر جھکتی محسوس کرتی رہی تھی۔ مارے اُلجھن کے اس کا برا حال تھا۔ خدا خدا کر کے یونس ٹیکسی لائے اور وہ لوگ واپس گھر آئے۔ یوسف ہنوز نہ لوٹے تھے۔

"یوسف بھائی نے اچھا نہیں کیا۔"

"ثریا نے اسے زیور اتارتے دیکھ کر افسردگی سے کہا تھا۔



ٹیکسی ایک وسیع و عریض عمارت کے سامنے جا کر رُکی تھی۔ یہ علاقہ آبادی سے کافی ہٹ کر تھا اور انہیں یہاں پہنچنے میں پورا سوا گھنٹہ لگا تھا۔

"چلو بیٹا اُترو۔"

نیلم ٹیکسی سے اُتر کر چاروں جانب دیکھنے لگی۔ وہ عنبرین کے ماموں کے ساتھ جاب کے سلسلے میں یہاں آئی تھی۔ یہ دوائیوں کی ایک بڑی مقامی کمپنی تھی۔ یہاں عنبرین کے ماموں کے کوئی جاننے والے تھے۔

"میں یہاں روزانہ کیسے آیا جایا کروں گی ماموں؟" وہ پریشانی سے آگے بڑھتے ہوئے دریافت کر رہی تھی۔

ماموں نے پہلے ایک کونے میں پیک تھوکی اور رومال سے منہ صاف کرنے لگے۔

"ان کی اپنی سروس ہے کمپنی کے ملازمین کو ہر جگہ سے پک اینڈ ڈراپ کرنے کی۔ تمہارے علاقے کا جو بس اسٹاپ ہے وہاں سے تمہیں ان کی وین لے لیا کرے گی اور وہیں چھوڑ ا بھی کرے گی بس اسٹاپ تک آنا تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔"

اس نے پریشانی سے سر ہلا دیا۔ روزانہ گھر سے اتنا دور آنے کا تصور اس کے لیے کافی خوف ناک تھا اور پھر یہ علاقہ بھی انڈسٹریل تھا۔ دور دور بس فیکٹریاں اور فضا میں گونجتی مشینوں کی آوازیں آبادی کا تو کوئی نام و نشان نہ تھا۔

ماموں کے ساتھ چلتی وہ فیکٹری کے مین گیٹ تک پہنچ گئی۔ گیٹ کیپر نے ماموں کا کارڈ دیکھ کر انہیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ ایک لمبی روش کو طے کر کے وہ لوگ مرکزی ہال میں پہنچے۔ ریسپشنسٹ نے ایڈمن آفیسر کے کمرے تک ان کی رہنمائی کر دی۔

"السلام علیکم فاروقی صاحب۔" ماموں نے اندر داخل ہو کر زوردار سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" انہوں نے اُٹھ کر ہاتھ ملایا۔ "تشریف رکھیے۔"

فاروقی صاحب درمیانی عمر کے سوبر سے آدمی تھے۔ انہوں نے ایک نگاہ نیلم پر ڈالی۔

"یہ بچی ہے؟"

"جی ہاں۔" ماموں نے سر ہلایا۔

"میں نے اس کے لیے بات کر لی ہے۔ لیڈی آپریٹر کی جگہ خالی ہے۔ فی الحال اس کو وہاں رکھوا دیتا ہوں، پھر بعد میں مزید کوئی مناسب جگہ خالی ہوئی تو دیکھا جائے گا۔"

"کیوں بھئی۔" ماموں نے اسے دیکھا۔ "کر لو گی ناں؟۔"

"جی۔" نیلم نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ایم۔ ڈی صاحب خود تو موجود نہیں ہیں۔ میں نے عباسی صاحب سے بات کی تھی۔ وہ فیکٹری منیجر ہیں۔ فی الحال تمہارا انٹرویو وہ کر لیں گے۔ ٹھیک ہے ناں؟"

"جی" اسے نجانے کیوں ڈر لگ رہا تھا۔

''چلو، میں تمہیں ان سے ملوا دیتا ہوں۔'' وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

نیلم گھبرائی ہوئی ان کے پیچھے پیچھے چل دی۔ یہ زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ پہلی بار قدم گھر سے نکالا تھا۔ گھبراہٹ اور پریشانی اس کے ہرانداز سے ہویدا تھی۔

''عرفان عباسی۔ فیکٹری منیجر۔'' نیم پلیٹ دروازے پر لگی ہوئی تھی۔ وہ فاروقی صاحب کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوگئی۔

عباسی صاحب کسی سے فون پر مصروف گفتگو تھے۔ چند لمحوں بعد ریسیور رکھ کر ان کی جانب متوجہ ہوئے۔

''سر! یہ لڑکی جس کے سلسلے میں، میں نے آپ سے بات کی تھی۔'' فاروقی صاحب اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کرسی پر ٹک گئے۔

''ہوں۔'' انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ ''کیا نام ہے آپ کا؟''

''نیلم علی۔''

''فائل لائی ہیں آپ؟''

''جی۔'' اس نے اپنی فائل ان کی جانب بڑھا دی۔

''پہلے کبھی لیڈی آپریٹر کی جاب کی ہے؟'' ان کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

''میں نے کبھی جاب نہیں کی سر!'' اس نے سر جھکا لیا۔ ''کسی بھی قسم کی۔''

''ٹھیک ہے۔'' انہوں نے دیکھے بغیر فائل واپس کر دی۔

''میں آپ کو اپائنٹ کر لیتا ہوں۔ فاروقی صاحب آپ کو مس نگہت سے ملوا دیں گے۔ وہ آپ کو سارا کام سمجھا دیں گی۔ کل سے آپ آ جائیں۔

''تھینک یو سر!''

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کا کام اس قدر آسانی ہو جائے گا۔ اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔

''تنخواہ آپ کی ساڑھے تین ہزار روپے ہوگی۔ یہ اسٹارٹ ہے۔ آپ کو منظور ہے؟''

''ٹھیک ہے سر!'' اس نے سر ہلایا۔

''پچھلے کئی دنوں کی مسلسل کوششوں کے بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کیلئے یہ نوکری بھی غنیمت ہے۔ اس سے زیادہ کی توقع فضول تھی۔

وہ فاروقی صاحب کے ساتھ باہر آ گئی۔ مس نگہت بھی آپریٹر تھیں اور کافی عرصے سے یہاں کام کر رہی تھیں۔ وہ اسے کام کی نوعیت سے آگاہ کرنے لگی۔

''ہیلو نگہت۔'' کسی نے ان کے شانے پر ہاتھ مارا تھا۔

نیلم بھی نو وارد کی جانب متوجہ ہوگئی۔

"اوہ! مس زارا۔ کیسی ہیں آپ؟" مس نگہت مسکرائیں۔

"آئی ایم فائن۔" اس نے نیلم کو بغور دیکھا۔ "نیا چہرا؟"

"یہ نیلم ہیں۔ ان کو عباسی صاحب نے آج ہی اپائنٹ کیا ہے۔"

"عباسی صاحب نے۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ ناچنے لگی۔ "ضرور کیا ہوگا۔ عباسی صاحب کے اپائنٹ کیے گئے اسٹاف میں ایک قدر ضرور مشترک ہوتی ہے۔ چہرا۔"

اس نے نیلم کے رخسار پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

"زارا پلیز!" نگہت کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

"او۔کے۔سی۔یو!" وہ مسکرائی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

"عجیب واہیات لڑکی ہے۔" نیلم نے اسے تنفر سے دیکھا۔ اس کا گال پر ہاتھ پھیرانے کی حرکت اسے سخت بری لگی تھی۔

"کون ہیں یہ؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"پروڈکشن کے ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔" نگہت نے مختصر کہا اور اسے کام سمجھانے لگی۔

نیلم کا ذہن چند لمحوں کے لیے بھٹک گیا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور کام سمجھنے لگی۔



"بجو! کل سے آپ فیکٹری جائیں گی؟"

ریشم دونوں ہتھیلیوں کے پیالے میں چہرا جمائے اسے کپڑے پریس کرتا دیکھ رہی تھی۔

"ہوں۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔

"کر لیں گی بجو؟ میں نے سنا ہے لڑکیوں کے لیے باہر کا ماحول اچھا نہیں ہوتا۔"

نیلم نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

" انسان خود اچھا ہو تو سب اچھے ہوتے ہیں ریشم۔ اور پھر یہ میری مجبوری ہے، شوق نہیں، بینک میں موجود رقم اب زیادہ عرصہ تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی۔"

"بجو! آپ کی تنخواہ تو اتنی کم ہے۔ اتنی تنخواہ میں ہمارا گھر نہیں چل سکتا ناں؟"

نیلم ہولے سے مسکرا دی۔

"اللہ مالک ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ کچھ عرصے میں کچھ شارٹ کورسز کرلوں پھر کہیں اور کوئی اچھی نوکری دیکھوں گی۔ کم از کم گھر میں فاقے تو نہیں ہوں گے ناں۔"

"اللہ میاں نے ہم سے وقار بھائی کو کیوں چھین لیا بجو؟" وہ اداسی سے بولی۔ "زلفی بھی ابھی کسی قابل نہیں ہے ورنہ کم از کم آپ کو تو یہ سب کچھ نہ کرنا پڑتا۔"

"خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ ایسے مت سوچا کرو۔" وہ کپڑے ہینگر میں لٹکانے لگی۔

"آپ کے پاس تو ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہیں بجو۔ آپ روزانہ اس پرابلم کا شکار ہوں گی کہ کیا پہنیں۔"

"وہ ہنس دی۔

"بس جو کچھ بھی ہے۔ خدا کا شکر ہے۔"

"ویسے ایک بات ہے۔" وہ اچانک چہکی۔ "ان کپڑوں میں بھی آپ وہاں سب سے مختلف، سب سے اچھی لگیں گی۔ ہیں ناں؟"

"کیوں؟" اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"کیونکہ آپ ہیں ہی سب سے اچھی۔" اس نے پیار سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اچھا! یہ مکھن کیوں لگ رہا ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔

اسی لمحے زلفی اندر آیا تھا۔

"بجو! کتنے پیسے ہوں گے آپ کے پاس؟"

"خیریت!" اس نے ریشم کو خود سے علیحدہ کیا۔

"مجھے سخت ضرورت ہے۔ کچھ اہم نوٹس فوٹو اسٹیٹ کرانے ہیں۔ چند کتابیں خریدنی ہیں۔"

"کتنے پیسے چاہئیں؟"

"ہزار تو ہوں۔" وہ بڑی جلدی میں تھا۔

"زلفی!" وہ پریشان ہو گئی۔ "ابھی کچھ دن ہوئے تم ڈھائی ہزار لے کر گئے تھے۔"

وہ تو فیس تھی بجو۔ اب میں نشہ تو نہیں کرتا ناں۔ ضرورت ہے مانگ رہا ہوں۔ ورنہ کیا میں اس گھر کے پرابلمز کو نہیں سمجھتا؟" وہ اچانک ہی جھنجلا گیا۔

اس نے خاموشی سے اسے رقم لا دی۔

"کیا ہوا بجو؟" ریشم نے اسے غور سے دیکھا۔ "اتنی پریشان کیوں ہو گئی ہیں؟"

"کچھ نہیں۔"

وہ سر جھٹک کر کچن کی سمت چل دی۔ یہ رقم اس نے اماں کی دوائی کے لیے بچا بچا کر رکھی تھی اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ اماں کی مہینہ بھر کی دوائیاں کہاں سے آئیں گی۔

مریم کھانا تیار کر چکی تھی۔ چاول دم پر رکھے تھے اور سلاد کے لیے پیاز کاٹ رہی تھی۔

"کھانا لگاؤں بجو؟" اس نے بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ تم تھک گئی ہوگی۔ میں ریشم سے کہتی ہوں۔"

"رہنے دیں بجو! اس کے امتحان سر پر ہیں۔ اچھا ہے کچھ پڑھ لے۔"

"وہ پڑھ کہاں رہی ہے۔ ایسے ہی ادھر ادھر پھر رہی ہے۔"



سبز گھاس پر وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ گلابی نیل پالش سے سجے نرم پیروں پر نگاہ جمائے، دانتوں سے لب کاٹتے ہوئے گہری سوچ میں تھی۔

"امی تک میں نے تمہارا پیغام پہنچا دیا تھا۔" مہناز کہہ رہی تھی۔ "وہ جاننا چاہتی ہیں کہ عثمان میں آخر ایسی کیا برائی ہے۔ جس کی وجہ سے تم شادی کے معاملے میں اس قدر تذبذب کا شکار ہو۔ عاصمہ چچی جلد از جلد یہ فریضہ نمٹا دینا چاہتی ہیں۔ آخر ان کے بیٹے کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ لوگ بار بار بھی ایک سوال کرتے ہیں کہ اس مقدس فریضے کے سرانجام دیے جانے میں اتنی دیر کیوں لگائی جا رہی ہے۔"

وہ کچھ بھی کہے بنا بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔

"الماس! میں تمہاری بہن ہوں۔ تمہاری عادتوں سے بخوبی واقف ہوں۔ تم بہت جلد ہر شے سے اکتا جاتی ہو۔ خواہ وہ کوئی لباس ہو، سینڈل ہو یا گانوں کی کیسٹ لیکن یہ معاملہ نہایت اہم ہے۔ تمہیں اپنے بچکانہ رویے میں تبدیلی کرنی ہوگی۔"

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی۔

"اور پھر۔ یہ بھی ہے کہ کچھ دنوں سے تم۔" وہ پھر خاموش ہوئی۔

"الماس نے سر کو اٹھا کر اسے دیکھا۔" ہاں کہو! کیا بات ہے؟"

"کیا تمہیں کوئی اور شخص مل گیا ہے؟" اس نے الماس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تمہارے معمولات بڑی حد تک تبدیل ہو گئے ہیں۔ تم گھنٹوں کسی سے فون پر باتیں کرتی ہو اور کل صبا کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی تم نے عرصے سے اس سے بات نہیں کی۔ سب جانتے ہیں کہ وہ تمہاری واحد دوست ہے۔ اگر تم اس سے باتیں نہیں کرتیں تو پھر وہ کون ہے جس سے تم روزانہ کئی کئی گھنٹے مخاطب رہتی ہو؟ پہلے تم کبھی ہفتوں میں گھر سے نکلا کرتی تھیں اور اب تمہیں ہر دوسرے روز گاڑی کی ضرورت پڑتی ہے۔ گھر میں سب کو علم ہے کہ تم اکثر عثمان سے ان کی گاڑی لے جاتی ہو۔ عثمان کی شرافت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ نہ تو انہوں نے کبھی تم سے باز پرس کی اور نہ گھر میں کسی سے ذکر کیا۔ لیکن شاید، وہ حماقت کر رہے ہیں۔"

"وہ مجھ سے کسی بھی قسم کی باز پرس کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔" وہ خفگی سے گویا ہوئی۔

"میں کس سے باتیں کرتی ہوں اور کہاں جاتی ہوں۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں نہ وہ دخل انداز ہو سکتے ہیں نہ کوئی اور۔"

''خدارا الماس!'' مہتاز زچ ہو کر بولی۔ ''مت اتنی خودسری دکھاؤ۔ بہت نقصان اٹھاؤ گی۔ یقین جانو، تمہیں ایک بہترین چیز مل رہی ہے۔ یا تو جلد از جلد اسے قبول کرلو، یا پھر۔''

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر گہری سانس لی۔

''یا پھر کوئی اور فیصلہ سنادو۔ ہم سب تمہاری جانب سے کسی فیصلے کے منتظر ہیں۔''

''اس نے سوچ میں گم الماس کو دیکھا۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھ کر اندر چلی گئی۔



''میں نے فیصلہ کرلیا ہے صبا!'' کشن پر نیم دراز، ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے کھیلتی ہوئی وہ کہہ رہی تھی۔ ''میں عثمان سے شادی نہیں کرسکتی۔''

صبا نے حد درجہ تاسف سے اسے دیکھا۔

''لیکن کیوں اکوئی ٹھوس وجہ بھی تو ہوگی تمہارے پاس۔''

''وجہ یہ ہے کہ ہمارے ذہن میچ کرتے ہیں نہ طبیعتیں۔ میں ان کی کمپنی میں گھبرا جاتی ہوں۔ اُلجھن ہوتی ہے مجھے۔'' اس نے ریموٹ ایک طرف ڈال کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھالیں۔

''سچ سچ بتاؤ الماس!'' صبا اس کے قریب ہوئی۔ ''یہی ایک وجہ ہے؟''

''کیا جاننا چاہتی ہو؟'' اس نے اپنی چمکیلی کانچ سی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''میرا خیال ہے الماس۔'' وہ واپس سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے فیصلے کی اس عمارت کا سب سے اہم اور مضبوط ستون رضا مراد ہے۔''

''الماس نے ایک نظر اسے دیکھا۔

''کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں رضا سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔؟'' الماس نے بھنویں اچکائیں۔

''شاید۔ کم از کم یہ تو میں جانتی ہوں کہ وہ تم سے شادی کا خواہش مند ہے۔''

''اس نے مجھے کبھی پروپوز نہیں کیا صبا!'' الماس نے سر جھٹکا۔ اور۔ اور۔ مجھے ہی کیا کسی بھی لڑکی کو پروپوز کرنے کے لیے اسے بڑا وقت درکار ہے۔ وہ کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ میں اس کے گھر جا چکی ہوں۔ ایک کمرے کا انتہائی بوسیدہ سا فلیٹ ہے۔ جس میں ایک پلنگ اور دو کرسیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ فلیٹ بھی اس کا اپنا نہیں ہے۔ اس کے کسی رشتے دار کا ہے۔ جس نے اس پر ترس کھاتے ہوئے اسے وہاں رہنے کی اجازت دی ہوئی ہے۔ اور۔ اور اس کی آمدنی۔ وہ مہینے بھر میں بمشکل ایک آدھ کانسرٹ ہی کرتا ہے۔ ہم اگر کسی جگہ سے چھولوں کی چاٹ بھی کھائیں

تو بل میں ادا کرتی ہوں۔وہ۔وہ مجھے پروپوز کیسے کرسکتا ہے۔اور اگر کر بھی دے تو میں کیسے ہامی بھر سکتی ہوں۔"

صبا بغور اسے دیکھ رہی تھی۔اس کے انداز میں حد درجہ مایوسی اور جھنجلاہٹ تھی۔غصہ تھا، بے بس ہونے کا احساس تھا۔

"میں تمہارا مسئلہ سمجھ چکی ہوں الماس!" وہ آہستگی سے بولی۔

"ہاں! بتاؤ مجھے۔کیا مسئلہ ہے؟ کیا پرابلم ہے میرے ساتھ؟ میں خود بھی نہیں سمجھ پاتی۔"

"محض رضا تم سے محبت نہیں کرتا بلکہ تم بھی اس کے سحر میں گرفتار ہو چکی ہو عثمان تمہیں اس لیے اچھے نہیں لگتے کہ تم ان سے محبت نہیں کرتیں۔ لیکن تم محبتوں میں اندھا دھند آگے بڑھنے کی قائل نہیں ہو تم جانتی ہو عثمان سے دستبردار ہونے کی صورت میں تمہیں اپنی زندگی کی تمام تر آسائشوں سے دستبردار ہونا ہوگا اور یہ تمہیں منظور نہیں۔دوسری جانب عثمان سے وابستہ ہو جانے کی صورت میں تمہیں اپنی محبت سے ہاتھ دھونے ہوں گے۔تم یہ بھی نہیں چاہتیں۔بس، یہی ایک کشمکش ہے جو تمہارے وجود کے اندر جاری ہے۔"

"میں۔میں رضا سے۔ہاؤ پاسبل۔" وہ بڑبڑائی۔"نہیں صبا! میں اسے نہیں چاہتی۔"

"پھر؟ کیا وجہ ہے کہ تم اسے نہ چاہنے کے باوجود اس سے ملنے اور ملتے رہنے پر مجبور ہو؟ کیوں گھنٹوں اس کی آواز سے دل بہلاتی ہو؟ کیا تم اس سے کھیل رہی ہو۔اور کیا عثمان خان سے بھی کھیل رہی ہو؟ تم۔تم کس اُلجھن میں مبتلا ہو؟"

صبا بری طرح زچ ہوگئی۔

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں!" اس نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کیں۔"میں اس کی نہیں، اس کے الفاظ میں دیوانی ہوں۔میری سمجھ میں نہیں آتا آخر عثمان مجھ سے وہ سب باتیں کیوں نہیں کہہ پاتے جانتی ہو صبا وہ اپنا دل کھول کر میرے آگے رکھ دیتا ہے۔کسی کشکول کی طرح۔اور مجھ سے کہتا ہے کہ میں محض اپنی ملکوتی مسکراہٹ کے سکے اس میں ڈالتی رہوں۔مجھے سامنے بٹھا کر کسی معبود کی طرح مجھے تکتا رہتا ہے۔میرے حسن کو خراج پیش کرنے کے لیے اس کے پاس الفاظ ہی الفاظ ہیں۔اور اس کا یہ خزانہ کبھی خالی ہی نہیں ہو پاتا۔وہ مجھے دیوی اور خود کو پجاری کہتا ہے۔میری آنکھوں پر کہنے کے لیے اس کے پاس بے شمار اشعار ہیں۔میرے لبوں کی خوبصورتی بیان کرنے کے لیے لاتعداد استعارے ہیں۔میں اسیر ہو چکی ہوں اس کے لہجے کی۔اس کی آواز کی۔صبا۔"

اس نے آنکھیں کھول کر مایوسی سے اسے دیکھا۔

"عثمان میرے منگیتر ہیں انہیں مجھ سے باتیں کرنے کے لیے غالب کی ضرورت پڑتی ہے۔کوئی مشکل سی بات سمجھانے کے لیے نجانے کس کس ادیب کے حوالے دینے پڑتے ہیں۔میں اکتا گئی ہوں ان سے اور ان کے رویے سے۔"

"مجھے افسوس ہے الماس!" صبا نے سر جھکا لیا۔"لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ تم ایک خوفناک تباہی کی جانب بڑھ رہی ہو۔"

"وہ کیسے۔" اس کے چہرے پر بدمزگی کے آثار نمودار ہوئے۔

"الماس! جو عورت اپنے وجود کے حسن کے احساس میں اس بری طرح گرفتار ہو جائے جیسا کہ تم ہو چکی ہو، اسے دُنیا میں اپنے علاوہ پھر

اور کوئی شے نظر نہیں آتی۔ ایسی عورت نہ خود خوش رہ سکتی ہے اور نہ کسی اور کو خوشیاں دے سکتی ہے۔ الماس! کیا تم جان نہیں پائیں کہ رضا تمہارے وجود سے محبت کرتا ہے اور عثمان تمہاری شخصیت، تمہاری پوری ذات کا احترام کرتے ہیں۔ وہ تمہارے حسن کو سراہتے ضرور ہوں گے لیکن لفظوں میں اس کا اظہار اس لیے نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک یہ سطحی بات ہوگی۔ الماس! اگر تم رضا سے محبت نہیں کرتی تو عثمان کو اپنا لو۔ رضا کی محبت کا مقابلہ ان کی محبت سے مت کرو۔ کیا تمہیں ان کی ذات کا گہرا پن محسوس نہیں ہوتا؟ تم کوئی چودہ پندرہ سال کی کچے ذہن کی لڑکی نہیں ہو جس کے نزدیک محض تعریف کے چند الفاظ ہر شے سے زیادہ قیمتی ہوں، یقین کرو الماس! دیوی کو ایک پجاری کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ کچھ بھی نہیں۔ جبکہ ایک قابل اعتماد، عالی ظرف ساتھی زندگی کے ہر موڑ پر کام آتا ہے۔ اس کی پوجا کے چند پھولوں کے سہارے تمہاری زندگی نہیں گزر سکے گی۔"

"الماس نے دونوں ہاتھ سے اپنا سر تھام لیا۔ صبا بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔

"میرا خیال ہے میں چائے بنا لوں۔"

وہ الماش کا شانہ تھپتھپا کر باہر نکل گئی۔ اس کے خیال میں جو کچھ اس نے کہا، اس پر غور کرنے کے لیے الماس کو کچھ دیر تنہائی کی ضرورت تھی۔ اسے الماس کے انداز سے خوف آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ عثمان خان کو چھوڑ دینے کا قطعی فیصلہ کر چکی تھی اور اب اسے محض رضا کی جانب سے کسی پیش قدمی کا انتظار تھا۔

"خدا تمہیں عقل سلیم عطا فرمائے الماس۔" وہ چائے کی پتی ڈالتے ہوئے بڑبڑائی۔ "نجانے کس بری گھڑی میں یہ رضا مراد تم سے ٹکرا گیا ہے۔ اچھی خاصی پرسکون زندگی تھی تمہاری۔"

چائے بنا کر وہ واپس ڈرائنگ روم میں آئی تو ایک لمحے کے لیے پتھر بن گئی۔

الماس جا چکی تھی۔



"کیا بات ہے بھئی۔" عثمان خان اندر آتے ہوئے خوش دلی سے کہہ رہے تھے۔ "سنا ہے دشمنوں کے مزاج ٹھیک نہیں۔"

کڑھائی کے سیاہ لباس میں ملبوس الماس بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ اس نے بھاری بھاری پپوٹے اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"بیٹھ سکتا ہوں؟"

"تشریف رکھیے۔"

وہ اس کے قریب ہی ٹک گئے۔ الماس کے ماتھے پر پڑی شکنوں کو انہوں نے ایک نظر دیکھا پھر مسکرا دیے۔

"میں مخل تو نہیں ہوا آپ کے آرام میں؟"

"جی؟" اس نے ابرو اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "جی نہیں۔ ویسے میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ آپ سے کس نے کہا کہ میں بیمار ہوں؟"

"کسی نے بھی نہیں۔" وہ ہنسے۔ "مہناز بتا رہی تھیں آپ کا موڈ دو تین دن سے آف ہے اور آپ کمرا بند کیے لیٹی ہیں۔ نہ ہنستی ہیں نہ بات کرتی ہیں۔ میں نے سوچا نادانستگی میں کوئی بھول اگر مجھ سے ہو گئی ہو تو میں بھی ذرا اپنا اعمال نامہ چیک کر لوں۔ کہیے کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"پھر؟ یہ ڈپریشن کا دورہ کیوں؟"

"ڈپریشن۔" وہ انگلیاں چٹخانے لگی۔ "ہاں۔ ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔"

عثمان نے غور سے اسے دیکھا۔ چاند چہرے کی ضیاء کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ آنکھوں کے گرد ہلکی ہلکی سیاہیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا، وہ دو تین دن سے بیمار رہی ہو۔

"نبض دکھایئے۔" انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"الماس ہولے سے ہنس دی۔

"آپ ملنے آئے ہیں یا میرا چیک اپ کرنے۔"

"ڈاکٹر سے منگنی کرنے کا یہ پہلا فائدہ آج آپ کو محسوس ہوا۔" وہ ہنس دیے۔ "ملاقات بھی ہو جائے گی اور چیک اپ بھی۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور بے وجہ فیس بھرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"فیس بھرنے کا؟" انہوں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"جی ہاں۔ کیا خبر جاتے جاتے بل بھی تھما جائیں آپ مجھے۔" اس کا انداز سنجیدہ تھا۔

عثمان زور سے ہنس دیے۔

"اوہو۔ یعنی اس قدر جاننے لگی ہیں آپ مجھے۔" وہ شگفتگی سے بولے۔

"جان ہی تو نہیں پائی۔" وہ ہولے سے بڑبڑائی تھی۔

"جی؟ کیا کہا۔" وہ سن نہ سکے تھے۔

اسی لمحے نسرین نے دروازے پر دستک دی۔

"الماس بی بی۔ فون ہے آپ کا۔"

وہ اسے کارڈلیس تھما گئی۔

"میرا خیال ہے میں چلتا ہوں۔" عثمان کھڑے ہو گئے۔

"خدا حافظ۔" الماس نے ایک نظر انہیں دیکھا اور فون کان سے لگا لیا۔

"ہیلو۔ ہاں رضا! میں کتنے دن سے تمہارے فون کا انتظار کر رہی تھی۔"

باہر نکلتے عثمان نے اس کا جملہ سنا تھا۔ وہ کچھ دیر بند دروازے کے پاس کھڑے کچھ سوچتے رہے پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔



"جمنا! میں لان میں ہوں۔ مجھے ایک کپ چائے تو دے جائیں۔"

ہاتھ میں کتاب تھامے وہ لاؤنج میں نکلتے کہہ رہا تھا۔

عفت خانم کے پاس بیٹھی نبیلہ نے ایک نظر اس کے چوڑے شانوں پر ڈالی پھر اٹھ کر کچن کی سمت بڑھ گئی۔

وہ کتاب میں محو تھا جب وہ ٹرے اٹھائے وہاں چلی آئی۔ چوڑیوں کی کھنک پر اس نے نظر اٹھائی تھی۔

"آپ نے کیوں زحمت کی؟" وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ میں نے تو جمنا سے کہا تھا۔

"اصل میں میرا اپنا موڈ بھی چائے پینے کا ہو رہا تھا۔" وہ مسکرائی۔ "میں نے سوچا، ایک سے دو بھلے ہوتے۔ مجھے اکیلے کچھ کھانا پینا پسند نہیں ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا لیکن چہرے پر ایک عجب سا کھنچاؤ واضح تھا۔

"بسکٹ لے لیں۔" نبیلہ نے پلیٹ اس کی سمت بڑھائی۔

"نہیں شکریہ۔ مجھے بس ایک کپ چائے دے دیں۔"

"کوئی شخص سامنے بیٹھا ہو تو کتاب کھولے رکھنا عین بداخلاقی ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسی تھی۔

اس نے گہری سانس بھر کر کتاب بند کر دی۔

"یہ لیجیے۔" اس نے چائے کا کپ اس کی سمت بڑھایا۔

فیروز احمد نے کپ تھام لیا اور ہولے ہولے گھونٹ بھرنے لگا۔

''میں اور عقیلہ پرسوں واپس جا رہے ہیں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''اوہ۔ اچھا۔ ٹھہرتے کچھ روز اور۔'' اس نے جیسے رسم نبھائی۔

وہ مسکرا دی۔ ''اس سے آپ کو کیا فرق پڑے گا۔''

''کس سے؟'' اس نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''ہمارے ٹھہرنے یا نہ ٹھہرنے سے۔'' وہ سر جھکا کر ناخن دیکھنے لگی۔

انداز میں کئی رنگ نمایاں تھے اور وہ ایک بھرپور، جوان مرد تھا۔ ہر رنگ کو بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔

وہ چند لمحے ایسے دیکھتا رہا۔

''نبیلہ بی بی!'' پھر وہ آہستگی سے بولا۔ ''بعض کنویں اندھے، اندھیرے، خشک ہوتے ہیں۔ کسی امید پر ان میں پتھر پھینکتے رہنا حماقت اور وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ توانائیاں وہاں صرف کرنی چاہئیں جہاں سے جواب میں کچھ ملنے کی امید ہو۔''

''جی۔'' وہ یک لخت ہراساں ہوئی تھی۔ ''میں کچھ نہیں۔ پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا مطلب تھا۔''

بوکھلاہٹ میں اس کے ہاتھ سے کیتلی الٹ گئی۔ گرم گرم چائے اس کے ہاتھوں کو جلاتی، کپڑوں میں جذب ہوتی نیچے گرنے لگی۔ ہلکی ہلکی کراہیں اس کے لبوں سے نکلی تھیں۔

''اوہ گاڈ!'' وہ بے اختیار کپ رکھ کر اس کے نزدیک آیا۔ ''یہ کیا کر لیا آپ نے؟''

''وہ اس کے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ گوری جلد پر لال لال نشانات اُبھر آئے تھے۔

''بیٹھی رہیے۔ میں مرہم لاتا ہوں۔''

وہ تقریباً دوڑتا ہوا اندر گیا۔ نبیلہ پلکیں جھکائے بنا بیٹھی رہ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں گئے ہاتھوں کی ساری جلن، ساری دُکھن جیسے پل بھر میں ختم ہو گئی تھی۔ صرف ایک مہربان لمس کا احساس رہ گیا تھا۔

وہ چند منٹوں میں واپس آ گیا۔ اسکے قریب گھاس پر گھٹنا ٹکا کر بیٹھ گیا اور مرہم ٹیوب سے نکال کر احتیاط سے اس کے ہاتھوں پر لگانے لگا۔

نبیلہ بڑے جذب کے عالم میں اس کے گھنے بالوں، کشادہ پیشانی اور لانبی پلکوں کی حرکت کو دیکھ رہی تھی۔ ہاتھوں میں ٹھنڈک سی دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اور وہ جو نبیلہ اور عقیلہ سے ملنے آئی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ان دونوں کی محویت کو پلک جھپکائے بنا دیکھ رہی تھی۔

خوابوں میں بھی اس سے دور رہنے والا کسی اور کے اس قدر قریب تھا۔ اس کے اندر سانسوں کا جوار بھاٹا اُٹھنے لگا۔ وہ مڑی اور تیز تیز چلتی گیٹ کی سمت چل دی۔

''ارے صبا!'' نبیلہ نے آہٹ پر مڑ کر دیکھا تھا۔ ''صبا!''

''اس نے آواز بھی دی لیکن وہ باہر جا چکی تھی۔

ٹیوب بند کرتے فیروز کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے ٹھہرے تھے۔ پھر وہ سر جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔



سفید چادر میں لپٹی وہ اسٹاپ پر بس سے اُتری تھی۔ جاب کا آغاز کیے ہفتہ بھر ہو چلا تھا۔ اور اب اسے اس روٹین کی عادت ہوتی جا رہی تھی۔

"نیلم۔" کسی نے پیار سے پکارا تھا۔

اس کے بڑھتے قدم اچانک ہی تھمے تھے۔ تعجب سے مڑ کر دیکھا۔ راجہ اس کے مقابل کھڑا تھا۔ غصے کی ایک لہر اس کے اندر سے اُٹھی۔ اسے کس نے یہ حق دیا تھا کہ وہ اس کو اس طرح سے پکارتا۔

"یوں اکیلی کہاں سے آرہی ہو؟" وہاں حد درجے بے تکلفی تھی۔

وہاں اتنے لوگ تھے کہ وہ اگر چاہتی تو اس کو اچھے خاصے جوتے پڑوا سکتی تھی۔ لیکن اپنی ذات کا تماشا بنوانا اسے گوارا نہ تھا۔

غصے کو اپنے اندر دباتی وہ آگے بڑھ گئی۔ اسٹاپ سے گھر تک کا فیصلہ دس پندرہ منٹ کا تھا اور اس وقت شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔

"کب تک میرے پیار کا جواب پیار سے نہیں دو گی۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"تم میرا پیچھا چھوڑ نہیں سکتے؟" وہ تڑپ کر مڑی۔ "کیوں ایک عفریت کی مانند میرا پیچھا لے لیا ہے تم نے؟"

"محبت کرتا ہوں تم سے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "یہ جو تمہاری موہنی صورت ہے ناں رات رات بھر اسے آنکھوں میں بسائے جاگتا رہتا ہوں۔ کھلی آنکھوں سے سپنے دیکھتا ہوں تمہارے۔ دیکھو ناں کتنا بدل لیا ہے میں نے خود کو تمہارے لیے۔ اچھے کپڑے پہنتا ہوں، خوشبو بھی لگاتا ہوں۔ ایک نوکری بھی کر لی ہے۔"

"باہر سے تم چاہے سرخاب کے پر بھی لگا لو ناں تب بھی اندر سے ویسے ہی گنوار کے گنوار رہو گے۔ تم جاہل ہو سرتا پا جاہل۔ شریف بہن بیٹیوں کو یوں سر عام مخاطب کرنا اور ایسی واہیات باتیں کرنا جہالت اور گنوار پن ہے۔ ہونہہ!"

وہ بپھری ہوئی آگے بڑھ گئی۔

"ایک دن تمہیں دُلہن بنا کر اپنے سامنے نہ بٹھایا تو نام بدل دینا میرا۔" وہ بول کر تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ "اسی جاہل کے گھر آؤ گی تم نیلم بی بی۔ لکھ لینا۔"

اس کا دل خوف، خجالت اور غم و غصے سے اس تیزی سے دھڑکنے لگا کہ اس سے چلنا دوبھر ہو گیا۔ پیٹ تھام کر وہ وہیں گلی میں بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا بیٹی۔" کوئی خاتون وہاں سے گزر رہی تھیں۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟"

"جی!" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کھڑی ہو گئی۔

"میں گھر تک چھوڑ آؤں؟ کہاں ہے تمہارا گھر؟"

"جی۔بس وہ سامنے ہی ہے۔میں چلی جاؤں گی شکریہ۔"

وہ بھاری بھاری قدموں سے آگے بڑھ گئی۔



کارپٹ پر نیم دراز وہ بے دلی سے چینل بدل رہی تھی۔جب نجمی خاتون اندر داخل ہوئیں۔

"صبا جی۔"

"جی امی؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"باہر مہمان آئے ہیں۔چائے تو بنا لاؤ۔"

"کون ہے امی؟" وہ کھڑی ہو گئی۔

"تمہارے ابو کے دوست کے بیٹے ہیں۔پنڈی سے یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔ملنے آئے ہیں۔"

وہ سر ہلا کر کچن میں آ گئی۔کچھ دنوں سے بیزاری کی ایک کیفیت اس کے پورے وجود پر طاری تھی۔کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔
چائے بنا کر اس نے بسکٹ اور کچھ اسنیکس وغیرہ ٹرے میں رکھے اور باہر لے آئی۔آف وائٹ شلوار قمیص میں ملبوس ایک خوش شکل، نوجوان نجمہ بیگم اور توقیر صاحب سے محوِ گفتگو تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے ٹرے میز پر رکھی۔

"وعلیکم السلام۔" وہ خوش دلی سے مسکرایا۔"آپ یقیناً صبا ہیں۔"

"جی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"بیٹی یہ دانیال ہاشمی ہیں۔تمہیں اپنے ہاشمی انکل یاد ہیں۔جن کا ٹرانسفر ہو گیا تھا؟"

"جی۔" اس نے ذہن پر زور دیا۔"شاید۔"

"یہ انہی کے بیٹے ہیں۔ابھی انہوں نے اپنا کاروبار یہاں شفٹ کیا ہے۔اپنا بنگلہ بھی یہیں بنوا رہے ہیں۔" توقیر صاحب بڑے خوش نظر آ رہے تھے۔

بیٹا میں کھانا تیار کر رہی ہوں کھا کر جانا۔" نجمہ خاتون بولتی ہوئی اٹھیں۔

"ارے نہیں آنٹی۔کوئی تکلف نہیں۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔"میں بس اب چلوں گا۔کھانا پھر کسی دن کھا لوں گا۔اپنے ہی گھر کی بات ہے۔"

"جب اپنے گھر کی بات ہے تو تکلف کیسا؟" توقیر صاحب ہنسے۔"جاؤ بیگم جرے دار سا کھانا تیار کرو۔"

صبا بھی اندر جانا چاہتی تھی لیکن کچھ دیر اخلاق نبھانے کی خاطر وہیں رک گئی۔

"پڑھتی ہیں آپ؟" وہ اس کی جانب متوجہ تھا۔

"بی ایس سی کیا ہے۔اب ایم ایس سی میں ایڈمیشن لینے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"جی۔مناسب خیال ہے۔" وہ مسکرایا

"تم لوگ گپ شپ کرو۔میں ایک ضروری فون کرلوں۔"

توقیر صاحب اُٹھ کر اندر کی سمت بڑھ گئے۔

صبا کو غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔اسے لگا ان دونوں کو تنہائی جان بوجھ کر فراہم کی گئی ہے۔

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔وہ آنکھوں میں دنیا جہان کی دلچسپیاں بھرے اسے دیکھ رہا تھا۔اس نے گھبرا کر نظریں جھکالیں۔

"کچھ میرے بارے میں نہیں پوچھیں گی آپ؟" اس کا انداز شرارتی تھا۔

"جی؟" وہ پزل ہو کر انگلیاں چٹخانے لگی۔"کوئی ضرورت تو نہیں۔"

"ارے!" وہ ہنس دیا۔" آپ تو بڑی نا سمجھ ہیں۔محترمہ! مستقبل قریب میں ہمارے ایک دوسرے سے وابستہ ہو جانے کے بڑے گہرے امکانات ہیں۔موقع مناسب جانیے اور اچھی طرح جان پھٹک کر دیکھ لیجیے مجھے۔میں تو آپ کو پاس کر چکا ہوں۔اگر آپ نے مجھے اچھے مارکس دے دیے تو سمجھیے بات پکی ہے۔"

وہ حد درجہ شگفتہ مزاج،شوخ وشنگ اور باتونی لگتا تھا۔لیکن صبا کا دھیان اس کی کسی بھی کوالٹی کی جانب نہ تھا۔وہ تو اس کے الفاظ سن کر گم صم ہوگئی تھی۔

ذہن میں سب سے پہلی تصویر فیروز احمد کی بنی تھی۔

"تو فیروز احمد۔کیا میں تمہیں پائے بنا ہی کھونے لگی ہوں۔"

وہ جیسے اندر ہی اندر اندھیروں میں گرتی جارہی تھی۔



وہ اگلے روز فیکٹری جانے کے لیے کپڑے استری کر رہی تھی۔ساتھ ہی ساتھ انجم کو سبق بھی یاد کرارہی تھی۔

ریشم اور مریم پڑوس میں گئی تھیں۔زلفی اماں کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا ہوا تھا۔اس نے کسی کی بھی آمد کے پیش نظر باہر کا دروازہ کھلا چھوڑا ہوا تھا۔باہر صحن میں کسی کے قدموں کی چاپ اُبھری تو وہ پلگ لگا چھوڑ کر کمرے سے نکل آئی۔

"آپ!" یوسف کو برآمدے کی جالیوں کے پاس کھڑا دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی۔

"آپ۔اکیلے ہی آئے ہیں۔شبنم کو نہیں لائے؟"

"وہ ایک ساتھ سوالات کرنے لگی۔ وہ کوئی جواب دیے بنا اسے گھورتے رہے۔ سرخ آنکھوں، پریشان بالوں اور بڑھی ہوئی شیو میں وہ اسے کچھ بدلے بدلے سے لگے۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" وہ پریشان ہوگئی۔

"تمہیں میری پروا کب سے ہوگئی۔ نیلم بی بی۔" وہ زہر خند لہجے میں بولے۔ "کب احساس کیا ہے تم نے میرا، میرے جذبات کا؟"

"یوسف! برائے مہربانی ان باتوں کو یہیں روک دیں یہ باتیں اور ان کے کہنے سننے کا وقت عرصہ ہوا ختم ہو چکا ہے۔"

"کچھ ختم نہیں ہوا نیلم۔ کچھ ختم نہیں ہوا۔" وہ آگے بڑھ آئے۔ "میں آج بھی تمہیں سوچتا ہوں۔ میں آج بھی تمہارے سپنے دیکھتا ہوں۔ میرا دل آج بھی تمہارے لیے دھڑکتا ہے۔ میرا نام کس کے نام سے جڑا ہے مجھے خبر ہے نہ پروا ہے۔ میری روح کا ہر رشتہ تم سے جاملتا ہے۔ میں ان باتوں کو کیسے روک سکتا ہوں!"

"یوسف۔" اس کا گلا خشک ہوگیا۔ "دیکھیے۔ آپ مجھے نارمل نہیں لگتے۔"

انہیں اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔

"آپ۔ آپ چلے جائیں۔"

"میں کہیں نہیں جاسکتا نیلم۔ کہیں نہیں۔ تم نے اپنے پیار کی بیڑی ڈالی تھی میرے قدموں میں۔ اب تم خود بھی چاہو تو مجھے آزاد نہیں کرسکتیں۔"

انہوں نے اسے دونوں شانوں سے تھام کر خود سے قریب کرنا چاہا۔

"یوسف۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں چیخی۔ "خدارا، یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔ چھوڑیے مجھے۔"

"میں جل رہا ہوں نیلم۔ صحراؤں میں ننگے پاؤں پھر رہا ہوں۔ مجھے اپنے پیار کی چند بوندیں بھیک کر دو۔"

انہوں نے اسے خود سے لپٹالیا۔

نیلم نے اپنا پورا زور لگا کر خود کو چھڑایا اور بھاگتی ہوئی اماں کے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ بند کر کے وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"نجانے کتنی دیر گزر گئی۔ باہر اماں اور ذکی کی آواز آئی تو اس نے دوپٹے سے جلدی جلدی چہرا صاف کیا اور اٹھ کر کنڈی کھول دی۔

"یہاں بیٹھی ہو۔" اماں تھکی ہوئی اندر آئی تھیں۔ "باہر دروازہ کھلا چھوڑ رکھا ہے۔"

اسے اندازہ ہوا کہ یوسف جاچکے تھے۔

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

اماں نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔

''کیا رو تی رہی ہو؟''

''نہیں اماں۔ وہ سلاد کے لیے پیاز کاٹی تھی۔'' اسے بروقت بہانا سوجھا۔

''اسی وقت انعم اندر آ گئی۔

''اماں۔'' وہ بھاگ کر اماں سے لپٹ گئی۔ ''یوسف بھائی آئے تھے۔''

''اچھا!'' اماں کو تعجب ہوا۔ ''کب آئے۔ تم نے تو مجھے نہیں بتایا؟''

انہوں نے نیلم کو دیکھا۔ وہ چوری بن گئی۔

''پتا ہے اماں۔ انہوں نے بجو کو گلے سے لگا کر پیار بھی کیا ہے۔ جیسے آپ مجھے کرتی ہیں۔'' وہ واقعہ کی چشم دیدہ گواہ تھی اور نیلم کو خبر نہ تھی۔

اماں سن بیٹھی تھیں اور نیلم کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سما جائے۔



اماں دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی تھیں۔

ان کی شاید یہ بھی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ اگر اس سے سوال کریں تو کیا کریں؟ اور نہ نیلم کے پاس ہی کوئی وضاحت تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرائے اپنے اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھیں کہ در حقیقت کیا ہوا تھا۔

چند لمحوں بعد ذلفی بھی اندر آ گیا۔

''بجو! مجھے کھانا نکال دیں۔ بہت بھوک لگی ہے۔''

''وہ آہستگی سے اُٹھ کر دروازے کی سمت بڑھی تھی۔

''نیلم!'' اماں نے اُسے پیچھے سے پکارا۔ ''انعم کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اسے کل کا سبق یاد کرا دو۔!''

''آؤ انعم۔!''

وہ رکی نہیں۔ نہ پلٹ کر ماں کو دیکھا۔ انعم کو پکار کر کمرے سے نکل گئی۔ وہ جانتی تھی اماں نے اسے یہ ہدایت کیوں کی تھی۔ انہیں ڈر تھا کہیں وہ ذلفی کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ دے۔

انعم کو کتاب تھما کر، سبق یاد کرنے کی ہدایت کر کے وہ کچن میں آ گئی۔

اس کا ذہن۔ بیک وقت کئی قسم کی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اسے یوسف کے عمل پر حیرانی بھی تھی۔ افسوس بھی تھا۔ غصہ بھی تھا اور اماں کے تاثرات پر خجالت اور ندامت کا احساس بھی دامن گیر تھا۔ انہوں نے اس سے کچھ نہ پوچھا تھا۔ کسی قسم کی وضاحت طلب نہ کی تھی۔ بس خاموشی کی ایک دبیز چادر ان کے وجود پر چھا گئی تھی۔

اور وہ ذلفی کے لیے روٹیاں پکاتے ہوئے مسلسل اس سوچ میں تھی کہ نجانے اماں نے انعم کے بیان سے کیا معنی اخذ کیے تھے۔ کہیں وہ اس

کو تو غلط نہیں سمجھ رہی تھیں؟

''ذلفی کے جانے اور ریشم اور مریم کے واپس آنے تک وہ جلے پیر کی بلی کی طرح ادھر ادھر پھرتی رہی سوچوں کی یلغار ایک مسلسل اضطراب بن کر اس کے رگ و پے میں سماتی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اماں کے پاس جائے اور رو رو کر انہیں یقین دلا دے کہ جو کچھ بھی ہوا اس میں اس کا کچھ ہاتھ نہ تھا۔ وہ قطعاً بے قصور تھی۔

پھر جس وقت وہ سونے کے لیے ان کے کمرے میں داخل ہوئی، وہ دیوار کی جانب منہ کیے آنکھوں پر کپڑا لپیٹے لیٹی تھیں۔ یہ اس بات کا واضح اشارا تھا کہ وہ کوئی بھی بات کہنے سننے کے موڈ میں نہیں ہیں۔

نیلم آہستگی سے اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔ بے بسی کے شدید احساس سے اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ اس وقت اسے یوسف پر شدت سے غصہ آیا۔ اس حد تک کہ اسے ان کے تصور سے کراہیت آنے لگی۔

کیا سمجھا تھا انہوں نے اسے! کیا وہ اس قدر گری ہوئی تھی کہ اپنے بہنوئی کی ذہنی اور جسمانی تھکن اتارنے کا سامان کرتی؟ کیا وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے۔ یا دین ایمان کہیں بیچ آئے تھے؟ کیا ان کے نزدیک رشتوں ناتوں کی کوئی اہمیت نہ تھی؟ کسی قسم کے تقدس اور احترام کے خیال نے ان کا دامن نہ کھینچا تھا۔؟

پھر اسے شبنم کا خیال آیا۔

نجانے وہ اس کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتے تھے کہ اپنی سگی بہن کے ساتھ اس کا سلوک انتہائی ناروا ہو گیا تھا۔ نجانے اس غریب کے دل پر دن ورات کیا بیتتی ہوگی۔ ہر لحظہ وہ سوچوں کی کسی بھٹی میں جل جل کر راکھ ہوتی ہوگی کہ اب وہ بات کرتی تھی تو اس کے لفظ آبلے ڈال دیتے تھے۔

''میری بہن! مجھے احساس ہے کہ میں نے تیرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔''

''اس نے آنسوؤں کے امڈتے ہوئے سیلاب میں بہتے ہوئے سوچا۔

''اپنی انا کا پرچم سربلند کرتے ہوئے میں نے بالکل نہیں سوچا کہ میں تیرے کومل جذبوں اور مہکتی خواہشوں کو ہمیشہ کی نیند سلانے کا سامان کر رہی ہوں۔ لیکن تیری قسم! مجھے اس بات کی خبر نہ تھی کہ جس شخص پر میں دنیا میں سب سے زیادہ اعتبار کرتی ہوں۔ وہ قدم قدم پر مجھے اس قدر بے اعتباری بخشے گا۔ مجھے میرے اپنوں کی نظروں میں ایک تماشا بنا دے گا۔ میرے دل و دماغ کو اضطراب اور بے سکونی کے اتنے خانوں میں بانٹ دے گا۔ اے کاش! مجھے خبر ہوتی تو میں اس شخص کا سایہ بھی تجھ پر نہ پڑنے دیتی۔''

اپنے وجود میں گونجتی چیخوں کا گلا اس نے بڑی مشکلوں سے روکا تھا۔ ورنہ جی تو چاہتا تھا کہ اتنا چلائے اتنا چلائے کہ ساری دنیا کو اس کی منتشر دماغی اور اذیت ناک کیفیات کی خبر ہو جائے۔

کسی مریض لادوا کی مانند وہ ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ صبح اذانوں کے وقت اس کی آنکھ کچھ دیر کو لگی تھی۔



"کیا بات ہے۔ رات کو سوئی نہیں ہو؟"

مس نجہت نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"جی۔ سر میں درد تھا۔" اس نے نظر چرالی۔ "نیند ٹھیک سے آئی نہیں۔ اس وقت بھی سر میں دھماکے سے ہو رہے ہیں۔"

"چلو۔ لنچ ٹائم ہو رہا ہے۔ کچھ پیٹ پوجا کر لیں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔ آپ جائیں۔" اس نے جھک کر سر میز کی سطح پر ٹکا دیا۔

یہ حقیقت تھی کہ پوری رات جاگنے اور روتے رہنے سے اس کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

"کچھ کھا لو گی تو آرام آ جائے گا۔" انہوں نے خلوص سے مشورہ دیا۔

"آپ مجھے ایک کپ چائے بھجوا دیں۔ ساتھ میں سر درد کی گولیاں۔" اس نے درخواست کی۔

"جیسی تمہاری مرضی۔!"

"وہ میس کی جانب بڑھ گئیں۔

سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

لعل سے لب، چراغ سی آنکھیں

ناک ستواں، جبیں کشادہ تھی!"

کسی نے بڑے خواب ناک لہجے میں شعر پڑھا تھا۔

نیلم نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ زارا مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ رہی تھی۔

"قسم خدا کی، تمہیں دیکھتی ہوں تو خوف سے میرا دل اوپر تک بھر جاتا ہے۔" وہ یوں گویا ہوئی جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ "جب کسی خوبصورت چہرے پر میں بھول پن بھی دیکھوں تو مجھے یونہی خوف آتا ہے۔"

نیلم کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ وہ خاموشی سے اس کی سمت دیکھتی رہی۔ گھونگھریالے بالوں اور تیز میک اپ سے سجے چہرے والی یہ لڑکی پہلی نظر میں طبیعت پر بہت خراب اثر چھوڑتی تھی۔

نیلم کو وہ اکثر نظر آتی تھی اور جب بھی اس پر نگاہ پڑتی تھی۔ اسے اس کی اول دن والی حرکت یاد آ جاتی تھی۔ وہ اسے سخت نہیں تو کچھ ناپسند ضرور کرتی تھی۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ اس کا کیریکٹر اچھا نہیں ہے۔!"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی!"

پھر کچھ دیر بعد وہ سنجیدگی سے بولی۔ اس وقت یوں بھی اس کا دل کچھ دیر تنہائی میں بیٹھنے اور خالی الذہنی کی کیفیت میں مبتلا ہونے کو چاہ رہا

تھا۔ وہ جلد از جلد اس سے جان چھڑانا چاہتی تھی لہٰذا اس کی گرم جوشی کے جواب میں اس نے نہایت سرد انداز اختیار کیا۔

مس نجمت نے چائے بھجوادی تھی۔ اور ٹرے میں دو کپ تھے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ زارا بھی چائے کا کہتی ہوئی آئی تھی یعنی وہ یہ فارغ وقت نیلم کے ساتھ گذارنے کی خواہش مند تھی۔ اسے یہ سوچ کر سخت کوفت محسوس ہوئی۔

"ابھی تو تم مجھے ہی نہیں سمجھ پائی۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "خیر، اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔ ویسے بھی ہم کوئی سربستہ راز تو ہیں نہیں۔ کچھ روز میں تمہیں خبر ہو جائے گی، پھر ہر طرح کی باتوں کا مطلب تم از خود سمجھ لیا کرو گی۔ کتنی چینی ڈالوں؟"

"جتنی بھی ڈال دیں۔" وہ قدرے بیزاری سے بولی۔

"کم چینی پیا کرو۔" وہ مسکرائی۔ "دیکھنے میں ہی شوگر کونڈ لگتی ہے۔ اور یہاں لوگ میٹھے کے بڑے شوقین ہیں۔ !"

"آپ۔ !" نیلم کو غصہ آگیا۔ "آپ بڑی فضول باتیں کرتی ہیں۔ نہایت واہیات۔ برائے کرم آپ مجھ سے ایسی باتیں مت کیا کریں۔"

زارا نے ہاتھ روک کر اسے غور سے دیکھا۔

"چچ چچ چچ۔" پھر وہ سر ہلانے لگی۔

یہ اظہار افسوس اس نے نجانے کس بات پر کیا تھا۔

پھر وہ اپنا کپ اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔

"گھر سے نکلی ہو تو دنیا کا سامنا کرنا سیکھو نیلم بی بی" وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔ "تمہیں تو منافقت کرنا بالکل نہیں آتی نجانے دنیا تمہارا کیا حشر کرے گی۔ !"

اپنا کپ اٹھائے وہ خراماں خراماں سیڑھیوں کی جانب چل دی۔ نیلم کا دل چاہا پیچھے سے اسے کوئی چیز دے مارے۔ وہ اس کے اُلجھے ہوئے ذہن کو مزید الجھا گئی تھی



وہ کچن میں کھڑی سالن بھون رہی تھی۔ جب کسی نے پیچھے سے اس کا دامن کھینچا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ ننھی مومنہ اس کا دامن تھامے کھڑی تھی۔

"ارے۔ موی!" اس نے جھک کر اسے اُٹھا لیا۔ "کب آئیں؟"

چولہا بند کر کے وہ اس کا گال چومتی باہر نکل رہی تھی جب اچانک ریاض بھائی سامنے آ گئے۔

"السلام علیکم!" اس نے مسکرا کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام جیتی رہو۔ !" وہ جیسے اس کا راستہ روک کے کھڑے تھے۔ "کیا ہو رہا ہے۔ اکیلا کیلئے کیا کھایا جا رہا ہے؟"

''کھانا نہیں پکایا جا رہا ہے۔ کلیجی پالک پکا رہی تھی۔ چچی جان نے فرمائش کی تھی خاص طور پر۔ اب آپ لوگ آگئے ہیں تو کھانا کھا کر جائیے گا۔!''

''اس نے بات کرتے کرتے باہر نکلنے کی کوشش کی۔

''آمنہ کہاں ہیں؟''

''آمنہ تو گھر پر ہے۔ بس میں اور مومنہ ہی ہیں۔''

''شبنم کو پہلی بار احساس ہوا کہ جان بوجھ کر اس کے آگے اس طرح کھڑے ہیں کہ وہ چاہتے ہوئے بھی باہر نہیں نکل سکتی۔

اس نے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا پھر خود بخود اس کی نظریں جھک گئیں اور جسم کا سارا خون گالوں پر دوڑنے لگا۔ اسے زندگی میں کبھی مرد کی ایسی نظروں کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔

''راستہ دیں ریاض بھائی!'' اس کے لہجے میں تلخی در آئی۔

''ارے!'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے ایک طرف ہو گئے۔ ''یہ لو کتنی جگہ پڑی ہے۔ تم سی دھان پان لڑکی کے نکلنے کو تو ایک معمولی سا سوراخ بھی بہت ہے۔ کیا بات ہے کھانا پینا سب چھوڑ رکھا ہے کیا۔!''

''وہ اس کے پیچھے پیچھے صحن میں آگئے جہاں چچی بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں۔ ثریا اور یونس بھائی حسب معمول کہیں گھومنے گئے ہوئے تھے۔ گھر میں بس وہ اور وحیدہ چچی ہی تھیں۔

''آمنہ کو بھی لیتے آتے تو اچھا تھا۔'' چچی جان نے چھالیہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''کئی دن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ریاض میاں تم نے تو مجھے میری بیٹی سے بھی ترسا دیا۔''

''ارے کمال کرتی ہیں امی آپ بھی۔ آپ کی بیٹی ہے۔ آپ کا پورا حق ہے اس پر، جب جی چاہے آ کر مل لیں۔'' وہ خوش دلی سے ہنسے۔

''میرے حقوق کی اتنی خبر ہے تو کچھ اپنے فرائض کا بھی لحاظ کرو۔''

چچی جان داماد کو کچھ ایسا خاص پسند نہیں کرتی تھی۔ اور ان کی باتوں سے بھی اس کا اظہار ہوتا رہتا تھا۔

ریاض ہنس کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ وہ خاموش بیٹھی دوپٹے کے کنارے سے اُلجھ رہی تھی۔

''اور بھئی شبنم! کیا اپنے یوسف میاں کہاں ہوتے ہیں آج کل!'' انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

''یہیں ہوتے ہیں۔'' وہ مختصراً بولی۔

''اچھا! ہمیں تو نظر نہیں آتے'' انہوں نے قہقہہ لگایا ''تم کہیں دل کی آنکھوں سے تو نہیں دیکھتیں جو وہ ہر لمحہ تمہیں اپنے ارد گرد ہی نظر آتے ہوں۔ ہیں''

شبنم نے انکی بات کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ یوں بھی پچھلے کچھ دنوں سے ان کی جانب سے جس عجیب و غریب رویے کا مظاہرہ ہو رہا

تھا۔ اس سے وہ ان کی جانب سے برگشتہ سی ہوگئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں یونس بھائی اور ثریا بھی آگئے۔

''آمنہ بھابی کو کیوں نہیں لائے بھائی؟'' ثریا نے سب سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

''بھئی، وہ کچھ ضروری کام کر رہی تھی۔'' وہ بار بار یہی سوال ہونے پر جھنجلا سے گئے۔ ''مومنہ باہر چلنے کی ضد کر رہی تھی میں اسے گھمانے نکلا تو سوچا یہاں بھی چکر لگا لوں۔ کیا قیامت آگئی۔ آمنہ کو نہ لانے سے۔''

''چلو ثریا! کھانا لگا لو!'' چچی نے داماد کا موڈ بگڑتا دیکھ کر بات بدلی۔

''یوسف بھائی آجاتے تو!'' اس نے سوالیہ نظروں سے شبنم کو دیکھا۔

''وہ جب آئیں گے کھا لیں گے!'' وہ کھڑی ہوگئی۔ ''سب کو بھوک لگی ہے۔ چلو کھانا لگاتے ہیں۔'' دل ہی دل میں کڑھتی وہ کچن میں آگئی۔

''آج سے پہلے وہ کب کھانے کے وقت پر دستیاب ہوئے ہیں۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''اپنے ناکام عشق کا سوگ منانے سے انہیں فرصت ہی کب ہے۔ جو وہ گھر اور گھر والوں کا سوچیں!''

''کھانا نکال کر وہ باہر دستر خوان بچھانے آئی تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ یوسف، ریاض بھائی سے محوِ گفتگو تھے۔ اس پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر انہوں نے چہرہ پھیر لیا۔

اس کے جسم میں گرم گرم لہو پوری روانی سے دوڑنے لگا۔ ان کے لمحہ بھر کے عمل میں جو تحقیر اور ذلت چھپی ہوئی تھی اسے محض شبنم ہی محسوس کر سکتی تھی۔ گویا وہ اس پر نظر ڈالنا تک پسند نہیں کرتے تھے۔

''کھانے کے دوران بھی نوالے اس کے حلق میں پھنستے رہے، اور وہ بار بار پانی کا گلاس لبوں سے لگاتی رہی۔

پھر چند لقمے لے کر وہ اُٹھ گئی اور اوپر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس شخص سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ پل بھر میں کر ڈالے اور پھر سب کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے سکون کا سانس لے۔

لیکن وہ جب بھی ایسا سوچتی، اماں کا کمزور مرجھایا ہوا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آجاتا اور وہ کسی سب کچھ ہارے ہوئے جواری کی سی بے بسی سے دوچار ہو جاتی۔ غصے اور جذبہ انتقام کی لہریں اماں کے تصور سے ٹکرا کر چپ چاپ لوٹ جاتیں۔

تھکن کے انتہائی احساس سے چور وہ تکیے سے کمر ٹکائے۔ آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ دروازے پر آہٹ سن کر بھی اس نے آنکھیں کھولنے کی زحمت نہ کی۔ اب وہ بھی ان کے چہرے پر نظر ڈالنے کے خیال سے کوفت میں مبتلا ہو جاتی تھی۔

بستر پر رکھے اس کے ہاتھ پر کسی ہاتھ کا دباؤ پڑا تو وہ زور سے اُچھل پڑی۔ ریاض بھائی اس کے قریب بیٹھے تھے۔

''آپ؟''

''وہ حواس باختہ سی ہوگئی۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دوپٹہ دور کرسی پر پڑا تھا۔

''گھبرا کیوں گئیں شبنم'' وہ ہمدردی سے کہہ رہے تھے۔ ''میں کوئی غیر تو نہیں ہوں۔''

''آپ اوپر کیوں آئے؟ میرا مطلب ہے کوئی کام تھا تو مجھے آواز دے لی ہوتی۔'' وہ عجب تذبذب کا شکار تھی۔

''نہیں بھئی کام کیسا۔ میں جارہا تھا سوچا تمہیں بھی الوداع کہتا چلوں۔ لیکن تمہاری یہ حالت دیکھ کر رہا نہیں گیا۔ تم سے مجسم دُکھ واندوہ کی تصویر لگ رہی تھیں۔ میں تمہارا درد سمجھتا ہوں شبو!''

''مجھے کوئی دُکھ نہیں۔''

اس کے زخموں سے چور دل پر انہوں نے جیسے نمک چھڑک دیا تھا۔ سر جھٹک کر بولی۔

''جب شوہر اپنی بیوی کو اس کا جائز مقام نہ دے، اس کے حقوق سے چشم پوشی اختیار کرے، قدم قدم پر اسے اپنی بے تعلقی کا احساس دلائے تو اس سے بڑا دکھ اور کیا ہو سکتا ہے شبنم!''

''وہ سر جھکا کر رہ گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی پلکیں بھیگتی چلی گئیں۔

''مجھے تو یوسف میاں کی عقل اور سمجھ پر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا تھا۔ تم سی حسین لڑکی کو نظر انداز کرنے والا شخص یا تو آنکھوں کا اندھا ہو سکتا ہے یا عقل کا اندھا۔ ارے، تمہیں تو دیکھ کر پیار کرنے کو جی کرتا ہے۔''

اس کا جھکا ہوا سر حیرت سے اُٹھا۔

''ریاض بھائی!'' وہ محض اتنا ہی کہہ سکی۔

''کیا بھائی بھائی کی رٹ لگائے رکھتی ہو۔'' وہ ہنستے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ''ارے شبو رانی تمہیں بھلا کیا اندازہ ہوگا کہ حسینوں کے نازک لبوں سے ایسے الفاظ کس قدر ثقیل لگتے ہیں۔ گراں گزرتے ہیں۔''

اس کی پیشانی کی شکنوں میں اضافہ ہوا تو وہ دروازے کی سمت بڑھ گئے۔

''آمنہ بہت یاد کرتی ہے تمہیں۔ چکر لگا لیا کرو۔ یوسف میاں نہ سہی، ثریا اور تم دونوں مل کر ہی آجایا کرو۔''

ان کے جانے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھی رہی۔ ریاض بھائی کا واضح اظہار اسے پریشانی میں مبتلا کر رہا تھا..... نجانے وہ اس سے کیا چاہتے تھے؟''

''تمہیں تو دیکھ کر پیار کرنے کو جی کرتا ہے!''

''اس کا دل بری طرح دھڑک اُٹھا! یہ الفاظ نہ تو کوئی بھائی ادا کر سکتا ہے نہ بہنوئی۔ آخر وہ اسے کن نظروں سے دیکھتے تھے؟

پھر اسے ان کی نگاہیں یاد آئیں۔ بے باک، جسم کے آرپار ہو جانے والی نظریں، جن سے چھپنے کو دل کرتا تھا۔

اس کے بدن میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ ایک مرد کا لفظوں اور نظروں دونوں سے ہونے والا واضح اظہار اس کے لیے بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ یوسف نے تو کبھی اس پر استحقاق بھری ایک نظر تک ڈالنا گوارا نہ کی تھی۔ اس کا دل ایک عجب بوجھل پن کا شکار ہونے لگا پھر وہ پھوٹ پھوٹ

کر رودی۔ اپنی کیفیات اسے خود بھی سمجھ میں نہ آ رہی تھیں۔



چائے کی پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے اس نے نادانستہ ہی نظر اٹھائی تھی۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے آنکھوں میں دلچسپی بھرے وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ صبا نے گھبرا کر نظر جھکالی۔

''نجانے میں اتنی جلدی نروس کیوں ہو جاتی ہوں۔'' اس نے سوچا۔

''بھئی نجمہ بیگم! ہمیں تو آپ کی بیٹی پر سو جان سے فدا ہو گئی ہو۔'' مسز ہاشمی اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ''بڑی باادب، سلیقہ مند بچی ہے۔ مجھے تو پہلی نگاہ میں ہی اتنی اپنی اپنی سی لگی کہ ساتھ ہی لے جانے کو جی چاہنے لگا۔ بس آپ جلد از جلد ہمیں جواب دیں اور وہ بھی مثبت جواب۔ خدا نے چاہا تو ہمارے بچے بہت خوش رہیں گے۔''

وہ بے حد صاف گو خاتون تھیں۔ صبا کے چہرے پر سرخ سنہری رنگ بکھر گئے۔ یہ نہیں تھا کہ اسے دانیال ہاشمی میں کوئی دلچسپی تھی لیکن ایک جوان لڑکے کے سامنے یہ ذکر کسی بھی لڑکی کے چہرے پر حیا کی سرخی بکھیر سکتا تھا۔

نجانے نجمہ بیگم کیا کہہ رہی تھیں۔ وہ اچانک ہی سننے سمجھنے کی صلاحیت کھونے لگی تھی۔ منتشر سوچوں کے ساتھ وہ ادھر ادھر ڈولتے قدموں سے اٹھ کر اندر آ گئی۔

لاؤنج میں قالین پر بکھرے کشنز کے درمیان بیٹھ کر اس نے ہاتھوں کی انگلیوں سے کنپٹیوں کو دبایا۔

ابھی کل کی ہی بات تھی۔ نجمہ بیگم اور توقیر صاحب دانیال ہاشمی کی تعریفوں میں زمین آسمان ملائے دے رہے تھے۔ اور اس میں شک کی کچھ گنجائش بھی نہ تھی۔ وہ واقعی قابل تعریف لڑکا تھا۔ خوش شکل پڑھا لکھا، اخلاق و آداب سے واقف، بذلہ سنج اور اپنائیت اور خلوص سے بھرا ہوا۔ پھر اچھا خاندان اور شاندار طرز زندگی اس کے اضافی اوصاف تھے۔ حقیقت یہی تھی کہ اس کا رشتہ کسی بھی لحاظ سے مسترد کیے جانے کا حق دار نہ تھا۔

اگر امی اور پاپا نے ہاں کر دی۔ تو؟

اس کے بعد ایک بڑا سا سوالیہ نشان نظروں کے سامنے آتا تھا اور وہ سوچ سوچ کر تھک جاتی۔

''ایسی کون سی خوبی ہے فیروز احمد تم میں جو میں کسی طور پر تمہیں نظر انداز نہیں کر پاتی حالانکہ تمہارے مقابل دانیال ہاشمی جیسا خوبرو شخص ہے۔ شاید اصل خوبی میری بے ریا محبت ہے۔ کمال تمہارا نہیں میرا اپنا ہے۔

اور جانتی ہو یہ کیا ہے۔'' وہ بڑبڑائی! ''کمال یا حماقت۔ محبت یا نری بے وقوفی۔''

اسے خبر نہ تھی وہ لوگ کب گئے۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔۔ ہمیشہ کی طرح ننگے پاؤں۔ ٹیرس کے ٹھنڈے فرش پر کھڑی رات کے گہرے سناٹے کو سن رہی تھی۔

پیچھے سے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو وہ چونک اٹھی۔ مڑ کر کمرے میں واپس چلی آئی۔ نجمہ خاتون ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھامے

کھڑی تھیں۔

"ارے امی! آپ نے کیوں زحمت کی۔ میں تو جاگ رہی تھی۔ لے لیتی خود ہی۔"

"کوئی حرج نہیں۔" وہ مسکرائیں۔ "کتنی کمزور ہوگئی ہے میری بیٹی۔ اور میں کیا دودھ کا گلاس لانے سے گھس جاؤں گی؟"

"آئیں بیٹھیں۔!"

اس نے ان کے ہاتھ سے گلاس لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ اس کے سامنے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟" صبا نے غور سے انہیں دیکھا۔

"سوچ رہی ہوں، میری ایک ہی بیٹی ہے۔ وہ بھی چلی جائے گی تو کتنا سونا ہو جائے گا میرا آنگن!" وہ یک بیک بے حد اداس اور دل گیر نظر آنے لگیں۔

"میں۔ میں کیوں کہیں جانے لگی۔ اپنی پیاری امی کو چھوڑ کر!"

"ساری بیٹیاں اپنی پیاری ماؤں کو چھوڑ کر جاتی ہیں۔" وہ اداسی سے مسکرائیں۔

صبا نے گہری سانس بھری۔

"دانیال ہاشمی کے پروپوزل کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ مجھے اور تمہارے والد کو تو یہ رشتہ بہت ہی پسند آیا ہے۔ ایک دو جگہ سے اور بھی لوگوں نے کہا ہے لیکن دانیال جیسا لڑکا شاید ہی کہیں ملے۔ تمہارا کیا خیال ہے بیٹی۔!"

وہ سر جھکا کر دل کی دھڑکنوں کو گنتی رہی۔ کیا کہتی! کس امید پر کہتی؟ کسی اور کا نام ماں کے سامنے پیش کرنے کی جسارت بھلا کس کے مان کے سہارے کرتی۔ محبت کے کھیل میں تو وہ شروع سے صرف ہارتی آئی تھی۔ جیتا تو کچھ بھی نہ تھا جسے ماں کے حضور پیش کر پاتی۔

"اتنی پریشان کیوں ہوگئی ہو؟" وہ ہولے سے ہنس دیں۔ "تمہارے پاپا نے کہا تھا اس لیے میں پوچھنے چلی آئی۔ میں جانتی ہوں، کوئی اور بات ہوتی تو میں پہلے سے آگاہ ہوتی خیر، پھر بھی فیصلہ بہرحال تمہارا اپنا ہوگا۔ ابھی آرام سے سو جاؤ۔ دانیال کی والدہ اگلے ہفتے آئیں گی۔ وہ تو انگوٹھی پہنانے کا کہہ رہی تھیں لیکن تمہارے پاپا نے منع کر دیا۔ وہ تم سے پوچھے بغیر کوئی جواب بھی دینا نہیں چاہتے۔"

ان کے جانے کے بعد وہ دیر تک سوچتی رہی۔ لے دے کے ذہن میں ایک ہی مہربان چہرہ آتا تھا۔ شہروز کا چہرہ!

"لیکن تم بھی کیا کر پاؤ گے!" اس نے مایوسی سے سوچا تھا۔



"لگتا ہے رو دیں گی!" اس نے بغور صبا کا چہرہ دیکھا۔ آخر ہوا کیا ہے؟"

وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے آنسو روکنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اور جب اس انتہائی کوشش کے وقت کوئی کوشش کے ناکام ہو جانے کی نشاندہی کوئی بھی کر دے تو آنسوؤں پر بند باندھنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

''ٹپ۔ٹپ۔ٹپ۔'' کئی قطرے اس کے سلونے ہاتھوں پر گرے۔

''ارے صبا!'' وہ گھبرا گیا۔ ''کیا ہوا ہے؟ دیکھیں کچھ تو بولیں۔ ہر چند کہ یہ نمکین پانی از خود بہت کچھ کہہ رہا ہے۔ لیکن یقین جانیے مجھے اس کی زبان بالکل سمجھ میں نہیں آتی یہ خوشی کے آنسو ہیں یا غم کے یا پریشانی کے ہا۔ہا۔ خیر مجھے آخر دماغ لڑانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آپ زبان کیوں نہیں کھولتیں؟''

''تم چپ ہو تو میں کچھ کہوں۔'' وہ جھلا گئی۔

''یہ بات ہے تو لیجیے!''

اس نے جھٹ ہونٹوں پر انگلی رکھی ساتھ ہی دوسرے ہاتھ سے اسے بولنے کا اشارہ کیا۔

''میں نے تمہیں دانیال ہاشمی کے بارے میں بتایا تھا نا۔ کل اس کی والدہ باقاعدہ پروپوزل لے آئی ہیں۔''

''اوہ تو۔!'' وہ یک بیک سیریس ہو گیا۔ ''پھر کیا طے پایا؟''

صبا نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

''امی نے مجھے سوچنے اور پھر جواب دینے کے لیے کہا ہے۔''

''کیا جواب ہے آپ کا؟'' وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''شہروز!'' صبا نے پھر جھلا کر کہا۔ ''تم صورت حال کو اتنا ہی سمجھتے ہو جتنا میں خود۔ یہ سوال تم اپنے آپ سے بھی کر سکتے ہو۔ بتاؤ، میرا جواب کیا ہونا چاہیے؟''

اس نے گہری سانس بھری، اور کچھ سوچنے لگا۔

''فیروز بھائی نے میرے سارے اندازے غلط ثابت کر دیے ہیں۔'' پھر وہ بولا'' میں سمجھتا تھا وہ نرم، کومل جذبوں سے متاثر ہو کر اپنی سمت خلوص سے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو ضرور تھام لیں گے۔ لیکن انہوں نے تو خود پر وہ مضبوط خول چڑھا لیا ہے، جسے شاید وہ خود بھی چاہیں تو توڑ نہ پائیں گے!''

''وہ ہولے سے ہنس دی۔

''انہیں تو شاید یہ بھی خبر نہ ہو شہروز! کہ ان کی جانب کوئی پرخلوص ہاتھ بڑھا بھی تھا یا نہیں، انہیں تو شاید علم ہی نہ ہو کہ وہ کسی کے نرم، کومل جذبوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ گئے ہیں۔ اور جب انہیں خبر ہی نہیں تو پھر الزام کیسے، شکوہ کیسا؟''

''تو پھر کیوں نہیں آزماتیں اپنے جذبوں کی سچائی کو۔'' اس نے صبا کو دیکھا۔

''کیا مطلب؟''

''کیوں نہیں بتاتیں انہیں کہ آپ کے پاس ان کے نام پر کیا کچھ محفوظ رکھا ہے۔ کتنی محبتیں، کتنی توقعات، کتنی اُمیدیں، کتنی دُعائیں۔ یہ

سب ایک مرتبہ انہیں بتا تو دیں تا کہ بعد میں کسی قسم کا کوئی تاسف کوئی پچھتاوا تو نہ رہ جائے۔"

"نہیں!" وہ کانپ سی گئی۔ "میں ان سے نہیں! میں یہ سب کچھ کہہ سکتی تو آج تک کہہ نہ چکی ہوتی!"

"صبا!" اسے غصہ آ گیا۔ "ایسی بزدلی بھی کس کام کی۔ پھر محبت کی ہی کیوں تھی۔ چاہا ہی کیوں تھا کسی کو۔ جس کام کا بندے میں حوصلہ ہی نہ ہو، اس کا بیڑا اُٹھانے کی حماقت ہی کیوں کی جائے۔"

"میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے شہروز۔ اگر ان کے دل میں میرے لیے کوئی جذبہ نہیں ہے تو پھر یہ بھیک کیوں مانگوں۔ کیا ملے گا؟ شرمندگی، ندامت اور بس۔!"

"کہہ کر تو دیکھیں صبا!" اس نے التجا کی۔ "کیا خبر یہ پتھر کا بت عشق کی آنچ سے پگھل ہی جائے۔"

"بت بھی نہیں پگھلتے شہروز!" وہ قدرے افسردگی سے بولی۔

"پھر ٹوٹ جاتے ہیں صبا۔ میں نہیں چاہتا میرا بھائی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ کیا آپ ایسا چاہیں گی؟ اگر آج آپ بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر کسی اور کی دنیا بسانے چل دیں تو کون ہے جو پھر ایسا کر پائے گا۔" وہ سخت اداس ہو گیا تھا۔

"میں کیا کروں شہروز؟" وہ در حقیقت رو دی۔

"میرا کہا مان لیں صبا! ایک بار بس ایک بار اپنے جذبے تمام تر سچائیوں کے ساتھ ان پر عیاں کر دیں۔ اور پھر دیکھیں، ان پر کتنا اثر ہے۔"

"تم۔ تم مجھے بھیک مانگنے کے لیے کہہ رہے ہو شہروز۔" اس کا لہجہ بھرا رہا تھا۔

"میں آپ سے بھیک مانگتا ہوں صبا! اپنے بھائی کی خوشیوں کی، اسے زندگی کی بہاروں کی سمت لانے کی کوشش کریں۔ آپ، آپ جو کچھ ان سے کہیں یہ سوچ کر کہیے گا کہ وہ سارے لفظ آپ نے مجھے بھیک میں دیے۔"

"شہروز!" وہ چیخ اٹھی۔ "پاگل۔!"

ایک زوردار چپت اس نے شہروز کے گال پر رسید کی تھی۔

دونوں بھیگی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر مسکرا دیے۔



وہ حسب معمول آٹھ بجے اپنی سیٹ پر موجود تھی۔ مس نگہت آج چھٹی پر تھیں۔ اس لیے اسے دن انتہائی مصروف گزرنے کا پورا یقین تھا۔ اس کی سیٹ مین ہال میں بنائے گئے پارٹیشن میں تھی۔ گلاس وال کی بدولت سارا دن آنے جانے والوں کی نظریں اس کا طواف کرتی تھیں۔ شروع شروع میں تو وہ اس بے حجابی سے بے حد گھبرائی تھی مگر پھر چند دنوں ہی میں عادت ہو چکی تھی۔ وہ کوشش کرتی کہ فارغ وقت میں بھی نظریں جھکائے اپنے کسی کام میں مصروف رہے۔

سوا آٹھ بجے پہلی گھنٹی بجی۔

''یس سر!'' اس نے ریسیور اٹھایا

''مس نیلم۔ ذرا میرے کمرے میں آیئے۔''

''او کے سر!''

یہ فون عباسی صاحب کے کمرے سے تھا۔ وہ کچھ سوچتی ہوئی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''عباسی صاحب کے اپائنٹ کیے گئے اسٹاف میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے۔ چہرہ۔!''

''زارا کا اول دن کا ادا کیا ہوا جملہ اب تک اس کی سماعتوں میں محفوظ تھا۔ یہ جملہ اور اس میں چھپی ہوئی طنز نما تنبیہہ وہ بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔ ہر چند کہ زارا جیسی لڑکی کے لبوں سے نکلنے والی فضول باتوں کو وہ کوئی اہمیت دینے پر ہرگز تیار نہ تھی، پھر بھی محتاط رہنا چاہتی تھی۔

مس نگہت بھی کسی مخصوص شخص کا نام لیے بغیر اسے اکثر و بیشتر ہدایتیں کرتی رہتی تھیں۔ یہ کہ وہ اپنی حدود کا از حد تعین کرے اور پھر اس کی سختی سے پابندی کرے۔ یا پھر یہ کہ کسی بھی شخص سے ضرورت سے زیادہ بات چیت کرے نہ تعلقات بڑھانے کی کوشش کرے۔ اپنا امیج ایسا قائم کرے کہ ہر کوئی اس کی عزت کرنے پر مجبور ہو۔

دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اس نے قدم آگے بڑھایا تھا۔

''میں اندر آسکتی ہوں سر؟''

''آیئے!''

وہ نہایت سنجیدگی سے کسی کام میں مصروف تھے۔ سفید کاغذ پر پھسلتا ہوا قلم لمحہ بھر کے لیے بھی نہ رکا تھا۔ وہ خاموشی سے جا کر ان کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

تقریباً پانچ منٹ بعد وہ فارغ ہوئے تھے۔

''ارے! ابھی آپ کھڑی کیوں ہیں۔ بیٹھ جائیں۔''

اسے کھڑا دیکھ کر انہوں نے حیرت سے کہا۔

''شکریہ سر!'' اس نے بیٹھتے ہوئے ایک نگاہ ان پر ڈالی۔

چالیس پینتالیس کے لگ بھگ عمر، آنکھوں پر سیاہ فریم کے چشمے، بھاری پپوٹوں اور کنپٹیوں پر سفید ہوتے بالوں کے ساتھ وہ اسے نہایت مہذب اور خلیق محسوس ہوئے۔

''جی مس نیلم!'' وہ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ ''کہیے کیسا محسوس کر رہی ہیں۔ جاب مشکل تو نہیں؟ کوئی بات تکلیف دہ تو نہیں؟''

''نہیں سر۔ ایسی کوئی مشکل نہیں ہے۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔ ''آہستہ آہستہ سب سمجھ میں آرہا ہے۔ مس نگہت بھی بہت تعاون کرتی

ہیں۔!"

"اویس شی از ویری گوآپریٹو پرسن۔ویری نائس۔!" انہوں نے مس نگہت کو سراہا۔

"میں نے انہیں ہدایت کی تھی کہ آپ کا خاص خیال رکھیں۔ دراصل یہاں کا ماحول ایسا ہے کہ نئی لڑکیاں ذرا گھبرا جاتی ہیں۔ ماحول سے میری مراد ہے، جس جگہ مرد اور خواتین مل کر کام کریں۔ وہاں آپ جیسی گھریلو قسم کی لڑکیاں بہت جلد..... خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پاتیں۔ لیکن آہستہ آہستہ ایک دوسرے کو جان لیتے ہیں۔ سمجھ لیتے ہیں تو پھر مشکل نہیں ہوتی، میں نے آپ کو بھی دیکھنے کے لیے بلایا تھا کہ کہیں آپ گھبرا تو نہیں گئیں۔ جاب بھی تو آپ نے پہلی مرتبہ کی ہے۔"

"جی سر۔!" اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

"دوسری بات یہ کہ کبھی کبھار ہمیں چھوٹی موٹی شکایتیں موصول ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں آپریٹر نے نمبر جلدی نہیں ملایا یا فلاں وقت آپریٹر ڈیوٹی پر نہیں تھی۔ کام ذرا جم کر اور جانفشانی سے کرنے کی عادت ڈالیں۔ جلد ترقی کریں گی۔"

"میری شکایت آئی تھی سر؟" وہ پریشان ہو گئی۔ میں تو سر۔ چائے بھی ٹیبل پر منگوا لیتی ہوں۔ کوشش کرتی ہوں کہ ہر کال جلد از جلد ملاؤں۔ میں تو سر۔!"

"اوہ نہیں بھئی۔" وہ ہنس دیے۔" آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ یہ تو قبل از وقت کی گئی ہدایت تھی تاکہ آپ محتاط رہیں۔ ویسے آپ کو کبھی بھی کوئی پرابلم ہو، کسی شخص سے کسی قسم کی شکایت ہو، آپ میرے پاس آئیں۔!"

"تھینک یو سر۔!"

اس نے اٹھتے ہوئے انہیں ممنونیت سے دیکھا۔ وہ ہولے سے مسکرا کر اپنی فائل کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"بدکردار لوگ ساری دنیا کو بدکردار سمجھتے ہیں۔"

اپنی سیٹ پر آتے ہوئے وہ تنفر سے سوچ رہی تھی۔ اسے زارا تابش نامی اس لڑکی پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ جس نے اتنے شریف، مہذب اور کوآپریٹو افسر کے لیے اس کے دل میں بدگمانی پیدا کرنا چاہی تھی۔

"چہرے سے ہی کتنے مہربان اور شفیق نظر آتے ہیں۔" وہ سوچ رہی تھی۔



"امی! میں نے آپ سے ایک ذکر کیا تھا۔

وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بڑے محتاط لہجے میں کہہ رہے تھے۔

عفت خانم نے ایک نظر بیٹے کے چہرے پر ڈالی۔

"بیٹا! بات یہ ہے کہ تم جانتے ہو میں ان لڑکیوں کو کس مقصد کے تحت یہاں لائی تھی۔" انہوں نے کچھ دیر سوچ کر بات کا آغاز کیا۔

"یہ بات کلی طور پر نہ سہی، بہر حال کچھ نہ کچھ یہ بچیاں بھی سمجھتی ہیں۔ اب اگر ان کی موجودگی میں، میں تمہارے لیے رشتہ دیکھنے یا بات کرنے جاتی ہوں تو کہیں بچیاں دل برا نہ کریں۔ یہی سوچ کر یہ پروگرام ملتوی کر رکھا ہے۔ جمعرات کے دن کی سیٹیں بک ہیں۔ شہروز انہیں چھوڑنے جا رہا ہے۔ میں انشاء اللہ جمعے کے دن ان لوگوں کے ہاں چلی جاؤں گی۔"

"بہتر!" وہ بولے۔ "دراصل جلدی ان لوگوں کو ہے مجھے نہیں۔ میں چونکہ کہہ چکا تھا کہ والدہ کو بھیجوں گا لہٰذا وہ لوگ بار بار کہلوا رہے ہیں کہ والدہ سے کہیں جلد تشریف لائیں۔۔ مجھے ہر بار معذرت کرنا عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"بیٹا! کوئی ضروری تو نہیں کہ ہم لڑکی پسند ہی کرلیں۔" عفت خانم نے قدرے تامل سے بولیں۔ بہروز مسکرا دیے۔

"میں کہہ چکا ہوں امی جان کہ شکل وصورت کے معاملے میں میں بہت قناعت پسند ہوں لہٰذا آپ لڑکی کی صورت کو مسترد کرآئیں۔ اس بات کا تو امکان نہیں۔ جہیز وغیرہ کی ہماری ڈیمانڈ نہیں ہوگی۔ رہ گئی بات نجابت اور شرافت کی تو اس کی تحقیق میں اپنے طور پر کروا چکا ہوں۔ لڑکی کے والد نہایت شریف، متقی اور پرہیزگار قسم کے شخص ہیں۔ ہیڈ کلرک ہیں محکمہ تعلیم میں۔ پھر بھی آپ کو کوئی اعتراض ہو تو یقین رکھیے، میں کوئی بھی قدم آپ کی رضا کے بغیر نہیں اٹھا سکتا۔ اتنا اعتماد تو یقیناً آپ کو مجھ پر ہوگا۔"

عفت خانم سانس بھر کر رہ گئیں۔ بیٹے سے کس طرح کہیں کہ میری رضا تو یہ ہے کہ میری بھانجیوں میں سے کسی کا انتخاب کرلو۔ انہوں نے زندگی میں کبھی بھی بیٹوں پر اپنی پسند ناپسند تھوپنے کی کوشش نہ کی تھی۔ باپ کی جانب سے ہونے والی زیادتیوں کی تلافی وہ اپنے طور پر کرنے کی ہر ممکن سعی کیا کرتی تھیں۔

"اچھا امی! میں چلتا ہوں۔" انہوں نے اٹھ کر بریف کیس اٹھایا۔ "اللہ حافظ۔"

خدا کی امان میں سونپا۔"

وہ جواب تک چپکا بیٹھا ناشتا کرنے میں مگن تھا، بھائی کے جاتے ہی اسٹارٹ ہوا۔

"غور فرمایا آپ نے! بھائی جان اپنے طور پر پورا رشتہ طے بھی کر چکے ہیں۔ فرمارہے تھے۔ میں اپنے طور پر تحقیق کروا چکا ہوں۔ امی حضور، اب ہمیں اپنے اپنے طور پر تحقیقات کروانی چاہئیں کہ بھائی جان نے انہیں سب سے پہلے کہاں دیکھا تھا۔ وہ کس رنگ کے لباس میں تھیں اور کس حد تک خوبصورت لگ رہی تھیں جو بھائی جان جیسا ذوقِ نظر سے عاری شخص بھی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ یکایک ان کی تمام حسیات لطیف جاگ اٹھیں۔"

"خدا کے لیے شہروز۔" وہ عاجز ہوگئیں۔ "کچھ تو بڑے چھوٹے کا لحاظ کیا کرو۔"

"اگر ہم سے چھوٹا کوئی ہوتا امی حضور تو آپ کو یقیناً اندازہ ہوتا کہ ہم اپنے بڑوں کا کتنا لحاظ کرتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔ مگر صد افسوس ہم سے چھوٹا کوئی ہے ہی نہیں جسے ہم اپنی بات پر گواہ کے طور پیش کرسکیں۔ خیر خیر۔ یہ تو ایک متنازعہ مسئلہ ہے۔ یہ فرمایئے کہ میرے خلاف یہ سازش صرف آپ نے تیار کی ہے یا اس میں جمنا پیاری، راج دلاری کا بھی کچھ حصہ ہے۔"

"تمہاری بات کا سر پیر ڈھونڈنے نکلو تو شاید برسوں لگ جائیں اور کوئی سرا ہاتھ نہ آئے۔"

"یہی تو مسئلہ ہے کہ آپ سر اور پیر دونوں ایک ساتھ ڈھونڈنے نکلتی ہیں۔ اب کوئی بتائے کہ یہ دونوں انتہائی متضاد اشیاء بیک وقت کس مقام پر ناموجود پر دستیاب ہوں گی؟ جبھی تو کوئی سرا آپ کے ہاتھ نہیں آپاتا۔"

وہ مزے سے توس پر مکھن لگانے لگا۔

"خیر مدعا ہمارا یہ تھا کہ ہمیں دو عدد لڑکیوں کا سرپرست بنا کر آپ دوسرے شہر روانہ کر رہی ہیں۔ اور ہمارے پیچھے بھائی جان کی منگنی کر دینے کا پروگرام بنائے بیٹھی ہیں۔ یہ سازش نہیں تو اور کیا ہے امی حضور اویسے پس پردہ جو مقاصد کارفرما ہیں ہم ان سے بخوبی واقف ہیں۔"

"کون سے مقاصد؟ کس کے پس پردہ؟" انہوں نے گھورا۔

"اسی سازش نما پروگرام یا پروگرام نما سازش کے پس پردہ!" وہ نہایت مدبرانہ انداز میں مسکرایا۔ "ہوتا ہے ناں گھروں میں، رواج سا چل نکلا ہے کہ لوگ لڑکیوں کا رشتہ کرنے آتے ہیں تو چھوٹوں پر زیادہ غور کرتے ہیں۔ اسی لیے اکثر لوگ کسی رشتے کے سلسلے میں آنے والی خواتین کی آمد سے قبل ہی سولہ سترہ سالہ کے پس منظر عام سے غائب ہو کر پچیس چھبیس سال کے پیس سامنے رکھتے ہیں۔ یہی مقصد آپ کا ہے لڑکی والے کہیں مجھ پر فریفتہ نہ ہو جائیں۔ اسی خوف کے پیش نظر آپ نے پہلے ہی سے مناسب بندوبست کر لیا ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔" انہیں ہنسی آ گئی۔ شہروز! کیا بلا ہو تم۔ میں کون سی منگنی کر رہی ہوں تمہاری غیر موجودگی میں بس لڑکی والوں سے ایک بار مل کر آ جاؤں گی۔ کوئی رسم انجام دی گئی تو ان شاءاللہ سب کی موجودگی میں ہی کی جائے گی۔"

"ہوں!" اس نے سر ہلایا۔ "مناسب خیال ہے بلکہ بے حد عمدہ! ہم تو رسم و رواج کے بے حد خلاف ہیں امی حضور! لیکن پھر بھی جب بھی اس گھر میں کسی رسم کے انجام دیے جانے کی بات ہوتی ہے ہمارے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ ہمارا خیال ہے، اس گھر میں آخری رسم جو انجام دی گئی وہ آپ کی تقریب نکاح کی تھی، جس میں چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ہم شریک نہ ہو پائے تھے۔ ہم ٹھیک فرما رہے ہیں ناں؟"

عفت خانم مسکرا دیں۔

"سن رہی ہو جمنا!" انہوں نے گرم چائے لاتی جمنا کو مخاطب کیا۔ "کون سی بیڑی لگائی ہے خدا نے اس لڑکے کی زبان میں جو اس کی بے سروپا باتیں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔"

"مت ٹوکا کرو باجی۔" جمنا نے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ ہمارے بچے کی باتوں سے ہی تو اس گھر کی رونق ہے۔"

وہ بڑی معصومیت سے آنکھیں پٹپٹانے لگا تھا۔



جرنل مکمل کرتے ہوئے اس نے نظر اٹھائی تھی۔

عزالہ دونوں گھٹنوں پر ٹھوڑی جمائے کسی گہری سوچ میں تھی۔

''معلوم بھی ہے ایگزام میں کتنے دن رہ گئے ہیں۔'' وہ پھر جرنل کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہ مراقبے ختم کر کے کچھ ارتکاز پڑھائی پر کرو۔ شاید بہتری کی کچھ صورت نکل آئے۔ ورنہ مجھے تو پورا یقین ہے کہ تم فیل ہو جاؤ گی۔''

''بھاڑ میں جائے پڑھائی۔'' وہ جھنجلا کر بولی۔ ''میری جان پر بنی ہے اور اماں نصیحت کو کوئی اور کام ہی نہیں۔''

''کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔؟''

''اب کسر کیا رہ گئی ہے پہاڑ ٹوٹنے میں جبکہ ان حضرت کی والدہ ہمارے ہاں تشریف لا رہی ہیں۔ بات پکی ہو جائے گی۔''

''تو ہونے دو ناں۔ اس نے چپن بند کیا۔ ''مجھے تو یہ رشتہ ہر لحاظ سے مکمل اور بہترین لگتا ہے۔''

''تو تم کر لوں ناں۔'' اس نے دانت کچکچائے۔

''یار اگر بس میں ہوتا تو میں نیلی۔ بجو یا مریم کی نہ کروا دیتی۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''ریشم۔ ریشم۔ کچھ کرو۔'' وہ پھر پریشان ہوئی۔

''مثلاً کیا؟''

''میں مر جاؤں گی اس کے بغیر۔'' وہ روہانسی ہوئی۔ ''وہ بھی جی نہ پائے گا۔''

ریشم کو ہنسی آ گئی۔

''بس تو پھر حل شدہ مسئلہ ہے۔ عالم بالا پر دونوں لو سونگ گاتے پھرنا۔ نہ کوئی پابندی ہو گی نہ خوف۔''

''نجانے میری قسمت میں کیا لکھا تھا جو تم سی دوست ملی ہے۔ مجال ہے جو کوئی مخلصانہ مشورہ ہی دے دے۔ احمق اور بدھو۔''

ریشم کاندھے اچکا کر رہ گئی۔

''مجھے تو فی الوقت دُنیا میں صرف اور صرف ایک ہی مسئلہ نظر آتا ہے ایگزام! جو سر پر کھڑے ہیں اور مطلوبہ تیاری مکمل نہیں۔ میں تو دن رات پڑھتی رہتی ہوں۔ نیلی بجو کہتی ہیں اچھے نمبر لاؤ گی تو یونیورسٹی میں داخلہ ملے گا۔''

''جی کرتا ہے اس کے ساتھ بھاگ جاؤں۔'' وہ اپنے مسئلے میں اُلجھی ہوئی تھی۔

''ہائیں!'' ریشم بوکھلا گئی۔ ''کیا حماقت ہے۔ دیکھو غزال، مریم کہتی ہے۔ اگر وہ لڑکا تم سے سیریس ہوتا تو اب تک اپنے ماں باپ کو تمہارے گھر بھیج چکا ہوتا۔ وہ تو محض وقت گزاری چاہتا ہے۔ جس قدر جلدی تمہاری کہیں اور بات طے ہو جائے تمہارے حق میں انتہائی بہتر ہے۔''

''مریم کیا جانے ہماری مجبوریوں کو۔'' وہ جل کر بولی۔

''جب اس قدر مجبوریاں ہیں تو پھر علیحدہ تو ہونا ہی ہے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''آج یا کل۔''

''تمہیں کسی سے عشق ہوا تو پھر پوچھوں گی۔''

''نہ بابا! ہم تو یہ روگ پالنے والے ہی نہیں ہیں۔'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''یہ عبرت ناک مناظر ہی اس عشق سے دل برا کرنے کے لیے کافی

ہیں۔"

"کہاں چل دیں؟"

"لائبریری۔ چلو ٹل کر پڑھیں گے۔"

"میری جاتی ہے جوتی۔ میں تو کسی طرح کالج سے نکلنے کے چکر میں ہوں۔ ایک تو یہ چپراسی اور چوکیدار بڑی نگاہ رکھنے لگے ہیں۔"

ریشم کو اس کی جھنجلاہٹ پر ہنسی آ گئی۔

وہ کیا کہہ گئے ہیں شاعر صاحب

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اب دیکھو، پار اترتی ہو کہ نہیں۔

وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔



گھڑی میں وقت دیکھ کر اس نے اپنی نشست چھوڑی تھی۔

بیگ میں چیزیں رکھ کر چادر درست کرتی وہ باہر نکلی۔

"ہیلو۔"

" دائیں جانب سے آتی آواز یقیناً اس کے لیے تھی۔ وہ رکنے پر مجبور ہوئی۔

زارا انگلی میں رنگ گھماتی، مسکراتی ہوئی اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

کہاں رہتی ہو؟ چلو آج میں چھوڑ دوں۔"

"جی نہیں شکریہ۔ مجھے آنے جانے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔" اس نے حتی الامکان نرمی سے کہا۔

"اُفوہ۔ تکلف کیسا۔ گاڑی میں بہت آرام سے گھر پہنچ جاؤ گی۔"

"مہربانی۔" وہ ذرا سا مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔

"عجیب لڑکی ہو بھئی تم تو۔ یوں کتراتی ہو جیسے میں کوئی لوفر لڑکا ہوں۔ بھگا کر نہیں لے جاؤں گی تمہیں۔"

"دیکھیں مس زارا" وہ رُک گئی۔ "بات محض اتنی سی ہے کہ میں ایک عام شکل وصورت کی، عام سی صلاحیتیں رکھنے والی لڑکی ہوں۔ میں خود جانتی ہوں کہ مجھ میں ایسی کوئی خاص بات نہیں جو کسی کو میری جانب متوجہ کرے۔ ایسے میں جب کوئی مجھ سے بے وجہ قریب آنا چاہے تو میں سخت کوفت میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ بھلا آپ کیوں چاہتی ہیں کہ میں کوفت میں مبتلا ہوں۔"

"عام سی شکل وصورت۔ عام سی صلاحیتیں۔" وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ "جو لوگ خود سے واقف نہیں ہوتے نیلم! بہت نقصان اُٹھاتے

ہیں۔خود سے واقف رہو۔"

وہ کئی رنگ گھماتی آگے بڑھ گئی تھی۔

"نیلم بھی سر جھٹک کر اپنے راستے پر ہولی۔

وین نے اسے اسٹاپ پر اُتارا تھا۔حسب معمول اس نے اُتر کر چادر درست کی پھر آگے بڑھنے لگی تو قدموں نے جیسے اُٹھنے سے انکار کر دیا۔

بالکل سامنے، برگد کے پیڑ تلے یوسف اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ موجود تھے۔اسے دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے قریب آ گئے۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں نیلی۔"

"میں نیلی نامی کسی لڑکی کو نہیں جانتی اور مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔" وہ آگے بڑھنے لگی۔

"نیلم پلیز! تمہیں سننا ہوگا میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔دراصل تمہارے گھر میں تمہیں مخاطب کرنا اور کچھ کہنا مجھے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔اور پھر بیڈ را طویل گفتگو ہوگی۔"

"یوسف صاحب! کیا آپ نہیں جانتے میرے اور آپ کے مابین کیا رشتہ ہے؟"

اس کے حوصلے جواب دینے لگے۔جی میں آیا بیچ سڑک پر چیخ چیخ کر انہیں بے نقط سنا ڈالے۔لیکن ایسا تو وہ راجہ کے ساتھ بھی نہیں کر پاتی تھی۔مصلحت کی چادر اوڑھے دھیمی آواز میں بولی۔

"کیوں مجھے تماشا بنا دینے پر تلے ہوئے ہیں آپ؟ کیا آپ جانتے ہیں آپ کا جو طرزِ عمل ہے اس کے کس قدر خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں؟"

"تمہارا جو جی چاہے کہنا۔لیکن میرے ساتھ چلو۔پلیز۔"

اس نے لمحہ بھر کو سوچا۔اسے تو واقعی ان سے بہت کچھ کہنا ہے۔انہیں خدا کا واسطہ دے کر اپنی بہن کی خوشیوں کے لیے التجا کرنی تھی۔ان سے کہنا تھا کہ وہ اپنی ماں بہنوں کی نظروں میں رسوا ہوئی جا رہی ہے۔دماغی طور پر مجروح ہوتی جا رہی ہے۔

"کہاں چلیں گے؟"

"کسی ایسی جگہ جہاں آرام سے بیٹھ کر باتیں کر لیں۔"

"چلیں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔"لیکن صرف آدھے گھنٹے میں آپ مجھے واپس یہاں پہنچا دیں گے۔"

"منظور ہے۔" وہ کھل اُٹھے۔

ویٹر کو کافی لانے کو کہہ کر وہ تمام حسیات کے ساتھ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

اتنی کمزور کیوں ہوگئی ہو۔"

"آپ کو کیا کہنا ہے یوسف۔ جلد کہیں۔ پھر مجھے بھی اپنی بات کرنی ہے۔"

"نیلی! مجھے تو صرف اتنا کہنا ہے کہ میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔ میں نہیں رہ سکتا۔ نہیں رہ سکتا اس طرح سے۔ یہ نقلی زندگی گزارنا، پل پل جینا، پل پل مرنا میرے لیے ممکن نہیں۔"

"یہ ہے وہ فضول اور حد درجے واہیات بات، جس کے لیے آپ مجھے یہاں تک لائے ہیں۔ یوسف صاحب! زندگی آپ کے نزدیک محض ایک کھیل ہے جسے آپ اپنی مرضی سے کھیلنا چاہتے ہیں۔ جب مات ہوتی دیکھتے ہیں تو بساط اُلٹ کر پھر نئے سرے سے مہرے سجا لیتے ہیں اور پھر جیتنا چاہتے ہیں۔ لیکن دوسرے لوگ آپ کی بساط پر بچے مہرے نہیں ہیں۔ جیتی جاگتی ہستیاں ہیں جو سانس لیتی ہیں، محسوس کرتی ہیں اور از خود حرکت کرتی ہیں۔"

اس کا سانس پھول گیا اور چہرا غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا۔

"نیلی۔" وہ اچانک اس کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ خدارا مجھ پر ترس کھاؤ۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"یہ..... یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔" وہ دبی دبی آواز میں چیخی۔

اس کے پاؤں تھامے وہ اس کے گھٹنوں پر سر رکھے بول رہے تھے۔

"میں ہار چکا ہوں نیلی! ہر بازی ہار چکا ہوں۔ اپنی شکست تسلیم کر لی ہے میں نے۔ اب مجھے سنائی گئی سزا میں ترمیم کر لو۔ خدا کے واسطے، مجھ پر ترس کھاؤ۔"

"نیلم جیسے، برف کی بن گئی تھی۔ اس کا جسم بالکل سرد ہو گیا اور وہ لرزنے لگی۔ یوسف کا اس درجہ قرب اسے پاگل کیے دے رہا تھا۔

"میں شبنم کو چھوڑ دوں گا نیلی۔ تمہاری قسم! میں نے اسے چھوا تک نہیں ہے۔ وہ بالکل پاک ہے۔ بس تم ایک مرتبہ ہاں کہہ دو۔ میں سب کو منا لوں گا۔ میں سب کچھ درست کر لوں گا۔ تم ابھی شادی کرنا نہیں چاہتیں ناں۔ میں ساری عمر تمہارا انتظار کر لوں گا۔ بس ہاں کہہ دو۔ کہہ دو نیلی۔"

اس کی کیفیات لمحہ بھر میں بدل گئی تھیں۔ شبنم کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس جان لیوا حقیقت کے انکشاف کے بعد وہ سناٹے میں آ گئی تھی۔ اس کی بہن اس کی اپنی وجہ سے کتنی تکلیف دہ زندگی گزار رہی تھی۔ اور مہر طلب تھی۔

"دور ہٹیں۔ اور میری بات سنیں۔" اس نے انہیں بری طرح جھٹکا۔

"میری بہن کے ساتھ مزید کوئی زیادتی نہیں ہونی چاہیے یوسف! بہت دعوا ہے آپ کو مجھ سے محبت کا، تو قسم ہے آپ کو اس محبت کی۔ اسے اس کا جائز حق دیں۔ اسے پیار دیں۔ اپنی چاہت کا یقین اور حوصلہ دیں۔ اور اگر آپ نے یہ سب کچھ نہیں کیا تو میں سمجھوں گی کہ آپ ایک ذہنی مریض ہیں اور اپنی ذہنی بیماری کو محبت کہتے ہیں۔ میں تو کیا خدا بھی اس زیادتی اور حق تلفی پر آپ کو معاف نہیں کرے گا۔ دُنیا تو خراب ہو ہی گئی ہے، اپنی عاقبت تو سنوار لیں۔"

اپنی بات ختم کر کے وہ ویٹر اور یوسف دونوں کو ہونق چھوڑ کر باہر نکل آئی۔

''نیلم۔'' وہ چند لمحوں میں اس تک آ پہنچے تھے۔ ''میری بات ادھوری چھوڑ کر جا رہی ہو۔''

''مگر میری بات مکمل ہو چکی ہے۔'' ان کا لہجہ ٹوٹا ہوا اور شکست خوردہ تھا۔

وہ خاموشی سے ان کے پیچھے بیٹھ گئی اور موٹر سائیکل آگے بڑھ گئی۔

''کیا ہوا۔ کیوں پتھر کی بن گئی ہو۔''

ثریا نے شبنم کو شہوکا دیا۔

''میں کہہ رہی ہوں یہ پنک دیکھو۔ اس سوٹ پر اچھی لگے گی ناں۔''

''ہوں!''

وہ محض ہنکارا بھر پائی تھی۔ کتنے دنوں کے بعد آج ثریا کے بے حد اصرار پر اس کے ساتھ کچھ شاپنگ کے لیے چلی آئی تھی اور نظروں نے ایسا منظر دیکھا تھا جس کے بعد وہ دنیا میں مزید کچھ بھی دیکھنے کی خواہش مند نہ رہی تھی۔

سڑک پار کرتے ہوئے ثریا اس کا ہاتھ تھام کر اپنی جانب نہ کھینچ لیتی تو یقیناً وہ ٹرک کے نیچے آ جاتی۔



وہ شہروز کے کمرے میں اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ دیوار گیر کلاک میں ساڑھے دس کا وقت ہوا تھا۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے شہروز۔'' وہ منمنائی۔ ''میں گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''آپ تو مجھ سے زیادہ بزدل ہیں صبا۔؟ ڈر تو مجھے بھی لگ رہا ہے لیکن میں آپ کے گھر جانا نہیں چاہتا۔''

صبا ہنسنا چاہتی تھی لیکن محض لب ہلا کر رہ گئی۔

''زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے امی سے جھوٹ بولا ہے۔'' وہ تاسف کا شکار تھی۔

''چلیں۔ شادی کے بعد معافی مانگ لیجیے گا۔''

''شادی کے بعد؟'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''فیروز بھائی سے شادی ہونے کے بعد۔'' اس نے وضاحت کی۔

''کس قدر بدتمیز ہو تم۔'' اس نے آنکھیں نکالیں۔

''کیوں؟۔ جو کچھ آپ کے دل میں ہے، اسے اپنی زبان پر لانا بدتمیزی ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

صبا کو اندازہ ہوا۔ وہ خود بھی قدرے نروس تھا۔ لیکن بول بول کر اپنی گھبراہٹ کو مخفی رکھنا چاہتا تھا۔

آج اس نے ایسا کام کیا تھا جو اگر منظر عام پر آ جاتا تو اسے سب بڑوں سے سخت سست سننا پڑتی وہ اسے سب کی نظروں سے بچا کر اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ پلان کے مطابق گیارہ بجے جب حسب معمول فیروز ٹہلنے کے لیے لان میں جاتا تو صبا بھی اس کے پیچھے جاتی اور اس سے حال دل کہہ ڈالتی۔ صبا، نجمہ بیگم سے نبیلہ اور عقیلہ سے ملنے اور دیر تک ساتھ بیٹھنے کی اجازت لے آئی تھی۔ کیونکہ کل وہ دونوں واپس جا رہی تھیں۔ اور ان سے مل کر اور گھر جانے کی اجازت لے کر وہ شہروز کے پاس آ گئی تھی۔

"ویسے یہ ٹھیک نہیں ہے شہروز۔" اسے ہر ایک منٹ کے بعد الجھن ہو رہی تھی۔

"خدارا صبا! اب جو ہوگا سو ہوگا۔ مجھے تو نہ پریشان کریں۔"

"اگر مزید پانچ منٹ بعد وہ لان میں نہ آئے تو میں گھر چلی جاؤں گی۔"

"فیروز بھائی۔ اپنے روٹین کے از حد پابند ہیں۔" وہ بولا۔

"وہ بے چینی سے نیچے لان میں کھلنے والی کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔



دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک اٹھا۔

"یس۔" اس نے ہولے سے کہا تھا۔

دروازہ کھلا اور نبیلہ کا چہرا برآمد ہوا۔

"میں اندر آ سکتی ہوں؟"

"فیروز احمد نے قدرے الجھن کے عالم میں گھڑی کی سمت دیکھا۔

"آیئے۔" وہ جیسے بادل نخواستہ بولا تھا۔

اجازت مل جانے پر بھی وہ کچھ دیر دروازے میں ہی کھڑی رہی جیسے جو کچھ کہنے آئی ہوا سے ذہن میں یکجا کر کے دہرا رہی ہو۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" وہ ہنوز الجھن کا شکار تھا۔

"احمق لڑکیوں کی بے وقوفانہ حرکتیں اسے بہت جلد جھنجلاہٹ کا شکار کر دیا کرتی تھی۔

"جی۔" وہ آہستہ آہستہ چلتی اندر آ گئی۔

"بیٹھیں۔"

وہ پہلے پلنگ کے کنارے پر ٹکی پھر جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"کیا بات ہے نبیلہ؟" اس کے لہجے میں برہمی در آئی۔

"وہ۔ دراصل۔ میں اور عقیلہ کل واپس جا رہے ہیں۔" وہ اس کے انداز سے گھبرا گئی۔

"جی میں جانتا ہوں۔ صبح میں خود بھی آپ کو الوداع کہتا۔ اتنے میوز تو مجھے آتے ہیں۔"

"میرا مقصد یہ نہیں تھا۔" وہ جلدی سے بولی۔ "دراصل۔ میں کچھ اور۔"

"آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں؟" وہ سراپا سوال بن گیا۔

"جی۔ جی ہاں۔"

"تو جلدی کیجیے۔" اس نے پھر گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

"میں۔ فیروز صاحب! میں کل جا تو رہی ہوں لیکن اس گھر کے در و دیوار مجھے عزیز ہو چلے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں پھر۔ ہمیشہ کے لیے یہاں آ جاؤں اگر آپ چاہیں تو۔"

اس کی نظریں جھک گئیں۔

"وہ چند لمحے بے بسی سے اسے دیکھتا رہا۔

"میں نے پہلے بھی کہا تھا نبیلہ! بعض کنویں اندھے، اندھیرے اور خشک ہوتے ہیں لیکن آپ کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی۔"

"سچے جذبوں کی طاقت صحرا میں بھی پھول کھلا دیتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ پھول سے بھرے دامن کی خواہش صحرا کی مٹی میں بھی کہیں موجود ہو۔"

"مجھ میں کیا کمی ہے؟" اس کی آنکھیں اس کے درشت انداز سے ڈبڈبا گئیں۔

"اب سے کچھ دیر پہلے تک نہیں تھی۔"

"اور اب؟" وہ ہونق ہوئی۔

"وہ بہت سے لفظ جو کچھ دیر پہلے تک صرف آپ کے تھے۔ فضاؤں میں بکھرے اور آپ کے نہ رہے۔ سماعتیں اگر لفظ قبول کرنے سے انکار کریں تو کہنے والا بہت کچھ کھو دیتا ہے۔ یہ کیا کم نقصان ہے؟۔ آئی ایم سوری۔ میں آپ کو وہ مقام نہیں دے سکتا جو آپ چاہتی ہیں۔"

اپنی جگہ سے اُٹھ کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا اور ڈگمگاتے قدموں سے اپنے کمرے کو جاتی نبیلہ احساس ندامت اور شکستگی سے سوچ رہی تھی کہ درحقیقت اسے نقصان ہی ہوا تھا۔

اور وہ جلتے تپتے دماغ کے ساتھ لان میں ٹہلتے ہوئے اسی سوچ میں تھا کہ جذبوں کو چھپائے رکھنے والے دل کیا اس دنیا میں ہوتے ہی نہیں ہیں؟۔ ہر بات کا اظہار زبان سے کر کے اس کی قدر و قیمت گھٹانا کیا ضروری عمل ہے۔ کیا اس کے بغیر روحیں شانت نہیں ہو پاتیں۔

"ٹہلتے ٹہلتے وہ اچانک مڑا تو حیرت سے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس کے عین مقابل صبا موجود تھی۔

"صبا آپ!" وہ شاک کی سی کیفیت میں تھا۔" اس نے تھوک نگلا۔

"اور نجانے اسے کیا ہوا۔ وہ اپنے آپے میں نہ رہا۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور اس کے گال پر انگارے چھوڑ گیا۔

''خبردار۔ جو تم نے خود کو بے قیمت کیا۔ جو اپنی قیمت لگائے اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ سمجھیں۔''

تیز تیز قدم اٹھاتا وہ اندر کی سمت بڑھ گیا۔ صبا گال پر ہاتھ رکھے، روانی سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ گیٹ کی سمت دوڑی تھی۔

''بھائی۔ بھائی!''

''کھڑکی سے سارا منظر دیکھتا شہروز پردہ تھام کر جیسے رو دیا۔

''یہ کیا کر دیا تم نے خوشیاں بڑھی تھیں تمہاری سمت، زندگی مسکراتی ہوئی آئی تھی۔ اور تم نے اتنے غرور سے دامن جھٹک دیا۔ بھائی۔ تم نے ہمیشہ کے لیے خوشیاں اپنی دسترس سے دور کر دیں۔''



''شام تک لوٹ بھی آئیں گے شبنم اضدمت کرو۔''

''یہی تو میں تم سے کہہ رہی ہوں ثریا۔ ضد مت کرو۔ میں کہیں آنے جانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' وہ بے حد اکتاہٹ سے گویا ہوئی تھی۔

''کتنے دنوں سے آمنہ بھابی کہلوا رہی ہیں۔ آج پروگرام بنا ہے تو تم نخرے دکھا رہی ہو۔''

''ثریا! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ مجھے مزید پریشان نہ کرو۔'' اس نے سچ مچ ہاتھ جوڑ دیے۔

''غضب خدا کا تم تو بالکل پاگل ہو۔'' وہ اس کی حرکت پر بھڑک اٹھی۔ ''تمہاری مرضی ہے۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ باہر نکلو گی، کہیں آؤ جاؤ گی تو طبیعت پر اچھا اثر پڑے گا۔ چہرا فریش ہو جائے گا۔ کچھ دنوں میں کیسی کملا سی گئی ہو۔''

''مجھے ایسے ہی رہنے دو۔'' وہ دل شکستگی سے بولی۔

''اپنی اماں کے گھر ہو آؤ۔ تم نے تو وہاں بھی نہ جانے کی قسم اٹھا لی ہے۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ درحقیقت اماں سے ملنے اور ان سے لپٹ کر جی بھر کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ نیلم کی وجہ سے وہاں بھی نہیں جاتی تھی۔

اکیلی رہو گی بلاوجہ۔''

ثریا جاتے جاتے بری طرح جھنجلا رہی تھی۔ چچی جان بھی کہا نہ ماننے پر خفا خفا سی تھیں۔ اس پر ایک اچٹتی نگاہ ڈال کر نکل گئیں۔

''گیٹ اچھی طرح بند کر لینا۔'' یونس بھائی نے اسے ہدایت کی۔ ''ہم شام ڈھلنے سے پہلے ہی لوٹ آئیں گے۔''

''جی بہتر۔''

''گیٹ بند کر کے وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کی زندگی نے اچانک وہ رخ اختیار کیا تھا کہ جس کا اس کے ذہن میں دور دور تک کوئی

تصور ہی نہ تھا۔ یوسف سے شادی سے لے کر اب تک کے واقعات اس کے دل ودماغ پر کوڑے برساتے، مجروح کرتے، یکے بعد دیگرے گزرتے چلے جاتے تھے۔ اور بظاہران کے رُکنے کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔

نجانے ابھی اسے اپنی جان پر اور کتنے ستم برداشت کرنے تھے۔ ان کی قوت حوصلہ جواب دینے لگی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی زندگی کا مقصد اور مصرف کیا ہونا چاہیے؟ اس کی قسمت میں خدا نے جتنی سانسیں لکھی تھیں، وہ تو اسے ہر حال میں پوری کرنی تھی لیکن کس طرح؟ بناء کسی امید، کسی توقع اور کسی جذبے کے وہ یہ سانسیں کس طرح اور کب تک پوری کرتی۔

اسے اپنے تہی داماں ہونے کا احساس اس شدت سے ہو رہا تھا کہ اب ذہن کچھ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں سے بھی عاری ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا بہت جلد وہ ایک مٹی کا بت بننے جا رہی تھی۔ جو اپنی مدت پوری کرنے کے بعد کسی بھی لمحے ریزہ ریزہ ہو کر فضاؤں میں بکھر جاتا......

کیونکہ ایک جیتی جاگتی ہستی کہلانے کے لیے جن جذبوں، خواہشوں اور امیدوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے پاس بالکل نہ تھیں۔

خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی وہ کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے ہوئے تھی جب اسے احساس ہوا کہ کال بیل بج رہی ہے۔ وہ ایک جھرجھری لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور گیٹ کھولنے چل دی۔

''کیا مر گئے سب کے سب؟'' باہر یوسف کھڑے جھنجلا رہے تھے۔ ''گھنٹہ بھر سے کھڑا بیل بجا رہا ہوں، کوئی سنوائی ہی نہیں ہے۔''

وہ بنا کوئی جواب دیے پلٹ آئی۔ اس شخص کی صورت پر نظر پڑنے سے اس کے اندر بگولے سے اٹھتے تھے۔ اس کی بے فکر ہنستی مسکراتی زندگی میں کانٹے ہی کانٹے بچھا دینے والا یہ شخص اس کی کسی شے کا حق دار نہ تھا۔ چند لفظوں کا بھی نہیں۔

''کہاں ہیں سب لوگ؟۔ امی، ثریا، یونس بھائی؟'' انہیں تشویش ہوئی۔

وہ ہنوز خاموشی اختیار کیے رہی۔

''کیا ہوا ہے؟''

''اس کے انداز غیر معمولی تھے اور گھر کے افراد بھی موجود نہ تھے۔ ان کی تشویش بجا تھی۔

''شبنم۔'' انہوں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''مت ہاتھ لگائیں مجھے۔''

وہ اتنے زور سے چیخی تھی کہ وہ ڈر گئے۔

''مت ناپاک کیجئے مجھے۔ آپ کے آلودہ جسم سے گھن آتی ہے مجھے۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کی حسرتوں کی تکمیل جائز رشتے کر ہی نہیں سکتے۔ جائیں، اپنی خواہشات کہیں اور جا کر پوری کریں۔ کسی اور سے بھیک مانگیں۔ کسی اور کے سامنے اپنا کاسہ پھیلائیں۔ پھر چاہے وہ کوئی بازاری عورت ہو، کوئی بدکردار بھکارن ہو یا میری اپنی بہن ہو۔''

''شبنم!'' بات ان کی برداشت سے کہیں زیادہ تلخ تھی۔ انہوں نے اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ پھر اسے بستر پر پھینک کر

باہر چلے گئے۔

''بزدل۔ بے غیرت، بے کردار، لادین۔'' وہ چیختی رہی۔ ''اور کر ہی کیا سکتے ہیں آپ، اور دے ہی کیا سکتے ہیں مجھے۔''

تکیے میں منہ دیے کروہ نجانے کب تک روتی رہی۔

کسی کے ہاتھ کا لمس اسے اپنے کاندھے پر محسوس ہوا تھا۔

''شبنم!'' پھر کسی نے اسے بڑی محبت سے پکارا۔

وہ ایسے اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

ریاض بھائی اس کے بے حد قریب بیٹھے تھے۔

''آپ؟'' اسے اپنے منتشر حواسوں کو یکجا کرنے میں ناکامی ہوئی۔

''شبو۔ کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو۔ یہ نشان کیسے ہیں تمہارے گالوں پر۔''

اتنا نرم لہجہ، ایسا مہربان انداز۔

''ریاض بھائی!'' وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔



''دھیرج دھیرج۔'' وہ اسے آہستہ آہستہ تھپک رہے تھے۔

''میں مرجانا چاہتی ہوں ریاض بھائی! میں زندہ رہ کر کیا کروں گی، کیا کر رہی ہوں؟ میرے لیے اب زندگی میں کوئی کشش، کوئی امنگ باقی نہیں رہی۔ کوئی بہانہ ہی نہیں رہا۔''

''ایسے نہیں کہتے شبو۔''

''میرا جی چاہتا ہے ساری دُنیا کو آگ لگا دوں۔ اس کا تماشا دیکھوں، خوب قہقہے لگاؤں اور پھر خود بھی اس آگ میں کود پڑوں۔ خود کو بھی مٹا ڈالوں اور زمانے کو بھی۔ نجانے خوشی کیا ہوتی ہے۔ کن لوگوں کو ملتی ہے کس شے کے عوض ملتی ہے۔ میں تو غموں کی بھٹی میں تپ تپ کر راکھ ہوئی جا رہی ہوں۔ اور سب سے بڑا دُکھ یہ ہے کہ اس بھٹی میں مجھے میرے اپنوں نے جھونکا ہے۔ جس سولی پر میرا زخمی وجود پھڑ پھڑا رہا ہے اس تک میرے سگے، میرے پیارے مجھے کھینچتے ہوئے لائے ہیں۔ میری ماں جائی، جسے میں بہت بہت پیار کرتی تھی، جس کے پاکیزہ چہرے پر قربان ہونے کا سوچتی تھی۔ اسی نے رات کے اندھیرے میں اپنے خوفناک نوکیلے دانت میری۔ شہ رگ میں گاڑ دیے؟ کس جنم کا بدلہ لیا اس نے مجھ سے۔ میں نے کب اس کے آگے اپنا دامن پھیلایا تھا جو اس نے اپنی جھوٹی تھالی میرے سامنے رکھ دی۔ زیست گل و گلزار نہیں تھی تو اس قدر ویران بھی نہیں تھی۔ اس نے کیوں میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی مجھے تپتے صحرا میں کھڑا کیا۔ بولا تم نے ایسا کیوں کیا۔''

اس کے حواس کسی طور پر قابو میں نہ آ رہے تھے۔

''ہاں۔ہاں ایک تپتا ہوا اجاڑ صحرا ہے وہ شخص میرے لیے۔اس کا ساتھ کبھی میرے لیے خوشیوں کا کوئی پھول نہ کھلا سکا۔جھلسی جا رہی ہوں میں۔''

''حوصلہ کرو شبنم! جینے کو دُنیا میں بہت کچھ ہے۔خوشیاں کسی کی جاگیر نہیں ہیں۔یہ تو کہیں سے بھی مل سکتی ہیں۔تم ایک نظر اُٹھا کر تو دیکھو، کس کس کے دل تمہارے آگے سرنگوں ہونے کو بے قرار ہیں۔تمہارے قدموں میں گر کر تڑپنا چاہتے ہیں۔ان سے لپٹنا چاہتے ہیں۔''

وہ جیسے آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگی۔ایک اجنبی لمس کا احساس اسے بیدار کرنے لگا۔کسمسا کر اس نے ریاض بھائی کے بازو اپنے وجود سے الگ کرنے چاہے۔

''تم یوسف کی پروا اب تک کرتی ہو؟۔ارے بھاڑ میں ڈالو اسے اور اس کے تصور کو بھی۔جسے تمہارا خیال تک نہیں آتا تم اس کے غم میں اپنی آنکھیں خراب کر رہی ہو؟۔ان آنکھوں کو چاہنے اور سراہنے والے مر گئے ہیں کیا؟۔''

ان کے بازوؤں کا گھیرا تنگ تر ہو جا رہا تھا۔

''ریاض بھائی۔''

''اسے پوری طرح سے احساس ہو گیا کہ کیا ہو رہا ہے۔تڑپ کر وہ ان سے الگ ہو گئی۔

''ارے۔'' وہ ہنسے۔کیا ہوا شبو؟۔ایسے بھلا کیوں گھبرا گئیں۔میں کوئی غیر تھوڑا ہی ہوں۔تمہارا اپنا ہوں۔بالکل اپنا۔''۔

''وہ اپنی سوجی ہوئی آنکھوں میں ناگواری کا احساس بھرے انہیں دیکھنے لگی۔

''کون نہیں جانتا کہ یوسف میاں تمہارے ساتھ کس قدر زیادتی روا رکھے ہوئے ہیں۔تم دونوں میاں بیوی کم اور دو اجنبی زیادہ لگتے ہو۔ جو ایک ساتھ سفر کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔اور۔اور۔یہ نیلم کا کیا چکر ہے؟۔کیا یوسف اب تک اس کے خیالوں سے پیچھا نہیں چھڑا پائے؟''

''وہ بے بسی سے سر جھکا کر ہونٹ کاٹنے لگی۔

''کیا قیامت کا زمانہ ہے۔''انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔''اتنی اچھی۔اتنی پیاری۔اتنی معصوم بیوی کے ہوتے ہوئے بھی انہیں باہر تانک جھانک میں لطف آتا ہے۔یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی گھر میں بچھے پر تکلف خوان سے اُٹھ کر دوسروں کے خالی پیالے چاٹتا پھرے۔ساری خرابی نیت کی ہے۔لیکن تم کیوں دل برا کرتی ہو۔تمہیں بھلا کس شے کی کمی ہے؟۔حسن و جمال کی دولت سے مالا مال ہو۔ایسا سبق سکھاؤ کہ موصوف یاد رکھیں۔''

''میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیا کر سکتی ہو؟'' وہ حیران ہوئے۔''کیا نہیں کر سکتیں؟ خیر۔کم از کم اتنا تو کر سکتی ہو کہ یوں اتنا خون جلانے کے بجائے خوش رہو۔کھاؤ پیو،زندگی کے مزے لوٹو۔''

اس نے طنزیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"خوش رہنے کا کوئی نہ کوئی جواز ہوتا ہے ریاض بھائی۔ بے وجہ ہنسنے لگی تو لوگ چھری ماریں گے۔"

"کمال ہے۔ بھئی جو کام بھی تمہیں خوشی بخش سکتا ہے، بے دھڑک کرو۔ دوسروں کی پروا کرنے والے یونہی تنہائیوں سے سر پھوڑ کر رویا کرتے ہیں۔ ہنسو، مسکراؤ، خوش رہو۔ اپنے چاہنے والوں کی چاہت سے لطف اندوز ہو۔ یہی بہت ہے۔"

اس نے غور سے انہیں دیکھا۔

"ارے بھئی۔ کس کام سے آیا تھا اور کن باتوں میں وقت گزر گیا۔" انہوں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "میں تو تمہیں لینے آیا تھا۔"

"مجھے لینے؟"

"ہاں اور کیا۔ ثریا اور امی جان وہاں پہنچیں تو آمنہ بہت خفا ہوئی تمہارے نہ آنے پر۔ میں نے کہا۔ میں ابھی جا کر لے آتا ہوں۔ یہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں، دروازہ چوپٹ کھلا ہے، پورا گھر خالی پڑا ہے اور تم یہاں اوپری منزل میں اکیلی بیٹھی رو رہی ہو۔ ہوا کیا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ اس نے نظریں چرالیں۔

"مجھے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ یوسف میاں نے تم پر ہاتھ اُٹھایا ہے۔ تمہارے گال کس قدر سرخ ہو رہے ہیں۔"

"وہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔" وہ تنفر سے بولی۔

"چچ چچ چچ، بیوی پر ہاتھ اُٹھانا کس قدر نچلے درجے کے لوگوں کا کام ہے۔ چلو تم اُٹھ کر منہ دھو لو اور کپڑے بدلو۔ ادھر سب لوگ کھانے پر انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"میں نہیں جاؤں گی ریاض بھائی۔ پلیز، مجھے مجبور نہ کریں۔"

"کیسے نہ کریں بھئی؟ یوسف میاں کے دل میں تمہارا درد نہیں ہے تو کیا کبھی کو احساس سے اتنا عاری سمجھتی ہو؟۔ میں تو ہرگز تمہیں یوں اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔ نہیں چلتی تو میں بھی یہیں بیٹھا رہوں گا۔"

"ریاض بھائی! مجھے مجبور نہ کریں۔"

"چلو اُٹھو۔ شاباش! اگر مجھے کچھ سمجھتی ہو تو فوراً اُٹھ کر کپڑے بدلو۔ ارے ہاں، وہی نیلی ساڑھی پہنو جو اس دن ہمارے ہاں دعوت میں پہن کر آئی تھیں۔ کیا قیامت ڈھاتی ہو وہ پہن کر۔ شعلہ جوالہ لگتی ہو۔"

"وہ ناگواری کے جذبات چھپاتی اپنی جگہ سے اُٹھ گئی۔ یوں بھی وہ اس کے قریب بستر پر ہی بیٹھے ہوئے تھے اور اسے سخت اُلجھن ہو رہی تھی۔

"آپ نیچے چل کر بیٹھیں۔ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔"

"اچھا اچھا۔" وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "زیادہ دیر نہ لگانا وہ لوگ پریشان ہوں گے۔" اس نے الماری سے ایک سادہ سا جوڑا نکالا اور باتھ روم میں گھس گئی۔

یوں تو اس سخت بے دلی کی کیفیت میں اس کا کہیں بھی آنے جانے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ ریاض بھائی اس کے ساتھ تنہا گھر میں موجود رہیں۔ ان کی پیش رفت وہ خوب سمجھ رہی تھی۔ لیکن نجانے کیا بات تھی۔ اسے یہ سب کچھ اس حد تک برا نہیں لگ رہا تھا۔ جتنا کہ لگنا چاہیے تھا۔

گیلے بال سکھا کر اس نے پشت پر پھیلا دیے اور آنکھوں میں ہلکا سا کاجل ڈال کر نیچے اتر آئی۔

''چلیں ریاض بھائی۔''

''واہ۔ کیا روپ نکھر آیا ہے۔ کاجل کی ہلکی سی لکیر بھی مانو جادو کر ڈالتی ہے۔ ویسے یہ اور بات ہے کہ تم نے ہماری خواہش کا احترام نہیں کیا۔''

''مجھے خود سے ساڑھی باندھنی نہیں آتی۔'' وہ ہولے سے مسکرا دی۔

''چلو معاف کیا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ''آؤ چلیں۔''

ان کی ہمراہی میں اسے گھر سے نکلتے ہوئے ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے وہ یوسف سے انتقام لے رہی ہو۔ اس کے اندر سکون سا اترنے لگا۔



"بیٹا! کھانا لگا دیا ہے۔ آ کے کھالو۔" جمنا نے کمرے میں جھانک کر اطلاع دی۔

"جمنا! مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔ میں کچھ دیر بعد کھالوں گا۔"

وہ کھانے کی میز پر خنیلہ کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آج وہ صبح سے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ ایک عجب سی بے چینی تھی۔ جو اسے لاحق تھی۔ سوچ سوچ کر اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ زندگی میں اسے کئی لڑکیوں سے واسطہ پڑا تھا۔ اس نے کئی دل توڑے تھے۔ کتنے ہی کومل جذبوں سے آنکھیں بند کر کے گزر گیا تھا لیکن وہ۔

وہ مختلف تھی۔ آج تک ملنے والی ہر لڑکی سے مختلف نجانے کیوں اسے دیکھ کر زندگی اور زندگی کی ہر سچائی پر یقین کر لینے کو، فیروز احمد کا دل چاہا تھا۔ اس کی نرم روی، شائستگی، رکھ رکھاؤ، انداز گفتگو اور دھیرے دھیرے سے مسکرانے کی ادا خود پر اعتماد کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ شروع میں وہ اسے سمجھ نہیں سکا تھا۔ شاید یہ اس کا حیا آمیز گریز تھا۔ جو کچھ بھی کھلنے نہ دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اسے اپنی دانست میں شہروز سے منسوب کر بیٹھا اور اسے یہ جان کر بڑی خوشی بھی ہوئی تھی۔ اسے خوشی ہوئی تھی کہ اس کے جان سے عزیز بھائی کو ایک بہترین لڑکی ملی ہے۔ ورنہ اس کی لاابالی طبیعت اور شوخی سے وہ خوفزدہ رہتا تھا کہ کہیں وہ کوئی غلط انتخاب نہ کر بیٹھے۔ کبھی نقصان نہ اٹھالے۔ لیکن پھر اسے اس کومل سی لڑکی کے ساتھ دیکھ کر اس نے سکون کا سانس بھرا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ یکلخت اس پر یہ انکشاف از خود ہی ہو گیا کہ وہ جو کچھ اس نے سمجھا تھا، وہ یکسر غلط تھا۔ وہ سارے جذبے اور احساسات جن کا اسے ادراک ہوا تھا، موجود تو تھے لیکن شہروز کے لیے نہیں تھے اور کس کے لیے تھے، اس انکشاف نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ حیرت اسے اس بات پر ہوئی تھی کہ اسے غصہ نہیں آیا تھا۔ اس کا جی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کو نہیں چاہا تھا۔ اسے اس لڑکی سے نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اسے خوشی ہوئی تھی۔

ایک بے پایاں مسرت احساس اس کے اندر ابھرا تھا کہ دنیا میں کوئی ہستی ایسی بھی ہے جو محبت کرنا اور اسے انمول موتی کی طرح سیپی میں قید رکھنے کا ہنر جانتی ہے۔ جو خوشبو کو محصور رکھنا جانتی ہے۔ جسے ہواؤں میں پہرے بٹھانے آتے تھے۔ جو اپنی نظروں پر حجاب کے پہرے لگا سکتی ہے۔ جسے الفاظ کی اہمیت کا اندازہ ہے کہ کس طرح یہ کسی کو کسی کی نگاہ میں معتبر کرتے ہیں اور کیسے کسی کو بے مول کر دیتے ہیں۔ اس کی نگاہ میں یکلخت وہ لڑکی بہت معتبر، بہت محترم ہو گئی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوتا اور وہ شہروز یا عفت خانم کے پاس بیٹھی نظر آتی تھی تو اس کے اندر خوشی کی ایک مدھم سی لہر دوڑ جاتی۔ فون کی گھنٹی بجنے پر وہ ریسیور اٹھاتا اور دوسری جانب سے اس کی آواز سنائی دیتی تو وہ ریسیور کو بڑے احترام سے تھام لیتا۔ وہ اس کے لیے رفتہ رفتہ ایک مقدس شے بنتی جا رہی تھی جب اچانک وہ سب کچھ ہوا جس کا فیروز احمد تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صبا پر ہاتھ اٹھا بیٹھا۔

سوچتا تھا کہ اپنا ہاتھ کاٹ کر رکھ دینے کو جی چاہتا تھا۔

"نجانے کیوں میں اپنے آپ میں نہیں رہتا آخر کیوں؟"

اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ شاید حقیقت یہ تھی کہ نبیلہ نے اسے ٹینس کر دیا تھا۔ وہ اسے جس طرح اپنے وجود کا احساس دلانے پر تل گئی تھی اس سے فیروز احمد کے لاشعور میں چھپی وحشت جاگنے لگی تھی۔ اس پر دیوانگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ اور پھر اس کا اظہار واقعی اسے کچھ دیر کے لیے دیوانہ بنا گیا تھا۔ اسی حالت میں صبا اس کے سامنے آ گئی اور اسے اپنے عتاب کا نشانہ بنا بیٹھا۔

''لیکن وہ۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔'' اس نے سوچا۔

''رات کے اس پہر وہ وہاں کیوں آئی تھی۔ اس نے مجھے کیوں مخاطب کیا تھا۔ کیا محبت سا انمول موتی سیپی کو بے چین کر رہا تھا؟ کیا وہ بوجھ اُٹھاتے تھک چکی ہے؟۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، ہمیشہ ایسا ہی کیوں ہوتا ہے۔''

''اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو اس کی سلگتی ہوئی سوچوں کا سلسلہ موقوف ہوا۔

''کون ہے؟'' نجانے کیوں آواز حد درجے ٹھنڈی برآمد ہوئی تھی۔

''بھائی۔'' وہ اُترے ہوئے چہرے کے ساتھ اندر آیا تھا۔ ''ہم لوگ جا رہے ہیں۔ آ کر مل لیجیے اگر چاہیں تو۔''

اپنی پریشان سوچوں سے اُلجھتے وہ اس قدر تھک چکا تھا کہ اس نے شہروز کی یاسیت کو محسوس ہی نہیں کیا۔

''ہوں! تم چلو میں آتا ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد وہ اُٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ تولیے سے منہ خشک کیا اور انگلیوں سے بال سنوارتا ہوا باہر آ گیا۔

دونوں لڑکیاں عفت خانم سے گلے مل رہی تھیں۔

''خدا کی امان میں سونپا۔'' ان کا گلا رندھ گیا تھا۔ ''پھر آتی رہنا بچو۔ تمہارے دم سے ہی کچھ دنوں کے لیے بہار سی آ گئی تھی ورنہ تو۔''

''ہم پھر آئیں گے آنٹی۔'' عقیلہ خلوص سے بولی۔ ''آپ بھی آتی رہیے گا۔ فون پر بھی رابطہ کیجیے گا۔''

''انشاء اللہ۔'' انہوں نے آنکھیں پونچھیں۔ ''ماں کو میرا اسلام دینا اور اگر مجھ سے کوئی شکایت ہو تو مجھے معاف۔''

''آنٹی!'' نبیلہ نے ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ ہماری بزرگ ہیں۔ ہم سے کچھ بھول چوک ہوئی ہو تو ہمیں آپ بچے سمجھ کر معاف کر دیجیے گا۔''

''تم تو بڑی پیاری بچیاں ہو۔ میرا دل اپنے ساتھ ہی لے جا رہی ہو۔ کتنی عزیز ہو گئی تھیں تھوڑے ہی دنوں میں مجھے۔''

انہوں نے فیروز احمد کو دیکھا تھا۔ وہ نظر چرا کر رہ گیا۔

''جلدی سے بہروز بھائی کے لیے کوئی لڑکی تلاش کر لیں پھر ہم شادی میں آئیں گے۔'' عقیلہ کہہ رہی تھی۔

''انشاء اللہ۔''

ان سے مل کر وہ جنات سے ملیں۔

"خدا حافظ سے پہنچائے۔"

"اس نے دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔

"اپنی امی کو ہمارا سلام دینا۔"

"اچھا فیروز صاحب!" نبیلہ اس سے مخاطب تھی۔ "زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ اگر قسمت میں ہوا تو۔"

"ضرور۔ اللہ حافظ۔" اس پر اس کی مخصوص سنجیدگی سوار تھی۔

"میرے بیٹے کو دیکھو۔" عفت خانم نے پیار سے شہروز کو دیکھا۔ "پتہ نہیں ہو رہا کہ جاتے جاتے ماں سے دو باتیں ہی کر لے۔ آج منہ میں چنے کیسے بھرے بیٹھے ہو؟"

وہ اُٹھ کر ماں کے گلے لگ گیا۔

"امی حضور۔ ہم سخت اداس ہیں۔ اگر وہاں ہمارا جی لگ گیا تو ہم مہینہ بھر بعد ہی آئیں گے۔"

"اور پیچھے ماں جو اداس ہو جائے گی اسکا کچھ خیال نہیں۔ تو ہی تو ماں کی اداسیوں اور تنہائیوں کا ساتھی ہے۔ میرے گھر کی بلبل ہے۔"

وہ اسے پیار کر رہی تھیں۔

"نبیلہ اور عقیلہ ہنس دیں۔ فیروز خاموش کھڑا رہا۔ ماں آج جانے کیا کچھ سنا رہی تھیں۔

"اچھا بھائی۔" وہ اس تک آیا۔

"اللہ حافظ۔" فیروز نے اسے گلے لگا لیا۔

ان تینوں کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر ماں کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ سخت اداسی کے عالم میں کچھ سوچ رہی تھیں۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ ان سے کوئی بھی بات نہ کر سکا۔ اسے احساس ہوا وہ سب سے کتنا پیچھے رہ گیا تھا۔ اپنی ماں سے، اپنے سگے بھائیوں سے، اپنے دوستوں سے۔ ہر کوئی اسے ساتھ ساتھ چلنے کی نصیحت کرتا آگے نکل گیا تھا اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ کہیں ماضی میں زندہ تھا۔ اسی لیے اسے حال میں جیتے لوگوں سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔ کسی بھی سطح پر اس کا کسی سے کوئی رابطہ نہ تھا۔

اذانوں کی آواز پر عفت خانم اُٹھ کر اپنے کمرے کی سمت بڑھ گئیں اور وہ جسمانی طور پر بھی وہاں تنہا رہ گیا ہاں۔ ذہنی طور پر وہ نجانے کب سے تنہا تھا۔

"لیکن کیوں۔" اس نے سوچا۔ "کیوں میں نے اپنے لیے خود پر سزا تجویز کی تھی۔ کس قصور کی پاداش میں خود کو ہمیشہ کی تنہائی، مستقل عذابوں کے سپرد کیا تھا میں نے؟۔ بھائی جان، امی، شہروز۔ کتنے قریب ہیں ایک دوسرے کے اور میں کسی اور ڈبے میں سفر کرتے مسافر کی طرح الگ تھلگ اپنے دُکھوں اور سکھوں سے اکیلا نبرد آزما۔"

اسے لگا وہ تھپڑ اس نے صبا کو نہیں اپنے آپ کو مارا تھا۔ اس تھپڑ نے اسے جیسے کسی گہری نیند سے جگایا تھا۔ وہ جاگ گیا تھا۔ ایک طویل عرصے کی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ رشتے ناطوں سے پہلی بار متعارف ہو رہا تھا۔ اس کی اہمیت کا احساس اجاگر ہو رہا تھا۔

اسے لگا اس نے زندگی کا ایک بڑا عرصہ ضائع کر دیا تھا۔ بہت کچھ کھو دیا تھا اس نے۔

"لو چائے پیو۔"

وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔ جنتا چائے کی پیالی لیے کھڑی تھی۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر چائے کی پیالی تھام لی۔

"تھینک یو جنتا!" وہ ممنونیت سے بولا تھا۔



گھنے، سیاہ سلکی بالوں کو برش سے سنوارتے ہوئے اس نے اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ نیٹ کے سیاہ لباس میں اس کا حسن چھلکا پڑ رہا تھا۔ بے تحاشا گورے بازو، تنگ آستینوں میں اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ کانوں میں پڑے ہیرے کے چھوٹے چھوٹے ٹاپس بالوں کی اوٹ میں کبھی کبھار جھانکتے اور اس کے چہرے کو منور کر دیتے۔ ہیرے کے لاکٹ نے گوری، صراحی دار گردن کو مزید قیمتی بنا دیا تھا۔ بھرے بھرے ہونٹوں کو اس نے لپ اسٹک سے شعلے کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔

آئینہ کہہ رہا تھا کہ وہ بے حد حسین، بے حد قیمتی نظر آ رہی تھی۔ اس کے اوپر غزلیں کہی جا سکتی تھیں۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو کلائی پر رسٹ واچ باندھتا اس کا ہاتھ تھم گیا۔

"کون ہے؟ آ جاؤ۔"

"دروازہ کھلا اور سیاہ کوٹ پینٹ میں ملبوس عثمان اندر آ گئے۔

"السلام علیکم۔" ان کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"وعلیکم۔" اسے قدرے ناگواری ہوئی۔ "آئیں۔ تشریف رکھیں۔"

"آپ میرا استقبال یوں کرتی ہیں جیسے ہم اب تک ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔" اس نے یونہی بات چھیڑی۔

"بہت زیادہ۔ آج دو آپریشن کیے ہیں۔ ذہنی طور پر تھکا ہوا ہوں۔ سوچا آپ کے ساتھ کہیں چل کر اچھی سی کافی پی جائے۔"

"اوہ!" وہ ہونٹ سکیڑ کر رہ گئی۔

"کہیں کی تیاری ہے؟" انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

"جی۔ جی ہاں!" وہ کچھ سوچ کر بولی تھی۔

"یہ شام اگر میں آپ سے مانگ لوں تو؟" وہ قدرے شگفتگی سے مسکرائے۔

اس کا روپ ان کے دل میں اترا جا رہا تھا۔ شام کے ساتھ ساتھ ان کا دل اسے بھی مانگنے لگا۔

"آئی ایم سوری۔" وہ تذبذب سے بولی۔ "دراصل کسی سے میری ملاقات طے ہے۔ میں نہ گئی تو وہ وعدہ خلافی ہوگی۔"

عثمان چند لمحے اسے دیکھتے رہے۔ کسی سوچ میں گم وہ اپنا نچلا لب کاٹنے لگے تھے۔

الماس ان کی جانب سے کسی بات کی منتظر تھی۔

"پوچھ سکتا ہوں۔ یہ ملاقات کس سے طے ہے؟"

ان کا لہجہ عجیب سا تھا۔ وہ چونکنے پر مجبور ہوگئی۔

"الماس ایمن۔ میں جاننا چاہتا ہوں۔ سب کچھ! میں چاہتا ہوں کہ اب اس کشمکش کی سی کیفیت سے باہر نکل آؤں۔ کسی فیصلہ کن موڑ پر پہنچنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ سے ایک بار کہا تھا الماس کہ میں دخل در ذاتیات کا قائل نہیں۔ نہ ہی بے وجہ شک و شبے کا شکار ہوتا ہوں لیکن بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا تعلق براہ راست انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے اور ان کو جاننا اور سمجھنا انسان کا حق ہوتا ہے۔ بہت دنوں سے منتظر تھا کہ شاید آپ کچھ کہیں گی لیکن آپ سے میں آپ کو سمجھ نہیں سکا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ لہٰذا اب مجھے خود ہی پوچھ لینا چاہیے کہ آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"میں کیا چاہتی ہوں۔" وہ خود سے بولی۔ "یہاں اس کی پروا کس کو ہے؟"

"کسی اور کو ہو نہ ہو، مجھے ہے۔ مجھے آپ کی، آپ کے جذبات و احساسات کی بہت پروا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر مجھ سے سب کچھ کہہ ڈالیے۔"

"کیا کہوں۔ کیا سننا چاہتے ہیں آپ؟" وہ تذبذب کا شکار تھی۔

"یہ رضا صاحب آپ کی زندگی میں کس حد تک شامل ہیں؟ وہ آپ سے اور آپ ان سے کیا چاہتی ہیں۔ معاف کیجیے الماس! بظاہر یہ سوالات بہت تکلیف دہ ہیں، نہ صرف آپ کے لیے بلکہ میرے اپنے لیے بھی۔ لیکن اب یہ جاننا ضروری ہو چکا ہے۔ اس لیے میں اس طرح پر آ کر گفتگو کرنے پر مجبور ہوں۔ دراصل بے وقوف بننا کسی کو بھی پسند نہیں ہوتا اور مجھے یہ لگتا ہے کہ میں بے وقوف بن رہا ہوں۔"

"الماس چند لمحے انہیں دیکھتی رہی۔ اسے لگا عثمان ٹھیک کہہ رہے تھے۔ فیصلہ کن موڑ آ پہنچا تھا اور فیصلہ اسے ہی سنانا تھا۔

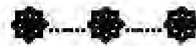
"عثمان!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آپ درست کہہ رہے ہیں۔ اچھا ہوا آج آپ نے خود ہی یہ گفتگو چھیڑ دی ورنہ میں مزید دیر لگا دیتی۔ میں۔ میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔"

بیٹھے بیٹھے عثمان خان نے نجانے کتنی صدیوں کا فاصلہ طے کر لیا۔ انہیں لگا پل بھر کی ساعت میں وہ بوڑھے ہو گئے ہوں۔

الماس نے ان کے تاریک ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"دراصل میں۔ رضا سے نکاح کر چکی ہوں۔"

دھڑام سے چھت ان پر آ گری اور وہ اس کے ملبے تلے دب گئے۔
اس لمحے انہیں ایسا لگا کہ ان کی ساری خوشیاں عمر بھر کے لیے ان سے رخصت ہو گئی ہوں۔ اُٹھے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔



''اماں۔'' وہ ان کی شیشیاں ٹٹول رہی تھی۔ ''دوائی کب سے ختم ہو گئی ہے۔ آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔''
اماں نے ایک لاتعلق سی نظر اس پر ڈالی اور خاموش رہیں۔
''چلیں۔ ابھی حکیم صاحب بیٹھے ہوں گے۔ چل کر دوا لے آتے ہیں۔''
''رہنے دو۔'' وہ بولیں۔ ''دوائیاں کھانے سے دل کے زخم کب بھرتے ہیں۔ دوائیاں کھا کر لوگ زندہ رہتے تو آج اتنے قبرستان کاہے کو آباد ہوتے۔''
ان کا لہجہ تھکن اور مایوسی سے چور تھا۔ نیلم ساکت کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔
اماں کا یہ انداز گزشتہ کئی روز سے مسلسل برقرار تھا۔ نجانے وہ اس سے کس حد تک بددل ہو چکی تھیں کہ اب اس کی محبتوں اور خدمتوں کا جواب بھی دینا پسند نہ کرتی تھیں۔
''ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں اماں۔'' اس کا دل بھر آیا۔ ''کیوں کرنے لگی ہیں۔ مجھ سے آپ کو اگر کوئی شکایت ہے تو۔''
''مجھے کوئی شکایت نہیں۔'' انہوں نے منہ پھیر لیا۔ ''خود مختار، اپنے فیصلوں میں آزاد لوگوں سے بھلا کیا شکایت۔ تم دیکھو، یہ مریم نے ہانڈی تیار کی یا نہیں۔ مجھے بھوک لگی ہے۔''
وہ آنسو پیتی ہوئی اٹھ کر باہر آ گئی۔
''اماں! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ بہت غلط۔''
وہ خیالوں میں ان سے مخاطب تھی۔
''بجیا'' ریشم شاداں و فرحاں کمرے سے نکلی تھی۔ ''یہ سوٹ کس کا ہے؟''
''اس نے چونک کر اس کے ہاتھ میں موجود کپڑے کو دیکھا۔ گلابی پرنٹڈ کپڑا وہ آج ہی فیکٹری سے آتے ہوئے خرید کر لائی تھی۔ پہننے کو چند سوٹ تھے اس کے پاس جنہیں وہ روز بدل بدل کر پہن کر جاتی تھی اور اب ان کے رنگ بالکل ماند پڑ چکے تھے۔ تنخواہ میں سے بمشکل کچھ پیسے بچا کر رکھے تھے۔ جن سے آج وہ یہ سوٹ خرید لائی تھی۔
''کتنا پیارا ہے۔ یہ بولیں ناں کس کا ہے؟''
''تمہیں پسند ہے تم لے لو۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

"سچ بجو لے لوں؟" وہ خوشی سے بولی۔ "قسم سے میرے پاس ایک بھی ڈھنگ کا جوڑا نہیں ہے۔ کتنے مہینے گزر گئے کپڑے بنائے ہی نہیں۔"

نیلم ہولے سے مسکرادی۔ اماں کا رویہ اسے اندر سے مارے ڈال رہا تھا۔ ایسے میں وہ لاکھوں کے کپڑے بنوالیتی تو بھی اسے خوشی نہ ہوتی۔ معمولی سے سوٹ کے جانے سے اسے کیا احساس ہوتا۔ اور پھر ریشم کی خوشی دیکھ کر ہی وہ کچھ دیر کے لیے اپنی فکریں بھلا بیٹھی تھی۔

"میں مریم کو دکھاتی ہوں۔"

وہ چھلانگیں مارتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

نیلم بھی ایک گہری سانس بھر کر اسی سمت بڑھ گئی۔ مریم اور ریشم سوٹ پر جھگڑا شروع کر چکی تھیں۔

"تم کوئی نواب زادی ہو کہ جو بھی چیز گھر میں آئے، تمہارے لیے آئے۔" مریم سخت ناراض تھی۔ "بجو دیکھیں بجو، یہ سوٹ میں لوں گی۔ میرے پاس پہننے کے لیے بالکل کپڑے نہیں ہیں۔"

"وہ نیلم کو دروازے میں نمودار ہوتا دیکھ کر اس سے مخاطب ہو گئی۔

"ارے واہ! کوئی زبردستی ہے۔ بجو یہ مجھے دے بھی چکیں۔ اب یہ میرا ہے اور میرا تمہیں دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"مریم! کھانا تیار ہے؟"۔ وہ تھکے تھکے لہجے میں گویا ہوئی۔ "اماں کو بھوک لگی ہے۔"

"جی بجو! بس میں نکال ہی رہی تھی کہ یہ فساد کی جڑ آ پہنچی۔" مریم نے دانت پیسے۔

"فساد کی جڑ میں ہوں کہ تم؟"

"یہ سوٹ!" مریم برجستہ بولی۔

ریشم کو ہنسی آ گئی۔

"چلو ایسا کرتے ہیں دونوں ایک ایک قمیص بنا لیتے ہیں۔ سفید شلوار کے ساتھ پہن لیں گے۔" ریشم صلح جو انداز میں بولی۔

"نہیں رہنے دو۔ ایسا بھی کیا۔" مریم دوبارہ اپنے کام کی سمت متوجہ ہو گئی۔ "تم پورا سوٹ ہی بنالو۔ میرا جب جی چاہے گا تم سے مانگ کر پہن لوں گی۔"

نیلم دومنٹ کے جھگڑے کے بعد ہو جانے والی صلح دیکھ کر مسکرا دی۔

"مریم! میں اگلی تنخواہ پر تمہیں بالکل ایسا سوٹ لا دوں گی۔"

"پیشگی شکریہ بجو!" وہ ہنس دی۔

وہ سوچتے ہوئے کمرے میں آ گئی تھی۔ کتنی پیاری عمر تھی یہ۔ جب بڑے سے بڑا دکھ، عظیم سے عظیم نقصان محض ہولے سے چھو کر گزر جاتا تھا۔ بے خبری، ماں کی طرح مہربان آغوش وا کیے رکھتی تھی۔ کوری کوری پلکیں آگہی کے بوجھ سے آزاد ہوتی تھیں۔ اپنی ذات کی نئی نئی پہچان کا نشہ

مست کیسے دکھتا۔ کوئی غم غم نہ لگتا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی بات خوشی کا باعث ہوتی تھی۔

اسے یاد تھا۔ وہ اور شبنم کبھی بھی کسی چیز پر جھگڑا نہیں کرتے تھے۔ جھگڑا کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ ہر چیز یا تو مل بانٹ کر استعمال کرتی یا ایک دوسرے کو دے دینے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

شبنم کی یاد آئی تو اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

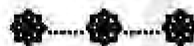
"نجانے میری بہن کن حالات سے دوچار ہوگی۔ اس نے تو آنا ہی ترک کر دیا۔ مجھ سے نہ سہی اپنی ماں سے ملنے تو آجایا کرے۔ چھوٹی بہنوں سے مل کر جایا کرے۔ نجانے وہ یہ سزا ہمیں دے رہی ہے یا خود کو۔"

بستر پر لیٹ کر اس نے ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ اشک خاموشی سے بہہ کر تکیے سے جا ملے۔

"شاید اماں کو اس کے نہ آنے سے وہم ستاتے ہوں، شاید اسی لیے وہ مجھے اپنے دل میں قصوروار ٹھہراتی ہوں یا شاید میں حقیقتاً قصوروار ہوں۔ تبھی سزا بھگت رہی ہوں۔ اپنے ناعاقبت اندیش فیصلوں کی آگ میں جل رہی ہوں اور دوسروں کو جلتا دیکھ رہی ہوں۔ میں نے تو کبھی اس سے معافی مانگنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ مجھے تو اس کے پیروں میں گر کر گڑگڑانا چاہیے تھا۔ اپنے قصور اسی دنیا میں بخشوا لینے چاہئیں مجھے۔ کیا خبر مرنے کے بعد بھی میں اسی آگ میں جلتی رہوں۔"

"اس کا سانس دھونکنی کی مانند چلنے لگا۔

"میں۔ میں خود جاؤں گی اس کے پاس۔ مجھے جانا بھی چاہیے۔ نجانے میں نے کس امید پر اتنی تاخیر کی۔ جتنی بدنصیب ہوں۔ اتنی ہی بدعقل بھی ہوں۔"



"مس اعباسی صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔"

اٹینڈنٹ اسے اطلاع دے کر گیا تھا۔

"وہ چند کال ملا رہی تھی۔ فارغ ہو کر اٹھی اور سر پر چادر درست کرتی عباسی صاحب کے کمرے کی سمت چل دی۔

"میں اندر آسکتی ہوں سر؟"

"آیئے" انہوں نے ہاتھ میں تھامی ہوئی فائل ایک طرف رکھ دی۔

"تشریف رکھیے۔"

"شکریہ سر۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اور۔ کیسا چل رہا ہے کام؟ کوئی شکایت تو نہیں کسی قسم کی؟" وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"نہیں سر! خدا کا شکر ہے۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔ "کوئی پریشانی نہیں ہے۔ کام بھی مکمل طور پر سمجھ میں آگیا ہے۔"

عباسی صاحب کا پی۔ اے آ کر ان دونوں کے آگے چائے رکھنے لگا۔

"ارے۔ اس کی کیا ضرورت تھی سر۔" وہ گھبرا گئی۔ "میں تو ابھی۔"

کوئی تکلف کی بات نہیں ہے۔ چائے پئیں۔" انہوں اپنا کپ اٹھاتے ہوئے اسے بھی اشارہ کیا۔

"آپ نے مجھے بلایا تھا سر! کوئی کام تھا؟"

"ہوں؟" انہوں نے سر ہلایا۔ "کام تو کچھ خاص نہیں تھا۔ یہ بتایئے، ٹائپ کر لیتی ہیں آپ؟ ڈکٹیشن لے لیتی ہیں؟"

"نہیں سر۔ بالکل بھی نہیں۔" وہ کچھ ہراساں ہو گئی۔ "لیکن کیوں سر، اس کی اب کیا ضرورت آن پڑی؟"

"کچھ اتنی زیادہ گھبرانے کی بات نہیں۔" وہ مسکرائے۔ "یہ آپ کے چہرے پر ہر وقت ہوائیاں سی کیوں اُڑی رہتی ہیں؟ ایسا لگتا ہے کسی جنگل سے آبادی کی طرف آ نکلی ہوں۔"

"نیلم بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

"پتا نہیں سر۔ میں گھبرا جاتی ہوں۔" وہ انگلیاں چٹخانے لگی۔

"آپ کے والد کیا کرتے ہیں؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

"جی! ان کا تو عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔"

"اوہ! آئی ایم سوری۔ پھر والدہ سروس میں ہیں آپ کی؟"

"جی؟۔ جی نہیں۔ اماں تو پڑھی لکھی بالکل بھی نہیں ہیں۔ میرے بڑے بھائی تھے وقار انہوں نے ہی درحقیقت باپ بن کر ہماری پرورش کی تھی۔ پچھلے سال ان کا انتقال۔"

اس سے آگے بولا ہی نہ گیا۔ اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

"چچ چچ چچ۔ آئی ایم ویری سوری مس نیلم میرا مقصد آپ کی دل آزاری کرنا نہ تھا۔ میں تو یونہی پوچھ بیٹھا۔ تو۔ اب آپ جاب کر رہی ہیں اپنے گھر میں؟۔ سب سے بڑی ہیں بہن بھائیوں میں۔"

"جی!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کتنے بہن بھائی ہیں آپ لوگ؟"

"تین بھائی اور پانچ بہنیں۔ ایک بہن کی شادی کر دی ہے۔ وقار بھائی کے بعد اب دو بھائی ہیں میرے۔"

"پھر تو آپ کی تنخواہ اس لحاظ سے کم پڑتی ہوگی۔"

"بس سر! شکر ہے خدا کا۔" اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

"مس نیلم! میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ وغیرہ سیکھ لیں۔ پھر میں کوشش کر کے آپ کی پوسٹ تبدیل کر دوں گا اور

سیلری میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو جائے گا۔ میں نے آج آپ کو اس لیے بلایا تھا کہ میرا پی اے دس دن کی چھٹی پر جا رہا ہے۔ شادی ہے اس کی۔ تو ان چند دنوں کے لیے اگر آپ یہ کام کر لیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ آپ کی جگہ مس سیما سنبھال لیں گی۔"

اس نے نظروں میں اُلجھن بھر کر انہیں دیکھا۔

"لیکن سر! میں تو۔"

"نا تجربہ کار ہوں نا؟" وہ مسکرائے۔ "بے فکر رہیں۔ کوئی مشکل نہیں ہو گی۔"

"وہ خاموش رہی۔ کیا کہنا تھا کیا نہیں۔ اسے علم ہی نہ تھا۔

"پھر کل سے آپ یہاں بیٹھیں گی۔ اس ٹیبل پر۔"

انہوں نے کونے میں رکھی چھوٹی میز کی طرف اشارہ کیا

"بہتر سر!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اب میں جاتی ہوں؟"

وہ "بالکل!" وہ خوش دلی سے مسکرائے۔

وہ کمرے سے نکل آئی۔ عجب تذبذب کا شکار ہو رہی تھی۔ بالکل نئے کام کا خیال اسے اُلجھن میں گرفتار کر رہا تھا۔

وہ اپنی سیٹ پر واپس آئی تو لنچ بریک ہو چکا تھا۔ مس نگہت اور زارا بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ وہ مزید کوفت میں مبتلا ہوئی۔

"ہیلو نیلم!" زارا خوشدلی سے بولی تھی۔ "کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔" وہ مختصراً کہہ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"چائے پیو گی؟" مس نگہت نے پوچھا۔

"نہیں۔ پی کر آ رہی ہوں۔"

"عباسی صاحب کے ساتھ؟" زارا عجب انداز میں مسکرائی تھی۔

"نیلم نے زہر بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"دیکھیں مس زارا! انسان کا اپنا ذہن اگر گندا ہو تو اس کی نمائش ہر جگہ کرنا اتنا ضروری کیوں ہوتا ہے۔ آپ سمجھتی ہیں۔ انسان کو اپنی ذہنی پسماندگی پر پردہ ڈالے رکھنا چاہیے۔"

"زارا نے اپنا کپ ٹیبل پر واپس رکھ دیا۔ اور خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے پھر سختی سے بھینچ لیے۔ پھر اچانک وہ کھڑی ہو گئی۔

"سنو مس نیلم علی!" دونوں ہاتھ ٹیبل پر ٹکا کر تھوڑا سا آگے کو جھک کر وہ بولی تھی۔

"مجھے تم پر ترس بھی آتا اور تم سے ہمدردی بھی محسوس ہوتی ہے۔ مجھے تم جو کچھ بھی سمجھتی ہو سمجھو بس میری ایک بات دھیان میں رکھنا۔ یہاں

کسی پر اعتبار مت کرنا۔"

وہ مڑی اور کھٹ کھٹ کرتی ایک طرف کو چل دی۔ نیلم نفرت سے اس کی پشت پر لہراتی پونی کو دیکھتی رہی۔

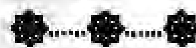
"بہت غلط بات ہے نیلم!" مس بھگت اسے سرزنش کر رہی تھیں۔ "تمہارا یہ رویہ بہت غلط تھا۔"

"یہ۔ یہ لڑکی؟" اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ "یہ مجھے زہر لگتی ہے اس کو دیکھ کر اندر کڑواہٹ بھر جاتی ہے میرے۔ اس سے کہہ دیں، مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش نہ کیا کرے!"

"دیکھو، ہر انسان اپنی اپنی سوچ کے مطابق ہی بات کرتا ہے۔ اب ہم کسی کو سولی پر تو نہیں چڑھا سکتے نا۔ اس کی باتیں بری لگتی ہیں تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرو۔ لیکن اس طرح کسی کی بے عزتی کر دینا تو بری بات ہے نا! اور پھر وہ تو ہمیں بہت پسند کرتی ہے۔ محض تم سے ملنے ہی یہاں آتی ہے۔"

"یہ مہربانی وہ نہ ہی کیا کرے تو اچھا ہے۔" وہ جھلائی۔

مس بھگت اسے دیکھ کر رہ گئیں۔



گاڑی کئی موڑ کاٹ کر ایک چھوٹی سی گلی کے کونے پر رک گئی تھی۔

"وہ پہلا دروازہ ہے امی جان! سفید رنگ کا۔"

"کتنے بجے تک آ جاؤ گے؟" وہ اترتے ہوئے بولیں۔

"بس ایک گھنٹے میں آتا ہوں!" بہروز احمد گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔

عفت خانم کاندھوں پر شال سنبھالتی ہوئی دروازے تک جا پہنچیں۔ بہروز احمد گاڑی آگے بڑھا لے گئے انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے دروازے پر دستک دی تھی۔ دروازہ کھلا ان کے سامنے سترہ اٹھارہ برس کی ایک معصوم شکل لڑکی کھڑی تھی۔

"جی!" وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"بیٹا! آپ کی امی ہیں گھر پر؟"

"جی ہاں۔ آپ کون ہیں؟"

"میں بہروز احمد کی والدہ ہوں۔" وہ مسکرائیں۔

"غزالہ بیٹی! کون ہے؟"

کوئی خاتون تھیں جو اندر سے پکار رہی تھیں۔

"آئیں جی۔ اندر آ جائیں۔"

وہ اس کی ہمراہی میں اندر داخل ہو گئیں۔ تین کمروں، چھوٹے سے دالان اور صحن پر مشتمل پورا گھر نظروں کے سامنے تھا۔

صحن کی مغربی دیوار کے ساتھ ساتھ باورچی خانہ اور غسلخانہ تھا۔ ان کی نظریں اندر آتی خاتون پر ٹھہریں۔

"السلام علیکم!" انہوں نے سلام میں پہل کی۔ "میں بہروز کی والدہ ہوں۔"

"اوہ! آیئے آیئے۔ تشریف رکھیے۔"

خاتون کے انداز میں اچانک ہی گرم جوشی در آئی۔ عفت خانم کا ہاتھ تھام کر وہ انہیں کری تک لے آئیں۔

"بیٹھیں بہن! غزالہ، بیٹی چائے تو بنالو۔"

آپ سے شاید آپ کے بھائی نے بہروز کا ذکر کیا ہو۔" انہوں نے بات کا آغاز کیا۔

جی ہاں، جی ہاں۔ مجھ سے ذکر کیا تھا بھائی نے۔" انہوں نے ہاتھ مسلے۔

میں نے سوچا آج مل ہی آؤں۔ بہروز کئی دن سے مجھے کہہ رہے تھے۔ دراصل میری بھتیجیاں آئی ہوئی تھیں لاہور سے۔ انہیں کی وجہ سے کچھ دیر ہو گئی۔" انہوں نے وضاحت کی۔

"کتنی بیٹیاں ہیں آپ کی؟" انہوں نے ایک نظر چاروں طرف دوڑا کر پوچھا۔

جی۔ میری تین بیٹیاں ہیں۔ غزالہ سب سے بڑی ہے۔ اسی کی فکر رہتی ہے مجھے۔"

"یہ بچی!" عفت خانم حیران رہ گئیں۔ "جس نے دروازہ کھولا تھا؟"

"جی ہاں!" وہ مسکرائیں۔ "انٹر کا امتحان دے رہی ہے۔"

عفت خانم خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگیں۔ بہروز احمد تیس سے کچھ اوپر ہی کے تھے۔ نہ نہ کر کے انہوں نے کتنا ہی عرصہ نکال دیا تھا اور نہ وہ تو کب سے اپنے دل میں ان کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان لیے بیٹھی تھیں۔ اور اب انہیں اندازہ تھا کہ شاید بہروز احمد کو کوئی کم سن لڑکی پسند بھی نہ آتی۔ ان کے لحاظ سے تو کوئی چوبیس، پچیس سال کی لڑکی ہی ٹھیک رہتی۔ اور یہ لڑکی جس نے ان کے لیے دروازہ کھولا تھا بمشکل اٹھارہ سال کی تھی۔ چہرے پر بچپنا بکھرا ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ چائے بنا کر لے آئی۔ انہیں کپ تھما کر وہ جانے لگی تو انہوں نے پکار لیا۔

"بیٹھو بیٹی! کہاں چل دیں؟"

"جی؟" وہ پریشانی سے مڑی۔ "مجھے کھانا بنانا ہے۔"

"بن جائے گا کھانا بھی۔" اس کی ماں کے لہجے میں ہلکی سی سرزنش تھی۔ "وہ کہہ رہی ہیں تو بیٹھ جاؤ نا!"

وہ وہیں رکھے مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور ناپسندیدگی کے ملے جلے جذبات بکھرے ہوئے تھے۔ عفت خانم کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس عمر کی لڑکیاں اپنے رشتے آنے پر یوں ہی ناک بھوں چڑھایا کرتی ہیں، انہوں نے سوچا تھا۔

"بات دراصل یہ ہے بہن۔!"

غزالہ اٹھ کر اندر چلی گئی تو انہوں نے بات کا آغاز کیا۔

"کہ مجھے تو آپ کی بیٹی بہت اچھی لگی ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ لڑکیاں ہوتی ہی اچھی ہیں۔ بیچاری معصوم بیٹیاں کسے بری لگتی ہیں۔ اور پھر میری کوئی بیٹی نہیں اس لیے میرے دل میں تو چھوٹی چھوٹی بچیوں کے لیے کچھ زیادہ ہی محبت ہے۔"

وہ کچھ دیر کو رکیں۔

"لیکن بات یہ ہے کہ میرے بیٹے کی عمر آپ کی بیٹی کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہے، میرا خیال ہے بارہ چودہ سالوں کا فرق ہو جائے گا۔"

"ارے بہن۔ لڑکے کی عمر کون دیکھتا ہے۔" وہ خاتون خوشدلی سے ہنسیں۔ "آج کل کے دور میں ایسے فرق دیکھنے اور ان پر غور کرنے کا کس میں یارا ہے۔ ہمیں تو اپنی بیٹی ایک شریف اور باعزت گھرانے میں بیاہنی ہے۔ اور بس۔ اور آپ کو تو شکل دیکھ کر آپ کی شرافت اور نجابت کی قسم کھائی جا سکتی ہے، ویسے بھی شریف نے مجھے آپ لوگوں کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے۔ ہمیں تو بہروز میاں کا رشتہ غزالہ کے لیے دل و جان سے منظور ہے۔"

عفت خانم خاموش ہو گئیں۔ وہ خاتون سب کچھ جیسے طے ہی کیے بیٹھی تھیں۔ ویسے لڑکی تو انہیں..... بھی پسند آ گئی تھی۔ حسین چہرے والی تو عمر لڑکی پہلی نظر میں انہیں بھا گئی تھی۔ شاید لڑکیوں کو ترسی ہوئی تھیں، اس لیے ہر چہرہ بھلا لگتا تھا۔ یا شاید یہاں کی فطری سادگی ہی تھی کہ وہ کسی کو بھی برا کچھ ہی نہیں سکتی تھیں۔

بہروز احمد انہیں لینے آئے تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"پھر کب تشریف لائیے گا بہن!" خاتون کے انداز میں خوشامد سی تھی۔

"انشاء اللہ جلد آؤں گی!" وہ مسکرائیں۔ "رشتے ناتے تو اوپر ہی طے ہوتے ہیں۔ ہم بندے بھلا کیا کرنے کے قابل ہیں۔"

"کیسے لوگ ہیں امی جان؟"

بہروز چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولے تھے۔

"مجھے تو اچھے ہی لگے۔" وہ بولیں۔ "لیکن اس قدر عجلت بھی مناسب نہیں ذرا دیکھ بھال کر ہی قدم اٹھانا ہے۔"

"جی بہتر!" وہ مودبانہ انداز میں بولے۔

"تم بھی اپنے طور پر پتا کر لو۔ ایک آدھ چکر میں لگاؤں گی پھر کسی بھی دن بات پکی کر کے انگوٹھی پہنا آؤں گی۔ اب میں بھی مزید تاخیر بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔"

انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"تھک گئی ہوں تنہا بیٹھے بیٹھے۔"

"سیٹ کی پشت سے سر ٹیک کر انہوں نے آنکھیں موند لیں۔



کئی دن سے وہ کمرہ صاف کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ شادی سے پہلے وہ سب بہنوں میں سب سے زیادہ پھرتیلی تھی۔ جو کام کرنے کا سوچتی، چند منٹوں میں کر کے رکھ دیتی تھی۔ اور اب نجانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ کسی کام کو شروع کرنے سے پہلے جتنی وہ منصوبہ بندی ہی کرتی رہ جاتی اور اکثر ایسا ہوتا کہ کام اس کے بعد بھی نہ ہو پاتا۔ ہر چند کہ سسرال میں آ کر تو ایسا کوئی خاص کام تھا بھی نہیں۔ صبح کا کھانا ثریا تیار کرتی تو شام کا وہ۔ ناشتا چچی جان بنا لیتی تھیں۔ نیچے کے پورشن کی صفائی کرنے ماسی آیا کرتی تھی۔ اوپر وہ اور ثریا اپنے اپنے کمرے کی صفائی کر لیا کرتی تھیں۔ کپڑے بھی اپنے اپنے دھو لیا کرتے تھے۔ کسی فرد واحد پر کام کا زیادہ بوجھ نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ دو ہفتوں میں کہیں جا کر کمرے کی صفائی کیا کرتی تھی۔ کپڑے جمع ہو ہو کر ایک ڈھیر کی صورت اختیار کر لیتے تو انہیں دھونے بیٹھتی تھی۔

"کم بخت جی کسی کام میں راضی ہوتا ہی نہیں ہے۔"

کمرے کے جالے اتارتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

"کیسا گندہ ہو رہا ہے کمرہ۔ آنے جانے والے کیا سوچتے ہوں گے، کیسی بد حرام لڑکی ہے۔ ثریا کتنا چمکا کے رکھتی ہے اپنے حصے کو۔ آج تو ہر شے صاف کر ڈالوں گی۔"

جالے اتار کر اس نے ہر شے کی جھاڑ پونچھ کی۔ بستر کی چادر تبدیل کی۔ کرسیوں کے کور تبدیل کیے۔ فرش رگڑ رگڑ کر چمکا دیا۔

کمرہ بالکل صاف ہو گیا تو وہ الماریوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ہر ہر خانے میں بے تحاشا کپڑے ٹھنسے ہوئے تھے۔ ایک عرصے سے اس نے اپنے اور یوسف کے کپڑوں پر استری کر کے انہیں ہینگروں میں نہ لٹکایا تھا۔ دھو کر یونہی کسی خانے میں ٹھونس دیا کرتی تھی۔

"سب سوچتے ہوں گے، پہلے کیسی سلیقہ شعار بنتی تھی۔ کپڑوں کا کتنا خیال رکھا کرتی تھی۔ کڑھائیاں کرنا، بکلف لگانا، خوب استری کر کے کپڑے پہننا۔ سب دل کے کھیل ہیں۔ یہ راضی تو سب راضی!"

اس نے سارے خانوں میں سے کپڑے نکال لیے۔ اپنے اور یوسف کے کپڑے الگ الگ کیے پھر استری کا پلگ لگا کر کپڑے پریس کرنے بیٹھ گئی۔

نجانے کیسا خیال تھا جو اچانک ہی دماغ میں در آیا۔ پوری الماری اس کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ زیورات کے ڈبے بھی اوپر کے خانے کے ایک کونے میں پڑے تھے۔ بس ایک نچلا خانہ تھا جو مقفل تھا۔

"اس میں آخر کیا ہے جو یہ مقفل ہے۔" وہ اس پر طبع آزمائی کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ "میرا زیور بھی ایسے ہی کھلا پڑا ہے۔ سامنے ہی سامنے کوئی آ جائے تو ہاتھ صاف کرنے میں دیر نہ لگائے۔ اس منحوس خانے کو نجانے کس الا بلا سے بھر کر مقفل کر دیا ہے۔ اسے کھول کر زیور اس میں رکھتی ہوں۔"

اس نے کئی مرتبہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ایک چھوٹی سی چابی پڑی دیکھی تھی۔ اسے خیال آیا تو اٹھ کر وہ چابی نکال لائی۔ چابی واقعی اسی سیف کی تھی۔

سیف کھول کر اس نے جھک کر سارا سامان اس میں سے نکال لیا۔

چند ڈائریاں تھیں۔ کچھ تصاویر تھیں۔ وہ ایک کے بعد ایک دیکھتی رہی اور اس کے دماغ میں بارود بھرتا گیا۔

وہ سب نیلم کی تصاویر تھیں۔ بچپن سے لے کر اب تک مختلف مواقع پر اتاری گئی تصاویر، بے شمار تصاویر تھیں۔ کوئی کوئی تصویر کسی گروپ فوٹو میں سے کاٹ کر نکالی گئی تھی۔ تصاویر ایک طرف ڈال کر اس نے ایک ڈائری کھول لی۔ ہر ڈائری کا ہر صفحہ صرف اور صرف نیلم کے ذکر سے بھرا ہوا تھا۔ اشعار تھے، تشبیہات تھیں، استعارے تھے۔ اس کے حسن کو کس کس طرح سے انہوں نے خراج پیش نہ کیا تھا۔

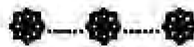
وہ پڑھتی رہی، پڑھتی رہی اور اس کے دماغ میں بارودی سرنگیں پھٹتی رہیں۔ کتنی ملاقاتوں اور ان ملاقاتوں میں ہونے والی باتوں کی تفصیل انہوں نے لکھی تھی۔ کوئی ملاقات چھت پر ہوئی تھی تو کوئی خاندان میں ہونے والی کسی دعوت میں۔ کوئی کوئی ملاقات محض نظروں کی ملیک سلیک پر مشتمل تھی۔

آخر کار اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ڈائری ایک طرف ڈال دی۔ اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔

کس شخص سے اس کا تعلق جوڑا گیا تھا۔ جس کی زندگی لمحہ لمحہ کسی اور کی یاد سے بندھا ہوا تھا۔ جس کے دامن میں اس کے لیے کچھ نہ تھا۔ کچھ بھی نہ تھا۔

"کیسے قبول کرلیا تھا آپ نے مجھے اپنے نکاح میں کس دل سے تین مرتبہ ہاں کہی تھی۔ آپ کا تو رواں رواں "نہ" کر رہا ہوگا۔ کتنے منافق ہوتے ہیں یہ مرد۔ خول در خول تہہ در تہہ۔"

"وہ بے دلی سے ساری چیزیں واپس رکھنے لگی۔ سیف لاک کرکے اس نے کپڑوں کے ڈھیر کو دیکھا۔ پھر سارے کپڑے اٹھا کر واپس خانوں میں ٹھونسنے لگی۔



وہ اماں کو بتا کر آئی تھی کہ وہ دیر سے لوٹے گی۔ آج وہ شبنم سے ملنے کا ارادہ کرکے گھر سے نکلی تھی۔

وین سے وہ اپنے اسٹاپ سے بہت پیچھے اتر گئی تھی۔ وہاں سے رکشہ کرکے وہ شبنم کے گھر اتر گئی۔

"بیل بجاتے ہی اس کا دل مختلف خدشات کا شکار تھا، شبنم، اپنی سگی بہن سے ملنے کے خیال سے اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ نجانے اس کا رویہ کیسا ہو۔ نجانے وہ کس طرح بات کرے۔ بات کرے بھی یا نہ کرے۔ صاف انکار ہی کردے۔

دروازہ ثریا نے کھولا تھا۔

"ہائے نیلم۔ تم!" وہ بے تحاشا خوش ہوئی۔

"السلام علیکم!" وہ مسکرائی۔ "شبنم ہے ناں۔"

"ہاں ہاں بالکل۔ وہ کہاں جاتی ہے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی۔ وحیدہ چچی صحن میں اپنا پاندان سامنے رکھے بیٹھی تھیں۔

"السلام علیکم چچی جان" وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

"وعلیکم السلام۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

انداز میں وہی ہمیشہ والی سرد مہری تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟" اس کا گلا خشک ہونے لگا۔

"ٹھیک ہی ہوں۔ مجھے کیا ہونا ہے۔" وہ پاندان کی سمت متوجہ ہو گئیں۔

"شبنم!" اس نے شرمندہ ہو کر ثریا کو دیکھا۔ "شبنم کہاں ہے؟"

"ہاں۔ میں بلا کر لاتی ہوں۔"

ثریا نے ایک نظر ساس کو دیکھا اور اوپر کی سمت بڑھ گئی۔

"کیسے آنا ہوا؟" وہ مختلف گلیاں جھانک رہی تھی۔

"جی۔ وہ کئی روز سے شبنم آئی نہیں ناں۔ میں نے سوچا۔ خیریت پتا کر آؤں۔"

"ہاں! تمہیں چاہیے کہ اس کا خیال کرو تم چاہو تو شاید وہ خوش بھی رہ سکے۔"

"میں کچھ نہیں چچی جان!" اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

"اتنی ناسمجھ بھی نہیں ہو۔" انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ "یوسف میاں آتے تو رہتے ہوں گے تمہاری طرف؟"

"وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ گلا خشک تھا۔ اس میں مزید کانٹے سے اگ آئے۔ جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

"چچی جان نے اتنا بھی لحاظ نہ کیا تھا کہ وہ اس گھر میں کتنے عرصے کے بعد اور کس حیثیت سے آئی تھی۔ اسے وہاں بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی جب ثریا اوپر سے اتری۔ اس کے چہرے پر پریشانی سی تھی۔

"وہ نیلم! ایسا ہے کہ شبنم شاید سو رہی ہے۔ تم اوپر جا کر کیوں نہیں مل لیتیں اس سے۔ میں تب تک چائے بناتی ہوں۔"

اسے ایسا لگا کسی نے اس کے منہ پر بھری محفل میں کس کر طمانچہ مارا۔ یہ بالکل واضح تھا کہ شبنم نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔

چچی جان کھنکھاریں اور تخت سے پاؤں لٹکا کر اپنی چپل ڈھونڈنے لگیں۔ وہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

کچھ دیر وہ وہاں بالکل تنہا کھڑی رہی۔ چچی اندر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ اور ثریا کچن میں تھی۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی وہ سیڑھیوں کی سمت بڑھ گئی۔

جب ایک بار یہاں آنے کی ہمت کر ہی لی ہے تو ملے بغیر لوٹ جانا بے معنی تھا۔ اب تو چاہے شبنم اسے گالیاں دیتی یا تھپڑوں سے نوازتی،

اسے مل کر جانا تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی شبنم بازو آنکھوں پر رکھے لیٹی تھی۔

"شبنم!" اس نے شبنم کے قریب کھڑے ہوتے ہوئے پکارا۔

شبنم نے بازو آنکھوں پر سے ہٹایا۔ اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

"کیسی ہو؟" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کیسی نظر آتی ہوں بجو؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

نیلم اسے دیکھتی رہ گئی۔ کچھ ہی دن میں وہ مکمل کرد ھانچہ سی بن گئی تھی۔ گالوں پر زردیاں کھنڈی ہوئی تھیں جیسے وہ عرصے سے بیمار رہی ہو۔ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کافی دیر سے روتی رہی ہے۔ اس کا جی چاہا وہ دوڑ کر اس سے لپٹ جائے۔

"کیا ہوا شبو؟" وہ کانپتی آواز میں محض اتنا ہی پوچھ سکی۔

"پوچھنے آئی ہو یا میرا حال اپنی آنکھوں سے دیکھنے آئی ہو؟ یہ دیکھنے جو زخم تم نے تحفتاً مجھے دیے ہیں وہ بھر گئے ہیں۔ یا ابھی تک رستے ہیں۔ خوش ہو جاؤ بجو کہ یہ زخم اب ناسور بننے چلے ہیں۔ ایسا ناسور جو جان لے کر ہی چھوڑتے ہیں۔ ہاں رات کی تنہائیوں میں اتنا ضرور سوچا کرو، بجو کہ میں نے تمہارے ساتھ کون سی برائی کی تھی جس کا صلہ تم نے میری زندگی اجاڑ کر دیا ہے

مجھے دیکھنے آئی تھیں ناں؟ بس دیکھ چکیں تو اب لوٹ جاؤ۔ ہاں اگر کسی اور وجہ سے آئی ہو تو جاؤ نیچے جا کر انتظار کرو۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔"

اپنی بات مکمل کر کے اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ واقعی ایسا مریض لگ رہی تھی جو موت کی دہلیز پر کھڑا ہو۔

نیلم دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ اس نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ اس کے کانوں میں قطرہ قطرہ زہر بن کر ٹپکا تھا۔ اور اسے اپنا پورا وجود نیلا پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

اسے لگا کہ اس کے پاس ایسا کوئی حرف نہ تھا جسے شبنم کے قدموں میں رکھ کر وہ اس سے معافی طلب کر پاتی۔ اسے لگا وہ ساری عمر کے لیے نامراد قرار دے دی گئی ہے۔ ہر دروازہ اس پر بند تھا، معافی کا تو بہ کا۔ بس ایک سزا کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا جہاں سے جہنم کی آگ کی گرم گرم لپٹیں آ کر اس کا جسم جھلسا رہی تھیں۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھیں لیے اُلٹے قدموں لوٹ گئی۔



"بہن! بات یہ ہے کہ ہم لوگ جلد از جلد اس قرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ بیٹی کا بار تو امیر غریب سب کے لیے ہی ہوتا ہے۔ لیکن غریب لوگ تو اس کو ایک قرض کی طرح سے اپنے ذہنوں پر سوار کیے رکھتے ہیں۔ جس قدر جلد ادا ہو جائے، اتنا ہی اچھا۔"

"مجھے آپ کی بات سے پورا پورا اتفاق ہے۔" عفت خانم مسکرائیں۔ "لیکن آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آپ سے زیادہ جلدی تو مجھے ہے۔ میں نے بھی اس مبارک وقت کا بہت بہت انتظار کیا ہے۔ میرے گھر میں خوشیوں کے دیپ جلیں، چراغاں ہو، مبارک قدم اتریں۔ اس انتظار کے سوا میرے گھر میں تھا ہی کیا۔ اب خدا یہ وقت لایا ہے تو میں مزید تاخیر بالکل بھی نہیں چاہوں گی۔ آج انگوٹھی پہنا کر جا رہی ہوں۔ اگلی دفعہ انشاءاللہ شادی کی تاریخ ٹھہرانے ہی آؤں گی۔"

"انشاءاللہ۔" خاتون کی خوشی قابل دید تھی۔

اور انہیں بھلا کیا چاہیے تھا۔ ایک اعلیٰ خاندان کا خوش شکل وخوش سیرت جوان انہیں اپنی بیٹی کی قسمت کا انعام لگ رہا تھا۔ بغیر کسی لالچ کے، بناء کسی شرط کے وہ ان کی لڑکی کو اپنے گھر کی رانی بنا کر لے جا رہے تھے۔ اس سے زیادہ انہیں کیا چاہیے تھا۔

عفت خانم نے غزالہ کو انگوٹھی پہنا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

"خدا لمبی عمر دے، خوشیاں دے۔ میرے گھر میں مبارک قدم لے کر اترو۔"

انہوں نے ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

جنا بائی نے بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور شگون کی مٹھائی کھلائی۔

"جگ جگ جیو۔ راج کرو۔"

مردانے میں بہروز احمد اور فیروز احمد بیٹھے تھے۔ انہیں وہاں مٹھائی بھیج دی گئی۔

"اچھا بہن اب ہم چلیں گے۔"

کچھ دیر میں عفت خانم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آپ لوگوں کو کسی قسم کا تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا کا شکر ہے اس نے کسی چیز کی کمی نہیں دی۔ بس ہمیں آپ کی بیٹی کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ میں جلد آ کر تاریخ ٹھہرا جاؤں گی!"

غزالہ کی امی نے فرط مسرت سے ان کا ہاتھ چوم لیا۔

"خوشی سے آئیں جب بھی چاہیں۔ آپ کا اپنا گھر۔ آپ کی اپنی بیٹی ہے۔ آپ جیسے لوگ تو قسمت والوں کو ملتے ہیں۔"

وہ اپنے بیٹوں کے ہمراہ باہر نکل آئیں۔

"شہروز ہوتا تو ایک قیامت مچا دیتا۔"

وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔

"بھلا اس وقت اتنی خاموشی رہنے دیتا ان کے گھر میں۔ انہیں ایسا لگتا کہ ہم آج ہی بارات لے آئے ہیں۔"

بہروز احمد دھیرے سے ہنس دیے۔

"آپ مطمئن تو ہیں ناں امی؟"

"شکر ہے خدا کا۔اس نے نیک لوگوں سے سامنا کرایا۔" وہ پرسکون لہجے میں بولی تھیں۔

"بچی بھی بہت پیاری ہے۔مجال ہے جو دوبارہ سامنے آ جائے۔نجانے ہمیں دیکھ کر کس کونے میں دبک جاتی ہے جا کر۔"

"اس عمر کی بچیاں ایسی ہی شرمیلی ہوتی ہیں باجی!" جمنا نے دانت نکالے۔"ہاں لڑکے تیز ہوتے ہیں۔"

"شہروز ہے؟"۔فیروز احمد نے ہنس کر دریافت کیا تھا۔

عفت خانم نے پرسکون انداز میں اپنا سر پیچھے ٹکا دیا۔مدتوں بعد ان کے گھر میں خوشی کی کوئی لہر آئی تھی۔



وہ ابھی ابھی سو کر اٹھا تھا۔

نہانے کا ارادہ کر کے پھر اس نے ترک کر دیا۔دل ابھی ہی چائے پینے کو چاہ رہا تھا۔تولیہ یونہی کاندھے پر ڈالے وہ کمرے سے نکل آیا۔

عفت خانم عصر کی نماز سے فارغ ہو کر تسبیح پڑھ رہی تھیں۔جمنا کچن میں رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔

"جمنا بائی! اگر زحمت نہ ہو تو چائے پلا دو۔"

"زحمت کا ہے کی۔" جمنا مسکرائی۔"تم چل کر امی کے پاس بیٹھو،ہم ابھی لاتے ہیں چائے۔باجی کا بھی چائے پینے کا وقت ہے۔"

وہ میز پر پڑا ہوا صبح کا اخبار اٹھاتا،ماں کے پاس آ بیٹھا۔

انہوں نے تسبیح ختم کر کے دعا مانگی پھر اس کے چہرہ تھام کر اس پر پھونک ماری۔

"آج گئے نہیں؟"

"بس امی۔سو گیا بیٹا" وہ اخبار کی سمت متوجہ تھا۔

"نتیجہ کب آ رہا ہے۔تمہارا؟"

"بہت جلد۔چند روز میں متوقع ہے۔"

"دیکھو بیٹا۔خدا تمہیں کامیاب کرے۔بڑے درجے پر پہنچائے۔پھر اس کے بعد تمہیں بھی شہروز کا ہاتھ بٹانا ہے۔"

"ضرور۔" اس نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔"بھائی جان اور شہروز کا ہی خیال رہتا ہے آپ کو۔"

عفت خانم نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"ماں کی محبت پر بھی شک ہے تمہیں؟ دل کھول کر دکھا سکتی تو تم تینوں کو ضرور دکھاتی۔اور بھلا اس دل میں ہو بھی کیا سکتا ہے بیٹا! میری تو زندگی ہی تو تم تینوں کی محبت ہے۔میرے لیے جس طرح اپنی آنکھوں میں فرق کرنا دشوار ہے اسی طرح یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکتی کہ میرے دل میں کس کی محبت زیادہ ہے۔ہاں،البتہ میں تم سے ضرور یہ شکایت کر سکتی ہوں۔"

"نہیں امی! مجھے غلط نہ سمجھنا!" وہ پھر سنجیدہ ہو گیا۔ "یہی تو مشکل ہے کہ کوئی کسی کو اپنا دل کھول کر نہیں دکھا سکتا۔"

"نہیں بیٹا! مجھے تم سے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔" وہ محبت سے بولیں "خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ خوشیاں دے۔ کامیابیاں دے۔ اور بھلا مجھے کیا چاہیے۔ آج دو گھڑی کو ماں کے پاس آ بیٹھے ہو تو کتنا اچھا لگ رہا ہے مجھے۔"

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

کال بیل بجی تو وہ اٹھ کر گیٹ کھولنے چل دیا۔

باہر نجمہ بیگم اور صبا کھڑی تھیں۔

"السلام علیکم!" وہ ایک طرف کو ہو گیا۔ "تشریف لائیے۔"

اندر آتی صبا نے دانستہ ایک لمحہ بھی نہ اٹھائی تھی۔ فیروز احمد نے بھی اگلی نظر ڈالنے کی جرات نہ کی۔ سر جھکا کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔

"جمنا بائی! چائے مجھے میرے کمرے میں ہی دے جانا۔"

جمنا کو ہدایت دے کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ چند روز قبل والا واقعہ اپنی پوری تازگی کے ساتھ اس کے ذہن میں موجود تھا۔ وہ صبا سے نظر ملانے کی ہمت نہ کر سکا۔ کمرے میں آ کر وہ پہلے کوئی کتاب دیکھتا رہا۔ پھر کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔

"بیٹا! تمہارا فون ہے۔ اور باجی کہہ رہی ہیں، آ کر چائے وہیں پی لو۔"

جمنا نے اندر جھانک کر اطلاع دی تو وہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ پھر کچھ سوچ کر باہر نکل آیا۔

ٹیلی فون سیٹ وہیں لاؤنج میں رکھا تھا۔ اس کے کسی دوست کا فون تھا۔ اس نے مختصر بات کر کے فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

"فیروز!" عفت خانم نے آواز دے ڈالی۔

"بیٹا! چائے لے لو۔"

مجبوراً اسے کپ لے کر وہیں کرسی پر ٹکنا پڑا۔ چائے کا کپ لیتے ہوئے اس نے کپ سے نظر اٹھائی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے انہیں تک رہی تھی۔

"ایک ہی بیٹی ہے آپ کی تو" عفت خانم کہہ رہی تھیں۔ "گھر سونا کر جائے گی آپ کا۔"

"بس بہن! اس کا گھر آباد رہے۔ یہ خوش رہے۔ اسی میں ہماری خوشی ہے۔ گھر تو خوشیوں سے آباد لگتے ہیں۔ ورنہ تو بھرے پرے گھرانوں میں بھی خاموشیاں بول سکتی ہیں۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔" عفت خانم نے تائید کی۔

"آپ سب لوگ آئیے گا۔ شہروز کے نہ ہونے کا مجھے بڑا افسوس ہے۔ کہاں وہ ہر پل اس کے ساتھ ہوتا تھا اور کہاں اس خوشی کے موقعے پر غائب ہے۔ فیروز بیٹا! آپ بھی ضرور آئیے گا۔" نجمہ بیگم اس سے مخاطب تھیں۔

"جی؟" اس نے نظریں اٹھائیں۔ "کوئی تقریب ہے؟"

"صبا کی منگنی ہے۔" وہ مسکرائیں۔ "پرسوں شام کو۔ اسی سلسلے میں ہلکی پھلکی سی تقریب ہے۔"

نجانے صبا کا وہم تھا یا حقیقت تھی۔ اس کی آنکھوں میں دھندی اتری تھی۔ چہرے پر سایہ سا لہرایا تھا۔ کسی اذیت کا نشان تھا یا محض اس کا وہم۔ وہ سمجھ نہ پائی۔

وہ دونوں ہاتھوں میں کپ تھامے سر جھکائے بیٹھا تھا۔



شام اپنے سرمئی پر سمیٹ کر افق کے پار روانہ ہونے کی جستجو میں تھی اور رات کا اندھیرا دھیرے دھیرے اس کی جگہ پر کر رہا تھا۔

ڈرائنگ روم کی گلاس وال سے باہر جھانکتی صبا کو کاندھے پر کسی نے دھیرے سے ہاتھ رکھا تھا۔

وہ چونک کر مڑی۔ نجمہ خاتون مسکرا رہی تھیں۔

"کیا بات ہے؟ کس کا انتظار ہے میری بچی کو؟"

"الماس کا۔" اس نے رکا ہوا سانس خارج کیا۔

تم نے فون تو کر دیا تھا ناں؟"

"جی۔ کل سے چار پانچ مرتبہ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ہر بار یہی جواب ملتا ہے کہ وہ گھر میں نہیں ہیں۔ نجانے کہاں گئی ہوئی تھی۔ پھر میں نے میسج چھوڑ دیا۔ پتا نہیں اسے ملا بھی یا نہیں۔"

"ایک بار اور رنگ کر لو۔"

"نہیں امی۔ بس ٹھیک ہے۔"

اس نے پردے کا کونا ہٹا کر ایک بار پھر جھانکا۔

"اسے آنا ہوگا تو میسج ملنے پر بھی آ جائے گی۔ ابو نے کتنے لوگ بلا لیے ہیں۔"

اس گھر کی پہلی خوشی ہے۔ جتنا اہتمام کیا جائے کم ہے۔" وہ مسکرائیں۔

"برابر سے۔" وہ بولتے بولتے رُک گئی۔ ہونٹ بھینچ لیے۔

"ہاں حشمت خانم تو آ گئی ہیں۔" نجمہ خاتون اس کا مطلب سمجھ کر بولی تھیں۔ "وہ اندر نماز پڑھ رہی ہیں۔ شہروز تو تم جانتی ہو، لاہور سے لوٹا ہی نہیں۔ اچھا۔ میں ذرا باہر مہمانوں کو دیکھوں۔ تمہارے ابو کہاں دھیان رکھتے ہیں کسی بات کا۔"

"میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں امی!"

اس نے باہر جاتی نجمہ خاتون کو مطلع کیا تھا۔

پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے کمرے کی سمت بڑھ گئی۔

باہر لان میں برقی قمقمے جھلملا اٹھے تھے۔ اور سینے میں دھڑکتا اس کا دل آہستہ آہستہ بجھ رہا تھا اور اس کا دھواں بار بار اس کی آنکھوں کو دھندلا دیتا تھا۔

وہ قد آدم آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اسکن اور میرون کلر کے، احتراج کے انگرکھے اور بڑے سے کامدار دوپٹے میں چھپا اس کا نازک وجود ہمیشہ سے بے حد مختلف لگ رہا تھا۔ متناسب نقوش کو سلیقے سے کیے گئے میک اپ نے گویا زبان عطا کر دی تھی۔ اس کی آنکھیں قید نظر میں آتی ہر شے سے خاطب تھیں۔ لب آپس میں جڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کھڑی ناک میں ہیرے کی لونگ اس کے چہرے پر روشنیاں بکھیر رہی تھی۔ اور ماتھے پر سجا چھوٹا سا ٹیکا اس کے وجود کی خوبصورتی کو دوگنا کیے دے رہا تھا۔

آنکھوں میں بھر آنے والے پانی کو اس نے پلکیں جھپک جھپک کر باہر نکلنے سے روکا اور آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

زندگی میں آنے والا ہی خاص پہلا اہم دن تھا اور اس کا دل کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ وہ جیسے کسی اندھے کنوئیں میں محبوس تھی۔ باہر سے خوشیوں کی چہکتی، چھنکتی آوازیں تو سنائی دیتی تھیں۔ لیکن اندر عجیب سناٹا تھا۔ وہ دیوار سے سر پھوڑتی تھی اور کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔

فیروز احمد جیسے سنگ دل شخص سے محبت کرنے کی سنگین ترین غلطی وہ کر بیٹھی تھی۔ اور اب اسے لگتا تھا کہ اس غلطی کا خمیازہ اسے عمر بھر بھگتنا ہے۔

پچھلے کئی دنوں کی کاوش مسلسل کے باوجود ایک لمحے کے لیے اس کا خیال اپنے دل سے نہ نکال سکی تھی۔

ایک نام تھا جس کی گھنٹی دل کے مندر میں نجانے کب سے بج رہی تھی۔ ایک جہاں تصور تھا کہ عرصے سے آباد تھا۔ اس نے کب اس شخص کو سوچنا شروع کیا تھا، اسے خود بھی یاد نہ تھا پھر بھلا وہ اسے بھلا دینے کا اختیار کہاں سے لاتی؟ اسے یاد تھا۔ اس نے بارہا اس سے کہا تھا کہ اس کے لیے ملاپ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ نہ اس کے قرار کی خواہاں ہے اور نہ شادی کی خواہش مند۔ اسے تو بس اسے دیکھنا، اسے سوچنا اسے پسند کرنا اچھا لگتا ہے اور بس۔

لیکن اسے علم ہوا کہ محبت تو ایک منہ زور، چڑھتا ہوا دریا ہے، جو ایک بار سنگ دل سے پھوٹ نکلے تو صرف آگے بڑھتا جاتا ہے۔ یہ کا ہوا جو بڑھتا ہیں جس میں خواہشوں کو جوار بھاٹا نہ اٹھے۔ یہ چاند کو چاہنے لگے تو اس تک پہنچنے کی تگ و دو میں سر پتھروں پر پٹخ کر بے حال ہو جاتا ہے لیکن چاند کی خواہش کرنا نہیں چھوڑتا۔

فیروز احمد کو چاہنے کے بعد پانے کی تمنا کب اس کے دل میں پھوٹی، اسے خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ اسے تو اب اتنا علم تھا کہ اس کی بے رخی اور گریز کے پتھروں پر سر پٹخ کر اس کی تمنائیں زخمی ہو چکی تھیں۔ امیدیں دم توڑ رہی تھیں۔ خواہشیں بین کر رہی تھیں۔

"تمہارا گریز میری محبت سے جیت گیا فیروز احمد اور میں، میری محبت ہار گئی۔"

اس کے اندر سے ایک سسکی سی ابھری اور اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

"صبا۔!" مانوس آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ دروازے پر الماس کھڑی تھی۔ صبا سب کچھ بھول بھال کر چند لمحے حیرانی سے اسے دیکھتی رہی۔ نفاست سے بنی سنوری الماس اسے بالکل اجنبی لگی۔ جیسے وہ اسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

حیدر آبادی کرتے اور تنگ پاجامے میں ملبوس مغل شہزادیوں کی سی آن بان لیے وہ دروازے کے بیچ میں کھڑی تھی۔ تلے کے کام والے کھسوں میں اس کے پیر سفید کبوتروں کی مانند لگ رہے تھے۔ وہ اتنی خوبصورت نظر آ رہی تھی کہ صبا کو اجنبی لگنے لگی۔

"صبا!" الماس نے مسکرا کر بانہیں پھیلائی تھیں۔ وہ اٹھی اور جا کر اس سے لپٹ گئی۔

"اوہ صبا! کتنا سرپرائزنگ ہے یہ سب کچھ!" اس نے صبا کے گال پر پیار کیا۔ "تم نے مجھے کبھی کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"کیسے بتاتی؟" وہ اداسی سے مسکرائی تھی۔ "تم نے تو عرصہ ہوا، پلٹ کر پوچھا ہی نہیں۔ نجانے کس دنیا میں بستی ہو۔ ملتی ہی نہیں۔"

الماس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ ناچ اٹھی۔

"کتنی پیاری لگ رہی ہو صبا!" الماس نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر دیکھا۔ "پہلی مرتبہ تمہیں اس طرح سجا بنا دیکھا ہے۔"

"اور تم۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔ "یہ اتنا سارا روپ کہاں سے چرا لائی ہو کہ پہچانی نہیں جاتیں۔ حسین تو تم خیر تھیں ہی لیکن یہ شہزادیوں کا سا حسن؟ کہیں تم نے مجھے بتائے بغیر شادی تو نہیں کر لی؟"

الماس کی آنکھوں میں حیرانی چمکی تھی۔ وہ چند لمحے صبا کو دیکھتی رہی۔ پھر دفعتاً اس نے سر جھٹکا اور اسے لے کر بیڈ کی جانب بڑھی۔

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ دانیال ہاشمی صاحب ہیں کون؟ اچانک کہاں سے آ ٹپکے اور وہ فیروز احمد؟ کتنی ڈھیر ساری جواب طلب باتیں ہیں میرے ذہن میں۔"

"نہیں الماس! ابھی نہیں۔" صبا نے التجا کی۔ "میں ذہنی طور پر پہلے ہی بہت زیادہ الجھی ہوئی ہوں۔ مزید الجھنا نہیں چاہتی۔ یہ ساری باتیں کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔"

الماس نے چند لمحے سوچا تھا۔

"جیسی تمہاری مرضی!" پھر اس نے کہا۔ "ویسے میرے پاس بھی تم سے کہنے کو بہت کچھ ہے۔ میرے دماغ میں بھی اتنا بوجھ ہے صبا کہ کبھی کبھی دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔"

صبا نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے ہی تھے کہ خاموش ہو گئی۔ نجمہ خاتون تیزی سے اندر آئی تھیں۔

"الماس! صبا! وہ لوگ آ گئے ہیں۔"

میں صبا کو ذرا دیر میں نیچے لے آؤں گی آنٹی۔ آپ فکر مت کریں۔" الماس شوخی سے مسکرائی۔ "ویسے حضرت ہیں کیسے۔ میں تو دیکھ لوں۔"

وہ اٹھ کر ٹیرس کی جانب بڑھ گئی۔

نجمہ خاتون نے ایک نظر سر جھکائے، ہاتھ ملتی صبا پر ڈالی پھر مسکرا کر باہر نکل گئیں۔

"واؤ۔صبا!" الماس مسکراتی ہوئی پلٹ کر آئی تھیں۔"اتنا ہینڈسم ہے تمہارا منگیتر اور تم یوں منہ لٹکائے بیٹھی ہو۔چلو مسکراؤ۔"

اس نے صبا کو چھیڑا تھا۔

وہ ہولے سے مسکرا دی۔پھر اس نے غور سے الماس کو دیکھا۔

اس کا رویہ ہمیشہ سے بڑا مختلف تھا۔الماس کبھی بھی شوخی سے، چہک کر باتیں کرنے کی عادی نہ رہی تھی۔ ہمیشہ ٹھہر ٹھہر کر، سنبھل سنبھل گفتگو کرتی تھی۔اس کے انداز کا نمایاں ترین وصف اس کا وقار تھا۔اس کی ہر بات میں ایک ٹھہراؤ سا محسوس ہوتا تھا۔لیکن آج وہ بڑے مختلف رویے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔جیسے کوئی ایسی بات اس کے اندر چھپی ہو کہ اس سے سنبھلتی نہ ہو۔بار بار باہر نکلنے کی کوشش کرتی۔شوخی، شرارت کبھی بھی اس کی ادا نہ رہی تھی اور آج وہ بار بار شوخی پر آمادہ نظر آتی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" الماس نے پوچھا تھا۔

"کچھ بھی نہیں۔"اس نے سر جھٹکا۔

"چلو نیچے چلیں۔سارا انتظار ہو رہا ہوگا۔" الماس کھڑی ہوگئی۔

لان میں بہت سے لوگ تھے۔الماس کی ہمراہی میں باہر نکلتی صبا نروس ہونے لگی۔

"الماس پلیز!میں،میں نہیں جاؤں گی۔" وہ واپس پلٹنے لگی تھی۔

"کم۔آن صبا۔"الماس نے اس کا بازو پکڑا۔"ڈونٹ ایکٹ لائک دس۔کیا احمقوں کا سا رویہ ہے"

صبا لب بھینچے، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی سب کے درمیان آگئی۔جھکی جھکی نظروں سے اس نے دانیال کی والدہ اور والد کو سلام کیا۔

الماس نے اسے سہارا دے کر بٹھا دیا تھا۔

"کوئی اور غریب بھی آپ کی توجہ کا طالب ہے اور غالباً مستحق بھی!"

وہ مسکراتا ہوا، بڑے ہی اعتماد سے آکر اس کے برابر بیٹھا تھا۔

"یا ہمیں سلام کرنا اگر آپ کے شایان شان نہیں تو چلیں پہل ہم کر لیتے ہیں۔السلام علیکم؟"

"دانیال بیٹا تنگ نہیں کرتا ہے۔" قریب ہی سے ہنسی آواز ابھری تھی۔

"ہرگز نہیں امی!" وہ مسکرایا۔صرف ان کی ہچکچاہٹ دور کرتی ہے۔"

"صبا!" الماس اس کے دوسری طرف آبیٹھی۔"اس طرح سے کیوں کر رہی ہو؟ ایسا لگ رہا ہے جیسے پورا جسم کانپ رہا ہو۔"

"صبا نے محسوس کیا۔واقعی اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔اسے نجانے کیا ہو رہا تھا۔اسکے وجود میں طوفان سا برپا تھا۔اسکا دل چاہ رہا تھا کہ چیختی چلاتی کسی سمت بھاگ نکلے۔اور اگر یہ نہیں کر سکتی تو کم از کم پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔اسے لگا۔وہ اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہی ہے۔

"السلام علیکم!" اس نے اپنے بالکل قریب ایک مانوس آواز سنی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار آیا نہ نظر اٹھانے پر نظروں پر۔!

سیاہ پینٹ سوٹ اور سیاہ لائنوں والی گرے شرٹ میں ملبوس فیروز احمد اس کے سامنے تھے۔

اس نے صبا کو سلام کیا تھا یا کسی اور کو۔ اسے علم نہ ہو سکا۔ اسے تو بس اتنا علم تھا کہ فیروز احمد نے نگاہ بھر کے اسے دیکھا تھا۔ اور اس کے اندر مچلتی بے قراریوں کو اس نگاہ نے دھیرے دھیرے تھپک کر قرار بخش دیا تھا۔ اس کے اندر جلتی آگ پر ٹھنڈا پانی پڑ گیا تھا۔ ریزہ ریزہ بکھرتے وجود کو سمیٹنے کے لیے وہ ایک نگاہ ہی کافی تھی۔ وہ سامنے پڑی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔ اور بہت سے لوگوں میں بیٹھا شخص ایک عام سا شخص تھا۔

لیکن اس شخص کی ایک نگاہ کے سہارے اس نے دانیال ہاشمی کے ہاتھ سے انگوٹھی بھی چھین لی تھی اور اس کے کئی سوالوں کے جواب بھی بڑے حوصلے سے دیے تھے۔

"یہ کون سی ڈور ہے فیروز احمد۔ جو تمہارے دل سے میرے دل تک آتی ہے۔ جو تمہارے ہر انکار کے باوجود تمہیں کھینچ کر یہاں تک لائی ہے اور جس کے ذریعے تم نے اتنا حوصلہ مجھے بخشا ہے کہ اب میں ہر طوفان سے مقابلہ بڑی ہمت سے کر سکتی ہوں۔ اور یہ درست ہے کہ میری تمنائیں ذخمی ہیں۔ امیدیں دم توڑ چکی ہیں اور خواہشیں بین کر رہی ہیں۔ لیکن میری محبت کا سمندر آج بھی اتنا ہی منہ زور ہے اور تمہاری کشش اپنی جگہ لیکن یہ میری محبت کی کشش ہے جو آج تمہیں یہاں لے آئی ہے۔ اس کھیل میں میری ہار کے باوجود تمہارا دھندلایا ہوا چہرا کہہ رہا ہے کہ جیتے تم بھی نہیں۔ تم بھی نہیں۔"

چہکتے، بولتے لوگوں کے بیچ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش سر جھکائے جیسے ایک دوسرے سے مخاطب تھے۔



"مس علی! میرا خیال ہے کہ آپ کا انتخاب کرتے وقت میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔" عرفان عباسی اس کے ٹائپ کیے ہوئے لیٹرز دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"آپ میں جو گنس چھپے ہوئے ہیں، انہیں میں پوری طرح سے پہچان چکا ہوں۔"

"پتا نہیں سر۔ آپ میرا حوصلہ بڑھا رہے ہیں یا۔" وہ شرمندگی سے انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ "ورنہ مجھے بخوبی علم ہے کہ میں کتنی محدود صلاحیتوں کی مالک ہوں۔ مجھ میں کسی طرح کے کوئی گنس نہیں ہیں۔ بس یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ آپ نے اتنے دن مجھے برداشت کیا ہے۔"

عرفان عباسی کے ساتھ کام کرتے ہوئے آج اس کا دسواں دن تھا۔ اور ان دس دنوں میں انہوں نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

"محض چند دن کی بات ہے۔ آپ کی ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ بہترین ہو جائے گی۔ ڈکٹیشن بھی آپ اچھا لیتی ہیں۔"

وہ احسان مندی کے جذبات سے مغلوب سر جھکائے میز پر آڑی ترچھی لائنیں کھینچ رہی تھی۔

"سر! یہ سب آپ کی مہربانی ہے اتنا کچھ تو میں تین چار ماہ میں بھی نہ سیکھ پاتی جتنا کہ ان دس دنوں میں سیکھ گئی ہوں۔"

"میری مہربانی؟" وہ دھیرے سے ہنسے۔ "مس علی! انسان کا اپنا حوصلہ اور ذاتی محنت شامل حال نہ ہو تو کسی کی مہربانی کچھ کام نہیں آتی۔ جس انتھک محنت کے ساتھ آپ نے سب کچھ سیکھنے کی کوشش کی وہ ہی بہارک امل ہے۔"

نیلم نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے، کرسی کو دائیں بائیں ہلاتے نرم مزاج، مہربان صفت عباسی صاحب اسے بہت اچھے لگے۔

زندگی میں کبھی کسی نے اس کی اور اس کی صلاحیتوں کی اتنے اچھے انداز میں تعریف نہ کی تھی۔ کچھ دیر کو اسے اپنا آپ کتنا معتبر لگنے لگا تھا۔

"کل سے آپ کے پی اے آرہے ہیں سر؟" اسے یک لخت خیال آیا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں؟" وہ مبہم سے انداز میں مسکرائے۔

"میں بھلا کیا چاہ سکتی ہوں سر! آپ نے کہا تھا نا کہ وہ دس دن کی رخصت پر گئے ہیں۔ میں اسی لیے پوچھ رہی تھی۔ آج دس روز پورے ہو چکے ہیں۔"

"وہ رخصت پر نہیں گئے تھے مس علی!" عرفان عباسی کھل کر مسکرا دیے۔ "انہوں نے ریزائن کر دیا تھا۔"

"جی۔!" اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"جی ہاں۔ اگر میں آپ کو یہ بات بتا دیتا تو شاید آپ اس کام کو اپنے لیے مشکل سمجھتے ہوئے اسی وقت انکار کر دیتیں۔ اس لیے میں نے آپ سے صرف دس دن کی بات کی تا کہ آپ بھی کام سمجھ لیں۔ اور مجھے بھی اندازہ ہو جائے کہ آپ یہ کام کر بھی سکتی ہیں یا نہیں۔ اب بتائیے۔ یہ پوسٹ مستقلاً آپ کے حوالے کر دی جائے تو کیسا ہے؟"

"سر!" احساس تشکر سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "میں تو ابھی بھی بے حد نا تجربہ کار ہوں۔"

"آپ سے مجھے کام لینا میرا مسئلہ ہے مس علی!" انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ "بات صرف آپ کی رضامندی کی ہے۔"

"میرے لیے تو انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے۔" وہ مسکرا دی۔

"گڈ۔ پھر ایسا کیجیے کہ سب سے پہلے اپنے لیے اپائنٹمنٹ لیٹر ٹائپ کیجیے۔ اس کے بعد اچھی سی چائے پلوائیں۔"

"بہتر سر۔!" وہ کھڑی ہونے لگی۔

"فی الحال آپ کی سیلری ساڑھے پانچ ہزار روپے مقرر کی گئی ہے۔"

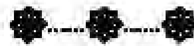
نیلم نے میز کا کونا تھام لیا۔ اتنی جلدی اتنا اضافہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ مارے خوشی کے اس کی سانس رکنے لگی۔

عباسی صاحب اس کے تاثرات بغور دیکھ رہے تھے۔

"اس کے علاوہ بھی آپ کو جب کبھی کوئی پرابلم ہو، آپ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے ڈسکس کر سکتی ہیں۔" وہ دھیرے سے بولے تھے۔ "مسکرایا کریں مس علی! مسکرانے سے انسان کا حوصلہ اور اعتماد بڑھتا ہے۔" وہ اپنی میز کی جانب جاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رکی تھی۔ پھر خاموشی

سے آگے بڑھ گئی۔

اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ دونوں ہاتھوں میں بین تھامے وہ ابھی تک اس کی جانب متوجہ تھے۔
نیلم گھبرا کر ٹائپ رائیٹر میں پیپر لگانے لگی۔



چھٹی کا دن تھا۔ چچی کی ہدایت کے مطابق وہ اور ثریا گرم کپڑوں کو دھوپ لگا رہی تھیں۔

"کتنی خوبصورت شال ہے۔"

"پتہ چچی جان سے میں مانگ لوں گی۔"

"تم پر اچھی بھی لگے گی۔" شبنم مسکرائی۔ "اب چچی جان کی عمر ایسی شالیں پہننے کی نہیں ہے۔ کیسے شوخ رنگوں کی کڑھائی ہے اس پر۔"

"اچھا ذرا اوڑھ کر تو دکھاؤ۔"

"ثریا نے شال اس کے اوپر ڈال دی۔ شبنم مسکرا دی۔

"ماشاءاللہ چشم بددور۔" ثریا نے غالباً چچی کی نقل اُتاری تھی۔

شبنم ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی۔

"شکر ہے، تمہاری قسم ٹوٹی۔" ثریا نے گہری سانس بھری۔ ورنہ ہنسنا تو تمہارے نزدیک کوئی ناقابل معافی جرم ہے گویا۔"

شبنم اب تک ہنس رہی تھی۔ پھر یک لخت اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ یوسف سیڑھیاں چڑھتے اوپر آ گئے تھے۔

انہوں نے آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے شبنم پر نگاہ ڈالی تھی کچھ سورج کی تمازت تھی اور کچھ ہنسنے کا اثر۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ سیاہ کڑھائی کی شال میں وہ دل میں اُتر جانے کی حد تک اچھی لگ رہی تھی۔

وہ چند لمحوں کے لیے اسے دیکھتے رہنے پر مجبور ہوئے۔ اور نجانے ان کی نظروں میں وہ کون سا احساس تھا کہ جس سے شبنم چھتری بن گئی۔ دل میں آہستگی سے کوئی کلی چٹکی تھی۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔

ایک لمحے کے لیے اسے اپنے اور ان کے درمیان قائم رشتے کا شدت سے احساس ہوا۔

"تمہیں امی ناشتے کے لیے بلا رہی ہیں۔" وہ اچانک ہی تلخی سے بولے۔ "تم دونوں کان بند کیے بیٹھی ہو۔"

شاید انہیں ان چند لمحوں میں اپنے کمزور پڑ جانے پر غصہ آ رہا تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ ڑ کے بغیر واپس سیڑھیاں اترنے لگے۔

شبنم اور ثریا نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کھڑی ہو گئیں۔ پھر ثریا نے جیسے ہی قدم اٹھایا۔ اسے نجانے کیا ہوا۔ وہ پوری کی پوری شبنم پر آ گری۔

"ارے ثریا۔ کیا ہوا!" شبنم سخت بدحواس ہو گئی۔ "یوسف۔ یوسف جلدی آئیں۔" وہ گھبراہٹ میں چیخنے لگی۔

یوسف اس کی چیخیں سن کر سیڑھیاں پھلانگتے اوپر آئے۔ یونس بھائی بھی اپنے کمرے سے نکل آئے۔

"ثریا۔ ثریا۔" یونس بھائی نے بے تابی سے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"نیچے لے چلیں بھائی۔ شاید دھوپ میں دیر تک بیٹھنے کا اثر ہے۔" یوسف پریشانی سے بولے۔

اتنی دیر میں ثریا اپنے حواسوں میں آ چکی تھی۔

"یونس!" وہ نقاہت سے بولی۔

"ہاں گڑیا۔ بولو۔ کیا ہوا؟"

وہ کتنی محبت سے اس سے مخاطب تھے۔ شبنم کو اس وقت ثریا دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی نظر آئی۔ اس کا شوہر پورے کا پورا اس کا تھا۔ دل و جان کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ۔ اسے ثریا کی قسمت پر ٹوٹ کر رشک آیا۔

"ارے کیا ہوا ثریا کو!"

وحیدہ چچی اٹھنے میں اپنے بھاری بھرکم وجود کو سنبھالتی اوپر چلی آئیں۔

"ہوا"

انھوں نے یونس بھائی کے ہاتھ ناگواری سے پرے کیے۔

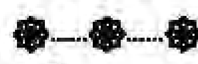
"کیا ہوا لڑکی۔؟"

"بڑے زور سے چکر آیا تھا چچی جان!" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "نجانے کیا ہوا؟"

"چلو شکر ہے خدا کا۔ اس نے مجھے بھی یہ دن دکھایا۔ بڑا ارمان تھا مجھے پوتے پوتیوں کا کھلانے کا۔" چچی جان مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

وہ چاروں پہلے ہونق پن سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر یونس بھائی مسکراتے ہوئے واپس کمرے میں چلے گئے اور یوسف سر جھکا کر سیڑھیاں اتر گئے۔

شبنم کسی گہری سوچ میں گم ثریا کے چہرے پر بکھرتے رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔



وہ کسی کتاب پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ لیکن درحقیقت ان کا دھیان کہیں اور تھا۔ اور ان کو عرصے سے یہ مسئلہ درپیش تھا۔ ذہنی رو بار بار بہکتی تھی۔ لیکن پہلے یہ کیفیت کچھ یوں مختلف تھی کہ وہ الماس کے حسن اور اس کے قرب میں کھوئے رہا کرتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے مسکرا دیتے تھے اور اب جس کیفیت میں وہ مبتلا تھے۔ وہ انھیں پاگل کیے دے رہی تھی۔ دماغ سوچ سوچ کر پھٹا جاتا تھا۔

"میں نے رضا سے نکاح کر لیا ہے۔"

الفاظ تھے کہ بارود اندر جا بیاں بچاتے چلے جاتے تھے۔ سب کچھ ختم ہونے لگتا تھا۔
انہیں تو یہ بھی علم نہ تھا کہ اب انہیں کیا کرنا ہے؟ کس سے کیا کہنا ہے؟ الماس نے تو انہیں یہ اطلاع ایسے دی تھی جیسے وہ اس کے پڑوسی ہوں یا دور کے کوئی عزیز!
جنہیں راہ میں مل جانے پر بڑی سے بڑی خبر بھی عام سے انداز میں سنادی جاتی ہے۔ دروازہ بجا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکے۔
"کون ہے؟" ان کی تھکی تھکی آواز برآمد ہوئی۔
دروازہ کھلا تو کئی شکلیں ایک ساتھ نظر آئیں۔
عاصمہ چچی، راشدہ بیگم، مہناز، سیماب ایک ساتھ اندر گھس آئیں۔
"خیریت!" انہوں نے تشویش سے ان سب کی سمت دیکھا۔
"ہاں، ہاں خیریت ہے۔" عاصمہ چچی ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "یونہی ایک بات کرنی تھی تم سے!"
وہ جانتے تھے یہ بات "یونہی" نہیں تھی۔ یقیناً کوئی اہم مسئلہ تھا۔ جس کے لیے وہ سب کے سب ایک ساتھ آئی تھیں۔
"جی!" وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ "فرمایئے!"
"عثمان بیٹے! شادی کے متعلق تمہارا کیا ارادہ ہے؟" راشدہ بیگم نے بالکل سیدھی سیدھی بات کی۔
"کس کی شادی چچی جان؟" انہوں نے انجان بننے کی حد کردی۔
"تمہاری اور الماس کی بیٹے! دراصل مہناز کے سسرال والے تاریخ مانگ رہے ہیں اور میں دونوں بیٹیوں کی شادی ساتھ کرنا چاہتی ہوں۔ ہم نے سوچا تم سے تمہاری رائے بھی معلوم کرلی جائے۔!"
"میری رائے!" وہ چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گئے۔ "میری رائے اب کیا اہمیت رکھتی ہے چچی جان!"
"ہم جانتے ہیں بیٹے کہ تمہیں اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بات الماس کی ہے۔" عاصمہ چچی نے لب کشائی کی۔ "وہی اس ضد پر قائم ہے کہ اس کو ابھی شادی کی جلدی نہیں۔ اسی لیے ہم سب نے مل کر اس پر زور ڈالنے کا فیصلہ کیا ہے اور تمہیں بھی ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔ نجانے کیوں تم اب تک اس کا ساتھ دیتے آئے ہو۔!"
"مجھ سے آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟" وہ پریشان ہو اٹھے۔
"یہی کہ ہمارے ساتھ چلو۔ وہ اپنے کمرے میں ہے۔ سب مل کر اس سے بات کرتے ہیں۔ بلکہ اسے محض آگاہ کردیتے ہیں کہ ہمارے کیا ارادے ہیں۔ مہناز کے سسرال والے تو اگلے مہینے کی کوئی تاریخ مانگ رہے ہیں۔"
راشدہ بیگم غصے اور خجالت کے ملے جلے جذبات کا شکار تھیں۔
عثمان نے ایک نظر ان سب کے چہروں پر ڈالی۔ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ اب وہ الماس کی کسی بھی قسم کی حمایت کرنے کے قابل

شدہ رہے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹے؟" عاصمہ چچی نے بیٹے کی صورت پر رقم پریشانی دیکھی۔

"مجھے علم نہیں ہے کہ الماس اب تک خاموش کیوں ہیں۔" بالآخر وہ بولے۔ "اور مجھے افسوس بھی ہے کہ یہ خبر مجھ تک آپ لوگوں تک پہنچائی جا رہی ہے۔"

انہوں نے راشدہ بیگم کا خوف زدہ چہرہ دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"بات یہ ہے کہ الماس صاحب نے اپنے ایک گوکار دوست سے نکاح کر لیا ہے۔"

"کیا؟" مہناز اور سیماب چلائی تھیں۔

جب کہ عاصمہ چچی اور راشدہ بیگم سکتے کے سے عالم میں بیٹھی رہ گئی تھیں۔

"نکاح؟ نکاح کر لیا ہے۔" پھر راشدہ بیگم بڑبڑائیں۔ "نکاح۔ الماس نے نکاح کر لیا ہے۔" یک لخت وہ اپنی دائیں جانب لڑھک گئیں۔

"امی۔ امی۔!"

"چچی جان!"

مہناز، سیماب، عثمان ایک ساتھ ان کی جانب لپکے تھے۔

عاصمہ چچی ہنوز سکتے کے عالم میں اپنی جگہ بیٹھی تھیں۔ جیسے گرد و پیش سے بے نیاز ہوں۔

"میں انہیں ہاسپٹل لے جاتا ہوں۔"

"عثمان انہیں اپنے بازوؤں میں اٹھا کر باہر لے گئے۔ سیماب روتی ہوئی ماں سے لپٹ گئی جب کہ مہناز عثمان کے پیچھے پیچھے باہر بھاگی تھی۔



ہاسپٹل کے کمرے میں سب جمع تھے۔

مہناز، مہوش اور کاشف راشدہ بیگم کے پاؤں تھامے بیٹھے تھے جب کہ دلاور چچا، عاصمہ چچی اور عدنان کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

عثمان باہر کاریڈور میں ڈاکٹر سے بات کر رہے تھے۔

راشدہ بیگم کی سسکی کمرے میں ابھری تو سب چونک اٹھے۔

"امی۔ امی پلیز۔ آپ بالکل نہ روئیں۔ سوچیں ہی مت اس کے بارے میں۔" مہناز ان سے لپٹ گئی۔

"کیسے نہ سوچوں۔ میرے دامن میں تم چاروں کے سوا اور کیا ہے۔ اس بدبخت نے دُکھ دینے سے پہلے یہ بھی نہ سوچا کہ ماں پہلے ہی کتنی

تمی داماں ہے۔ ایک بار باپ نے سر سے چادر کھینچ کر تپتے صحرا میں لا چھوڑا تھا۔ اب اس نے رہی سہی عزت۔"

ان سے مزید نہ بولا گیا۔

"چچی جان!" عثمان اندر داخل ہوتے ہی ان کی سمت آئے۔ "پلیز! خود کو پریشان نہ کریں۔ دیکھیں یہ تینوں کتنے پریشان ہو رہے ہیں۔"

"اس بدبخت کو بھی تو میں نے ہی جنا تھا۔ پھر اس کا دل اتنا پتھر کیسے ہو گیا۔ ماں سے قریب رہ کر بھی باپ پر گئی۔ کس طرح سب کی خوشیاں غارت کر دیں اس نے۔ کیسے خوش رہ پائے گی وہ!"

"ایسے مت کہیں امی!" مہناز تڑپ گئی۔

"میرے کہنے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے بیٹی۔ دکھے دل کی آواز ہونٹوں سے نہ نکلے تب بھی اوپر جاتی ہے!"

وہ اپنے حواسوں میں نہ تھیں۔ ڈاکٹر انہیں سکون آور انجکشن دینے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ پھر ہوش سے بیگانہ ہو گئیں۔



اٹیچی کیس اٹھائے اور کاندھے پر بیگ لٹکائے وہ سیڑھیاں عبور کر رہی تھی۔ ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ حالات جس طرح سے تبدیل ہوئے تھے، اس کا اسے اتنا اندازہ ہرگز نہ تھا۔ اس نے تو سب کچھ بے حد کل جانا تھا۔

رضا نے اسے پورا یقین دلایا تھا کہ محض چند روز کی بات ہے۔ اسے جاب مل جائے گی تو وہ لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر اس کے گھر والوں سے مل لے گا اور ساری بات کلیئر کر دے گا۔ لیکن اسے جاب ملنے میں دیر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور گھر والوں کا پریشر الماس پر بڑھنے لگا تھا۔

سب اس سے پوچھنے لگے تھے کہ وہ فون پر کس سے باتیں کرتی ہے اور کس سے ملنے جاتی ہے۔ حتیٰ کہ عثمان بھی یہ سب کچھ دریافت کیے بنا نہ رہ سکے تھے اور اس نے کسی جذباتی لمحے سے مغلوب ہو کر انہیں بتا دیا کہ وہ رضا سے نکاح کر چکی ہے۔ ہر چند کہ رضا نے اسے نہایت سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ کسی کو بھی، کبھی نکاح کے متعلق کچھ نہیں بتائے گی۔

پھر بھی الماس کو نجانے کیوں یقین سا تھا کہ عثمان اس کے راز کو راز ہی رکھیں گے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ انہوں نے یہ بات راشدہ بیگم سمیت سب پر منکشف کر دی اور راشدہ بیگم موت کے دہانے تک جا پہنچیں۔

فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دل سے دعا مانگی تھی کہ رضا گھر پر ہی ہو۔ اس نے کال بیل کا بٹن پش کیا اور اپنے دل کی دھڑکنیں سنتی رہی۔

"کون؟" ایک آواز ابھری جو رضا کی ہی تھی۔

پھر دروازہ کھل گیا۔ وہ شیونگ کریم کا جھاگ منہ پر بنائے تولیہ کاندھے پر ڈالے ہاتھ میں برش لیے کھڑا تھا۔

"الماس!" اس کی باچھیں کھل گئیں۔ "اچانک اتنا کسی پیشگی اطلاع کے؟ آؤنا۔ باہر کیوں کھڑی ہو؟"

اس نے ہٹ کر اسے اندر آنے کا رستہ دیا۔

''کہیں جا رہی ہو؟ یہ تیاری کہاں کی ہے؟''

اس کا ساز و سامان دیکھ کر وہ استفسار کر رہا تھا۔

الماس اٹیچی کیس زمین پر رکھ کر بولی۔

''جا نہیں رہی۔ آئی ہوں۔ ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آ گئی ہوں رضا!''

''وہاٹ؟'' وہ بھونچکا رہ گیا۔ ''یہ۔ یہ کیا کہہ رہی ہو الماس۔!''

''ہاں رضا!'' وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''گھر والوں کو علم ہو چکا ہے کہ میں نے تم سے نکاح کر لیا۔ امی ابا سخت طیش میں ہیں اور میری صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں ہیں۔ اور مجھے اس طرح سب کو فیس کرنا اتنا مشکل لگ رہا ہے کہ میں سوچے سمجھے بغیر اپنا سامان باندھ کر یہاں چلی آئی۔ آخر آل، اب میں تمہاری ذمہ داری ہوں۔''

''یقیناً لیکن جانو! اس طرح تو ہمارے لیے بہت سی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ تمہیں ابھی وہیں رہنا ہے، سب کے ساتھ۔ میں تمہیں عزت سے رخصت کروا کے لانا چاہتا ہوں۔ ساری دنیا کو یہ علم نہ ہو کہ ہم نے چھپ کر نکاح کر لیا تھا۔''

''آئی ایم سوری رضا!'' وہ اپنے ناخن دیکھنے لگی۔ ''یہ بات اوپن ہو چکی ہے اور میری وجہ سے ہی ہوئی ہے۔ لیکن اب میں وہاں کیسے رہ سکتی ہوں؟ وہاں سب مجھے تنفر بھری نگاہوں سے دیکھیں گے جو برداشت کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ یہ طے ہے کہ میں رخصت ہو کر وہاں سے آ چکی ہوں۔''

''شـ شـ'' وہ جلدی جلدی تولیے سے منہ صاف کرنے لگا۔ ''میں تمہیں ابھی چھوڑ کر آتا ہوں۔''

''رضا!'' الماس نے حیرت اور قدرے غصے سے اسے دیکھا۔ ''جو کچھ میں کہہ رہی ہوں کیا تمہیں سنائی نہیں دیتا۔ یا سمجھ نہیں آتا۔''

''الی۔ تم سمجھ نہیں رہیں۔ اس طرح ہمارے لیے کتنی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔''

''میں جانتی ہوں۔ اور تم سے رشتہ جوڑنے سے قبل یہ طے تھا کہ مجھے مشکلات کا سامنا تو بہر حال کرنا ہی ہے۔''

''دیکھو جانو!'' وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے پاس آ بیٹھا۔ ''میں چند دن بعد ایک کانسرٹ کے سلسلے میں دبئی جا رہا ہوں۔ تقریباً پندرہ دن کے لیے۔ تم یہاں اکیلی کیسے رہو گی؟''

الماس چند لمحے اس کی صورت دیکھتی رہی۔

''رضا!'' پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم سے شادی کے بعد بھی تو مجھے کبھی نہ کبھی اکیلے رہنا ہی ہوگا نا؟ کیا تم ہر وقت میرے ساتھ رہا کرو گے؟''

''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن تب میں تمہارے رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی پراپر بندوبست بھی تو کروں گا۔ یہ فلیٹ ایک اکیلی لڑکی کے رہنے کے

لیے نہایت ناموزوں ہے۔"

"میری فکر مت کرو۔" وہ لاپروائی سے سر جھٹک کر بولی۔ "میں کسی بھی بات سے گھبرا جانے والی لڑکی نہیں ہوں۔ میں یہاں سکون سے رہوں گی۔"

"الماس!" وہ زچ ہو کر بولا۔ "خدا کے لیے لو اللہ راسٹینڈ یار۔ ہم دونوں اس طرح سروائیو نہیں کر پائیں گے تم سمجھتیں کیوں نہیں؟ محض چند روز کی بات ہے، میں خود آ کر تمہارے چچا سے بات کروں گا۔"

"رضا میں وہاں واپس کیسے جا سکتی ہوں۔" الماس نے غصے سے بھڑک کر کہا۔

"ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی ہو گی۔ تم چلو میں تمہیں ٹیکسی میں چھوڑ کر آتا ہوں۔"

اپنی بات مکمل کر کے اس نے پلک جھپکتے میں اس کا سامان اٹھا لیا تھا۔ الماس بھی لب کاٹتی، جھنجھلاتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

رضا نے اسے گیٹ پر ہی اُتار دیا تھا۔

وہ سامان اُٹھا کر مڑ کر دیکھے بغیر اندر کی سمت بڑھ گئی۔

"خدا حافظ الماس!"

اس نے پیچھے رضا کی آواز سنی مگر مڑ کر پھر بھی نہیں دیکھا۔

مرکزی دروازے پر کھڑی نسرین نے اسے حیرت سے دیکھا تھا مگر کچھ بول نہ پائی۔ وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگی پھر بیچ میں ہی رُک گئی۔

عثمان اوپر سے سیڑھیاں اترتے آ رہے تھے۔ وہ بھی چند لمحوں کے لیے اپنی جگہ پر تھم گئے۔ اس کی تیاری بزبانِ خود بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ اُنہوں نے اس کا جائزہ ذرا سی دیر میں لے لیا۔

"فیصلوں میں اتنی جلد بازی اچھی نہیں ہوتی الماس!" ٹھنڈے لہجے میں وہ بولے تھے۔ "سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی عادت ڈالیں۔ میں آپ ہی کو تلاش کر رہا تھا۔ جائیں، سامان رکھیں اور آرام کریں۔ سب لوگ ہاسپٹل گئے ہیں، کسی کو علم نہیں ہوا۔"

"جب آپ کو علم ہو ہی گیا ہے تو سمجھ لیجیے کہ سب کو ہو گیا۔ اب کیا بات چھپی رہ سکتی ہے؟" اس نے ان پر چوٹ کی اور آگے بڑھ گئی۔

وہ وہیں کھڑے کچھ سوچ رہے تھے۔



"مبارک ہو بہن۔ منہ میٹھا کیجیے۔"

غزالہ کی والدہ نے مٹھائی کا ڈبہ عفت خانم کے سامنے کیا۔

"آپ کو بھی مبارک ہو۔" عفت خانم آج بہروز احمد کی شادی کی تاریخ رکھنے کے لیے آئی تھیں، مردانے میں بہروز احمد اور فیروز احمد بھی

موجود تھے۔

''خدا نے ہماری بھی سن لی۔ہم تو من بھر مٹھائی بانٹیں گے۔'' جمنا کے دانت نکلے جا رہے تھے۔

''ہاں جمنا! شکر ہے اس رب کا۔'' عفت خانم نے سانس بھری۔ ''یہ خوشیاں دیکھنے کو تو عرصے سے آنکھیں ترس رہی تھیں۔خدا نے ہمیں بھی یہ دن دکھائے۔میرے بہروز کے سر پر سہرا سجے گا۔گھر میں خوشیاں بولیں گی۔ہمارا سونا پن ختم ہو جائے گا۔''

''ہمیں تو شہروز میاں ہی یاد آئے چلے جاتے ہیں!'' جمنا افسردہ ہوئی۔

''اسے بھی فون کریں گے گھر چل کر۔دیکھنا کیسا دوڑا چلا آتا ہے۔'' وہ ہنسیں۔

اسی لمحے غزالہ، ماں کی ہمراہی میں سر جھکائے اندر داخل ہوئی۔

''ماشاءاللہ۔آؤ بیٹی۔یہاں آؤ۔!''

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان تک آئی۔

عفت خانم نے اٹھ کر اس کی پیشانی چومی۔

''خدا نصیب جگائے۔خوب پھولو پھلو۔بس اب جلدی سے میرے گھر کی رونق بن کر آ جاؤ۔میری بھی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔''

انھوں نے اس کے تتے تتے چہرے پر نظر کی۔

''کیا بات ہے؟ ہم سے ناراض کیوں رہتی ہو؟ کچھ بولتی ہی نہیں۔'' وہ لب کاٹنے لگی۔

''چھوٹی ہے نا۔گھبرا جاتی ہے ایسی باتوں سے۔'' اس کی والدہ جلدی سے بولیں۔ ''جاؤ بیٹی ارم سے کہو چائے بنا کر لے آئے۔''

''نہیں بہن! بس اب ہم چلیں گے۔چائے تو پی ہی لی ہے۔''

عفت خانم نے اپنا پرس اٹھایا۔

''اور آپ لوگوں کو کسی بھی قسم کا تردد کرنے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''آپ جیسے اچھے لوگ تو قسمت والوں کو ملتے ہیں۔'' وہ ہاتھ مسلنے لگیں۔

''بس خدا نصیب اچھے کرے۔'' عفت خانم مسکرائیں۔

''آمین۔!''



''ہیلو۔شہروز! کیسے ہو'' عفت خانم مارے خوشی کے زور سے بول رہی تھیں۔

''السلام علیکم امی حضور۔'' وہ شوخی سے بولا تھا۔ ''بالکل ٹھیک ہوں۔بہرا بالکل نہیں ہوا۔''

''وعلیکم السلام۔ہائیں کیا ہانک رہے ہو۔'' وہ اس کی بات نہ سمجھی تھیں۔ ''خدا نہ کرے!''

"آپ کیسی ہیں امی حضور۔ باقی لوگ کیسے ہیں؟" وہ ہنس رہا تھا۔

"سب بالکل خیریت سے ہیں۔ ہاں، ایک خوشخبری ہے تمہارے لیے!"

"میرے لیے؟ لڑکی ڈھونڈلی آپ نے؟ کیسی ہے؟"

"ہاں ڈھونڈلی۔" وہ ہنس دی۔ "مگر تمہارے لیے نہیں، بہروز کے لیے۔ بہت پیاری بچی ہے۔" "چلیں خیر ہے۔ اب میری باری بھی زیادہ دور نہیں۔ بھائی جان کو میری طرف سے مبارکباد دیجیے گا۔"

"اب تم آکر خود ہی مبارکبادیاں دو، جس جس کو بھی دینا چاہو۔ میں تاریخ طے کرآئی ہوں رجب کی پچیس تاریخ ٹھہرائی ہے۔"

"ہائیں۔" وہ اچھل ہی پڑا تھا۔ "آپ سچ کہہ رہی ہیں والدہ حضور؟ یعنی اتنی جلدی۔ ہرا۔"

"بس اب جلد لوٹ آؤ۔ ساری تیاریاں کرنی ہیں۔"

"امی حضور۔ ہم دو دن میں آرہے ہیں۔" اس سے خوشی سنبھالنا مشکل تھی۔ "اور صبا کیسی ہیں؟"

"ہاں صبا! ماشاءاللہ بڑے اچھے لڑکے سے منگنی ہوئی ہے اس کی!"

"منگنی!" لائن پر خاموشی چھا گئی تھی۔

"ہیلو۔ شہروز۔ شہروز۔!"

وہ آوازیں دیتی رہیں پھر لائن ڈس کنکٹ کر دی۔

"بس اب دوڑا آئے گا۔"

وہ مڑ کر جمنا سے کہہ رہی تھیں۔

❀.....❀.....❀

"السلام علیکم۔!"

اس نے آواز پر چونک کر سر اٹھایا تھا پھر چند لمحوں کے لیے اپنی جگہ جم سی گئی۔ سامنے یوسف کھڑے تھے۔

"وعلیکم السلام۔" پھر وہ کچھ پریشانی سے بولی۔ "اماں۔ برابر والے کمرے میں ہیں۔"

"اور تم۔!"

"وہ تھکے تھکے انداز میں کہتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

وہ ابھی ابھی فیکٹری سے لوٹی تھی۔ سبزی کی ٹوکری سامنے رکھے سبزی صاف کر رہی تھی۔ ریشم اور مریم باورچی خانے میں تھیں۔ انجم، اماں کے پاس تھی۔

اسے سخت الجھن محسوس ہوئی۔

"کیا بات ہے؟" وہ اسے بغور دیکھنے لگے۔ "میں کوئی جن یا بھوت تو نہیں جس پر نگاہ پڑتے ہی تم اتنی پریشان ہو جاتی ہو۔!"

"یوسف میاں تو آتے ہی رہتے ہوں گے تمہاری طرف!"

اس کے کانوں میں وحیدہ چچی کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"دیکھیں یوسف۔ پلیز آپ اماں کے پاس جا کر بیٹھیں۔" وہ پریشان ہو کر بولی۔ "آپ کو معاملات کی نزاکت کا یا تو اندازہ نہیں ہے یا آپ کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتے۔"

"ہاں! ٹھیک کہتی ہو۔ میں کچھ سمجھنا نہیں چاہتا۔" انہوں نے سر کرسی کی پشت سے لگا کر آنکھیں موند لیں۔ "جانتی ہو میں نے رات کو خواب میں تمہیں دیکھا۔ آنکھ کھلنے سے لے کر اب تک کا وقت کس طرح گزرا ہے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں کچھ سمجھنا چاہوں بھی تو نہیں سمجھ سکتا۔ میں خود اپنے بس میں نہیں ہو نیلی۔!"

"مت کیجیے ایسی باتیں!" وہ خوف زدہ ہو اٹھی۔

"کیسے نہ کروں۔ نہ کروں تو جیوں کیسے۔ نیلی! تمہیں مجھ پر رحم نہیں آتا۔!"

انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ ان کی نظروں میں وہ جذبے عیاں تھے۔ جنہوں نے نیلم کو دھڑکتے دل کے ساتھ نظریں جھکانے پر مجبور کر دیا۔

"یوسف میاں! کب آئے؟"

اماں کی آواز پر دونوں بری طرح سے چونک گئے تھے۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ!" یوسف کھڑے ہو گئے۔

نیلم اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ ابھی ابھی جو لمحہ ان دونوں کے درمیان آ کر گزر گیا تھا۔ اس سے کی شاہد اماں تھی۔ اس خیال نے اسے سر سے

پاؤں تلے پتھر کی سل کو دبا دیا تھا۔

"نیلم!" اماں اس سے مخاطب تھیں۔ "جاؤ، باورچی خانے میں جا کر بہن کا ہاتھ بٹاؤ۔" وہ بمشکل اپنی جگہ سے اٹھی اور باہر آ گئی۔

اس کا اپنی حالت پر ماتم کرنے کا جی چاہ رہا تھا۔

"نیلو۔!"

ریشم اور مریم اس کے چہرے پر رقم جذبات دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"کیا ہوا ہے؟"

اور وہ مزید ضبط نہ کر پائی۔ بری طرح سے رو دی۔ اماں کی بدگمانی، اپنی بے بسی، یوسف کی ذہنیت کتنے ہی احساسات تھے جو اسے رلائے چلے جا رہے تھے۔

ریشم نے اسے پانی کا گلاس تھمایا۔ مریم اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ لیکن وہ روئے چلی جا رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے بجو! خدا را کچھ تو بتائیں۔" دونوں از حد پریشان تھیں۔ اسی لمحے اماں دروازے پر نمودار ہوئیں۔

"اماں! اماں بجو کو کیا ہوا ہے؟" مریم نے جلدی سے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ سرد لہجے میں بولیں۔ "انہیں پچھتاوے رلاتے ہیں۔ اپنی بے وقوفی پر ہاتھ ملتی ہیں۔

مریم! کھانا تیار ہے تو نکال لو۔ یوسف میاں بیٹھے ہیں۔"

نیلم رونا بھول کر دم بخود بیٹھی تھی۔ چھوٹی بہنوں کے سامنے ادا ہونے والے اماں کے الفاظ نے اس پر سات سمندروں کا پانی گزار دیا تھا۔

اماں اس سے اس حد تک بدگمان تھیں۔ اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ مریم اور ریشم کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے والی کیفیت میں مبتلا کھانا نکالنے لگی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں بے شمار سوالات تھے۔ وہ ان سوالوں سے نظر چرائے، سر جھکائے بیٹھی تھی۔



گھر سے نکلی تو دماغ عجب سن زدہ کیفیت کا شکار تھا۔

ساری رات وہ کھلی آنکھوں سے جاگی تھی۔ دہشت زدہ کر ڈالنے والے حالات کے سامنے وہ اس قدر تنہا تھی، یہ احساس ہر طرح کے احساسات سے اسے عاری کیے دے رہا تھا۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ کس قدر پژمردگی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ کسی کو پروا نہ تھی کہ وہ کیا سوچتی ہے، کیوں پریشان رہتی ہے۔ کوئی اس کا ہم راز تھا۔ نہ دم ساز، کوئی پرسان حال نہ تھا۔

سر جھکائے، مشینی انداز میں آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی کہ کسی سے بری طرح سے ٹکرائی۔ ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے نکلی تھی۔

سامنے راجہ کمز مسکرا رہا تھا۔

نیلم اپنے حواسوں میں آئی تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ تو جس کیفیت کا شکار تھی اس میں اسے کچھ سجھائی نہ دیا تھا۔ لیکن وہ تو

ہوش و حواس میں تھا۔ جان بوجھ کر اس سے ٹکرایا تھا۔ دانستہ اسے چھوا تھا۔

”کمینے، ذلیل، کتے۔!“

اسے اچانک خود پہ اختیار نہ رہا۔ اس کا گریبان تھام کر وہ اس پر طمانچے برسانے لگی۔

”اتنا ارزاں سمجھتے ہو دوسروں کو، اتنا سستا جس کا جی چاہے ہاتھ پکڑا۔ جسے چاہا چھولیا۔ عورت تمہارے لیے اتنی گھٹیا ہے، اتنی بے مول۔“

لوگ جمع ہونے لگے تو اس نے راجہ کا گریبان چھوڑا۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ اتنا کمزور نہ تھا کہ اس جیسی لڑکی کے ہاتھوں طمانچے کھا لیتا۔ وہ تو کھڑا مسکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں کسی انجانی فتح کا خمار لیے۔ سرشار۔ جیسے اس کے نرم ہاتھوں میں اپنے چہرے پر محسوس کرنا اس کے نزدیک بڑا خوشگوار عمل تھا۔

اس نے چادر سمیٹی اور سر جھکائے سب کے درمیان سے نکلتی چلی گئی۔



سامنے بہت سے کاغذات بکھرائے وہ سر تھامے بیٹھی تھی۔

کچھ کام کرنا چاہتی تو نظروں میں ایک طنزیہ مسکراہٹ سجا چہرہ آجاتا۔ اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتا، اس کے غصے کی کمزوری سے حظ اٹھاتا ہوا۔ اس کی قربت کے احساس سے سرشار ہوتا ہوا۔ ایک کراہ سی اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ کتنی مجبور تھی وہ کتنی بے بس۔ اس کا گریبان پکڑ کر اسے طمانچے لگائے بھی تو کیا حاصل ہوا؟ یہ احساس کہ اس کا گریبان پکڑنے سے وہ اس کے کتنے نزدیک ہوگئی تھی۔ یا طمانچے برسانے کے دوران وہ اس سے کتنا مس ہوئی تھی۔ ناپسندیدہ ترین ہستی کی آنکھوں میں اترتی چمک کا تصور اسے بے حال کیے دے رہا تھا۔ اپنے اس قدر بے مول ہو جانے کا خیال رگوں میں چبھن بھر رہا تھا۔

وہ ایسا تھکا ہوا پرندہ تھی جو کسی بھی وقت کہیں بھی گر سکتا تھا۔ کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔

”مس علی۔!“

وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

عباسی صاحب دونوں ہاتھوں کو میز پر ٹکائے اس سے مخاطب تھے۔

”مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔“

”جی؟“

”بہت دیر تک اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا۔

”جی سر؟“

”کیا بات ہے؟“ وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ ”اس قدر کھوئی ہوئی ہیں کہ واپس آنا محال ہے۔ کوئی مسئلہ ہے؟ کوئی پریشانی؟ طبیعت خراب ہے

آپ کی؟"

"وہ چند لمحے انہیں دیکھتی رہی۔۔

سنجیدہ چہرہ، کنپٹیوں پر سفید بال، سیاہ فریم کا چشمہ۔ ایک مہربان سراپا نظر آئے وہ اسے۔ اس پر اتنا نرم لہجہ کے سامنے کے زخم بھرنے لگیں۔ دکھے دل پر جیسے کوئی ہاتھ رکھ دے۔

اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔

"ارے۔ بھئی یہ کیا ہے؟" وہ گھبرا سے گئے۔ جیب سے رومال نکال کر آگے بڑھایا۔

"پلیز! مس نیل! آنسو پونچھیے۔ شاباش!"

اس نے رومال ان سے لے لیا۔ لیکن آنسو تھمتے ہی نہیں تھے۔

"دیکھیں۔ کوئی آ گیا تو کیا سمجھے گا!" وہ سخت پریشانی کے عالم میں تھے۔ نیلم ان کی بات سمجھ گئی۔ آنسو تھم گئے۔ سر جھکائے وہ سوں سوں کرتی رہی۔

"اب کہیے۔ کیا مسئلہ ہے؟"

"نہیں سر۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "یونہی ذرا سر میں درد سا ہے!"

"سر کا درد ایسے نہیں رُلاتا۔" وہ مسکرائے۔ "ایسے تو دل کا درد رُلاتا ہے۔" نیلم شرمندگی سے مسکرا دی۔ میز پر آڑی ترچھی لائنیں بنانے لگی۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" وہ کھڑے ہو گئے۔ اب مطلع صاف ہو گیا ہے تو اچھی سی چائے پلائیں۔"

"جی سر!" وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

چائے بنا کر سرو کر دینے کے بعد بھی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بڑی گہری نظروں کی زد میں ہے۔



"یہ لو۔ اور اب یہ پریشانی دور کرو۔ کیسی پھٹکار بکھری ہے چہرے پر۔!" ریشم نے چائے کا کپ اسے تھمایا۔

"تم میری پریشانی نہیں سمجھ سکتیں ریشم!" غزالہ نے سر ہلایا۔ "تم کیا جانو میرے احساسات کو۔!"

"دیکھو غزالہ! وہ لڑکا تم سے سیریس ہوتا تو ضرور تمہارا رشتہ لے کر تمہارے گھر آتا۔ تم یہ بات کیوں نہیں سمجھتیں۔!"

"تمہیں کیا خبر وہ کتنا سیریس ہے۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔ "تم نے کون سا کسی سے محبت کی ہے۔ جو تم اس کی مجبوریاں اور تقاضے سمجھ سکو۔"

"چلو ٹھیک ہے۔!" ریشم نے سانس بھرا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟ تمہاری تو شادی کی تاریخ تک طے ہو گئی ہے۔ اب اسے بھول جاؤ اور بسم اللہ کر کے نئی زندگی کی ابتدا کرو۔!"

"بس میرا ایک کام کردو ریشم!" غزالہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر التجا کی۔ "یہ خط اس تک پہنچا دو!"

"میں۔" وہ بری طرح گھبرا گئی۔ "میں بھلا کیسے!"

"دیکھو۔ میں تو بڑی مشکل سے یہاں تم سے ملنے آئی ہوں۔ وہ بھی بھائی کے پہرے میں۔ میں تو کالج جا نہیں سکتی۔ لیکن تم پر تو کوئی پابندی نہیں ہے۔ نا۔ پلیز اسے یہ خط دے دینا۔ پلیز ریشم! تمہیں میری قسم۔!"

اس کے چہرے پر اتنی مظلومیت تھی کہ وہ انکار نہ کر سکی۔ تذبذب کے عالم میں خط کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

❀......❀......❀

وہ آنکھوں میں کاجل ڈال رہی تھی جب آئینے میں اس کے پیچھے ریشم کا چہرہ نمودار ہوا اس کا ہاتھ رک گیا۔

کالج کے یونیفارم کی سفید قمیص میں وہ صبح ہی صبح بہت نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ گول چہرہ اپنی تمام تر معصومیت اور بھولپن کے ساتھ بہت تر و تازہ اور شاداب نظر آ رہا تھا۔

اس نے کس کس کر دو چوٹیاں باندھی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں کاجل کی لکیر تھی۔ اور اس سادگی کے عالم میں بھی وہ نیلم اور آئینے کو محو حیرت کیے دے رہی تھی۔

"کتنی بڑی ہو گئی ہے۔"

نیلم نے ایک نظر میں اپنے اور اس کے چہرے کا موازنہ کیا، نجانے اس کے اندر کیسے جذبات امڈے تھے۔ وہ خود بھی نہ سمجھ پائی۔

"کیا بات ہے ریشم۔"

"اس نے ریشم کو اپنی توجہ کا منتظر پایا تو مڑ کر پوچھا۔

"باجو...... وہ......" وہ نظریں جھکا کر رہ گئی۔

"کیا بات ہے کہو؟" نیلم ہولے سے مسکرائی...... "پیسے چاہئیں"

"ابھی تو نہیں، وہ غزالہ ہے نا باجو! اس کی شادی کی تاریخ ٹھہر گئی ہے اگلے مہینے ہی ہے۔"

"ہاں تو پھر؟" نیلم اس کی بات سمجھ نہ پائی۔

"باجو...... وہ...... میرے پاس تو بالکل کپڑے ہی نہیں ہیں تقریبات کے لیے۔ شبنم آپی کی شادی کے لیے جتنے بھی کپڑے سلوائے تھے، وہ سب میں گھر میں پہن کر خراب کر چکی ہوں۔"

"اوہ!" نیلم نے سانس بھری "شوق بھی تو بہت ہے تمہیں ہر روز نئے نئے کپڑے پہننے کا۔ جہاں ہے جو کہیں آنے جانے کے لیے کوئی ڈھنگ کا جوڑا سنبھال کر رکھو۔"

"بس ایک جوڑا بنوا دیں باجو...... باقی تو میں آپ کا ایک آدھ سوٹ پہن کر کام چلا لوں گی۔"

"اچھا...... دیکھتی ہوں۔"

وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی، مریم چائے تیار کیے بیٹھی تھی۔ وہ پیڑھی پر بیٹھ کر بے دلی سے گھونٹ بھرنے لگی۔ کتنا ہی وہ کچھ رقم پس انداز کرنے کا سوچتی، ہر مہینے کسی نہ کسی بہن یا بھائی کی کوئی نہ کوئی فرمائش یا ضرورت نکل ہی آتی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہیں بجو؟"۔ مریم نے اس کی صورت دیکھی "پریشان ہیں؟"

"نہیں۔" وہ ہولے سے مسکرا دی۔

"پھر؟ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پراٹھا کھا کر جائیں ناں۔ ایسے ہی خالی پیٹ چائے پی جاتی ہیں۔ کیسی شکل ہو رہی ہے مرجھائی ہوئی۔"

اس نے چائے کا کپ واپس رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بس مریم اور دیر ہو جاتی ہے ناں ناشتے میں۔ ویں نکل جاتی ہے جا کر۔"

اپنی صحت کا خیال رکھا کریں بجو!" وہ اس کے پیچھے پیچھے دروازے تک آئی" آہستہ آہستہ گھلتی جا رہی ہیں۔" نیلم نے ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر کچھ سوچا اور باہر نکل آئی۔

"دعا کرو مریم! وہ وقت جلد آئے جب گھل گھل کر میرا وجود پورے کا پورا تحلیل ہو جائے اور پھر کچھ نہ بچے، نہ حال کا غم، نہ ماضی کے پچھتاوے، نہ مستقبل کے خوف۔"

ایک پرسوچ کیفیت میں وہ وین میں سوار ہوئی تھی۔



"ارے بھئی موی دیکھو...... تمہاری ممانی جان یہاں لیٹی ہیں"

وہ ہلو ہنستے ہوئے موسنہ کو گود میں اٹھائے اندر آ گئے تھے۔

شبنم اپنے حلیے سے قطعی بے نیاز کسی سوچ میں گم سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"یہ لو بھئی سنبھالو اپنی بھانجی کو۔"

انہوں نے نہایت بے تکلفی سے موسنہ کو اس کی گود میں ڈال دیا۔ شبنم کو نہایت کوفت محسوس ہوئی۔ اس کی شلوار قدرے اوپر کو چڑھی ہوئی تھی اور دوپٹا بھی نجانے کہاں تھا۔

موسنہ کو سنبھالتے ہوئے اس نے اس نے ایک نظر ریاض بھائی کے چہرے پر ڈالی، وہ نہایت بے تکلفی سے اس کے سراپے کا جائزہ لے رہے تھے۔ خفت اور شرمندگی سے اس کا چہرہ تپ گیا۔

"کیا بات ہے بھئی نہ کوئی سلام نہ دعا نہ خیریت نہ عافیت۔"

وہ لمحہ بھر میں اس کے تاثرات کو بھانپ کر اپنا انداز بدل لیا کرتے تھے جلدی سے دور پڑی کرسی پر جا بیٹھے۔

"اکیلے ہی آئے ہیں۔ آمنہ کو ساتھ نہیں لائے۔" شبنم اپنے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے بمشکل بول پائی۔

مومنہ کو اس نے برابر میں بٹھا کر اپنے کپڑے درست کیے، تکیے کے اوپر پڑا دوپٹا اٹھا کر ڈھنگ سے اوڑھا۔ اس دوران وہ ریاض بھائی کی نگاہوں کو اپنے ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ محسوس کرتی رہی تھی۔ پھر اس نے ایک جھجکی نگاہ ان پر ڈالی۔

"اں...... ہاں کیا کہہ رہی تھیں تم؟" وہ یک بیک گڑبڑا گئے۔ "ہاں اچھا وہ آمنہ ارے وہ تو گھنٹہ بھر سے نیچے بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ یہ مومی ضد کر رہی تھی، میں اسے یہاں لے آیا، شبنم! تم اس طرح اکیلی کیوں پڑی رہتی ہو؟"

انہوں ایک بار پھر انداز بدل کر پوچھا تھا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔" وہ قدرے بیزاری سے بولی۔

اس طرح کے سوال و جواب اسے صدوجہ پریشان کرتے تھے۔

ریاض بھائی عجب طرح سے مسکرائے۔

"کیا بات ہے۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟" وہ رازداری سے پوچھ رہے تھے۔

"خاص بات سے کیا مراد ہے آپ کی؟" وہ ٹھٹک کر بولی۔

"میرا مطلب ہے، خیر جانے دو، یوسف میاں سے مجھے یہ امید نہیں ہے۔" وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شبنم کے تلوں سے لگی تو سر پر جا کر بجھی۔ اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہہ پاتی، وہ باہر جا چکے تھے۔ احساس بے حسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تبھی دامنی کیسا کھلا راز تھی۔ کوئی اس کے خالی دامن میں ہمدردی کے جھوٹے سکے ڈال دیتا تھا تو کوئی طنز کے نوکیلے کانٹے۔

بڑی دیر تک وہ وہیں بیٹھی ہونٹ چباتی رہی اور آنسوؤں کے سیلاب میں بند باندھنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس کے برابر بیٹھی مومنہ نے بلند آواز میں اس کی خاموشی کے خلاف احتجاج شروع کیا تو وہ اسے اٹھا کر باہر نکل گئی۔

نیچے آمنہ اور وحیدہ چچی ثریا کے پاس موجود تھیں۔ جب سے ثریا کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ اس نے اپنا سامان نیچے کے کمرے میں سیٹ کر لیا تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو تینوں اچانک ہی خاموش ہو گئیں، شبنم کو نجانے کیوں یہ احساس ہوا کہ وہ لوگ جو گفتگو کر رہی تھیں، وہ اسی کے متعلق تھی۔

"السلام وعلیکم۔" وہ آمنہ سے ملنے لگی۔

"وعلیکم السلام!" آمنہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔ "کیوں اکیلی اوپر پڑی رہتی ہو۔ نیچے ہی رہا کرو جب یوسف بھائی گھر پر نہ ہوں، اکیلا آدمی خواہ مخواہ خود سے اور لوگوں سے بیزار ہونے لگتا ہے۔"

"واہ کیا بات کی ہے۔" ثریا ہنس دیں "بھائی اجب آدمی خود سے اور لوگوں سے بیزار ہو جائے تبھی تو اکیلا رہتا ہے اور یہ تمہارا مسئلہ ہی تو ہے ہی

اس وقت ہیں جب یوسف بھائی گھر پر نہ ہوں، جب وہ اوپر جاتے ہیں تو یہ پیچھے آجاتی ہیں۔"

"کتنی غلط بات ہے شبنم!" آمنہ تاسف سے بولی "میں تو سمجھتی تھی تم بہت عقل مند لڑکی ہو لیکن تم تو اتنی ہی نا سمجھ نکلیں۔ اب تک تم اپنے اور ان کے درمیان موجود دیوار کو گرا ہی نہ پائیں؟ اب ایسی بھی کیا بدگمانی، ناحق اپنی زندگی خراب کیے جا رہی ہو۔"

"میرے بس میں کیا ہے آمنہ۔" وہ جھلا کر بولی "میں بھلا کیا کر سکتی ہوں؟ اور تم لوگ یہ باتیں اس طرح کرتے ہو جیسے سارا قصور میرا ہو۔"

"سارا نہیں تو آدھا قصور تمہارا ہے بیٹی!" وحیدہ چچی بولیں "مرد تو اندھا بھینسا ہوتا ہے جھومتا جھومتا کبھی ادھر کو نکل جاتا ہے تو کبھی ادھر کو۔ اسے رستہ دکھانا، قابو کیے رکھنا عورت کا کام ہے اور تم! تمہاری بھلا کیا صفت بیان کروں۔ تم تو خود اس سے دو ہاتھ آگے ہو، وہ شمال جائے تو تم جنوب جاتی ہو۔ وہ مشرق کو بڑھے تو تم مغرب کو بھاگتی ہو۔ ہار سنگھار، کپڑے لتے، زیور گہنے سے تمہیں چڑ ہے۔ ارے کبھی اس کے آنے سے پہلے تیار ہو، سنگھار کرو، وہ آئے تو اس کا استقبال مسکرا کر کرو۔ کھانے پانی کا پوچھو۔ سر دباؤ، تب کچھ اس کا بھی دل گرمائے۔ تمہارے طور طریقے تو اور اس کو دور بھگانے کے ہیں۔"

وہ بیٹھی ہونٹ کاٹتی رہی۔ کیسی تکلیف دہ گفتگو تھی۔ چچی جان پرانے زمانے کے فرسودہ خیالات رکھنے والی خاتون اب تک انہی پرانے وقتوں میں زندہ تھیں۔ انہیں سوچوں، جذبوں، رویوں اور رویوں کے ردعمل میں پیدا ہو جانے والے مسئلوں سے کچھ سروکار نہ تھا۔ انہوں نے اپنے خیالات کے مطابق ہر رشتے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے چند فارمولے بنا لیے تھے جن پر وہ آنکھ بند کر کے عمل کیا کرتی تھیں وہ پڑھی لکھی نہ تھیں۔ اپنے بچپن میں انہیں "بچیوں کی تعلیم و تربیت" کی طرح کی چند کتابیں سنا دی گئی تھیں جن کے چند زریں اصول انہیں آج بھی یاد تھے۔ اور وہ انہی پر اصرار کیا کرتی تھیں۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"آمنہ نے اسے ٹہوکا دیا تو شبنم اپنے خیالات سے چونکی۔

"کچھ نہیں۔ میں چائے بنا لاتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر کچن میں آگئی، چائے کا پانی چولہے پر رکھنے لگی۔ چند ہی منٹ گزرے تھے کہ آمنہ بھی وہیں آگئیں۔

"تم کیوں چلی آئیں؟" اس نے مسکرانے کی کوشش کی "میں آ تو رہی تھی۔"

"شبو!" وہ اسٹول پر بیٹھ گئی، "میں اکیلے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"شبنم ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگی۔

"دیکھو، مجھے غلط مت سمجھنا۔" آمنہ ہچکچا رہی تھی "دراصل میں اور امی تمہارے اور یوسف بھائی کے درمیان موجود اس خلیج سے بہت زیادہ پریشان ہیں۔ ہم لوگوں نے بہت عرصہ یہ سوچ کر خاموشی گزار لیا کہ شاید تم دونوں خود اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کرو، شاید ایک ساتھ رہ کر ایک

دوسرے کو سمجھ کر ایک دوسرے کے قریب ہو سکو۔ لیکن تم لوگ تو قسم کھائے بیٹھے ہو اور یہ صرف تمہارا ہی نہیں اس پورے گھر کا مسئلہ ہے۔ ہم سب مسلسل ایک ذہنی الجھن میں مبتلا ہیں۔ میں اور امی بہت ارمانوں سے تمہیں بیاہ کر لائے تھے۔ ہم نہیں چاہتے کہ کل کلاں کو خدانخواستہ ایسا کچھ ہو جائے کہ ہم لوگ ساری زندگی پچھتاوؤں کا شکار رہیں۔"

"تم نے چچی جان نے کچھ اچھا نہیں کیا آمنہ۔" وہ کچھ دیر بعد بولی تھی "اپنے ارمان پورے کر لینے کے چکر میں تم نے بہت سے لوگوں کے ارمان کا خون کیا ہے۔ یوسف، نیلی بجو، میں ہم سب اپنی اپنی دنیاؤں میں زندہ، مگن، خوش تھے۔ ہماری دنیاؤں کو تہہ و بالا کر کے کیا پایا تم نے؟ نیلی بجو کی جگہ اس گھر میں، میں آ گئی تو کیا مل گیا چچی جان کو یا تمہیں، ذرا سی جیت کا ایک وقتی احساس اور بس؟ اب مجھے اور یوسف کو دیکھ کر فتح کا وہ خمار مزہ دیتا ہے؟ ہمیں جلتا سلگتا دیکھ کر دلوں میں ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے؟ بتاؤ آمنہ! کیا قصور تھا میرا جس کی یہ کڑی سزا ملی ہے مجھے، نہ مجھے پیروں تلے زمین محسوس ہوتی ہے نہ سر پر کوئی آسمان۔ ایک خلا ہے جس میں معلق ہوں، کتنے لوگوں کی ضدوں کا انتقام کا شکار ہوئی ہوں میں، یہ سوچتی ہوں تو میرے اندر خون کی جگہ پگھلا ہوا سیسہ دوڑنے لگتا ہے۔ میں ختم ہونے لگتی ہوں اور ایک ضد اور ایک انتقام کا جذبہ میرے اندر بھی بیدار ہونے لگتا ہے جو مجھ سے کہتا ہے کہ مٹا ڈالو سب کچھ، راکھ کر ڈالو، جس جس نے تمہیں جو جو کچھ دیا ہے، ویسے ہی طرح سے اسے لوٹا دو۔ تم دیکھنا آمنہ! میں کچھ کر ڈالوں گی، یا تو خود کو ختم کر لوں گی یا اس سارے فسانے کو۔"

"پاگل مت بنو شبو!" آمنہ دہل کر بولی۔

وہ اس کے جنونی انداز سے سہم سی گئی تھی۔

"پاگل ہو گئی ہوں آمنہ" وہ ہنسی "پھر اب جو کچھ بھی کروں گی مجھ پر معاف ہوگا۔"

"شبو!" آمنہ نے اٹھ کر اسے کاندھوں سے تھام لیا "دیکھو، ابھی کچھ نہیں بگڑا، کچھ بھی نہیں۔ یوسف بھائی کو ذرا سا وقت چاہیے، وہ سنبھل جائیں گے۔ بس تم وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو، جو کچھ بھی تمہارے ساتھ ہوا ہے، وہ خواہ کسی کی ضد کا نتیجہ ہو یا محض غلط فہمیوں کا حاصل ہو اسے خود پر سوار مت کرو۔ یہ مت سوچو کہ سب نے مل کر تمہیں کسی کنوئیں میں دھکیلا ہے۔ تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرنے کی کوشش کرو اور بہتری کی کوشش بھی کرو اور دعا بھی۔"

"میں کسی سے خیرات میں ملی خوشیوں سے نہ تو خوش رہ سکتی ہوں نہ اپنی کھلی آنکھوں پر خوش فہمیوں کی پٹی ہی باندھ سکتی ہوں، جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے آمنہ! نہ تو یوسف اب مجھے کچھ دے سکتے ہیں نہ میں ان کی کسی کمی کو پورا کر سکتی ہوں۔ یہ طے ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں ہیں۔"

"شبو۔" آمنہ سخت حواس باختہ نظر آنے لگی "خدا کا واسطہ اپنی ان بے ہودہ سوچوں پر قابو پاؤ۔ یہ تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑیں گی۔"

شبنم نے ایک گہرا سانس بھرا اور اسٹول پر گر سی گئی۔

"میں کیا کروں آمنہ! کیا کروں؟ زندہ رہنے کی تمنا بھی کروں تو کس برتے پر؟ خوش رہنا بھی چاہوں تو کیوں کر؟"

''شبو! میری خاطر، امی کی خاطر، بلکہ ہم سب کی خاطر، ایک مرتبہ صرف ایک مرتبہ یوسف بھائی کی طرف صاف دل سے پیش قدمی کر کے دیکھو۔ ان سے اپنا حق مانگو پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ، صرف ایک مرتبہ شبو! مجھے یقین ہے اندر سے وہ بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ کمزور پڑ گئے ہیں لیکن مرد ہیں ناں جھک نہیں سکتے۔ تم ان کی طرف بڑھو گی تو وہ بھی اعتراف کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کریں گے۔ کیوں اپنی پوری زندگی کو محض ایک بے نام ضد کی وجہ سے داؤ پر لگا رہی ہو۔؟''

''شبنم اسے دیکھے گی۔

''اگر انہوں نے میرے جھکے ہوئے سر کو ٹھوکر لگائی آمنہ! تو میں برداشت اور حوصلے کی ہر سرحد پار کر جاؤں گی۔''

''ایسا نہیں ہوگا شبو!'' آمنہ نے اس کا کاندھا تھپکا ''تم انہیں اپنا حق ہو۔ ایک بار پھر محبت کے ساتھ ان کا ہاتھ تھام کر تو دیکھو۔ جھڑک دیکھنے کا اختیار کھو بیٹھیں گے وہ۔''

''وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی تھی۔



''امی حضور! اب ایسا بھی کیا پردہ؟ آخر ہم ان کے ہونے والے دیور ہیں بلکہ دیور خاص۔'' وہ جھنجلایا ہوا تھا۔

''یہ دیور خاص کیا ہوتا ہے؟'' عفت خانم مسکرائیں۔

''دیور خاص بڑے کام کی چیز ہوتا ہے امی حضور'' وہ صوفے سے اٹھ کر ان کے پاس جا بیٹھا ''دنیا کا کوئی رشتہ اس کی جگہ پر نہیں کر سکتا، بھابی اداس ہو، میکہ یاد آتا ہو اور شوہر کو آفیسوں چکروں سے فرصت نہ ملے تو دیور ہی وہ شخص ہے جو اپنا ہر کام ایک سائیڈ پر رکھ کر بھابی کے میکے والوں سے ملوانے لے جاتا ہے۔ اور اگر بھابی اداس ہو اور میکے والوں سے بھی کچھ چپقلش چل رہی ہو تو ایسے مواقع پر بھی دیور ہی ہے جو مختلف لطیفوں، چٹکلوں اور لڑکیوں کے قصوں سے بھابی کا دل بہلاتا ہے۔ دیور کچن میں آ کر بھابی کا ہر وہ کام کرتا ہے جو نند یں کرنے سے انکار کر چکی ہوتی ہیں۔ ساس کی ڈانٹ پر بھابی کے آنسو بھی دیور ہی پونچھتا ہے۔ دیور تو سسرال کی رونق ہوتا ہے۔ امی حضور! اور جب بھابی صاحبہ ہر سال اس رونق میں اضافہ کے لیے کمر بستہ ہو جائیں تو مہمانوں کی آمد پر ٹیں ٹیں چیں چیں کرنے والے بہت سے کارٹونوں کو دیور ہی باہر لے جاتا ہے تاکہ بھابی سکون سے مہمانوں سے نپٹ لیں علاوہ ازیں.....''

''خدارا شہروز! بس بھی کرو۔'' عفت خانم عاجز آ گئیں۔

''یعنی اب بھی آپ دیور کی اہمیت سے منکر ہیں؟ اور ہاں! ہم دیور خاص اور عام دیوروں کا فرق بیان کرنا تو بھول ہی گئے۔ اب فرض کیجیے گھر میں، میں نہ ہوتا صرف بھائی جان اور فیروز بھائی ہی ہوتے تو کیا وہ دیور ہونے کے یہ جملہ تقاضے پورے کر سکتے تھے۔ کیا وہ ان تمام فرائض سے بخوبی سبکدوش ہو پاتے؟ ہرگز نہیں پس ثابت ہوا کہ ہر دیور دیور خاص نہیں ہوتا، یہ ''خاصیت'' وہ بار گراں ہے جو کوئی خاص الخاص شخصیت ہی اٹھا سکتی ہے۔ جیسا کہ میں یعنی شہروز احمد!''

حشمت خانم سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"کیا ہوا امی حضور؟" اسے تشویش ہوئی "لائیے ہم آپ کا سر دبا دیں ہم نہ صرف مستقبل کے ایک اچھے دیور ہیں بلکہ ماضی وحال و مستقبل کے ایک لائق اور ہونہار فرزند بھی ہیں۔"

"ارے میرے ہونہار فرزند خاص! کیا آپ کچھ دیر کے لیے اپنی زبان تالوسے لگا کر رکھ سکتے ہیں تا کہ آپ کی ناچیز ماں چند ضروری چیزوں کی لسٹ بنا سکے؟" وہ نہایت عاجزی سے گویا ہوئی تھیں۔

"پچھلے ایک گھنٹے سے میں چیزوں کے نام سوچ رہی ہوں اور بھول رہی ہوں کیونکہ تمہاری یہ قینچی جیسی زبان مجھے لمحہ بھر کی مہلت نہیں دیتی۔"

"تو ہم کون سی فضول باتیں کر رہے ہیں؟" اس نے منہ پھلالیا، "ہم تو محض یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم اپنی ہونے والی بھابی کو دیکھنا اور سننا چاہتے ہیں۔ اتنی سی فرمائش ہے۔ اور آپ ہیں کہ ایک تواتر سے انکار کیے جا رہی ہیں۔"

"بیٹا وہ بچی میرے سامنے آنے سے ہی اتنا گھبرا جاتی ہے کہ میں اکثر اس سے ملے بغیر ہی لوٹ آتی ہوں۔ اب اگر میں تمہیں ساتھ لے جاؤں تو وہ شاید سامنے ہی نہ آئے اور پھر تم اچھے بھلے جوان لڑکے ہو، اس طرح سے اسے فرمائش کر کے بلانا مجھے تو بہت برا لگے گا اور اسے یہاں آنے میں دیر ہی کتنی ہے۔ گھر آ جائے تو بے شک پورا دن اس کا کان کھایا کرنا.....

"اس کا مطلب ہے۔ میں انہیں شادی پر ہی دیکھ پاؤں گا۔" اس نے منہ پھلالیا "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، آخر اپنی بڑی بھابی کو پسند کرنے میں میرا بھی تو کوئی حصہ ہونا چاہیے تھا۔ مجھے تو اس گھر میں کوئی کچھ سمجھتا ہی نہیں، میں تو کسی گنتی میں ہی نہیں ہوں۔"

وہ جا کر جھولے میں اوندھا لیٹ گیا۔ اور سر بازو میں دے لیا۔

"یہ صبا بہت دن سے نہیں آئی۔" وہ خود مخاطب تھیں "اور نہ اس کی والدہ ہی آئیں۔"

"اب کیا کرنے آئیں گی وہ۔" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔

"کیا؟" وہ اپنے دھیان سے چونکیں "کیا کہہ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ سیدھا ہو کر کچھ سوچنے لگا تھا "امی! صبا کی منگنی کیسے لڑکے سے ہوئی ہے۔؟"

"ماشاءاللہ بڑا خوبرو جوان ہے۔ خاندان بھی اچھا ہے۔ شریف لوگ لگتے ہیں۔ تم تو اسے مبارکباد تک دینے نہیں گئے۔ دو دن ہو گئے ہیں تمہیں لاہور سے آئے ہوئے۔ کیا سوچتی ہوگی وہ۔"

"یہی تو میں جاننا نہیں چاہتا کہ وہ اب کیا سوچتی ہوں گی۔" وہ مسلسل سوچ میں تھا۔

حشمت خانم نے چشمے کی اوٹ سے اسے دیکھا۔

"کیا مقصد ہے ان باتوں کا۔"

اس نے چونک کر ماں کی سمت دیکھا پھر کھسیاتا سا ہو کر مسکرا دیا۔

"امی حضور! صبا کو بلا لاؤں؟ بری کی تیاری میں آپ کا ہاتھ بٹا دیں گی۔" عفت خانم مسکرا دیں۔

"چپ جاب تم میرا دھیان بٹا رہے ہو، ویسے الجھن سی تو مجھے بھی ہے۔ خیر، ہاں اسے بلا ہی لاؤ تو اچھا ہے۔ ذرا جوڑے ٹانک دے گی۔ مجھ اکیلی سے کہاں ہوگا یہ سب کچھ۔ ایسے کام تو بیٹیاں کرتی ہیں۔"

انہوں نے گہرا سانس بھرا۔

"شکر ہے اس رب کا اولاد کی نعمت سے نوازا ہے اس نے۔ احسان ہے مولا تیرا۔"

ان کا دھیان واقعی بٹ گیا تھا اس نے بھی دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور پھر وہاں سے کھسک لینے میں ہی عافیت جانی۔



ٹائم آف ہونے کے بعد وہ چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ عرفان عباسی صاحب گھنٹہ بھر پہلے کسی ضروری کام سے جا چکے تھے۔

دروازہ پر ہلکی سی دستک پر اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ زارا تابش کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"جا رہی ہو؟" وہ اندر چلی آئی۔

"جی!" اس نے مختصراً کہا۔

"آفیسر صاحب چلے گئے؟" اس کی مسکراہٹ میں عجب کاٹ تھی۔

ثیلم نے دونوں ہتھیلیاں میز کی سطح پر ٹکا کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی نجانے اس کا مزاج کیسا ہو گیا تھا۔ اندر بارود سا بھرتا جا رہا تھا۔ کسی کی ذرا سی بات، چھوٹا سا جملہ، ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ جیسے تیلی کا کام کیا کرتی تھی اس کا پھٹ پڑنے کو جی چاہتا تھا۔ اس نے ایک نگاہ زارا پر ڈالی۔

"دیکھیں مس زارا تابش! میرا ظرف بہت چھوٹا ہے۔ اسے آزمانے کی کوشش آپ مت کیا کریں۔" اس نے حتی الامکان ٹھنڈے لہجے میں بولنے کی سعی کی تھی۔

"تم جانتی نہیں ہو......" اس نے تاسف سے سر ہلایا "کون کون تمہیں کس کس طرح آزما رہا ہے۔"

"کیوں کرتی ہیں آپ ایسی باتیں؟" ثیلم چیختے ہوئے لہجے میں بولی "کیا جتانا چاہتی ہیں؟ میں سمجھ نہیں پائی مس زارا، کہ آپ دراصل کس میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ مجھ میں؟ عباسی صاحب میں......؟ یا یہ آپ کے ذہن کی گندگی ہے جو آپ کو ایسی فضول باتیں سوچنے اور کرتے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔"

زارا تابش چند لمحے اسے دیکھتی رہی، خلاف معمول آج اس کے چہرے نے اس کی اتنی سخت بات سن کر بھی کوئی رنگ نہ بدلا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ذہنی طور پر یہ سب کچھ سننے کے لیے بالکل تیار تھی۔

"سنو ثیلم علی۔" پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "آج سے آٹھ سال قبل جب میں نے اپنے گھر سے پہلی مرتبہ قدم باہر نکالا تھا تب

میں بالکل تمہاری جیسی تھی۔ ایسی ہی معصوم، ایسی ہی کھری، منافقت سے نابلد، آلودگیوں سے پاک۔ ان آٹھ سالوں میں، میں بہت کچھ جان کر، بہت کچھ سہہ کر اور بہت کچھ سیکھ کر اور اک کے اس مقام تک پہنچی ہوں جسے تم ذہنی گندگی کا نام دیتی ہو، اور میں چاہتی ہوں کہ تم وہ سب کچھ نہ بھوجو میں نے سہا ہے اور تم پر وہ حقیقتیں کبھی منکشف نہ ہوں جو مجھ پر ہوئی ہیں اور......"

اس نے نچلا لب دانتوں میں دبا کر بے پناہ ضبط کرنے کی کوشش کی، پھر سرخ چہرے اور پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بولی۔

"اور تمہارے ذہن میں گندگی کے یہ ڈھیر کبھی جگہ نہ پائیں...... اس لیے میں آج واضح الفاظ میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ یہاں کبھی کسی کے قریب ہونے کی کوشش مت کرنا جو تم سے جتنا قریب ہونا چاہے، اس سے اس قدر ہی دور رہنا بس اس سے آگے مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔"

وہ پلٹی اور تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔



دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے، الجھے الجھے سے انداز میں وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ زندگی کے ہر معاملے میں وہ جتنے اعتماد سے کام لیتی آئی تھی۔ گزشتہ کل دنوں سے اتنی ہی بے اعتمادی اور تذبذب کا شکار رہی تھی، ہر چند کہ بہت پہلے شعور کی دنیا میں پہلا قدم رکھتے ہی اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی شخصیت کی تعمیر نہایت مضبوط بنیادوں پر کرے گی۔ اعتماد، اپنی ذات کے یقین اور اپنے فیصلوں میں آزادی اور خود مختاری کو ہمیشہ اپنی شخصیت کا حسن بنائے رکھے گی۔ اور در حقیقت وہ ایسا کرتی آئی تھی۔ اسے عاجزی، انکساری اور دوسروں کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کیے رہنے سے سخت نفرت تھی۔

بچپن میں ہی اس نے جان لیا تھا کہ وہ جس گھر میں رہتی ہے، وہ اس کے باپ کا نہیں ہے اور اس کا باپ ہمیشہ کے لیے اس کی ماں سے قطع تعلق کر چکا ہے۔ کیونکہ وہ راشدہ بیگم جیسی دبو اور کمزور عورت کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا تھا، طاہر خان کو اعلیٰ تعلیم یافتہ، بولڈ، قدم سے قدم ملا کر چلنے والی مضبوط جیون ساتھی کی خواہش تھی اور راشدہ بیگم ان تمام خصوصیات سے بے بہرہ تھیں۔ ان کی تعلیم تو معمولی تھی ہی۔ زندگی کے دوسرے معاملوں میں بھی وہ کبھی آزادی اور روشن خیالی کا مظاہرہ نہ کر پائیں۔ ہر لحظہ خوف زدہ نظر آنے والی ہر معاملے میں دبی دبی رہنے والی، ہر بات پر سر جھکا دینے والی راشدہ بیگم طاہر خان کو زیادہ عرصے تک اپنا اسیر رہا کر نہ رکھ سکیں۔ ان پر اپنے ماں باپ کی سخت تربیت کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ وہ باوجود کوشش کے خود کو اپنے شوہر کی مرضی کے رنگ میں نہ رنگ سکیں۔ طاہر خان پہلے ملازمت کے بہانے بیرون ملک چلے گئے اور پھر وہاں سے دوسری شادی کی خبر بھجوا دی۔

یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے راشدہ بیگم کی پیروں تلے زمین چھوڑی نہ سر پر آسمان۔ ماں باپ ان کی شادی کے دوسرے تیسرے سال ہی یکے بعد دیگرے دنیا سے سدھار گئے تھے بہن بھائی اپنے اپنے گھروں میں خوش اور مطمئن تھے۔ چار بچوں کے ساتھ کون تھا جو انہیں اپنے گھر میں خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیتا۔

ایسے میں دلاور خان ہی تھے جنہوں نے آگے بڑھ کر ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور بھائی کی زیادتیوں کی اس طرح سے معافی مانگی جیسے وہ خود

اصل قصوروار ہوں، اور ہمیشہ کے لیے ان کا اور ان کے بچوں کا سائبان بن گئے، نہ صرف وہ بلکہ ان کی بیوی، عاصمہ چچی بھی کھلے دل کے ساتھ اپنا آدھا گھر ان کے حوالے کر کے خوش اور مطمئن تھیں۔

وہ سب ان کے گھر میں پورے استحقاق کے ساتھ رہتے تھے اور ان کی نہ صرف ضرورتیں بلکہ بے جا خواہشیں بھی خوش دلی کے ساتھ پوری کی جاتی تھیں۔ دلاور چچا نے کبھی بھی خود کو چار بچوں کا باپ نہ سمجھا، وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ وہ میرے ساتھ اولادیں ہیں۔ انہوں نے کبھی بھی راشدہ بیگم اور ان کے بچوں کو کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی، لیکن نجانے کب اور کیسے وہ کیا خلا تھا جو الماس طاہر خان کے اندر پیدا ہو گیا۔

اپنی ماں پر بیتنے والی کہانی تو مہناز کے بھی علم میں تھی اور کاشف اور مہوش کو بھی اس کی خبر تھی لیکن اس نے الماس کو نجانے کس طرح سے متاثر کیا تھا کہ وہ زندگی کے ہر پہلو کو اس واقعہ کے تناظر سے دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی اس نے اپنی شخصیت کی تعمیر اسی انداز میں کی تھی جس میں اس کے باپ نے اس کی ماں کو دیکھنے کی خواہش کی تھی اور چونکہ یہ شعوری کوشش تھی لہٰذا اس سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ خود اعتماد بننے کی کوشش کرتے کرتے وہ مغرور اور ہٹ دھرم ہو گئی تھی۔ اپنے ارادوں میں مضبوط بنتے بنتے وہ ضدی اور خودسر ہو چلی تھی، روشن خیالی کا مظاہرہ کرتے کرتے بےراہ روی ہو گئی تھی اور اسی غرور، خودسری اور بےراہ روی نے اسے تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کر دیا تھا۔

رضا مراد سے فوری طور پر نکاح کر لینے کا فیصلہ اس نے اپنی خوشی اور مکمل رضامندی سے ہرگز نہیں کیا تھا، اسے ایسا کرنے پر چند ناگزیر وجوہات نے مجبور کیا تھا، چند لمحوں کی لغزش نے اس کے غرور کے پر کاٹ ڈالے تھے اور وہ کسی بےدم پنچھی کی طرح اس کے دامن میں گر گئی تھی۔ ایسے وقت میں جب رضا نے فوری طور پر نکاح کی پیشکش کی تو وہ انکار نہ کر سکی اور وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں تھی بھی نہیں، سب کچھ اتنی جلدی اور اچانک ہوا تھا کہ اسے سوچنے، سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت ہی نہ ملی اور اب وقت آ پڑا تھا سوچنے کا جو کچھ بیت چکا تھا اسے پرکھنے کا۔

اسے احساس ہو رہا تھا کہ اب تک ہر کام بہت غیر منطقی انداز میں کرتی آ رہی تھی۔ وہ جو خود کو بہت غیر جذباتی اور حقیقت پسند سمجھتی تھی جسے صبا کی رومان پسندی اور نازک خیالی سے کوفت ہوتی تھی۔ وہ جو اس اندیشہ سودوزیاں کو نظر انداز کرنے کی ہرگز قائل نہ تھی۔ شاید گھاٹے کا سودا کر بیٹھی تھی۔

اسے اپنے مضبوط اعصاب پر ناز تھا لیکن کچھ دنوں سے اس کے شانے ٹوٹنے لگے تھے۔ اور آنکھیں تھکن محسوس کر رہی تھیں۔ دل پر ایک عجیب سے بوجھ کا احساس تھا۔

راشدہ بیگم کو گھر آئے دو دن ہو چکے تھے اور انہوں نے اس سے ملنا تو در کنار اس کی صورت دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ گھر کے دیگر افراد بھی اس سے کترائے کترائے سے پھر رہے تھے اور ادھر رضا کا کچھ پتا نہیں تھا۔

اس نے جاتے ہوئے کانٹیکٹ رکھنے کی بھرپور یقین دہانی کرائی تھی۔ لیکن ایک مرتبہ بھی اس کا فون نہ آیا تھا۔

الماس خود کو ایک بھنور میں پھنسا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک نے اس کے پریشان کن خیالات کا سلسلہ چند لمحوں کے لیے موقوف کیا تھا۔

"کون؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

دروازہ کھلا اور عثمان خان نمودار ہوئے۔

"حاضر ہو سکتا ہوں؟"

"آیئے۔" اس نے دونوں پیر بستر سے نیچے لٹکا لیے۔

وہ اندر آ کر اس کے سامنے رکھے کشن پر نیم دراز ہو گئے۔

"امی کیسی ہیں اب؟"

وہ کچھ دیر ان کی جانب سے کسی بات کا منتظر رہ کر بولی تھی۔

عثمان خان نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا ان کی آنکھوں میں سرخ ڈورے نمایاں تھے نہ جانے وہ جاگتے رہے تھے یا کچھ اور بات تھی۔

"بھی جان خدا کا شکر ہے اب روبصحت ہیں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولے "آپ ملیں گی نہیں ان سے؟"

"الماس نے گہرا سانس بھرا اور دوسری جانب دیکھنے لگی۔ پیر کے انگوٹھے سے وہ قالین کو کرید رہی تھی۔ عثمان خان کی نگاہوں نے کچھ دیر اس کے نرم گلابی پیروں کو دیکھا۔

"آپ کیوں ٹینشن کا شکار ہیں۔" پھر انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا "جو کچھ ہونا تھا وہ تو بیت چکا اب تو ٹینشن ریلیز ہو جانی چاہیے۔"

"امی بہت خفا ہیں مجھ سے۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"ہونا بھی چاہیے انہیں۔ آپ نے ان کے نرم روی اور اعتماد کا بہت غلط استعمال کیا ہے۔ الماس نے جھٹکے سے ان کی سمت رخ کیا تھا۔

"مجھے غلط مت سمجھیے۔" وہ رسانیت سے بولے "میں یہ سب کچھ اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ میری منگیتر رہ چکی ہیں اور آپ کے اقدام سے مجھے ٹھیس پہنچی ہے۔ درحقیقت ایسا ہوا تو ہے لیکن فی الوقت میں اپنی بات نہیں کر رہا۔ میں آپ کو یہ سمجھانے آیا ہوں کہ پہلے تو آپ چچی جان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر ان کا دل دکھا ہی چکی ہیں اب ان سے معافی نہ مانگ کر آپ مزید غلطی کر رہی ہیں۔ وہ لاکھ آپ سے خفا سہی، اندر سے اس بات کی منتظر ہیں کہ آپ آ کر ان سے معافی مانگیں، شرمندگی کا اظہار کریں، انہیں منائیں، زندگی کا فیصلہ کر لینے کا اختیار آپ کا اپنا سہی، لیکن اس کے لیے جو طریقہ کار آپ نے اپنایا وہ غلط تھا، آپ نے کسی کو بھی کچھ کہے بتائے بغیر جس طرح اپنی من مانی کی ہے۔ اس پر یقیناً آپ کو معذرت طلب کرنی چاہیے اور آپ ہیں کہ ایسی خود سری سے اکیلی یہاں بیٹھی اس بات کا انتظار کر رہی ہیں کہ دوسرے لوگ آ کر آپ کو منائیں۔"

وہ اسے سمجھانے آئے تھے لیکن اندرونی جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی ذاتی خفگی کا اظہار کرنے لگے تھے۔

چند لمحے انہیں خود پر قابو پانے میں لگے۔

"آئی ایم سوری!" پھر وہ بولے۔ "میں شاید جذباتی ہو رہا ہوں، جانتا نہیں آپ سے باز پرس کرنے کا میرا کچھ اختیار ہے بھی یا نہیں۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

"پھر آپ چل رہی ہیں؟ یقین جانیے آپ کا اعتراف چچی جان کو سنبھلنے میں بہت مدد دے گا۔"

وہ کھڑے ہو گئے تھے اور اب اسے منتظر نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

الماس بھی آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی پھر ان کی ہمراہی میں وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ راشدہ بیگم کے کمرے میں تقریباً سب ہی موجود تھے، عثمان خان کے پیچھے آتے الماس پر سب کی نظریں اٹھی تھیں۔

"کتنی خوش نصیب لڑکی ہے...... سیماب بہزاد کی تھی" بھائی آج بھی اس کی ڈھال بنے ہوئے ہیں؟" عاصمہ چچی نے نظروں ہی نظروں میں اسے تنبیہہ کی تھی۔

عثمان خان نے اسے راشدہ بیگم کے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آنکھیں موندے لیٹی تھیں اس کے بیٹھنے سے چونک اٹھیں، پھر جیسے ہی اس پر نگاہ پڑی انہوں نے ناگواری سے منہ پھیر لیا۔

"کیوں آئی ہے یہ یہاں۔ لے جاؤ اسے یہاں سے۔"

"چچی جان ایسے نہ کہیے۔" عثمان خان ان کے دوسری جانب بیٹھ گئے "یہ بھی آپ کا اپنا خون ہے۔ بچوں سے غلطیاں ہو ہی جایا کرتی ہیں۔"

"میرا خون۔" ان کی آواز بھرا گئی "نہیں، یہ میری نہیں، یہ اپنے باپ کی بیٹی ہے، اور میں مر گئی تو میرا خون اس کے سر ہوگا اور قیامت کے روز تک میں اسے اپنا خون معاف کروں گی نہ دودھ بخشوں گی۔"

"امی...... امی مجھے معاف کر دیں" الماس نے ان کا ہاتھ تھام لیا "پلیز امی!"

"ہٹ جاؤ!" انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "نہ میں تیری ماں نہ تو میری اولاد۔ میری اولاد ہوتی تو یوں رسوا کرتی مجھے اس عمر میں؟ احسان فراموش! تو نے تو جس تھالی میں کھایا اس میں چھید کیا ہے۔"

"چچی جان...... چچی جان، پلیز اب بس بھی کریں۔ مت سوچیں اس طرح جو ہونا تھا ہو گیا، اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیں اور آپ قبول نہ کریں تو یہ سب مٹایا تو نہیں جا سکتا نا؟"

"اس سے کہو، اپنے چچا کے پیروں میں گرے، ان سے معافی مانگے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تھیں۔ الماس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ولاور چچا وہاں سے جا چکے تھے۔

"ابو کو بہت صدمہ ہے۔" عثمان خان آہستگی سے بولے "میں انہیں سمجھا لوں گا۔"

وہ اٹھ کر کسی کی سمت دیکھے بغیر کمرے سے نکل گئی تھی

❁......❁......❁

کسی نے مدھم سروں میں سیٹی بجائی تھی۔

سالن میں نمک ڈالتی صبا حیرانی سے مڑی پھر مسکرا دی۔

"شہروز کے بچے! آخر تمہیں خیال آ ہی گیا۔"

"السلام علیکم۔" وہ ہاتھ ماتھے تک لے گیا۔

"وعلیکم اسلام، جیتے رہو، دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔" وہ سنجیدگی سے نمک واپس کیبنٹ میں رکھ رہی تھی۔

"بہت بڑی ہو گئی ہیں؟" وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اسے گہری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

"صبا دھیمے سے مسکرا دی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے۔"

"ایسی لمبی چوڑی پر سنی دعائیں تو اگلے وقتوں کی بڑی بوڑھیاں ہی دیا کرتی ہیں" وہ اندر چلا آیا، اس کے تازہ تازہ تلے ہوئے کبابوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔

"ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ یہ کباب رات کے کھانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔" صبا نے اسے گھورا۔

"تو رات تو ہو چکی ہے۔" اس نے جیسے اطلاع دی" اور پھر مٹھائی تو آپ کھلائیں گی نہیں۔ میں نے سوچا منگنی کے کباب ہی کھا لیے جائیں ویسے مبارک ہو۔"

وہ اس کی جانب پشت کیے کھڑا تھا جیسے نہ تو اس کے تاثرات دیکھنا چاہتا ہو نہ ہی مبارکباد دیتے ہوئے اپنے چہرے پر آئے رنگ اس پر عیاں کرنا چاہتا ہو۔

صبا نے گہرا سانس بھر کر خود بھی اس کی جانب پشت کر لی۔

"کب آئے لاہور سے۔"

"دو دن ہو گئے ہیں۔"

"اب آئے ہو ملنے؟" صبا نے مڑ کر دیکھا۔

"فرصت ہی نہیں تھی۔ بھائی جان کی شادی کی تیاریاں عروج پر ہیں۔ روز ہی امی کو بازار وغیرہ لے جانا ہوتا ہے، ویسے آپ کیا مایوں بیٹھ گئی ہیں؟" وہ کہتے کہتے مڑا۔

"مجھے کیا خبر تھی۔ تم کب آئے۔" صبا نے نظریں چرا لیں۔

"واہ میری اچھی دوست۔" وہ مسکرایا۔ "کم از کم جھوٹ بولنا تو سیکھ لیں، سچ بولنا نہیں آتا۔ وہ الگ بات ہے۔ ویسے جھوٹ بولنے کا پہلا اصول یہ ہے کہ یہ نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر بولا جاتا ہے، جہاں نگاہیں چرائیں وہیں جھوٹ پکڑا گیا۔"

صبا کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

وہ منہ بگاڑے اسے دیکھتا رہا۔

"ویسے بائی داوے کیسے ہیں وہ؟ آپ کے دانیال ہاشمی صاحب۔"

"بہت اچھے۔ بہت ہی اچھے۔" ہولے سے مسکرائی۔

"ہائے گلشن کو آری کیا۔" وہ بڑبڑایا۔

"چائے پیو گے؟"

"پلا دیجئے۔" اس نے شانے اچکائے۔

صبا چائے بنانے لگی۔ وہ خاموش کھڑا نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ صبا نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ چہرے پر آزردگی کی تمام تر نشانیاں درج کیے وہ اسے بے حد معصوم اور پیارا لگا، وہ کسی ایسے بچے کی طرح اداس نظر آ رہا تھا جس نے کوئی من پسند کھلونا خریدنے کے لیے عرصے تک جیب خرچ جمع کیا ہوا اور پھر دکان پر پہنچ کر اسے علم ہوا کہ وہ کھلونا تو کچھ دیر قبل کوئی اور لے جا چکا، ٹوٹا ٹوٹا سا کھویا کھویا سا شہروز احمد اس لمحے صبا کو ساری دنیا سے الگ کوئی شے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" چائے کا کپ اسے تھما کر اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے سر جھٹکا "میری سوچیں تو آپ کو پتا ہے۔ کیسی بے ربط اور بے سروپا ہوا کرتی ہیں، کیا بتاؤں کہ کیا سوچ رہا ہوں۔"

"گھر میں بھابی آنے والی ہیں۔ اب تو خوش ہو گے، برسوں پرانی تمنا پوری ہونے جا رہی ہے۔"

"ہاں خوش بھی ہوں۔" وہ کچھ سوچ کر بولا "ویسے بھابی کی کمی مجھے کبھی گھر میں محسوس ہوتی تھی زندگی میں نہیں۔"

صبا نظریں جھکا کر رہ گئی۔

"صبا خوش ہیں آپ؟" اس نے جیسے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

"ہاں شہروز!" وہ لمحہ بھر کا توقف کیے بغیر بولی تھی "اتنی خوش ہوں کہ مجھے خود پر حیرت ہوتی ہے۔ انسان دوسروں کو پہچاننے کا دعویٰ نجانے کس طرح کر لیتا ہے حالانکہ وہ خود سے بھی یکسر ناواقف ہوتا ہے۔ میں سمجھتی تھی تمہارے بھائی کے علاوہ میں کبھی کسی شخص کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھ پاؤں گی لیکن شہروز! کیا تم یقین کر سکتے ہو، دانیال ہاشمی نے چند دنوں میں میری زندگی کا محور ہی بدل دیا ہے۔ وہ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز، سب سے پیارا ہو چکا ہے۔ میں، میں اتنی خوش ہوں شہروز کہ خوشی سے مر جانے کو جی چاہتا ہے۔"

وہ منہ کھولے، حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا جیسے جو کچھ سنا ہو، وہ اس کے لیے دنیا کی سب سے انوکھی، سب سے حیران کر دینے والی بات ہو۔

"کیا بات ہے؟ تمہیں افسوس ہوا یہ سن کر۔"

''نہیں۔'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا ''افسوس کیوں اور کیسا مجھے تو خوشی ہوئی صبا! میں تو آپ کے لیے بہت پریشان، بہت فکرمند تھا، آپ کا سامنا کرنے سے بھی گھبرا رہا تھا یوں جیسے جو کچھ ہوا ہو، اس میں میرا اپنا کوئی ہاتھ ہو لیکن آپ نے تو میرا دل ہلکا کر دیا ہے۔ مجھے ہر طرح کے بوجھ سے آزاد کر دیا ہے۔ آئی ایم ویری تھینک فل ٹو یو صبا! اور دانیال ہاشمی صاحب کے اچھا ہونے میں اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا، وہ یقیناً اچھے، بلکہ بہت اچھے انسان ہوں گے۔ میں ہر اس شخص کا شکر گزار رہتا ہوں جو آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور انہوں نے تو آپ کو اتنی بہت سی خوشیاں دی ہیں۔ اب تو میں واقعی ان سے ملنا چاہوں گا۔''

وہ یقیناً خوش ہونا چاہتا تھا، لیکن اس کے اندر اس کے بھائی کا غم بول رہا تھا جس کی آواز نہایت واضح اور صاف تھی۔ صبا سالن میں چمچہ ہلانے کے بہانے اس کے سامنے سے ہٹ گئی، وہ اس کی آنکھوں میں نمی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔



''سر!'' وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی ''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

''جی!'' انہوں نے فائل بند کر دی ''کوئی خاص بات ہے مس علی؟ خیریت تو ہے۔''

''سر! پلیز زارا تابش صاحبہ مجھے کچھ عرصے سے تنگ کر رہی ہیں، وہ مجھ سے عجیب و غریب قسم کی باتیں کرتی ہیں۔ جن سے میں ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتی ہوں آپ پلیز ان سے کہہ دیں وہ مجھ سے بات نہ ہی کیا کریں تو بہتر ہے۔''

وہ کئی دن سے زارا کے رویے کے بارے میں عرفان عباسی سے بات کرنا چاہ رہی تھی اور آج مصمم ارادہ کر کے گھر سے نکلی تھی۔ اسی لیے ان کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ان کے سامنے آ بیٹھی تھی۔

''زارا تابش۔'' انہوں نے لمحہ بھر کو سوچا ''پروڈکشن کے ڈپارٹمنٹ میں ہیں۔''

''جی سر! وہ مجھے کوئی ذہنی مریضہ دکھائی دیتی ہیں۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی ان کی دماغی رو نجانے کس سمت میں بہنے لگتی ہے۔'' وہ تلخی سے بولی۔

عرفان عباسی صاحب مسکرا دیے۔

''بری بات ہے مس علی! ایک اچھی بھلی شخصیت کے لیے اس طرح کے ریمارکس!۔''

''آئی ایم سوری سر! لیکن آپ کو ان کے رویے کے بارے میں علم نہیں طنزیہ مسکراہٹ، کاٹ دار جملے، بے ہودہ گفتگو، میرا ایسی باتوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا سر میں گھبرا جاتی ہوں۔''

عباسی صاحب نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ اور مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔

''آپ کیوں اتنا گھبراتی ہیں مس علی! اپنا بی پی چیک کرایئے۔''

''جی؟'' وہ ہونق ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

''پھر پریشان ہو گئیں۔'' وہ ہنس دیے۔ ''دیکھیں مس علی! دنیا میں ہمارا واسطہ ہر طرح کے لوگوں سے پڑتا ہے، اور پڑتا ہے۔ ان میں کچھ لوگ نارمل ہوتے ہیں تو کچھ ایب نارمل بھی ہوتے ہیں، مختلف انسانوں پر ان کی اپنی اپنی نجی و ذاتی زندگی میں مختلف واقعات و حادثات اپنا اثر چھوڑتے ہوئے گزرتے ہیں اور ان کی سوچوں اور رویوں کو نجانے کس کس طرح سے متاثر کر جاتے ہیں۔ ایسے لوگ کبھی کبھی ایب نارمل بی ہیو کرنے لگتے ہیں۔ ان سے گھبرانا نہیں چاہیے اور نہ ان سے نفرت کرنی چاہیے۔ بس آرام سے ان کی بات سن لیں اور اگنور کر دیں۔ یہی ان کا واحد علاج ہے۔ بات اگر محض کسی زارا تابش نامی واحد لڑکی کی ہو تو مجھے اسے سمجھانے میں کوئی عار نہیں۔ لیکن آپ اگر گھر سے نکلی ہیں تو آپ کا واسطہ تو ہر دوسرے قدم پر کسی زارا تابش سے پڑے گا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے رویے متعین کر لیں۔ دوسروں کے رویے محدود متعین کرنے لگیں تو ذہنی انتشار کا شکار ہو جائیں گی۔ دنیا کا ہر شخص آپ سے آپ کی مرضی کے مطابق تو بی ہیو نہیں کرے گا نا؟''

''نیلم کچھ دیر ان کی صورت دیکھتی رہی، سیاہ فریم کے چشمے میں جھانکتی دو گہری نظریں اس پر مرتکز تھیں۔ اس کی نظریں یک بارگی جھک گئیں۔

''ٹھیک یو سر! آپ نے جو کچھ کہا، وہ میری سمجھ میں آ گیا ہے۔''

''یو آر ویل کم اویسے میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ مجھ سے اپنا کسی بھی قسم کا مسئلہ شیئر کر سکتی ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کوئی بہت فارغ، فالتو شخص ہوں جس کے پاس دوسروں کی زندگی میں جھانکنے اور لطف اٹھانے کے سوا اور کوئی کام نہ ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں بہت کم لوگوں کو خود سے قریب ہونے کی اجازت دیتا ہوں، لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں مس علی! جن کے بارے میں نہ صرف جاننے کو، بلکہ بہت زیادہ جاننے کو جی چاہتا ہے۔''

نیلم کا دل عجیب انداز میں دھڑکا تھا۔

''اب آپ کام شروع کیجیے۔'' وہ چند لمحوں بعد بولے تھے۔ ''آئندہ بھی کسی قسم کی کوئی پریشانی محسوس کریں تو بلا تامل میرے پاس آ جائیں، دوسروں کی پروا کم کیا کریں مس علی! دوسرے تو چاہتے ہی یہی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح، کسی نہ کسی کو پریشان کرتے رہیں۔ ہر بات سے بے پروا ہو کر آپ اپنا کام کرتی رہیے۔''

''تھینک یو سر۔'' وہ اپنی سیٹ کی جانب بڑھ گئی تھی۔



''بجو...... ایمان سے یہی سوٹ میرے خیالوں میں تھا۔'' ریشم دبی دبی آواز میں چیخی تھی ''بالکل یہی کلر، یہی کام''

''اچھا بابا...... آہستہ تو بولو'' وہ جھلا گئی۔

''بجو...... یہی دلا دیں پلیز پلیز۔''

نازک سے کام والے لائٹ اورنج سوٹ پر ریشم بری طرح مرمٹی تھی اسے یوں بھی یہ رنگ بہت پسند تھا۔

"تمھیں بازار لانے کا ایک تو یہ بڑا نقصان ہے۔" نیلم جلائی۔ "ایک تو ہر چیز پر بچوں کی طرح ضد کرتی ہو وہ بھی با آواز بلند۔"

"اچھا نا!۔" وہ سہم گئی "تو ڈانٹ کیوں رہی ہیں۔"

"آؤ اندر، پتا کرتے ہیں کتنے کا ہے۔" وہ اسے لے کر دکان کے اندر گھس گئی۔

غزالہ کی شادی کی تقریب نزدیک آ پہنچی تھی۔ اور ریشم نے دن رات اس کی جان کھائی ہوئی تھی۔ آج وہ آفس سے جلدی چھٹی کر کے اسے مارکیٹ لے آئی تھی۔

دکان دار نے سوٹ کی جو قیمت بتائی۔ اسے سن کر نیلم نے دانتوں تلے زبان دبالی اور ریشم کا منہ اتر گیا۔

"سن لیا؟۔" اس نے ریشم کی سمت دیکھا۔

"بہت مہنگا ہے بجو! کہیں اور پتا کرتے ہیں۔" اس نے مایوسی سے گردن ہلائی۔

دونوں دکان سے نکل آئیں۔

"خدا خدا کر کے ریشم کو ایک مناسب قیمت کا سوٹ کچھ پسند آیا۔ نیلم نے جھٹ پرس سے رقم نکال کر دکان دار کو تھما دی۔ مبادا ریشم اپنا ارادہ ایک بار پھر بدل ڈالے۔

"پتا نہیں بجو! چیزیں اتنی مہنگی کیوں..... ہوتی جا رہی ہیں۔" ریشم اپنا پسندیدہ سوٹ نہ خرید پانے پر سخت اداس تھی۔ "آخر ہم لوگ غریب کیوں ہیں؟"

"حکومت اور خدا کا شکر ادا کیا کرو۔" نیلم نے اسے جھڑکا۔

شام گہری ہو رہی تھی اور وہ رکشے کی تلاش میں تھی۔

اچانک ایک گاڑی ان کے پاس آ کر رکی، اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے شیشہ اتار کر باہر جھانکا۔

"بجو۔" ریشم نے کہنی مار کر رکشے کی تلاش میں نظریں دوڑاتی نیلم کو متوجہ کیا تھا۔

"ہاں!۔" وہ چونکی۔

گاڑی میں عباسی صاحب اس کی سمت متوجہ تھے۔

"سر آپ۔"

"آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

ان کا انداز اس قدر قطعی تھا کہ نیلم انکار کر ہی نہ پائی۔ اس نے ریشم کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں بہنیں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

"تو شاپنگ ہو رہی تھی......" گاڑی آگے بڑھا کر سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

"جی سر! یہ میری چھوٹی بہن ہے ریشم۔ اسے کپڑے دلوانے لائی تھی کچھ دن بعد اس کی قریبی دوست کی شادی ہے۔"

"آپ نہ بھی بتائیں تو دیکھنے والا خود بخود آپ کا رشتہ بھی سکتا ہے شکلیں ہی اس قدر مشابہ ہیں۔" وہ دھیرے سے ہنسے "اور بیٹا آپ کیا کرتی ہیں؟"

"میں نے انٹر کا اگزام دیا ہے، رزلٹ آجائے تو یونیورسٹی میں اپلائی کروں گی۔"

"بہت خوب۔" وہ مسکرائے۔

گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے جا رکی تو نیلم بری طرح گھبرا گئی۔

"سر...... یہ کیا؟"

"کچھ بھی نہیں، آپ کے لیے تو کچھ بھی نہیں، البتہ یہ جو پیاری سی لڑکی آپ کے ساتھ ہے اسے آئسکریم کھلانی ہے کیوں بھئی ریشم کھانی ہے نا آئسکریم۔"

ریشم مسکرا دی۔ ناچار نیلم کو گاڑی سے اترنا پڑا، اسے یہ سب کچھ نہایت برا محسوس ہو رہا تھا جب کہ ریشم کے چہرے پر بے پناہ خوشی چمک رہی تھی۔

"کون سی آئس کریم کھانی ہے؟" انہوں نے کرسی سنبھالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کوئی سی بھی۔" ریشم جھٹ بولی۔ "آج سے پہلے مجھے کبھی کوئی آئس کریم کھلانے نہیں لایا۔"

نیلم نے نظروں ہی نظروں میں اسے سرزنش کی جبکہ عباسی صاحب مسکرا دیے۔

آئس کریم کھانے کے دوران بھی ریشم نہایت بے تکلفی سے عباسی صاحب سے گفتگو کرتی رہی تھی۔ نیلم بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ اسے یوں ایک غیر آدمی کے ساتھ بیٹھ کر آئس کریم کھانا اور باتیں کرنا سخت معیوب لگ رہا تھا۔ نجانے کیوں اسے عباسی صاحب بالکل غیر اور اجنبی لگ رہے تھے۔

خدا خدا کر کے ریشم نے آئسکریم ختم کی تو وہ لوگ باہر نکلے۔

"مس علی!"

"وہ دروازہ کھول کر بیٹھ رہی تھی جب عباسی صاحب نے پکارا۔

"آپ آگے آجایئے پلیز۔"

نیلم چند لمحے کھڑی رہی پھر ناچار اگلا دروازہ کھول کر ان کے برابر آبیٹھی۔

"مجھے گائیڈ کرتی جائیں۔" انہوں نے جیسے وضاحت کی، "میں آپ کے گھر کا راستہ نہیں جانتا۔"

گھر تک کا راستہ ان تینوں نے بالکل خاموشی کے ساتھ گزارا۔ صرف نیلم نے چند بار راستہ بتانے کے لیے لب کشائی کی تھی۔

گاڑی اس نے اپنی گلی کے موڑ پر ہی رکوائی تھی۔

''مس علی!'' اس کے اترنے سے قبل انہوں نے اسے دیکھا ''آپ کو یہ سب کچھ برا تو نہیں لگا...؟''

''نہیں سر!'' اسے مجبوراً جھوٹ بولنا پڑا ''بہت شکریہ سر!''

''کس بات کا؟'' وہ ہنس دیئے۔

گھر تک چھوڑنے کا۔'' وہ بھی مسکرائی۔

''اچھا!'' وہ شگفتگی سے بولے ''آئس کریم کا شکریہ کون ادا کرے گا؟''۔

نیلم نے مسکرا کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ گاڑی آگے بڑھا لے گئے۔

ریشم گلی کے کونے پر اس کی منتظر تھی۔

''کتنا کتنے اچھے ہیں آپ کے سر آپی''۔

''جب ہی اس قدر زبان چل رہی تھی تمہاری۔'' نیلم نے گھورا۔

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔'' وہ منہ بنا کر رہ گئی۔



آنکھوں میں کاجل ڈال کر اس نے غور سے آئینے کو دیکھا۔

گہرے ہرے لباس میں، خاص اہتمام کے ساتھ آراستہ کیا گیا۔ اس کا وجود نظر انداز کیے جانے والا ہرگز نہ تھا۔ چست قمیص میں نمایاں ہوتے دلکش نشیب و فراز کسی کی بھی توجہ پل بھر میں اپنی جانب مبذول کر سکتے تھے۔ نفاست سے سنوارے گئے بالوں کی چٹیا ناگن کی طرح سینے پر لہرا رہی تھی۔ کانوں میں چاندی کے آویزے ہولے ہولے ہلکورے لے رہے تھے۔ اس نے گلی کی سمت کھلتی بالکونی کا دروازہ کھول لیا تھا اور کمرے میں ٹھنڈی ٹھنڈی تازہ ہوا کے جھونکے وقتاً فوقتاً در آئے تھے۔

یوسف کے آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی اور ایک مرتبہ پھر آئینے پر نظر ڈالی۔

دل تھا کہ خلفشار وہمات و خدشات کا شکار تھا۔ اپنا آپ سجا سنوار کر یوں ان کے سامنے پیش کرنا اسے بہت عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ کبھی خیال آتا کہ ان کے آنے سے قبل پھر سادہ حلیے میں لوٹ آئے اور ہمیشہ کے لیے تکیے میں منہ دے کر سو رہے۔

کبھی سوچتی کہ تیاری میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔ کوئی چیز ایسی تو نہیں جو انہیں متاثر نہ کر سکے۔ یوسف اس کے شوہر تھے۔ لیکن ان سے ہم کلام ہونے کا خیال اسے زندگی اور موت کا مسئلہ معلوم ہو رہا تھا۔

کال بیل کی آواز گونجی تو اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ وہ جلدی سے دروازے کی طرف سے پشت کر کے بستر پر جا بیٹھی۔

پھر گیٹ کھلنے کی آواز سے لے کر سیڑھیوں پر ہوتی قدموں کی دھمک تک ہر آواز اس نے کان کھڑے کر کے سنی تھی۔

دروازہ کھلا تو وہ اچھل ہی پڑی۔ پلٹ کر دیکھنے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔ وہ اندر آ کر حسب معمول جوتے اتارنے لگے تھے۔ شبنم نے کن

آنکھوں سے دیکھا۔ پیروں میں سلیپر ڈال کر وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گئے تھے مزید پندرہ بیس منٹ تک وہ یہی سوچتی رہی کہ اسے جو کچھ کہنا ہے۔ اس کے لیے مناسب ترین الفاظ کیا ہونے چاہئیں تو ثریا نے اسے حتی الامکان فیڈ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اب اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے دماغ بالکل خالی ہو چکا ہو۔

یوسف نہا دھو کر کپڑے بدل کر نکلے تو وہ خود اسی کش مکش کا شکار تھی کہ بات کہے۔ کہے تو کیونکر کہے۔

وہ کمل کر اپنی جگہ آ کر لیٹ گئے تو وہ آہستگی سے مڑی۔ نجانے کیوں وہ اسی جانب متوجہ تھے۔ اس کی نگاہیں جھک گئیں۔

"کیا بات ہے؟"، انہوں نے بے تاثر لہجے میں پوچھا۔ "کہیں جانا ہے؟"

"نہیں تو۔" اس نے سر جھٹکا۔

"کہیں سے آئی ہو؟"

"جی نہیں۔"

"اچھا۔" وہ خاموش ہو گئے۔

"دیکھیں...... " اس نے اپنی تمام تر ہمت کو جمع کیا "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟"

"کہو؟ کیا بات ہے؟" وہ ابرو اچکا کر اسے دیکھنے لگے۔

"دیکھیں یوسف! کسی بھی انسان کی زندگی بالکل سیدھی اور سپاٹ نہیں ہوتی۔ اس میں مختلف نشیب و فراز آتے ہیں۔ مختلف حادثات رونما ہوتے ہیں کبھی خوشیاں مل جاتی ہیں تو کبھی سخت قسم کے دکھوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے، خوشی اور غم کا تناسب ہر شخص کی زندگی میں موجود ہے کچھ پانے اور کچھ کھو دینے کا عمل سب کے ساتھ ہوتا ہے کوئی بھی شخص پورا یا مکمل نہیں ہو سکتا، کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کمی رہتی ہے۔"

اس نے ایک نظر ان کی جانب دیکھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہے تھے۔"

"کسی ایک کمی کو، کسی خلا کو اپنی پوری زندگی پر محیط کر لینا بڑی نا سمجھی کی بات ہے یوسف۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں جانتی ہوں...... بجو اور آپ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، خصوصاً آپ دل و جان سے انہیں چاہتے تھے، پھر جو کچھ بھی ہوا اسے قسمت کہہ لیں، خدا نے تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ آپ کی زندگی میں بجو کی جگہ میں شامل ہو جاؤں، لیکن اگر ایسا ہو ہی گیا ہے تو اسے جھٹلائے چلے جانا کہاں کی عقل مندی ہے؟ یہ سچ ہے کہ شادی سے لے کر آج تک میں نے بھی محض نا سمجھی اور بے وقوفی کے مظاہرے کیے ہیں۔ لیکن اب مجھے یہ تسلیم کر لینے میں عار نہیں ہے یوسف کہ ایک ڈور میں بندھ کر مخالف سمتوں میں بھاگنے سے سوائے تکلیف کے اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔ خدانخواستہ یہ ڈور ٹوٹی بھی تو جسموں کو زخم زخم کر دے گی۔ ملے گا پھر بھی کچھ نہیں نہ آپ کو نہ مجھے تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ایک بار پھر سب کچھ بھلا کر زندگی کا نئے سرے سے آغاز کیا جائے؟ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ پھر کبھی آپ سے گزشتہ زندگی کا کوئی تذکرہ نہ کروں گی، میں سمجھوں گی کہ وہ کوئی اور تھا جس سے

میری بہن کی منگنی ہوئی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ کسی کو اتنی شدت سے چاہ کر بھلا دینا آسان نہیں، لیکن میں پوری کوشش کروں گی کہ آپ کو ہر وہ خوشی دوں جو نیلی آپ کو دے سکتی تھیں۔"

"ہونہہ۔" وہ استہزائیہ ہنسے تھے "تم مجھے وہ خوشیاں دینے چلی ہو شبنم بیگم جو مجھے نیلی سے مل سکتی تھیں؟ کیا جانتی ہو تم میرے جذبوں کی شدت کے بارے میں؟ جانتی ہو کچھ؟ ارے میں نے اسے چاہا نہیں پوجا ہے، پرستش کی ہے اس کی۔ وہ میرے خوابوں، خیالوں میں اس طرح بسی ہے کہ مجھے تمہارا وجود اپنے آس پاس محسوس ہی نہیں ہو پاتا۔

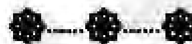
اس کا تصور تمہاری حقیقت سے سو گنا زیادہ مضبوط ہے شبنم! مجھے تو محض اس کو سوچ کر خوشی ہوتی ہے اسے خواب میں دیکھ لوں تو مہینے بھر شاداب رہتا ہوں تم مجھے اس کے حصے کی خوشیاں دینے چلی ہو؟"

"یوسف۔" اس کے لب آہستگی سے ہلے اور دو آنسو پلکوں پر اٹک گئے۔

"اس کی جدائی کی آگ میں اس طرح جل رہا ہوں شبنم بیگم! کہ تمہاری قربتوں کا اثر اتنا بھی نہ ہوگا جتنا کسی برسوں کے پیاسے کو بوند بھر پانی مل جانے سے ہو، میرے لیے تمہارا ہونا نہ ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا بہتر یہی ہے کہ تم بھی مجھ سے کوئی گمان نہ رکھو، تمہارا یہ ہار سنگھار، بنا سنورنا نہ میرے کسی کام آسکتا ہے نہ تمہارے۔ میں تو بس اس دن کے انتظار میں ہوں جب اس سنگ دل، کٹھور پر میری التجائیں، اثر کر جائیں، خدا کی قسم! میں اگلے پل تمہیں آزاد کردوں گا۔"

اس کا پورا وجود اس طرح سے سلگا کہ پھر ساری دنیا دھواں دھواں ہوگئی۔

وہ اپنی بات پوری کر کے کمرے سے نکل گئے تھے۔ اس نے پاگلوں کی طرح خود کو نوچ کھسوٹ کر رکھ دیا۔ پھر بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔



"پھر نیند کہاں آتی ہے جو لگ جاتی ہے، محبوب کی مہندی ہاتھوں میں۔ ارے ہاں، ہاتھوں میں۔ ہوگی ہاتھوں میں۔"

"ہم شکایت لگائیں گے باجی سے۔" جمنا نے کام کے دوران اس کی خلل اندازی پر ہاتھ روک کر اسے گھورا۔

"کیا مطلب شکایت لگائیں گے باجی سے؟" اس نے بھی مزید گنگنانے کا ارادہ موقوف کیا۔ "ہم ایک تو ہاتھ بٹا رہے ہیں تمہارا، دوسرے گانا گا کر جی بھی بہلا رہے ہیں، اس پر بھی یہ گیدڑ بھبکیاں۔"

"یہ ہاتھ بٹا رہے ہو یا مزید کام پھیلا رہے ہو؟ ہم کپڑے تہہ لگا کر پیکٹ میں رکھتے ہیں تم انہیں کھول کھول کر ادھر ادھر پھیلا دیتے ہو۔ ہم ان کپڑوں سے نمٹیں یا تم سے؟" وہ سخت ناراضی کے عالم میں اس کے بکھیرے ہوئے کپڑے سمیٹنے لگی۔

"ایک تو ہم چیکنگ کر رہے ہیں کہ آیا کپڑوں پر کیا گیا کام تسلی بخش بھی ہے یا کاریگروں نے محض امی حضور کو لوٹا ہے اور یہ کہ درزی نے سلائی میں صفائی اور نفاست کا کیا معیار رکھا ہے۔ کہیں لڑکی والوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ اور تم ہمیں رضا کارانہ طور پر کی جانے والی اس خدمت کا یہ صلہ دے رہی ہو؟ ہمارے کام کو بکھراوا اور پھیلاوا قرار دے رہی ہو؟ اگر ہمیں غصہ آ گیا تو ہم ورحقیقت بتا دیں گے کہ بکھراوا اور پھیلاوا ہوتا کیا ہے۔"

"اور ہمیں غصہ آ گیا تو ہم یہ سب چھوڑ چھاڑ کر چلے جائیں گے باورچی خانے میں۔ پھر سمیٹتے رہنا خود ہی۔ ابھی باجی آتی ہوں گی مارکیٹ سے آٹا گوندھ کر روٹیاں بھی ڈالنی ہیں ہمیں۔"

"تو صاف کیوں نہیں کہہ دیتی کہ میاں شہروز! جا کر آٹا گوندھو اور چار روٹیاں ڈال لو۔ یہ اشاروں کنایوں میں بات کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ کام بہت ہے، وقت کم ہے، روٹیاں پکی نہیں ہیں، آٹا گندھا نہیں ہے۔" وہ پاؤں لمبے کر کے صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ جمنا حیرت سے اسے گھورنے لگی۔

"اے لو ہم نے کب ایسا کہا؟"

"ابھی یہی تو کہہ رہی تھیں۔ آنے دو امی حضور کو، آج ہم تمہاری شکایت لگائیں گے کہ جمنا باجی ہمیں اکیلا دیکھ کر کچن کا کام کرواتی ہیں۔"

"ہونہہ۔" جمنا نے سر جھٹکا۔ "جیسے باجی تو ہمیں جانتی ہی نہیں۔"

"یہ بھی سوچ کر وہ ایک ماں ہیں۔ جب اپنے سب سے چھوٹے، لاڈلے بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھیں گی تو ان کے دل پر کیسی برچھیاں سی چلیں گی۔ ایسے میں انہیں کہاں کچھ سجھائی دے گا۔ وہ تو بس اسی پر یقین کریں گی جو ہم ان سے کہیں گے۔"

جمنا اطمینان سے کپڑے تہہ کر کے اٹیچی کیس میں رکھتی رہی۔

"اپنی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا دیکھ کر اسے سخت افسوس ہوا تھا۔ وہ بلا مقصد ادھر اُدھر دیکھنے لگا

"فالتو بیٹھے ہو تو کچھ پڑھائی کر لو۔" جمنا نے اسے مشورہ دیا۔

"تمہیں کس نے کہا ہم فالتو بیٹھے ہیں۔" وہ سخت بھنا یا۔

"تو ہمیں دکھتا نہیں ہے کیا۔ ٹانگ پہ ٹانگ دھرے بیٹھے ہو۔ کیا پہاڑ کھود رہے ہو۔"

"عظیم مفکر کبھی ہاتھوں نہیں بیٹھتے جمنا بائی۔ دنیا میں انقلاب برپا کر دینے والے خیالات کی تشکیل میں مصروف ہوتے ہیں۔"

"اب یوں ہی بولے جاؤ گے۔" اس نے سر جھٹکا۔

"تمہاری مدد کریں تو تمہیں اعتراض۔ خاموش ہو بیٹھیں تو تم نکھٹو کہو۔ کچھ بولنے کی کوشش کریں تو تم طعنہ زن۔ ابھی ٹھیک ہے کہ ہم یہاں سے اٹھ جائیں۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اب چلے کہاں۔ یہ بکسے ہم سے نہیں اٹھنے کے۔ ہم نے کپڑے تہہ کر کے رکھ دیے ہیں۔ یہ دونوں بکسے اسٹور میں رکھ آؤ۔"

"یعنی اب تم نے تسلیم کر ہی لیا کہ ہماری مدد کے بغیر کوئی کام ممکن نہیں۔" وہ مسکرایا۔

"آدھے سے زیادہ کپڑوں کی تہہ ہم نے لگائی۔ سوٹ کیس ہم اسٹور روم میں رکھیں۔ باقی تم نے کیا کیا؟ ایک بجنے کو ہے۔ روٹیاں تک نہیں پکیں۔ آنے دو امی حضور کو۔ آج ہم تمہاری شکایت لگائیں گے۔"

"باجی سب جانتی ہیں۔ ہمیں بھی تمہیں بھی۔" وہ کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"ہمیں آج تک کون جان پایا ہے جمنا بائی۔" اس نے سوٹ کیس اٹھائے تھے۔ "ایک معمہ ہیں سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔"



بڑی دیر سے وہ الماس کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ ہر بار انگیج ٹون سننے کو ملتی۔ تھک ہار کر اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

نجمہ بیگم اور توقیر صاحب کسی عزیز کی تعزیت کے لیے گئے ہوئے تھے اور وہ گھر میں اکیلی تھی۔ پہلے اس نے شہروز کو بلانے کا سوچا پھر خود ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ تنہا گھر میں ایک جوان لڑکے کا آنا کسی کو بھی معیوب لگ سکتا تھا۔ اسی خیال نے اسے شہروز کو بلانے سے باز رکھا۔ پھر اس نے الماس سے کانٹیکٹ کی کوشش کی مگر اس میں بھی ناکامی ہو رہی تھی۔

آخر اس نے ٹی وی آن کر دیا اور خالی الذہنی سے اسکرین کو گھورنے لگی۔ زندگی میں کچھ ایسی تبدیلیاں ہوئی تھیں، جنہیں قبول کر لینا اس کے لیے بے حد مشکل ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ سوچوں پر قابو پانے کی اپنی سی کوششوں میں مصروف رہتی تھی۔ لیکن تنہائی میں ان پر ہر سو امڈتی سوچوں سے نبرد آزما ہونا بڑا ہی تکلیف دہ ہوتا تھا۔ کال بیل کی آواز پر وہ چونک اٹھی۔ نگاہ اٹھا کر وال کلاک کو دیکھا۔

"امی ابا اتنی جلدی آ گئے۔"

وہ اٹھ کر گیٹ کی سمت دوڑ گئی۔

اسے اس وقت نجمہ اور توقیر صاحب کے علاوہ کسی کے گیٹ پر موجود ہونے کی توقع ایک فیصد بھی نہ تھی۔ اسی لیے گیٹ کھولنے پر جو شکل نظر آئی اسے دیکھ کر سخت دھچکا سا لگا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے کچھ بول بھی نہ پائی۔

تو وارد نے ایک نگاہ اس کے حیرت زدہ وجود پر اور دوسری گھبرا کر اپنے سراپے پر ڈالی تھی۔

"آپ کی حیرانی نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔" پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "میں سمجھا، جلدی میں، میں ہی کچھ گڑبڑ کر آیا ہوں۔ پینٹ کی جگہ شلوار یا جائٹ کی جگہ ازار بند۔"

صبا جھینپ کر مسکرا دی۔

"اندر آنے پر پابندی تو نہیں ہے؟ آپ اس طرح رستہ روکے کھڑی ہیں جیسے ابھی کچھ ٹکٹس وغیرہ طلب کریں گی۔"

"وہ۔ دراصل۔ امی ابو گھر پر نہیں ہیں۔" اس نے قدرے جھجکتے ہوئے وضاحت کی تھی۔

"اوہ!" دانیال نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا۔ "اس سے اچھی بات۔"

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا تھا۔ صبا پوری بات سن نہ پائی۔

"جی!"

"میرا مطلب ہے۔ میں انتظار کر لیتا ہوں۔ اگر آپ اندر نہ بلانا چاہیں تو یہیں گیٹ پر۔"

وہ کشمکش کا شکار ہوئی۔

"نہیں۔ آپ اندر آ جائیں۔" پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر اس نے کہا۔ "امی، ابو آتے ہی ہوں گے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" وہ مسکرایا۔

"میں گیٹ کھولتی ہوں۔ آپ گاڑی اندر کر لیں۔"

باہر اس کی چمچاتی گاڑی کو دیکھ کر صبا کو خیال آیا تھا۔

"رہنے دیں۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔ "جلدی اٹھنے کا کوئی تو بہانا ہو۔ گاڑی باہر کھڑی ہو گی تو کم از کم ایک بے کلی تو لاحق رہے گی۔"

صبا بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ کچن میں چلی آئی اور چائے کا پانی رکھنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ سوچتی بھی جارہی تھی کہ چائے کے ساتھ کیا پیش کرے۔

"ہیلو۔" کسی نے مدھم سروں میں کہا تھا۔

وہ اپنی سوچ میں گم تھی۔ ڈر کر دور سے اچھلی۔ سامنے شہروز کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"اچھے بھلے ہوتم؟" وہ جھنجلائی۔ "پل بھر میں سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہو جیسے جادو کے زور پر چلے آئے ہو۔"

"ساری بات خیالات کے حسن کی ہوتی ہے۔" وہ کچھ کھانے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ "ورنہ آپ مجھے فرشتہ بھی سمجھ سکتی تھیں۔"

"فرشتوں کی شکلیں ایسی ہوتیں تو لوگ مارے خوف کے عبادت کرنا چھوڑ دیتے کہ کہیں کوئی فرشتہ نہ چلا آئے۔" وہ ہنسی۔

اس نے لاجواب ہو کر برا سا منہ بنایا تھا۔

"شہروز میاں! لگتا ہے آدمی تم اچھے ہو۔" وہ خود سے مخاطب تھا۔ "سارا زمانہ تمہارا دشمن ہوا جاتا ہے۔"

صبا زور سے ہنس دی۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ چونکی تھی۔ کچن کے دروازے پر دانیال ہاشمی کھڑا تھا۔

شہروز بھی اس کی سمت متوجہ ہو گیا۔

"آپ نے کہا تھا کہ آپ گھر میں اکیلی ہیں۔ مردانہ آواز سن کر میں یہاں چلا آیا۔" وہ وضاحت کرنے لگا۔

"یہ شہروز ہے۔ پڑوس میں رہتا ہے۔ یہ بالکل برابر والا گھر ان کا ہے۔" صبا نے تعارف کروایا۔

"اور شہروز! یہ دانیال ہیں۔"

"اوہ! تو آپ ہیں دانیال ہاشمی!" شہروز نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ "بھئی بڑی تعریفیں سنی ہیں آپ کی۔ ایسا لگتا تھا کہ مٹھی میں مٹھائی کے بجائے تعریفوں کے ٹوکرے آتے ہیں۔"

"واقعی؟" وہ مسکرایا۔ "یقین کرنے والی بات تو نہیں۔ بائی دا وے، یہ تعریفیں کس سمت سے بری تھیں دیکھا تا پتا ہے۔"

"شہروز!" صبا جلدی سے بول پڑی۔ "تم ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔ میں چائے وہیں لے آتی ہوں۔"

"آیئے دانیال صاحب! صبا کی برائیاں کرتے ہیں۔"

وہ اسے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ صبا دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ شہروز کچھ الٹی سیدھی نہ ہانکنے لگے۔ اس سے کچھ بعید بھی نہ تھا۔

جلدی جلدی چائے بنا کر بسکٹس کی پلیٹ ساتھ لیے وہ اندر آئی تو دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔

"دیکھا آپ نے۔ منٹوں میں چلی آئیں کہ کہیں ہم دونوں ان کے خلاف کوئی بات نہ کریں۔ ورنہ عموماً ان کی چائے گھنٹہ بھر میں تیار ہوتی ہے۔" شہروز چہک کر بولا تھا۔

"ہاں ہاں خوب بول لو۔" صبا نے اسے گھورا۔ "تمہیں تو خدا نے موقع دیا۔"

"بدلے چکانے کا۔" وہ برجستہ بولا۔ "ورنہ ہوتا یہ ہے بھا کیلے کے خلاف کئی خواتین بیک وقت کمربستہ ہوئی ہوتی ہیں۔ آج آپ اکیلی ہیں تو ذرا مجھ پہ اکثر و بیشتر گزرنے والی کیفیات کا اندازہ کریں۔"

"واقعی ظلم ہے آپ کے ساتھ۔" دانیال مسکرایا تھا۔ "کمربستہ ہونے کے لیے ایک واحد خاتون کافی ہوتی ہے اور آپ خواتین کا مقابلہ تنہا کرتے ہیں۔"

"نہ صرف مقابلہ کر لیتے ہیں بلکہ بسا اوقات اپنی قینچی جیسی زبان سے سب کو شکست بھی دے ڈالتے ہیں۔ آپ ان کی صلاحیتوں کو انڈر اسٹیمیٹ نہ کریں۔" صبا بولی۔

"ایک صلاحیت کا تو میں بھی معترف ہو گیا ہوں۔" دانیال ہاشمی نے غور سے صبا کو دیکھا۔ "آپ سی کم گو خاتون کو انہوں نے مسلسل بولنے

پر مجبور کیا ہوا ہے۔ ورنہ ہم تو ہر بار تنا کام ہی لوٹے ہیں۔"

صبا شرما کر رہ گئی۔

"ہم کو "اور" خاتون؟" شہروز حیرت زدہ نظر آنے میں مصروف تھا۔ "دو نہایت متضاد خصوصیات کو یکجا کیسے کیا آپ نے؟"

دانیال زور سے ہنس دیا۔

"کیا کریں۔ اپنے اپنے تجربات کی بات ہے۔ میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کی رائے کچھ اور ہو۔"

"چند دن گزرنے دیں۔ پھر آہستہ آہستہ آپ کی رائے بھی بدل لے گی۔" شہروز نے سر ہلا کر گویا اسے تسلی دی۔

صبا چائے میں چینی ملاتے ہوئے مسلسل اسے گھور رہی تھی۔



وہ حسب معمول تھکی ہاری گھر میں داخل ہوئی تھی۔ دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی سن ہو گئی۔ صحن میں اماں کے پاس شبنم بیٹھی ہوئی تھی۔

دونوں نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا مگر دونوں ہی خاموش رہیں۔

"شبو" وہ خود ہی آگے بڑھی۔ "کب آئیں۔ کیسی ہو؟"

"دوپہر میں آئی تھی۔ ٹھیک ہوں۔" اس کا انداز سرد و بے گانہ تھا۔

نیلم پر کوئی شرمندگی اور ندامت کی برف ڈالنے لگا۔ اس کا جسم بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔

"شبو" وہ اس کے ہاتھ تھام کر بیٹھ گئی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟"

"جی بجو!" اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے نکالا تھا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بہت خوش۔ آپ کپڑے بدل لیں۔"

"کپڑے بدل کر دیکھو، یہ مریم اور شبنم باورچی خانے میں گھسی کیا کر رہی ہیں۔ کچھ پکا ڈالو رات کے لیے۔ ہو سکتا ہے یوسف میاں بھی یہیں کھانا کھائیں۔"

وہ دونوں جیسے اس کی ماں اور بہن نہ تھیں۔ وہ جیسے ان دونوں کی کچھ نہ لگتی تھی۔ کس قدر اجنبی، کتنا پرایا تھا ان کا انداز۔

وہ اٹھ کر کمرے تک آئی لیکن اسے لگتا تھا اس نے صدیوں کا سفر کیا ہو۔ پیروں میں چھالے پڑ گئے ہوں، اور زبان میں کانٹے اگ آئے ہوں۔ کاندھے احساس تھکن سے ٹوٹ چکے ہوں اور دل احساس تنہائی میں مردہ ہوا جاتا ہو۔

ریشم کسی کام سے کمرے میں آئی تو وہ آنکھیں بند کیے دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی۔

"بجو!" وہ گھبرا کر آگے بڑھی۔ "بجو کیا ہوا ہے؟"

اس نے بمشکل نفی میں سر ہلایا۔

"بیٹھ جائیں بجو۔ میں پانی لاتی ہوں۔"

نیلم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کچھ نہیں ہوا ریشم! ایسے ہی ذرا چکر سا آیا تھا۔"

"ہاں تو بیٹھ جائیں ناں۔"

بس میں ٹھیک ہوں۔ پنکھا چلا دو۔" وہ بستر پر دراز ہو گئی۔

"کتنا کام کرتی ہیں۔ گھر کا بھی، باہر کا بھی۔ تھک جاتی ہوں گی۔ کھانا لاؤں؟" وہ پنکھا چلا کر اس کے پاس آ بیٹھی۔

"نہیں۔ کیا پکا رہی ہو تم لوگ؟"

"دوپہر میں تو چنے کی دال پکائی تھی۔ مریم نے۔ رات کے لیے بریانی بنا رہے ہیں۔ شبنم آپی آئی ہیں ناں اس لیے۔"

"ہوں! ساتھ میں کباب بھی تل لینا۔ سلاد وغیرہ بنا لینا۔" اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

"جی!" ریشم سر جھکا کر بولی۔ "بجو۔ ایک بات پوچھوں۔"

"ہاں کہو!" اس نے ہاتھ ہٹائے بغیر پوچھا۔

اس وقت دل چاہتا تھا نہ کوئی دل میں جھانکے نہ آنکھوں میں۔ دل کا درد اور آنکھوں کا پانی چھپانا بسا اوقات کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ کیسے کہتی ریشم سے، کہ اسے تنہا چھوڑ دے۔

"بجو۔ یہ اماں اور شبنم آپی آپ سے اکھڑی اکھڑی کیوں رہتی ہیں۔" ریشم نے بھی بھولپن میں دل کی ٹوٹتی رگوں کو براہ راست چھیڑا تھا۔ درد اس کی برداشت سے باہر ہونے لگا۔

"میں نے کتنی ہی دفعہ نوٹ کیا ہے۔ وہ دونوں۔"

"ریشم!" اس نے کروٹ بدل لی۔ "جاؤ مریم کا ہاتھ بٹاؤ۔"

ریشم چند لمحے خاموش بیٹھی اس کے دھیرے دھیرے ہلتے وجود کو دیکھتی رہی، پھر تاسف سے سر ہلا کر اٹھ کر باہر چلی گئی۔

پھر کتنی ہی دیر گزر گئی۔ کمرے میں کوئی نہ آیا۔ ان لوگوں کی باتوں کی آوازیں ضرور آ رہی تھیں۔

نیلم کتنی ہی دیر لیٹی بے آواز روتی رہی۔ پھر نجانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو باہر گھپ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ خود سے نہیں جاگی۔ کسی نے اسے پکارا تھا۔ کوئی سایہ اس کے مقابل تھا۔ پہلے اسے پہچاننے میں کچھ دشواری ہوئی پھر حواس پوری طرح بحال ہوئے تو اسے علم ہوا، وہ شبنم تھی۔

"شبو! تم!"

"جی بجا میں۔" وہ آہستگی سے بستر کے کنارے ٹک گئی۔ "کچھ کہنا چاہتی ہوں آپ سے۔"

"ہاں۔ کہو۔" اس کا رواں رواں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"بجو! یوسف کو اپنا لیں۔ میں ان سے علیحدہ ہو جانا چاہتی ہوں۔"

نیلم کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

"کیا؟ کیا کہا؟ تم ہوش میں تو ہو شبنم!" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

"حالات ایسے ہو گئے ہیں بجو کہ مجھے حقیقتاً ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جانا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے میرے ساتھ ایسا بھی نہیں ہوا۔ دن رات پورے حواسوں میں رہتی ہوں اور ہر بات کو پوری شدت سے محسوس کرتی ہوں۔ یہ بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔"

"شبو!" اس کی آنکھیں لبالب بھر گئیں۔

"میری بات سنیں بجو۔ جو کہنے کے لیے میں نجانے کب سے بے چین ہوں۔" شبنم نے اس کی بات کاٹ دی۔ "دیکھیں بجو! میں، یوسف اور آپ۔ علیحدہ علیحدہ دائروں میں مقید ہیں اور اپنی اپنی سلگائی ہوئی آگ میں جلے جا رہے ہیں میرے حصے میں بھی آپ دونوں کی لگائی آگ ہی آئی ہے۔ اسی لیے میری آگ کی تپش اور جلن دوگنی ہے۔ بجو! میں دن رات جل جل کر ختم ہوتی جا رہی ہوں۔ نہ زندوں میں رہی ہوں نہ مردوں میں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا بجو، وہ کون سی خطا ہے، وہ کون سا گناہ ہے، جس کی مجھے سزا مل رہی ہے۔ زندگی کا سفر بہت طویل ہے اور میرے پاس یہ سفر طے کرنے کے لیے خوشی یا کسی امید کی ایک کرن بھی نہیں ہے۔ بجو! آج میں تمہارے پاس یہ التجا لے کر آئی ہوں کہ مجھے اس سفر سے نجات دلا دو۔ مجھ میں اب گھسٹنے کی سکت بھی باقی نہیں ہے۔"

نیلم نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"یوسف نے مجھے میری آزادی کی قیمت تمہارا اقرار بتائی ہے۔ اگر تم انہیں اپنا لو تو وہ مجھے چھوڑ دیں گے۔"

وہ بے رحمی سے بولے چلی جا رہی تھی۔ نیلم کو چکر آنے لگے۔

"شبنم۔ شبنم۔ خدا کا واسطہ، خاموش ہو جاؤ۔ زندگی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔"

"کھیل اسے میں نے نہیں بنایا بجو۔" وہ تیز لہجے میں بولی تھی۔ "زندگی میں کھیل تو آپ دونوں کر رہے ہیں۔ تماشا دکھانے والا ہے۔ لیکن میں ہمیشہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہوں کہ آخر اس کھیل میں تماشے میں میرا کیا حصہ ہے۔ خیر پچھلی باتوں کو دہرانے سے بھی کیا حاصل؟ بات محض اتنی ہے کہ یہ ضد چھوڑ کر آپ حقیقت کو تسلیم کر لیں تو بہتوں کا بھلا بھی ہو سکتا ہے۔ یوسف آج بھی آپ کے منتظر ہیں۔ وہ اب بھی آپ کو دیوانہ وار چاہتے ہیں۔"

"شبنم!" نیلم نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ "تمہیں قسم ہے۔ اس سے آگے کچھ مت کہنا۔ رشتوں کے تقدس کو اس طرح سے پامال مت کرو شبو! ذرا سوچو اب ان سے میرا کیا رشتہ ہے اور تم؟ تم بیوی ہو ان کی۔"

"رشتے؟ تقدس؟" وہ ہنسی۔ "کیا جانتی ہو بجو آپ ان کے بارے میں۔ جب آپ فیکٹری جانے کے بہانے مختلف ہوٹلوں میں ان سے

ملتی ہو تب ان رشتوں کا تقدس کیا ہوتا ہے؟۔ وہ مجھے بتائے بغیر یہاں آکر تنہائی میں آپ سے ملاقات کرتے ہیں۔ مجھی! مجھے تو سوچ کر حیا آتی ہے۔ اور آپ بات کرتی ہیں رشتوں کے تقدس کی؟۔"

نیلم کا یہ حال تھا کہ کوئی تلوار سے اس کی گردن اڑا دیتا تو اسے خبر نہ ہوتی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ شبنم کے سائے کو گھورے جا رہی تھی۔ وہ بھی جو کچھ بول چکی تھی اس کی کڑواہٹ کو اپنے پورے وجود میں سرایت کرتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ احساس ذلت و ندامت سے خاموش بیٹھی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

"شبنم!" پھر نیلم کے لبوں سے ایک سسکی کی مانند نکلا۔ "کاش کہ تمہارے لبوں سے یہ سب کچھ سننے سے پہلے مجھے موت آجاتی۔ لیکن ابھی کچھ دیر قبل تم نے بالکل ٹھیک کہا کہ بسا اوقات ہوش و حواس میں رہنا اور چیزوں اور باتوں کو پوری شدت سے محسوس کرنا بھی بدقسمتی بن جاتی ہے۔ مجھ سے بڑھ کر بدقسمت کون ہوگا۔ اور۔ اور۔ یہ فرد جرم عائد کرنے سے پہلے تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر مجھے یوسف میں رتی برابر بھی دلچسپی ہوتی۔ تو میں کس بات کا انتظار کرتی۔ بقول تمہارے، وہ آج بھی میرے منتظر ہیں۔ مجھے دیوانہ وار چاہتے، پھر انہیں اپنانے میں بھلا مجھے کیا تامل ہوتا۔ افسوس میری بہن! جوش جذبات میں تم نے یہ سب کچھ کہہ ڈالا لیکن کیا تم یقین کرو گی یہ چند لفظ میری روح میں اتنا گہرا گھاؤ لگا گئے ہیں کہ اب ان کی کسک میں ساری عمر محسوس کرتی رہوں گی۔"

"میری روح کا زخمی پن کس کو نظر آتا ہے بھلا۔" وہ بڑبڑائی تھی۔

"شبو! میرا یقین کرو۔ مجھے یوسف سے نہ کوئی دلچسپی ہے نہ لگاؤ۔ بلکہ تمہارے ساتھ ان کا سلوک دیکھ کر مجھے ان سے نفرت ہو چلی ہے۔"

"میری مجبوری یہ ہے بجو کہ میں نہ ان سے نفرت کر سکی نہ آپ سے۔" وہ تلخی سے بولی تھی۔ "اور ان سے آپ کی یہ نفرت اب میرے کسی کام نہیں آسکتی۔ ہاں، اگر آپ کو 'اب' بھی ان سے محبت ہوتی تب دوسری بات تھی۔"

"میں۔ میں۔ یوسف سے بات کروں۔" نیلم نے بولنے کی کوشش کی۔

شبنم کے انداز اس کے الفاظ کا گلا گھونٹ رہے تھے۔

اس عنایت کا شکریہ!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کالے پانی کی سزا مجھے آپ ہی نے سنائی تھی۔ اب اس سزا میں تھوڑی بہت ترمیم کے لیے آپ تردد نہ کریں۔ میری زندگی تباہ ہونی تھی سو ہو چکی۔ یوسف سے آپ کی یہ نفرت دیکھ کر مجھے اس بات کا اور بھی یقین ہو چکا ہے۔"

وہ کمرے سے نکل گئی۔ نیلم اندھیرے کمرے میں کسی غیر مرئی نقطے پر نظر جمائے تادیر اسی کیفیت میں بیٹھی رہی۔

اس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں عجیب خلا تھے، گہرا سناٹا تھا۔ اور کوئی اس کی آواز سننے والا نہ تھا۔

احساس تنہائی اس کے وجود کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ احساس جرم روح پر تازیانے برسا رہا تھا اور گھائل سوچوں کی مسیحائی کے لیے کوئی نہ تھا



"اتنی سی عمر میں کون کون سی پریشانیاں خود پر سوار کر بیٹھی ہیں؟" فائل پر نظر جمائے وہ اپنی مخصوص سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

نیلم نے چونک کر سر اٹھایا۔

"جی؟ آپ نے کچھ کہا سر؟"

عباسی صاحب ہولے سے مسکرائے۔

"ٹائپنگ میں آج آپ نے اس قدر غلطیاں کی ہیں۔ مس علی کی میں چاہتے ہوئے بھی شمار نہیں کر پا رہا۔"

"اوہ!" وہ انگلیاں چٹخانے لگی۔ "دراصل آج میں کچھ۔ سر درد محسوس کر رہی تھی۔"

"ابھی کچھ دیر قبل میں نے اسی درد کے بارے میں استفسار کیا تھا۔" فائل میز پر ڈال کر وہ مسکرائے۔ "یہ درد اکثر ہوتا ہے آپ کے سر میں۔ کس قسم کا درد ہے مس علی؟"

"نیلی کنفیوژ سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا، وہ غصہ کر رہے تھے، طنز کر رہے تھے یا یہ محض ایک مذاق تھا۔

"آپ ناراض ہیں سر!" وہ بے ساختہ بولی تھی۔ "میں یہ پیپرز دوبارہ سے ٹائپ کر دیتی ہوں۔"

"جی نہیں۔ میرا خیال ہے آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔" وہ متانت سے بولے۔

"سر میں بالکل ٹھیک ہوں۔" ان کا انداز اسے اُلجھا رہا تھا۔

"ابھی تو آپ نے کہا، آپ سر درد محسوس کر رہی ہیں۔" وہ ہنس دیے۔ "مس علی! میں آپ کو سمجھ نہیں سکا۔ ہر وقت ابھی ابھی، کھوئی کھوئی، جیسے کہیں کچھ رکھ کر بھول رہی ہوں، لاتنا ہی سوچوں کا شکار ہوں۔ آخر آپ کے ساتھ کیا پرابلم ہے؟ گھر میں کوئی مسئلہ ہے؟" نیلم پلکیں جھپکائے بغیر انہیں دیکھ رہی تھی۔

"میں آپ کے ساتھ تعاون کرنے کی حتی الامکان کوشش کر رہا ہوں لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ آپ میرے ساتھ بالکل تعاون نہیں کر رہی ہیں۔"

آخر کار ان کے لہجے میں برہمی در آئی تھی۔ نیلم بالکل ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر اس کی پلکوں میں ہلکی سی حرکت ہوئی اور دو آنسو اس کے گالوں پر آ رکے۔

"مس علی!" عباسی صاحب چونک اٹھے۔ "پلیز۔"

"نیلم نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور ہچکیوں سے رونے لگی

"اوہ نو!" وہ کرسی سے اٹھ کر اس تک آئے۔ "مس علی! بھئی یہ کیا حرکت ہے۔" انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اس کے چہرے سے ہٹائے۔

"نیلم۔ پلیز۔"

وہ رونا بھول کر ان کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھ تھامے، اس سے صد درجہ قریب وہ اسے بڑی محبت سے دیکھ رہے تھے۔

نیلم کی نظریں بے اختیار جھک گئیں۔ دل آزردگی کے جال میں نکل کر ایک عجب کیفیات سے دوچار ہوا تھا۔

عباسی صاحب نے جیب سے رومال نکالا اور آہستگی سے اس کا چہرہ صاف کیا۔

"ناؤ ریلیکس!" وہ نرمی سے بولے۔

نیلم نے ہولے سے سر ہلایا۔ وہ اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

"اپنے آنسوؤں کے ساتھ آپ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتیں۔" چند لمحوں بعد وہ مسکرا کر کہہ رہے تھے۔ "اس قدر بے مول ہیں یہ آپ کے نزدیک۔ جب جہاں جی چاہا، گرا دیا۔"

"یہ آنسو بھی میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں کرتے۔ جب جہاں جی چاہتا ہے امڈے چلے آتے ہیں..... شرمندہ کر دیتے ہیں۔" اپنے ہاتھوں پر نظر جمائے وہ گلوگیر لہجے میں کہہ رہی تھی۔ عباسی صاحب نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔

"ایسے تو نہیں چلے آتے یہ آنسو بھی۔ بلاوجہ تو یہ کہیں نہیں جاتے۔ بھلا کیوں یاد کرتی ہیں رو رو کر انہیں؟"

نیلم نے شرمندگی سے انہیں دیکھا۔

"کچھ کہہ دینے سے دل کا بوجھ آدھا ہو جاتا ہے آزما لیجیے۔" وہ لب کشائی پر مجبور کر رہے تھے۔

"جانے دیجیے سر۔ ٹی بریک ہے۔ میں چائے بناتی ہوں۔" وہ نظر چرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کونے میں رکھی الماری سے کپ نکالنے لگی۔ کچھ دیر قبل جو لمحے آ کر گزر گئے تھے، اب تک دل کی تہہ میں ہلچل سی مچا رہے تھے۔ زخم زخم وجود پر کسی کا مہربان لمس اب تک اپنی پوری حرارت کے ساتھ محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے برف ہاتھوں کو وہ اب تک کسی گرفت میں محسوس کر رہی تھی۔

وہ اپنی کیفیت میں گم تھی۔ اسے احساس نہ تھا کہ اس کی پتلی کمر اور اس پر لہرائی سیاہ ناگن سی چوٹی کسی کی نظروں کے حصار میں ہے۔ وہ گہری سیاہ آنکھیں اس کے وجود میں پیوست ہو رہی تھیں۔



"اُف! کس قدر خوبصورت کام ہے آنٹی۔" صبا پوری توجہ اور دلچسپی سے کپڑے دیکھ رہی تھی۔ "یہ آپ نے کہاں سے لیا۔"

"وہیں کیٹلاگز وغیرہ میں سے پسند کیا تھا۔" عفت خانم مسکرائیں۔ "شکر ہے تمہیں پسند آیا۔ میں تو اس فکر میں تھی کہ مجھ بوڑھی کی پسند نجانے کسی کو بھائے گی یا نہیں۔ تمہیں کپڑے اچھے لگے تو یقیناً غزالہ کو بھی پسند آئیں گے۔ ہم عمر لڑکیوں کا مزاج تو ملتا ہی ہے۔"

"آپ کی پسند کا تو جواب نہیں۔" صبا مسکرائی۔ "اور آپ سے کس نے کہا آپ بوڑھی ہیں۔"

"تو کیا جوان ہوں۔" وہ ہنسیں۔

"اتنی گریس فل پرسنالٹی ہے آپ کی۔ مجھے کوئی آپ سا بن جانے کو کہے۔ میں فوراً مان جاؤں۔"
عفت خانم ہنستی چلی گئیں۔
"جمنا بائی! بازار میں کھسن کے کیا بھاؤ ہیں آج کل؟" وہ جھولے میں لیٹا بظاہر کسی کتاب میں گم تھا۔ وہیں سے آواز لگائی۔
"ہمیں کیا خبر۔" جمنا کام میں مگن تھی۔ "بابا سے پوچھو آج کل بھی مارکیٹ جاتے ہیں۔"
"ابا حضور کو تو ڈھیروں ڈھیر مکھن مفت ملا کرتا ہے۔ انہیں بھلا خریدنے کی کیا ضرورت۔"
صبا شرمندہ ہو کر کپڑے واپس سوٹ کیس میں رکھنے لگی۔ عفت خانم نے اسے گھورنے کی کوشش کی جو اس کے چہرے پر بھی کتاب نے ناکام بنا دی۔
اس لڑکے کو کون پورا پڑ سکتا ہے۔" وہ بھی بڑبڑا کر رہ گئیں۔
صبا کو ہنسی آ گئی۔
"آنٹی آپ کے رشتے دار وغیرہ کب آئیں گے؟ ہفتہ رہ گیا ہے مایوں وغیرہ میں۔"
"دعوت نامہ تو سب کو ڈالے ہیں۔ فون بھی کیے ہیں جہاں جہاں ہو سکا۔ اب دیکھو کون کب آتا ہے۔ ہماری طرف سے تو سارے انتظامات مکمل ہیں۔ شکر ہے اس رب کا۔ اس نے توفیق بخشی۔"
"السلام علیکم!" فیروز احمد نے اندر داخل ہوتے ہوئے سلام کیا تھا۔
"وعلیکم السلام۔ جیتے رہو!" انہوں نے محبت سے بیٹے کو دیکھا۔ "آ گئے بیٹا۔"
"ہائیں! گویا ابھی بھی شک ہے۔" کتاب کے پیچھے سے پھر آواز آئی تھی۔
صبا بمشکل ہنسی روک پائی۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے فیروز احمد نے ایک نگاہ اس پر ڈالی تھی۔
"کتنا کام باقی ہے امی؟ کوئی پرابلم تو نہیں۔" وہ ماں سے مخاطب تھا۔
"نہیں بیٹا! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ سارا کام بخوبی نمٹ گیا۔"
"میں چلتی ہوں آنٹی اب۔" صبا نے خود کو اس ماحول میں غیر مناسب خیال کیا۔ "امی انتظار کر رہی ہوں گی۔"
"بیٹھو بیٹا! چائے پی کر جانا۔ جمنا بائی بنانے ہی گئی ہے۔" انہوں نے خلوص سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے پھر بٹھا لیا۔ "شیروز! یہ سوٹ کیس اسٹور میں رکھ آؤ۔"
"میری یہ ڈیوٹی مزید کتنی مدت کی ہے امی جان؟" وہ جھنجلایا۔ "صبح سے رات تک کوئی دس مرتبہ یہ سوٹ کیس وہاں سے یہاں اور یہاں سے وہاں لے جاتا ہوں۔"
جوان آدمی ہو۔ کون سا گھس جاتے ہو۔ انہوں نے برا مان کر اسے دیکھا۔

"جوانی اگر اس مشقت کا نام ہے تو ہمیں آج سے بوڑھا خیال کیا جائے۔" وہ سوٹ کیس اٹھا کر باہر نکل گیا۔

صبا اور عفت خانم ہنس دیں۔ فیروز احمد نے بھی مسکرا کر بھائی کو جاتے دیکھا تھا۔

"میں دیکھوں کھانے میں کتنی دیر ہے۔" انہیں دفعتاً دھیان آیا۔ "ابھی تو جمنا نے چاول بھی نہیں چنے وہ بے چاری بھی تھک جاتی ہے۔ کیا کیا سمیٹتی ہے دن بھر۔"

چپل پہن کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ صبا بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔

جن لمحوں کی کبھی وہ منتظر رہا کرتی تھی۔ آج کس قدر بھاری لگ رہے تھے۔

"اور مس صبا!" وہ یک بیک متوجہ ہوا تھا۔ "آپ کیسی ہیں؟"۔

"جی۔ ٹھیک ہوں۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"خوش ہیں؟"۔

"عجب سوال تھا۔ نجانے اس نے کیوں اور کس ناتے سے کہا تھا۔

صبا نے حیرانی سے پلکیں اٹھائیں۔

اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھا وہ بڑی سنجیدگی سے اس کے جواب کا منتظر تھا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس کے اپنے اندر کئی سوالات ابھرنے لگے۔ وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔

"خوش رہا کریں۔" پھر وہ سر جھکا کر بولا۔ "آپ کے چہرے پر مسکراہٹ بھلی لگتی ہے۔"

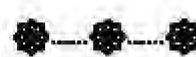
صبا ایک بار پھر حیرانی سے اسے تکنے لگی۔ آج وہ اسے حیران کیے دے رہا تھا۔ پھر وہ اٹھا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

"کتنے گہرے ہو تم فیروز احمد؟ میری صداؤں کی رسائی تم تک اب ہوئی ہے۔ جب میں جواب آنے کی امید سے ہاتھ دھو بیٹھی ہوں؟ سیا۔ یا۔ آج بھی یہ محض میری خوش فہمی ہے جو تمہارے ذرا سے اخلاق کو التفات کا نام دے رہی ہے۔"

شہروز نے اس کے چہرے کے آگے ہاتھ ہلا کر اسے چونکنے پر مجبور کیا تھا۔

"اس گھر میں کوئی آرٹسٹ نہیں ہے۔ بے وجہ پوز بنا کر مت بیٹھا کریں۔" وہ مشورہ دیتے ہوئے اس کے قریب بیٹھا تھا۔

وہ جھینپ کر رہ گئی تھی۔



"جاؤ بیٹی! ساتھ خیریت کے ساتھ جاؤ، ساتھ خیریت کے آؤ۔ میں نے تو کبھی تم لوگوں کی پسند کے کاموں میں رخنہ اندازی کی کوشش نہیں کی۔ تمہیں اور شبنم کو ہمیشہ آمنہ سے بڑھ کر خیال کیا ہے۔" وحیدہ چچی اپنے مخصوص انداز میں بول رہی تھیں۔

"جی امی!" ثریا آہستہ سے بولی۔ "ہمارے لیے بھی آپ ہماری ماں کی طرح ہیں۔"

"ویسے تو یہاں بھی تمہیں کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ہم نے تو تمہیں ہر طرح کا آرام پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی ماں نے بلوایا ہے تو چلی جاؤ۔ کچھ دنوں کے لیے۔ بہن بھائیوں میں رہو گی تو ذرا جی بھی بہل جائے گا۔"

انہوں نے پاندان کھول کر آگے کر لیا۔

"ثریا تم کپڑے تو بدل لو۔ ریاض آتے ہی ہوں گے۔" آمنہ نے کہا۔

"جی بھابی!" وہ آہستگی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اے لو! ان کی اماں کے اطوار دیکھو۔!"

"اس کے باہر نکلتے ہی وحیدہ چچی نے جل کر کہا تھا۔

"کبھی ہماری بچی کے بھی یہ دن آئے تھے۔ جھوٹے منہ نہیں کہا کہ دو دن ماں کے گھر گزار آؤ۔ جی گھبراتا ہوگا۔ اب اپنی بیٹی کی باری آئی تو کیسے شاہوں کی طرح بلوا بھیجا۔ یہاں جیسے اس کو کھانے پینے کو نہیں ملتا تھا!"

"آہستہ بولیں امی!" آمنہ بے بسی سے لہجے میں بولی۔ "سن لے گی ثریا!"

"اے سنتی ہیں تو سنیں۔ میں کیا ڈرتی ہوں۔ جی لگتی کہتی ہوں۔ تمہاری شادی کو کتنے سال ہو گئے۔ کتنے دن چھوڑا ریاض میاں نے تمہیں؟ اپنی بہنا ایسی پیاری ہیں کہ ہر دوسرے دن کھڑے ہوتے ہیں لے جانے کے لیے!"

آہستہ آہستہ بل کر وہ جلے بھنے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ آمنہ نے بے بسی سے شبنم کی طرف دیکھا۔ وہ بے نیازی سے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔

شبنم! بہن تم ذرا ثریا کا سوٹ کیس تیار کر دو۔ اس کے چند جوڑے اور ضرورت کا سامان رکھ دو۔

شبنم سر ہلا کر کھڑی ہو گئی۔

اوپر آ کر وہ ثریا کی الماری کے پٹ کھولے کھڑی تھی۔ بے دھیانی میں اس کے کپڑوں پر نگاہ دوڑا رہی تھی۔ کسی نے پیچھے سے اس کی چوٹی کو جھٹکا سا دیا۔

شبنم چونک کر مڑی۔

"آداب عرض ہے!" ریاض بھائی کھڑے مسکرا رہے تھے۔

گرم گرم لہو اس کے پورے بدن میں دوڑ گیا۔

"آپ!" اس کے تیور بگڑ گئے۔ "یہ کیا حرکت تھی!"

"وہ!" وہ کھسیانے ہو گئے۔ "یونہی تمہیں ذرا چھیڑنے کے لیے۔ وہ سامان رکھ دیا ثریا کا!"

"رکھ رہی ہوں!" اس کا لہجہ خود خشک تھا۔

"اتنی بیگانگی سے کیوں بولتی ہو شبو! کبھی تو مسکرا کر بات کیا کرو۔ آخر ہم بھی تمہارے اپنے ہیں!"

الماری سے ٹیک لگائے وہ انہی بے باک نظروں سے دیکھنے لگے۔ شبنم نے چند لمحے انہیں دیکھا۔ پھر نجانے کیا ہوا۔ عجب خیال تھا جو بجلی بن کر دماغ میں گھوم گیا تھا۔ اور اس خیال نے اسے ایک طمانیت بھرے احساس سے دوچار۔ وہ لگاوٹ سے مسکرا دی۔

"آپ ایسی حرکتیں ہی کیوں کرتے ہیں۔ غصہ دلانے والی؟" چہرے پر مسکراہٹ سجائے وہ ایک ادا سے بولی۔

ریاض بھائی ایک لمحے کے لیے ہونق ہوئے کہ ان کا منہ کھل گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے مسکرا دیے۔

"تو تم جلنا دونا۔ کون سی باتیں تمہاری من بھاتی ہیں۔ ہم وہی باتیں کریں گے۔" وہ کھل اٹھے تھے۔ "تم تو یوں بھاگتی ہو جیسے ہمیں چھوت کی بیماری ہو۔!"

"خدانخواستہ!" وہ ہنس دی۔

"قسم خدا کی شبو۔ تم ہنستی ہوئی کیسی پیاری لگتی ہو۔"

اس کو ذرا سا مائل بہ کرم پا کر وہ ہوش و حواس سے دور ہوئے جا رہے تھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے گھبرا ہی گئی۔

"خدا کے لیے ریاض بھائی! ہوش کی دوا کریں۔" اس نے اپنے کاندھے پر سے ان کا ہاتھ جھٹکا۔ "جائیں نیچے جا کر بیٹھیں۔ میں چیک لے کر آتی ہوں۔"

"ذرا جلدی آنا۔ منظر ادھورا لگتا ہے تمہارے بغیر۔" ان کی باچھیں مسرت سے کھلی ہوئی تھیں۔ جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگ گئے۔

وہ جو انہیں جاتا دیکھ رہی تھی۔ الماری سے سر لگا کر اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سکون اطمینان کی لہریں پورے تن من کو بھگوئے دے رہی تھیں۔ کب سے جلتے سلگتے دل پر ٹھنڈی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک کھڑی اس کیفیت کو محسوس کرتی رہی۔



وہ صوفے پر دونوں ٹانگیں سمیٹے بیٹھی تھی۔ سیاہ لباس میں، اس کا خفگی سے تپا تپا چہرہ بے حد نمایاں تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے، گردن اکڑائے ہوئے چپ بیٹھی تھی۔

"دیکھو بیٹی! فیصلہ تو تم کسی سے پوچھے بغیر، کسی کو بتائے بغیر کر ہی چکی ہو۔ اس کے باوجود تمہیں ابھی بھی تمہارا بھلا برا سمجھانے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ تمہارے اپنے ہیں۔ تم سے محبت کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے الماس۔ بیٹی اگر تم مجھے سیماب سے زیادہ پیاری ہو۔ نجانے کیوں ہمیشہ میں نے اوروں کی نسبت تمہیں خود سے قریب محسوس کیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ تم میں میرے بھائی کی جھلک بہت نمایاں ہے۔" وہ تھکے تھکے انداز میں کہہ رہے تھے۔

"کچھ بھی ہے چچا جان! جیسا کہ آپ نے کہا، فیصلہ میں کر چکی ہوں۔ اور پھر رضا میں کیا برائی ہے آپ تو اب تک اس سے ملے بھی نہیں!"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹی! لیکن بعض باتیں ملے بغیر بھی علم میں آسکتی ہیں۔ میں نے کئی جاننے والوں سے اس لڑکے کا پتا کروایا ہے۔ وہ قابل اعتبار نہیں۔ میں اس پر زور نہیں دیتا کہ تم عثمان سے ہی شادی کرو۔ لیکن کسی قابل بھروسا شخص کو تو اپناؤ۔ تم نے نجانے اس میں کیا دیکھا۔"

"جو کچھ ہونا تھا، وہ تو ہو چکا ناں چچا جان؟" اس نے سر جھکا لیا۔

"ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔" وہ دبی دبی زبان میں بولے۔

"تمہاری بھرلو تو کوشش کی جاسکتی ہے۔"

"کس بات کی؟" اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا تھا۔

دلاور خان گڑبڑا گئے۔ انہوں نے کبھی اپنی کسی بیٹی سے اس قسم کی گفتگو کا تصور بھی نہ کیا تھا لیکن یہ لڑکی نجانے کس بات کی قسم کھائے بیٹھی تھی۔ ہر کسی کو جھکنے اور شرمندہ ہونے پر مجبور کیے دے رہی تھی۔

"طلیحدگی کی!" عاصمہ چچی نے شوہر کو سر جھکاتا دیکھ کر تلخی سے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" الماس نے پہلو بدلا تھا۔

"کتنے دن ہو گئے اس بات کو۔ اب تک وہ کسی سے ملنے بھی نہیں آیا۔ آخر اس گریز کا بھی کوئی مطلب ہوگا۔ ادھر تمہاری بہن کے سسرال والوں نے دلیلیں پکڑلی ہے۔ ان کو بھی کوئی جواب دینا ہے۔ تم محض اپنی ذات کو لے بیٹھی ہو الماس! کچھ تو دوسروں کا بھی لحاظ کرو۔" وہ بہت دنوں سے بھری بیٹھی تھیں۔ بولے بنا نہ رہ سکیں۔

الماس نے خفگی بھری ایک نگاہ چچی پر ڈالی۔

"ویری تھاصمہ۔ ویری تھ!" دلاور چچا نے ان کا ہاتھ تھپکا۔

وہ سر کو جھٹکا دے کر منہ پھیر کر بیٹھ گئیں۔

"بیٹی! ابھی وقت ہے۔ سوچ سمجھ لو!" پھر وہ الماس سے مخاطب ہوئے۔ "اگر پھر بھی تمہارا فیصلہ برقرار رہے تو اس شخص کو بلواؤ۔ اس سے کہو۔ بارات لائے اور عزت سے بیاہ کرے جائے، ہم مہتاز کے سسرال والوں کو بھی تاریخ دیں گے۔"

"میں بتا چکی ہوں چچا جان! وہ ملک سے باہر ہیں اور میرا ان سے کوئی کانٹیکٹ نہیں ہو پا رہا۔ چند روز کی بات ہے، وہ آتے ہی مجھ سے رابطہ کریں گے۔"

"ٹھیک ہے!" وہ مایوسی سے سر ہلا کر کھڑے ہو گئے! "اور بیٹی، ذرا اپنی ماں کی دلجوئی کیا کرو۔ وہ تو اس غم کو لے کر بیٹھ گئی ہے۔"

"امی تو مجھ سے بات کرنا تک پسند نہیں کرتیں، گھر میں ایسا سلوک کیا جا رہا ہے جیسے میں اچھوت ہو گئی ہوں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں!" انہوں نے اس کا سر تھپکا۔

"چند دنوں کی بات ہے، سب کے دل صاف ہو جائیں گے۔ یہاں سب تمہارے اپنے ہیں، تمہیں چاہتے ہیں۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

"کس قدر مغرور اور خود سر لڑکی ہے۔" عاصمہ چچی کمرے سے نکلتے ہی بولی تھیں۔ "کسی کا لحاظ ہے نہ آنکھ میں رتی برابر مروت!"

"رہنے دو بیگم۔ بچی ہے!"

"بچی! غضب خدا کا۔ میں کہتی ہوں۔ خدانخواستہ اپنی سیماب سے ایسی کوئی حرکت سرزد ہوئی ہوتی تو آپ شوٹ کر دیتے! اسے۔ اس کے ناز اس طرح اٹھا رہے ہیں جیسے اس نے کوئی بڑا قابل فخر کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ ہونہہ ایسے صلہ ملا ہے ہماری نیکیوں کا۔ خاندان بھر کا نام ڈبو دیا۔ گویے سے نکاح کر کے بیٹھ گئی۔"

"بیگم!" وہ دبی آواز میں چیخے۔ "خاموش ہو جاؤ!"

"شکر ہے میرے عثمان کی زندگی خراب ہونے سے بچی۔ کوئی نیک سیرت بچی ملائے خدا۔" وہ باز نہ آئیں۔ بڑبڑاتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگیں۔

دلاور خان بھی ہارے ہوئے جواری کی طرح ایک ایک سیڑھی پار کر رہے تھے۔



اپنی سوچتی آنکھوں کو بار بار جھپکتی بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ ریشم نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"تم پر تو ابھی سے نور اترنا شروع ہو گیا ہے غزالہ!" اس نے اسے چھیڑا۔ "شادی کے دن تک تو نجانے کیا سے کیا بن جاؤ گی۔"

"مت کرو ایسی باتیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "غصہ آتا ہے مجھے!"

"چھوڑو غصے کو بھول جاؤ پرانی باتیں۔ اعتماد اور بھروسے سے نئی زندگی کا آغاز کرو، میں نے پہلے بھی کہا تھا اگر وہ تم سے مخلص ہوتا تو بہت پہلے اپنے گھر والوں کو تمہارے گھر بھیجتا۔ اچھا یہ بتاؤ "وہ" کیسے ہیں؟"

"کون؟"

"تمہارے ہونے والے میاں صاحب!"

"پتا نہیں، میں نے نہیں دیکھا۔ بہنیں کہتی ہیں، مجھ سے کافی بڑے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے میرے ماں باپ پیسہ دیکھ کر مجھے کسی بڑے میاں سے بیاہ دینے کے چکر میں ہیں۔"

"مت سوچو ایسی باتیں۔" ریشم نے اسے پیار سے سمجھایا۔ "جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو وہ خود بخود تمہیں اچھے لگنے لگیں گے۔ کیا نام ہے ان کا؟"

"بہروز احمد۔!" اس نے آنسو پونچھے۔

"نام تو اچھا ہے۔ وہ خود بھی اچھے ہوں گے لگتا ہے گریس فل پرسنالٹی ہوگی ان کی۔"

"مجھے کیا!" غزالہ بڑبڑائی تھی۔ "اچھا، یہ لو کارڈ، اس میں مہندی کا بھی کارڈ ہے، تمہیں ضرور آنا ہے۔"

"شادی میں تو ضرور آؤں گی۔ میرا وعدہ ہے۔ البتہ مہندی میں آنا مشکل ہے۔ پتا نہیں ذلفی مانے گا بھی یا نہیں۔"

"نہیں نہیں۔ تمہیں میری قسم ہے۔ دیکھو میں خاص طور پر تمہیں دعوت دینے کے لیے ای کی منتیں کر کے گھر سے نکلی ہوں۔ ورنہ میرے باہر آنے جانے پر کب سے پابندی ہے۔ اب اگر تم نے انکار کیا تو سمجھو دوستی ختم۔!"

"ایسے مت کہو۔ میں نے کہا ناں، شادی میں ضرور آؤں گی!"

"مہندی میں بھی۔" اس نے بچوں کی طرح اصرار کیا۔ "میں بھائی کو بھیج کر بلوالوں گی۔"

"نہیں نہیں۔" ریشم گھبرا گئی۔ "میں خود آجاؤں گی۔ مریم کو ساتھ لے آؤں گی!"

"وعدہ ہے نا!"

"ہاں بابا! پکا وعدہ!" ریشم نے اسکا ہاتھ تھام کر دبایا۔

"اچھا میں چلتی ہوں۔ بھائی گاڑی لیے کھڑا ہے۔ پتا نہیں، کس سے مانگ کر لایا ہے۔ بڑی ضد کر کے آئی ہوں تمہارے گھر۔!"

"بہت شکریہ!" ریشم نے خلوص سے کہا۔

"اس کے جانے کے بعد وہ کچن میں چلی آئی۔ مریم روٹیاں پکانے میں مصروف تھی۔

"تین دن بعد مایوں ہے غزالہ کی، پھر مہندی۔" ریشم نے اسے مطلع کیا۔

"پھر شادی، پھر ولیمہ!" اس نے سنجیدگی سے ٹکڑا لگایا۔

"تو اور کیا؟" وہ روٹی کا ٹکڑا توڑ کر چبانے لگی۔ "تم چلو گی نا میرے ساتھ؟"

"نا بابا! مجھے تو معاف ہی رکھو۔!"

"مجھے نہیں اچھی لگتیں یہ تمہاری غزالہ بیگم!" وہ روٹیاں دسترخوان میں لپیٹنے لگی۔ "کالج میں کسی اور کا دم بھرتی تھی، اب مزے سے کسی اور سے شادی کر رہی ہیں!"

"چچ چچ چچ۔!" ریشم کو افسوس ہوا۔ "بری بات ہے مریم! اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے؟"

"کچھ ایسی بے چاری بھی نہیں ہے وہ!" وہ ہاتھ دھوتے ہوئے بولی۔ "مجھے تو ہمیشہ سے اس کا کیریکٹر مشکوک ہی لگا ہے۔ تمہیں میں نے ہمیشہ اس سے دوستی رکھنے سے منع کیا۔ لیکن تم کب باز آتی ہو۔!"

"تمہیں نہیں جانا تو مت جاؤ۔" ریشم کو غصہ آ گیا۔ "بلاوجہ باتیں کیوں بنا رہی ہو!"

"ہاں بھئی۔ میں نہیں جاؤں گی، ویسے بھی میرے پاس تو کپڑے ہیں نہیں۔ تم نے تو ابو کے کان کھا کھا کر اپنے لیے لے آئیں کپڑے؟"

"ہاں تو یہ کہو ناں۔ تمہیں ان کپڑوں کا غم ستا رہا ہے۔ میری بلا سے، وہ تم لے لو۔"

"میں کیوں لینے لگی۔ تمہاری چیز تمہیں مبارک ہو۔!"

"کیا بات ہے؟" اماں دروازے میں نمودار ہوئی تھیں۔ "کیا جھگڑا چل رہا ہے؟"

"کچھ نہیں اماں!" ریشم جلدی سے بولی۔ "ہم غزالہ کی شادی کی باتیں کر رہے تھے!"

"مریم کھانا جلدی تیار کر لو۔ لڑکے باہر سے آتے ہوں گے!" وہ مریم سے مخاطب ہوئیں۔

"کھانا تو تیار ہے اماں!" وہ آہستہ سے بولی۔

اماں کے جانے کے بعد دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیں۔



"یہ چند کاغذات ہیں۔ انہیں ٹائپ کر کے ان کی فائل بنا دیں۔"

"نیلم کی آنکھوں میں اُلجھن اُتری۔ اس نے ایک نگاہ گھڑی پر ڈالی۔

"جی ہاں۔ ٹائم اوور ہونے والا ہے۔" عباسی صاحب اس کی اُلجھن بھانپ کر مسکرائے۔

"لیکن مجبوری ہے۔ یہ پیپرز آج ہی تیار کرنے ہیں۔ بے فکر رہیں۔ میں بھی یہیں بیٹھا ہوں۔ جب تک آپ کا کام ختم نہیں ہو جاتا، میں بھی اپنا کام کرتا رہوں گا۔"

"میری وین نکل جائے گی سر۔!"

"میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔" وہ مسکرائے۔ "کچھ اور؟"

وہ خاموشی سے ٹائپ رائیٹر میں کاغذ لگانے لگی۔

اس سے پہلے بھی وہ کئی بار اوور ٹائم کر چکی تھی۔ لیکن ہمیشہ پہلے سے اماں کو بتا کر آتی تھی کہ دیر ہو جائے گی۔

"اماں یقیناً پریشان ہو جائیں گی!" اس نے سوچا۔

پھر سر جھکا کر کام میں جت گئی۔

نجانے کتنی گھڑیاں بیت گئی تھی۔ وہ فارغ ہوئی تو سب سے پہلے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ دوسری نگاہ عباسی صاحب پر پڑی۔

دونوں بازو سر کے پیچھے ٹیکے وہ بڑی محویت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ نیلم جھینپ گئی۔

"کام مکمل ہو گیا ہے سر۔!"

"جی؟" وہ چونکے۔ "اچھا! چلیں پھر؟"

"آپ جائیں سر! میں چلی جاؤں گی!" وہ ہولے سے بولی۔

"جی نہیں۔ جیسا طے ہوا تھا۔ ویسا ہی ہوگا۔ چلیں اٹھیں۔"

وہ انکار کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی ہمت نہ ہو سکی۔ اٹھ کر ان کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل آئی۔

"زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟" گاڑی سڑک پر لا کر انہوں نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ "گھر والے پریشان تو نہیں ہوں گے؟"

"اماں کو پتا ہے اکثر اوور ٹائم کرنا پڑتا ہے۔" وہ بولی۔ "پھر بھی، ہو سکتا ہے وہ پریشان ہوں۔"

"جب ایک بات کا علم ہے تو پھر پریشان ہونے کا کیا مطلب؟" وہ مسکرائے۔ "اور پھر نوکری میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔"

"جی!" وہ سڑک پر نظریں جما کر بولی۔

اسے محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بار بار سامنے سے نظر ہٹا کر اس پر ڈالتے تھے۔ اس کی اٹھتی گرتی پلکوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ نیلم اندر ہی اندر ڈوب کر ابھرنے لگی۔

گاڑی اچانک ہی کہیں رکی تو وہ اپنے خیالات سے چونکی۔ وہ ایک ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں تھے۔ کچھ دیر کے لیے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"سر۔!" تحیر کے عالم میں بس یہی بول پائی۔

وہ اپنی سیٹ سے اتر کر گھوم کر اس کی طرف آئے۔

"پلیز۔!" وہ دروازہ کھولے کھڑے تھے۔

"سر! میں۔ گھر جاؤں گی۔"

"ضرور۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ محض گھنٹہ بھر کی بات ہے!"

"سر! گھر والے پریشان ہوں گے!"

"نیلم پلیز! لوگ دیکھ رہے ہیں۔ آئیں شاباش!"

وہ جھجکتی ہوئی گاڑی سے اتر گئی۔ چادر کے دونوں کونوں کو اس نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

ہال میں انہوں نے نسبتاً کونے والی میز منتخب کی۔

"بیٹھیں!"

"سر! یہ اچھی بات تو نہیں ہے!" وہ دبے دبے لہجے میں بولی۔

"کچھ ایسا برا بھی نہیں۔" وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے مسکرائے۔

وہ بے بسی سے سجے ہوئے پھولوں کی آرائش دیکھنے لگی۔

"جانتی ہیں مس نیلم! آج میرا جنم دن ہے۔ سالگرہ ہے میری!" وہ مسکراتے ہوئے اسے بتا رہے تھے۔

"اوہ، مبارک ہو!" وہ بس یہی کہہ سکی۔

"نجانے کیوں، برسوں بعد اس دن کو منانے کا جی چاہا ہے۔" وہ کسی سوچ میں گم ہوئے۔ "ورنہ میں تو عرصہ ہوا، خود کو بھولا بیٹھا تھا۔"

نیلم نے ایک نگاہ ان پر ڈالی۔

"نیلم۔!" اپنے خیالات سے چونک کر انہوں نے اسے دیکھا۔

"جی۔!" اس نے سر اٹھایا۔

"آپ بھی تو کچھ کہیں ناں!"

"کیا کہوں سر! سمجھ میں نہیں آتا!" وہ ہولے سے مسکرائی۔

"ایک بات پوچھ سکتا ہوں۔ قدرے ذاتی!"

"پوچھیں!"

"آپ انگیجڈ ہیں؟"

"نیلم نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے اس کے خدوخال کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس کے اندر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس سوال کے پس پردہ جو اصل سوال تھا۔ وہ بخوبی اسے سمجھ گئی۔

"آپ نے جواب نہیں دیا نیلم!" وہ بلا اجازت بڑے اعتماد سے اس کا نام پکار رہے تھے۔

"نہیں سر!" وہ آہستہ سے بولی۔ "منگنی ہوئی تھی میری ٹوٹ گئی۔"

"اوہ! کون تھا وہ بدقسمت؟" وہ ابرو اٹھا کر پوچھنے لگے۔

"میرے کزن۔ اب وہ میرے بہنوئی ہیں۔ انہوں نے میری چھوٹی بہن کا رشتہ مانگ لیا تھا۔"

''آئی سی!'' انہیں بے حد حیرت ہوئی۔ ''آپ کو چھوڑ کر؟ امیزنگ! شاید وہ دونوں آپس میں کمفرٹ ہوں گے!''

''لمبی کہانی ہے سر۔ جانے دیں!'' وہ اُلجھ کر بولی۔

''ایز یو وش!'' وہ مسکرائے۔ ''وہی باتیں کیجیے جو کرنے کا دل چاہے۔ البتہ مجھے یہ اجازت ہر گز مت دیجیے گا۔!''

وہ ہولے سے ہنس دیے تھے۔ نیلم کے گال تپ گئے۔

''آپ کچھ نہیں پوچھیں گی؟ میرا مطلب ہے، دو افراد ڈنر کر رہے ہیں تو ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں، جیسا کہ میں نے آپ کے بارے میں پوچھا۔ یا شاید اپنی اپنی دلچسپی کی بات ہوتی ہے۔ آپ کو بھلا مجھ میں کیا دلچسپی ہو گی!''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن ویٹر آرڈر سرو کرنے آ گیا تھا۔

کھانا دونوں نے خاموشی سے کھایا۔ نیلم نے چند لقمے زہر مار کر کے ہاتھ روک دیے تھے۔ خلاف توقع انہوں نے اسے ٹوکا نہیں۔ خاموشی سے اپنا کھانا مکمل کیا۔

''چلیں؟'' نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''جی!'' اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بل پے کر کے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''مس نیلم!'' گاڑی میں بیٹھ کر وہ بولے تھے۔ ''میری اس حرکت پر اگر آپ خفا ہیں تو میری معذرت قبول کریں۔ نجانے کیوں میں اپنی اس خواہش پر بند نہ باندھ سکا۔ حالانکہ خوشیوں پر بند باندھتے رہنے کی عادت ہے مجھے، پھر بھی نجانے کیوں! آئی ایم ساری!''

''کوئی بات نہیں سر!'' وہ سر جھکا کر یہی کہہ سکی۔

انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

واپسی کا سفر دونوں نے بڑی خاموشی سے طے کیا تھا۔

گھر کے سامنے وہ دروازہ کھول کر اترنے لگی تو انہوں نے پکار لیا۔

''سنیے!''

''جی سر؟'' وہ اترتے اترتے رک گئی۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا۔ آج میرا جنم دن ہے۔ شاید آپ کو یہ سن کر حیرت ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس دن میں تحفے وصول کرنے کے بجائے خود سے قریب لوگوں کو تحفے دینا پسند کرتا ہوں۔''

نیلم ان کی بات سمجھے بغیر انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

''میں نے آپ کے لیے بھی کچھ لیا ہے!''

انہوں نے جیب سے ایک چھوٹا سا مخملیں ڈبا نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"پلیز! انکار مت کیجیے گا؟"

"نہیں سر!" وہ عاجزی سے بولی۔ "ایسے تو مت کریں!"

"میں نے کہا نا! انکار نہ کریں!"

انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے ڈبا پکڑا دیا۔

"سر۔یہ۔!"

"اب جائیں، دیر ہو رہی ہے۔"

وہ ایک عجب کشمکش کے عالم میں گاڑی سے اتری۔ وہ لمحہ بھر کی تاخیر کیے بغیر گاڑی بڑھا کر لے گئے تھے۔ کچھ دیر وہ وہیں کھڑی بے بسی سے ان کی گاڑی کی بتیوں کو دور جاتے دیکھتی۔



سب کاموں سے فارغ ہو کر اس نے تنہائی میں اس مخملیں ڈبیا کو کھولا۔ خوبصورت، سنہری زنجیر جھلملا رہی تھی۔

نیلم کے لبوں سے گہری سانس آزاد ہوئی۔ زنجیر اٹھا کر اس نے غور سے دیکھا۔ وہ واقعی بڑی دیدہ زیب، بڑی قیمتی زنجیر تھی۔

"آپ انگیجڈ ہیں؟"

اس کے کانوں میں ان کا سوال گونجا، ساتھ ہی ان کی نظریں اس کے پردہ خیال پر نمودار ہو گئیں۔ ان کا ہر ہر انداز بتا رہا تھا۔ وہ اسے دل دے بیٹھے ہیں۔

ایک شرمگیں مسکراہٹ نیلم کے لبوں پر نمودار ہو گئی۔ کتنے عرصے کے بعد اس نے زندگی میں کسی خوبصورت، دھڑکتے احساس کا سامنا کیا تھا۔ اسے لگا، اس کا چہرہ جھملانے لگا تھا۔ جانے زنجیر کا عکس تھا یا کسی خیال کا۔

مسکراتے ہوئے اس نے زنجیر واپس ڈبیا میں رکھ دی۔ اور اسے احتیاط سے اپنی دراز میں منتقل کر دیا۔

کتنے دن بعد وہ بستر پر اس طرح سے دراز ہوئی تھی کہ اس کا دل غموں سے آزاد تھا اور روح پر سکون فضا میں تیرتی محسوس ہو رہی تھی۔ نیند بہت جلدی اس کی پلکوں پر اتر آئی تھی۔



"سردا کہاں بھول آئے پیارے نندویا سردا۔ ہاں سردا!"

وہ مسلسل ڈھول پیٹ رہا تھا۔

ساری لڑکیاں سر کیلڈ کر بیٹھ گئیں۔

"خدا کی پناہ! شہروز کے بچے۔ یہ کون کون سے گانے یاد ہیں تمہیں؟" صبا نے اس سے ڈھول چھیننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "بہت تنگ کر لیا۔ اب ہمیں گانے دو!"

"ہاں تو گائیں نا۔ میرا ساتھ دیں پیارے تندو یا!" اس نے پھر تان لگائی۔

"یہ کیا تندو یا۔ تندو یا لگا رکھی ہے!" صبا بھنائی۔ "کوئی ڈھنگ کا گانا گاؤ!"

"ششش!" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "جمنا بائی نے سن لیا تو آفت مچا دے گی۔ یہ اس کا فیورٹ سانگ ہے۔ اسی سے تو سیکھا ہے میں نے!"

"آنٹی! دیکھیں نا۔ یہ شہروز ہمارے گانے خراب کر رہا ہے۔" نبیلہ نے اندر داخل ہوتی عفت خانم کو دیکھ کر موقع غنیمت جانا، جھٹ اس کی شکایت لگائی۔

"ارے واہ! ایک تو گانے والے آتے نہیں آپ لوگوں کو۔ نہ ہی ڈھول بجانا کسی لڑکی کو آتا ہے۔ جب سے مسلسل فلمی گانے گا رہی ہیں۔ کوئی تک ہے؟ شادی کے گانے گائیں۔ سر دنا کہاں بھول آئے یا جو تیرے بابا کی اونچی حویلی، یا میں لکھ لکھ بھیجوں بتاشے میں۔"

عفت خانم کو ہنسی آ گئی۔

"شیطان کے چیلے! لڑکیوں میں سے۔ گانے دو انہیں۔"

"جی نہیں اماں حضور، یہ قابل نہیں ہونے کا۔ میرے بھائی کی مایوں ہے، میں بھی گانے گاؤں گا۔!" اس نے فیصلہ سنایا۔

"گاؤ مگر شرافت سے۔ حلق کیوں پھاڑنے لگتے ہو۔ عقیلہ نے اسے گھورا۔ "کسی کی آواز ابھرنے ہی نہیں دیتے۔"

"جس میں دم خم ہو اترے میدان میں!" وہ فخریہ بولا۔

"فیروز احمد اندر داخل ہوا تھا۔ اسے لڑکیوں کے درمیان راجا اندر بنا دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ اتری۔

"شہروز۔!"

"جی بھائی؟" وہ چونکا۔ "آ جائیں۔ جگہ بناؤں، لڑکیو! ذرا دور دور ہو جاؤ۔!" ایک زبردست قہقہہ پڑا تھا۔ فیروز احمد کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔

صبا ایک لمحے کے لیے دل کے چور پر قابو پا گئی تھی۔ پھر اس نے دیکھا، نبیلہ بڑی محویت سے فیروز احمد کو تک رہی تھی۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"بکو مت!" وہ خود پر قابو پا کر بولا تھا۔ "باہر جا کر دیکھو تمہارے دوست کھڑے ہیں، حیدر، سلطان وغیرہ۔!"

"واؤ۔ اب آئی دھمال چوکڑی!"

وہ اٹھ کر سب کو پھلانگتا باہر نکل گیا۔ لڑکیوں نے سکون کا سانس لیا۔

فیروز احمد بھی سر جھکا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

انہوں نے دوبارہ رونے کا آغاز کیا تھا۔



"بجو!" وہ چھن چھن کرتی اندر آئی تھی۔ "سچ سچ بتائیں، کیسی لگتی ہوں؟" نیلم نے چونک کر اسے دیکھا پیلے جوڑے میں ملبوس، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں ڈالے وہ معصوم سی پری لگتی تھی۔

ہاتھ کلائیوں تک چوڑیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ گوٹے کنارے سے سجا دوپٹہ اس پر خوب سج رہا تھا۔

"ماشاءاللہ۔" وہ مسکرا دی۔ "کسی کی نظر نہ لگ جائے آپ آیۃ الکرسی پڑھ لو۔"

"اب ایسا بھی کیا!" وہ سچ مچ شرما گئی۔

"جلدی آ جانا ریشم! اماں پریشان ہوتی ہیں۔" وہ اسے چھوڑنے دروازے تک آئی۔

"ذکی کو وقت پر بھیج دیجیے گا نا۔ میں تو اسی کے ساتھ آؤں گی!"

وہ ذکی کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی۔

"اللہ حافظ بجو!"

"اللہ حافظ!"

"وہ کچھ دیر اسے جاتے دیکھتی رہی پھر اندر چلی گئی۔

غزالہ کا چھوٹا سا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ریشم ادھر اُدھر دیکھتی، جھجکتی کمرے میں گھس گئی۔

غزالہ اپنی بہنوں اور سہیلیوں میں گھری بیٹھی تھی۔

"غزالہ!" ریشم نے ہولے سے آواز دی۔

"ریشم!" وہ اُٹھ کر اس سے لپٹ گئی۔ "شکر ہے تم آ گئیں تو۔ میں تو مایوس ہو چلی تھی۔ چشم بددور۔ بڑی پیاری لگ رہی ہو!"

اس نے ریشم کا گال چوما۔

"تم بھی۔" ریشم مسکرا دی۔

"لڑکیوں، چلو باہر نکلو۔" غزالہ مڑ کر لڑکیوں سے مخاطب ہوئی۔ "میرے سر میں سخت درد ہے۔ کچھ دیر کے لیے کمرہ خالی کر دو۔!"

"لڑکیوں کو یہ آرڈر زیادہ پسند نہیں آیا۔ وہ منہ بناتی بڑبڑاتی باہر نکل گئیں۔ غزالہ نے اندر سے کنڈی لگائی۔

"یا خدا!" پھر وہ سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ "سر پھٹا جاتا ہے۔"

"میں دبا دوں!" ریشم نے پیشکش کی۔

"نہیں شکریہ" اس نے انگلیوں سے کنپٹیاں دبائیں۔ "چار گولیاں کھا چکی ہوں۔ کوئی افاقہ نہیں۔ زیادہ شور اور لوگوں کے ہجوم سے میرے سر میں اسی طرح درد اٹھتا ہے پھر کئی کئی دن آرام نہیں آتا۔"

"اوہ۔ تو تم نے کہا ہوتا نا اپنی امی سے۔ وہ ڈاکٹر کو بلا لیتیں۔ میں کہوں کسی سے؟" ریشم اس کی تکلیف دیکھ کر پریشان ہو اٹھی۔

"ریشم نے فکرمندی سے اس کی غیر ہوتی حالت کو دیکھا۔

"خدا را کہو ناں اپنی والدہ سے!"

"ریشم! میری دوست ہو نا پیاری سی۔ ایک کام کرو گی؟" اس نے التجا کی۔

"ہاں ہاں کہو۔!"

"دوپٹہ اوڑھ کر تم باہر چلی جانا۔ رسمیں کروا لینا۔ کسی کو کیا پتا چلے گا۔ اپنے قد اور جسم بالکل ایک سے ہیں۔!"

"ریشم اپنی جگہ سے اُچھل ہی پڑی۔

"کیا تم ہوش میں تو ہو؟ لوگ کیا کہیں گے؟"

"ہمارے ہاں رسم ہے، جب دلہن کو مہندی کی رسمیں کرنے کے لیے لے کر جاتے ہیں۔ کوئی اس کا چہرہ نہیں دیکھتا۔ یقین کرو، کوئی گھونگھٹ نہیں اٹھائے گا۔ بلکہ بڑی سی چادر ڈال کر لے جائیں گے تمہیں!"

"ہائے میرا سر۔!" وہ بستر پر پڑ گئی۔ "خدا کا واسطہ ریشم۔ میں مرنے کے قریب ہو گئی ہوں، سر پھٹا جاتا ہے۔ اور باہر کتنا شور شرابا ہوگا۔ تم سمجھتی کیوں نہیں!"

ریشم اس کی حالت دیکھ کر متذبذب ہو گئی۔

"کسی کو علم ہوا تو میں سارا الزام تم پر رکھ دوں گی۔" وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

"وعدہ کرتی ہوں۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا! کپڑے تو تمہارے بھی پیلے ہیں۔ یہ میرا دوپٹہ اوڑھ لو۔ اوپر سے یہ چادر ڈالو۔ تمہارا پورا جسم چھپ جائے گا!"

اس نے پلک جھپکتے میں اسے تیار کر دیا۔

"دیکھو بال برابر فرق نہیں ہے۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"خدا را۔ میرا دم گھٹ جائے گا!" وہ رو دینے کو تھی۔

"میری خاطر ریشم!"

ریشم کو یونہی شبہ سا ہوا۔ کوئی گلی کی جانب کھلتی کھڑکی میں کھڑا تھا

اس نے چادر اٹھا کر دیکھنا چاہا لیکن اسی لمحے فضا میں کچھ دھماکے سے ہوئے۔

"دولہا والے آ گئے ہیں!" غزالہ بولی۔ "تم بستر پر بیٹھ جاؤ۔ میں باتھ روم میں ہوں۔ لڑکیاں آ کر تمہیں دلہن بنا کر لے جائیں گی!"

"غزالہ!" اس نے بولنا چاہا لیکن وہ کنڈی گرا کر باتھ روم میں جا چکی تھی۔

باہر ایک شور مچا ہوا تھا۔ دولہا والے آتشبازی کر رہے تھے۔ وہ نجانے کتنی دیر بے دم سی بیٹھی رہی۔ پھر دروازہ کھلا اور ہنستی مسکراتی لڑکیاں اندر آ گئیں۔

"لو۔ یہ خود تیار بیٹھی ہیں!"

کسی نے اس کا بازو تھاما۔

"چلو اٹھو۔ تمہارے سسرال والے بڑے بے چین ہو رہے ہیں!"

وہ لرزتی۔ کانپتی ہزار اندیشوں کا شکار ان کے درمیان چلنے لگی۔ جی ہی جی میں جتنی آیتیں اسے یاد تھیں۔ اس نے سب پڑھ ڈالیں۔

اسے کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ نجانے کون کون آ کر اسے مہندی لگاتا گیا۔ وہ بیٹھی جی جان سے کانپ رہی تھی۔ چادر کے اندر اسے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔

"اگر کسی نے گھونگھٹ اٹھا لیا۔" رہ رہ کر اسے خیال آتا۔ "اگر کسی نے پہچان لیا۔"

"امی حضور۔ ہم بھی مہندی لگائیں گے اپنی بھابی جان کو!"

ایک شوخ مردانہ آواز اس کے عین سر پر گونجی تھی۔ وہ اچھل ہی پڑی۔

"بس کرو بیٹا! بچی تھک گئی ہو گی۔" کسی خاتون نے کہا تھا۔

"تو ہم کون سا پہاڑ کھدوا رہے ہیں ان سے۔ ذرا سی مہندی لگائیں گے اور اپنی بھابی کو دیکھیں گے اور بس!"

ایک بم تھا جو اس کے اعصاب پر آ کر لگا تھا۔

"بدتمیزی نہیں شہروز۔ بھابی کو کل دیکھنا۔" کسی نے سرزنش کی۔

"ارے کل تو انہوں نے ایسی ایسی خطرناک چیزیں لگائی ہوئی ہوں گی چہرے پر کہ اصل چہرہ ڈھونڈے دکھائی نہ دے گا۔ ہم تو آج والا چہرہ دیکھیں گے۔ سادہ دھلا دھلایا۔"

اس سے پہلے کوئی اسے منع کرتا وہ چادر اٹھا کر جھانکنے لگا تھا۔

ریشم کی وہ حالت تھی کاٹو تو لہو نہیں۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

"ماشاءاللہ۔ چشم بد دور!" وہ ہنسا تھا۔ "نظر تو اٹھائیں بھابی! ہم آپ کے دیور خاص ہیں۔"

ریشم نے یک بارگی نگاہ اٹھائی۔ ایک بھرپور، جوان مرد اس کے چہرے پر اس قدر قریب چہرہ کیے اسے پرشوق نگاہوں سے تک رہا تھا۔ وہ سانس لینا بھول گئی۔ دل، کسی جال میں پھنسی چڑیا کی مانند پھڑک رہا تھا۔ شہروز نے ان لرزتی پلکوں اور کانپتے ہونٹوں کو دیکھا۔ پھر اسے نجانے کیا

ہوا۔اس نے آہستگی سے چادر گرا دی۔

"دیکھ لیا بھائی کو۔!"عفت خانم نے اسے چپت لگائی۔"ہو گیا شوق پورا!"

"جی۔!"وہ نجانے کیوں ساری شوخی بھول گیا تھا۔

"چلو بھئی لڑکیوں۔لے جاؤ بہن کو۔"کسی نے اس کے شانے تھام کر اسے کھڑا کیا۔لڑکیاں اسے کمرے کے دروازے پر ہی چھوڑ گئیں۔

"جاؤ بھئی اندر۔ہم تو چلے دولہا والوں سے مقابلہ کرنے۔"انھوں نے اسے اندر دھکیل دیا۔پھر وہ سب کی سب ہنستی،مذاق کرتی واپس چلی گئی تھیں۔

ریشم نے اندر داخل ہو کر دروازے سے ٹیک لگائی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔کمرہ خالی پڑا تھا۔باتھ روم کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔غزالہ وہاں نہیں تھی۔

"غزالہ!"اس نے آواز دی۔"کہاں ہو؟"

"اچانک ہی اس کی توجہ بستر پر پڑے کاغذ نے اپنی جانب مبذول کروائی۔اسے کسی حادثے کا یکلخت ادراک ہوا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر کاغذ اٹھایا۔لکھا تھا۔

"آپ لوگوں نے زبردستی مجھ پہ یہ رشتہ تھوپا تھا۔اب اس کی سزا بھگتیں۔میں گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔کل بارات کو جو چاہیں جواب دیں۔!"

غزالہ

اسے حقیقتاً چکر آیا۔بستر پر بیٹھ کر وہ خود پر قابو پانے لگی۔پھر اس کی توجہ اپنے سراپے پر گئی۔جلدی جلدی اس کا دوپٹہ اور چادر بستر پر پھینک کر اس نے اپنا دوپٹہ اوڑھا اور منہ چھپا کر کمرے سے نکل گئی۔



دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا تھا۔مریم نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا۔گھبرائی گھبرائی سی ریشم اندر داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"ریشم۔"

وہ جو الگنی پر کپڑے سمیٹ کر لائی تھی،پریشان ہو اٹھی۔دونوں ہاتھوں میں سمیٹے کپڑے چارپائی پر ڈال کر اس کے قریب چلی آئی۔

"کیا بات ہے؟کس کے ساتھ آئی؟دلی تمہیں لینے گیا تھا،وہاں پہنچا نہیں؟"اس نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"اماں کہاں ہیں؟اور بجو؟"وہاں اس کے سوالوں کے جواب میں کچھ دوسرے ہی سوال تھے۔

"اماں نماز پڑھ رہی ہیں، بجو کھانا کھا کر لیٹی ہیں۔ کیا ہوا ہے ریشم۔"

"کچھ نہیں!۔"

اس نے جیسے سکون کا سانس لیا تھا۔ پھر وہ کچن کی سمت بڑھ گئی۔

مریم کچھ دیر کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر وہ اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ ریشم پیڑھی پر بیٹھی صدیوں کے پیاسے کی طرح پانی کا کٹورا منہ سے لگائے ہوئے تھی۔

"تم نے دلہی کا انتظار بھی نہیں کیا؟ کس کے ساتھ آ گئی ہو؟" اس کی الجھن ہنوز برقرار تھی۔

"اکیلی!۔" اس نے کٹورا لبوں سے ہٹایا۔

"اکیلی؟ اتنی دور سے؟" اس کی آنکھیں پھیل گئیں "اتنی رات گئے تم اکیلی آ گئیں۔ ریشم ایسی کیا آفت آ پڑی تھی جو تم سے ذرا سا انتظار نہ ہو سکا۔"

"مریم۔" اس نے ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر دیکھ کر رازداری سے کہا۔ "ایک بات سنو، بہت خطرناک۔"

"بہت خطرناک۔..... ہاں کہو!۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"غزالہ..... غزالہ....." الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔ "غزالہ گھر سے بھاگ گئی۔"

مریم بری طرح اچھلی تھی۔

"کیا......؟ بھاگ گئی؟ مگر کیوں کس کے ساتھ؟"

"شی آہستہ بولو۔" ریشم نے اس کا ہاتھ دبایا "بجو یا اماں نے سن لیا تو میری خیر نہ ہو گی۔ اماں کہیں گی، میری دوستی نجانے کیسی لڑکیوں سے ہے۔"

"وہ۔" الفاظ پھر اس کے گلے میں اٹکنے لگے "مریم! دراصل اس نے مجھے......"

"کیا تمہیں؟" مریم نے اسے گھورا۔

"دیکھو..... تم مجھے ڈانٹو گی، بجو کو بتا دو گی۔" وہ خوفزدہ ہوئی۔

"بکو مت۔ جلدی جلدی کہو، کیا تیر مار کر آئی ہو تمہاری بے وقوفیوں سے تو میں پہلے ہی عاجز آئی ہوں۔" مریم کو پکا یقین ہو گیا کہ وہ کچھ ایسا ویسا کر آئی ہے۔

ریشم نے ڈرتے جھجکتے اسے ساری رام کہانی سنا ڈالی۔

"میرے خدا!۔" مریم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "ریشم! تمہیں کیا سرسام ہو گیا تھا؟ ہوش حواس کھو بیٹھی تھیں اپنے ماتنا بڑا ڈرامہ اتنے آرام سے کھیل کر چلی آئیں اگر تمہارا پول وہاں کھل جاتا کوئی تمہیں پہچان لیتا تو کیا عزت رہ جاتی تمہاری؟ لوگ کیا کہتے؟ غزالہ کے

ماں باپ، بہن بھائیوں کے سامنے تم کیا جواب دیتیں، کتنے لوگوں میں تماشا بن کر رہ جاتیں تم، وہ دیوانی لڑکی تو جو قدم اٹھا چکی سو اٹھا چکی۔ تم! تم کس جرم کی پاداش میں وہ بے عزتی جھیلتیں؟"

"مجھے کیا علم تھا مریم وہ کیا کھیل کھیلنے جا رہی ہے۔ جس وقت وہ گڑگڑا کر مجھے دستخط کروانے پر مجبور کر رہی تھی۔ میرے فرشتوں کو خبر نہیں تھی کہ وہ سب ایک دھوکا ہے۔ میں تو اس کی بگڑتی حالت کے پیش نظر یہ سوچ کر راضی ہو گئی کہ اگر بعد میں کچھ ہوا بھی تو میں سارا الزام اس کے سر رکھ کر بری الذمہ ہو جاؤں گی اور چونکہ اس کی طبیعت اس قدر خراب ہے تو کوئی کچھ کہے گا بھی نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے مریم کہ شاید میں نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ اس نے مجھے سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

"اور اب سوچو کہ تم کتنی نادان ہو اور کتنی آسانی سے بے وقوف بنائی جا سکتی ہو۔ میں تمہیں ہمیشہ اس لڑکی سے دور رہنے کا مشورہ دیتی رہی اور تم نے کبھی میری باتوں کو قابل اعتبار نہ جانا۔" مریم ناراضی سے بولی "اور تم یہ مت سمجھو کہ تم صاف بچ کر نکل آئی۔ وہاں سب کو علم ہوگا کہ غزالہ نے تم سے کوئی خاص بات کہنے کے لیے کمرہ خالی کروایا تھا اور تم اس کی واحد دوست تھیں جو اس کے فرار کے وقت اس کے پاس موجود تھیں۔ اس کے ماں باپ ضرور یہاں آئیں گے یہ جاننے کے لیے کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ گئی ہے۔"

"مجھے کیا معلوم۔" وہ سخت خوفزدہ ہو گئی۔ "وہ میرے پاس کیا لینے آئیں گے۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ وہ لڑکا کہاں رہتا ہے۔"

"کوئی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم جانتی ہو اور یہ کہ تم نے غزالہ کے فرار میں اس کی پوری مدد کی ہے اور تم مجھتی ہو اماں اور ابو کو کچھ پتا نہیں چلے گا، انہیں ساری بات بتائی جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ تم خود پہلے انہیں اعتماد میں لے لو۔"

"مریم۔" وہ رونے لگی "میں کیا کروں، میں کیوں بیٹھے بٹھائے اس مصیبت میں پھنس گئی۔"

"تمہاری اپنی نادانیاں ہیں بھگتو۔"

دروازہ بجنے کی آواز پر دونوں چونک اٹھی تھیں۔

"میں کھولتی ہوں۔" ریشم جلدی سے اٹھنے لگی۔

"رہنے دو۔" مریم نے اس کا ہاتھ تھاما "ناصر دیکھ لے گا۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ یوں منہ اٹھا کر دروازے پر مت پہنچ جایا کرو۔"

چند لمحوں بعد دلی ان کے سر پر تھا۔

"کس کے ساتھ آئی ہو۔" وہ اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"م......میں......" وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"غزالہ کا بھائی چھوڑ گیا تھا۔" مریم جلدی سے بولی۔ "وہ اپنے کچھ رشتے داروں کو چھوڑنے اس طرف آیا تھا۔ دیر ہو جانے کے خیال سے یہ بھی چلی آئی۔"

"مجھے خوار کیوں کروایا۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا چل دیا۔

"مریم۔" ریشم نے ڈرتے ڈرتے اسے دیکھا۔ "دلشی وہاں سے ہو کر آیا ہے۔ اتنے بڑے حادثے کی اسے بالکل خبر نہیں ہوئی۔؟"

"اب کیا وہ لوگ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کروا دیں گے کہ ہمارے غیرے کو علم ہو جائے۔" وہ جلا گئی ابھی تو وہ اس تلخ حقیقت کو خود بھی قبول نہیں کر پائے ہوں گے۔ اپنے طور پر کوشش کر رہے ہوں گے اسے ڈھونڈ کر واپس لانے کی۔"

"اللہ کرے وہ مل جائے۔ ہے نا مریم۔"

"ہاں خدا کرے۔" وہ بڑبڑائی "نادان لڑکی۔ اس درجہ نادانی۔"

"مریم۔" ریشم اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم بھی تو میری ہم عمر ہو پھر تمہیں یہ عقل مندی کی باتیں کیسے آ جاتی ہیں؟۔"

مریم نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

❀.....❀.....❀

"اوہ تھینکس گاڈ۔" ایک گہری سانس اس کے سینے سے آزاد ہوا تھا۔

کتنے اعصاب شکن لمحات ہوتے تھے جب وہ دوسری جانب جاتی ہوئی بیل کی آواز سنا کرتی تھی۔ آج کئی دنوں کے بعد وہاں کا ریسیور اٹھایا گیا تھا۔

"الماس! کیسی ہو۔" رضا اس کی آواز پہچان کر پوچھ رہا تھا۔

"اس کے لہجے میں وہ ساری بے قراریاں تھیں جنہیں محسوس کرنے کی وہ متمنی تھی۔ اسے لگا اس کے دل و دماغ کا آدھا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔

"رضا! رضا تم۔" کچھ دیر کے لیے اس سے کچھ بھی نہ بولا گیا۔

"بولو جانم۔" وہ مسکرا رہا تھا" کتنے دن ہو گئے ہیں اس مدھر آواز کو سنے ہوئے پتا ہے الماس! جب سب لوگ میری آواز کی تعریف کرتے ہیں میرے گلے کی مٹھاس کو سراہتے ہیں تو میں سوچتا ہوں اگر یہ لوگ تمہاری آواز سن لیں تو شاید دیوانے ہی ہو جائیں میری طرح۔" وہ ہنسا۔

کانوں کے رستے دل میں اترتی ہوئی آواز

دیوانہ سا اور مدہوش سا کرتی ہوئی آواز

"لفظوں کے ہی تو جادوگر ہو تم۔" وہ قدرے خفگی سے بولی تھی" جب جسے چاہا اپنے الفاظ کے پھیرے میں لا کر بے بس کر ڈالتے ہو۔"

"ارے ارے...... یہ کیسی باتیں کر رہی ہو جانم۔" وہ ہنسا" ایسے گلے شکوے تم جیسی شاندار لڑکی کو سوٹ نہیں کرتے۔ کوئی اچھی سی بات کرو پیاری سی۔ تمہیں علم تو ہو کہ ہم اتنے دن بعد اپنے وطن کو لوٹے ہیں اور اپنی منکوحہ سے بات کر رہے ہیں۔"

"جس کا پچھلے کئی دنوں سے تمہیں شاید کوئی خیال ہی نہیں تھا جسے تم بھولے بیٹھے تھے۔" وہ تیزی سے بولی "تمہیں کچھ علم ہے رضا کتنے ٹینس کر دینے والے دن تھے یہ۔ مجھے لگتا تھا مجھے کچھ ہو جائے گا۔ یا تو میں پاگل ہو جاؤں گی یا خودکشی کر لوں گی۔"

"ہوں ہوں۔ پاگل ہوں آپ کے دشمن۔ ارے الماس بی بی! آپ تو وہ ہیں جس کی طرف دوسرے لوگ پاگل ہوتے ہیں یا خودکشی کر بیٹھتے ہیں۔ آپ پر بھلا یہ وقت کیوں آئے۔"

"رضا.....ابی سیریس پلیز۔"

"او کے۔"

"دیکھو ایسا کرو شام کو یہاں گھر آ جاؤ۔ دلاور چچا تم سے ملنا چاہتے ہیں نہ صرف وہ بلکہ گھر کے سارے افراد نہایت بے چین ہیں۔ ہر کوئی تمہیں جاننے کا تم سے ملنے کا خواہش مند ہے۔ مجھ پر کتنا پریشر ہے تمہیں لفظوں میں نہیں بتا سکتی۔"

"دیکھو الماس! میں تمہاری پرابلم کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔" وہ سنجیدہ ہو گیا "اور اسی لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ ہمیں اپنے اس تعلق کو کانفیڈنشل رکھنا ہے لیکن تمہاری جلد بازی نے سارا کام بگاڑ دیا۔"

"میری جلد بازی؟ تمہیں پتا تو ہے رضا ہر کوئی مجھے پریشرائز کر رہا تھا عثمان سے شادی کرنے کے لیے۔ آخر میں کب تک انہیں بہانوں سے مطمئن کر سکتی تھی؟ آخرکار مجھے اپنے انکار کی ٹھوس وجہ بتانی ہی تھی۔ ہاں ویسے شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ میں نے واقعی جلد بازی سے کام لیا ہے۔"

اس کے انداز میں بے بسی در آئی تھی۔

"الماس! ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ می جانو! میری مجبوریوں کو سمجھو آخر میں کس بیس پر تمہارے چچا سے بات کرنے آؤں۔ میرے پاس کچھ تو ہو۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارے والد کن دنوں میں یہاں ہوتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟ اس بات سے تمہارے آنے کا کیا تعلق؟۔"

میرے خیال میں زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ میں تمہارے والد سے بات کروں تمہارے چچا کی نسبت وہ زیادہ سوٹ ایبل شخص ہیں یہ باتیں کرنے کے لیے۔"

الماس نے ایک گہرا سانس لیا۔

"میرے والد کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے رضا! میرے چچا ہی ہماری فیملی کو لک آفٹر کرتے ہیں۔ تمہیں ان سے ملنا ہے۔"

"واٹ؟۔" اسے جھٹکا لگا تھا یہ سن کر "تمہارے والد آئی مین.....کیا تمہارے والدین میں طلاق ہو چکی ہے۔"

"او ہو.....تم نے.....تم نے مجھے پہلے کبھی یہ بات کیوں نہیں بتائی الماس۔"

"کیا فرق پڑتا ہے تکلیف دہ باتیں نہ کہی جائیں تو زیادہ بہتر رہتا ہے خیر تم اس ٹاپک کو جانے دو، پھر آ رہے ہو نا؟ چچا تم سے جلد از جلد ملنا چاہتے ہیں۔"

"دیکھو الی! میں کل رات ہی لوٹا ہوں۔ ابھی مجھے ڈھیروں کام نمٹانے ہیں۔ تمہارے چچا سے میں ذرا ذہنی طور پر پرسکون ہو کر ملنا چاہتا ہوں، تم کیوں نہیں چلی آتیں شام کو۔"

"میں؟ میں اب شاید نہ آسکوں۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"وائے ناٹ۔ تم خود مختار ہو۔ کسی کی پابند تو نہیں۔ آجاؤ نا۔ اللہ کتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں دیکھے ہوئے۔ تم سے ملے ہوئے۔ آجاؤ نا پلیز۔"

اس کی آواز میں وہی خمار اترنے لگا جو اکثر اس کے ہوش و حواس کو خوابیدہ کر دیا کرتا تھا۔

"او کے آئی ول ٹرائی۔"

"میں انتظار کروں گا۔"



"اوفوہ ارے کبھی کوئی میری نظر اتار دے۔ میں تو پورا شہزادہ لگ رہا ہوں۔" اس نے راسلک کے کرتے اور شلوار میں ملبوس اپنے سراپے کو آئینے میں غور سے دیکھا۔ "ارے جنتا باجی لال مرچ لے آؤ میں بیمار ہی نہ پڑ جاؤں۔"

"ہمیں کرنے کے اور بھی بہت کام ہیں۔" گہرے جامنی رنگ کا ریشمی لباس زیب تن کیے جنتا باجی نے قدرے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا۔ "دلہن کو لے آؤ۔ رات کو اتار دیں گے نظر۔"

"ہاں تب تک ہم مرجھا کر ہی رہ جائیں گے" وہ بگڑا "تمہیں کیا پتا کل کی تقریب میں لڑکیاں ہمیں کس کس طرح سے گھور رہی تھیں۔"

"شہروز...... ابھی وہ چھوہارے کہاں ہیں۔" عفت خانم گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی تھیں۔ "پورا ٹوکرا خدا جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔"

"یہ بھی ہمارا کمال ہے" وہ فخریہ مسکرایا "وہ ٹوکرا ہم گاڑی میں رکھ چکے ہیں۔"

"یا خدا......" وہ جھنجھلا گئیں "کام سرانجام دے کر اطلاع تو کر دیا کرو۔ دیکھو میں گھنٹہ بھر سے خوار ہو رہی ہوں اور تم یہاں گھسے کیا کر رہے ہو۔ ابھی سہرابندی ہونے والی ہے۔"

"ہائیں بھائی جان کے بجائے ہماری سہرابندی؟ یہ کیا ماجرا ہے۔ ہم نے پہلے ہی کہا تھا۔ امی حضور! ہمیں دلہن والوں سے چھپا کر رکھیں خیر ہمیں چنداں اعتراض نہیں آپ چلیے ہم آتے ہیں۔"

"ہائے کب کے چلے گئے۔" جنتا ہنسی تھی۔

"اوہو......ہو......" وہ گھبرا کر دروازے کی سمت بڑھا تھا۔

پیچھے ایک ادھم مچا ہوا تھا، ہر کوئی اپنی اپنی تیاری میں مصروف تھا۔ بارات روانہ ہونے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی۔

"دیکھو تو نبیلہ...... یہ جمیلہ کہاں رہ گئی۔ میرے کپڑے پریس کرنے کے لیے لے گئی تھی۔" نبیلہ کی والدہ اس سے مخاطب تھیں۔

"وہ اوپر گئی تھی۔" نبیلہ اپنا آئی لائنر ٹھیک سے جمانے میں مصروف تھی۔ "میں دیکھتی ہوں۔" وہ اپنا میک اپ کا سامان واپس بیگ

میں رکھنے لگی۔

"اسی وقت صبا اور نمرہ لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں۔ سیاہ چمکدار ریشم کے لباس میں کھلی کھلی صبا کی جانب کئی طرف سے نظریں اٹھی تھیں۔

"السلام وعلیکم۔" وہ نبیلہ سے مخاطب تھی۔

"اوہ..... والسلام۔" اس نے سراہتی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ "بہت پیاری لگ رہی ہو۔ بھئی منگنی کے تو بڑے مثبت اثرات نظر آرہے ہیں۔ بہت نکھر گئی ہو تم صبا!"

"تھینک یو!" وہ شگفتگی سے ہنس دی۔

قدرے فاصلے پر کھڑے فیروز احمد نے ایک گہری نگاہ اس کی جانب کی تھی۔ وہ جانے کس کام سے اندر آیا تھا اور اپنی جگہ پر جیسے تھم سا گیا تھا نبیلہ کی بات اس نے بڑے غور سے سنی تھی۔ صبا کو وہ نظر بہت اجنبی، پرائی سی لگی تھی۔ جیسے وہ کسی اور کی نظر ہو۔ فیروز احمد نے تو اسے آج تک اس طرح سے نہ دیکھا تھا کہ وہ خود میں سمٹ کر رہ جائے، نجانے وہ پتھر کب اور کیسے موم ہوا تھا۔

"بھائی جان۔" شہروز نے اسے چونکا دیا "بھائی جان کہاں ہیں۔"

"پتا نہیں۔ وہ تیار ہونے اپنے کمرے میں گئے تھے۔" فیروز نے غور سے بھائی کا چہرہ دیکھا "کیوں کیا بات ہے۔"

"آپ ڈرائنگ روم میں چلیے۔" وہ قدرے عجلت میں کہتا ہوا سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا تھا، وہ تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔

اندر عفت خانم کے ساتھ غزالہ کے والدین موجود تھے۔

فیروز احمد نے ماں کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔ اس کے اندر کئی خدشات نے بیک وقت سر اٹھایا تھا۔

"کیا بات ہے امی جان؟ خیریت ہے نا؟"

"بیٹے! بہروز کہاں ہے۔" انہوں نے مری مری آواز میں پوچھا۔

"آتے ہیں۔ شہروز بلانے گیا ہے انہیں۔" اس نے ایک نگاہ سر جھکا کر بیٹھے ہوئے میاں بیوی پر ڈالی۔

"خیریت تو ہے انکل۔"

اسی لمحے بہروز احمد شہروز کے ہمراہ ہی اندر داخل ہوئے۔

"السلام علیکم۔" انہوں نے غزالہ کے والد سے مصافحہ کیا۔

"تشریف رکھیے۔" وہ خود بھی ماں کے برابر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "ایسا کیا معاملہ آن پڑا جو آپ کو زحمت کرنی پڑی۔"

"بیٹے.....ا.....ہم.....ہم۔" غزالہ کے باریش والد کا چہرہ ضبط سے سرخ ہو رہا تھا "ہماری بیٹی.....غزالہ....." وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیے ان کی بیوی بھی سسکیاں لینے لگیں۔

''ہم ہاتھ جوڑ کر معذرت کرنے آئے ہیں ہمیں معاف کر دیں۔''

''کیا بات ہے کچھ تو کہیں بزرگوار۔'' بہروز احمد حتی الامکان پرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''غزالہ...... کہیں چلی گئی ہے......''

''کیا؟'' ان کے اعصاب پر بم گرا تھا۔ ''کیا مطلب؟ کہاں؟۔''

''معلوم نہیں یہ شادی اس کی مرضی کے خلاف ہو رہی تھی، اس نے ہمیں اچھی سزا دی۔ اس عمر میں ہمارے منہ پر یہ کالک مل کر جانے کہاں چلی گئی۔''

چاروں ماں بیٹے ایک سکتے کے سے عالم میں بیٹھے ان دونوں کو روتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

''آپ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں بزرگوار!'' بالآخر فیروز احمد نے لب کشائی کی ''ہمارے گھر بارات نکلنے کے لیے تیار کھڑی ہے، تقریباً سارے مہمان آچکے ہیں اور آپ کہتے ہیں...... دیکھیں...... یہ ہمارے لیے بڑی بے عزتی کی بات ہے۔''

''آپ کے لیے بے عزتی کی بات ہے۔ ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ ہم کس کس سے اپنی ذلت کا یہ ماجرا کہیں گے یہ سوچیے۔''

''لیکن...... اب کیا ہو سکتا ہے اگر آپ کی بیٹی ذہنی طور پر تیار نہیں تھی تو آپ لوگوں نے جبراً یہ رشتہ طے ہی کیوں کیا۔'' شہروز غصے میں کھڑا ہو گیا۔

''اب یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے بیٹے۔'' عفت خانم نے اس کا ہاتھ پکڑا ''بیٹھ جاؤ۔''

''لیکن امی! ہم کیا کہیں گے لوگوں سے؟۔'' وہ دبی دبی آواز میں چیخا۔

''شہروز...... پلیز......۔'' بہروز احمد نے پلکیں جھپکا کر نظروں کے سامنے چھا جانے والے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی اور ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

''پورا دن گزر گیا اسے تلاش کرتے ہوئے۔ ہر جگہ دیکھ ڈالی جانے وہ کہاں اور کس کے ساتھ چلی گئی ہے۔'' غزالہ کی ماں نے چادر کے پلو سے آنسو پونچھے ''خدا کسی دشمن کو ایسی بیٹی نہ دے۔ کس حال میں چھوڑ کر گئی ہے۔ ہمیں نہ ادھر کا چھوڑا نہ ادھر کا...... ارے...... کیسا زخم لگا گئی ہے۔''

''صبر کریں، بہن! صبر کریں۔'' عفت خانم ماں کا دکھ محسوس کر کے تڑپ اٹھیں۔ ''بہت بڑا سانحہ ہے لیکن صبر کے سوا چارہ نہیں۔''

''اس سے تو اچھا تھا، وہ اس بھری جوانی میں مر جاتی، اسے اپنے کاندھے کا سہارا دے کر قبر کر آتا تو ایسی اذیت نہ ہوتی......'' بوڑھا باپ سر جھکائے بڑبڑا رہا تھا۔

''بہروز احمد آہستہ آہستہ فیروز احمد سے کچھ باتیں کر رہے تھے۔

"کچھ کہو بیٹے!" عفت خانم نے بے چارگی سے ان کی طرف دیکھا "کیا کرنا ہے؟"

"کرنا اب کیا ہے امی جان۔" انہوں نے گہری سانس لی "بات چھپانے سے چھپ نہیں سکتی۔ بتانے سے بن نہیں سکتی جو حال سب سے کہہ ڈالیے۔"

"بہروز!" وہ تڑپ اٹھیں "بڑی ذلت کی بات ہے بیٹے۔"

"ہمارے نصیبوں میں لکھی تھی امی جان۔" وہ سر جھکائے بولے۔

"بیٹے۔" انہوں نے فیروز احمد کی جانب ملتجی نظروں سے دیکھا "تم ہی کچھ کہو، کوئی تو راستہ بتاؤ۔"

فیروز احمد نے عجیب سی نظروں سے ماں کو دیکھا برسوں بعد ان کے خاندان کو کوئی خوشی نصیب ہونے جا رہی تھی۔ اور برسوں بعد پھر ایک لڑکی نے ان لوگوں کا سکون درہم برہم کر دیا تھا۔ ایک بار پھر اس کے دل میں عورت ذات سے سخت قسم کی نفرت کا احساس پیدا ہوا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ دنیا کی ساری عورتوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے گولیوں سے بھون ڈالے۔

"بہروز۔" عفت خانم کو گھپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن ہاتھ لگی تھی۔ "نبیلہ! نبیلہ کی ماں سے بات کروں۔"

"خدا کے لیے امی! کسی کو اتنا تو بے وقعت مت کیجیے۔" انہوں نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

"نہیں بیٹا! میرا مقصد کسی کو بے وقعت کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس وقت اگر وہ لوگ ہماری مدد کر دیں تو ہمارے لیے نہایت قابل احترام ٹھہریں گے، ہم تو ساری زندگی ان کے آگے سر جھکائے رہیں گے۔"

"نہیں امی جان۔" وہ گہرا سانس بھر کر اٹھ کھڑے ہوئے "ایک بار وہ اسی مقصد کے تحت یہاں لا کر لوٹائی جا چکی ہیں، اب ان حالات میں ان کے آگے دست سوال دراز کرنا گھٹیا پن اور ان کی توہین ہوگی۔ شاید ہماری قسمتوں میں سیاہیاں ہیں۔ خوشیاں ہمیں راس نہیں آئیں گی امی جان! اس بات کا اب یقین کر ہی لیں تو بہتر ہے۔"

"میرا خیال ہے امی درست کہہ رہی ہیں بھائی جان۔" شہروز دبے دبے انداز میں بولا۔ "خوشیوں سے چہکتے گھر کو ماتم کدہ بنانے سے بہتر ہے کہ تھوڑی سی روشنیاں کسی کے آگے دست سوال دراز کر کے ہی حاصل کر لی جائیں۔"

"مجھے مجبور نہ کریں پلیز۔" وہ کمرے سے نکل گئے۔



دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

تھکے تھکے انداز میں یوسف اندر داخل ہوئے تھے۔

"کہاں ہیں سب لوگ؟" انہوں نے ایک نظر اس کی سوجی سوجی آنکھوں پر ڈالی۔

"کون لوگ؟" وہ تلخی سے بولی۔ "یہاں رہتا ہی کون ہے؟"

''اماں کہاں گئی ہیں؟'' وہ آ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

''آمنہ کی طرف گئی ہیں۔'' اس نے واپس منہ تکیے میں دے لیا۔

''تم بھی چلی جاتیں۔ اکیلے گھر میں رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس پر ساری کھڑکیاں دروازے کھول کر یہاں آ کر ایسے لیٹ جاتی ہو جیسے نگرانی کے لیے دس چوکیدار موجود ہوں۔ کوئی گھس آئے تو کیا کرو گی۔'' وہ سخت جھلائے ہوئے جوتے اتار رہے تھے۔

''کون سے خزانے دفن ہیں یہاں۔'' اس نے ایک طنزیہ نگاہ ان پر ڈالی۔ ''رہی میری بات تو میں تو ایک ایسا بے مول کھوٹا سکہ ہوئی جسے وہ شخص بھی کوئی اہمیت نہیں دیتا جس کی جیب میں، میں نجانے کب سے پڑی ہوں۔''

''خود کو بے قدر مت کرو شبنم بیگم۔'' وہ عجیب انداز میں مسکرائے۔ ''تم پورا خزانہ ہو۔ خود کو کھوٹا سکہ کر اپنی قدر مت گھٹاؤ۔ بس یہ ہے کہ سارے خزانے ہر کسی کے لیے نہیں ہوتے۔ تم بھی ہو مگر میرے لیے نہیں ہو۔ اور میرے لیے جو ہے، وہ فی الوقت میرے پاس نہیں صرف ذرا سی جگہیں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے اور پوری کایا پلٹ ہو جائے گی۔ اپنی تنہائیوں کے یہ عذاب رت جگوں کی داستانیں جا کر کبھی اپنی بہن کو بھی سناؤ۔ مجھ پر نہ سہی، شاید اسے تم پر ترس آ جائے اور تم.....'' وہ ذرا سا رک کر آگے بڑھ گئے۔

''آزاد ہو جاؤ''

جملہ مکمل کر کے وہ باتھ روم میں گھس گئے تھے۔

شبنم کے تن بدن میں انگارے سلگ اٹھے۔ نس نس میں لہو زہر بن کر دوڑنے لگا۔ یوسف کی زبان سے نیلم کا ذکر اس کے اندر چھپے آتش فشاں کے دہانے کو کھول دیا کرتا تھا۔

''یہ اسے دنیا کی گھٹیا ترین گالی لگا کرتی تھی۔ بستر کی چادر کو اس نے دونوں مٹھیوں میں بھینچ لیا'' یوسف صاحب! یہ تنہائیاں یہ رت جگے، اس لیے میرا مقدر کیے گئے ہیں، اس لیے میں اس پنجرے میں مقید کی گئی ہوں کہ میری زبانی میرا حال سن کر شاید آپ کے حال پر رحم کیا جائے، میں وہ بے مول کیڑا ہوں جسے آپ نے اپنی ڈور میں مچھلی کو شکار کرنے کے واسطے لگا رکھا ہے۔ بس یہی مطلب ہے میرے وجود کا، یہی ہے میری حقیقت، ذلتوں کا ایک بھنور ہے۔ جس میں آپ نے مجھے چکرانے کے لیے چھوڑ دیا ہے تاکہ ایک دن یہ ذلت یہ تحقیر سہہ کر میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاؤں۔ اپنے آپ سمیت ہر شے کو فراموش کر ڈالوں لیکن نہیں میں بھی آج قسم کھاتی ہوں، یہ ذلتیں یہ عذاب میں اسی طرح سے آپ کو لوٹا دوں گی۔ اس کسک سے آشنا کروں گی تمہیں کہ دن رات سسکتے ہی رہو گے۔ رشتوں کے درد کو سمجھے نہیں ہو ناں سمجھنے لگو گے۔''

منہ تکیے میں گھسا کر وہ تیز تیز سانسیں لے رہی تھی۔



''بجو!'' مریم نے ڈرتے ڈرتے اسے مخاطب کیا تھا۔

''ہوں.....کہو۔'' وہ سر جھکائے کچھ لکھنے میں منہمک تھی۔

"باہر باہر کوئی کھڑا ہے۔"

"کون؟۔" اس نے سر اٹھایا۔

"بجو...... وہ ریشم کی دوست تھی نا غزالہ۔" اس نے تھوک نگلا۔ "اس کا بھائی آیا ہے۔ ریشم کو بلا رہا ہے، ریشم کو ڈرگ رہا ہے۔"

وہ کچھ دیر حیرانی سے مریم کی سمت دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں فوری طور پر کچھ بھی نہ آسکا۔

"کیا مطلب؟ کون غزالہ اور اس کا بھائی ریشم کو کیوں بلا رہا ہے۔"

"بجو...... وہ غزالہ، جس کی شادی ہونا تھی۔"

"ہونا تھی، ہاں ہاں پھر ہوئی نہیں۔" اس کی حیرانی دو چند ہوئی۔

"بجو وہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔"

"اوہ گاڈ۔" وہ سن ہو کر رہ گئی "بھاگ گئی؟ بچ بچ بچ لیکن اس کا بھائی ریشم سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ کہیں وہ بے وقوف لڑکی تو کچھ کر کے نہیں آئی۔"

"اس کا بھائی شاید یہ سن کر یہاں آیا ہے کہ ریشم، غزالہ کے بارے میں یقیناً کچھ نہ کچھ جانتی ہو گی کہ وہ کہاں گئی ہے۔ کس کے ساتھ گئی ہے۔"

"کیا ایسا ہی ہے؟ ریشم کو علم ہے۔"

"نہیں بجو! اس بے چاری کو تو گمان تک نہ تھا کہ وہ لڑکی کیا کرنے جا رہی ہے۔ وہ بہت ہوشیار لڑکی تھی اس نے تو ریشم کے فرشتوں تک کو خبر نہ ہونے دی۔"

"اچھا چلو میں دیکھتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر چپلیں پہننے لگی۔ دوپٹہ سر پہ جما کر وہ دروازے پر آئی تھی

"جی بھائی۔" اس نے ذرا سا باہر جھانکا "فرمایئے۔"

"مجھے ریشم سے کام ہے۔ اس کو بھیجیں۔" باہر کھڑے لڑکے کا انداز گستاخانہ تھا۔

"ریشم گھر پر نہیں ہے، میں اس کی بڑی بہن ہوں، جو کہنا ہے مجھے کہیں۔"

دیکھیں بی بی! ہماری بہن گئی ہے ہماری اب کوئی عزت نہیں رہی، آپ کی ابھی عزت ہے۔ بہتر یہی ہے ہمارے ساتھ تعاون کریں ورنہ ہمیں اب کوئی ڈر خوف نہیں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیسی باتیں کر رہے ہیں، دیکھئے آپ کی بہن سے ریشم کی صرف سرسری سی جان پہچان تھی جو آپ سمجھ رہے ہیں ویسی کوئی بات نہیں۔ آپ کی بہن اگر اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہے تو اس میں ریشم کا کوئی حصہ نہیں ہے اور برائے مہربانی ان دھمکیوں سے

گریز کیجیے۔ یہ شریفوں کا گھر ہے، یہاں اس طرح منہ اٹھا کر چلے آنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے اندر سے تختی پیدا کی۔

"آپ ریشم کو بلائیں۔ مجھے اس سے کچھ پوچھنا ہے، غزالہ کے ساتھ وہی تھی آخری لمحوں میں۔ اسے یقیناً ہر بات کا علم ہے جب ہی وہ کسی کو بتائے بغیر چلی آئی تھی۔"

"ریشم گھر نہیں ہے۔ میں عرض کر چکی ہوں۔" اس نے دروازہ بند کرنا چاہا۔ جواب میں اس نے اپنا پاؤں اندر کر کے اس کی کوشش ناکام بنادی۔

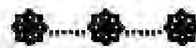
"دیکھو بی بی! ہم سے مت بگاڑو، پچھتاؤ گی۔ ہمیں صرف یہ جاننا ہے کہ وہ کس کے ساتھ گئی ہے، پھر ہم تمہاری بہن کو کچھ نہیں کہیں گے یہ پولیس کیس ہے۔ ہم نے رپورٹ میں تمہاری بہن کا نام لے دیا تو سوچ لو تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

"نیلم.....مریم.....کون ہے باہر۔"

اندر سے اماں باہر کی طرف آرہی تھیں۔ اس لڑکے نے اپنا پاؤں پیچھے کیا اور پلٹ کر دو راہ قطلے پر کھڑا بائیک پر جا بیٹھا۔ دوسرے ہی لمحے گلی میں گرد اڑتی نظر آرہی تھی۔ نیلم نے دروازہ بند کر لیا۔

"کون تھا نیلم!" اماں صحن تک آ پہنچی تھیں۔

"کوئی نہیں اماں۔" وہ زیر لب بڑبڑائی "یونہی کسی کا گھر پوچھ رہا تھا۔"



وہ زارو قطار رو رہی تھی۔

"یوں ٹسوے بہانے کی ضرورت نہیں ہے ریشم!" وہ بری طرح سے چڑی ہوئی تھی۔ "تم جانتی نہیں ہو۔ کس مشکل میں گرفتار ہو گئی ہو مجھے سچ سچ بتاؤ، وہ لڑکی کس کے ساتھ گئی ہے اور اس کے فرار میں تمہارا کیا رول ہے۔"

"قسم لے لیں بجو......" اس نے آنسو پونچھے "میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ کالج میں کسی لڑکے میں انٹرسٹڈ تھی۔ وہ لڑکا کون تھا۔ کہاں رہتا تھا، میں نہیں جانتی۔ غزالہ مجھے کبھی بات بتاتی بھی تھی تو میں دلچسپی نہیں لیتی تھی، پھر اس نے بتایا۔ اس کے والدین نے اس کی شادی کہیں اور طے کر دی ہے۔ بس یہ سارا قصہ ہے۔ مہندی والی رات......"

اس نے ایک نگاہ مریم پر ڈالی، مریم نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔ ریشم اس کا مطلب سمجھ گئی۔

"مہندی والی رات جب میں گاتے گاتے تھک گئی......تو غزالہ کے پاس اس کے کمرے میں گئی، وہ وہاں نہیں تھی۔ بستر پر اس کا خط پڑا تھا میں نے وہ خط پڑھا تو میرے حواس معطل ہو گئے۔ میں جلدی میں کسی سے کچھ کہے بغیر واپس آگئی۔"

"یہی تو غلطی کی تم نے۔ تمہارے اسی اقدام سے ان لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ فرار میں تمہارا بھی حصہ ہے۔ وہ تمہاری مدد سے بھاگی ہے۔"

"نہیں بجو..... قسم سے ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"یا خدا.....!" نیلم نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا "میں کیا کروں، یہ حالات تو کسی بھی شخص کو پاگل کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ ساری مصیبتوں نے کیا ہمارا گھر ہی دیکھ لیا ہے جو آفت ٹوٹتی ہے، وہ ہم پر آ کر ٹوٹتی ہے۔"

اس کے لہجے میں نمی اتر آئی۔ ریشم اور مریم نے ایک دوسرے کی سمت دیکھا۔

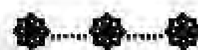
"اور تم ریشم؟ تم سے مجھے اسی قسم کی حماقتوں کی امید رہی ہے۔ آخر مریم بھی تو ہے، اس کی دوستی کیوں نہیں تھی اس لڑکی سے۔ انسان کو یہ دوستیاں بھی دیکھ بھال کر پالنی چاہئیں، جہاں برائی نظر آئے وہاں سے دامن بچا کر گزرنا ہی عقل مندی ہوتی ہے۔ بیٹھے بٹھائے اچھی مشکل میں پھنس گئے ہم۔"

"بجو.....۔" مریم نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا "اتنی فکر مند نہ ہو۔ جب ہمارا کوئی قصور ہی نہیں ہے تو ہم بلاوجہ کیوں اندیشے پالیں۔"

"تم نے اس لڑکے کی باتیں سنی تھیں ناں! اچھا ہوا بدمعاش لگ رہا تھا۔ میں نہیں چاہتی بزدلی اور ناصر کسی مشکل میں پڑیں۔"

"خدا نہ کرے اور بدمعاش ہوگا وہ اپنی گلی کا۔ ہم سے اس کا کیا واسطہ۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ دفعہ اور آ جائے گا اور بس بھلا کیا بگاڑ لے گا ہمارا۔"

نیلم فکر مندی سے کچھ سوچنے لگی تھی۔"



لاؤنج میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا، ہر چند کہ وہاں کئی افراد موجود تھے۔ سب ایک دوسرے سے نظریں چرائے اپنی اپنی سوچوں کے حصار میں تھے۔

"ہمارے ارمان تو......" جنا بائی نے ایک گہری آہ بھری۔ "مٹی میں مل گئے، کبھی کسی کے ساتھ ایسا بھی ہوتا ہے، جیسا ہمارے ساتھ ہوا۔"

"بس جنا بائی! خدا کی رضا اسی میں تھی۔" عفت خانم نے چھت پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ "بندے کو صبر شکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے کیا خبر، اسی میں ہماری کوئی بہتری چھپی ہو۔"

"جی ہاں۔ شہروز نے تلخی سے کہا "محترمہ ہمارے گھر قدم رنجہ فرما کر یہ حرکت کرتیں تو...... بھائی جان کو بھی نجانے کیا سوجھی تھی۔"

"میرا بچہ۔" عفت خانم نے گہری سانس لی۔ "کتنے انتظار کے بعد یہ دن آئے تھے۔ کیسا ارمان تھا مجھے اپنے بہروز کے سر پہ سہرا سجا دیکھنے کا اور وہ دن آیا بھی اور یوں ہی گزر گیا، ہمارا دامن میں کوئی خوشی ڈالے۔"

"امی۔!" فیروز احمد نے ماں کا ہاتھ تھاما "بس، زیادہ مت سوچیے یہ بھی کیا کم مقام شکر ہے کہ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں، بخیر و عافیت اپنی چھت کے نیچے ہیں۔ لوگوں پر تو نجانے کس کس طرح کے حادثے گزر جاتے ہیں۔ گھروں کے گھر تباہ ہو جاتے ہیں جوان حادثوں کو سہ جاتے

ہیں، وہ بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں نا یہ تو بڑا معمولی سا واقعہ ہے چند دنوں میں ہم سب اسے ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جائیں گے۔ بھائی کی منگنی انشاء اللہ جلد کسی اچھی جگہ پر ہو جائے گی۔"

حشمت خانم نے بیٹے کو تشکر بھری نظروں سے دیکھا۔

"ٹھیک کہتے ہو بیٹا! خدا تم بھائیوں کو لمبی عمر دے۔ صحت سلامتی دے، خوشیاں دے۔ یہ چھوٹے موٹے حادثے تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔"

"چلیں پھر اپنے کمرے میں چل کر تھوڑا سا آرام کرلیں۔ کب سے جاگ رہی ہیں۔" وہ ماں کو سہارا دے کر ان کے کمرے میں لے گیا۔

شہروز احمد نے گہرا سانس بھر کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"ایسی معمولی بات بھی نہیں ہے بھائی! جسے اس قدر جلد فراموش کر دیا جائے۔" وہ سوچ رہا تھا "میرے بھائی کے سینے میں کیسا گہرا گھاؤ لگا ہے۔ میں جانتا ہوں اب عرصے تک وہ مسکرانے کی ہمت نہ کر پائیں گے...... اف" اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"وہ لڑکی...... وہ لڑکی مجھے مل جائے تو گلا گھونٹ دوں اس کا۔ اپنی عزت داؤ پر لگائی تھی تو ہماری خوشیوں سے کھیلنے کی کیا ضرورت تھی، ہمارے دلوں کو روند کر گزرنے کی اجازت اسے کس نے دی، کیا بگاڑا تھا میرے معصوم بھائی نے اس کا۔"

اس کے پردہ تصور پر دو لرزتی پلکیں اور کانپتے ہونٹ نمودار ہو گئے اس نے سختی سے آنکھیں بھینچ لیں۔

❁......❁......❁

"اندر آسکتی ہوں۔"

وہ ذرا سا اندر کیے لبوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ سجائے پوچھ رہی تھی

"ارے شبنم......" آمنہ کو بے تحاشہ حیرت ہوئی تھی۔ "آؤ، آؤ...... یا خدا! میں حیرت سے مر ہی نہ جاؤں۔"

"اللہ تمہیں عمر دراز عطا فرمائے۔" وہ ہنستی ہوئی اندر چلی آئی۔

آمنہ نے اس کی تیاری کا نہایت حیرت سے جائزہ لیا۔ ڈارک پرپل پر جڑاؤ ساڑھی میں وہ نہایت خوبصورت لگ رہی تھی۔ چست، مختصر سے بالٹروز سے اس کے جسم کی ساری دلکشی جھلک رہی تھی۔ ہونٹوں پر آتشیں لپ اسٹک سجائے آنکھوں میں کاجل بھرے وہ قتل کر ڈالنے کی حد تک حسین نظر آرہی تھی۔

"شبو...... یہ تم ہی ہونا۔" آمنہ نے اسے بازوؤں سے تھاما۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔" وہ ہنسی۔

"شکر ہے خدا کا۔ تمہارا یہ مطمئن روپ، یہ بے ہد یا ہنسی، یہ مسکراتی آنکھیں دیکھنے کی کتنی دعائیں کرتی تھی میں، سچ سچ بتاؤ بھائی سے دوستی ہو گئی۔"

وہ رازداری سے پوچھنے لگی۔ وہ سر جھٹک کر مسکرا دی۔

"میری خوشیاں ان کی مرہون منت نہیں، میں خوش نظر آنا چاہوں تو وہ میری مسکراہٹوں پر پہرے نہیں لگا سکتے۔"

"بس اب یہ دل جلانے والی باتیں رہنے دو۔ خوش نظر آنا سیکھ لیا ہے تو خوش رہنا بھی سیکھو، اس طرح خوش وخرم، ہشاش بشاش نظر آؤ گی تو بہت جلدی بھائی کے دل پر پوری طرح سے چھا جاؤ گی۔"

"اچھا۔" اس نے ایک نظر آمنہ پر ڈالی۔ "سارے گر جانتی ہو تو یہ بتاؤ۔ ریاض بھائی کے دل میں تمہارا کتنا قبضہ ہے۔"

"آمنہ کے چہرے پر سائے سے لہرا گئے۔

"چھوڑو بھی کیا ذکر لے بیٹھیں۔ یہ بتاؤ کس کے ساتھ آئی ہو، بھائی آئے ہیں۔"

ہمارے ایسے نصیب کہاں۔" اس نے کاندھے اچکائے "اکیلی ہی آگئی ہوں رکشہ لے کر۔"

"چلو یہ بھی ٹھیک ہے کہاں تک ان مردوں کے پابند ہیں۔ اچھا، میں ذرا کھانے کی تیاری کرلوں تم جب تک ثریا وغیرہ سے مل لو۔"

"ہاں ہاں... تم کچن میں چلو۔ میں وہیں آجاتی ہوں۔"

اسی لمحے ریاض بھائی مومنہ کو اٹھائے اندر داخل ہوئے تھے۔

"آمنہ یہ اس کو......" ان کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے آنکھیں پھیلائے وہ پہچانوں کی طرح شبنم کو گھورنے لگے۔

"السلام علیکم۔" وہ ہنسی "کیا پہچاننے کی کوشش کررہے ہیں ریاض بھائی؟ میں شبنم ہوں۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔" وہ شرمندہ ہوگئے "اور سناؤ کیسی ہو، کس کے ساتھ آئیں؟"

"اکیلی ہی آئی ہوں۔" وہ مسکرا مسکرا کر اس کا گھبرانا دیکھ رہی تھی

"آمنہ اس کا منہ دھلا دو۔" انہوں نے مومنہ کو آمنہ کی گود میں دے دیا۔ "آئس کریم اس نے کھانے کے بجائے منہ اور ہاتھوں میں مل لی ہے۔"

"تو آپ کھلا دیتے نا۔" شبنم ہنسی "کیسے باپ ہیں۔ بچی کو آئس کریم نہیں کھلا سکتے۔"

"بھئی وہ.....ایسے کام ان کی ماں ہی کرتی ہیں۔ ہم نے تو کبھی نہیں کیے۔"

آمنہ مومنہ کو لیے مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ ریاض بھائی نے دروازے کی سمت دیکھا اور ایک دم فارم میں آگئے، ان کی آنکھیں مسکرانے کا انداز بھی کچھ بدل گیا۔

"بھئی کیا زیادتی ہے شبو کیوں کنفیوز کررہی تھیں۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے پاس آبیٹھے۔

"میں کنفیوز کررہی تھی۔" اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں "بھلا کس طرح؟"

"اوفوہ کیا قاتل ادا ہے۔" وہ دبے دبے انداز میں مسکرائے "گھائل کرڈالتی ہو تم سے۔"

وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے لگاوٹ سے دیکھتی رہی۔ دل کے کسی کونے سے جو احساس گناہ بول رہا تھا۔ آج اسے اس کی آواز بھی اچھی لگ رہی تھی۔

"اس قدر ہتھیاروں سے لیس ہو کر آئی ہو۔ بھلا کیوں؟" انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ ان کی جرأت پر حیران رہ گئی۔

"اگر کوئی آجائے تو۔" ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ اطمینان سے پوچھنے لگی۔

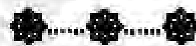
"تو..... میں کہہ دوں گا۔ میں تو لکیریں پڑھ رہا تھا۔" وہ زور سے ہنس دیے۔

"اف یہ مرد۔"

وہ سوچ رہی تھی۔

"یہ مکر و فریب سے لبالب بھرے مردوں کے لیے کوئی رشتہ معتبر نہیں۔ تقدس کوئی شے نہیں، کوئی شے حقیقت رکھتی ہے تو ان کا بے لگام نفس، ان کو محض صنف نازک چاہیے خواہ کسی رشتے کی ڈور سے بندھی ملے، ان کے لیے ہر رشتہ محض مرد و زن کا رشتہ ہے۔"

اس کے پورے وجود میں تلخیاں سرائیت کر رہی تھیں۔ لیکن اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور لب مسکرا رہے تھے۔



"یہ بے پایاں حسن، اور میرے لیے۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ "یقین نہیں آتا الی! خود اپنے آپ پر رشک آنے لگتا ہے، کہاں وہ تمہارے ڈاکٹر صاحب سب کچھ چرانے چلے تھے۔ ہم راستے سے بھگا لائے تمہیں۔"

وہ ہولے سے ہنس دی۔

"الی! بس یونہی میرے پاس بیٹھی میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہا کرو۔ خدا کی قسم یہ سکون ناقابل بیان ہے۔"

"ہاں، اب میں خود بھی یہی چاہتی ہوں۔" اس کا سر تکیے پر رکھ کر وہ ذرا دور ہو بیٹھی۔ "کب سے تو کہہ رہی ہوں۔ چچا جان سے مل لو۔"

"ہاں یار! یہ تو بے حد ضروری کام ہے۔ کرنا ہی ہے۔" وہ ذرا اونچا ہو کر سگریٹ سلگانے لگا۔

"رضا! چلو ابھی میرے ساتھ چلو۔"

"ابھی! کم آن الی! کوئی ہمیٹ امپاسیبل اس حلیے میں تمہارے چچا جان سے ملنے میں ہرگز نہیں جا سکتا۔"

وہ مسکرا دی۔

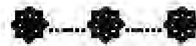
"میں تمہیں اس حلیے میں لے جا بھی نہیں رہی، اٹھ کر کپڑے بدل لو، دیکھو رضا میرے گھر والے پریشان ہیں اور انہیں ہونا بھی چاہیے میں تمہیں جانتی ہوں۔ باقی لوگ تو نہیں جانتے۔ سب نہایت فکر مند ہیں کہ نجانے میں کس شخص سے رشتہ جوڑ بیٹھی ہوں، ایک مرتبہ تم سے مل کر سب کے شکوک و شبہات دور ہو جائیں تو پھر مجھ پر اتنا دباؤ نہیں رہے گا تم سمجھ رہے ہو نا۔"

"بالکل جانم۔" وہ مسکرایا۔ "تمہاری باتیں میں نہیں سمجھوں گا تو اور کون سمجھے گا بس کچھ دن اور انتظار کر لو۔ میں ذرا کسی اچھی جگہ پر رہائش کا

بندوبست کرلوں پھر سب سے پہلے تمہارے دردولت پر حاضری دوں گا۔"

"اور کتنے دن رضا۔" وہ زچ ہوئی۔

"چند روز اور میری جان چند روز۔" وہ گنگنایا تھا۔



"بیٹا الماس۔"

وہ کھڑکی میں کھڑی بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ عقب سے آتی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ عثمان کھڑے سنجیدگی سے اس سے مخاطب تھے۔

"جی!۔" اس نے ابرو اٹھائے۔

"کچھ وقت ہوگا آپ کے پاس؟ میں ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی ضرور۔" وہ کھڑکی سے ہٹ کر کمرے کے وسط میں آگئی "اندر آجائیں۔" وہ آہستگی سے چلتے ہوئے اندر آگئے۔

"تشریف رکھیے!۔"

"انہوں نے ایک نگاہ اس کے گلابی چہرے پر ڈالی اور پھر نگاہ ہٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

"الماس، ابو کی خواہش ہے۔ جلد سے جلد آپ کی اور مہتاز کی رخصتی کر دی جائے۔ مہتاز کے گھر والوں کا کئی مرتبہ فون آچکا ہے، وہ تاریخ لینے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔ ابو نے انہیں کل بلایا ہے۔"

"اوہ!۔" وہ پریشان ہوگئی "مگر؟ رضا کا تو اتنی جلدی کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔"

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے جیسے کچھ کہنا چاہتے ہیں اور تامل کا شکار ہوں۔

"ایک بات پوچھ سکتا ہوں۔" ان کا انداز محتاط تھا۔

"ضرور.....!۔"

"جب آپ لوگوں کا ارادہ..... اتنی جلدی شادی کرنے کا نہ تھا تو پھر اتنی عجلت میں نکاح کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ پہلے گھر والوں کو اعتماد میں لے سکتی تھیں۔ کیا یہ موجودہ صورت حال کی نسبت بہتر نہ ہوتی۔"

الماس خاموشی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔ اس بات کا جواب اسکے پاس تھا لیکن کسی کو بھی وہ جواب نہ دے سکتی تھی۔"

"خیر!۔" اپنے سوال کے جواب میں خاموشی پاکر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔" آپ کا، رضا کا جو بھی پروگرام ہو، اسے ڈس کس تو کیا جاسکتا ہے نا۔ آپ ایسا کریں۔ اسے آج شام کو بلالیں۔"

"دیکھیں عثمان! ایک منٹ پلیز۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں جانے سے روکا "ذرا بیٹھ کر میری بات سن لیں۔" وہ جانتی تھی کہ اگر اسے

اس گھر میں اپنی کوئی بات منوانی تھی تو سب سے پہلے عثمان کو اعتماد میں لینا چاہیے تھا، وہ اس گھر کا اہم ترین ستون تھے۔

"عثمان بیٹھ گئے۔"

"جی کہیے۔"

"دیکھیں۔ آپ چچا جان سے کہیں، ممتاز کی رخصتی کر دیں ہمارا مسئلہ بعد میں اٹھایا جا سکتا ہے جب یہ طے ہے کہ رضا ابھی خانگی زندگی کی ذمہ داریاں افورڈ نہیں کر سکتے۔"

وہ جھجک کر اپنے ناخن دیکھنے لگی۔ نجانے کیوں عثمان سے یہ بات کہتے ہوئے اسے شرمندگی سے محسوس ہوئی تھی۔ "آپ پلیز میری پرابلم سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس گھر میں آپ واحد فرد ہیں جو میری بات غور سے سن لیتے ہیں۔ آخر میں نے اپنی پسند سے نکاح ہی تو کیا ہے۔ ایسی کیا قیامت آ گئی جو سب کے سب یکایک مجھے اس گھر سے نکالنے کے درپے ہو گئے ہیں۔"

عثمان کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ در آئی۔

"جی ہاں۔ کہہ تو آپ درست رہی ہیں۔" پھر وہ بولے "کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہوتا ہے، امریکہ میں ایک طویل عرصہ میں نہیں آپ گزار کر آئی ہیں۔"

"پلیز! یہ طنز کا وقت نہیں ہے۔" اس نے التجا کی تھی۔ "آئی نیڈ یور ہیلپ۔"

"او کے!" وہ کھڑے ہو گئے "میں بابا جان سے بات کرتا ہوں، دیکھتے ہیں۔ کیا صورت حال بنتی ہے۔"

"عثمان پلیز، میں یہ معاملہ آپ پر چھوڑ رہی ہوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ......"

"وہ جاتے جاتے رک گئے تھے، دروازے پر کھڑے ہو کر انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔

"جی کہیے کیا کہہ رہی تھیں آپ؟ کیا جانتے ہوئے؟"

"کچھ نہیں۔" وہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔

"بے فکر رہیے الماس! میرے دل میں جو جذبے تھے اگر مرے نہیں ہیں تب بھی میں نے انہیں زندہ دفن کر دیا ہے۔ اب آپ انہیں کبھی میری آنکھوں میں، میرے لبوں پر نہیں پائیں گی۔"

دروازہ ایک آواز کے ساتھ بند کر کے وہ چلے گئے تھے۔



"آپ کے گھر فون نہیں ہے، کوئی کانٹیکٹ نمبر؟" وہ فائل پر نگاہ جمائے گہری سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

"نہیں سر۔" اس نے سر ہلایا "نمبر تو کوئی نہیں ہے کیوں سر؟"

"کبھی کوئی کام پڑ سکتا ہے" اس لیے میں نے استفسار کیا۔" انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''مس نیلم۔''

''جی سر۔''

''بیٹھیں۔'' انہوں نے اسے اشارہ کیا۔ ''کیا بات ہے۔ کچھ دنوں سے ایک عجیب کھنچاؤ سا ہے آپ کے رویے میں۔''

وہ ذرا سا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''نہیں سر! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''کوئی تو بات ہے عجب گریز سا ہے آپ کے انداز میں، کوئی ناراضی ہے۔''

وہ جھینپ کر ہنس دی۔

''نہیں سر! ناراضی کیسی؟۔''

''میرا تحفہ دینا شاید آپ کو پسند نہیں آیا۔ آپ نے مائنڈ کیا ہے یہی بات ہے نا۔''

''نہیں سر! میں نے مائنڈ تو نہیں کیا'' وہ قدرے رک رک کر بولی ''لیکن آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ دیکھیں ہمارے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں کہ ہم تحائف کا تبادلہ کریں۔''

''اوہ! تو میرا اندازہ درست تھا۔ آپ نے واقعی مائنڈ کیا تھا''

وہ خاموش بیٹھی میز کی سطح پر انگلی پھیرتی رہی۔

''آئی ایم سوری مس نیلم! مجھے معاف کر دیں۔'' وہ بے حد آزردہ نظر آ رہے تھے۔

''نہیں سر'' وہ گھبرا اٹھی ''ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بہت عرصے بعد مجھے.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

اپنی جلد بازی پر شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

''کہیے نا! کیا کہہ رہی تھیں آپ۔'' وہ اب دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''سر.....؟'' اس کے الفاظ منہ میں رہ گئے۔ دروازے پر دستک دے کر فاروقی صاحب اندر داخل ہوئے۔

''مس نیلم! آپ جلد از جلد فائل مکمل کر کے مجھے دیں، ایک تو آپ ہر کام انتہائی لیٹ کرتی ہیں۔''

عباسی صاحب کی آواز میں اچانک ہی حد درجہ اجنبیت در آئی تھی۔ وہ یکایک اس کے آفیسر بن گئے تھے۔ نیلم ان کے انداز پر حیران ہی رہ گئی۔

وہ سر جھکا کر اپنی میز پر آ گئی تھی۔



فیکٹری سے آ کر وہ سیدھی اپنے کمرے میں گھس جاتی تھی لیکن آج اسے دروازے سے قدم اندر رکھتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔

اماں کے کمرے سے اجنبی خواتین کے مسلسل بولنے کی آواز صحن میں آ رہی تھی۔ وہ سیدھی کچن میں چلی آئی۔ ریشم اور مریم پکوڑے تل رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر دونوں کے لبوں پر شریر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''کیا بات ہے؟ کون آیا ہے مریم؟'' وہ تھکی ہوئی تھی۔ وہیں پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

''بجو.....وہ کچھ خواتین آئی ہیں..... ہمارے والی گلی سے ہی آئی ہیں۔'' مریم اس کا انداز دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی جبکہ ریشم بدستور شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

''خواتین۔'' اس کا ماتھا ٹھنکا ''کس سلسلے میں۔''

''بجو! گھر میں بیری ہوتی ہے تو پتھر تو آتے ہیں۔'' ریشم ہنسی ''سنا ہی ہوگا آپ نے۔''

نیلم نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

''آپ..... آپ کا رشتہ لائی ہیں۔'' مریم جلدی سے بولی ''اماں نے مجھ سے کہا۔ کچھ اہتمام کر لو اور نیلم سے کہنا، کپڑے تبدیل کر کے حلیہ درست کر کے اندر آئے۔''

وہ خاموشی سے کچھ سوچنے لگی تھی۔

''جائیں بجو! کپڑے تبدیل کر لیں۔'' ریشم منمنائی۔

''رہنے دو۔'' وہ قدرے سختی سے بولی ''میرے سر میں درد ہے۔ میں ذرا لیٹتی ہوں۔ اماں پوچھیں تو انہیں بتا دینا۔''

دونوں لڑکیوں نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

وہ اندر آ کر بیگ ایک طرف ڈال کر بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ اجنبی خواتین کی آمد نے اسے عجب الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

نہ جانے وہ لوگ کون تھے۔ اسے کس ریفرنس سے جانتے تھے اور نجانے اماں ان کی خاطر مدارات کیوں کر رہی تھیں اسے اگر شادی کرنی ہوتی تو اتنی لمبی چوڑی کہانی بنتی ہی کیوں؟ وہ خاموشی سے یوسف سے شادی نہ کر لیتی۔ شبنم کی زندگی بھی خراب نہ ہوتی۔ نہ اسے روز روز بسوں ویگنوں کے دھکے کھانے پڑتے۔ سیدھا سادا سا راستہ تھا لیکن اگر میں نے سیدھے سادے راستے کو چھوڑ کر خاردار تپتے صحرا میں قدم رکھا تھا تو اس کی کوئی وجہ تھی اور اماں؟ اب اماں کیا کرنے جا رہی تھیں؟

وہ چڑ کر کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

''بجو!'' مریم نے اسے دھیرے سے پکارا تھا۔

''کیا ہے؟'' اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

''اماں بلا رہی ہیں۔''

''اوفوہ!'' وہ چڑ کر اٹھی ''اماں کی سمجھ میں ایک بات کیوں نہیں آتی..... میں..... ابھی.....'' مریم کی موجودگی کا احساس کر کے وہ خاموش ہوگئی۔

چپلیں پہن کر وہ اسی حلیے میں اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''السلام علیکم!'' وہ سلام کرتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

''وعلیکم اسلام۔''

''وہاں اماں کے علاوہ تین اور خواتین موجود تھیں تینوں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ خاموشی سے اماں کے قریب بیٹھ گئی۔

''یہ نیلم ہے۔ بیٹیوں میں سب سے بڑی ہے۔'' اماں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

''ہوں؟'' ایک خاتون نے سر ہلایا ''جاب کرتی ہو؟''۔

''جی۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''کیا اوقات ہیں آنے جانے کے۔''

''جی؟'' اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ صبح سات بجے نکلتی ہوں۔ اس وقت واپس لوٹتی ہوں۔''

''ہوں، اسٹاپ تک تو پیدل جاتی ہوگی۔'' دوسری خاتون نے دریافت کیا۔ نیلم کو اب الجھن ہونے لگی تھی۔

''جی ہاں، لیکن آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہیں۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا تھا۔

''یوں ہی۔'' وہ ہنسیں ''وہ راجہ کہہ رہا تھا..... راستے میں ملاقاتوں کا بتا رہا تھا۔''

''راجہ؟'' اس کی سمجھ میں فوری طور پر کچھ بھی نہ آیا ''کون راجہ.....؟ کیسی ملاقاتیں؟''

''ہاں.....'' وہ بے حد ہنس رہی تھیں۔ ''لڑکیاں گھروں میں ان باتوں پر یوں ہی شرمایا کرتی ہیں خیر خیر بیٹی! گھبراؤ نہیں۔ راجہ نے ہمیں سب بتا رکھا ہے۔''

نیلم نے عجب بدحواسی کے عالم میں اماں کی طرف دیکھا۔ وہ خود بھی ہونق بنی کبھی اسے کبھی ان خواتین کو دیکھ رہی تھیں۔

''جی میں سمجھی نہیں محترمہ! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔''

''اب ہو مت۔'' دوسری خاتون خاصی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ ''راجہ نے ہمیں بتا رکھا ہے تمہارے بارے میں۔ تم جانتی تو ہو راجہ کو۔''

''راجہ!'' یکا یک بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آگئی۔ ''اوہ تو آپ کو راجہ نے بھیجا ہے۔''

''ہاں! میں اس کی ماں ہوں، یہ میری بہن اور میری بیٹی ہے۔''

''کس سلسلے میں آئے ہیں آپ لوگ۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ''اور آپ کو راجہ نے میرے بارے میں کیا بتایا ہے۔''

''اے ہے بچی! یہ کیسے بات کر رہی ہو...... تیور تو سنبھالو ذرا۔'' انہوں نے غصے کی اوٹ سے اسے گھورا۔

''دیکھیں۔ ایک بات غور سے سنیں۔ آپ کے آوارہ مزاج بیٹے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ مجھے راستے میں آتے جاتے ہوئے تنگ کرتا ہے اور جو کچھ اس نے ہماری ''ملاقاتوں'' کے بارے میں بتایا ہے اگر وہ اس کے علاوہ بھی کچھ ہے تو قطعاً جھوٹ ہے۔''

''نیلم۔'' اماں بولی تھیں۔ ''تم باہر جاؤ میں بات کروں گی۔''

❀......❀......❀

بڑی اذیت ناک رات تھی۔ اس نے جیسے انگاروں پر کاٹی تھی۔ پل پل بدن جھلس کر راکھ ہوا تھا۔ لمحہ لمحہ عذاب ناک تھا۔ جسم کا خون قطرہ قطرہ آنکھوں سے بہہ کر بستر کی تہوں تک جذب ہوتا رہا تھا۔

اس کا بے اعتبار وجود کتنا بے اماں تھا۔ اس رات سے قبل اسے اتنا اندازہ نہ تھا۔ ہر طرح کے حالات سے گزر کر بھی وہ خود کو معتبر ہی سمجھتی تھی۔ اپنی عزت آپ کیا کرتی تھی۔ مگر رات اماں نے اس سے جو کچھ کہا، اسے سن کر سہہ کر اسے دنیا کی کسی بھی شے پر اعتبار نہ رہا تھا۔ وہ ایک ارزاں، بے مول، بے اعتبار وجود تھی جسے کسی کی توجہ، ہمدردی اور محبت حاصل نہ تھی۔ اس کے جینے کا جیسے کوئی مقصد ہی نہ تھا۔ اسے اپنے آپ سمیت دنیا کی ہر شے سے نفرت ہو گئی تھی۔

''ماں کو جتنا غیر اہم اور بے مصرف تم سمجھتی ہو نیلم! میں اتنی غیر اہم نہیں ہوں۔ اگر آج میں بیمار ہو کر بستر پر پڑی ہوں اور تم چند روپے کمانے کے لائق ہو گئی ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم نے میری اور میں نے تمہاری جگہ لے لی ہے اور تم ہر فیصلہ اپنی مرضی سے بالا ہی بالا کر سکتی ہو۔ اگر ایسی کوئی بات تھی تو تمہیں پہلے مجھ سے ذکر کر دینا چاہیے تھا۔ بلکہ اول تو یہ کہ جو لڑکیاں گھروں سے کمائی کے لیے باہر نکلیں، انہیں اپنی ذات کے حوالے سے اتنا محتاط ہونا چاہیے کہ کسی اور کو ان کے گھر میں گھس کر کچھ کہنے سننے کا حوصلہ نہ ہو سکے۔''

''اماں! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔'' اس کے اعصاب منجمد ہونے لگے تھے۔ ''آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''بکومت!'' وہ سخت مشتعل ہو گئیں۔ ''کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں کر کے پہلے ہی تم ایک بہت بڑا فساد اس گھر میں کھڑا کر چکی ہو۔ جس کی سزا آج بھی میری معصوم بچی ہونٹوں پر چپ کی مہر لگائے بھگت رہی ہے۔ دن رات اس بےزبان کے آنسو میرے دل پر گرتے ہیں۔ مجھے لہو لہو رلاتے ہیں آج بھی تم وہی انکاری ہو۔ پس پردہ جو کچھ کرتی ہو۔ اس کا اقرار کرتے وقت تمہاری جرأتیں کہاں جا کر سوتی ہیں۔''

''اماں!'' وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

ریشم اور مریم اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہی ہوں میں مت ایسے گھورو مجھے۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ تم اندر ہی اندر یوسف میاں سے راز و نیاز کر چکی ہو تو پہلی فرصت میں تمہارا نکاح ان سے پڑھوا دیتی۔ چاہے تم کتنا ہی واویلا کرتیں۔ مگر تم نے تو مجھے کیا کسی کو بھی ہوا تک نہ لگنے دی۔ جانے اس میں تمہاری کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔ شاید وہ تمہارے دل سے اتر گئے تھے اور تمہیں کچھ نہ سوجھا تو میری معصوم شبنم کو اپنی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔''

اسے چکر آنے لگے تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"اب پھر تم نے وہی کھیل کھیلا ہے۔ ارے کسی میں اتنی جرات کہاں کہ بنا بات کسی کے گھر میں گھس کر دوسروں کی بیٹیوں پر الزام تراشیاں کرتا پھرے۔ رائی ہوتی ہے تو پہاڑ بنتا ہے ناں۔ اور تم نے خود اقرار کیا ہے کہ تم اس لڑکے کو پہچانتی ہو۔ اور یہ کہ وہ تم کو سرراہ چھیڑتا ہے۔ ارے ذرا سی غیرت ہوتی تو تم کیا بھائیوں سے نہ کہتیں؟ مجھ سے ذکر نہ کرتیں۔ لیکن بڑے بھائی کے بعد تم تو ایسی بے لگام ہوئی ہو کہ تمہیں کسی اچھے برے کی تمیز ہی نہیں رہی۔ تمہارے مدیروں کا تو پانی مر گیا ہے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

کیسے بدنصیب لمحے تھے وہ کتنی سیاہیاں اس کے مقدر میں بھر چلے تھے۔ اس کی سگی ماں اس سے اس قدر بدگمان ہوئی بیٹھی تھی کہ کیا کوئی جانی دشمن ہوتا۔ اپنی صفائی میں کہنے کے لیے جتنے لفظ اس کے پاس تھے، سارے کے سارے آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ لبوں پر قفل پڑ گئے تھے۔

"میرے پاس تو ان سارے مسئلوں کا ایک ہی حل ہے نیلم! کہ میں جلد از جلد تمہیں اس گھر میں رخصت کر کے زندگی کے باقی دن کچھ سکون اور عزت سے گزار لوں۔ جانے آگے تمہارے کیا ارادے ہیں۔"

اماں بےحد دکھی ہو کر خود بھی رونے لگی تھیں۔

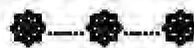
"وہ عورتیں بھی اپنی خوشی اور مرضی سے نہیں آئی تھیں [illegible] لڑکے نے مجبور کر کے بھیجا تھا انہیں ٹھیک ہے اب برا بھلا جیسا بھی ہے تمہارے اپنے اعمال کا حاصل ہے۔ میں نے تو انہیں ہاں کر دی ہے۔ جب چاہیں آ کر تمہیں لے جائیں۔"

"اس کی آنکھیں حیرت اور صدمے سے پھٹ گئیں۔

"اماں!" اس کے کانپتے لبوں سے بس اتنا ہی نکلا۔

"تم نے مجھے بہت دکھ دیے ہیں نیلم!" وہ بے بسی سے رو رہی تھیں۔ "پھر بھی میں ماں ہوں۔ یہی دعا دوں گی کہ خدا تمہیں خوش رکھے۔ نیک ہدایت دے۔ توفیق دے۔"

اس کی جلتی آنکھیں پوری رات ایک لمحے کو بھی بند نہ ہوئی تھیں۔ سوچ سوچ کر اعصاب شل ہو گئے تھے۔ حوصلے جواب دے گئے تھے۔ تقدیر جیسی منہ زور طاقت ور شے کے مقابل اس کا کمزور وجود بے بس و بے اختیار تھا۔ ذہن اب فرار کے راستے تلاش کر رہا تھا۔



"اماں نے اچھا نہیں کیا بجو کے ساتھ!" ریشم دھلے ہوئے برتن چھبیوں پر رکھتے ہوئے اداسی سے بولی تھی۔ "بے چاری بجو! صبح فیکٹری جاتے ہوئے ان کی شکل سفید لٹھے جیسی ہو رہی تھی اور آنکھیں۔ انگارہ۔"

"اماں بھی کیا کریں۔" مریم افسردگی سے بولی "مٹھی سے کران کے حوصلے بھی جواب دے گئے ہیں کس کس کے غم کا بوجھ وہ اکیلی اپنے

سینے پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ انسان تلخ ہو جاتا ہے ناں۔"

"جو کچھ ہوا اس میں بجو کا کیا قصور؟" ریشم نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"پتا نہیں۔" مریم نے سر جھکا لیا۔ "اماں سے شبنم آپی کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس معاملے میں نیلی بجو کا کچھ نہ کچھ ہاتھ ضرور تھا۔ آخر انہیں کیا پڑی تھی شبنم آپی کے سر اتنا بڑا عذاب منڈھ دینے کی۔ وہ جانتی تھیں، یوسف بھائی انہیں چاہتے ہیں۔ اور شاید وہ بھی۔"

"بجو کی شبنم آپی سے کوئی دشمنی تو نہیں تھی مریم! سب ایسا کیوں کہتے ہیں؟۔ ہم بھی تو ان کی بہنیں ہیں۔ ہم سے وہ کتنا پیار کرتی ہیں۔ کتنی محبت کرتی ہیں۔ ہماری خاطر اپنی جان ہلکان کر رکھی ہے انہوں نے۔ گھر میں کسی کو ان کا احساس ہی نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے وہ پاگل ہو جائیں گی۔"

"خدا نہ کرے۔" مریم نے اسے گھورا۔

"ذکی اب اچھا خاصا سمجھدار ہو گیا ہے۔ اسے گھر کے مسائل کو سمجھنا چاہیے۔"

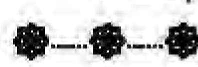
"ابھی وہ پڑھ رہا ہے ریشم!" مریم نے رسانیت سے سمجھایا۔ "اور پھر اس عمر میں یہ چھوٹی موٹی سی تفریحات تو زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔ بجو بھی نہیں چاہتیں کہ وقار بھائی کی طرح وہ ابھی سے اپنے کاندھوں پر اتنا بوجھ محسوس کرنے لگے کہ جوانی میں ہی بوڑھا ہو جائے۔ یاد ہے، وقار بھائی چھوٹی سی عمر میں ہی اتنے سنجیدہ ہو گئے تھے۔ اپنی ذات کو قابل توجہ جانتے ہی نہ تھے۔ کبھی خود پر ایک پائی خرچ نہیں کرتے تھے۔ اپنا من مارنے کے اس قدر عادی ہو گئے تھے وہ کہ خوشیوں کی کوئی طلب ہی نہ رہی تھی انہیں۔"

"اور اب بجو بھی وقار بھائی بنتی جا رہی ہیں۔" ریشم کی آنکھیں بھائی کے ذکر پر بھر آئیں۔ "تم اماں کو سمجھاؤ ناں مریم! بجو کی خطائیں معاف کیوں نہیں کر دیتیں۔"

"شبنم آپی کی زندگی میں خوشیاں آ جائیں اور وہ اور یوسف بھائی ایک ہو جائیں تو اماں بھی سب کچھ بھلا دیں گی۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے بہن کو دلاسا دیا۔

"تب تک تو اماں بجو کو زبردستی رخصت کر دیں گی۔ مجھے تو یہ لوگ بالکل پسند نہیں ہیں مریم! کیسی جاہل خواتین تھیں وہ۔ وہ کس طرح کی باتیں کر رہی تھیں بجو سے۔ اگر بجو کی شادی وہاں ہو گئی تو۔" وہ دہل کر خود ہی خاموش ہو گئی۔

دونوں بہنیں اپنی اپنی سوچوں میں گم خاموشی سے کام کرنے لگیں



فون کی بیل کافی دیر سے بج رہی تھی۔

صبا کسلمندی سے اُٹھ کر فون تک آئی تھی۔

"ہیلو!" اس نے سوئی سوئی آواز میں کہا۔

"السلام وعلیکم۔" دوسری جانب سے قدرے شوخی سے کہا گیا۔ "کیسا! کیسے مزاج ہیں۔"

"الحمدللہ۔" وہ آواز پہچان کر آسنگی سے بولی۔ "آپ خیریت سے ہیں؟۔"

"بالکل۔" وہ ہنسا۔ "نہ صرف خیریت سے بلکہ قدرے فراغت سے بھی۔ آپ مصروف تو نہیں ہیں صبا؟۔"

"جی۔نہیں تو!" وہ لمحہ بھر کے لیے جھجکی۔

"بس تو پھر میں آرہا ہوں۔ذرا آؤٹنگ کے لیے چلتے ہیں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا تھا۔

"سنیے اواقبال صاحب!" وہ قدرے پریشان ہوگئی۔

"کوئی قباحت ہے؟۔" وہ جیسے ریسیور رکھتے رکھتے رہ گیا تھا۔ "کہیں اور کا پروگرام ہے؟۔"

"نہیں ایسا تو نہیں۔وہ دراصل امی سے نہیں پوچھا ناں۔" وہ جلدی سے بس کہہ گئی۔

"ڈونٹ وری۔" وہ ہنس دیا۔ "یہ میرا کام ہے میں خود ہی سرانجام دے لوں گا۔آپ کو پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔بس اتنا کیجیے۔میں آؤں تو مجھے تیار ملیں۔انتظار سے مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔"

اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہتی،وہ فون بند کرچکا تھا۔ایک سوچ میں ڈوبی ہوئی وہ واپس کمرے میں آ گئی تھی۔

"کتنی متضاد ہیں ہماری شخصیات۔"

وارڈ روب کے سامنے کھڑی ہوئی غائب دماغی سے کپڑوں پر نگاہ دوڑا رہی تھی۔

"یا شاید مجھے ہی ایسا لگتا ہے۔"

"صبا بیٹی!" پیچھے سے نجمہ خاتون نے پکارا تھا۔

"جی امی؟" وہ چونک کر مڑی۔

"شہروز آیا ہے۔نیچے لان میں بیٹھا ہے۔"

"شہروز آیا ہے؟۔" وہ کھل اٹھی۔ "اچھا میں آتی ہوں کتنے دن کے بعد شکل دکھائی ہے اس نے۔"

وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی اتر آئی۔

وہ پام کے بڑے سے گملے کے پاس کھڑا کسی سوچ میں گم تھا۔

"شہروز!" وہ مسکراتی ہوئی اس کے سامنے آگئی۔

"السلام علیکم!" وہ اداسی سے مسکرایا۔ "کیسی ہیں؟۔"

"وعلیکم السلام! میں تو بالکل خیریت سے ہوں لیکن یہ تمہارے مکھڑے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں اور کتنے دن بعد آئے ہو۔راستہ بھول تو نہیں گئے تھے؟۔"

"بس۔ موڈ ہی نہیں بن رہا تھا کہیں آنے جانے کا۔" وہ وہیں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اتنے دن بعد آج یونیورسٹی گیا تھا۔"

"یہ تو بہت بری بات ہے۔" وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ "اور یہ تمہارے موڈ کو ہوا کیا ہے؟۔"

"اور کیا کروں۔!" وہ زچ ہوا۔ "بے وجہ خوش رہ رہ کر اکتا گیا ہے دل صبا! اب تو جی چاہتا ہے سچ کی خوشیوں پر خوش ہونے کا۔ لیکن لگتا ہے اداسیوں نے ہمارے ہی گھر کا راستہ دیکھ رکھا ہے۔"

"ایسے نہیں کہتے شہروز!" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "ہر کام میں خدا کی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔"

"امی جان بہت اداس ہو گئی ہیں صبا! آپ نے بھی آنا چھوڑ رکھا ہے۔" اس نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ "بھائی جان اب دن تو کیا رات کو بھی نظر نہیں آتے۔ اور فیروز بھائی وہ تو لگتا ہے رہبانیت اختیار کر چکے ہیں۔ ہمارے گھر تو ہر وقت کرفیو کا سا سماں رہتا ہے۔"

وہ جل جل کر بول رہا تھا۔

"وقتی صدمہ ہے شہروز! آہستہ آہستہ سب نارمل ہو جائیں گے۔"

"آپ بھی تو منگنی کر کے بیٹھ گئی ہیں۔" اس نے صبا کو گھورا۔ "آپ سے مل کر جی کو خوشی ملتی تھی۔ اب وہ بھی نہیں ملتی۔ یہ جو آپ کے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی ہے ناں، اس کی شعاعیں دل جلاتی رہتی ہیں۔"

وہ دھیرے سے ہنس دی۔

"بھئی اس انگوٹھی کو کچھ مت کہیں۔ یہ ہم نے بڑے چاؤ سے خریدی تھی۔"

دانیال ہاشمی کی آواز پر وہ دونوں بری طرح سے چونک گئے تھے۔

"ارے آپ!" شہروز بے اختیار کھڑا ہوا تھا۔

"اچانک نہیں، طے شدہ پروگرام کے مطابق آیا ہوں۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے کیا۔ "ہمارا ذرا آؤٹنگ کا پروگرام تھا۔ صبا! آپ تیار نہیں ہوئیں؟۔"

"وہ۔ وہ گڑبڑا گئی۔" "شہروز آ گیا تو۔"

"یعنی میں بڑے غلط وقت پر آ گیا ہوں۔" شہروز دھیرے سے ہنس دیا۔ "اچھا جناب! پھر تو اجازت لینی پڑے گی۔"

"کیوں شہروز! تم بھی چلو ناں ہمارے ساتھ۔" صبا جلدی سے بول پڑی۔

"وہ جانتی تھی، وہ اس وقت اپنی اداسی اس کے ساتھ شیئر کرنے آیا تھا۔ اسے اس طرح چھوڑ کر دانیال کے ساتھ جانے کے خیال سے ہی اسے کوفت ہونے لگی۔

"ارے نہیں۔ میں کباب میں ہڈی ہرگز نہیں بنوں گا۔" وہ مسکرایا۔

"بکواس!" صبا نے اسے گھورا۔ "دانیال! پلیز آپ اس سے کہیں ناں۔ یہ بھی ہمارے ساتھ چلے۔"

"بھئی، اگر یہ چلنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے کاندھے اچکا دیے۔

شہروز نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ صبا کو دیکھا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

دانیال ہاشمی کے تمام تر انداز کہہ رہے تھے کہ وہ اسے ساتھ لے جانے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔

"او کے دانیال صاحب!" شہروز نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "پھر ملیں گے۔"

"چلئے آپ بھی!" اس نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"پھر کبھی سہی، ابھی بھی میرا موڈ تھوڑا ایسا نہیں کہ آپ لوگوں کو اچھی کمپنی دے سکوں۔ خواہ مخواہ آپ لوگوں کی تفریح بھی خراب کروں گا۔"

"ایز یو وش!" دانیال نے بے نیازی سے کاندھے اچکا دیے۔

"اور مس صبا!"

شہروز کے چلے جانے کے بعد وہ اس کی سمت مڑا تھا۔

"اب آپ مزید کتنا وقت لیں گی تیاری کے لیے؟"

"آپ بیٹھیں، میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔" اس کا دل بے حد اداس ہو رہا تھا۔

آہستگی سے کہہ کر وہ اندر کی جانب چل دی۔

"مصلحت کے تقاضے بھی بسا اوقات بجھ سے باہر ہوتے ہیں۔" وہ سوچ رہی تھی۔ "شہروز سے دل کا جتنا گہرا رشتہ بنتا ہے، اس کا دسواں حصہ بھی دانیال ہاشمی کو میسر نہیں۔ پھر بھی آج اس شخص کا کہا ماننے کی پابند ہوں۔ شہروز سے اجنبیوں کی طرح معذرت کر کے اس کے ساتھ جا رہی ہوں اور یہ دو رنگی منافقانہ زندگی یونہی گزارنی ہے۔"

گاڑی تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی اور وہ اداسی سے پیچھے کو بھاگتی سڑک پر نگاہ جمائے ہوئے تھی۔

"کہیں میں آپ کو اغوا کر کے تو نہیں لے جا رہا؟" دانیال نے ایک لمحے کے لیے سامنے سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا۔ "آپ کی صورت پر برستی پریشانی دیکھ کر کوئی بھی پولیس والا شک میں مبتلا ہو سکتا ہے۔"

صبا ہولے سے مسکرا دی۔

"بھئی اس قدر کم گوئی میرے ساتھ تو چل نہیں سکتی۔" اس نے سر ہلایا۔ "اور پھر یہ شکل پر بجتے بارہ۔ کہیں انکل آنٹی نے مجھے زبردستی تو آپ کے سر نہیں منڈھ دیا ہے؟" اس نے شک کا اظہار کیا۔

"شہروز بھی آ جاتا تو اچھا رہتا ناں!" اس نے موضوع بدل دیا۔ "آپ ذرا تو اصرار کرتے۔"

اس کے لہجے میں ہلکی سی شکایت تھی۔ دانیال نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"سچ تو یہ صبا! کہ میں خود بھی موصوف کو ساتھ لانا نہیں چاہتا تھا۔ آپ کے ساتھ تنہائی میں کچھ وقت گزارنے کا میرا زبردست قسم کا موڈ تھا۔ جو انہیں پاکر آف ہو گیا تھا۔"

"دانیال صاحب!" اس کے لہجے میں تلخی در آئی۔ "وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔"

"سو واٹ؟۔ میں نے تو محض اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ احساسات تو خود بخود بیدار ہوتے رہتے ہیں۔ اچھے یا برے!"

صبا نچلا لب دانتوں سے کاٹ کر رہ گئی۔

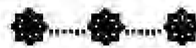
"چلیں! آئی ایم سوری۔" اس کے تاثرات دیکھ کر وہ جلدی سے لہجہ بدل گیا۔ "اب اگلی مرتبہ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر بھی انہیں ساتھ لانا پڑا تو بندہ تاخیر نہیں کرے گا۔ اب پلیز مسکرا دو صبا! تمہاری مسکراہٹ بہت پیاری ہے۔"

وہ شوخی پر اتر آیا تھا۔ اور وہ اس کے الفاظ کی ڈور میں بندھی کہیں پیچھے پہنچ گئی تھی۔

"خوش رہا کریں۔" کسی ہیولے نے اس کے اندر سرگوشی کی تھی۔ "آپ کے چہرے پر مسکراہٹ کھلی لگتی ہے۔"

اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اور لبوں پر ایک اداس مسکراہٹ دوڑ گئی۔

دانیال ہاشمی سیٹی پر کوئی دھن بجاتے ہوئے کیسٹ پلیئر میں کیسٹ لگا رہا تھا۔



اپنی مارک شیٹ وصول کر کے وہ خوش خوش کالج سے نکلی تھی۔ گھر پہنچنے کی جلدی اتنی تھی کہ اس نے کسی لڑکی کا انتظار کرنا ضروری نہ سمجھا اور تنہا ہی قدم آگے بڑھا دیے۔

موسم قدرے گرم تھا اور عین سر پہ چمکتے سورج نے اس کے گالوں پر گلال بکھرا دیا تھا۔ سفید چادر لپیٹے وہ تیز تیز چل رہی تھی۔ تبھی کسی نے اس کے آگے بائیک روک کر اس کا راستہ بند کر دیا۔

ریشم نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ غزالہ کا بھائی نہایت خطرناک تیوروں کے ساتھ اسے گھور رہا تھا اسے خوف سے پسینے آ گئے۔

"کیا بات ہے؟۔" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی تھی۔ "کیوں میرا راستہ روکا ہے آپ نے؟۔"

"مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے لڑکی!" وہ غرایا۔ "مجھے بتا دو۔ غزالہ کہاں ہے؟۔ کہاں گئی ہے وہ؟۔"

"مجھے۔ مجھے کچھ نہیں پتا!" اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

چند راہ گیر آ جا رہے تھے۔ لیکن کوئی بھی ان کی جانب متوجہ نہ تھا۔

"دیکھو لڑکی! تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ میری ٹھیک ٹھیک رہنمائی کر دو۔ بصورت دیگر تمہارا انجام عبرتناک بھی ہو سکتا ہے۔"

"دیکھیں بھائی! میرا یقین کریں۔" اس کی آنکھیں لبالب بھر گئیں۔ "میں کچھ نہیں جانتی۔ میں بھی اتنی ہی بے خبر ہوں جتنے کہ آپ۔"

"بکواس بند کرو لڑکی۔" اس نے دانت پیسے۔ "تم ایک ایک راز سے واقف ہو اس کے۔ تمہاری ہی مدد سے فرار ہوئی ہے وہ۔ تمہارے

سوا کسی سے دوستی نہیں تھی اس کی۔ اگر تم نے شرافت کی زبان نہیں سمجھی ناں۔ تو مجھے دوسری زبان بھی استعمال کرنی آتی ہے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رُک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

ریشم کی غیر ہوتی ہوئی حالت کی وجہ سے اب لوگ متوجہ ہو رہے تھے۔

"دیکھو لڑکی! اپنی زندگی اور عزت اگر عزیز ہے تمہیں۔"

چند راہ گیر اکٹھے ہو کر ان دونوں کی جانب بڑھنے لگے تھے۔ اس نے کک مار کر بائیک اسٹارٹ کی اور چند لمحوں میں غائب ہو گیا۔

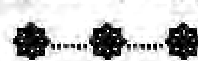
ریشم نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور زمین پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"کیا بات ہے بیٹی!" کسی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "کون تھا وہ لڑکا؟ تنگ کر رہا تھا تمہیں؟"

اس نے بمشکل اثبات میں سر ہلایا۔

"کسی بھائی کو ساتھ لے کر نکلا کرو بی بی!" ایک اور آواز آئی۔ "آج کل تنہا لڑکیوں کا گھر سے نکلنے کا زمانہ نہیں ہے۔ یہ بدمعاش بڑے شیر ہو گئے ہیں۔"

وہ چادر سے منہ صاف کرتی ہوئی اٹھی اور ادھر ادھر دیکھے بغیر آگے بڑھ گئی۔



"الماس بی بی!" پروین اسے جگانے آئی تھی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے بازو آنکھوں سے ہٹایا۔

"نیچے آپ کے مہمان آئے ہیں جی۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ بڑے خان آپ کو بلا رہے ہیں۔"

"میرے مہمان؟" وہ اُلجھی۔ "کون؟"

"میں نہیں جانتی بی بی۔ میں نے تو خود پہلی مرتبہ دیکھا ہے انہیں۔ بڑے خوبصورت سے ہیں، اسمارٹ سے۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

"او وارضا؟" اسے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" پھر وہ چونک کر پروین سے مخاطب ہوئی تھی۔

وہ بڑی ادا سے مسکراتی ہوئی مڑ گئی۔ ہم جان گئے، پہچان گئے، کی پوری تفسیر بنی ہوئی۔

"اُف یہ نوکر ذات۔" الماس کو اس سے عجیب سی چڑ محسوس ہوئی۔ "ذرا سی بات جان کر خود کو نجانے کتنا معتبر خیال کرنے لگتے ہیں۔"

اس نے بڑی عجلت میں لباس تبدیل کیا۔ بالوں کو برش کر کے آزاد چھوڑ دیا اور ایک مسحور کن خوشبو میں خود کو بسا کر کمرے سے نکل آئی۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر وہ لمحہ بھر کے لیے رُکی تھی۔

دلاور خان اور عثمان خان بالکل سامنے بیٹھے تھے۔ دائیں دا ئیں بڑے صوفے پر رضا مراد موجود تھا۔ راشدہ بیگم اور عاصمہ چچی قدرے فاصلے پر رکھی نشستیں کرسیوں پر براجمان تھیں۔

''آ ہے الماس!'' عثمان خان کی نگاہ اس پر پڑی تھی۔ ''وہاں کیوں کھڑی ہیں۔''

''وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان تک پہنچی۔ وہ اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''کیسے ہو رضا!'' وہ مسکرائی۔

''فائن!'' وہ بھی مسکرایا۔

الماس نے محسوس کیا۔ اس کے اعصاب نہایت کشیدہ تھے۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

''بیٹھو ناں!'' وہ اسی صوفے پر خود بھی قدرے فاصلے پر بیٹھ گئی۔

وہاں بیٹھے تمام افراد کے مقابل آخر وہ دونوں ہی تھے۔

''ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے الماس بیٹی!'' بالآخر دلاور چچا نے خاموشی توڑی۔ ''ہم چاہتے ہیں ہر بات تم دونوں کے سامنے ہی طے کی جائے۔ بعد میں تم میں کسی کو کوئی شکایت نہ ہو۔''

انہوں نے بات کے اختتام پر عثمان خان کی جانب دیکھا تھا۔ گویا جو بات بھی تھی، وہ عثمان خان نے آگے بڑھانی تھی۔

''دیکھیں رضا صاحب!'' عثمان خان نے متانت سے کہنا شروع کیا۔ ''آپ نے اور الماس نے مل کر اپنی زندگی ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا۔ کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔ لیکن جس طریقے کو آپ دونوں نے اپنایا۔ وہ ہمارے گھر کی روایات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ آپ سے باز پرس کرنے کا شاید ہمارا حق نہ بنتا ہو لیکن الماس اسی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی خاندان کا ایک فرد ہیں۔ ان کے اس خود مختارانہ فعل سے ہمارا پورا خاندان ایک شاک سے دوچار ہوا ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ یہ مجھ سے منسوب بھی تھیں۔''

وہ لمحہ بھر کو رکے۔

''ان کے اس اقدام سے ان کی بڑی بہن کے لیے بھی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کے سسرال والوں کو اس تمام صورت حال سے بے خبر رکھنے کی ہم سب نے پوری کوشش کی لیکن ایسی باتیں تو بہر حال اپنا راستہ خود بنا کر ہر طرف پھیل جاتی ہیں۔ اس لیے ہم لوگ چاہتے ہیں کہ قبل اس کے یہ بات مزید کئی رنگوں میں رنگ کر پھیلے۔ مہناز اور الماس کی رخصتی کر دی جائے۔''

''دیکھیں سر!'' رضا گویا ہوا۔ ''میں یہ مانتا ہوں کہ ہم دونوں نے قدرے جلد بازی کا مظاہرہ کیا لیکن دراصل ہم دونوں خوفزدہ تھے۔ اس نسبت سے جو آپ دونوں کے درمیان قائم کر دی گئی تھی۔ بے چینی کی کیفیت میں جو راستہ ہم دونوں کو نظر آیا۔ وہ ہم نے اپنا لیا۔ آگے کیا کیا مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں، اس کا ہمیں اتنا اندازہ نہ تھا۔ خصوصاً مہناز کے حوالے سے تو ہم نے سوچا ہی نہ تھا۔ لیکن جہاں تک الماس کی رخصتی کا سوال ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ میں آج کل معاشی اعتبار سے نہایت کمزور ہوں۔ یہ مسئلہ کسی طور حل ہو جائے تو مجھے شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔''

"میں بھی پوائنٹ کلیر کرنے جارہا تھا۔" عثمان خان کی آنکھوں میں مبہم سی چمک ابھری تھی۔ "رضا صاحب! الماس نے جس قدر آپ کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ آپ کے حالات سے پوری طرح سے واقف تھیں۔ اس لیے ہمارے خیال میں انہیں اب اس بات پر بحث کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ کہ شادی کے بعد آپ لوگوں کا طرز زندگی اور معیار زندگی کیا اور کیسا ہوگا۔"

"میں نے کبھی اس بات پر بحث کی بھی نہیں۔" الماس دفعتاً برہمی سے بولی تھی۔

نجانے کیوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ عثمان خان دانستہ رضا کو پریشان کر رہے تھے۔

"گڈ!" وہ مسکرائے۔ "تو رضا صاحب! جب الماس ہر طرح کے حالات میں آپ کا ساتھ نباہنے کے لیے تیار ہیں تو آپ کو بھلا کیا اعتراض ہے۔ جہاں آپ رہائش پذیر ہیں، وہاں ان کو بھی اپنے ساتھ رکھیں۔ جیسا آپ کا طرز زندگی ہے وہی یہ اپنا ئیں گی۔ آپ یہ کیوں سوچ رہے ہیں کہ پہلے تمام تر آسائشوں کا بندوبست کریں پھر ان کو لے کر جائیں۔"

الماس ہونٹ کاٹنے لگی۔ عثمان خان ضرورت سے زیادہ تلخ ہو رہے تھے۔

جس طرح کے ماحول میں یہ پلی بڑھی ہیں۔ وہ میرے طرز زندگی سے میچ نہیں کرتا۔" وہ بولا تھا۔ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اگر آپ لوگ مجھے ذرا سا سہارا دیں تو میں بہت جلد۔"

"رضا صاحب!" عثمان خان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ بات تو بالکل مت کیجیے۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ الماس کے اس فیصلے نے ہمارے پورے گھرانے کو ایک عظیم دکھ سے دوچار کیا ہے۔ اگر ہم سب یہاں بیٹھے ہیں تو اس کا یہ مطلب بالکل بھی نہیں ہے کہ ہمارے بڑوں کے دل سے یہ صدمہ کم ہو گیا ہے۔ یا ان کی خفگی دور ہو گئی ہے۔ آپ کو یہاں بلایا گیا چند باتیں کلیر کرنے کے لیے۔ پہلی بات یہ کہ ممتاز کے ساتھ الماس کی بھی رخصتی چاہتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ الماس کے بزرگوں نے سزا کے طور پر انہیں کچھ بھی نہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ یہاں سے صرف اور صرف الماس کو لے کر جائیں گے۔ محض اس ایک لباس میں جس میں یہ ملبوس ہوں گی۔ کوئی جہیز، کوئی بینک بیلنس نہیں۔ آپ دونوں نے اپنی زندگی خود شروع کرنی ہے۔ خود آگے بڑھانی ہے۔"

الماس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ جبکہ رضا کا چہرہ اسفید ہو گیا تھا۔

"دیکھیں عثمان صاحب! میرے پاس ان کو دینے کے لیے فی الوقت کچھ بھی نہیں ہے۔"

"یہ بات آپ کو نکاح سے پہلے سوچنی تھی۔"

"دیکھیں۔ یہ آپ کے اپنے خاندان کی عزت ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اگر آپ لوگ مجھے اپنا داماد سمجھتے ہوئے۔ اپنے گھر کا ایک فرد قرار دیتے ہوئے، مجھے ذرا سا سہارا دے دیں تو اس میں آپ کی اپنی عزت اور نیک نامی ہے۔"

"مثلاً؟" ولاور چچا بولے تھے۔ "کیا چاہتے ہو تم۔"

"چچا جان! آپ کا اتنا بڑا بزنس ہے۔ آپ مجھے اس میں شریک کر لیجیے۔ کسی اچھے عہدے پر فائز کر دیں۔ یا پھر الماس کے والد اگر مجھے

باہر بلوا لیں اپنے پاس۔ میں بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔" وہ گھبرا گھبرا کر بول رہا تھا۔

"ہوں!" عثمان خان مسکرائے تھے۔ "الماس سے نکاح اسی لیے تو نہیں کیا تھا آپ نے؟ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے۔"

"جی۔ بالکل نہیں۔" وہ بوکھلا گیا۔

"ناؤ اسٹاپ اٹ۔" الماس کھڑی ہو گئی تھی۔ "عثمان صاحب! میں سب کچھ بہت اچھی طرح سے سمجھ رہی ہوں۔ آپ کا پورا کھیل میری سمجھ میں آ گیا ہے۔ کس طرح سے آپ رضا کو گھیر کر اپنی مرضی کے بیان تک لائے ہیں۔ آپ کو تو پولیس میں تفتیشی افسر ہونا چاہیے۔"

"الماس! انہیں سمجھاؤ ناں پلیز!" رضا بولا تھا۔

"کسی کو کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے رضا۔" وہ اس سے بولی پھر مڑ کر عثمان سے مخاطب ہوئی۔

"آپ کی ساری شرائط میں منظور کرتی ہوں۔ مجھے آپ کے والد کی جائیداد یا بینک بیلنس میں سے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے جہیز کے نام پر کسی شے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ میں ابھی اور اسی وقت اپنے شوہر کے ساتھ یہاں سے جا رہی ہوں۔"

"نہیں الماس!" رضا پریشانی سے کھڑا ہو گیا۔ "ایسے نہیں۔ ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ! ابھی میں تمہیں نہیں لے جا سکتا۔"

"واٹ؟" وہ بھڑک گئی۔ "میں تمہاری بیوی ہوں رضا! ان لوگوں کی یہ باتیں سن کر بھی تم مجھے ساتھ لے جانے سے انکار کر رہے ہو؟ بھلا کیا مانگ رہی ہوں میں تم سے؟ میری فکر مت کرو۔ میں خود جاب کر کے اپنا خرچ پورا کر سکتی ہوں۔"

"کول ڈاؤن الماس!" وہ دبے لفظوں میں بولا تھا۔ "پلیز بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ کیوں اپنے حق سے خواہ مخواہ محروم ہو رہی ہو۔"

الماس بھی نہ سمجھتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئی۔ باقی سب لوگ اس طرح سے خاموش بیٹھے تھے جیسے وہ حاضرین میں تھے ہی نہیں۔ گویا سب کچھ پہلے سے طے شدہ تھا۔

"چچا جان!" رضا عمران سے مخاطب ہوا۔ "ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ الماس آپ کی بھی بیٹی ہے۔ اس کی راحت، خوشی اور آرام میں آپ کی بھی راحت ہو گی۔ میں نہیں چاہتا، الماس کو میری وجہ سے کوئی تکلیف پہنچے۔ یہ بہت عزیز ہیں مجھے۔ میں انہیں خوشیاں دینا چاہتا ہوں ہر صورت میں۔ اور پھر میرا اس دنیا میں ہے ہی کون۔ الماس کے حوالے سے اب میرے رشتے دار بھی آپ لوگ ہی ہیں۔ میری مانیں تو خفگیوں اور ناراضگیوں کو ختم کر کے ہنسی خوشی سب معاملات طے کر لیے جائیں۔ الماس کی رخصتی پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ خود میں یہاں آنے پر تیار ہوں۔ میرا مطلب ہے، جب تک کہ کوئی مناسب بندوبست نہیں ہو جاتا۔"

"ہوں۔" دلاور چچا نے ہنکارا بھرا۔ "پھر یوں کرو برخوردار! کہ جلد ہی کوئی مناسب بندوبست کر کے ہمیں اطلاع کرو۔"

"جی!"

آنکھوں میں ایک الجھن بھرے وہ الماس کو دیکھ رہا تھا۔



"کیا بات ہے جناب! اتنا بجھا بجھا انداز؟ خیریت تو ہے؟" وہ مسکرا رہے تھے۔

"اپنی سیٹ پر بیٹھی، کام کرتی نیلم کا ہاتھ تھم گیا۔ اس نے ایک تھکی ہوئی نگاہ ان پر ڈالی۔

"میری زندگی میں شاید خیریت نام کا کوئی لفظ ہی نہیں ہے سراہد گمانیاں، پریشانیاں، وحشتیں، اضطراب۔ بس سب کچھ میرے کھاتے میں درج ہے۔"

بظاہر ٹھنڈے اور سادہ لہجے میں کہی گئی بات کی تہہ میں درد وکرب کھول رہا تھا۔

"لگتا ہے کسی سے لڑ کر آ رہی ہیں۔" وہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔

"ہر وقت اپنے مقدر سے جنگ کرتی رہتی ہوں۔ آپ محض آج کی بات کرتے ہیں۔"

عباسی صاحب نے اسے غور سے دیکھا۔ یہ تیزی، یہ برجستگی کبھی بھی اس کا خاصا نہ رہی تھی۔

"مخصوص قسم کے حالات مخصوص رویوں کا باعث بنتے ہیں۔" وہ دھیرے سے مسکرائے۔ "آج تو آپ حیران کیے دے رہی ہیں۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تمام پیپرز میز پر رکھ دیے اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

"تھک گئی ہیں؟" وہ ہمدردی سے پوچھنے لگے۔

"جی سر!" اس کی بند پلکوں پر ننھے ننھے موتی چمکنے لگے۔ "بہت تھک گئی ہوں۔ جی چاہتا ہے کوئی سہارا ہو۔ جس کو تھام کر چند لمحوں کے لیے سستا لوں۔ کوئی کاندھا ہو جس پر سر ٹکا کر جی بھر کر رو لوں۔ اس اندھیری شب میں طویل مسافتیں طے کرنے کے لیے کوئی تو دیا ہو میری ہتھیلی پر۔" وہ جیسے ہسٹریائی کیفیت کا شکار ہونے جا رہی تھی۔

"نیلم!" عباسی صاحب گھبرا سے گئے۔

"اپنی سیٹ سے اٹھ کر وہ اس تک آ پہنچے۔

"کیا بات ہے نیلم! مجھ سے کہیں۔ کوئی بوجھ ہے دل پر تو شیئر کریجیے۔"

اس نے لبریز آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"سر! میں۔ میں پاگل ہوتی جا رہی ہوں۔"

نہ۔ ایسی باتیں نہیں کرتے۔ اچھا! آج کہیں چلتے ہیں۔"

"کہاں؟" وہ غائب دماغی سے بولی۔

"ہے ایک جگہ۔ بالکل فریش ہو جاؤ گی تم۔ او۔ کے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اچھا اب بالکل مت سوچو۔ کوئی بوجھ نہ لو دماغ پر۔ بلکہ طبیعت خراب ہے تو کچھ آرام کر لو۔" انہوں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے پلکیں جھپکائیں۔
"شیور؟" وہ اس پر جھکے۔
وہ دھیمے سے مسکرا دی۔



"آؤ اندر آجاؤ۔" اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر اندر آنے کا اشارہ کر رہے تھے۔
وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی تھی۔
"یہاں۔ کون رہتا ہے سر؟"
"میں رہتا ہوں۔ کبھی کبھی۔" وہ مسکرایا۔ "اندر آؤ۔ بالکنی سے تمہیں سمندر کا نظارہ کراؤں۔ مجھے سمندر بہت پسند ہے۔ جب بھی مجھے کوئی پریشانی ہو، ٹینشن ہو، میں یہاں آجاتا ہوں۔ پھر گھنٹوں بالکنی میں کھڑا سمندر کا نظارہ کرتا رہتا ہوں۔ پھر یوں لگتا ہے، ساری فکریں، ساری پریشانیاں سمندر کی لہریں بہا کر لے گئی ہیں۔"
ان کی بات سنتی وہ آہستہ آہستہ اندر آ گئی تھی۔ چار کمروں کا ویل ڈیکوریٹڈ اپارٹمنٹ تھا۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ ہر جانب دوڑائی۔
"بیٹھو!" انہوں نے گداز صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ "چائے پیوگی؟"
وہ خاموش رہی۔ عباسی صاحب مسکرا دیے۔
"روز آفس میں تم مجھے چائے پلاتی ہو۔ آج میرے ہاتھ کی چائے پی کر دیکھو۔" وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا کوٹ صوفے کی پشت پر ڈال کر ساتھ بنے کچن میں گھس گئے۔
نیلم ان کے ساتھ تو گئی تھی لیکن اب ایک عجیب سا احساس جرم اس کے اندر رہ رہ کر ابھر رہا تھا عباسی صاحب کا نہایت بے تکلفانہ دوستانہ انداز اسے ذہنی خلفشار میں مبتلا کر رہا تھا۔ ریلیکس ہونے کے بجائے وہ مزید ٹینس ہو رہی تھی۔
"میں کیوں چلی آئی یہاں۔" ہاتھ مسلتے ہوئے وہ اسی سوچ میں تھی۔ "کیوں میں ایک اجنبی شخص کے ہمراہ ایک چھت کے نیچے تنہا موجود ہوں۔ کسی کو علم ہو جائے تو کیا سوچے، کیا سمجھے۔ اگر اماں۔"
"کیا سوچا جا رہا ہے بھئی۔ اکیلے اکیلے۔" وہ کچن سے ٹرے اٹھائے نکل رہے تھے۔
ان کی مسکراہٹ نہایت تر و تازہ اور جاندار تھی۔ جیسے وہ اس کے وہاں چلے آنے پر دلی طور پر مسرور ہوں۔ نیلم نے انہیں غور سے دیکھا۔ وہ اسے اپنے آفیسر عرفان عباسی کے بجائے کوئی دوسرا شخص لگے۔ تمام تر انداز بدلے ہوئے تھے۔
"سر! میں گھر جاؤں گی۔" وہ سر جھکا کر آہستگی سے بولی۔
کپ میں کیتلی سے چائے انڈیلتے وہ رک گئے۔

"ضرور! میں خود چھوڑ کر آؤں گا۔ لیکن چائے پینے کے بعد۔"

"سر! ایسے اچھا نہیں لگتا۔"

"کمال ہے!" وہ مبہم سا مسکرائے۔ "مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔ نیلی! آئی ایم ریئلی ہیپی!"

"نیلم نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"حیرت ہے۔ میں تمہیں یہاں تمہاری پریشانیاں شیئر کرنے کے لیے لایا تھا اور اب مجھے لگ رہا ہے جیسے میں خود بہت ہلکا ہو کر فضاؤں میں تیر رہا ہوں۔ نیلی! تمہاری قربت میں ایک عجیب سا جادو ہے۔ مسرور کر دینے والا۔ مخمور کر دینے والا۔"

ان کا لہجہ خمار آلود ہو گیا۔ آنکھیں لو دینے لگیں۔

نیلم کا دل جال میں آئے۔ پنچھی کی طرح دھڑکنے لگا۔ گال تپ کر سرخ ہو گئے۔

"سر!" وہ کانپتی آواز میں بس یہی کہہ سکی۔

"ڈونٹ کال می لائیک دس۔ کم سے کم یہاں تو ایسے مت پکارو۔" وہ نرمی سے بولے۔ "مجھے عباسی کہا کرو۔ مجھ سے قریب لوگ مجھے ایسے ہی پکارتے ہیں۔" وہ اس کے ہاتھ تھامنے لگے۔

"سر! میں جاؤں گی۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"جادو جیسے ٹوٹ سا گیا۔ عباسی صاحب کسی طلسم سے آزاد ہوئے۔

"اوہ! آئی ایم ساری۔ آئی ایم ایکسٹریملی سوری نیلم!" وہ خود بھی کھڑے ہو گئے۔ "نجانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ نیلم پلیز! مجھے معاف کرنا۔"

وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔

"اچھا بیٹھو! چائے تو پی لو۔ اور سمندر کا نظارہ کر لو۔" وہ بوکھلا سے گئے۔

وہ خاموش کھڑی دانتوں سے ہونٹ کچل رہی تھی۔

"نیلم! مجھے مزید شرمندہ مت کرو۔" وہ حد درجہ آزردہ ہو گئے۔ "اگر تم اس طرح بنا کوئی بات کیے چلی گئیں تو میں اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں گا۔"

ایک دبا دبا سا سانس نیلم کے لبوں سے آزاد ہوا تھا۔ وہ آہستگی سے دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تھینکس گاڈ!" وہ اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "اچھا چلو اب چائے پیو۔ بسکٹ لو۔"

"بس سر! میں چائے ہی لوں گی۔" اس نے آہستگی سے کہتے ہوئے اپنا کپ اٹھالیا اور دھیرے دھیرے چسکیاں لینے لگی۔

"کچھ بتاؤ نیلم۔ اپنے بارے میں۔" وہ پرسوچ لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

"کیا بتاؤں سر؟" وہ کپ لبوں سے ہٹا کر دھیرے سے مسکرا دی۔ "میری داستان میں ایسی کوئی زیب و زینت نہیں کہ اسے یوں فرمائش کر کے سنا جائے۔"

"اہمیت داستان کی نہیں ہوتی۔ اہمیت شخصیت کی ہوتی ہے۔ تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ گی تو مجھے وہ سب کچھ دلچسپ محسوس ہوگا وہ آہستگی سے بولے۔

نیلم نے ایک نگاہ ان پر ڈالی۔ اب وہ پھر عباسی صاحب لگ رہے تھے۔ سوبر سے۔ ہمدرد سے۔ اپنائیت بھرے انداز کے ساتھ۔

نیلم چند لمحوں کے لیے کسی سوچ میں گم ہوئی پھر آہستہ آہستہ اس نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ اپنا ہر مسئلہ، ہر پریشانی کھول کر ان کے سامنے رکھ دی۔

زندگی میں پہلی مرتبہ اس کا کسی پر اعتبار کرنے کو جی چاہا تھا۔ یا شاید صبر کا پیمانہ اتنا لبریز ہو چکا تھا کہ اب اسے چھلکنا ہی تھا۔ محض ذرا سا چھیڑنے کی دیر تھی۔

"مجھے یوں لگتا ہے سر! ایک لامتناہی، ہر سو پھیلا ہوا، درد کا صحرا ہے اور میں تن تنہا، ننگے پاؤں چلتی چلی جا رہی ہوں۔ کوئی مجھے روکتا ہی نہیں۔ کوئی کچھ پوچھتا ہی نہیں۔ کہ کہاں سے چلی ہو کہاں تک جاؤ گی۔ زادِ راہ بھی ہمراہ ہے یا نہیں۔ کسی کی محبت، کسی کی توجہ تمہیں درکار بھی ہے یا نہیں۔ ہر کوئی بس خود میں مگن ہے۔"

وہ جیسے خود سے ہی باتیں کر رہی تھی۔

"بات دراصل یہ ہے نیلم!" عباسی صاحب سوچتے ہوئے بولے۔ "کہ جو لوگ دوسروں کو اپنی ذات کا احساس نہیں دلاتے۔ دوسرے ان سے یونہی بے پروا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ خاموش رہ کر ہر غم سہتے ہی چلے جانے کا زمانہ نہیں ہے۔ یہاں چیخنا پڑتا ہے کہ میں ہوں، اپنے ہونے کا یقین سب کو دلانے کے لیے چلانا پڑتا ہے۔ تب دوسروں کو علم ہوتا ہے کہ ہاں! کوئی ہے اور کسی تکلیف میں ہے۔ تم اگر چپ چاپ، راضی خوشی اپنے کزن سے شادی کر لیتیں تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ کسی کو کوئی فرق نہ پڑتا۔ جو جگہ آج تمہاری ہے، وہ کسی اور نے سنبھالی ہوئی ہوتی۔ تم بھی اپنی زندگی میں خوش باش ہوتیں اور کسی اور کو بھی تم سے شکایت نہ ہوتی۔ تم نے قربانی دی اور ایک بڑی غلطی کے ساتھ۔ وہ یہ کہ تم نے کسی کو احساس تک نہ ہونے دیا کہ تم کوئی قربانی دے رہی ہو۔ اپنی خوشیاں دوسروں کی راحت کے لیے تج رہی ہو۔ تمہارے گھر والوں کو علم ہی نہ ہو سکا کہ تم نے ان کے لیے کیا کیا ہے۔ کس طرح اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر اپنی چنی ہوئی سیج اپنی بہن کو تحفتاً دے دی۔"

"وہ سیج نہیں۔ کانٹوں سے بھرا راستہ ہے، جس پر وہ غریب اب تک چل رہی ہے۔"

"یہ تمہارا قصور نہیں۔ تم نے تو اسے اپنے حصے میں آیا ہوا اچھا ل دیا تھا۔ یہ کڑوا نکلا تو اس میں تمہارا کیا قصور۔"

"یہ بات کوئی ماننے کے لیے تیار ہی نہیں۔" اس نے مایوسی سے سر جھکا لیا۔

"کیونکہ تم نے خاموشی سے فردِ جرم سن لی۔ تمہاری اصل غلطی ہی تمہاری خاموشی ہے نیلم! جہاں بولنے کی ضرورت ہو وہاں خاموشی اختیار

کرنا حماقت ہے۔"

نیلم نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا اور مسکرا دی۔

"آپ تو ماہر نفسیات ہیں سر۔"

"ہاں! پڑھا ہے میں نے نفسیات کو بھی۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"میرا ذہن واقعی بہت ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ یہ سب کچھ ڈسکس کر کے۔" اس نے اعتراف کیا۔

"میں نے بہت پہلے کہا تھا تم سے کہ کوئی بھی مسئلہ ہو مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔" وہ مسکرائے۔

"میں اب چلوں گی سر!" وہ کھڑی ہو گئی۔ "بہت دیر ہو چلی ہے۔"

"سمندر نہیں دیکھو گی؟" وہ مسکرائے۔

"اب ضرورت نہیں رہی۔" وہ ہنس دی۔



"میاں! اب گھر سنبھالو اپنا۔" وحیدہ چچی نے ایک زوردار آواز کے ساتھ پاندان بند کیا۔ "مجھ میں اب سکت نہیں رہی ہر کسی کے نازنخرے سہتے رہنے کی۔ اے ہاں! ایک حد ہوتی ہے کسی بھی بات کی۔"

"کیا بات ہے؟" انہوں نے ناگواری سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ "کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟ کھانا مانگا ہے میں نے آپ سے۔"

"کھانا مانگو اس سے جو دن رات اوپر کمرا بند کیے پڑی رہتی ہے۔ اسی لیے تمہارے لیے بیاہ کر لائی تھی میں اسے کہ مجھے کچھ آرام ملے۔ غضب خدا کا، ایک حسن آرا اپنے میکے جا کر بیٹھی ہیں تو دوسری کو ماتم سے فرصت نہیں۔ میں خدا کی بندی کہاں جاؤں۔ کیا کیا کروں؟ جوڑوں کی مریضہ ہوں۔ مجھ سے تو ایک بار بیٹھ کر پھر کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ تم لوگوں کو ماں کی کوئی خبر ہی نہیں۔ ماں جائے جہنم میں تو بیوی لگی رہے برزخ میں۔ وہ غریب تو نہ یہاں کی نہ وہاں کی۔ نہیں رکھنی ہے تو کوئی فیصلہ کر دو اس کا۔ کم سے کم اس عذاب سے تو نجات ملے اس کو۔ دو روٹیاں وہ اپنی ماں کے گھر کھا کر بھی جی لے گی۔" وحیدہ چچی بھری بیٹھی تھیں۔ پھر بھی بالآخر حق بات لبوں پر آ گئی۔

"کیوں؟ پہلے وہ اپنی ماں کے گھر بری لگتی تھی آپ کو؟" وہ پھنکارے۔ "آپ ہی لائی تھیں ناں اسے؟ اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے اب رکھیں اسے۔ دیکھیں اس کا ماتم۔ آپ کو بھی تو کوئی خلش ستائے۔ کوئی فیصلہ چبھے پھانس کی مانند۔ کیوں آزاد کروں میں اسے۔ میرے پر بھی تو آپ سب نے مل کر کاٹے تھے۔"

"اے لو! عجب ہی۔ میاں منہ سنبھال کر بات کرو۔ تمہاری رضا میں لائی تھی اسے۔ اب جھوٹے سچے بہتان نہ باندھو میرے سر۔"

"میری رضا!" انہوں نے دانت کچکچائے۔ "امی امی! آپ بہت بہتر طریقے سے جانتی ہیں کہ میری رضا کیا تھی۔ کیا چاہتا تھا میں۔"

"ہاں ہاں، سب جانتی ہوں۔ کس طرح سب کے سامنے اس نے تھوکا تھا تم پر۔ کیسے انکار کر دیا تھا شادی سے۔ پھر تم نے اپنی مرضی سے

شادی کی ہامی بھری تھی۔ میرے حافظے کو ابھی زنگ نہیں چڑھا۔"

"مجھے بھی یاد ہے، کیسے آپ نے مجھے گھیرا تھا۔ مجبور کیا تھا مجھے۔"

"ہاں بیٹا! عالم بے ہوشی میں سہرا باندھ کر لے گئے تھے تمہیں۔ سب کچھ میں نے اور آمنہ نے ہی کیا۔ مولوی نے بھی ہم دونوں سے ہی پوچھا تھا۔ ہاں ہوں تمہاری، سو وہ بیتی بیکی نہیں جسے بہلا رہے ہو۔"

"بہر حال۔ جو بھی ہوا اس میں زیادہ قصور آپ کا ہے۔ دن رات مجھے طعنے مت دیا کریں۔"

وہ ٹھنڈے ہو کر شرٹ کا بٹن کھولنے لگے۔

"اور اگر واقعی میری ماں ہیں تو میری خطائیں بخش دیں۔ مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہوتو۔"

"تو؟۔" انہوں نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔

"میں شبنم کو آزاد کیے دیتا ہوں۔ آپ نیلم کو لے آئیں۔"

"ہائیں!" ان کے حواسوں پر بم گرا۔ "میاں ہوش میں تو ہو؟ ارے وہ موئی نیلم نہ ہوئی پھانسی کا پھندا ہو گئی رات دن گلے میں یہ طوق پڑا ہے سوچا ہے۔"

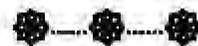
"شور مت مچائیں۔" انہوں نے دانت پیسے۔ "مجھے جو کہنا تھا، میں نے کہہ دیا۔ اسی میں سب کی خوشی اور بہتری ہے۔ غور کیجیے۔"

وہ تیزی سے باہر نکلنے کی کوشش میں دروازے پر کھڑی شبنم سے ٹکرا گئے۔ پیچھے ہٹ کر انہوں نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔

متورم آنکھوں میں طنز کی کیفیت لیے، ہونٹوں پر دل جلانے والی مسکراہٹ سجائے وہ انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ سر جھٹک کر باہر نکل گئے۔

"بہتری۔ خوشی۔" وہ دانتوں سے نچلا لب کاٹ رہی تھی۔ "بھول کر بھی ان کے بارے میں مت سوچنا یوسف صاحب، میں نے یہ چیزیں ہمیشہ کے لیے تمہاری دسترس سے دور کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ خواہ اس میں میری جان کا زیاں ہی کیوں نہ ہو۔"

وحیدہ بیگم چھالیہ چرنی کا پاندان ٹٹول رہی تھیں۔



کتنے دن کے بعد آج وہ اس طرف آئی تھی۔ روش پر سے گزرتے ہوئے وہ لان کی خوبصورتیوں پر نظر دوڑا رہی تھی۔

لاؤنج کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی۔ سامنے بیٹھی جمنا بائی برادہ بھیا صاف کر رہی تھی۔

"السلام علیکم جمنا بائی۔ کیا حال ہیں۔"

"ارے۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ "وعلیکم السلام۔ بٹیا آئی ہے۔ اتنے دنوں کے بعد۔"

"کہاں ہیں سب لوگ۔" اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ "کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ آنٹی، شہروز، کہاں ہیں سب؟۔"

"باجی کی طبیعت ٹھیک نا ہی تھی۔ شہروز بیٹا ڈاکٹر کے پاس لے گئے ہیں۔"

''اچھا!'' وہ فکر مند ہوئی۔ ''خیریت تو ہے ناں۔ کیا ہوا آنٹی کو۔''

''بس ذرا وہ کیا لو ہو جاتا ہے۔'' وہ سوچنے لگی۔

''بلڈ پریشر۔''

''ہاں ہاں وہی ہو گیا۔ آپ بیٹھو بیٹا۔ ابھی آتے ہوں گے۔ ہم چائے بنا کر لاتے ہیں۔'' وہ اٹھنے لگی۔

''ارے رہنے دو جنائی۔ خوامخواہ تکلیف کرو گی۔''

''تکلیف کیسی۔ اتنے دنوں کے بعد ہماری دھیا آئی ہے۔'' وہ آج بڑے موڈ میں تھی۔ مسکراتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

''صبا قریب پڑا میگزین دیکھنے لگی۔ باہر بائیک کی آواز گونجی تو وہ چونک اٹھی۔

بائیک کا مخصوص ہارن وہ اچھی طرح سے پہچانتی تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔

میگزین سائیڈ میں رکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر فیروز احمد اندر آیا تھا۔ چہرے پر چمکتی خوشی کا احساس نہایت واضح تھا۔ اسے سامنے پا کر وہ لمحہ بھر کے لیے حیران ہوا پھر مسکرا دیا۔

''مس صبا! کیسی ہیں آپ؟'' اس کا چہرا چمک رہا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''میں سوچتا ہوا آ رہا تھا۔ نجانے گھر میں سب سے پہلے کس سے سامنا ہوگا۔ حیرت انگیز طور پر۔''

وہ خاموش ہو کر مسکرا دیا۔ آج وہ اتنا خوش نظر آ رہا تھا کہ خوشی اسکے انگ انگ سے چھلک رہی تھی۔

''شاید آپ یقین نہ کریں۔ میری خواہش تھی سب سے پہلے۔ یہ خبر۔'' وہ جھجک کر چند لمحوں کے لیے رُکا۔

''کوئی خوشی کی بات ہے؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''بہت بڑی خوشی ملی ہے مجھے۔ میں نے ایگزام کلیئر کر لیا ہے۔'' اس کا سانس بے ترتیب ہو گیا۔

''P.C.S کا؟'' صبا کھل اُٹھی۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اوہ۔ مبارک ہو بہت بہت۔'' اسے واقعی بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔ ''آپ کو آپ کی محنت کا ثمر مل گیا۔''

''تھینک یو۔'' وہ خوشی سے ہنس پڑا۔

صبا اسے دیکھتی رہ گئی۔ یوں بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے ہوئے وہ کس قدر اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھرے رنگ کتنے بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ ہنسی اس پر کیسی سج رہی تھی۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

اسی لمحے دروازہ کھول کر عفت خانم اور شہروز اندر آئے تھے۔

"امی۔ امی۔ میرا رزلٹ آگیا۔ میں نے ایگزام کلیئر کرلیا ہے۔" وہ بے اختیار ان کی جانب بڑھ گیا۔

"شکر ہے میرے مولا کا۔" عفت خانم نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

"یاہو۔" شہروز نے نعرہ لگایا۔ "فیروز بھائی زندہ باد۔"

وہ ماں سے الگ ہو کر بھائی سے لپٹ گیا۔

صبا مسکراتے ہوئے ان سب کی خوشیوں کے رنگ دیکھتی رہی۔ اس لمحے پھر اس کا من بے ایمان ہونے لگا تھا۔ اس ماحول کا ایک حصہ ہونے کی خواہش پھر اس کے اندر جوار بھاٹے کی مانند اٹھنے لگی تھی۔

پھر بڑی آہستگی سے ان سب کے درمیان سے نکل کر وہ گھر چلی آئی تھی۔



خفگی سے تپا ہوا چہرا لیے وہ قدرے رخ موڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ رضا مراد اس کے قدموں میں بیٹھا آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا۔

"رضا!" الماس نے اس کی بات کاٹی۔ "اب یہ میری انا کا مسئلہ ہے۔ میرے وقار کا معاملہ ہے۔ میں یہ طے کر چکی ہوں کہ میں ولاور خان کا ایک پیسہ نہ لوں گی۔"

"ڈونٹ بی سلی الماس!" اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ دبایا۔ "تم دشان خان کے پھیلائے ہوئے جال کی بنت پر غور کرو۔ اس میں چھنسو مت۔ وہ شخص یہی کچھ چاہتا ہے کہ تم اگر اس سے نسبت توڑ کر کہیں اور انٹرسٹڈ ہوئی ہو تو اب اس کے باپ کے مال میں سے ایک پیسہ بھی نہ لے جاسکو۔ اسی لیے اس نے یہ جال بڑی خوبصورتی سے پھیلایا ہے۔ خواہ مخواہ جذباتیت پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کا شکار تمہاری والدہ تک ہو گئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اس کا پلان میں اس کے منہ پر ماروں گی۔ وہ تمہیں لالچی ثابت کرنا چاہ رہا ہے نا۔ تو تم اسے بتا دو کہ تم کتنے آنسٹ ہو۔ اس طرح میں بھی اپنی ماں اور چچا کی نظر میں سرخرو ہو جاؤں گی۔۔ دیکھو رضا۔ حالات سے اتنے خوفزدہ مت ہو۔ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔ میں بنوں گی تمہارا سہارا۔"

"نہیں چاہیے مجھے ایسا کمزور سہارا الماس!" وہ جھنجلا کر پرے ہو گئے۔ "نہیں چاہیے مجھے ایسا کمزور سہارا کہ ایک طویل عرصے تک میں یونہی جوتیاں چٹخاتا رہوں۔ میں کچھ بننا چاہتا ہوں۔ کسی مقام پر پہنچنا چاہتا ہوں۔ ایک ہی جست میں۔ تم میری بات سمجھو۔ مجھے موٹیویٹ کرنے کی کوشش مت کرو۔"

"کیا میں یہ سمجھوں کہ ہر طرح کی دشمنی کے باوجود دشان خان کا تمہارے میں کیا گیا تجزیہ درست ہے؟" وہ بھڑک اٹھی۔

"پاگل ہو تم۔ بے وقوف۔ جاہل۔"

"رضا! بدتمیزی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" وہ بھنا گئی۔

"ہاں۔ لیکن بے وقوفی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔" وہ غصے میں کھڑا ہو گیا۔ "خالی ہاتھ آنا چاہتی ہو۔ یہاں۔ اس فلیٹ میں۔ رہ لو گی تم؟"

"ہاں۔ رہ لوں گی۔ وہ قطعیت سے بولی۔

"لیکن میں نہیں رہوں گا۔ یہ مت سمجھو کہ میں صرف تمہارے حسن پر مرمٹا تھا۔" وہ غصے میں کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔

"رضا!" وہ اس کا منہ تک رہی تھی۔ "کہو۔ کیا کہہ رہے تھے۔"

"دیکھو الماس۔ مجھے کچھ بننے کے لیے تمہاری مدد درکار ہے۔" وہ نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "اپنے گھر والوں کو میرے حق میں راغب کرو۔ الٹا مجھے بڑکانے کی کوشش چھوڑ دو۔ چھوڑ دیا نا اور دوار کا جھگڑا۔ انا ونا کچھ نہیں ہوتی۔ انسان کی راحت اور سکون سب سے بڑی نعمت ہے۔ چاہے اس کے لیے کسی کے آگے جھکنا ہی کیوں نہ پڑے۔"

"وہ چند لمحے اس کے الفاظ پر غور کرتی رہی۔ پھر اس نے اٹھ کر سینڈل پہنے، پرس اٹھایا اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

"مجھے افسوس ہو رہا ہے رضا!" دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رُکی تھی۔ "عثمان خان کے مقابلے میں میں یہ بازی ہار گئی ہوں۔ آئی ایڈمٹ۔"

برف کی طرح سرد لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ باہر نکل گئی تھی۔



ایک عجب اضطراب کی کیفیت میں وہ صحن میں ٹہل رہی تھی۔

ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ لبوں کو بار بار کاٹتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔ وہ کیا بننے جا رہی تھی۔ لیکن ہر بار جواب میں انتقام کے دہکتے جذبے کی منہ زور لہریں اس کے خیالات پر بادل بن کر چھا جاتی تھیں۔

''ہاں۔ ٹھیک ہے۔ یہی ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جو، جو طوفان بن کر اٹھے اور ملیا میٹ کر دے ہر شے کو۔ تہس نہس کر کے رکھ دے ہر کسی کی ہستی۔ کیا سمجھا تھا مجھے ان لوگوں نے۔ ماں، بہن اور بیٹے نے۔ کوئی پتھر کا ٹکڑا تھی۔ میں روئی کا غذ تھی جس پر یہ ظلم کیا ہے انہوں نے۔ میں انہیں بتاؤں گی کہ ظلم کیا ہوتا ہے۔ کیسے مظلوم کے دل کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔ لہو آنکھوں سے رستے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔''

''دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ بیچ صحن میں رک گئی۔

''کون؟'' اس نے وہیں سے پوچھا۔

''ریاض!'' جواب حسب منشا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''آ گئے آپ!'' پرسکون لہجے میں کہتے ہوئے وہ پلٹ رہی تھی۔

''خیریت تو ہے ناں! تم نے آفس فون کیا تھا'' ۔ وہ حیران تھے۔

''جی ہاں۔ میں نے ہی کیا تھا پڑوس سے فون۔'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''کیوں۔ خیریت۔ امی کہاں ہیں؟'' وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

''چچی جان تو صبح سے آپ کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ یوسف اور یونس بھائی آفس گئے ہیں۔ بس میں اکیلی ہوں۔''

''تو اس لیے بلایا ہے۔'' وہ بات سمجھ کر کھل کر مسکرا دیے۔

''کس لیے؟'' وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

''گپ شپ کے لیے۔'' وہ جھینپ کر ہنسنے لگے۔

''جی نہیں! مجھے تو آپ کے ساتھ آپ کے گھر جانا ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''یوسف اور یونس بھائی تو دیر میں آئیں گے۔ میں نے آپ کو بلایا۔ آپ کیا سمجھے؟''

''شریر!'' وہ شرمندگی سے بولے۔

''آپ بیٹھیں۔ میں ذرا لباس تبدیل کر لوں۔''

انہیں بیٹھا کر وہ اوپر چلی آئی۔ الماری کھول کر کپڑوں پر نظر دوڑانے لگی۔

''شیبا!''

"وہ اس کے عین پیچھے بولے تھے۔ وہ چونک کر مڑی۔

"اوہ! صبر نہ ہوا آپ سے۔" اس نے گہرا سانس لیا۔

"تمہیں دیکھ کر جو صبر سے کام لے، مجھو اس کے سینے میں دل ہی نہیں۔" وہ ہنس رہے تھے۔

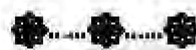
"جانتے ہیں کیا رشتہ بنتا ہے آپ کا مجھ سے؟" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھنے لگی۔

"محبت کا۔ پیار کا۔" وہ اس پر جھکنے لگے۔

"پاگل ہو گئے ہیں آپ۔" اس نے جھنجلا کر انہیں پیچھے دھکیلا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟"

"ایک سرد آواز اُبھری تھی۔ وہ دونوں ہی چونک اُٹھے کمرے کے دروازے پر یوسف کھڑے تھے۔



چند لمحوں کے لیے کمرے میں مکمل خاموشی چھائی رہی، پھر بالآخر شبنم نے خشک لہجے میں کہا۔

"کچھ بھی نہیں، یہ ریاض بھائی کب سے اپنے گھر چلنے کی ضد کر رہے ہیں اور میں جانا نہیں چاہ رہی، کہتے ہیں، چچی جان بلا رہی ہیں۔"

اس نے ایک مطمئن نگاہ ریاض بھائی پر ڈالی جو "کاٹو تو لہو نہیں" کی مکمل تصویر بنے جامد و ساکت کھڑے تھے۔ چہرے پر اس قدر ہونق پن طاری تھا کہ اسے ہنسی آنے لگی۔

کہاں تو ابھی شوخی و شرارت ان کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی اور کہاں وہ صورت ہوئی تھی کہ لگتا تھا ابھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں گے۔

یوسف نے پھر ایک نگاہ ان دونوں پر ڈالی۔ نظروں میں بے تحاشا اُلجھن بھری ہوئی تھی۔ جیسے چند لمحوں قبل جو منظر یک بیک تبدیل ہوا تھا اسے واپس..... ذہن میں لانا چاہ رہے ہوں کہیں کچھ غلط ہونے کا احساس پھانس کی طرح ان کے دماغ میں چبھ رہا تھا۔

"آپ لوگ نیچے آجائیں۔ میں کھانا رکھتی ہوں۔"

وہ بھرپور اطمینان کے ساتھ چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔ اس کے انگ انگ سے خوشی اور سرشاری کی لہریں پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ دل اوپر ہی اوپر فضاؤں میں تیر رہا تھا۔ یوسف کی نگاہوں کی بے اعتباری اور اُلجھن اسے بے پایاں مسرت کے احساس سے دوچار کر گئی تھی۔ اس کا جی قہقہے لگانے کو چاہ رہا تھا۔

"ضد اور انتقام کے اس محاذ پر یہ میری پہلی فتح ہے یوسف صاحب! بے اعتباری کا پہلا تیر جو میں نے تمہارے سینے میں پیوست کیا ہے۔ کئی دن تمہاری نیندیں اُڑائے رکھے گا۔ بے سکونی کے عذاب کے لیے گن گن کر گزارو گے تو میری متورم آنکھوں کا درد تمہیں چڑانے لگے گا۔"

وہ تلخ مسکراہٹ کے ساتھ چھوٹی میز پر کھانے کا سامان رکھ رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں پیچھے اندر داخل ہوئے۔ یوسف کے چہرے پر خوفناک سنجیدگی برس رہی تھی۔ جبکہ ریاض بھائی کی صورت وہی بارہ بجا رہی تھی۔

"بیٹھیں بھائی صاحب!" یوسف نے شاید اس عرصے میں پہلی مرتبہ انہیں مخاطب کیا تھا۔

"میرا خیال ہے یوسف میاں! میں چلتا ہوں۔" وہ ہچکچائے۔ "گھر پر بھی انتظار ہو رہا ہوگا۔"

"کمال کرتے ہیں ریاض بھائی!" وہ دلشنا بڑی لگاوٹ سے بولی تھی۔ "اتنی دور سے آئے ہیں اور کھانا کھائے بغیر ہی چلے جائیں گے۔ ایسا ہوسکتا ہے بھلا!"

"اس نے ان کا بازو تھام کر انہیں زبردستی کرسی پر بٹھا دیا۔

"بھئی کیا کرتی ہو۔" وہ پھیکی ہنسی ہنسنے لگے۔

یوسف سر جھکائے خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔

"آپ لوگ کھانا کھائیں، تب تک میں تیار ہو جاتی ہوں۔"

"ریاض بھائی نوالہ توڑتے توڑتے رک گئے۔

"چلنا بھی تو ہے آپ کے ساتھ!" وہ مسکرا کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

ریاض بھائی نے چور نظروں سے سالے کی سمت دیکھا تھا۔

تیار ہو کر وہ واقعی ان کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔ یوسف کو کچھ بھی بتانے کی زحمت کیے بغیر، وہ گیٹ بند کر کے بائیک پر ان کے پیچھے سوار ہوگئی۔

"شیوا تم بڑی سیدھی ہو۔ بالکل۔ بالکل دیوانی ہو۔" ریاض بھائی کو اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے غالباً مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"کیوں؟" وہ اپنا چہرہ ان کے کاندھے کے قریب لے آئی۔ "میں نے بھلا کیا کیا ہے؟"

"اف مارے بھئی۔ یوسف میاں کے سامنے۔ نجانے وہ کیا سوچ رہے ہوں۔ پتا نہیں کیا دیکھ لیا ہو۔ وہ سخت گھبرائے ہوئے تھے۔

"ایسا بھی کیا دیکھ لیا ہوگا۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "یوں بھی آپ تنہائی پاتے ہی کچھ زیادہ ہی رومینٹک ہونے لگتے ہیں۔ ہزار مرتبہ سمجھایا ہے میں نے آپ کو کہ اپنے ہوش و حواس سلامت رکھا کریں۔ لیکن آپ ہیں کہ بہکتے ہی لگتے ہیں۔"

"کوئی بڑا فساد نہ برپا ہو جائے۔" وہ سخت فکر مند تھے۔

"آپ ڈرتے کیوں ہیں؟" وہ اپنا چہرہ مزید قریب لے آئی۔ میں ہوں نا آپ کے ساتھ!"

"ہوں ہوں۔ کیا ایکسیڈنٹ کرواؤ گی۔"

"وہ ہنستے ہوئے پیچھے ہوگئی تھی۔



سخت سستی کے عالم میں بیٹھی وہ اپنے دوپٹے کے کنارے بنی کروشیا کی بیل کو ناخنوں سے نوچ رہی تھی۔ گھر میں بڑی پراسرار سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی شخص کسی دوسرے سے بات کرتا نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ماسوائے راشدہ بیگم اور عاصمہ چچی کے۔ وہ دونوں ضرور کسی نہ کسی کونے میں سر جوڑے صلاح و مشورہ کرتی نظر آجاتی تھیں۔

اور وہ تو ایک عرصے سے قید تنہائی کی سی زندگی گزار رہی تھی۔ نہ وہ کسی کو مخاطب کرتی تھی نہ کوئی دوسرا ہی اس سے بات کرنے میں پہل کرتا تھا۔

رضا سے ملے اسے آٹھواں دن تھا اور ان آٹھ دنوں میں اس نے بے چینی اور اضطراب کی ہر ہر کیفیت سے گزر کر دیکھ لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ گمبھیر خاموشی جلد ہی ٹوٹنے والی تھی اور پھر ایک شور برپا ہونا تھا۔

رضا سے عشق کا بھوت مکمل طور پر اس کے سر سے اتر چکا تھا اور اب اسے ہر بات نہایت واضح اور صاف نظر آرہی تھی۔ صورت حال کا وہ مکمل اور درست تجزیہ کر چکی تھی۔ اب تو محض نتیجے کا انتظار تھا۔

قدموں کی چاپ پر اس نے سر اٹھایا۔ عثمان خان اس کے قریب کھڑے تھے۔

"کیا بات ہے؟" ان کا لہجہ حسب معمول نرم تھا۔ "یہاں سیڑھیوں پر تنہا بیٹھی کیا سوچ رہی ہیں۔"

اس نے بغیر بولے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ ایک سیڑھی طے کر کے اس کے برابر بیٹھ گئے۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگے۔

"بہت ٹینس لگ رہی ہیں!"

"الماس نے گردن موڑ کر انہیں بغور دیکھا۔

"جیسا سلوک اس گھر میں میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس سے مضبوط سے مضبوط اعصاب کا مالک بھی دماغی توڑ پھوڑ کا شکار ہو سکتا ہے۔ پریشان دکھائی دے رہی ہوں تو اس میں استفسار کی ضرورت کیا ہے؟۔"

وہ ہولے سے مسکرائے۔

"اس گھر کے افراد کی تعداد پر غور کیجیے پھر سوچیے کہ ایسا سلوک محض آپ کے ساتھ ہی کیوں ہو رہا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے الماس صاحبہ! کہ گھر کے افراد کے ساتھ آپ کا سلوک بھی کچھ خاص قابل ذکر نہیں رہا۔ بہت سے لوگ آپ ہی کی وجہ سے ٹینشن کا شکار ہیں۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" اس نے سر جھٹکا۔ "اپنی زندگی کے بارے میں ایک فیصلہ ہی کیا تھا کسی کو گولی تو نہیں ماردی تھی۔"

"چلیں!" اس کے تیور دیکھ کر انہوں نے ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے بات کا رُخ موڑا۔ "جوا سو ہوا۔ اتنا ضرور کہوں گا الماس کہ ساری زندگی کے فیصلے اس قدر جلد بازی میں نہیں کیے جاتے۔ رضا صاحب کافی دن سے نہیں آئے۔"

انہوں نے یک لخت سوال کیا تھا۔ الماس بے اختیار نظر چرا گئی۔

"پتا نہیں۔ مصروف ہوں شاید!" ماربل کی سیڑھیوں پر نظر جما کر آہستگی سے بولی تھی۔

"یہاں اس قدر اہم کام ان کا منتظر ہے۔ انہیں ایسی بھی کیا مصروفیت ہوگی۔ بابا جان بڑی شدتوں سے ان کے منتظر ہیں۔"

وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولے تھے۔

الماس نے پریشانی سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اور کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ شاید جو کچھ کہنے کے لیے اس کے پاس تھا، اسے سننے کے لیے عثمان خان موزوں شخصیت نہیں تھے۔



بڑے دنوں کے بعد کسی مہربان کاندھے کی ضرورت پڑی تھی۔ کسی ہمدرد سے لہجے کو سننے کا جی چاہا تھا۔

کسی سوچ میں گم ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ صبا کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ کال بیل بجا کر گیٹ کھلنے کی منتظر تھی۔

"کون ہے؟" انٹرکام پر صبا کی امی تھیں۔

"آنٹی میں ہوں الماس، صبا کی فرینڈ!" وہ جھجک کر بولی۔

چند لمحوں میں گیٹ کھل گیا۔ صبا اس کے مقابل تھی۔

"الماس۔" وہ کھلی ہوئی تھی۔ "اتنے دن بعد۔ راستہ بھول گئی تھیں؟ آج یاد آیا ہے؟"

"اندر تو آنے دو۔" وہ مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوگئی۔

"سچ میں اتنا بور ہو رہی تھی۔ اچھا کیا تم آگئیں۔" وہ اسے لیے اپنے کمرے میں آگئی۔ "میں تو بھول ہی گئی تھی اس دنیا میں میری کوئی اچھی پیاری سی دوست بھی ہے۔"

"تو یوں کہو نا!" الماس بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ "بھولی میں نہیں تم تھیں۔ پہلے کبھی کبھار فون کر لیا کرتی تھیں۔ اب وہ بھی نہیں کرتیں۔"

"یوں ہی کہہ لو۔" صبا شرمندگی سے مسکرا دی۔ "اچھا چھوڑو یہ فضول سے گلے شکوے۔ یہ بتاؤ کیسے مزاج ہیں۔ کیا حال چال ہیں۔ اور وہ تمہارے عثمان خان کیسے ہیں؟"

"میرے عثمان خان؟" وہ ہنس دی۔ "ہم واقعی بہت دنوں کے بعد ملے ہیں صبا!"

"کیا مطلب؟" صبا نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"وہ انگیج منٹ تو کب کی ختم ہوگئی۔"

"کیا؟" صبا کو شاک لگا تھا۔ "کب؟ کیوں؟ تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"اصل میں صبا۔ میں آج اسی لیے آئی ہوں تمہارے پاس!" وہ بیڈ شیٹ پر آڑی ترچھی لائنیں بنانے لگی۔ "بہت کچھ شیئر کرنا ہے تم سے۔

مجھے لگتا ہے صبا! میں بہت زیادہ اوور لوڈ ہو چکی ہوں۔ اب اگر میرے دماغ پر یہ بوجھ کم نہیں ہوا تو یا تو میں پاگل ہو جاؤں گی یا۔ یا خودکشی کر لوں گی۔"

"یا خدا۔!" صبا سخت پریشان ہو گئی۔ "کیسی باتیں کر رہی ہو الماس! آخر ہوا کیا ہے؟۔"

"صبا!" الماس نے اپنی بے تحاشا حسین آنکھوں میں تھکن بھر کر اسے دیکھا۔ "میں۔ میں بہت بری طرح سے استعمال کی جا چکی ہوں۔ رضا ارضا مراد نے ٹریپ کر لیا مجھے۔ میں سمجھ نہیں سکی تھی اسے!"

"کیا ہوا الماس؟" اس کا لہجہ خوفزدہ تھا۔

"میں نے بہت جلد بازی میں فیصلہ کر کے اس سے نکاح کر لیا تھا صبا۔!"

"اوہ تو۔" صبا اپنی جگہ جیسے منجمد ہو گئی۔ "تو تم نے یہ قدم بالآخر اٹھا ہی لیا۔"

"ہاں۔" اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ "اور۔ اور۔ گھر میں سب کو علم ہو چکا ہے۔ سب مجھے اور رضا کو مجبور کر رہے ہیں کہ مہناز کے ساتھ میری بھی رخصتی ہو جائے۔"

"ظاہر ہے۔" صبا نے گہرا سانس بھرا۔ "یہ تو اب ہونا ہی ہے۔ گھر والے اب اور کر بھی کیا سکتے ہیں پھر کب تک ہے رخصتی کا پروگرام؟۔"
اس نے الماس کی سمت دیکھا جو بڑے خوفزدہ سے انداز میں دیکھ رہی تھی۔

"صبا ارضا نے۔ رضا نے کچھ شرائط پیش کر دی ہیں۔ وہ ان کو پورا کیے بغیر رخصتی پر رضامند نہیں ہے۔"

"اور وہ شرائط کیا ہیں!" صبا بڑی حد تک بات کو سمجھ چکی تھی۔

"وہ چچا جان کے کاروبار میں ان کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہے۔" اس نے افسوس سے سر جھکا لیا۔ "وہ چاہتا ہے صبا کہ اس کے سسرال والے اسے مالی طور پر سپورٹ کریں۔"

"اوہ!" صبا بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

"اور چچا جان اور عثمان خان قطعی طور پر انکار کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ رضا اس گھر سے صرف مجھے لے جا سکتا ہے اور بس! ہر کوئی مجھے ڈس اون کر رہا ہے صبا! میں کیا کروں؟"

وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رو دی۔ صبا بڑے افسوس سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھی لڑکی نے اپنی بے وقوفی کے ہاتھوں کمال نقصان اٹھایا تھا۔

"رضا کو سمجھاؤ کہ اب یہ احمقانہ ضد چھوڑ دے اور عزت و احترام کے ساتھ تمہیں تمہارے گھر سے اپنے گھر لے جائے۔ تمہارے چچا جان محض اس کو آزما رہے ہیں۔ وہ اس آزمائش میں سرخرو ہو۔ تو ہو سکتا ہے۔ چچا اس کی مالی سپورٹ کر ہی دیں۔"

وہ کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔" اس نے آنسوؤں میں بھیگا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔ "اور پھر میں اسے جھوٹے خواب کیوں دکھاؤں؟ کیوں کہوں اسے کہ دولہا اور چچا اسے آزما رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے، چچا جان نے سنجیدگی سے یہ شرط رکھی ہو۔ وہ اسے خود بنا کسی مدد کے اپنے پیروں پر کھڑا

ہوتے دیکھنا چاہتے ہوں۔ میں رضا کو جھوٹی امیدیں نہیں دلا سکتی۔ میں ضدی ہوں، خود سر ہوں کچھ بھی ہوں۔ منافق نہیں ہوں۔ وہی کہتی ہوں جو میرے نزدیک سچ ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے میں رضا سے نکاح کو بہت عرصے تک چھپا بھی نہ سکی۔"

"پھر کیا حل ہے اس مسئلے کا تمہارے پاس؟" صبا نے اسے دیکھا۔

"میں۔ میں۔ رضا سے علیحدگی چاہتی ہوں۔" اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

صبا مارے حیرت کے بہت دیر تک کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رہی۔

"میں ایسے شخص کے ساتھ زندگی کیسے گزار سکتی ہوں صبا۔ جس نے محض دولت حاصل کرنے کے لیے میرا سہارا لینے کی کوشش کی۔ مجھے بتائے بغیر۔ محبت کے جھوٹے فسانے سنا کر میری ہمدردی بٹوریں۔ مجھے اپنے عشق کے جال میں بڑی ہوشیاری سے پھانسا، میرے حسن کے قصیدے پڑھ پڑھ کر میری آنکھوں پر سنہرے سپنوں کی پٹی باندھی اور۔ اور جب میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر اس کے ساتھ چل نکلی تو اب وہ کہتا ہے کہ وہ میرے حسن سے نہیں میرے چچا کی دولت سے متاثر ہوا تھا۔ آئی ہیٹ ہم۔"

اس نے آنسو پونچھے۔

"دیکھو الماس! ابھی تمہاری سب سے بڑی خامی ہے۔ جلد بازی میں فیصلے کر کے پہلے بھی اپنا بہت نقصان کر چکی ہو تم۔ مزید حماقتیں مت کرو۔"

"پھر کیا کروں میں؟" وہ زچ ہوئی۔ "چچا جان کی منتیں کروں۔ ہاتھ جوڑوں ان کے آگے کہ میرا نکھٹو شوہر کچھ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ خدارا اس پر رحم کھائیں اور ہماری مالی امداد کریں۔ یا عثمان خان کے پیر پڑوں کہ اس بے کار آدمی کو کہیں اچھی نوکری دلوا دیں۔ آخر وہ خود کچھ کرنے پر راضی کیوں نہیں ہے؟"

"کچھ بھی ہے الماس! وہ تمہاری اپنی پسند ہے۔ اور اب تمہارا شوہر بھی۔ اس کو یوں ڈی گریڈ مت کرو ہر کسی کے سامنے۔ تم اس کی عزت ہو، وہ تمہاری عزت ہے۔"

"وہ خود اپنے آپ کو ہر کسی کے سامنے ڈی گریڈ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔" اس نے جھٹکے سے چہرے پر آئے ہوئے بال ہٹائے۔

"کم از کم اتنا تو کرو کہ یوں برملا اس سے علیحدہ ہونے کی بات مت کرو۔ زندگی کو سیریس لو الماس۔ اسے یوں تماشا مت بناؤ۔"

"صبا! پلیز مجھے کچھ بتاؤ۔ کچھ سمجھاؤ۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کاش یہ مشورے تم نے پہلے مانگے ہوتے الماس!" وہ مایوسی سے بولی۔ "آخر عثمان خان جیسے شاندار آدمی کو چھوڑ کر تم نے اس لالچی آدمی کو کیسے پسند کیا۔ کیا نظر آ گیا تھا تمہیں اس میں۔"

"پتا نہیں۔ شاید میں غیر شعوری طور پر عثمان سے دور جانا چاہ رہی تھی۔ رضا میں مجھے فرار کی صورت نظر آئی تھی۔ یا شاید میری خود پرستی کے

کچھ فاصلے تھے۔ جنہیں انسان پورا نہ کر پاتے تھے۔ انہیں وہ پورا کرنے لگا اور میں۔ آگے بڑھتی چلی گئی۔"
وہ پرسوچ انداز میں بولتی چلی جارہی تھی۔
"اب واپس پلٹ کر آنے کا مت سوچو الماس!" صبا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جو کچھ ہو چکا ہے، اسے کسی نہ کسی طور بہتر بنانے کی کوشش کرو۔ اسی میں بہتری ہے سب کی۔"
"مجھے لگتا ہے میرے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا۔ سوائے اس واحد فیصلے کے۔"
"صبا نے تاسف سے اسے دیکھا۔ الماس اپنی ضدی طبیعت سے مجبور تھی۔ اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے پر قطعی غیر تیار۔ صبا کو اس سے خوف آنے لگا۔



"پھر تم چلو گی نا میرے ساتھ۔" اس نے مریم کو پرامید نظروں سے دیکھا تھا۔
"دیکھو ریشم! میرے پیچھے مت پڑا کرو ہر کام کے لیے۔" وہ جھلائی۔ "اپنی کسی دوست کو لے جانا۔"
"کسے لے کر جاؤں گی میں؟" وہ روہانسی ہوگئی۔ "غزالہ بے چاری ایک ایسی دوست تھی جو میرے کام کروا دیا کرتی تھی۔"
"ظاہر ہے۔ آخر تم سے اپنا اتنا بڑا کام نکلوانا تھا اسے۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے کام بھی نہ کرتی وہ۔!" مریم نے مسکرا کر طنز کیا۔
"مریم! تم انتہا درجے کی خودغرض اور مطلبی ہو۔" ریشم کو غصہ آ گیا۔
"کیوں۔ میں کون سے مطلب نکالتی ہوں تم سے۔ کبھی تم سے کہا ہے کہ میرا فلاں کام کر دو۔ اباؤں کے نوکر تو تمہارے ہی بھرے رہتے ہیں ہر وقت۔"
"ہاں واقعی!" وہ دل گرفتہ ہوگئی۔ "ٹھیک کہتی ہو۔ پتا نہیں اللہ میاں نے مجھے اتنا بے اختیار کیوں بنایا ہے، میرا کوئی نہ کوئی کام کسی نہ کسی سے اٹکا ہی رہتا ہے۔ تمہیں تو کبھی کسی سے کوئی کام نہیں پڑتا۔"
"مریم اس کی روہانسی صورت دیکھ کر مسکرا دی۔
"اب آگے پڑھنے کا شوق تمہیں ہی ہے۔ یونیورسٹی میں پڑھنے کے خواب تم نے ہی دیکھے ہیں جب دل میں شوق ہے تو ہمت بھی پیدا کرو۔"
"بات ہمت کی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔" وہ کمال معصومیت سے بولی تھی۔ مریم ہنس ہنس کر بے حال ہوگئی۔
"میں سچ کہہ رہی ہوں۔" اسے ہنستا دیکھ کر وہ شرمندہ ہوگئی۔ "وہ۔ وہ۔ غزالہ کا بھائی، لگتا ہے کسی بھی کونے سے جن کی طرح نکل کر میرے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ میں اکیلے نکلنے سے گھبرانے لگی ہوں اب۔"
"آخر چار سال کھپانے ہیں تم نے یونیورسٹی میں۔" مریم سنجیدہ ہوگئی۔ "کیا روز مجھے ساتھ لے کر جاؤ گی؟"

"رفتہ رفتہ عادت بھی پڑ جائے گی۔ اور ہمت بھی پیدا ہو جائے گی۔ فی الحال یہ فارم جمع کروانے میرے ساتھ چلی چلو۔ کتنی ذلیل ہو تم۔ کب سے منتیں کر رہی ہوں میں تمہاری۔"

"اچھا بابا! جان چھوڑو۔ مجھے اپنی قیمیں بھی سینی ہے ابھی سیدھا پی بحث۔"

ریشم اسے گھورتے ہوئے اُٹھ کر اندر چلی گئی۔



اگلے دن وہ دونوں یونیورسٹی چلی آئی تھیں۔ نئی نئی جگہ تھی۔ کون سا کام کہاں ہونا تھا۔ دونوں ہی ہر کسی سے پوچھتی پھر رہی تھیں۔

"توبہ ہے ریشم! اتنی بڑی ہوتی ہے یونیورسٹی؟" مریم حیران تھی۔ "میں تو کھو جاؤں یہاں۔"

"کھونے کے ڈر سے تو تمہیں ساتھ لائی ہوں میں۔" وہ ہنسی۔

"نجانے کہاں کہاں لیے پھر رہی ہو مجھے۔ پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے اُگ آئے ہیں۔" مریم نے لبوں پر زبان پھیری۔

"بس یہ فارم جمع کرا دیں پھر چل کر جوس پیتے ہیں۔ ابھی تو مجھے اپنا ڈیپارٹمنٹ بھی دیکھنا ہے۔" اسے اپنے ذوق و شوق کے عالم میں مریم کی پسینے سے لبریز صورت دکھائی ہی نہیں دے رہی تھی۔

"شکر ہے۔ میں نے آگے پڑھنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔" مریم بیزار تھی۔ "مجھے تو روز روز یہاں آنے کے خیال سے ہی کوفت ہو رہی ہے۔"

ریشم اس سے آگے آگے چل رہی تھی۔ اس کی بات سن کر مسکرا دی۔

فارم جمع کروا کر وہ مریم کو کینٹین لے آئی تھی۔

"شکر ہے خدا کا!" مریم نے ٹھنڈے جوس کا گھونٹ بھر کر کہا۔ "کوئی ڈھنگ کی جگہ بھی ہے یہاں۔" ریشم کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ارے ریشم!" اچانک مریم نے اسے ٹہوکا دیا۔ "وہ دیکھو سامنے جو لڑکی کھڑی ہے، کہیں فاکہہ تو نہیں؟"

"ارے ہاں۔ یہ تو فاکہہ ہے۔ کالج میں اپنے ساتھ تھی نا۔" ریشم پرجوش ہوئی۔ "تم بیٹھو میں اس سے مل کر آتی ہوں۔ وہ کھڑی ہو گی۔"

"رہنے دو۔" مریم نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ "مزید دیر ہو جائے گی۔"

"یہ پوچھنے تو دو کس ڈیپارٹمنٹ میں ہے؟" ریشم نے ہنسا کر ہاتھ کھینچا۔ "بعد میں کسی کام کے سلسلے میں آسانی ہوتی ہے جان پہچان کے لوگوں سے۔"

"اُف یہ تمہارے کام!" مریم ہنستا کر جوس پینے لگی۔

وہ کینٹین سے باہر نکل آئی۔ فاکہہ وہاں سے آگے جا چکی تھی۔ ریشم نے اِدھر اُدھر اس کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور آگے بڑھنے لگی۔

"نجانے کہاں چلی گئی۔" بڑبڑا کر وہ واپس جانے کے خیال سے مڑ رہی تھی۔

یکا یک نظریں دو مانوس سی نظروں سے ٹکرا کر لوٹیں۔ ریشم نے کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ وہاں دیکھا۔ بلیو جینز کی پینٹ شرٹ میں ملبوس،

ایک ہاتھ میں کتابیں اور دوسرے ہاتھ میں گنے کا جوس کا گلاس لیے۔ سیاہ سن گلاسز ماتھے پر ٹکائے، وہ خوش شکل نوجوان آنکھوں میں اُلجھن بھرے اسے دیکھ رہا تھا۔ غالباً وہ اسے پہچاننے کی کوشش میں تھا۔

اچانک ایک بجلی سی کوندی۔ غزالہ کی مہندی والی رات اس کی آنکھوں میں گھوم گئی۔ اس کا گھونگھٹ اٹھا کر اندر جھانکنے والا یہی شوخ لڑکا تھا۔

''او خدا!'' ریشم نے گھبرا کر رخ موڑا اور بجلی کی سی تیزی سے ایک سمت کو چل دی۔

ادھر شہروز کو بھی اسے پہچاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

''یہ پکڑو ذرا۔'' برابر کھڑے حیدر کو اس نے کتابیں اور جوس کا گلاس تھمایا۔ سن گلاسز آنکھوں پر جما کر وہ پھرتی سے اس کے پیچھے بڑھا تھا۔

ریشم انگلش ڈپارٹمنٹ کے کاریڈور میں داخل ہو کر پہلے نظر آتے دروازے میں گھس گئی تھی۔ دروازے کے ساتھ لگ کر اس نے سانس بحال کر کے دیکھا۔ وہ گرلز کامن روم میں تھی۔

''شکر خدا کا!'' اس نے دوپٹے سے چہرا صاف کیا اور ایک کرسی پر گرنے والے انداز میں بیٹھی۔ باہر کاریڈور میں کھڑا شہروز پریشانی اور اُلجھن سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

''شہروز!'' حیدر چند لمحوں میں اس تک آ پہنچا۔ ''کیا ہوا ہے کسے ڈھونڈ رہا ہے؟''

''کسی کو نہیں۔'' اس نے کاریڈور میں آتے جاتے لڑکے لڑکیوں پر ایک نظر ڈال کر سر جھٹکا اور اس کے ہاتھ سے کتابیں لے لیں۔ ''یونہی ایک شک سا ہوا تھا۔''

''کیسا شک؟''

''آ نا یار چلتے ہیں۔'' وہ ادھر ادھر متلاشی نظریں دوڑاتا ہوا اسے لے کر باہر کی سمت بڑھ گیا۔



وین سے اتر کر چادر درست کرتی وہ آگے کی سمت بڑھی تھی۔
موسم قدرے خوشگوار ہو رہا تھا۔ اور پچھلے کئی دنوں کا سا حبس نہ تھا۔ مطمئن سے انداز میں وہ قدم بڑھاتی جا رہی تھی کہ اچانک کسی نے گلاب کا مہکتا پھول اس کے آگے کر دیا۔
نیلم ٹھٹک کر رکی قریب کھڑا راجہ بڑی فلمی انداز میں گلاب آگے کیے مسکرا رہا تھا۔ نیلم کے پورے وجود میں جیسے کسی نے زہر گھول دیا۔
"تمہاری کوئی بہن نہیں ہے بدذات انسان؟" وہ دانت پیس کر غرائی تھی۔ "یا تمہاری آنکھوں کی شرم غیرت مر چکی ہے۔"
"پتا نہیں کون ہے۔ کون نہیں۔" اس کے انداز میں سر مو فرق نہ آیا۔ "آپ کی محبت نے ہمیں تو سب کچھ بھلا دیا۔ اور اب ذرا یہ انداز بدل لیں اپنے۔ ایک ڈور سے بندھنے والی ہیں ہمارے ساتھ۔"
"تم بیر گز گز کر مر بھی جاؤ تب بھی ایسا ممکن نہیں۔" وہ دانت کچکچا کر بولی۔
"گھر پہنچ کر علم ہو گا کیا ممکن ہے، کیا نہیں۔" اس نے اسٹائل سے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "امی اور خالہ منگنی کی انگوٹھی لیے آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ میں ہی تو چھوڑ کر آیا ہوں انہیں۔"
نیلم پر جیسے منوں اوس گری تھی۔ وہ اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئی۔ راجہ گلاب کا پھول اس کے قدموں میں گرا کر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ تا دیر وہیں کھڑی اس کے الفاظ پر غور کرتی رہی پھر مرے مرے قدموں سے گھر کی سمت بڑھی تھی۔
"راجہ؟ کیا راجہ تھا اس کی منزل؟ کیا یہ صلہ تھا اس کی ریاضتوں کا۔ اس کے ایثار کا ثمر۔ اس کی قربانیوں کا حاصل۔ کیا اسی لیے کیا تھا اس نے یہ سب کچھ؟ کیا اتنا ہی بے مول تھا اس کا وجود کہ اس گلی کے آوارہ، اوباش شخص کی سیج پر سجا دیا جاتا؟"
قدموں کو گھسیٹتے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوئی۔ دروازے پر ہی ریشم موجود تھی۔
"بجو! آپ آ گئیں؟" اس کا سفید چہرہ اور کھوکھلا لہجہ بتا رہا تھا کہ راجہ نے درست کہا تھا۔
"کیوں۔ نہ آتی؟" اس کا لہجہ برف کی طرح سرد تھا۔
ہاتھ میں پکڑا بیگ اس نے وہیں چارپائی پر ڈال دیا۔
"وہ۔ تیار ہو جائیں بجو۔ اماں نے کہا تھا" وہ خوفزدہ تھی۔
"اماں سے کہو۔ کچھ دن اور انتظار کر لیں۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "موت ویسے نہ آئی تو خود سے کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔ پھر تیار کر کے ہمیشہ کے لیے بھیج دیں مجھے۔"
"بجو!" پیچھے سے مریم چلی آئی۔ "وہ۔ خواتین آئی ہیں۔ انگوٹھی لے کر۔ اماں بلا رہی ہیں۔ آپ کو کمرے میں۔"
"اچانک وہ ایک جھٹکے سے مڑی تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلتی وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔
"کیا چاہتی ہیں آپ؟" وہ اماں سے مخاطب تھی۔ "کیا چاہتی ہیں اماں! کس جرم کی یہ سزا منتخب کی ہے آپ نے میرے لیے؟"

''اماں اور کمرے میں موجود دونوں خواتین دم بخود اسے دیکھنے لگی تھیں۔

''نیلم!'' اماں کے لہجے میں تنبیہ تھی۔ ''دماغ درست ہے تمہارا؟''

''درست رہ سکتا ہے کسی کا دماغ اماں؟'' وہ چلائی۔ ''رہ سکتا ہے؟ حیرت اس بات پر کریں کہ میں پاگل کیوں نہیں ہوگئی اب تک۔ صحیح سلامت کیسے ہوں۔ گھٹ گھٹ کر مر کیوں نہیں گئی۔''

''اے ہے بیٹی۔ ماں کے سامنے یوں چلا کر بات نہیں کرتے۔'' راحہ کی والدہ بڑی ناگواری سے گویا ہوئی تھیں۔

''ماں۔ کہاں ہے میری ماں۔ کون ہے۔ ہے کوئی رشتہ کسی کا مجھ سے۔ کوئی ہے میرا غم گسار۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

ریشم اور مریم گھبرائی اندر داخل ہوئی تھیں۔

''نیلو۔ نیلو کیا ہوا ہے؟'' مریم نے گھبرا کر اس کا بازو تھاما۔

وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوئی مسلسل چیخ رہی تھی۔

ریشم اور مریم بمشکل اسے گھسیٹتی ہوئی کمرے سے باہر لے گئیں۔

''اے بہن معاف کرنا ہمیں نہیں پتا تھا لڑکی کو دورے پڑتے ہیں۔'' خاتون فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''اور صاف کیوں نہ تو بیٹی کی بیماری کی پردہ پوشی تمہیں مہنگی پڑے گی۔ اب کوئی رشتہ آئے تو ڈھکا چھپا کر مت رکھنا۔ چلو ساجدہ۔''

اماں ان کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی تھیں۔

دوسرے کمرے میں اس کے بولنے کی آواز اب تک آ رہی تھی۔

''میں غلطی پر تھی اگر میں نے خود کو حوصلہ مند سمجھا تھا تو۔ میں بہت کم ہمت ہوں۔ کم حوصلہ۔ ان سے کہو مجھے اور نہ آزمائیں۔ میں پتھر سے نہیں بنی۔ گوشت پوست کی انسان ہوں۔ میرے سینے میں بھی دل ہے۔ مجھے بھی درد محسوس ہوتا ہے۔ تکلیف ہوتی ہے۔ آخر کب تک سہتی رہوں یہ لا تعلقی یہ بے نیازیاں۔''

''نیلو! بس کریں۔ یہ لیں پانی پی لیں۔'' مریم ٹھنڈا پانی لے آئی۔

مریم نے گلاس اس کے لبوں سے لگایا تو اس کو جیسے ہوش آ گیا۔ ایک جھٹکے سے گلاس ایک طرف ہٹا کر وہ کھڑی ہوگئی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

ریشم اور مریم نے دکھ سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ دماغی طور پر بے حد مجروح لگ رہی تھی۔ پھر شکست خوردہ قدموں سے چلتی ہوئی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔



"میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا سر۔" پانی پر نگاہ جمائے وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ "پتا نہیں۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ میں اپنے اختیار میں نہ رہی۔ دماغ میں ایک محشر برپا ہو گیا تھا۔ پتا نہیں میں نے کیا کیا۔ کیا کہا۔ حواس بحال ہوئے تو دماغ کی رگیں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔"

"یہ تو خطرناک ہے نیلم! میں نے بھی کئی مرتبہ نوٹ کیا تھا کہ تم پر ہسٹریائی کیفیت اکثر و بیشتر طاری ہوتی رہتی ہے۔ کیوں اتنا بوجھ لیتی ہو دماغ پر۔"

"کون اپنی خوشی سے بدصورت، مردہ سوچوں کو خود پر سوار کرتا ہے سر! یہ تو سب حالات کی کرشمہ سازیاں ہیں۔"

"خود کو تعمیری کاموں سے لگاؤ۔ مثبت انداز فکر اپنانے کی کوشش کرو۔ ورنہ تمہارے دماغ میں جاری یہ جنگ تمہیں لے ڈوبے گی۔" وہ اس پر نظر جمائے آہستہ آہستہ سمجھا رہے تھے۔

"اسی جنگ سے تو نجات چاہتی ہوں میں۔" وہ دکھ سے بولی۔ "آپ کے ساتھ یہاں چلی آئی تو ذہن میں تفریح کے کسی خیال کا نام و نشان نہ تھا۔ محض فرار کی خواہش تھی۔ چند لمحوں کا فرار کہیں بھی کسی سے بھی مل جائے۔"

عباسی صاحب نے میز پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنا ہاتھ نہ ہٹا سکی۔

"سچ کہتی ہو نیلی تم۔" وہ سوچ میں ڈوبے انداز میں کہہ رہے تھے۔ "یہاں ہر شخص محض فرار ہی چاہتا ہے۔ اپنے حال میں فرار کہیں بھی ملے، کیسے بھی ملے، چند لمحوں کے لیے ہی سہی۔ پتا نہیں ہر کوئی اندھا دھند کس سمت کو بھاگ رہا ہے۔ پتا نہیں نیلی! ہم کس سمت کو جا رہے ہیں۔"

نیلم نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"آپ۔ آپ بھی پریشان ہیں سر؟" ان کا کھویا کھویا سا انداز دیکھ کر وہ پوچھ بیٹھی۔

"پریشان ہونا چھوڑ دیا ہے میں نے۔" وہ مسکرائے۔ "اب تو بس رنجیدہ سا رہتا ہوں۔ لیکن تم سے مل کر لگ رہا ہے۔ میں رنجیدہ رہنا بھی چھوڑ دوں گا۔ تمہارا قرب کس قدر سکون و اطمینان کا باعث ہوتا ہے نیلی۔ شاید میں بیان نہ کرسکوں۔"

وہ اداسی سے مسکرا دی۔

"پریشانیوں اور الجھنوں میں گھرا ہوا وجود کسی کو سکون کیسے بخش سکتا ہے سر!"

"شاید ہم ایک دوسرے کی الجھنیں، پریشانیاں، دکھ شیئر کر لیتے ہیں۔ یہی بات ہے نا نیلی!"

"میں نے کبھی پوچھا نہیں سر۔" نیلم نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ "آپ ڈسٹرب رہتے ہیں۔ آپ کو بھلا کس چیز کی کمی ہے؟"

"کمی ہے نیلی۔ ذہنی ہم آہنگی کی۔ میرے اور میری بیوی کے درمیان۔" وہ میز پر رکھا گلاس اٹھا کر پانی پینے لگے تھے۔ ان کے چہرے پر تاثرات گلاس کے پیچھے چھپ گئے۔

"اوہ۔!" وہ بے اختیار بولی تھی۔

"دو بیٹیاں بھی ہیں ہماری۔ ایک چودہ سال کی ہے۔ ایک تیرہ سال کی۔ سولہ برس ہو چکے ہیں ہماری شادی کو۔ لیکن سکون کا ایک پل،

کسی چاہنے والے کے وجود سے ملنے والی خوشی کا ایک لمحہ مجھے آج تک میسر نہ ہوا۔"

"کیوں سر؟" وہ آہستگی سے بولی تھی۔

"ہم ذہنی طور پر ایک دوسرے سے بالکل میچ نہیں کرتے تھے۔ اور کسی نے دوسرے کی خاطر خود کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔"

"دنیا میں کروڑوں شادیاں ہوتی ہیں سر! ذہنی طور پر میچ کرنا اتنی بڑی بات تو نہیں ہوتی۔ اصل بات تو باہمی خلوص اور محبت کی ہے۔ ایک دوسرے کی ناپسندیدہ عادتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی۔"

"وہ ناقابل برداشت حد تک جھگڑالو فطرت کی مالک ہے۔" انھوں نے منہ بگاڑا تھا۔ "ان سولہ برسوں میں ہم ایک دوسرے سے محض نفرت کا رشتہ استوار کر پائے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہوا ہے یہ سن کر۔" اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

"نجانے ہمارے ماں باپ کیوں تصور کر لیتے ہیں کہ محض ہم پر فرض ہے کہ ہم ان کی خواہشات کا احترام کریں۔ ان کے فیصلوں پر سر جھکا دیں۔ آخر ہماری اپنی بھی تو کچھ خواہشات ہوتی ہیں۔ کچھ آرزوئیں ہوتی ہیں۔ جن کا گلا ایک مرتبہ گھونٹ دیا جائے تو عمر بھر مسکرانے کا حوصلہ نہیں ہو پاتا۔ میں اپنی خالہ زاد کو پسند کرتا تھا۔ میری آرزوؤں، ساری خوشیوں کا مرکز تھی وہ۔ لیکن میری ماں نے بہن سے ناچاقی کی بنا پر میری شادی میرے ماموں زاد سے طے کر دی۔ یہ مائیں بھی عجیب ہوتی ہیں نیلی! عمر بھر دعاؤں میں محض اپنی اولاد کی خوشیاں طلب کرتی ہیں اور اولاد کی عمر بھر کی خوشیاں اپنی ضد کے ہاتھوں پامال کر دیتی ہیں۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں۔"

نیلم نے چونک کر انھیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"میری خوشیوں کو بھی میری ماں نے اپنی ضد اور انا کے پرچم تلے ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔ اب برسوں بعد دل میں جینے کی امنگ جاگی ہے نیلی۔"

ان کا لہجہ پھر شہد آگیں ہونے لگا۔ آنکھیں ننھے ننھے دیے جلانے لگیں۔

"دیکھو نیلی! میں تمھیں مجبور تو نہیں کر سکتا۔ تمہاری زندگی تمہاری اپنی ہے۔ اس کے سارے فیصلے تمہارے اپنے ہاتھ میں ہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا۔ اگر حالات تمھیں مزید تنگ کرنے لگیں۔ کوئی الجھاؤ آجائے زندگی میں جو سلجھتا نہ ہو۔ تو ایک مرتبہ مجھ پر اعتماد کر کے دیکھنا۔ مجھے یقین ہے میں تمھیں بے حد خوش رکھ سکتا ہوں۔"

نیلم سے کوشش کے باوجود سر نہ اٹھایا جا سکا۔

"اس عمر میں یہ بات کہنا عجیب سا لگتا ہے لیکن حقیقتاً میں تمھیں چاہنے لگا ہوں۔"

اس کی خاموشی نے جیسے ان کے جذبات کو مہمیز کر دیا تھا۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کے قرب کے سہارے اپنی ساری مشکلیں آسان کر لیں گے۔ ساری الجھنیں سلجھا لیں گے۔"

نیلم نے بالآخر جھکے جھکے انداز میں انہیں دیکھا۔

''آپ جانتے ہیں سر۔فی الوقت میں اپنی زندگی کے بارے میں ایسا کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔میرے کاندھوں پر بھاری ذمے داریوں کا بوجھ ہے۔''

''میں نے کب کہا کہ تم ان ذمے داریوں کا بوجھ ایک طرف پھینک دو۔لیکن خود کو بھلا دو مت۔تمہاری اپنی ایک ہستی ہے۔اپنی خوشیوں کا حصہ وصول کرنا تمہارا حق ہے۔''

''میں کچھ نہیں؟۔''

''ہم دونوں خاموشی سے نکاح کر لیتے ہیں۔جب تک تم اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برا نہیں ہو جاتیں ہم یہ راز چھپائے رکھیں گے۔'' وہ بہت پرجوش ہو رہے تھے۔

''نہیں نہیں۔'' وہ گھبرا گئی۔''سر پلیز! ایسی باتیں مت کیجیے۔معاف کیجیے۔میرے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہیں ہے۔آپ رنجیدہ نہ ہوں۔''

''آہ!'' انہوں نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔''ذرا سی دیر میں کیسے خوش رنگ خواب بن بیٹھا ہوں میں۔'' وہ یکدم ٹھنڈے پڑ گئے تھے......پھر وہ دھیرے سے ہنسے۔

''نیور مائنڈ! تم میری پابند نہیں ہو۔''

''میں اب چلوں گی!'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہاں ہاں۔ضرور۔'' انہوں نے اس کی تقلید کی۔

واپسی کا تمام راستہ وہ خاموشی سے طے کرتی رہی۔

''بڑے دلکش ہوتے ہیں یہ لمحات میرے لیے نیلی!'' گاڑی روک کر وہ بولے تھے۔''میری جگہ کوئی بھی ہوتا، ان کے امر کرنے کی خواہش کا اظہار ضرور کرتا۔تم برا مت ماننا۔''

وہ دروازہ وا کر کے خاموش بیٹھی تھی۔

''اور۔اور۔میں اپنی خواہش کا اظہار کر کے شرمندہ بھی نہیں ہوں۔بلکہ یہ تو میرے دل کی زمین میں یوں جڑ پکڑ گئی ہے کہ شاید ہی اس سے پیچھا چھڑا سکوں۔''

''میں سوچوں گی سر!''

''وہ دھیرے سے کہہ کر گاڑی سے اُتر گئی تھی۔



"میں نہایت واضح الفاظ میں کہہ رہا ہوں امی حضور! ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ زبردست قسم کا دھوکا۔"

"آخر تمہیں کیوں اس بات کا اتنا یقین ہے بیٹا! کہ وہ لڑکی غزالہ ہی تھی۔ نظریں دھوکا بھی تو کھا سکتی ہیں۔ اور پھر تم نے اس کی ایک معمولی سی جھلک ہی تو دیکھی تھی۔"

"وہ جھلک معمولی ہرگز نہیں تھی۔ نقش ہو گئی ہے میری آنکھوں کی پتلیوں پر۔ میں تو اسے ہزاروں لاکھوں میں شناخت کر سکتا ہوں۔ وہ لڑکی وہی تھی بالکل وہی۔ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ چیٹنگ کی ہے۔ فائدہ اٹھایا ہے ہماری شرافت کا۔ لڑکی کو چھپا کر کہہ دیا کہ لڑکی بھاگ گئی۔ بارات لانے کی زحمت نہ کیجیے۔"

ایسا کرنے کی ہمت بھلا کون سے ماں باپ کر پائیں گے شہروز۔" عفت خانم زچ ہو گئیں۔" اور پھر انہیں کس نے مجبور کیا تھا یہ رشتہ جوڑنے پر۔ انہوں نے تو اپنی خوشی سے اپنی بیٹی ہمیں دینے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ پھر بھلا انہیں کیا پڑی تھی عین وقت پر اپنی ہی بیٹی پر اتنا بڑا بہتان لگانے کی کہ پھر زندگی بھر وہ کسی کو صورت نہ دکھا پائے۔"

وہ محترمہ بڑے دھڑلے سے اپنی وہی صورت سب کو دکھاتی پھر رہی ہیں۔" وہ چڑ گیا۔ "یونیورسٹی میں بڑے ٹھاٹ سے پھر رہی تھیں۔ بغیر کسی خوف کے۔ اور پھر اگر وہ غزالہ نہیں تھی تو مجھے دیکھ کر اسے چھپنے کی کیا ضرورت تھی۔"

اس نے بڑی قابل غور دلیل دی تھی۔ عفت خانم لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئیں۔

"سچ کہہ رہے ہو بیٹا!" پھر وہ سانس بھر کر بولیں۔ "لیکن اگر ایسا ہے بھی تو بھلا ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ وہ محترمہ میرے ہتھے تو چڑھیں۔ پھر دیکھیے کیا سلوک کرتا ہوں میں۔" اس نے مٹھیاں بھینچیں۔ "دن میں تارے نہ دکھا دوں تو شہروز احمد نام نہیں۔"

تمہیں بھلا کتنے نفلوں کا ثواب ملے گا اسے دن میں تارے دکھا کر۔" عفت خانم قدرے بے دلی سے بولی تھیں۔ "ہمارے ساتھ تو جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب اگر وہ بچی گھر لوٹ بھی آئی ہے تو خدا اس کے نصیب اچھے کرے نیک توفیق دے اسے۔

اس نے برا سا منہ بنایا۔

"تمہیں کیا پڑی تھی کہ اس کے پیچھے جانے کی۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو کیا ہوتا۔"

"محترمہ کا قتل ہو سکتا تھا میرے ہاتھوں۔" وہ جل کر بولا۔ "اور بھلا کیا ہوتا۔"

"خدا نہ کرے بیٹا! کیسی باتیں کر رہے ہو۔" وہ سچ مچ ڈر گئیں۔

"السلام علیکم۔" منیر وز احمد دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔" عفت خانم نے محبت سے اسے دیکھا۔

"کیا بات ہے۔ یہ بگڑے بگڑے تیور۔" وہ شہروز کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔ "کہیں امی سے جنگ تو نہیں ہو رہی ہے؟"

"مجھ سے تو نہیں البتہ کسی اور سے جنگ کرنے کی مکمل تیاریوں میں ہیں موصوف۔"

"کس سے؟" وہ چونکا تھا۔

عفت خانم نے اسے پوری بات بتادی۔

"نہیں یار۔" اس نے بات سن کر نفی میں سر ہلایا تھا۔ "تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ایک مرتبہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی پر پھر کبھی ماں باپ اتنا بھروسا نہیں کر پاتے کہ اسے یوں کھلے عام ہر جگہ آنے جانے کی اجازت دیں۔ دوسری بات یہ کہ بھائی جان کی بات جس لڑکی سے ہوئی تھی اس کی تعلیم بقول اس کے گھر والوں کے مکمل ہو چکی تھی۔ وہ کہیں اور تو نظر آسکتی تھی لیکن یونیورسٹی میں اس کا کیا کام؟ تیسری اور آخری بات یہ کہ میری اطلاع کے مطابق وہ لڑکی نہ تو گھر واپس آئی ہے اور نہ ہی اس کا کچھ سراغ مل سکا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ وہ کسی دوسرے شہر میں ہے۔"

وہ بات مکمل کر کے اسے دیکھنے لگا تھا۔ شہروز کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہو چلے۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے بھائی۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکی کیوں تھی۔ وہاں سے غائب کیوں ہو گئی؟"

"یہ محض تمہارا وہم ہے۔ اور پھر بعض لڑکیاں نروس ہونے کا شکار رہتی ہیں۔ کسی غیر شخص کو متوجہ پا کر گھبرا جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔ تم آنکھوں میں پہچان کے رنگ لے کر تیزی سے اس کی سمت بڑھے ہو تو وہ گھبرا کر وہاں سے چلی گئی ہو۔"

"ہاں بالکل یہی بات ہے۔" عفت خانم نے فوراً تائید کی۔ "اور اسی سے یہ غلط فہمی کا شکار ہو گیا۔"

"امی جی۔" فیروز احمد بات ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "شاور لے رہا ہوں۔ جب تک کھانا گرم کر دے۔"

وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

عفت خانم نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کر کچن کی سمت چل دیں۔

وہ نچلے لب کو دانتوں میں کچلتا کسی سوچ میں تھا۔ ماں اور بھائی کے سامنے وہ احتراماً خاموش تو ہو گیا تھا لیکن کوئی اس کے ہاتھ پر سورج لا کر رکھ دیتا تو وہ یہ بات ہرگز نہ تسلیم کرتا کہ اسے غلط فہمی ہوئی تھی۔

اسے پورا یقین تھا کہ اس نے آج اسی لڑکی کو دیکھا تھا۔



شام ڈھلنے لگی تو وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی۔ بند کھڑکی کے شیشے سے دھوپ رخصت ہو چکی تھی۔ کمرے میں ہلکا سا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس نے ایک نظر سرہانے رکھی گھڑی پر ڈالی اور اٹھ کر بال درست کرنے لگی۔

چٹیا بنا کر، دوپٹہ کاندھوں پر پھیلا کر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ اپنے ہی کسی دھیان میں تھی، جب صحن میں بیٹھے یوسف کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"کیوں جاتی ہیں اسے گھر میں اکیلا چھوڑ کر؟ پیچھے سے خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کون جواب دیتا پھرے گا؟"

وہ لمحہ بھر کے وہیں ٹھہر گئی تھی۔

"ارے بیٹا! میں بھلا کیا کروں۔ وہ تو ایسی خود سر ہو گئی ہے۔ وہی کرتی ہے جو اس کے من میں سماتا ہے۔ میں صبح سے کہتی رہوں گی چل، چل تو انکار کرتی رہے گی۔ اور جب اپنا من کہے گا تو لمحہ بھر میں چادر اٹھا کر نکل جائے گی۔"

وحیدہ چچی بے بسی کا اظہار کر رہی تھیں۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی من مانیاں سہنے کی۔ اسے صاف کہہ دیں کہ زیادہ پر نکالنے کی ضرورت نہیں۔ شرافت کی زبان سمجھے اور آرام سے گھر میں بیٹھے۔"

"ویسے اور کہیں نہیں جاتی۔" وحیدہ چچی دبے لفظوں میں اس کی حمایت کرنے لگیں۔ "زیادہ سے زیادہ آمنہ سے ملنے چلی جاتی ہے۔ اس کی سسرال۔"

"ہاں تو آپ کے ساتھ جائے اور ساتھ آ جائے۔ آپ کو کس حکیم نے مشورہ دیا ہے کہ پہلے اکیلی وہاں چلی جاتی ہیں۔ پھر پیچھے سے بھائی صاحب کو اسے لینے کے لیے بھیجتی ہیں۔"

"اے لو۔" انہوں نے حیرت کا اظہار کیا۔ "میں کب ایسا کرتی ہوں؟ یہ ریاض میاں پتا نہیں کس وقت میں آ کر اسے لے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں گھر میں اکیلی پڑی ہو گی۔ میں لے آتا ہوں۔"

یوسف بات سن کر بالکل خاموش ہو گئے تھے۔

"بہر حال!" پھر وہ سرد لہجے میں بولے۔ "اسے میں بھی سمجھا دوں گا اور آپ بھی خیال رکھا کریں۔"

باقی سیڑھیاں اس نے کافی زوردار قدموں کے ساتھ طے کی تھیں۔

آنکھوں میں طنز کا گہرا احساس لیے اس نے یوسف کو دیکھا تھا۔ انہوں نے نگاہیں پھیر لیں وہ وہیں تخت پر چچی کے ساتھ بیٹھ کر ان کی چھالیہ کترنے لگی۔

تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر چچی جان اٹھ کر نماز کرنے وضو کے لیے چلی گئیں۔ وہ کچھ دیر تو بیٹھی رہی پھر خود بھی اٹھ کر اندر جانے لگی۔

"بات سنو شبنم!" اچانک انہوں نے پکارا تھا۔

وہ رک کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"آئندہ جب بھی کہیں جانا ہو امی کے ساتھ جانا اور ان ہی کے ساتھ واپس آ جانا۔"

"اس بات کا کیا مقصد ہے؟ میں سمجھی نہیں؟" وہ سپاٹ لہجے میں پوچھنے لگی۔

"میرا مقصد تم اچھی طرح سے سمجھتی ہو۔" انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ "میں بالکل پسند نہیں کرتا کہ میری بیوی غیر مردوں

کے ساتھ موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر سارا جہان گھومتی پھرے۔"

"غیر مرد؟۔ میں بھلا کس غیر مرد کے ساتھ گئی تھی؟" وہ معصومیت سے پوچھنے لگی۔

"تم میرا مطلب بخوبی سمجھتی ہو۔" وہ سرد لہجے میں بولے۔

"اوہ۔ قائبا آپ ریاض بھائی جان کی بات کر رہے ہیں۔ پھر وہ بڑی ادا سے بولی۔ "لیکن وہ غیر تو نہیں۔ رشتے میں میرے بھائی لگتے ہیں۔"

وہ لمحہ بھر کو رکی تھی۔

"جس طرح رشتے میں۔ بجو آپ کی بہن لگتی ہیں۔"

"شبنم!" وہ بری طرح سے غرائے تھے۔

وہ پھر وہاں رکی نہیں۔ تیزی سے اندر چلی گئی۔



امی حضور! ہم کہہ رہے ہیں کہ یہ دعوت ہرگز ہرگز سادگی سے نہیں کی جائے گی۔ محفل رنگ و بو بھی چاہیے۔ ایک سماں بندھا ہوا ہو اور ہم اپنا راسلک کا کرتا پہنیں، جو کہ پچھلے چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر نہ پہنا جا سکا۔ اندر آئے مہمانوں سے مصافحہ و معانقہ کر رہے ہوں۔ ہر سو رنگ برنگی جھنڈیاں لگی ہوئی ہوں۔ گلاسوں کے بجنے کی آوازیں پورے ہال میں جل ترنگ بجا رہی ہو۔ برقی قمقموں کی روشنی میں چہرے کھلے کھلے لگ رہے ہوں۔ جنانے بھی کپڑے تبدیل کر لیے ہوں۔ جس کا امکان کچھ کم ہی ہے۔ اور آپ! آپ ریشمی ساڑی زیب تن کیے بڑی سی کرسی پر بیٹھی مسکرا مسکرا کر مہمانوں کی مبارک بادیاں وصول کر رہی ہوں۔ سوچیے! امی حضور، کیا قیامت کا سماں ہو گا۔"

عفت خانم نے برا سا منہ بنا کر اسے دیکھا۔

"یعنی کون سی بات قابل اعتراض معلوم ہوئی آپ کو؟" اس نے ماں کے چہرے کو دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔

"بیٹا! سادگی میں جو حسن ہوتا ہے ناں! وہ ان چھچھوری تقریبات میں نہیں ہوتا۔ میں تو محفل قرآن خوانی اور محفل میلاد منعقد کراؤں گی۔ بعد میں سب باہر لان میں کھانا کھالیں گے۔ کیا ضرورت ہے رنگ برنگی جھنڈیوں اور برقی قمقموں کی۔ کون سی شادی ہو رہی ہے۔"

"نہ ذکر کیا کریں شادی کا۔" اس نے منہ بنایا۔ "زخم ہرے ہوتے ہیں ہمارے۔ اور پھر رنگین جھنڈیاں محفل میلاد کی رونق بھی دو چند کر دیں گی آپ انتظامات میرے سپرد کر کے دیکھیں۔ فیروز بھائی تو گھر کی سجاوٹ دیکھ کر شرم سے جھوم اٹھیں گے۔ کیا خبر اندر ہی نہ آئیں۔"

عفت خانم کو ہنسی آ گئی۔

"بھائی کی شرافت کا مذاق اڑا رہے ہو۔ شرم کرو۔"

"لیجیے! میں ان کی اداؤں کو محض تصور میں لا کر ان پر فدا ہوا جا رہا ہوں اور آپ اسے مذاق اڑانا کہتی ہیں۔"

"خدا نے میرے بیٹے کو کامیابی دی۔ بڑا شکر ہے اس رب کریم کا۔" عفت خانم تشکر کے جذبات سے لبریز ہو کر بولیں۔

"جی ہاں! اور ہمیں یہ خوشی سلمہ بیٹ ہی نہیں کرنے دے رہی ہیں۔" وہ منہ پھلا کر بولا۔

"جیسا جی میں آئے کرو بیٹا!" وہ مسکرا دیں۔ "میں نے پہلے کب تمہیں کسی بات سے روکا ہے۔ تمہاری خوشیوں سے زیادہ بھلا مجھے کیا عزیز ہو سکتا ہے۔"

"یاہو!" اس نے نعرہ لگایا۔ "امی حضور یو آر گریٹ۔"

وہ مسکرا دیں۔



وہ کش مکش سے بے چین ہو کر اس نے ریسیور اٹھایا۔ نمبر ڈائل کر کے وہ سوچتے ہوئے انداز میں دوسری طرف جاتی ہوئی بیل سننے لگی۔

"ہیلو۔" کچھ دیر بعد ریسیور اٹھا لیا گیا۔ "رضا اسپیکنگ۔"

"اوہ!" الماس کے لبوں سے گہرا سانس نکلا تھا۔ "پوچھ سکتی ہوں، پچھلے دنوں کہاں غائب تھے آپ؟"

"کون۔ الماس؟" وہ بے نیاز رہا۔

"کیوں۔ پہچاننے میں کچھ دقت پیش آ رہی ہے تمہیں؟" وہ دانت پیس کر بولی۔ "کیا مجھے از سر نو تعارف کرانے کی ضرورت ہے۔"

"ہاں، وہ میں ذرا شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "یہ تمہارے انداز کیوں بدلے ہوئے ہیں؟"

"رضا! اٹس ٹو مچ!" اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ "تم آخر چاہتے کیا ہو؟ کیوں مجھے کٹھ پتلی سمجھ رہے ہو؟ یہ کیا تماشا لگایا ہوا ہے تم نے؟"

"نجانے کیا کہہ رہی ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آخر ہوا کیا ہے؟" وہ بڑی سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

"تم جانتے ہو۔ میری جان سولی پر ٹنگی ہوئی ہے اور تم ہو کہ ہر دوسرے دن بتائے بغیر غائب ہو جاتے ہو۔ کیا تم کہیں جانے سے قبل مجھے انفارم بھی نہیں کر سکتے؟" وہ بے بسی سے بولی تھی۔

"اوہ! آئی ایم سوری۔ لیکن میں خود یہ چاہ رہا تھا کہ تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو کچھ وقت مل جائے۔"

"کس لیے؟"

"سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے لیے۔" وہ سکون سے بولا تھا۔

"اوہ!" وہ لمحہ بھر کو رکی۔ "اور تم نے خود بھی تو کچھ سوچا، سمجھا ہوگا۔ کوئی فیصلہ کیا ہوگا؟"

"میں نے تو پہلے ہی سے ہر کام سوچ سمجھ کر کیا تھا۔" وہ جیسے مسکرا رہا تھا۔ "نظر ثانی کی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔"

"واقعی۔" وہ گہرے طنز سے بولی۔ "میں مانتی ہوں تمہاری ساری پلاننگ کو۔"

"دیکھو الماس! ہمیں ایک دوسرے سے نہیں جھگڑنا چاہیے۔" وہ لہجہ بدلتے ہوئے بولا۔

"لیکن اب وہ اس کے سارے لہجے اور ان کے پیچھے چھپے سارے مفہوم سمجھنے لگی تھی۔

"تمہاری خاطر میں ساری دُنیا سے جھگڑ چکی ہوں رضا! اور اب اس کی سزا بھگت رہی ہوں۔" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی تھی۔

"لیکن اب مجھے اپنی غلطی کا پورا پورا احساس ہو چکا ہے۔ اب میں مزید کسی سے جھگڑنا نہیں چاہتی۔"

"ویری گڈ!" وہ ہنسا۔ "جھگڑے والا کام کرنا بھی نہیں ہے۔ بڑی محبت اور پیار سے سب کو منانا ہے۔ اپنے حق میں راغب کرنا ہے۔"

"کس سلسلے میں؟" اس کا انداز جنوز ٹھنڈا تھا۔

"کیا مطلب ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی پوچھ رہی ہو؟"

"رضا! میری بات غور سے سنو۔" دفعتاً وہ بڑے مضبوط لہجے میں گویا ہوئی۔ "مجھ سے شادی کا مطلب ہو گا صرف مجھ سے شادی۔ میرے چچا کے بینک بیلنس سے نہیں۔"

"پھر وہی فضول ضد۔" اس نے بات کاٹی۔

"مجھے اپنی بات مکمل کر لینے دو۔" وہ تیزی سے اس کا جملہ کاٹ گئی۔ "یہ میری ضد ہے۔ انا ہے خواہ جو بھی ہے میرا آخری فیصلہ یہی ہے۔ میں تم جیسے لالچی انسان کو آخری وقت تک آزماؤں گی۔ سر نہیں جھکاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" وہ سخت مشتعل ہو گیا۔ "تو پھر میرا آخری فیصلہ بھی بہت جلد تم تک پہنچ جائے گا۔ تم جیسی خود سر لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

اس نے کھٹ سے ریسیور رکھ دیا۔

الماس ہاتھ میں تھامے ریسیور کو نفرت اور غصے سے دیکھتی رہ گئی۔



وہ بڑی تندہی سے اپنا کام مکمل کر رہی تھی۔ فون کی بیل پر اس نے سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

"مس نیلم۔ عباسی صاحب فون سن کر آپ سے مخاطب کر رہے تھے۔" "آپ کا فون ہے۔"

"میرا فون؟" اس نے سر اٹھا کر انہیں حیرت سے دیکھا

"پھر وہ اٹھ کر ان کی میز تک آئی۔

"ہیلو۔" اس نے ریسیور کان سے لگایا تھا۔

"نیلی! میں یوسف بات کر رہا ہوں۔"

دوسری جانب سے آتی آواز سن کر وہ لمحہ بھر کے لیے سن ہو گئی۔

"ہیلو۔ ہیلو۔ نیلی تم سن رہی ہو ناں۔" وہ اسے بے تابی سے پکار رہے تھے۔

"فرمائیے!" وہ حواس بحال کر کے سرد لہجے میں بولی۔ "کس لیے یاد کیا؟"

"یاد؟۔ یادیں ہی تو ہیں جو جینا عذاب کیے ہوئے ہیں۔" وہ دُکھی لہجے میں بولے۔ "کس لیے یاد کیے جاتا ہوں تمہیں۔ میری اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔"

نیلم نے ایک گہرا سانس لیا۔

"دیکھئے یہ آفس ہے۔ برائے مہربانی کام کی بات کیجیے۔" وہ تلخ لہجے میں بولی تھی۔

"دیکھو نیلم! فون بند مت کرنا۔" وہ گڑگڑائے۔ "بڑی مشکلوں سے یہ نمبر ملا ہے۔ دیکھو نیلی مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ فضول ضد چھوڑ دو۔ دیکھو، شبنم بہت پریشان ہے۔ دُکھی ہے۔"

"شبنم!" وہ دھک سے رہ گئی۔ "کیا ہوا ہے اسے؟"

"جو کچھ بھی ہوا ہے یا ہوگا۔ اس کی وجہ تم ہو نیلی۔"

"میں۔؟"

"ہاں۔ تم! کیوں نہیں سمجھ لیتیں تم یہ بات کہ تمہارے اس انکار کے پیچھے کتنوں کا نقصان ہو رہا ہے میرا نقصان۔ تمہارا نقصان۔ شبنم کا نقصان۔"

"مجھے نہ اپنی پروا ہے اور نہ آپ کی۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "لیکن میری بہن کو کچھ نہیں ہونا چاہیے یوسف صاحب!"

"تو پھر مان لو میری بات۔ ختم کر دو اس کی یہ قید تنہائی۔ وہ رہائی چاہتی ہے یہاں سے۔ یہ گھر نہیں قفس ہے اس کے لیے۔ تم اس کی جگہ لے لو نیلی یہاں گل و گلزار کھل اُٹھیں گے۔"

شدت جذبات سے اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور آنسو چہرا بھگوتے ہوئے اس کی گردن چھونے لگے۔

"دیکھیں۔ دیکھیں یوسف! ناممکن کو ممکن مت بنائیے۔ وہ آپ کی بیوی ہے۔ اسے عزت دیں، پیار دیں۔ اس کے پاس بھی آپ کو دینے کے لیے یقیناً بہت کچھ ہوگا۔ آزما کر تو دیکھیں۔ یقین کیجیے، میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔"

"یاد رکھنا نیلی! تمہاری یہ ضد تمہاری بہن کے دُکھ کا باعث ہے۔"

"نہیں یوسف۔ میری بات سنیں۔"

دوسری جانب سے سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ وہ گرنے والے انداز میں وہیں بیٹھ گئی۔

"نیلم! کیا بات ہے۔" عباسی صاحب تشویش سے پوچھ رہے تھے۔ "سب خیر خیریت تو ہے؟" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کس کا فون تھا؟ آپ رو کیوں رہی ہیں؟۔"

"یوسف۔ میرے کزن کا۔" اس نے چہرا صاف کیا۔

"کیا کہہ رہے تھے؟۔"

"کہہ رہے تھے۔ شبنم میری وجہ سے دکھوں اور مصیبتوں کا شکار ہے۔ ان کی ساس تو جی کی مار کھا کھا کر ادھ موئی ہو چکی ہے۔ کہہ رہے تھے اگر میں شبنم کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں تو ان سے شادی کی ہامی بھر لوں۔ وہ شبنم کو آزاد کر دیں گے۔"

"اوہ!" عباسی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ "کھلی بلیک میلنگ۔"

"جی!" اس نے سر ہلایا۔

"اور اگر تم نے ایسا کیا تو جانتی ہو کیا ہوگا۔ سارے لوگ تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے تم نے اپنی ہی بہن کا گھر تباہ برباد کر دیا۔ اپنی بچ بچانے کے لیے اس کی مانگ اجاڑ دی۔ دنیا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔"

"میں جانتی ہوں سر! اور ایسا تا قیامت ممکن بھی نہیں۔ لیکن۔ لیکن میں اپنی بہن کی خوشیوں کے لیے کیا کروں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

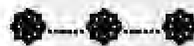
اس کا تو ایک ہی حل ہے نیلی!" وہ پر سوچ لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "دیکھو ناں کسی انسان کے دل میں کوئی امید ہوتی ہے تب ہی وہ دوسرے کا منتظر ہوتا ہے۔ اگر یہ امید ختم کر دی جائے تو انتظار بھی ختم ہو جائے گا۔ پھر شاید وہ اپنی زندگی میں ٹھیک طور پر ایڈجسٹ ہو سکے۔"

"کیا مطلب سر؟۔" وہ آنکھوں میں الجھن بھر کر انہیں دیکھنے لگی۔ "میں سمجھی نہیں۔"

"شادی کر کے اس شخص کی امیدوں کے سارے دیے بجھا دو۔ اندھیرے سے گھبرا کر وہ خود تمہاری بہن سے روشنی طلب کرے گا۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ اسے پر سوچ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

نیلم کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ جمائے بیٹھی رہ گئی۔



"ہیلو مادام! حاضر ہو سکتا ہوں۔"

"چہکتی ہوئی آواز پر اس نے گردن گھمائی تھی۔

"شیطان کے چیلے! فرصت مل گئی تمہیں آنے کی؟۔"

"شہروز کو سامنے پا کر وہ مصنوعی غصے سے بولی۔

"کیا کریں۔ محترمہ پارسا جو ہو گئی ہیں۔" وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "نیکوکار بندوں کے پاس شیطان کے چیلے کرنے بھی کیا آ ئیں؟۔"

"کیا مطلب ہے اس بات کا؟" صبا اسے گھورنے لگی۔

"جانے دیں!" اس نے دانت نکالے۔ "یونہی مذاق میں ایک بات کہی تھی۔"

"تمہارے یہ تو کیسے کیلئے مذاق میں خوب سمجھتی ہوں۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"لیجیے! ہم ارمان گئیں۔" اس نے سر پکڑ لیا۔ "یعنی آپ نے مجھے شیطان کا چیلا کہا میں نے آپ کو نیکو کار اور پارسا بتایا پھر بھی الزام میرے سر؟ یار شہروز! یار، دنیا تمہیں سمجھتی نہیں ہے۔"

وہ بن کر خود سے مخاطب ہوا۔

"یار شہروز! یار دنیا تمہیں خوب سمجھتی ہے۔" وہ بڑے طنز سے بولی۔

پھر دونوں ہی ہنس دیے۔

"ویسے صبا! مجھے سخت شکایت ہے آپ سے۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "منگنی کیا ہوئی، دماغ عرش اعظم پر جا پہنچا آپ کا۔ ہم سے کنوارے چھیل چھبیلوں کو لفٹ کرانا ہی چھوڑ دی آپ نے۔ شادی ہو گئی تو آپ تو ہمیں پہچاننے سے انکاری ہو جائیں گی۔"

"صبا کھلکھلا کر ہنس دی۔

"بتایئے ناں! کیوں آنا چھوڑ رکھا ہے؟"

"کمال کرتے ہو۔" وہ شگفتگی سے مسکرا کر بولی۔ "ابھی کچھ دن پہلے تو آئی تھی۔ جب۔"

"جب؟"

"فیروز صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"ہائے!" اس نے دل تھاما۔ "کبھی یہ ادائیں بھائی کو دکھائی ہوتیں۔"

"شہروز!" صبا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے آنکھیں نکالیں۔

"سوری۔ سوری۔" اس نے جلدی سے مصالحت بھرا انداز اختیار کیا۔ "خیر! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے محترمہ کہ یہ چند دن نہیں بلکہ کافی دن پہلے کی بات ہے۔ اور پڑوسیوں کو چاہیے کہ روزانہ اپنے پڑوسیوں کی خبر گیری کریں۔"

"جیسے کہ تم روزانہ میری خبر گیری کرنے آتے ہو۔" وہ مسکرا دی۔

"اچھا جانے دیں۔ کہیں اسی جھگڑے میں اصل بات میرے ذہن سے نہ نکل جائے۔ میں آیا تھا آپ کو دعوت دینے کے لیے۔"

"دعوت؟" صبا تعجب سے مسکرائی۔

"جی ہاں! فیروز بھائی کی کامیابی کی خوشی میں ایک عدد تقریب منعقد کی جا رہی ہے۔ آج سے ٹھیک ہفتہ بھر بعد۔ یعنی اگلے جمعے۔ ہم اہل خانہ آپ کی شرکت کے متمنی ہیں۔ تشریف لا کر ہماری تقریب کو چار چاند لگا دیجیے۔"

وہ ہنسنے لگی۔

"پورے چوکر ہو تم سے۔"

"چھوٹا بھائی ہوں آپ کا۔" وہ پورے اطمینان سے بولا۔ "جو چاہیں کہہ لیں۔"

"آج تو بڑے موڈ میں ہو۔" صبا نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ "پچھلے دنوں تو سنجیدگی کے ریکارڈ توڑ رہے تھے۔"

"جی ہاں۔ کافی دن ہو چلے تھے اس سنجیدگی کو۔ میں نے سوچا۔

فراز اب ذرا لہجہ بدل کے دیکھتے ہیں۔

کیسے لگا پسند آیا لہجہ؟" اس نے بڑے شاعرانہ انداز میں پوچھا۔

"بہت پسند آیا۔" وہ ہنس دی۔ "خدا کرے سدا اسی لہجے میں بات کرتے رہو۔"

"آمین۔ آمین۔"

اس نے بڑے جذب کے عالم میں آنکھیں بند کر کے کہا تھا



اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے سامنے کھڑے عثمان کو دیکھا۔

"کہیے! میں ہر بات سننے کے لیے تیار ہوں۔" پھر وہ بڑے حوصلے سے بولی۔ "کیا پیغام بھجوایا ہے چچا جان نے؟"

"اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ "بابا جان نے رضا کو بلوایا ہے۔ اگلے مہینے کی پانچ تاریخ آپ کی اور مہتاز کی رخصتی کے لیے طے کی گئی ہے۔"

وہ خاموش ہو کر لب کاٹنے لگے۔

"بابا جان نے کہا ہے وہ اپنی تمام شرائط واپس لیتے ہیں۔ رضا صاحب سے اس گھر میں ویسا ہی برتاؤ کیا جائے گا جیسا کہ مجھ سے یا عدنان سے کیا جاتا ہے۔ اور یہ کہ بابا جان انہیں اپنے بزنس میں شریک کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ ان سے کونٹیکٹ کر کے انہیں بتا دیں۔ ان سے کہیے کہ آ کر بابا جان سے مل لیں۔"

وہ خاموش ہو کر منتظر نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

"اگر چچا جان نے یہی سب کچھ کہنا تھا۔ تو اتنی دیر کیوں کی؟" وہ بالآخر مضطرب سے لہجے میں بولی۔

"کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے، وہ رضا مراد کے حوصلے آزما رہے تھے۔"

انہوں نے کاندھے اچکا دیے۔

"الماس نے ان کے لہجے میں طنز کے کسی تاثر کو کھوجنا چاہا مگر ناکام رہی۔

"پھر کونٹیکٹ کر لیں گی ناں آپ رضا سے؟" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جی!" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ان کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک بیٹھی کچھ سوچتی رہی پھر اٹھ کر ٹیلی فون سیٹ تک جا پہنچی رضا کا نمبر ڈائل کر کے وہ دوسری طرف سے جاتی ہوئی بیل کی آواز سن رہی تھی۔

"الماس بی بی۔" پیچھے سے نسرین نے مخاطب کیا۔ "یہ جی ڈاک آئی ہے آپ کی۔"

وہ چونک کر مڑی۔

اس کے ہاتھ میں خاکی لفافہ تھا۔

"رجسٹری ہے جی۔ سائن کر دیں۔"

وہ لفافے کو الجھن آمیز انداز میں گھور رہی تھی۔ دوسری جانب مسلسل بیل جا رہی تھی۔

ریسیور کریڈل پر ڈال کر اس نے سائن کیے اور اس کے جانے کے بعد لفافہ چاک کرنے لگی۔

ڈیئر الماس۔

جس وقت یہ رجسٹری موصول ہو گی میں یہ شہر چھوڑ کر جا چکا ہوں گا۔

میں نے بہت انتظار کیا لیکن شاید تم ان لوگوں میں سے ہو جو اپنے موقف کے آگے دوسروں کی کوئی بات سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

اگر تمہارے دماغ میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو ہم دونوں ایک بھرپور زندگی گزار سکتے تھے۔ لیکن افسوس تم نے ایک معمولی ضد کے ہاتھوں ساری خوشیوں سے ہاتھ دھونے کا فیصلہ کر لیا۔ معاف کرنا! میں اپنی خوشیوں سے اتنی آسانی سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ میرے کچھ خواب ہیں جنھیں میں ضرور پورا کروں گا۔ اور اس کے لیے میں تمہارے ساتھ چلنے سے انکار کرتا ہوں۔

طلاق کے کاغذات بھیج رہا ہوں۔

فقط

رضا مراد

اسے بڑے زور کا چکر آیا تھا۔

سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہ وہیں بیٹھ گئی۔ یکا یک اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ دل بری طرح سے متلانے لگا۔

دونوں ہاتھ منہ پر رکھے اندر سے اُمنڈتی ابکائی کو روکتی وہ باتھ روم کی سمت بھاگی تھی۔



کمرے میں ہلکی ہلکی سرگوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی مکمل سناٹا چھا جاتا اور ایسا لگتا جیسے سب لوگ جا چکے ہیں، لیکن پھر کسی کا ہنکارا ابھرتا اور کوئی ادھورا سا جملہ ابھر کر معدوم ہو جاتا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ ہوش میں تھی اور حواس بھی مکمل طور پر بیدار ہو چکے تھے۔ لیکن بند آنکھیں کھلنے کی ہمت نہ ہو پا رہی تھی۔

کس طرح آنکھیں کھولتی۔ کیسے سب سے نگاہ ملاتی۔ اس نے زندگی میں کبھی اس قدر ذلت، اتنی شرمندگی کا تصور تک نہ کیا تھا۔ جسم سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنی ذات کے اردگرد جو انا، خودسری، خود پسندی اور غرور کا ایک دبیز قامت خول اس نے چڑھا رکھا تھا وہ زمیں بوس ہو چکا تھا اور اسے اپنی روح اس آہنی خول کے نیچے دبی، کراہتی محسوس ہو رہی تھی۔

زندگی میں "شکست" کے لفظ سے اسے نفرت تھی اور آج وہ انتہائی شکست خوردہ تھی۔ بے بس اور مجبور تھی کہ سب اس پر ترس کھائیں اور بھلا دیں کہ اس نے کیا کیا تھا۔ وہ کن راہوں کی مسافرت طے کر کے آبلہ پا لوٹ آئی ہے۔

اپنی سوچوں کے حصار سے لمحہ بھر کے لیے وہ باہر نکلی تو کمرے میں پھیلی تنہائی کا احساس ہوا۔ سب لوگ جا چکے تھے۔ وہ ذلت اور ندامت کے بھرپور احساس کے مقابل تنہا تھی۔

دھیرے دھیرے اس نے بند پلکیں کھولیں اور یکدم ڈر گئی۔ آرام دہ کرسی پر دراز عثمان خان نہایت پرسوچ انداز میں اس کے چہرے کو نظروں کی گرفت میں لیے ہوئے تھے۔ تفکر کے گہرے سائے ان کے چہرے پر منڈلا رہے تھے۔ اس نے انہیں دیکھ کر آنکھیں دوبارہ بند کر لیں اور وہ اٹھ کر بستر کے قریب چلے آئے۔

"الماس!" وہ اس کے قریب بیٹھ گئے تھے۔ "آنکھیں کھولیں۔ اب کیسی ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے آنکھیں کھولے بغیر دھیرے سے کہا۔

اسے احساس ہوا اس کا گلا بری طرح سے رندھا ہوا تھا۔

"اچانک اتنی شدید کمزوری کیسے ہو گئی؟۔ کیا آپ نے کئی دنوں سے کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا؟" وہ نرم لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

اور وہ اچانک پتھر سے موم بن گئی تھی۔ اس نے ہچکیوں سے رونا شروع کر دیا۔

"میں جینا نہیں چاہتی۔ میں مرنا چاہتی ہوں۔ مجھے مر جانے دیں۔ نکال دیں یہ ڈرپ۔ نہیں چاہیے مجھے کوئی سہارا۔ کسی بھی قسم کا۔"

"آں۔ آں۔ کیا کر رہی ہیں!" انہوں نے سختی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "بے وقوفی کی باتیں مت کریں۔ ہر چند کہ امید آپ سے محض ایسی ہی باتوں کی کی جا سکتی ہے۔"

ان کے لہجے میں تلخی بر ہی در آئی۔

الماس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات نہایت کشیدہ تھے۔

"عثمان!" اس نے بے بسی سے کہا تھا۔ "میں...... میں تباہ ہو گئی ہوں۔"

"نہ کریں ایسی باتیں۔" وہ آہستگی سے بولے۔ "ذہن پر اتنا زور مت دیں۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔"

"اور۔ جو ابھی ہونا باقی ہے۔" وہ سسکی۔ "اس کا کیا کروں گی؟"

عثمان خان نظریں چرا کر دوسری سمت دیکھنے لگے۔

"کیا سب کو پتا چل گیا ہے؟" وہ خوفزدہ انداز میں پوچھنے لگی۔

عثمان نے لمحہ بھر کو اس پر نگاہ کی۔ وہ بے پناہ کمزور اور بے حد خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

"نہیں۔" پھر وہ نرمی سے بولے۔ "کسی کو اس بات کا علم نہیں سوائے میرے اور چچی جان کے۔"

"اوہ گاڈ!" اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ "ایسا کیوں ہوا۔ کیوں؟"

"اس کا جواب تو آپ ہی دے سکتی ہیں۔" ان کے لہجے میں پھر تلخی در آئی۔

پھر وہ کھڑے ہو گئے۔

"خیر زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر مسئلے کا چھوٹا یا بڑا حل ضرور ہوتا ہے۔ مسئلہ آپ نے پیدا کرنا تھا، کر لیا۔ حل تلاش کرنا اب ہمارا کام ہے۔ سو ہم کریں گے۔ آپ آرام کیجیے۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب مزید کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ کمرے سے نکل گئے۔

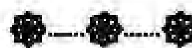
انہوں نے سافٹ ہونے کی کتنی کوشش کی تھی۔ لیکن کس قدر تلخی تھی۔ ان کے ہر ہر انداز میں۔ کتنی اجنبیت تھی ان کی آنکھوں میں۔

وہ قطرہ قطرہ جسم میں داخل ہوتے گلوکوز کی بوتل پر نگاہ جما کر سوچنے لگی۔

اور یہ وہ شخص تھا جو اس گھر میں اس کا سب سے بڑا حامی، سب سے زیادہ احترام کرنے والا تھا۔ جب اس کے انداز اتنے غیر تھے تو پھر باقی لوگ اس سے کیسا برتاؤ کرتے۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا۔

لیکن یہ احساس ضرور دامن گیر تھا کہ یہ اس کے اپنے اعمال کی سزا تھی۔ خود سری کا تاج سر پر سجائے، ناز و نخرے سے گردن تانے وہ سب کی خوشیوں کو، جذبوں کو کچلتی بہت آگے جا پہنچی تھی۔ پھر واپسی کا سفر تو یونہی نظر چراتے ہوئے طے کرنا تھا۔

ایک گہرا سانس بھر کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔



پارٹی کی تیاریاں کرتے ہوئے اس کا انگ انگ مسرور و شادمان تھا۔ خوشی ایک ایک ادا سے چھلکی پڑ رہی تھی۔

بڑے اہتمام سے اس نے صبح ہی اپنا سفید کلف دار سوٹ۔ بڑے نازوں سے پریس کر کے ہینگر پر لٹکا دیا تھا۔ ساتھ بڑا سا سفید ہی ڈوپٹا تھا۔ کرتے کی آستینیں اور دوپٹے کے پلو سیاہ بلوچی کڑھائی سے مزین تھے۔ سیاہ رنگ کا تنگ پاجامہ تھا۔ وہ جانتی تھی وہ ان کپڑوں میں بڑی گریس فل نظر آتی تھی۔ اس کی سلونی رنگت پر سفید رنگ بہت جچتا تھا۔

اس نے جب بھی یہ لباس پہنا تھا۔ نجمہ خاتون نے اس کی نظر اتاری تھی۔

شام ڈھلتے ہی وہ نہا دھو کر لان میں چلی آئی۔ موسم گزشتہ دنوں کی نسبت بڑا خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ہواؤں نے غروب ہوتے سورج کی تمازت کو شکست دے دی تھی۔

بال سکھاتے ہوئے وہ کوئی خوبصورت سا گیت گنگنا رہی تھی جب گاڑی کا ہارن بجا یکلخت اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی تھی۔ ہارن دانیال ہاشمی کی گاڑی کا تھا۔

چند ہی لمحوں میں وہ اس کے عین مقابل تھا۔

"السلام علیکم" وہ آہستگی سے کھڑی ہوگئی۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہیے۔" وہ خوشدلی سے بولا۔ "انکل، آنٹی نہیں ہیں؟"

"ابو تو نہیں ہیں۔ امی اندر ہیں۔ شاید چائے بنا رہی ہیں آپ تشریف رکھیے ناں۔"

"ضرور" وہ مسکرا کر کرسی پر براجمان ہوگیا۔ "کہیے جناب۔ کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدللہ" وہ اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

"بڑی کھلی ہوئی لگ رہی ہیں۔ خیریت تو ہے ناں۔" وہ شرارت سے اس کے سراپے کا جائزہ لینے لگا۔ "کہیں کی تیاری ہے کیا؟"

"صبا نے حیرت سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس نے تو ابھی لباس تک تبدیل نہ کیا تھا اسے بھلا کیسے علم ہوگیا تھا۔

"جی ہاں۔" پھر وہ بولی۔ "شہروز سے تو آپ واقف ہیں۔ اس کے بڑے بھائی ہیں فیروز احمد۔ انہوں نے پی۔ سی۔ ایس کا ایگزام کلیئر کیا ہے۔ اسی سلسلے میں ان کے گھر تقریب ہے۔"

"اوہ!"

"صبا نے بے حد واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ اس کے چہرے کے رنگ بدل گئے تھے۔ آنکھوں سے جھلکتی شوخی، شرارت یکلخت معدوم ہوگئی تھی۔ نچلے ہونٹ کا گوشہ دانتوں میں دبا کر وہ دوسری جانب دیکھنے لگا۔

"اور آپ سنائیے۔ خیریت ہے۔" اس کی خاموشی سے گھبرا کر اس نے ذکر چھیڑا۔ "انکل آنٹی کیسے ہیں؟"

"شکر ہے خدا کا۔" وہ پیر ہلانے لگا۔

"لے آیا کریں ناں آنٹی کو بھی۔ ان کا دل نہیں کرتا یہاں آنے کو۔" وہ لاشعوری طور پر اس کا موڈ بحال کرنے کے جتن کرنے لگی۔

"پتا نہیں۔" وہ مختصراً بولا۔

صبا اس کے روکھے انداز پر خاموش ہوگئی۔

پھر دونوں کے درمیان پھیلی اس خاموشی کو نجمہ خاتون نے آ کر توڑا تھا۔

"ارے دانیال بیٹے۔ کب آئے؟"

"السلام علیکم۔" وہ احتراماً کھڑا ہوا۔ "بس ابھی پانچ منٹ ہوئے ہیں۔"

"چلو اچھا ہوا۔ تمہاری پسند کے شامی کباب بنائے ہیں میں نے۔" وہ ہنستے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"ابھی تلتے ہوئے تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔ بڑی لمبی عمر ہے ماشاءاللہ۔"

"چلیں شکر ہے۔" وہ دھیمے سے مسکرایا۔ "کوئی تو ہمیں یاد کرتا ہے۔ ورنہ آج کل کے زمانہ میں اتنی فرصت کس کو ہے بھلا۔"

صبا نے خاموش نظروں سے اسے دیکھا اور اُٹھ کر چائے نکالنے لگی۔

جتنی دیر میں اس نے چیزیں سرو کیں اور چائے بنائی۔ وہ مسلسل نجمہ خاتون سے محو گفتگو رہا۔ صبا محسوس کر رہی تھی کہ وہ دانستہ اس کو نظر انداز کر رہا تھا۔

"امی!" چائے پیتے ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں ذرا اپنے کمرے میں ہوں۔ تیاری کرنی ہے۔"

"اچھا اچھا۔" وہ اس کی کسی بات کو بغور سن رہی تھیں۔ چونک کر بولیں۔

وہ مڑ کر اندر کی سمت بڑھ گئی۔ جانے کیا بات تھی۔ اس کی ساری خوشی ماند پڑ گئی تھی۔ دانیال ہاشمی کا رویہ اسے اندر ہی اندر چبھ کے لگا رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ سر منہ لپیٹ کر پڑ جائے اور کہیں نہ جائے۔

سخت منتشر دماغ کے ساتھ وہ لاؤنج میں سے گزر رہی تھی جب فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"ہیلو!" اس نے ریسیور اُٹھایا۔

"بڑے شرم کی بات ہے مس صبا!" دوسری جانب سے تیز لہجے میں کہا گیا۔ "کتنے ٹھاٹ سے ابھی تک سستی اور کسلمندی کے مزے لوٹ رہی ہیں۔ یہاں اتنا سارا کام یونہی پڑا ہے۔ بندہ پڑوس کا اتنا لحاظ تو کر سکتا ہے کہ کھانا شروع ہونے سے کم از کم گھنٹہ بھر پہلے ہی پہنچ جائے۔ کسی چھوٹے موٹے کام کا جھوٹے منہ ہی پوچھ لے۔"

"اُف شہروز!" اس نے گہرا سانس بھرا۔ "شروع ہوتے ہو تو بس شروع ہو جاتے ہو۔"

"آپ کہیں تو ختم ہو جاؤں...؟ آپ سا دوست ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ ارے آپ تو کسی کو جلا جلا کر بی کر دیں۔"

"اسے ہنسی آ گئی۔

"ٹھٹھے نہ لگائیں۔ تشریف لائیں۔"

"ہاں۔ میں پندرہ منٹ میں آتی ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ ساری بے چینی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ وہ از سر نو فریش ہو گئی۔

"کتنے پیارے لوگ ہوتے ہیں جو خوشیاں بانٹتے ہیں۔ ذہنی سکون مہیا کرتے ہیں۔ خود پرست تنگ مزاج لوگ خود بھی پریشان ہوتے

ہیں، دوسروں کو بھی کرتے ہیں۔"

اس کے اعصاب پل بھر کے لیے کشیدہ ہوئے تھے۔ پھر اپنی سوچوں کا رخ تقریب کی جانب موڑ کر وہ بڑے دھیان سے تیار ہونے لگی۔ لباس تبدیل کر کے ہلکا سا میک اپ کیا۔ بالوں میں سیاہ پراندہ ڈالا۔ کانوں میں ننھے ننھے جھلملاتے نگینوں والے ٹاپس پہنے اور اپنا من پسند پرفیوم اسپرے کرنے لگی۔

"حاضر ہو سکتا ہوں۔" دروازے پر ہولے سے دستک دی گئی تھی۔

اس نے پیروں میں لمبی ہیل والے سیاہ ویلوٹ کے کورٹ شوز ڈال کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دانیال ہاشمی کھلے دروازے سے ٹیک لگائے دونوں بازو سینے پر باندھے کر بڑی محویت سے اس کا سجا سنورا روپ دیکھ رہا تھا۔

صبا نے اس کی بے باک نگاہوں میں کیا تھا۔ وہ نظریں جھکا کر رہ گئی۔

"جا رہی ہیں۔" وہ بے تکلفی سے اندر چلا آیا۔

"جی۔"

"اگر میں کہوں، رک جائیں، نہ جائیں۔ تو؟"

صبا نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

"میں وعدہ کر چکی ہوں۔ اور ابھی ابھی شہروز نے فون کر کے پھر یاد دہانی کرائی ہے۔ آئی ایم سوری۔"

"صبا! میں سمجھتا تھا۔ میں آپ کے لیے اسی طرح سے اہم ہوں جس طرح آپ میرے لیے ہو گئی ہیں پھر یہ کیا بات ہوئی کہ میرے اور آپ کے درمیان اتنے بہت سے لوگ ہیں۔"

"وہ اس کے مقابل کھڑا بڑا سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"بے فکر رہیے!" وہ رخ موڑ کر قدرے بدحرگی سے بولی۔ "جس وقت تین گواہوں کی موجودگی میں، میں اپنا وجود، اپنی ذات آپ کے نام لکھ دوں گی۔ اس کے بعد آپ میرے لیے دنیا کے ہر رشتے سے بڑھ کر اہم ہو جائیں گے۔ پھر درمیان میں کوئی شخص تو کیا۔ میری ذاتی خواہشیں بھی نہیں رہیں گی۔ اس وقت تک انتظار کیجیے۔"

اس کا مطلب یہی ہے ناں کہ ابھی درمیان میں کوئی ہے۔"

صبا نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"کون ہے وہ؟" وہ بدستور دونوں ہاتھ کمر پر رکھے لفظ چبا چبا کر ادا کر رہا تھا۔ "مسٹر شہروز؟"

"دانیال صاحب!" صبا نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ "حد ہوتی ہے کسی بات کی۔ اور یاد رکھیں منگنی بڑا بے جان، کمزور سا بندھن ہے اور ہر چند کہ ہم دونوں اس بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ آپ میری ذات پر کوئی اختیار نہیں رکھتے اور نہ ہی مجھ سے باز پرس کرنے کا کوئی حق ہے آپ کو

مجھ پر میرے والدین مکمل اعتماد کرتے ہیں اور اسی اعتماد اور اعتبار کو ساتھ لے کر میں ہر کسی سے ملتی ہوں۔ اس سے آگے مجھے کسی کی اجازت یا رضا مندی کی ضرورت نہیں۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

وہ شعلہ بار نظروں سے چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر مڑ کر کمرے سے نکل گیا۔

صبا نے اپنے نفس پر بمشکل قابو پایا تھا۔



"بہروز ولا" کے چھوٹے سے لان میں بڑی رونق تھی۔ ہر چند کہ زیادہ مہمان مدعو نہ تھے پھر بھی میلے کا سا سماں لگ رہا تھا۔

"بڑے دن بعد دل کسی سچی خوشی سے ہمکنار ہوا ہے۔ خدا ہماری خوشیاں سلامت رکھے۔ چاہتیں اور رحمتیں، برکتیں عطا کرے۔"

"شہروز نجانے کس بزرگ سی شخصیت سے محو گفتگو بڑی بڑی باتیں کر رہا تھا۔

صبا اس کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئی۔ دلچسپی سے اس کی باتیں سننے لگی۔

"آمین، آمین!" وہ بزرگ سر ہلا رہے تھے۔

"ارے صبا!" وہ اسے دیکھ کر چونکا۔ "ہو گئے آپ کے پندرہ منٹ؟ جھوٹ بولنے والے کا رنگ کالا ہو جاتا ہے، معلوم ہے؟"۔

بزرگ اسے دیکھ کر مسکرانے لگے۔ صبا جھینپ کر مسکرا دی۔

"اچھا ان سے ملو۔ جناب کا اسم گرامی ہے میاں شفقت مرزا! ہم تینوں بھائیوں کو انہوں نے قرآن مجید پڑھایا ہے اور مولوی صاحب ابو کے بہت اچھے دوست اور بہت پرانے پڑوسی ہیں۔ انہیں بتائیں اسلام میں ہمسایوں کے کیا حقوق ہیں۔"

"السلام علیکم۔" صبا نے اس کی تیز تیز چلتی زبان سے گھبرا کر انہیں سلام کیا۔ "کیسے مزاج ہیں؟"۔

وعلیکم السلام۔ جیتی رہو بیٹی۔ اللہ کا شکر ہے اس نے صحت و تندرستی سے نوازا ہے۔"

"جناب مولوی صاحب! کچھ اس امر پر روشنی ڈالیں کہ ہم جو بے جا نمود و نمائش کی عادی قوم بن چکے ہیں، اور روپے کی عزت ہم نے اپنا شعار بنا لیا ہے تو ان لعنتوں سے اب چھٹکارا پانا ممکن ہے؟۔ کیا کوئی راہ نجات کی ہے؟"۔

صبا چپکے سے حشمت خانم کی طرف بڑھ گئی۔ غالباً شہروز کا موڈ شدید قسم کی عاقلانہ باتیں کرنے کا ہو رہا تھا۔

"نجانے سنجیدہ بھی ہے یا محض مولوی صاحب کی نظر میں اپنے نمبر بڑھا رہا ہے۔"

اس نے سوچا تھا اور ادھر ادھر دیکھے بنا سیدھی حشمت خانم کی سمت جا رہی تھی۔ جب اچانک ہی کسی سے ٹکرا گئی۔

"اوہ آپ!" فیروز احمد نجانے کہاں سے سامنے آ گیا تھا۔

صبا سے کچھ کہا نہ جا سکا۔ نظریں جھکا کر مسکرا دی۔

"مبارک باد نہیں دیں گی؟" وہ نرم لہجے میں پوچھنے لگا۔

''میرا خیال ہے مبارک باد میں پہلے دے چکی ہوں۔'' وہ ہنس دی۔

''اچھا!'' اس نے سوچنے کی کوشش کی۔ ''ویسے پھر دینے میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔ الفاظ ہی تو ہیں۔ کون سے ہار پھول ہیں۔ جو آپ کے پیسے خرچ ہوں گے۔''

''اوہ!'' صبا پر اچانک ہی منوں اوس آ گری۔

''اسے یاد آیا صبح اس نے تو قیر صاحب سے پھولوں کی اور کارڈز کی فرمائش کی تھی اور انہوں نے لانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لیکن وہ دانیال ہاشمی سے اُلجھ کر اتنی اپ سیٹ ہوئی تھی کہ سب کچھ بھول بھال کر چلی آئی تھی۔

''وہ۔ دراصل۔'' اس نے کہنے کی کوشش کی مگر لفظ اس کی گرفت میں نہ آ سکے۔

فیروز احمد دھیرے سے ہنس دیا۔

''جانے دیجیے۔'' وہ بے بسی سے سر جھکا کر بولی۔ ''یہ مذاق نہیں تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ مجھ سے کمال کی بداخلاقی سرزد ہوئی ہے۔ یونہی خالی ہاتھ چلی آئی۔

''یہ پھولوں اور کارڈز سے بھی قیمتیں دیکھ رہی ہیں صبا!'' پھر وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولا تھا۔ ''یہ صبح سے لوگ لا رہے ہیں۔ ڈاک سے بھجوا رہے ہیں۔ فون کر رہے ہیں۔ لیکن۔ لیکن آپ سے مل کر جو خوشی دل کو ملی ہے وہ ان تمام پھولوں سے اور وش کارڈز سے ملنے والی خوشی سے کہیں بڑھ کر ہے۔''

صبا اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گئی۔ جو کچھ اس نے کہا۔ کیا تھا؟ اظہار تھا، اقرار تھا، خلوص تھا کہ محض رواداری۔ اخلاق۔ کیا تھا وہ۔؟

اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ چند انمول یادگار لمحے اس کے دل کی ہتھیلی پر رکھ کر جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ان لمحوں سے خوشی کا قطرہ قطرہ اس کی رگوں میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کے اندر یہاں سے وہاں تک بہار مکمل اُٹھی تھی۔

''صبا! اسے پتا ہی نہیں چلا شہروز کب اس کے قریب چلا آیا تھا۔ ''رو رہی ہیں۔ کیا ہوا ہے؟''

''آں۔'' اس نے چونک کر گالوں پر اتری نمی انگلیوں میں جذب کی۔ ''نہیں تو۔''

''بتائیں صبا! کیا ہوا ہے؟'' وہ اس کے آنسو دیکھ کر حد درجے پریشان ہو گیا تھا۔ ''کوئی بات ہوئی ہے؟''

''بدھو ہو تم!'' وہ اس کی صورت دیکھ کر ہنس پڑی۔ ''یونہی بوریت سے جمائیاں آ رہی تھیں۔ اس سے پانی آ گیا آنکھوں میں۔ تم کیا سمجھے۔''

''لیجیے۔'' وہ خفا ہوا۔ ''یعنی کر دیا نا سی ڈی گریڈ۔ جس محفل میں میاں شہروز احمد جلوہ نما ہوں، وہاں بور ہو کر آپ ان کی توہین کریں گی۔ آیئے! ہم کو چیدہ چیدہ مہمانوں سے ملواتے ہیں۔''

وہ مسکراتے ہوئے اس کی ہمراہی میں آگے بڑھ گئی تھی۔



"چچی جان۔" وہ دھڑ دھڑ سیڑھیاں اُترتی نیچے آئی تھی۔ "میں ذرا پڑوس میں جا رہی ہوں۔ ابھی پانچ منٹ میں لوٹ آؤں گی۔"

وحیدہ چچی نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔

"بیٹی! کس کے گھر جا رہی ہو؟" وہ متفکر سی ہو کر بولی تھیں۔

"یہ برابر میں فردوس آپا کے ہاں۔ وہ ذرا ریاض بھائی کو فون کروں گی۔" اس نے لمحہ بھر رُک کر ساس کے بدلتے تاثرات دیکھے پھر جلدی سے بولی۔ "آمنہ کو لے کر آئیں شام کو۔ ہاں نہیں تو کوئی انصاف ہے یہ۔ ثریا کب سے وہاں جا کر بیٹھی ہے، اور بے چاری آمنہ! آنچ آنچ۔ مہینہ مہینہ ہو جاتا ہے اس کی شکل دیکھے۔"

"بھی رونا تو میں روتی ہوں۔ مگر میری سنتا کون ہے۔" چچی سب کچھ بھول بھال کر بیٹی کا ذکر لے بیٹھیں۔

"اور تو اور۔ یہ ریاض میاں! اللہ دشمن کو ایسا داماد نہ دے۔ خود بانکے کنوارے بنے جہاں بھر میں گھومتے ہیں اور اس بے چاری پر قدغن سی قدغن ہے۔ ماں تک سے ملانے نہیں لاتے۔ مجھے جو خبر ہوتی تو کیوں بیٹی کو اس اندھے کنویں میں جھونکتی۔ پہلے پہل تو خوب خوب پھیرے ہوتے تھے گھر بھر کے۔ کبھی ان کی ماں آ کر آمنہ کی بلائیں لیتی تھی تو کبھی بہنیں باجی، باجی کرتی آگے پیچھے پھرا کرتی تھیں۔ اور ریاض میاں! نظریں بچھاتے تھے ان کے پیروں تلے۔ جہاں موقع پاتے، عاشقی بگھارنی شروع کر دیتے تھے۔ انہی کے انداز و اطوار سے خوش ہو کر میں نے کم عمری میں ہی لڑکی بیاہ دی کہ کہیں کل کلاں کو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں اور اب ان کا حال دیکھو۔ اس غریب کی صورت دیکھ کر غرانا شروع کر دیتے ہیں۔ میری معصوم بچی۔"

انہوں نے گلوگیر لہجے میں دہائی دے کر پاندان اپنے آگے سرکا لیا۔ شبنم زیر لب مسکرا کر رہ گئی تھی۔

"بچیاں تو سب کی برابر ہوتی ہیں چچی۔" وہ یونہی سرسری سے انداز میں بولی تھی۔

چچی نے جیسے اس کا جملہ سنا ہی نہ تھا۔ وہ سروتے سے چھالیہ کے ٹکڑے کرنے میں مصروف تھیں۔

"پھر کرا دوں فون چچی جان؟" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"آں ہاں۔ کرا دو۔ اور میری جانب سے بھی تاکید کر دینا ریاض میاں کو خوب خوب۔ کہنا، میاں کچھ خوف خدا کرو۔ ابھی آگے جوان بہنیں ہیں۔"

وہ ان کی مزید بڑبڑاہٹوں کو نظر انداز کرتی باہر نکل آئی۔ سرخ چھاپہ دوپٹہ گلے میں ڈالے، چست قمیص سے پوری آب و تاب سے نمایاں ہوتی گلی پار کر کے وہ سامنے والے گھر میں داخل ہوئی تھی۔

"السلام علیکم فردوس آپا۔"

"اس نے جائے نماز پر بیٹھی خاتون کو زور و شور سے سلام کیا۔ انہوں نے نظر اُٹھا کر اسے دیکھا اور زیر لب تسبیح کرتے ہوئے مسکرا کر سر

ہلایا۔۔

"ایک فون کرنا ہے۔ کرلوں؟"

"انہوں نے پھر سر ہلا دیا۔ وہ اندر کمرے میں چلی آئی۔ کونے میں رکھی تپائی پر ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ وہ کرسی پر ذرا سا ٹک کر ریاض بھائی کے آفس کے نمبر ملانے لگی۔

"وہ جلد ہی لائن پر تھے۔

"ہیلو۔ ریاض بھائی! شبنم بات کر رہی ہوں۔" وہ کھنکتی آواز میں بولی۔ "کیسے ! کیسے مزاج ہیں جناب کے؟"

"ارے۔ بھئی۔ زہے نصیب، زہے نصیب۔ ہماری سماعتوں کے مقدر جاگ اٹھے۔" دوسری جانب وہ کھل اٹھے تھے۔ "کیسے یاد کرلیا شبو رانی؟۔ ہماری بے قراریوں کی کچھ خبر ہوئی کیا جناب کو؟۔ ہمارے رتجگوں کا حال سنا کیا حضور نے؟"

"وہ سخت عامیانہ انداز میں لہک لہک کر کہہ رہے تھے۔ شبنم کو ہنسی آگئی۔

"کیا کھالیا ہے ریاض بھائی۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"بھئی شبو! یا کیجے میں تو "بھائی" نہ کہا کرو۔" انہوں نے برا منایا۔ "سخت چوٹ مارتی ہو لفظوں کی۔ کبھی تو پیار سے، ناز سے، انداز سے پکارا کرو۔"

"مثلاً کیسے؟" اس نے ہنسی روکی۔

جیسے میں پکارتا ہوں تمہیں۔ شبو رانی، گڑیا، جانو۔" وہ حد سے باہر جانے لگے۔

اس کے جسم میں مرچیں سی لگ گئیں۔ دم گھٹنے لگا۔

"اوہو" تلملا کر اس نے ان کی بات کاٹی تھی۔ "بات سنیں میری۔"

"کہیے حضور۔ ہمہ تن گوش ہیں ہم؟" وہ لہکے۔

"آفس سے چھٹی ہو تو آمنہ کو لیتے ہوئے ہماری طرف آجائیں۔ رات کا کھانا یہاں کھائیں ہمارے ساتھ۔"

"نصیب مرے!" وہ بڑی ادا سے بولے۔ "یہ آمنہ کا جھگڑا کیوں کرتی ہو۔ میں آفس سے سیدھا چلا آتا ہوں۔ وہ بے وجہ مسئلے کھڑے کرتی ہے۔"

"کیوں بے چاری کو بدنام کرتے ہیں ریاض بھائی۔" وہ طنز سے بولی۔ "وہ تو اللہ میاں کی گائے ہے۔ جہاں بٹھائیں بیٹھ جاتی ہے۔ جب کہیں چل دیتی ہے۔ جب ہنسائیں، ہنس دیتی ہے۔ جب رُلائیں، رو جاتی ہے۔"

"ارے بھئی واہ۔ ہم نے تو سنا تھا عورتوں میں بے پناہ جذبہ رقابت ہوتا ہے۔ یہاں تو طرفداریاں ہو رہی ہیں۔ واہ شبو رانی۔ واہ۔"

"جذبہ رقابت؟" وہ تعجب سے بولی۔ "میں، اور آمنہ کو رقیب سمجھوں گی۔ بھلا کیوں؟ آپ اپنے حواسوں میں تو ہیں؟"

"اوہو۔ ہوں۔" وہ شرمندگی سے ہنس دیے۔ "اچھا، مزید تنگ بعد میں کر لینا۔ یہ آفس کا فون ہے۔"

"پھر آ رہے ہیں ناں آپ لوگ؟"

"تمہاری ضد ہے بھئی!" انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "کیونکر پوری نہ کریں گے ہم۔"

"خدا حافظ!" اس نے مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا۔ "اُلو کا پٹھا۔"

پھر وہ دانت پیس کر بولی تھی۔

"اپنے تئیں مجنوں سمجھ رہا ہے۔ کھوپڑی اُلٹ کر نہ رکھ دوں تو شبنم نام نہیں۔"

"وہ اُٹھ کر باہر نکل رہی تھی، جب تیزی سے اندر آتے شخص سے ٹکرا گئی۔ غالباً وہ بڑی عجلت میں آ رہا تھا۔ آپ ہی آپ اس کے دونوں بازو اس کی گرفت میں آ گئے تھے۔ شبنم کچھ دیر کے لیے ہونق ہو گئی۔ دوسری جانب وہ بھی منہ کھولے اسے تک رہا تھا۔

پھر وہ جلدی سے علیحدہ ہو گئی۔ دوپٹہ درست کرنے لگی۔

"آپ۔ آپ۔" وہ نظروں میں اشتیاق کا سمندر لیے اسے تک رہا تھا۔ "آپ سامنے والے گھر میں رہتی ہیں ناں؟"

"جی ہاں مگر آپ کون ہیں؟" اس نے قدرے برہمی سے اسے دیکھا۔

"جی میں انیس ہوں۔" اس نے دانتوں کی نمائش کی۔

"اوہ آپ ہیں انیس۔"

اس نے مقابل کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ وہ ستائیس اٹھائیس برس کا خاصا خوش شکل نوجوان تھا۔ سینے اور بازوؤں کی ساخت بتا رہی تھی کہ وہ کسرت کا عادی ہے۔ حلیے سے اس نے فلمی ہیرو نظر آنے کی تمام تر کوشش کر رکھی تھی۔ بلیو جینز، سیاہ ٹی شرٹ اور گلے میں ریشمی سرخ رومال تھا۔ سر پر پی کیپ جما رکھی تھی۔ جینز کی اگلی جیب میں سیاہ سن گلاسز اڑسے ہوئے تھے۔

"کیوں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوئی۔" وہ جان بوجھ کر بات بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"جی ہاں۔" وہ مسکرائی۔ "کیونکہ جب فردوس آپا، انیس انیس کرتی تھیں تو میرے ذہن میں دس بارہ سال کے لڑکے کا تصور بنتا تھا۔ مجھے نہیں اندازہ تھا کہ آپ اتنے بڑے ہیں۔"

وہ بے ساختہ ہنس دیا۔

"آپ نے کبھی مجھے چھت پر نہیں دیکھا؟"

"چھت پر؟" وہ تعجب سے بولی۔ "نہیں تو۔"

"میں تو اکثر شام کو چھت پر ہی ہوتا ہوں۔ مجھے تو آپ روزانہ ہی نظر آتی ہیں۔ کبھی اپنے صحن میں کبھی اوپر والی منزل کی بالکونی میں۔" وہ جھینپ کر خاموش ہو گیا۔

''اوہ!'' اس نے ہونٹ سکوڑے۔

اس کے بات کرنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ نجانے کب سے اسے چھپ چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ اسے جان کر عجیب سی خوشی ہوئی۔

''میں نے تو۔ سوچا ہی نہیں تھا کہ آپ بھی ہمارے گھر بھی آسکتی ہیں۔''

''کیوں بھئی۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''میں انسان ہوں، کوئی پری وری تو نہیں۔''

''لگتی تو ہیں۔'' وہ زیر لب بولا تھا۔

اس نے سنی ان سنی کر دی اور باہر نکل آئی۔

فردوس آپا عصر کی نماز سے فارغ ہو کر کچن میں مصروف تھیں۔ وہ ان سے ہلکی پھلکی گفتگو کر کے گھر چلی آئی۔



''کیا بات ہے۔'' مریم نے پاس بیٹھتے ہوئے اس کی صورت دیکھی۔ ''کچھ دنوں سے محسوس کر رہی ہوں۔ کھوئی کھوئی سی ہو۔''

''آں۔ وہ اُچھل ہی پڑی۔ ''میں؟ سچی بتاؤ مریم۔ میں۔ میں کھوئی کھوئی سی رہتی ہوں؟''

''ہاں رہتی تو ہو۔ میرا انداز تو یہی کہتا ہے۔'' وہ دال صاف کرنے لگی۔ ''غزالہ کے بھائی کا مسئلہ ہے کیا؟''

''وہ بھی ہے۔'' وہ کچھ بے دلی سے بولی تھی۔

مریم نے ہاتھ روک کر اسے گھورا۔

''وہ بھی ہے، سے کیا مراد؟ کیا کچھ اور بھی ہے؟ تم کیوں چھپا رہی ہو؟''

''مریم! سچ بتاؤں۔'' وہ کچھ تامل کرتے ہوئے بولی ''وہ۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں۔ جب میں رسمیں کروا رہی تھی تو دولہا کا بھائی نے میرا انگوٹھا اُٹھا کر اندر جھانکا تھا۔''

''ہاں ہاں۔ پھر؟''

''میں سمجھی تھی مریم اس کی شکل میرے دماغ سے نکل چکی ہے اور میں نے کبھی اسے کہیں دیکھا بھی تو پہچان نہیں پاؤں گی۔ اور اس کے بارے میں بھی میرا یہی خیال تھا کہ اس نے نیم اندھیرے میں میری ایک ہلکی سی جھلک ہی تو دیکھی ہے، بھول بھال جائے گا۔ لیکن۔''

''لیکن کیا؟'' مریم بے تابی سے بولی۔

''لیکن اس نے مجھے پہچان لیا۔ نہ صرف پہچان لیا بلکہ میرے پیچھے دوڑا بھی۔''

''کہاں؟'' حیرت سے مریم کی چیخ ہی نکل گئی۔ ''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟''

''یونیورسٹی میں۔'' اس نے سر جھکا لیا۔ ''جب میں تمہیں کینٹین میں چھوڑ کر آگہ سے ملنے باہر نکلی تھی۔ وہ سامنے ہی کھڑا تھا اور اس نے مجھے لمحہ بھر میں پہچان لیا۔ اور میں نے بھی۔''

''پھر؟'' مریم حیرت زدہ سی بیٹھی تھی۔

''پھر میں پلٹ کر تیزی سے انگلش ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہو گئی۔ وہ پیچھے آیا مگر میں گرلز کامن روم میں چھپ گئی تھی۔''

''جبھی تو۔'' مریم نے عقلمندی سے سر ہلایا۔ ''تم واپس لوٹیں تو تمہاری شکل سفید لٹھے کی طرح ہو رہی تھی۔''

''لیکن مریم! وہ میرے پیچھے کیوں بھاگا تھا۔ میں تو غزالہ نہیں ہوں۔'' اس نے معصومیت سے دریافت کیا۔ مریم کو ہنسی آ گئی۔

''کیا خبر بھئی! اب کہیں تمہارے پیچھے بھاگا تو روک کر ضرور پوچھوں گی۔ کہوں گی، میرے بھائی یہ غزالہ نہیں ریشم ہے۔ اس کے پیچھے کیوں بھاگ رہے ہو۔''

''مریم! میں اس دن سے یہی سوچ رہی ہوں کہ وہ بھی اگر وہیں پڑھتا ہے تو اس سے تو میرا روز سامنا ہو گا۔ میں کیا کروں گی۔''

''کرنا کرانا کیا ہے۔ صاف صاف ساری بات بتا دینا۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔ ''کھا تھوڑی ہی جائے گا تمہیں۔''

''نہ بابا۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے لڑکوں سے۔ میں تو چھپ جاؤں گی۔''

''چھپنے والے کام کیے ہی کیوں تھے۔''

''ایک تو تم ہر وقت طنز ہی کرتی رہتی ہو۔'' وہ چڑ گئی۔ ''یہ تمہاری بہت بری عادت ہے۔ میں بیزار ہوں اس سے۔''

''چلو۔ میری تو ایک ہی عادت بری ہے ناں۔ تم تو بری عادتوں کی پوٹلی ہو پوری۔''

''کیا؟'' وہ چلائی۔ ''یہ کن عادتوں کی بات کر رہی ہو؟ میں اماں کو بتاؤں گی تمہارے الفاظ۔''

''اماں کو بتانے کے لیے میرے پاس بھی بہت کچھ ہے۔'' وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

''کیا ہو رہا بھئی۔ کیسی بحث چل رہی ہے؟''

نیلم کاندھے پر بیگ لٹکائے اندر داخل ہوئی تھی۔ دونوں یکلخت خاموش ہو گئیں۔

''السلام علیکم بجو۔'' پھر دونوں کورس میں بولی تھیں۔

''وعلیکم السلام۔'' وہ چارپائی پر گر سی گئی۔ ''پانی تو پلاؤ ریشم۔''

''جی اچھا بجو۔'' وہ اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

''کیا پک رہا ہے۔'' وہ مریم کی سمت متوجہ ہوئی۔

''مسور کی دال۔ ساتھ میں املی اور پودینے کی چٹنی۔'' اس نے مسکرا کر بتایا۔

''جلدی بنالو بھئی۔ سخت بھوک لگی ہے۔'' اس نے ریشم کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر لبوں سے لگا لیا۔

''بس بجو! گھنٹہ بھر کی بات ہے۔ آپ جب تک تھوڑا سستا لیں۔''

''تم بھی ہاتھ بٹایا کرو ناں بہن کا۔'' اس نے ریشم کو گھورا تھا۔ لوشا کی لوشا ہو گئی ہو۔ اب تک اٹھا اٹھانا نہیں آیا۔''

"کیا ہے بجو!" اس نے منہ بسورا۔ "آپ دونوں کی شادی ہو جائے گی تو میں ہی تو گھر سنبھالوں گی ناں۔ آجائے گا کھانا پکانا بھی۔"

مریم اس کی بات سن کر ہنسی اور لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

"سنا بجو آپ نے۔ یہ گھر سنبھالیں گی۔ اب تک خود کو سنبھالنا انہیں آیا نہیں۔"

مریم کی بات سن کر نیلم بھی ہنس دی تھی۔

"ہی ہی ہی۔ ہاہا۔" اس نے جل کر نیلم کی نقل اتاری تھی۔

نیلم نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور پھر ہنسنا بھول گئی۔ سیاہ کرتا شلوار میں اس کا متناسب جسم بڑا جاذب نظر لگ رہا تھا۔ چھپتے کی سی چال کمر پر سیاہ چوٹی جھول رہی تھی۔ لانبے قد پر کرتا شلوار خوب جچ رہا تھا۔ اور اس پر اس کا بھولا بھالا معصوم چہرا جو شرمندگی سے تپ کر سرخ ہو چکا تھا۔ قیامت ڈھا رہا تھا۔

کئی برس پرانے، گھسے ہوئے لباس میں بھی وہ کسی حور کی مانند خوبصورت اور پاکیزہ نظر آ رہی تھی۔ نیلم نے گہرا سانس بھر کر نظر ہٹالی۔

"اچھا بھئی! ابھی ذرا کپڑے تبدیل کر کے لیتی ہوں۔ ذرا کمر سیدھی کر لوں۔ تم لوگ کھانے کی تیاری کر لو۔"

وہ بیگ بیڈ پر رکھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ دونوں اٹھ کر کچن میں چلی آئیں۔

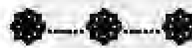
"مریم! بجو کتنی اچھی لگ رہی ہیں ناں۔ فریش؟" ریشم نے بڑی رازداری سے کہا۔

"ہاں! بجو پر نکھار سا آ گیا ہے۔" مریم نے بھی تائید کی۔

"کیوں بھلا؟"

مریم نے اس احمقانہ سوال پر اسے گھور کر دیکھا۔

"بے وقوف!" پھر وہ بڑبڑائی تھی۔



کام کرتے ہوئے وہ مسلسل خود کو آمنہ کی نظروں کی گرفت میں محسوس کر رہی تھی۔ نجانے آج وہ اسے کن نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ شبنم کو اس کی نظریں اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

ایک مرتبہ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا اور مسکرائی۔ گم صم سی آمنہ چونک اٹھی۔

"کیا بات ہے آمنہ آج بڑی خاموش سی ہو۔" وہ مسالا تیار کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

آمنہ نے ایک گہرا سانس بھرا۔

"کیا کہوں شبو۔ تم تو جانتی ہو میرا درد بھی تم ہی ہو۔"

شبنم کے ہاتھ چند لمحوں کے لیے رُکے تھے۔ پھر اس نے دوبارہ ہانڈی میں چمچ ہلانا شروع کر دیا۔

"یاد ہے ناں شبو! کتنی دوستی ہوا کرتی تھی ہم دونوں کی۔ اسکول، کالج ساتھ آتے جاتے تھے۔ شام میں بھی تم اکثر یہاں آ جاتی تھی۔ پھر بھی ہماری باتیں ختم ہی نہیں ہو پاتی تھیں۔ کتنا کچھ ہوتا تھا ایک دوسرے سے کہنے کے لیے۔ ایک دوسرے سے شیئر کرنے کے لیے۔ ہیں ناں۔"

"ہوں!" وہ محض ہنکارا بھر کر رہ گئی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا آمنہ نے یہ موضوع کیوں چھیڑا تھا۔

"اور اب۔ اب لگتا ہے سب کچھ بدل گیا ہو۔ میں بدل گئی ہوں، تم بدل گئی ہو۔ ہماری سوچیں بدل گئی ہیں۔"

"وقت جو بدلا ہے۔" وہ گہری سانس بھر کر بولی۔ "حالات جو بدل گئے ہیں۔ ہمیں اور ہماری سوچوں کو تو بدلنا ہی تھا۔"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔" اس نے سر جھکا لیا۔ "وقت کے ساتھ ساتھ سب ہی بدل جاتے ہیں۔ پتا نہیں شبو مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں بہت جذباتی ہوتی جا رہی ہوں۔ میں پہلے تو ایسی نہیں تھی۔ بڑی سے بڑی بات کو بھی ہنس کر سہہ جاتی تھی۔ کڑوے سے کڑوے رویے کو آرام سے پی جاتی تھی۔ لیکن اب میں کڑھنے لگی ہوں۔ ذرا ذرا سی بات پر بھی۔"

شبنم خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

"ریاض۔ ریاض نے مجھے ایسا کر دیا ہے۔ یہ مرد ایسے کیوں ہوتے ہیں شبو۔ ان کی ترجیحات اتنی جلدی کیوں بدل جاتی ہیں؟"

شبنم نے بے ساختہ ہی نظریں چرا لی تھیں۔ دل کے چور نے اسے رُخ موڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔

"شبو! مجھے لگتا ہے جیسے دنیا میں کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی ناں۔ مجھے اپنا گھر بہت اچھا لگتا تھا۔ ڈھیروں ڈھیر کام کر کے بھی میں تھکتی نہیں تھی۔ ہنستی گنگناتی رہتی تھی۔ ساس، نندوں کی کسی بات کا برا نہیں مانتی تھی۔ کیونکہ شام کو ریاض آتے تھے اور ان کو دیکھ کر، ان سے مل کر میں سب کچھ بھول جاتی تھی۔ کسی پھول جیسی تر و تازہ ہو جاتی تھی۔ لیکن یہ عرصہ اتنا مختصر ثابت ہوا جیسے میں نے پلک جھپکی ہو۔ مجھ سے ریاض کی دلچسپی کب اور کیسے ختم ہوئی۔ مجھے علم تک نہ ہوا۔ بس یوں لگتا ہے، ایک خواب دیکھا تھا اور اب آنکھ کھلی ہے۔"

اس نے گہرا سانس بھرا۔

"اب تو میں ذرا سا کام کر کے تھک جاتی ہوں۔ شانے درد سے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ کمر چٹختی ہے۔ اصل میں کام کے ساتھ ریاض کی بے وفائیوں اور بے اعتنائیوں کا بوجھ بھی تو آن پڑا ہے ناں سر پر۔" وہ دھیرے سے ہنس دی تھی۔

شبنم کے ہاتھ پاؤں بے حد بھاری ہو گئے تھے۔ چاہتے ہوئے بھی وہ کام نہ کر پا رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ آمنہ کا مقصد کیا تھا۔ آیا وہ محض سہیلی ہونے کے ناطے اپنا دُکھ درد بانٹ رہی تھی۔ یا اس گفتگو کے پیچھے کوئی اشارہ تھا۔

"ریاض جیسے لوگ کسی ایک کو اپنے نام کا پابند کر لینے کے بعد آزاد ہو جاتے ہیں۔ گھر کی طرف سے بے فکر ہوتے ہیں تو "باہر" کی ذمے داریوں کا احساس انہیں ستانے لگتا ہے۔"

"کیوں پروا کرتی ہو ایسے شخص کی۔" وہ یک لخت تلخی سے بولی تھی۔ "یہ سدھرنے والی نسل نہیں۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو ورنہ

مکمل کر ختم ہو جاؤ گی۔ سمجھو، تمہاری زندگی میں کوئی ہے ہی نہیں۔ تم ہو، تمہارا گھر ہے اور اس گھر کے کبھی نہ ختم ہونے والے کام ہیں۔ یہی ہے ہماری زندگی آمنہ! اتم لمحہ بھر کی خوشیوں کا مزا چکھ چکی ہو۔ شاید اس لیے تمہیں یہ تلخیاں کچھ زیادہ محسوس ہو رہی ہیں۔ میری طرح تمہیں بھی شروع دن سے زہر ملا ہوتا تو شاید اب تک امرت لگنے لگتا۔ تم شاید ابھی تک انتظار میں ہو کہ وہ دن لوٹ آئیں گے۔ لیکن وہ دن کبھی نہیں لوٹیں گے۔ کبھی بھی نہیں۔ ان مردوں کی عیاشیوں کا سفر بڑا طویل ہوتا ہے آمنہ۔ انہیں لوٹتے لوٹتے عمر لگ جاتی ہے۔ ہاں، جب ان کے ہاتھ پیروں میں رعشہ آ جاتا ہے۔ نظر دھندلانے لگتی ہے اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے تو انہیں اپنی بیویوں کے کاندھے یاد آتے ہیں۔"

"میں سوچتی تھی شاید حسن میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔" آمنہ پھر دھیرے دھیرے بولنے لگی۔ "میں سوچتی تھی شاید میری تازگی چند روزہ تھی۔ اسی لیے ریاض کا دل مجھ سے بھر گیا۔ شاید حسین عورتوں کے شوہر ساری عمر ان کی پرستش کرتے ہوں گے لیکن تمہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے، میرا یہ اندازہ بھی غلط تھا۔ تم میں بھلا کس چیز کی کمی ہے جو یوسف بھائی۔"

"نام مت لو ان کا۔" وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ گئی۔ "مجھ میں کسی چیز کی کمی نہیں اور مجھے بھی کسی چیز کی کمی نہیں جو ان کی نظر کرم کے انتظار میں ساری عمر گزار دوں۔ زادِ راہ تو ہمارے پاس بھی ہے۔ کسی نئے سفر پر ہم بھی نکل سکتے ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو شبنم؟" آمنہ دہل سی گئی۔ "یہ باتیں ہم عورتوں کو زیب نہیں دیتیں۔"

"ہا" وہ حقارت سے ہنس دی۔ "ہم عورتوں کو محض رونا، پیٹنا، ماتم کرتے رہنا ہی زیب دیتا ہے؟۔ میں قبر میں اترنے سے پہلے اپنی خوشیوں کے قاتل کو بھی دفن کر دینے کی قائل ہوں آمنہ۔ مجھے سسکنا اور کراہنا برا لگنے لگا ہے۔ خود اپنے آپ پر غصہ آتا ہے۔"

"میں ایسی نہیں بن سکتی۔" آمنہ نے مجبوری سے سر جھکا لیا۔ "میں تو آج بھی منتظر ہوں ان کی اور شاید۔ بقول تمہارے، اس وقت تک رہوں گی جب تک انہیں بیوی کے کاندھے کی ضرورت نہیں پڑ جاتی۔"

"ہونہہ! بے وقوف عورتیں۔" وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔



"صبا۔ صبا بیٹی۔ اٹھو شام ڈھل رہی ہے۔" نجمہ خاتون نے اندر آکر اے۔سی آف کیا اور ساری لائٹیں آن کر دی تھیں۔

"اوں ہوں۔ امی۔ بچی بڑے مزے کی نیند آرہی ہے۔" اس نے تکیہ پیچھے ڈال لیا۔

"دیکھو۔ دانیال آیا بیٹھا ہے۔ میں بھلا اسے کب تک کمپنی دوں۔ شاباش اٹھو۔ جلدی سے پیچھے آجاؤ۔"

وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

صبا کی ساری نیند کافور ہو گئی۔ تکیے میں سے منہ نکال کر وہ چھت کو گھورنے لگی۔ دانیال ہاشمی سے پچھلی ملاقات اور اس ملاقات کی ساری باتیں اس کی نظروں میں گھوم گئیں۔

بے دلی سے بستر سے اٹھ کر وہ آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ شکن آلود لباس اور بکھرے ہوئے بالوں میں اسے اپنا آپ بہت برا لگا۔ وہ وارڈ روب تک آئی اور اسے کھول کر کپڑوں کا جائزہ لینے لگی۔ پھر یکا یک اس نے سر جھٹکا اور چپلیں پہن کر ایسے ہی کمرے سے نکل گئی۔

"السلام علیکم۔" وہ سنجیدگی سے کہتی ہوئی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔

"جیتی رہیں۔ وعلیکم السلام۔" وہ بڑی تازگی سے مسکرایا۔

نجمہ خاتون اس کا حلیہ دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

"صبا بیٹی! کپڑے تو بدل لیے ہوتے۔"

"سستی ہو رہی ہے امی۔ تھوڑی دیر میں شاور لوں گی۔"

"تم دونوں باتیں کرو۔ میں چائے لاتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔

ان کے جانے کے بعد وہ پوری طرح اس کی سمت متوجہ ہوا۔ اس کی صورت دیکھ کر شرارت سے مسکرانے لگا۔

"اچھی لگ رہی ہیں۔"

"شکریہ۔" وہ روکھے پن سے بولی۔

"ناراض ہیں اب تک؟۔"

"اب تک؟ میں ناراض تھی ہی کب؟۔" اس نے تعجب سے بھنویں سکیڑیں۔

"دیکھو صبا۔ پلیز!" وہ اچانک سنجیدہ ہو چلا۔ "میں اس دن والے واقعے پر شرمندہ ہوں۔ بے حد شرمندہ ہوں۔ میں نے واقعی تمہیں ہرٹ کیا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔"

صبا نظر جھکائے بیٹھی رہی۔

"یقین کرو۔ اتنے دنوں سے میں سو نہیں سکا۔ عجیب سی بے چینی کا شکار رہا ہوں۔ اور آج صبح جب میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تم سے

معافی مانگنے کا سوچا۔ ساری بے قراریوں کو قرار سا آ گیا۔"

صبا نے نظر اٹھا کر دیکھا اور خوشدلی سے مسکرا دی۔

"مسکراہٹ کہہ رہی ہے تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔" وہ اچانک شوخ ہوا۔

"معاف کرنے یا نہ کرنے کا کیا سوال۔ غلطی محض آپ کی نہیں میری بھی تھی۔ نجانے میں غصے میں کیا کچھ کہہ گئی۔ بھلا آپ مجھ سے معذرت کیوں طلب کر رہے ہیں۔"

"چلیں پھر آپ طلب کیجیے۔" وہ ہنس دیا۔

"آئی ایم سوری۔"

"اٹس آل رائٹ۔" اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

پھر دونوں ہی ہنس دیے۔

"چائے پی کر کہیں باہر چلتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟" وہ اچانک ہی بڑا تر و تازہ دکھائی دینے لگا تھا۔

صبا چند لمحوں کے لیے خاموش سی ہو گئی۔

"چلیں آپ کی مرضی ہے۔" وہ فوراً ہی اس کا موڈ بھانپ گیا۔

"امی سے پوچھ لیں۔" اس نے گہرا سانس بھرا۔

وہ آج کسی بھی قسم کی بدمزگی نہیں چاہتی تھی۔ بلکہ اس روز والی بدمزگی کا ازالہ کرنا چاہ رہی تھی۔

"ارے یہ تو بہت آسان سا کام ہے۔ چٹکی بجاتے ہو جائے گا۔" وہ ہنس دیا۔

اور واقعی اس نے درست کہا تھا۔ نجمہ خاتون نے بڑی خوشدلی سے اجازت دے دی تھی۔ درحقیقت وہ اور تنویر صاحب دانیال کو بے حد پسند کرنے لگے تھے۔ اس پر مکمل اعتماد کرنے لگے تھے اور یہ بات صبا بھی جانتی تھی۔

"وہ اس دن والا ڈریس پہنو ناں۔" اجازت مل جانے پر اس نے فوراً ہی فرمائش داغ دی تھی۔ "وہ بلیک اینڈ وائٹ کیمی نیشن والا۔ بہت سوٹ کرتا ہے تمہیں۔"

صبا کو ناچار یہ فرمائش بھی پوری کرنی پڑی۔

"آج ہم گھر دیر سے لوٹیں گے۔" گاڑی سڑک پر ڈال کر وہ بولا تھا۔ "رات کا کھانا کسی اچھی سی جگہ کھا کر۔ ٹھیک ہے ناں۔"

"امی، ابو پریشان ہوں گے۔ آپ نے محض گھنٹہ بھر کی اجازت لی ہے۔"

"ارے ایسا ہی ہوتا ہے۔" اس نے سر جھٹکا۔ "اب میں آنٹی سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا ناں کہ ہم دیر سے لوٹیں گے۔ وہ خود بڑی عقلمند خاتون ہیں۔"

"لیکن انسان کو اپنی زبان کا پاس کرنا چاہیے۔" وہ رسانیت سے بولی۔ "کھانا پھر کسی دن کھالیں گے۔ آج یونہی ذرا سا گھوم پھر کر واپس چلتے ہیں۔"

"چلو بابا۔ فون کر دیں گے گھر سے کہ پروگرام تبدیل ہو گیا ہے ہم دیر سے آئیں گے۔"

"اس طرح والدین کا اعتماد جاتا رہتا ہے۔" وہ دوبے لہجے میں بولی۔

دانیال نے گہری سانس بھری۔

"او کے۔ او کے۔ ہم ٹھیک گھنٹے بعد گھر چلیں گے۔ خوش۔"

صبا مسکرا دی تھی۔ وہ سیٹی پر کوئی دھن بجاتے ہوئے کیسٹ سلیکٹ کرنے لگا۔

"صبا!" پھر وہ اچانک ہی بولا تھا۔ "اس روز والے رویے پر تمہیں حیرت تو ہوئی ہوگی؟"

وہ چند لمحے خاموش رہ کر باہر گزرتی گاڑیوں کو دیکھتی رہی پھر بولی۔

"افسوس ہوا تھا۔ حیرت کیا ہوتی ہے۔ کوئی میرے کردار پر شک کرے، اس سے بڑھ کر بری بات میرے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اور اچھا ہوا آپ نے یہ ذکر چھیڑ دیا۔ میں بھی وضاحت کر دوں۔ شہروز میرے لیے چھوٹے بھائی کی طرح ہے۔ بہت پیار کرتے ہیں ہم ایک دوسرے سے۔ اس کی کوئی بہن نہیں اور میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی یہ کمی پوری کر دی ہے۔ آئندہ آپ اس دوسرے حوالے سے کوئی بات مت سوچیے گا۔ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور ایک دوسرے کے متعلق کوئی غلط بات نہیں سن سکتے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں شرمندہ ہوں اپنی سوچ پر۔" وہ آہستگی سے بولا۔ "لیکن صبا! ایک بات میری بھی سن لو۔ میں بہت پوزیسو واقع ہوا ہوں۔ محبتوں اور شدتوں کا قائل ہوں۔ جسے اپنا مان لوں، اس کا جھکاؤ کسی اور طرف بالکل برداشت نہیں کر پاتا۔ یاد رکھنا صبا۔ مجھ پر کبھی کسی کو ترجیح مت دینا۔"

"میں آپ سے کہہ چکی ہوں۔ شادی کے بعد آپ کی خوشیوں کا خیال رکھنا ہی میری اولین ترجیح ہوگی۔ میں اپنی ذاتی خواہشات بھی پس پشت ڈال دوں گی۔"

"شادی کے بعد؟۔ ابھی کیوں نہیں؟۔"

"ہر رشتے کی اپنی اپنی مضبوطی ہوتی ہے۔" اس نے کاندھے اچکائے۔

"یوں کہو ناں کہ ہر رشتے کی اپنی اپنی مجبوری ہوتی ہے۔" وہ عجیب سی ہنسی ہنس دیا۔

"کیا مطلب؟۔"

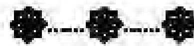
"مطلب یہ کہ شادی کے بعد تو اس رشتے کو نبھانے کی جتن کرنا ہر عورت کی مجبوری ہوتی ہے۔"

"صرف عورتوں کی؟۔"

"نہیں امردوں کی بھی لیکن عورتیں زیادہ مجبور ہوتی ہیں ناں۔"

"پتا نہیں آپ کا مطلب کیا ہے۔ میں سمجھ نہیں سکی۔"

وہ اس پر نظر ڈال کر رہ گیا تھا۔



"پتا نہیں گھر کا ماحول کیسا ہو گیا ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے کھنچا کھنچا سا رہتا ہے۔" مہوش نے تبصرہ کیا تھا۔

"ہاں!" سیماب نے اخبار سے نظر ہٹائی اور الماس پر ڈالی۔ "ہیں چند وجوہات۔"

الماس نے اس کے لہجے میں چھپی تلخی بخوبی محسوس کی تھی۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں موند لیں۔ آج کئی دنوں کے بعد سب کے سب اس کے کمرے میں جمع تھے۔ آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ غالباً "کسی" کی جانب سے انہیں اس کا خیال رکھنے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ باتوں میں حصہ لینے کے بجائے آنکھیں موندے پڑی تھی۔ اس کا دل بے پناہ گھبرا رہا تھا۔

مہناز نے سیماب کے اشارے کو بھانپ لیا تھا۔ اسے نظروں ہی نظروں میں جھڑک کر کے وہ اس کے پاس آ بیٹھی۔

"الماس! کیسی طبیعت ہے اب۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"ہوں!" اس نے محض اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا تھا۔ کتنا سمجھاتی تھی مہناز اسے۔ کتنی عقلمند تھی وہ۔ وہ ہی اتنی کم عقل کیوں نکلی۔ کتنا نقصان کر لیا تھا اس نے اپنا۔

"ہماری باتوں سے نیند آ رہی ہو تو ہم لوگ باہر چلے جاتے ہیں؟" مہناز پوچھ رہی تھی۔

"نہیں!" وہ آہستگی سے بولی۔ "بیٹھے رہو۔ جی گھبراتا ہے اکیلے میں۔"

"اچھا!" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"مہوش اور سیماب آپس میں نجانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ الماس کا غنودگی میں جاتا ذہن مشکل لفظوں کو پکڑ پا رہا تھا۔

"شادی؟ اب؟ تمہی انصاف سے کہو۔ عثمان بھائی اب کر سکتے ہیں اس سے شادی؟" سیماب کا لہجہ دبا دبا سا تھا۔

"اب انہوں نے انکار کر دیا تو کیا برا کیا؟"

"شی۔ آہستہ۔" مہناز کی سرگوشی ابھری تھی۔ "سن لے گی۔"

پھر وہ تینوں دور بیٹھی دبی دبی آوازوں میں باتیں کرنے لگیں۔ اس کا ڈوبتا ذہن چند لفظوں میں الجھا ہوا تھا۔ عثمان۔ شادی۔ انکار۔

"تو امید کی آخری کرن بھی بدقسمتی کی گھنگھور گھٹاؤں میں دم توڑ رہی تھی۔ وہ ہر طرف سے ٹھکرائی جا رہی تھی۔ تو یہ تھی اس کے بے پناہ غرور کی سزا۔

اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔



مریم تمام کام نپٹا کر دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی اندر کی سمت جا رہی تھی جب دروازے پر ہوتی دستک نے اس کے قدم روک لیے۔

"کون؟" اس نے وہیں سے پکارا تھا۔

"کھولو بھئی۔ ہم ہیں۔ یونس کی امی۔"

"اوہ۔ چچی جان!" اس نے لپک کر دروازہ کھولا۔ "السلام علیکم چچی جان۔ کیا حال ہیں۔" وہ ان سے لپٹی تھی۔

"والسلام۔ جیتی رہو۔ جیتی رہو۔" انہوں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ "اماں ہیں تمہاری؟"

"جی ہاں۔ اماں بھلا کہاں جاتی ہیں۔" وہ مسکرائی "آیئے۔ اندر چلیں۔" وہ انہیں لے کر اماں کے کمرے میں چلی آئی۔

"کیسی ہو زبیدہ؟" رسمی علیک سلیک کے بعد چچی اپنا بھاری بھرکم وجود سنبھالتی پھولے ہوئے سانس کے ساتھ چارپائی پر دراز ہو گئیں۔ "تم نے تو صورت دکھائی چھوڑ دی۔ رشتے داریاں بڑھ گئیں تو ان چند ملاقاتوں سے بھی گئے۔ ایک ہی شہر میں رہتے مہینوں گزر جاتے ہیں۔ آپس میں ملاقات کیے۔"

"اور تم کون سا روز روز چلی آتی ہو۔" اماں نے شکوہ کیا۔ "میں بیمار عورت کہاں باہر نکلتی ہوں۔"

"میں کون سا دوڑوں میں حصہ لیتی ہوں بہن۔ جوڑوں کی مریضہ ہوں۔ ارے بیٹی ذرا پانی تو پلاؤ۔ ایک تو یہ کم بخت سانس! قابو آ کر نہیں دیتا۔"

"مریم۔ شربت بنا لو۔" اماں نے اسے پیچھے سے ہدایت کی۔

"وہ فٹافٹ شربت بنا کر ٹرے میں جگ گلاس رکھ کر چلی آئی۔ ریشم ابھی تک دوپہر کی نیند پوری کر رہی تھی۔

"چچی جان! شبنم آپی کو کیوں نہیں لائیں۔ سچ اب تو ہم بھول سے گئے ہیں ہماری کوئی بہن بھی تھی۔"

"بس بیٹی! کیا کہوں۔ قسم لے لو جو کبھی اس پر کوئی قدغن لگائی ہو یا کوئی روک ٹوک کی ہو۔ اپنی مرضی سے جہاں چاہتی ہے آتی جاتی ہے۔ پر پتا نہیں یہاں کیوں نہیں آتی۔ میں تو اکثر کہتی بھی ہوں جا کر بہنوں سے مل آؤ۔ سنی ان سنی کر دیتی ہے۔ ہاں بھئی! ہمارے آگے بھی بیٹی ہے۔ ہم کیوں کسی کی بیٹی کا برا کریں۔"

"انہوں نے گلاس منہ سے لگا لیا۔ اماں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

"یوسف بھائی بھی نہیں آتے۔ وہی لے آیا کریں آپی کو۔"

"ارے بیٹی۔ کیوں منہ کھلواتی ہو۔ اس لڑکے نے تو دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔"

"مریم۔ بیٹی کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔ شام ڈھلنے لگی ہے۔"

"اچھا اماں۔ ابھی تو وہ پھر کا کام سمیٹا ہے۔" اسے ماں کا ٹوک کر وہاں سے اٹھا دینا اچھا نہ لگا۔ منہ بنا کر باہر نکل گئی۔

اماں وحیدہ چچی کی یوں اچانک آمد سے کھٹک سی گئی تھی۔ جلد از جلد ان کی آمد کا مقصد جاننا چاہ رہی تھیں۔

"نیلم کہاں ہے؟" چچی نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد پوچھا۔

"فیکٹری گئی ہے۔ ابھی لوٹتی ہوگی۔" اماں نے مختصرا کہا۔

"ارے مذ بیدہ کیا ہو گیا ہے تمہیں...... کیا نوکری کروا کر اسکی عمر نکال دو گی شادی کی؟ بس بہت کر لیں نوکریاں۔ ہاتھ پیلے کرو لڑکی کے۔"

"کون سی ماں ہو گی جس کا کلیجہ پتھر کا ہو گا؟" اماں نے سرد آہ بھری۔ "یہ تو سر پر ہی ایسی آ پڑی تھی کہ۔" ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ "خیر! ہمیں کون سا ساری زندگی اس کی کمائی کھانی ہے بس چند سالوں کی بات ہے۔ میرا لڑکا کسی قابل ہو جائے تو...... بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ آج اس کا کوئی ڈھنگ کا رشتہ آ جائے تو میں کل رخصت کر دوں۔ روزی رزق دینے والی ذات تو وہ ہے۔"

"واقعی ایسا چاہتی ہو؟" چچی نے نظروں ہی نظروں میں انہیں تولا۔ "پھر ڈالوں رشتہ؟"

"ہائیں؟" اماں کو سخت تعجب ہوا۔ "تم کس کا رشتہ لے آئیں وحیدہ؟"

"یوسف میاں کا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا لہجہ کھوکھلا ہو گیا تھا اور انہوں نے نظریں چرائی تھیں۔ اماں کو جیسے شاک لگا تھا۔ سخت اچنبھے کے عالم میں وہ انہیں گھورتی رہ گئیں۔

"حواسوں میں ہو؟" پھر انہوں نے نہایت برا مانتے ہوئے کہا۔ "کیا بک رہی ہو۔"

"سنو زبیدہ بہن۔ میری بات پر غور کرو۔" چچی اچانک بالکل عاجزی سے بولیں۔ "سوال صرف میرے ایک بیٹے کی زندگی کا نہیں ہے تمہاری دو بیٹوں کی خوشیوں کا بھی ہے۔ نہ یوسف خوش۔ نہ شبنم خوش۔ نہ نیلم خوش۔"

"یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا وحیدہ۔ اور تمہارے بیٹے کا بھی۔" اماں تلخ لہجے میں بولیں۔ "اگر تمہیں یاد ہو تو۔"

"ہاں ہاں سب یاد ہے مجھے۔ لیکن ایسی باتیں یاد رکھنے کے لیے نہیں، بھلا دینے کے لیے ہوتی ہیں۔ یقین کرو زبیدہ! ہم اگر آج بھی اپنی اپنی ضدوں پر اڑے رہے تو اپنے بچوں کو بہت نقصان کریں گے۔ ہم ان کے بڑے ہیں۔ ان کا بھلا سوچنا ہی تو بہتر ہے۔"

"تم کہہ کیا رہی ہو شاید تمہیں خود علم نہیں ہے۔" اماں چڑ گئیں۔ "کوئی تماشا ہے یہ یا زندگی ہے؟ اور۔ اور۔ جانتی ہو، ہمارے مذہب میں دو بہنیں ایک مرد کے عقد میں نہیں آ سکتیں۔"

"تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ دونوں اس کے عقد میں دے دو۔" چچی کے الفاظ ان کے حلق میں اٹکنے لگے۔ اماں کی گھورتی نظریں مسلسل ان کے چہرے پر تھیں۔

"پھر یہ کیسے ممکن ہے؟"

"شبنم کو یوسف میاں۔ طلاق۔"

"وحیدہ!" اماں کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "منہ سنبھال کر بات کرو۔ مجھ سے کہنے آئی ہو کہ میں اپنی بیٹی کا گھر اجاڑنے میں تمہارا ساتھ دوں؟ پاگل ہو گئی ہو؟ بجائے اس کے کہ اپنے بیٹے کو سمجھاؤ کہ بند کرے یہ کھیل، تم اسی کی طرفداری کرنے یہاں آ گئیں؟"

چچی سخت بے بسی کے عالم میں فرش کو گھورنے لگیں۔ جانتی تھیں جیٹھانی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اس کی جگہ وہ ہوتیں تو یہی سب کچھ کہتیں۔

"میں بھی اپنی خوشی سے نہیں آئی زبیدہ۔" پھر وہ بے بسی سے بولیں۔ "یہ اولاد بھی ماں باپ کو سر اٹھا کر جینے کے قابل نہیں چھوڑتی۔ یوسف میاں نے تو جیسے اسے اپنی موت زندگی کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ ادھر یونس کی قابل رشک زندگی کو دیکھتی ہوں تو یوسف اور شبنم کی حالت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ شبنم کو بہو بنانے کی ساری خوشی مٹی میں مل گئی ہے۔ مجھے اس کی ساس نہ سمجھو زبیدہ۔ وہ مجھے آمنہ جیسی عزیز ہے۔ تم جانتی ہو کتنے ارمانوں سے میں اسے بیاہ کر لے گئی تھی۔ لیکن مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے نہیں ہیں۔ جسے تم بیٹی کا گھر اجاڑنا کہہ رہی ہو وہ در حقیقت اسے ایک بہت بڑے عذاب سے نجات دلانا ہے۔ وہ وہاں تباہ ہو رہی ہے زبیدہ! میری بات کی گہرائی میں جانے کی کوشش کرو۔"

اماں بہت دیر کے لیے خاموش ہو گئیں۔ شبنم کا دکھ اندر ہی اندر ان کا کلیجہ کاٹنے لگا آنسو خود بخود ان کی آنکھوں سے رواں ہو گئے۔

"ثریا ماں بننے والی ہے۔" وحیدہ چچی نے لوہا گرم ہوتے دیکھ کر پھر چوٹ لگائی۔ "اور وہ معصوم نارسائیوں کے عذاب بھگت رہی ہے۔ ذرا سوچو، کیا خوشی ہے اس کی زندگی میں؟ ہے کوئی رنگ؟ یہ عمر ہے اس کی ایسے عذاب سہنے کی؟ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ وہ یوسف میاں کی زندگی سے نکل جائے۔ خوبصورت ہے، جوان ہے، پڑھی لکھی ہے۔ خدا بہتر کرے گا۔ جلد ہی اس کا بھی کہیں نہ کہیں رشتہ ہو جائے گا۔ وہ بھی نئی خوشیاں ملنے پر پرانے دکھ بھول جائے گی۔ ادھر یوسف میاں اور نیلم بھی سیٹ ہو جائیں گے۔ زبیدہ! طلاق بہت برا فعل سہی لیکن حلال ہے، کیونکہ ایسے ہی موقعوں پر اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب نبھنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو۔"

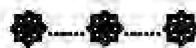
اماں کے چہرے پر تفکرات کے گہرے سائے لرز رہے تھے۔

"نیلم۔ وہ کب مانے گی؟"

وہ بولیں تو ان کا لہجہ بالکل ٹھنڈا تھا۔

"ارے اس کی تو تم بالکل فکر مت کرو۔ وہ تو دل و جان سے چاہتی تھی یوسف میاں کو۔ بس ذرا سی بات اس کے کان میں ڈالو۔ پھر دیکھو۔" وحیدہ چچی کھل اٹھیں۔ "اور رہے دنیا والے تو بہن۔ دل لگتی کہتی ہوں۔ اولاد سے بڑھ کر آدمی کسی کا نہیں سوچتا۔ ہمارے بچے خوش رہیں ہمیں اور کیا چاہیے سارے موئے دنیا والوں کو کون پوچھے۔"

وہ اماں کا ہاتھ دبا کر ہنس دیں۔



وہ صحن میں لگی کیاری میں پانی ڈال رہی تھی جب بیل بجی۔

"کون ہے۔" وہ ہاتھ صاف کرتی دروازے تک آئی۔

"پوسٹ مین۔ خط ہے۔"

اس نے ہاتھ باہر نکال کر خط لے لیا۔

"مس شبنم!"

"اسے لفافہ پر لکھا نام دیکھ کر حیرت نے آ گھیرا۔

"مجھے بھلا کون خط لکھ سکتا ہے۔" وہ حیرت کے عالم میں جلدی جلدی لفافہ چاک کر رہی تھی۔

زلف راتوں سی ہے، رنگت ہے اجالوں جیسی

پر طبیعت ہے وہی بھولنے والی جیسی

پیاری شبنم!

سلام محبت قبول ہو

پہلی مرتبہ آپ کو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ یوں محسوس ہوا کہ وہ دل کا معبد خانہ اب تک خالی پڑا تھا وہاں ایک دیوی آ کر براجمان ہو گئی ہے اور میرا دل گھنٹیوں کی سریلی آواز میں گونجنے لگا ہے۔

"آپ کی کیا تعریف کروں، میرے پاس تو لفظوں کی کمی ہے ہی، لیکن مجھے پورا یقین ہے، دنیا بھر کے شاعروں کو بھی آپ کی شان میں قصیدے لکھنے کے لیے ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو ان کو بھی لفظوں کی کمی پڑ جائے گی۔

ایسا بے مثال حسن پہلے کبھی نظر سے نہیں گزرا۔ جو کہا جائے کم ہے۔ اتنا جانتا ہوں کہ چند دنوں میں ایسا بے چین و بے قرار ہو گیا ہوں کہ معلوم ہوتا ہے میرے اندر صدیوں کی پیاس جمع ہو گئی ہے۔

یہ تیری زلف بکھری یا مری ہستی کا شیرازہ

خدا کے واسطے اس سلسلے کو مختصر کر دے

نجانے میرا یہ خط پڑھ کر آپ کا ردعمل کیا ہو (ہو سکتا ہے میری شامت ہی آ جائے) لیکن دل کی بے تابیوں نے کہا کہ اب قیامت برپا ہو جائے تو بھی پروا نہیں۔ اس لیے جو کچھ دل میں ہے کہتا ہوں۔

اے نازنین! میں تمہارے عشق کی دلدل میں بری طرح پھنس چکا ہوں۔ اب میرے مقدر کا فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ زندگی بخش دو کہ مار ڈالو تمہیں اختیار ہے۔

ہو سکے تو جواب دینا۔

تمہارا انیس

وہ خط پڑھ کر ساکن و جامد رہ گئی۔ اس قدر کھلا اظہار اور اتنا والہانہ پن۔ اس کا دل کسی الہڑ دوشیزہ کی مانند دھک دھک کر رہا تھا۔

وہ تو شکر ہوا وہ اس وقت گھر میں اکیلی تھی ورنہ اپنی کیفیت کسی طور پر نہ چھپا پاتی۔ ایک ہاتھ میں خط پکڑے۔ دوسرا ہاتھ سینے پر رکھے۔ وہ وہیں صحن میں بچھے تخت پر بیٹھ گئی۔

پھر اس نے خط دوبارہ پڑھا۔ سہ بارہ پڑھا اور خود بخود ہی ایک شرگیں مسکراہٹ اس کے لبوں پر اتر آئی۔

بے اختیار اس کی نظریں سامنے والے گھر کی چھت کی طرف اٹھی تھیں۔ پھر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ وہ دیوار پر جھکا ہوا سامنے ہی کھڑا تھا۔ اسے متوجہ پاتے ہی ہاتھ ماتھے تک لے گیا۔

شبنم جلدی سے اٹھ کر اندر کی طرف بھاگی۔ پلنگ پر گر کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

"بے شرم کہیں کا۔" اس کے گالوں پر شفق اتر رہی تھی۔



رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔

کسی جلے پیر کی بلی کی مانند وہ پورے گھر کے کتنے ہی چکر لگا چکی تھی۔ اوپر، نیچے، پھر والان پھر راہداری میں گھوم رہی تھی۔ چین دل تھا کہ گھبراہٹ کے گھٹنوں سے باہر نکل کر نہیں دے رہا تھا۔ معدے میں جو کچھ تھا، منہ کے رستے باہر نکلنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ منہ، دوسرا پیٹ پر رکھے یہاں وہاں چکراتی پھر رہی تھی۔

سارے کمرے بند تھے۔ ہر کوئی اپنی میٹھی، پرسکون نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ ایک وہی تھی کہ کسی کے ہجر کے غم سے بوجھل پگلی کی مانند جاگ رہی تھی۔ سلگ رہی تھی، رو رہی تھی۔

"کیوں کیا تم نے ایسا الماس طاہر خان۔ کیوں کیا؟" کوئی رہ رہ کر پوچھتا تھا۔ "کیا ملا اس ایڈونچر سے تمہیں۔ کیا پایا اس وقتی انجوائے منٹ سے۔ ساری عمر کی متاع۔ ایک میلے میں لگے تماشے کو دیکھنے میں لٹا کر گھر آئے مسافر کی عزت کون کرتا ہے؟ کون سینے سے لگاتا ہے اسے۔ کون اس کے دکھوں سے ٹوٹتے شانوں پر ہاتھ رکھتا ہے؟"

وہ بوجھل قدموں سے سیڑھیاں اترتی لان میں آگئی۔

اسے یاد آ رہا تھا۔ سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ وہ اور صبا بحث کیا کرتی تھیں۔ وہ صبا کو بے وقوف احمق اور جذباتی گردانتی تھی۔ اور خود کو بہت الگ بہت مختلف مزاج کی لڑکی سمجھتی تھی۔ اس نے صبا سے کہا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے مجھے اس سے محبت وحبت جیسی کوئی شے ہو جائے گی۔ میں اس کی فرقت میں ویسے ہی آہیں بھروں گی جیسے تم فیروز احمد کی جدائی میں بھرتی ہو۔ تمہاری طرح مجھے بھی تنہائی رہنے، غزلیں سننے کا شوق ہو جائے گا اور پھر ہاتھوں میں علم بغاوت بلند کر کے اس سے شادی کروں گی یا پھر اس کے فراق میں تڑپ تڑپ کر جان دے دوں گی۔ واٹ نان سنس حبا۔"

اور صبا نے کہا تھا۔

"تمھیں علم نہیں ہوتا الماس۔ لیکن کبھی کبھی دل دکھانے والی باتیں کرتی ہو۔ ٹھیک ہے، اگر تم خود کو عام انسانوں کی سطح سے بلند خیال کرتی ہو اور سمجھتی ہو کہ تم تعلقات کو مختلف طریقے سے ہینڈل کرتی ہو تو تمہاری مرضی۔"

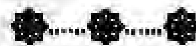
اور آج صبا کتنی کامیاب تھی اور وہ کتنی ناکام۔ جگہیں کب اور کیسے تبدیل ہوئی تھیں۔ اسے علم تک نہ ہوا تھا اور آج وہ عام، احمق، بے وقوف لڑکیوں کی طرح اپنے نصیبوں کو رو رہی تھی۔ آنے والے دنوں کے خوف سے لرز رہی تھی۔ جب ہر کسی کو اس کی حالت کا علم ہونا تھا، جب ہر جگہ اس کا تماشا بننا تھا۔ جگ ہنسائی ہونی تھی۔

دماغ میں بپا ہوتی قیامت سے گھبرا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بری طرح بھاگتی ہوئی وہ کچن میں جا پہنچی۔

ایک ایک کر کے سارے کیبنٹ اس نے پاگلوں کی مانند کھولے پھر ایک کیبنٹ میں رکھی شیشی پر اس کی نظر جم گئی۔

وہ کیڑے مار دوا کی بوتل تھی۔ اس کے احمقانہ فیصلوں کی فہرست کا یہ شاید آخری فیصلہ تھا۔ کارک ہٹا کر وہ شیشی سے منہ لگا چکی تھی۔ موت گھونٹ گھونٹ اس کا سینہ کاٹتی اندر اتر رہی تھی۔

ایک دلدوز چیخ اس کے لبوں سے نکلی تھی۔



بک شاپ پر کافی مغز ماری کے بعد بالآخر اس نے مستنصر حسین تارڑ کی کتابوں کا سیٹ پیک کروا لیا تھا۔

"حد ہو گئی۔" پرس سے پیسے نکالتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ "آنے سے پہلے کم از کم شیروز کو فون کر کے ان کے پسندیدہ مصنف کا نام ہی پوچھ لیتی۔ اتنی خواری تو نہ ہوتی۔ اور پھر کیا خبر یہ کتابیں ان کے پاس پہلے سے ہی موجود ہوں۔ اتنی بڑی الماری بھر کر رکھی ہے دُنیا جہاں کی کتابوں سے۔"

اپنا پیکٹ اٹھا کر وہ بک شاپ سے باہر نکل آئی تھی۔

بہت دنوں سے اسے ندامت سی تھی۔ اس دن دعوت میں خالی ہاتھ جا کر اسے کس قدر شرمندگی ہوئی تھی۔ نہ پھول، نہ کوئی کارڈ۔ تحفہ تو بہت دور کی بات تھی۔ واپس آ کر بھی وہ کتنے ہی دنوں سے اسی بے چینی کا شکار تھی۔

"کیا سوچتے ہوں گے وہ لوگ۔ اتنی قریبی ہمسائی، اتنے دنوں کا تعلق، اور جھوٹے منہ مٹھائی تک کو نہ پوچھا۔ دعوت اُڑا کر واپس چلی آئی۔"

سو بہت دن بے چین رہ کر وہ نجمہ خاتون سے اجازت لے کر فیروز احمد کے لیے کوئی اچھا سا گفٹ خریدنے کے لیے چلی آئی تھی۔ اور اس زاہد خشک کے لیے کتابوں سے بڑھ کر قیمتی تحفہ بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ یہی سوچ کر وہ بک شاپ میں داخل ہو گئی تھی اور بھرپور گھنٹہ لگا کر بالآخر اس نے کتاب سلیکٹ کی تھی۔

گھر آتے ہی اس نے پیکٹ نجمہ خاتون کو تھمایا اور خود فون کی جانب بڑھ گئی۔

''ہیلو شہروز۔'' سلسلہ ملنے پر وہ بولی۔ ''کیا حال ہے؟۔''

''قرب قیامت ہے۔'' جواب آیا۔ ''جوان جہاں لڑکیاں اکیلی بازاروں میں گھومتی ہیں۔''

''کیا مطلب ہے۔'' اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''کبھی کوئی سیدھی بات بھی اس عجیب و غریب زبان سے نکلتی ہے یا نہیں۔ اور یہ تم نے میری جاسوسی کب سے شروع کر دی ہے؟۔''

''جاسوسی نہیں چوکیداری!'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''جب تک پڑوسن اپنے گھر کی نہ ہو جائے محلے کے لڑکوں پر اس کی حفاظت کی نگرانی فرض ہے۔''

صبا کو ہنسی آ گئی۔

''اچھا محلے کے لڑکے! یہ بتاؤ تمہارے گھر کی لائبریری میں کون کون سے رائٹرز کی کتابیں موجود ہیں؟۔''

''فیروز بھائی کو بلاؤں؟۔'' وہ رازدار ہوا۔

''یہ کیا مذاق ہے؟۔'' وہ برا مان گئی۔ ''میں تم سے پوچھ رہی ہوں تم کیا ہانک رہے ہو۔''

''میرا مطلب ہے آپ کا سوال خاص الخاص ان کے شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔''

''ہائی داوے آپ کا شعبہ کیا ہے؟۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''چوکیداری۔ ہر طرح کی۔ کوئی خاص قسم کی انفارمیشن درکار ہو تو بندہ حاضر ہے۔''

''دیکھو۔ میں نے فیروز صاحب کے لیے مستنصر حسین تارڑ کی کتابوں کا سیٹ خریدا ہے۔'' بالآخر وہ ہار مان کر بولی۔ ''اب پتا نہیں ان کے پاس یہ کتابیں پہلے سے موجود ہیں یا نہیں۔ اگر یہ سیٹ ان کے پاس بھی ہے تو میں کتابیں چینج کروا لوں گی۔''

''اجی اس کی فکر چھوڑیے۔'' اس کی پوری بات بغور سن کر وہ بے فکری سے بولا۔ ''ان کے پاس پہلے سے یہ سیٹ ہوا بھی تو وہ پہلی فرصت میں دریا برد کر آئیں گے اور آپ کا تحفہ جھاڑ پونچھ کر مخملیں جزدان میں لپیٹ کر اپنے سرہانے سجا لیں گے۔ سونے سے پہلے اور جاگنے کے بعد دیدار سے باشرف ہوا کریں گے۔ آپ آنکھیں بند کر کے تحفے لے آئیں۔ میں انہیں آگاہ کرتا ہوں کہ نہا دھو کر خوشبو لگا لیں۔''

''بکو مت شہروز!'' اس کا ضبط جواب دے گیا۔ ''تم سے تو بات کرنا اور اپنی بات کا صحیح جواب حاصل کرنا گویا جوئے شیر لانا ہے۔''

''لیجیے! یعنی بندے کے خلوص کی یہ قدر؟۔ اس قدر سوچ بچار کے بعد ہر طرح کے امکانات آپ کے گوش گزار کیے اس پر بھی یہ گلہ؟۔''

صبا نے جل کر فون بند کر دیا۔

''بدتمیز کہیں کا۔ تنگ کرنے پر آئے تو صبح سے شام کر دیتا ہے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر آئی تھی۔

''شہروز سے بات کر رہی تھیں؟۔'' نجمہ خاتون نے مسکرا کر پوچھا۔

''جی ہاں۔ بلا کا شیطان ہے یہ لڑکا۔ بات کو یوں گول مول کرتا ہے کہ سرا ڈھونڈنا مشکل ہو جائے۔ میں نے صرف اتنا دریافت کیا تھا کہ

ان کی لائبریری میں یہ کتابیں ہیں یا نہیں۔اس نے داستان زلیخا چھیڑ دی۔بات کا جواب پھر بھی نہیں دیا۔"

نجمہ خاتون ہنس دیں۔

"چلو اب آئی ہو تو ترود کیسا۔شام کو جا کر دے آنا۔"

"جی ہاں۔یہی کروں گی!" اسے اب تنک خستہ تھا۔

"چلو اب کھانا کھا لو۔بغیر ناشتے کے ہی نکل کھڑی ہوئی تھیں۔"

"آپ نے کھا لیا؟۔"

"نہیں۔تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔اکیلی گھر سے نکلتی ہو تو میری نظریں گیٹ پر ہی لگی رہتی ہیں۔کسی کام میں جی نہیں لگتا۔"

"امی!" اس نے لاڈ سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔"ذرا سا تو فاصلہ ہے۔آپ یونہی پریشان ہو جاتی ہیں۔"



دوپہر کا کھانا کھا کر وہ کتابیں لے کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

کتابیں احتیاط سے بیڈ پر رکھ کر اس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز سے اپنا قلم نکالا اور چند لمحوں تک اس کا سرا دانتوں میں دبائے کچھ سوچتی رہی۔

"کیا لکھوں۔جو محض خلوص کو واضح کرے اور..... بہت سے جذبوں کو چھپا جائے۔یہ لفظ بھی بڑے چالاک ہوتے ہیں۔کہیں کوئی شرارت نہ کروا لیں۔"

"بہت سوچ بچار کے بعد اس نے کتابیں خوب صورت سے پیپر میں پیک کیں اور اس پر لکھا۔

"نیک تمناؤں کے ساتھ۔حبا۔"

"ان چند لفظوں میں بھی وہ بڑی دیر تک کچھ کھوجتی رہی پھر مطمئن ہو کر پیکٹ سرہانے رکھا اور لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

شام کو اس کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی تھی۔ہاتھ بڑھا کر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ آن کیا اور ذرا ذرا سی کھلی ہوئی آنکھوں سے ٹائم دیکھا۔

"اوہو۔سات بج گئے۔" وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔"امی نے بھی نہیں جگایا۔"

"بستر سے اٹھ کر اس نے لائٹیں آن کیں اور پردے ہٹا دیے۔

شہروز کی طرف بھی جانا ہے۔"

اس نے ایک نظر سرہانے رکھے پیکٹ پر ڈالی اور باتھ روم میں گھس گئی۔نہا دھو کر اس نے شام کی مناسبت سے کپڑوں کا انتخاب کیا اور تیار ہو کر کمرے سے نکل آئی۔

امی۔ میں ذرا شہروز کی طرف جا رہی ہوں۔" وہ کچن کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔

"چائے تو پی لو۔ تیار ہے۔"

"چائے جتنا بائی کے ہاتھوں کی۔" وہ مسکرا دی۔

"اچھا۔ جلدی آ جانا۔ تمہارے ابو آتے ہوں گے۔"

"جی!" وہ سعادت مندی سے سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔

"گیٹ تک پہنچ کر اس نے لاک کھولا ہی تھا کہ باہر گاڑی کا ہارن سن کر چند لمحوں کے لیے اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی۔

"یہ عین وقت پر۔" اسے سخت کوفت ہوئی تھی۔ ناچار گیٹ کھول کر ایک طرف کو ہو گئی۔

"السلام علیکم۔" اندر داخل ہوتے ہوئے وہ شگفتہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" وہ بجھے بجھے انداز میں بولی۔ "تشریف لائیں۔"

"کہاں کی تیاریاں ہیں۔" اس نے اسے بغور دیکھا۔ "کہیں سالگرہ وغیرہ کا پروگرام ہے؟" اس کے ہاتھ میں گفٹ پیک دیکھ کر وہ بھی سمجھا تھا۔

"نہیں۔" وہ ایک لمحے کو بوکھلائی۔ "یہ تو۔ وہ۔ کسی کا گفٹ ادھار تھا۔"

"اس نے بڑی ملائمت سے ہاتھ بڑھا کر پیکٹ لیا تھا۔ پیکٹ پر صبا کی گرفت خود بخود ڈھیلی ہو گئی۔

"نیک تمناؤں کے ساتھ۔ صبا!" وہ اس پر لکھی ہوئی تحریر باآواز بلند پڑھ رہا تھا۔ "بھی یہ اپنی نیک تمنائیں آپ نے کس کے ساتھ لگا دیں؟ تمناؤں کا سارا اسٹاک تو اب ہمارے لیے مختص ہو جانا چاہیے۔"

"آپ یہیں گیٹ پر ہی کھڑے رہیں گے۔" اس نے بات ٹالی۔ "چلیں اندر چلتے ہیں۔ امی نے ابھی ابھی چائے بنائی ہے۔"

"چلیے!" اس نے پیکٹ اسے تھما دیا اور مسکرا کر اس کے ہمراہ ہو لیا۔

"ارے۔ تم گئیں نہیں۔ اسے آتا دیکھ کر نجمہ خاتون حیرت سے بولیں۔ "ابھی شہروز کا فون آیا تھا۔ میں نے کہا، تمہاری طرف ہی آ رہی ہے۔ ارے دانیال بیٹا! تم کب آئے؟"

اس کے پیچھے پیچھے آتے دانیال پر ان کی نگاہ پڑی تو وہ کھل اٹھیں۔

"بس ابھی۔" وہ مسکرایا۔ "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔" انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "اچھا، میں بھی کہوں، یہ صبا واپس کیسے آ رہی ہے۔"

"جی۔" اس نے ایک نگاہ صبا پر ڈالی۔ "نجانے یہ شیطانی صفت کہاں سے در آئی ہے مجھ میں۔ ان کا اچھا بھلا پروگرام خراب کرنے کے لیے عین وقت پر پہنچ جاتا ہوں۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے۔ یہ پھر چلی جائے گی۔ یہ اسی کا تو گھر ہے۔ چلو تم لوگ اندر بیٹھو، باتیں کرو۔ میں چائے لاتی ہوں۔"

صبا اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

"تشریف رکھیں۔" وہ بتیاں جلانے لگی۔ "اے سی آن کر دوں؟"

"نہیں۔ اچھا بھلا موسم ہے۔" وہ مسکرایا۔

"وہ اس کے مقابل آ بیٹھی۔ پیکٹ گود میں رکھ لیا۔

"تو یہ شہروز کے لیے ہے؟" اس کا دھیان نجانے کیوں وہیں تھا۔

صبا کو الجھن ہونے لگی۔

"نہیں۔ آپ کو اس قدر دلچسپی کیوں ہو رہی ہے۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بول بیٹھی۔

"دل چسپی؟" اس نے بھنویں اچکائیں۔ "مجھے آئے کم و بیش بیس منٹ ہو چکے ہیں اور آپ مسلسل اس شخص کا نام چھپانا چاہ رہی ہیں جس کے نام آپ نے اپنی نیک تمنائیں لکھیں۔ مجھے دلچسپی نہیں الجھن ہے۔"

"اس کا وہی طنزیہ انداز در آیا تھا۔ صبا جل بھن کر خاک ہو گئی۔

"مسٹر دانیال۔" وہ شدت جذبات سے کھڑی ہو گئی۔ "میں نہ آپ سے ڈرتی ہوں نہ ابھی آپ کی پابند ہوئی ہوں۔ اور۔ اور آپ کی ذہنی سطح کو دیکھتے ہوئے شاید مجھے غور کرنا پڑے۔"

"یہی غور شاید مجھے بھی کرنا ہو گا۔" وہ اس کی بات کاٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ کی بے جا آزادی اور بے راہ روی کو دیکھتے ہوئے۔"

"وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن وہ لمحہ بھر میں باہر نکل گیا تھا۔ وہ غصے سے کانپتی رہ گئی۔ پیکٹ اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر ڈالے۔

"بے جا آزادی اور بے راہ روی۔"

اس کے کانوں میں جیسے پگھلا ہوا سیسہ انڈیل گیا تھا وہ۔ ذرا سی بات پر اتنا ہنگامہ کھڑا کر دینے والا یہ شخص نجانے مستقبل کس نہج پر سوچا کرتا تھا۔

نجمہ خاتون ٹرالی کھینچتی اندر داخل ہوئیں تو وہ لبوں کو دانتوں سے کاٹتی گہری سوچ میں تھی۔

"ارے! یہ دانیال کہاں گیا؟" وہ حیران ہوئیں۔

"صبا نے غائب دماغی سے ایک نظر ماں پر دوسری سجی ہوئی ٹرالی پر ڈالی۔ وہ بے حد اہتمام سے چائے لائی تھیں۔"

"چلے گئے!" وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

"چلا گیا؟ یوں اچانک؟"

''کوئی کام یاد آ گیا تھا۔'' وہ اپنی کیفیات متوازن کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''عجب لڑکا ہے۔ میں اتنا کچھ لے کر آئی۔'' انہیں تاسف ہو رہا تھا۔

''لائیے۔ میں اور آپ کھاتے ہیں۔''

اس نے جبراً مسکرا کر ٹرالی کھینچی۔

''تم تو جا رہی تھیں۔ ناں۔'' وہ تھک کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''اب کیا جانا۔'' وہ بڑبڑائی۔

''کیوں؟'' انہوں نے اس کی صورت دیکھی۔

''میرا مطلب ہے دیر ہو گئی ہے۔ کل چلی جاؤں گی۔''

وہ پلیٹ میں کیچپ ڈالنے لگی۔

شامی کباب کا ذائقہ اسے تلخ محسوس ہوا اور چاکلیٹ کیک کا زہر تر۔ لیکن وہ چائے کے گرم گھونٹوں سے ہر شے اندر اتارتی رہی۔



پھٹی ہوئی آنکھوں سے وہ ایک ٹک چھت پر آہستگی سے گھومتے ہوئے پنکھے کو دیکھ رہی تھی۔ سفید چادر نے اس کے بدن کو سینے تک ڈھانپ رکھا تھا اور بے داغ، اجلی چادر میں لپٹا اپنا وجود اسے ایک لاش کی مانند بے جان اور یخ بستہ محسوس ہو رہا تھا۔

آنکھوں میں ناچتے سفید دائرے مختلف شکلیں بدل بدل کر دکھا رہے تھے اور کانوں میں ہوتی سائیں سائیں نے بیرونی دنیا سے جیسے اس کا رابطہ منقطع کر رکھا تھا۔

اس نے گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھنے کی کوشش کی لیکن جسم میں کسی بھی جنبش کی سکت نہ تھی۔ تھک کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

چند لمحوں بعد ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا تھا۔ الماس یونہی آنکھیں موندے پڑی رہی۔

کسی نے اس کا ٹمپریچر اور بی پی چیک کیا۔

''ہوں۔ ناؤ شی از آل رائٹ۔'' مطمئن سے انداز میں کہا گیا تھا۔ ''غنودگی ہے۔ کچھ دیر بعد بالکل ہوش آ جائے گا۔''

''اب تو..... کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے؟'' عثمان خان کی آواز تھی۔

''نہیں۔'' وہ یقیناً کوئی ڈاکٹر تھا۔ ''معجزہ ہی سمجھو ان کا بچ جانا۔ بہر حال ہمیں ان کا حمل ضائع ہو جانے پر افسوس ہے۔ فرسٹ ٹائم ہوئی تھی پریگننسی۔؟''

''ہوں۔'' عثمان خان نے قدرے تامل کیا تھا۔

''اوہ۔ ویری سوری۔ میں تو اب تک یہ نہیں سمجھ پایا کہ یہ اتنی زہریلی دوا فلط تھی میں بھی اتنی زیادہ مقدار میں کیسے پی گئی تھی؟ تم نے اچھا

کیا میرے پاس لے آئے۔ ورنہ تو کوئی بھی ڈاکٹر خودکشی کا کیس ہی سمجھتا۔ کزن ہیں ناں تمہاری؟۔"

"ہاں۔ یار سراج! بات آؤٹ نہ ہو۔" عثمان خان کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"ڈونٹ وری عثمان! اٹس سب سمجھتا ہوں۔ ان کے شوہر کہاں ہیں؟۔"

"وہ باہر ہوتے ہیں۔"

"آئی۔ سی۔ اطلاع دی ان کو؟۔"

عثمان خان چند لمحوں کے لیے خاموش رہے۔

"اوکے ڈاکٹر خان۔" وہ شاید خود ہی کچھ بھانپ گیا تھا۔ "میں ذرا راؤنڈ لے لوں۔ تم چاہو تو گھر جا سکتے ہو۔ یہاں ان کی لک آفٹر کا پورا انتظام ہے۔"

"ہاں۔ مجھے جانا ہے۔ گھر والوں کو خیر خیریت کی اطلاع دینی ہے۔ پھر وہ بھی ان سے ملنا چاہیں گے۔"

"ملاقات کا وقت شام چھ بجے کے بعد ہے۔" وہ جاتے جاتے مطلع کر رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں۔"

دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔

عثمان خان سامنے ہی کھڑے تھے۔ اس کی جانب پشت کیے باہر کھلتی کھڑکی میں کھڑے نجانے کیا دیکھ رہے تھے۔

"عثمان!" اس نے بمشکل انہیں پکارا تھا۔

"وہ آہستگی سے مڑے اور اسے دیکھنے لگے۔ پھر آہستہ آہستہ چلتے اس کے قریب آ گئے۔

"کیسی ہیں آپ؟۔" ان کا لہجہ نرم تھا۔

"کیوں بچایا مجھے؟۔" اس کا گلا رندھ گیا۔ "مر جانے دیا ہوتا۔"

"مرنے کا۔ اپنا اپنا وقت مقرر ہے سب کا۔" وہ ہولے سے بولے۔ "اور کوئی اپنے وقت سے پہلے نہیں مر سکتا۔ آپ کے حصے کی زندگی جتنی ہے وہ آپ نے ہی گزارنی ہے۔"

"ذلت و رسوائی سے بھری زندگی میں نہیں گزارنا چاہتی۔" وہ سسکی۔

وہ لب بھینچ کر رہ گئے۔ غالباً اس کی حالت کے پیش نظر کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"شام کو سب لوگ آپ سے ملنے آئیں گے۔" کچھ دیر بعد وہ بولے۔ "پہلے بھی آئے تھے لیکن آپ ہوش میں نہیں تھیں۔"

"میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔ کسی کا سامنا کرنے کی سکت نہیں ہے مجھ میں۔"

"گزری ہوئی باتوں کو بھلا کر نارمل ہونے کی کوشش کریں الماس۔" انہوں نے اس کا ہاتھ تھپکا۔ "اس قدر حساسیت کا مظاہرہ کریں گی تو

جینا تو مشکل کر دے گا۔"

"گزری ہوئی۔" اس نے تھوک نگلا۔ "باتوں کو بھلانا آسان ہوتا ہے عثمان؟"

"ناممکن بھی نہیں۔ اب آپ آرام کریں۔" پھر انہوں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ "زیادہ سوچنے کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس سکون سے سو جائیں۔ ہم سب شام میں آئیں گے۔ میں ڈیوٹی پر موجود نرس کو بھیج رہا ہوں۔ وہ آپ کا خیال رکھے گی۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ مڑے اور باہر نکل گئے۔

ایک غمگین مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ اور دو آنسو چپکے سے تکیے میں جذب ہو گئے۔

جس طرح سے وہ موضوع بدل گئے تھے اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کے سوال کی تہہ میں موجود اصل سوال کا مفہوم بھانپ گئے تھے۔

"اس کی تلقین کرتے ہو۔ جو تمہارے اپنے بس میں نہیں ہے۔ بھلانا ناممکن نہیں تو تم کیوں نہیں بھلا دیتے میرے ماضی کو۔ بہت تنگ بنتے ہو ناں۔ بڑے حوصلے اور تحمل کا مظاہرہ کرتے ہو ہر موقع پر۔ پھر وہ ثبوت اپنے دیالو پن کا ہے حوصلہ میرا ماضی فراموش کر کے مجھے اپنا لینے کا؟ میری خطائیں بخش دینے کا۔ نہیں ناں؟ پھر مجھے کیوں جھوٹی تسلیاں دیتے ہو؟ زندگی کی نوید سناتے ہو۔ تم جھوٹے ہو عثمان خان۔ وہ ظلے ہو۔"

وہ بے آواز رو رہی تھی۔ ڈیوٹی پر موجود نرس جانے اب تک کیوں نہیں آئی تھی۔ ہاسپٹل کے کمرے میں تن تنہا وہ کبھی خود سے کبھی قسمت سے جھگڑ رہی تھی۔



وہ بڑے منہمک سے انداز میں اگلے دن کے لیے کپڑے پریس کر رہی تھی۔ جب انعم پیچھے سے آ کر اس سے لپٹ گئی۔

"تمہیں اماں بلا رہی ہیں۔"

"اماں! مجھے۔" اسے حیرت ہوئی۔

"اماں نے عرصہ ہوا اس سے لاتعلقی اور بیگانگی کا رشتہ قائم کر رکھا تھا۔ جب سے راحیہ کی ماں کے سامنے وہ اپنے حواسوں سے باہر ہو کر چیخی چلائی تھی۔ تب سے اماں نے اس سے بات کرنا تو کجا اس کی جانب دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

"کیوں بلا رہی ہیں؟"

"پتا نہیں۔ کوئی کام ہوگا۔" وہ دیوار سے چپکی کھڑی تھی۔ ساتھ ساتھ دائیں بائیں ہل رہی تھی۔

"کوئی ملنے آیا ہے؟"

"نہیں تو۔ اکیلی ہیں۔"

"اچھا۔ ان سے کہو ابھی آتی ہیں۔" وہ قمیص ہینگر میں لگانے لگی۔

انجم دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔ نیلم مسلسل ایک گہری سوچ میں تھی۔ اماں کا پیغام یونہی نہیں آیا تھا۔ یقیناً انہیں کوئی ضروری کام تھا۔

وہ استری کا پلگ نکال کر دوسرے کمرے میں چلی آئی۔ اماں کمرے میں اکیلی تھیں۔ بستر پر لیٹی دیوار کو گھور رہی تھیں۔

''کوئی کام ہے اماں؟'' وہ نشاط انداز میں پوچھنے لگی۔

''ہاں۔'' وہ اٹھ کر بیٹھنے لگیں۔ ''بیٹھو۔ کھڑی کیوں ہو۔ کچھ ضروری کام کر رہی تھیں؟''

''نہیں۔'' وہ مختصراً کہہ کر ان کے پائنتی پر بیٹھ گئی۔

''ریشم، مریم کیا کر رہی ہیں؟'' کچھ دیر خاموش رہ کر انہوں نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ شاید کچن میں ہوں۔''

اسے الجھن ہونے لگی۔ آخر وہ کیا بات تھی جو اماں کرنا چاہ رہی تھیں اور کر نہیں پا رہی تھیں۔ آخر وہ اس سے نظر کیوں چرائے ہوئے تھیں۔

''کیا بات ہے اماں؟ کوئی خاص بات ہے کیا؟'' بالآخر اس نے بے چینی سے پوچھ ہی لیا۔

''تمہاری چچی آئی تھی کچھ روز ہوئے۔'' قدرے تامل کے بعد اماں نے کہا تھا۔

''اچھا! شبنم نہیں آئی ان کے ساتھ؟''

''نہیں۔ اکیلی ہی تھیں۔ بات کرنے آئی تھیں مجھ سے۔'' اماں رک رک کر بول رہی تھیں۔

اس کا سانس رکنے لگا۔

''کیسی بات؟'' دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے پوچھا۔

''شبنم وہاں خوش نہیں ہے۔ دن رات کڑھتی ہے۔ خون کے آنسو رو رہی ہے میری بچی۔'' اماں آبدیدہ ہو گئیں۔

نیلم کی نظریں بے اختیار جھک گئیں۔ وہ ہونٹوں کو چبانے لگی۔

''نیلم۔ جانتی ہو اس بہن کے دکھ کا سبب تمہاری ہی ذات ہے۔'' اماں نے اچانک سر اٹھا کر سوال کیا تھا۔

''اماں!'' وہ تڑپ اٹھی۔ ''کیوں کہتی ہیں یہی بات بار بار۔ میرے اپنے حصے میں کتنی خوشیاں آ گئی ہیں جو میں آپ کو اس کی مجرم نظر آتی ہوں؟۔ اور خدا گواہ ہے کہ جو کچھ بھی میں نے کیا تھا آپ سب کی بھلائی کے لیے ہی کیا تھا۔''

''جسم کا ایک حصہ تکلیف میں جتا ہو تو باقی حصے سکون محسوس نہیں کرتے نیلم بیٹی۔'' اماں سرد آہ بھر کر بولیں۔ ''میں تو رات رات بھر جاگتی ہوں، بے چین رہتی ہوں۔ نجانے کیسی بھلائی تھی جو تم نے سب کے ساتھ کی۔ کبھی کچھ پوچھا تو ہوتا۔ کسی مشورے کے قابل تو جانا ہوتا۔ اچھے تیئں تم نے سب کا مسیحا بننے کی جو کوشش کی اس سے کسی کو نفع نہیں پہنچا۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ خوش تو یقیناً تم بھی نہیں ہو لیکن اس میں کسی اور کا دوش نہیں۔ فیصلہ قطعی طور پر تمہارا ذاتی تھا۔ تم کسی کو الزام نہیں دے سکتی لیکن بہت سے لوگ ایسے ہیں جو رات کے اندھیروں میں روتے ہیں تو اس فیصلے اور ہٹ دھرمی کو

کوستے ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں بہت سا پانی جمع ہو کر قطرہ قطرہ بہنے لگا۔ یہی چند لفظ تھے اس کی قربانیوں کا صلہ۔ یہی الزامات تھے اس کے ایثار، خلوص اور اپنے گھر سے بے تحاشا محبت کرنے کی جزا۔ یہی اس کی دن بھر کی مشقت کا اجر تھا۔

وہ سر جھکائے ان کے سامنے بیٹھی رہی۔

"ٹھیک ہے تمہارے احسانات ہیں ہم پر۔ دو وقت کی روٹی کا آسرا ہو تم لیکن بیٹی! ماؤں کو بیٹیاں کماتی ہوئی نہیں اپنے گھروں میں بستی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ روٹی دینے کا وعدہ اس رب کریم نے اپنے بندوں سے کیا ہے۔ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ تب بھی ہم لوگ بھوکے نہیں سوئیں گے۔"

نیلم کو اس لمحے اپنا وجود اس قدر ارزاں اور حقیر لگا کہ وہ زمین میں سما جانے کی خواہش کرنے لگی۔

"اماں۔" وہ کپکپاتے لہجے میں بولی۔ "آپ کس طرح خوش اور مطمئن ہو سکتی ہیں؟ بتائیں مجھے۔ اگر مجھے اس کمینے راحیہ کے ساتھ بیاہ کر آپ کی دلی تسلی ممکن ہے تو ٹھیک ہے۔ میں سولی پر چڑھنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ فیصلہ سنا دیں۔"

"اماں نے ایک نظر اس کے بھیگے چہرے پر ڈالی۔ چند لمحوں کے لیے ان کے چہرے پر ندامت اور یاسیت پھیلی پھر انہوں نے نظر پھیر لی۔

"تم۔ غلط فہمی ہو نیلم! وہ قصہ تو کب کا ختم ہو چکا۔" وہ دھیرے سے بولی تھیں۔

"پھر۔" وہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"وہ تو یہی کہتی تھی کہ یہ تمہیدا سے یہاں تک لانے کے لیے ہی باندھی گئی ہے۔ اماں کیا چاہتی تھیں۔ اب وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"پھر یہ کہ...... وحیدہ بیگم تمہارا رشتہ لائی تھیں۔" بات ایسی تھی کہ الفاظ ان کے لبوں پر بار بار دم توڑ دیتے تھے۔

"میرا رشتہ؟ چچی جان؟" وہ سخت اچنبھے کا شکار تھی۔ "کس کا رشتہ لائی تھیں وہ؟"

"یوسف میاں کا۔!"

"چھت جیسے دھڑام سے اس پر آگری۔ وہ پتھر کا بت بن گئی۔ نہ حیرت کے اظہار کی سکت تھی نہ مزید کسی استفسار کی۔ وہ ایک ٹک ان کا چہرا دیکھ رہی تھی۔

"یوسف میاں شبنم کو کوئی خوشی دینے کے قابل نہیں۔ انہیں محض۔ تمہاری۔" وہ خود بھی جھینپ گئیں۔ "وہ کہتے ہیں نیلم راضی ہو جائے تو وہ شبنم کو آزاد کر دیں گے۔ تمہاری ایک ہاں، سے، بہت سوں کے مقدر بدل جائیں گے۔"

"اماں۔" وہ بہت دیر کے بعد کچھ کہنے کے قابل ہوئی تھی۔ "اتنا بے وقعت، اتنا ارزاں ہے میرا وجود آپ کے لیے۔"

"نہیں نیلم۔ تم بھی میری بیٹی ہو، میری ذات کا حصہ۔"

"نہیں ہوں میں آپ کی بیٹی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "نہیں اماں۔ کب بیٹی سمجھا مجھے آپ نے۔ میں تو ایک قابل نفرین شے ہوں جسے اپنی بیٹی کی رہائی کے عوض آپ اس شخص کے منہ پر مارنا چاہتی ہیں۔"

"وہ شخص۔تمہاری ہی پسند تھا۔" اماں کی آواز بھی بلند ہوگئی۔

"خدارا اماں! فراموش کردیں میری اس خطا کو۔ ہر چند کہ آپ اپنے اس دعوے کے جواب میں میرے ایک لفظ کا حوالہ نہیں دے پائیں گی۔ پھر بھی میں اپنا یہ گناہ تسلیم کرتی ہوں لیکن یہ سوچیے اماں کہ زندگی کتنے رخ بدل چکی ہے۔ کیا رشتہ بنتا ہے اب میرا اس شخص سے۔ اور میں اسے اب وہ مقام نہیں دے سکتی، کبھی بھی نہیں۔ شبنم کی رہائی ہی اس کی خوشی ہے تو احمد شوق اپنی خوشی پوری کرلے۔ میری قربانی اس سلسلے میں کیوں ضروری ہے اماں؟۔"

"چلا دوست نیلم!" اماں کا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔ "میں نے تمہیں کوئی گولی نہیں ماری ہے۔ ایک بات ہی کہی ہے۔"

"کاش کہ آپ مجھے گولی مار دیتیں۔" وہ روتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

دروازے کے دائیں بائیں کھڑی ریشم اور مریم نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ اندر اماں اپنا سر تھامے بیٹھی تھیں۔



"کیا بات ہے جناب۔ گھر جانے کا ارادہ نہیں لگتا۔" عباسی صاحب نے بریف کیس میں چند فائلیں رکھتے ہوئے، اسے دیکھ کر خوش دلی سے کہا۔

"وہ جو خالی الذہنی کی کیفیت میں میز کی چمکتی سطح کو گھور رہی تھی، چونک اٹھی۔

"جی۔ کچھ کہا سر آپ نے؟۔" وہ خالی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"مزاج بخیر ہیں؟۔" انہوں نے بھنویں سکیڑیں۔

"جی۔ جی!" اس نے ہولے سے سر ہلایا۔

"لگتے تو نہیں۔" وہ ہولے سے مسکرائے۔ "میں نے پوچھا تھا، گھر جانے کا ارادہ ہے یا نہیں۔ آفس کا ٹائم کب کا ختم ہو چکا۔ آپ اب تک مستقل مزاجی سے اپنی سیٹ پر بیٹھی ہیں۔"

اس نے ایک نگاہ دیوار گیری گھڑی پر ڈالی اور ایک گہری سانس بھر کر بے دلی سے اپنا بیگ کھول کر چیزیں رکھنے لگی۔

"نیلم! کیا بات ہے؟۔" وہ بغور اس کی کیفیات کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ "آج صبح سے آپ اسی بے دلی کی کیفیت کا شکار ہیں۔ کوئی مسئلہ ہے؟۔"

نیلم نے ایک نظر ان پر ڈالی۔ اس کے اندر دھواں بھرا ہوا تھا اور وہ اس دھوئیں کو باہر کی راہ دکھانے پر مصر نظر آتے تھے۔

"کچھ نہیں سر۔ بس گھر جانے کو جی نہیں چاہتا۔" اس کے لہجے میں قدرے تلخی در آئی۔

"تو نہ جائیں۔" ان کے لبوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "کون مجبور کر رہا ہے؟۔"

"بھیڑ بکریوں کی یہی فطرت بنائی ہے خدا نے۔ اور یہی قسمت۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ "شام ہوتے ہی اپنے اپنے کھونٹوں کی

طرف خود بخود چل پڑتی ہیں۔"

"چچ چچ چچ۔ کیوں اتنا ڈی گریڈ کررہی ہو خود کو۔" ان کا لہجہ سنجیدہ اور بے حد ملائم ہوگیا۔ "چلو اٹھو تمہیں اس وقت کھلی فضا میں جانے کی سخت ضرورت ہے۔ بہت ڈپریسڈ ہورہی ہو۔"

"سوچوں پر غبار چھایا ہو اور دل میں حبس ہی حبس ہو تو کھلی فضا بھی انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں سر!" وہ جنوز اپنی جگہ بیٹھی ایک ہی ٹون میں بات کررہی تھی۔

"کم آن نیلم۔ مت سوچا کرو اتنا۔ چلو اٹھو۔ میرے ساتھ آؤ۔"

اس نے ایک نگاہ ان کے چہرے پر ڈالی اور میکانکی انداز میں کھڑی ہوگئی۔

کچھ دیر بعد وہ ان کے اپارٹمنٹ میں تھی۔ کھڑکی کے شفاف شیشوں سے پرے جھاگ اڑاتی اور ساحل پر سر پٹختی موجوں کو دیکھ رہی تھی۔

اپنے پیچھے ہونے والی برتنوں کی کھنک نے اس کی سوچوں کا سلسلہ توڑ دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ میز پر چائے کے برتن رکھ رہے تھے۔

"آؤ نیلی۔ چائے پیتے ہیں۔"

کوٹ اور ٹائی کے بغیر، شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک موڑے ہوئے وہ اپنی عمر سے قدرے کم نظر آرہے تھے۔ بکھرے بالوں کے ساتھ، چائے کپوں میں ڈالتے ہوئے وہ نیلم کو بہت بے ضرر سے محسوس ہوئے۔ ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر در آئی۔

آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"کتنی چینی ڈالوں؟"

عباسی صاحب نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔

"ہوں۔ ویٹس گڈ! ایسا نارمل بی ہیویئر بس کبھی کبھی ہی دیکھنے میں آتا ہے۔" انہوں نے چمچ ہلاتے ہوئے کپ اس کی طرف بڑھایا۔

"نارمل بی ہیو کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہے سر۔ اگر انسان کے حالات نارمل رہیں تو۔"

"اوہو۔ کیوں اتنی گہرائی میں جا کر سوچتی ہو۔ کیوں اتنا سیریس لیتی ہو ہر بات کو۔ اونچ نیچ ہر کسی کے رستے میں ہوتی ہے۔ سیدھی، متوازن شاہراہ بہت کم لوگوں کا نصیب ہوتا ہے بس یہ سوچا کرو کہ سب ٹھیک ہے۔ سب کچھ نارمل ہے۔"

"دراصل آپ اس گھر میں نہیں رہتے جس میں میں رہتی ہوں۔" وہ قدرے تلخی سے بولی۔

"ہوں!" وہ کچھ سوچ کر مسکرائے۔ "میں تو ایسا ہی چاہتا ہوں۔"

"وہ اپنی ہی سوچوں میں گھری تھی۔ ان کی بات پر غور نہ کرسکی۔

"اماں چاہتی ہیں۔ میں یوسف سے شادی کرلوں تاکہ شبنم آزاد ہوکر واپس لوٹ سکے۔"

"اوہ!" وہ سیریس ہوگئے۔ "تو یہ مسئلہ ہے۔"

"بات یہ نہیں ہے سر! کہ بہن کی خاطر یہ قربانی دینے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔ بات یہ ہے کہ بلیک میل ہونا مجھے کسی صورت منظور نہیں۔ ایک بار پہلے بھی اس نے مجھے اسی طرح بلیک میل کرنا چاہا تھا۔ جب مجھ سے منگنی ہونے کے باوجود اس نے شبنم کا ہاتھ طلب کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا۔ اس طرح میں جھک جاؤں گی۔ مجبور ہو کر اس سے فوری شادی پر رضامند ہو جاؤں گی۔ لیکن اس کے اس طرز عمل نے اسے میری نظروں میں ہمیشہ کے لیے گرا دیا۔ وہ میرے دل سے، میرے جذبوں سے، بہت دور ہو گیا۔ میری انا، میرا وقار، کسی اور کی نظر میں نہ سہی، میری اپنی نظر میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ میرے مشکل وقت میں مجھ سے نظر پھیر لینے والا آج پھر پرانا تعلق استوار کرنے کا متمنی ہے لیکن میرے اور اس کے درمیان اب صدیوں کا فاصلہ حائل ہو چکا ہے۔ اب میں اپنی ذات ہرگز اس سے وابستہ نہیں کر سکتی۔

شبنم اس کے ساتھ خوش نہیں ہیں اسی لیے اماں اسے واپس لانا چاہتی ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتیں کہ کیا میں اس کے ساتھ خوش اور مطمئن رہوں گی؟۔ وہ میری انا کا قاتل ہے، میری بہن کی معصوم زندگی سے کھیلنے والا، اسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنے گھر لے جانے والا دھوکے باز شخص ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس سے وابستہ ہونے سے بہتر میں یہ سمجھتی ہوں کہ کسی گندے نالے میں گر کر مر جاؤں۔ میری بہن کو تڑپا تڑپا کر وہ مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔ جب میں خود اس کی دسترس میں ہوں گی تو وہ کیا نہ کرے گا۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہر کوئی مجھے خود غرض، ہٹ دھرم اور ضدی سمجھ کر مجھ سے متنفر ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں، کہاں جاؤں۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رو دی۔

"ٹیک اٹ ایزی۔ ٹیک اٹ ایزی۔" وہ سرک کر اس کے قریب ہو گئے۔ "اس طرح خود کو مزید ہلکان نہ کرو۔"

"اپنا بازو اس کے شانے کے گرد پھیلائے وہ اسے تھپک رہے تھے۔

"میں بہت تھک چکی ہوں۔" وہ سسک رہی تھی۔

"تمہارے بوجھ اٹھانے کو میرا شانہ حاضر ہے نیلی!" ان کی آواز گمبھیر ہو گئی۔ "اپنے دکھ مجھے دے کر تم شانت ہو جاؤ۔ میں تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا جانو! تم بہت عزیز ہو مجھے۔ آئی۔ آئی۔"

"وہ اچانک ہی ان سے دور ہو گئی۔ ان کا بازو اپنے کاندھے سے ہٹا کر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ ان کے لہجے کی گرمی نے اسے ان کی قربت کا احساس دلایا تھا۔

"آئی ایم ساری۔" دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولی۔ "میں کچھ جذباتی ہو گئی تھی۔"

"کیا برائی ہے۔" وہ مسکرائے۔ "جذبات بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مجھے تمہاری جذباتیت ہی تو پسند ہے۔ پتا ہے نیلی! تم مجھے معصوم چڑیا جیسی لگتی ہو جو بارش سے بھیگ کر کسی شاخ پر بیٹھی کانپ رہی ہو۔ میرا دل چاہتا ہے تمہیں اپنی ہتھیلیوں میں نرمی سے محفوظ کر لوں۔ تمہارے سارے دکھ، ہر خوف ہمیشہ کے لیے دور کر دوں۔"

حیا سے اس کے چہرے پر رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔

"آپ کی۔ چائے۔ ٹھنڈی ہو گئی ہے۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"مگر میں اندر تک دہک اُٹھا ہوں۔" وہ اس کا چہرا دیکھ کر دیوانے سے ہو گئے۔ "مجھے خود سے دور کر کے یوں نہ تڑپاؤ نیلی۔ اپنی قربت کی نرم پھوار سے۔"

انہوں نے اس کے ہاتھ تھام کر اسے خود سے قریب کر لیا۔

"میرا تن من بھگو دو نیلی۔"

"سر۔" وہ سخت بدحواس ہو گئی۔ "یہ۔ یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔"

"کچھ نہ بولو۔ بس مجھ میں سما جاؤ۔ ہمارے دُکھوں کا یہی علاج ہے۔"

وہ خود کو ان کی گرفت سے آزاد کرانے میں ناکام ہوئی جا رہی تھی۔ وہ سوئٹ، مکمل تنہائی اور ایک جنونی شخص کی خواہشات کی مضبوطی کا خیال اسے دہشت زدہ کر چکا تھا۔

گھٹی گھٹی چیخیں اس کے لبوں سے برآمد ہوئیں۔ سخت قسم کی مزاحمت سے اس کی کانچ کی چوڑیاں ٹوٹ کر اس کی کلائی زخمی کر گئی تھیں۔

"نیلی۔ نیلی۔ ڈونٹ کرائی ڈیر۔" وہ اسے راہ پر لانے کی ہر ممکن کوشش میں تھے۔

چند لمحوں کے لیے وہ خود کو چھڑا پائی تھی۔ لیکن جونہی وہ اٹھ کر بھاگنے لگی، انہوں نے پیچھے سے اس کا دوپٹا جکڑ لیا۔ نیلم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ میز پر رکھی کیتلی اُٹھا کر ان پر الٹ دی۔ گرم گرم بھاپ اڑاتی چائے نے ان کا چہرہ جھلسا دیا۔

ایک کراہ کے ساتھ اُنہوں نے بے اختیار اس کا دوپٹا چھوڑ دیا۔ اس کے لیے بس اتنا ہی موقع کافی تھا۔ دیوانہ وار بھاگتی وہ کمرے سے نکل گئی۔

"نیلم۔ نیلم۔ رُک جاؤ۔" وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکے۔

لیکن وہ کمان سے چھوٹے تیر کی مانند مرکزی دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ کنڈی گرا کر اس نے ناب گھمائی تو وہ اپنی جگہ پر رُک گئے۔

"نیلی۔ بات تو سنو۔"

اس نے مڑ کر دیکھے بغیر باہر نکل کر دروازہ بند کیے بغیر تیزی سے سیڑھیوں کا رُخ کیا۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ کسی سے بری طرح ٹکرائی تھی۔ مقابل کو قطعی اندازہ نہ تھا کہ کوئی مخالف سمت سے آندھی طوفان بن کر اس پر حملہ آور ہوگا۔ وہ اسی سیڑھی پر اور نیلم اگلی دو سیڑھیاں پار کر کے زمین بوس ہوئے۔ جبکہ اس شخص کا بریف کیس بھی نیچے لڑھکتا گیا۔

اس کے حواس بڑی دیر تک بحال نہ ہو سکے۔ آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا تھا۔

"اُٹھیے!" اس غریب نے پہلے خود کو سنبھالا اب اسے سہارا دے کر اُٹھا رہا تھا۔

نیلم نے اُٹھنے کی کوشش کی تو اس کے لبوں سے ایک چیخ نکلی۔ اس کے پیر میں سخت قسم کی موچ آئی تھی۔

''نہیں۔ میں نہیں۔ آہ۔'' وہ کھڑے ہونے کی کوشش میں تکلیف سے دُہری ہوگئی۔

''کیا۔ کیا ہوا ہے؟'' وہ پریشان ہو گئے۔

''موچ آگئی ہے۔'' آنسو ایک تواتر سے بہہ نکلے۔

''اوہ۔ ویری سوری۔'' انہیں افسوس ہوا۔ ''لیکن محترمہ غلطی آپ ہی کی تھی۔ آپ اچانک ہی۔''

''جی۔ میں جانتی ہوں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''اب ذرا ہمت سے کام لیں۔ کون سا فلیٹ ہے آپ کا؟''

''میرا؟ کوئی سا بھی نہیں۔'' اپنی بے بسی کا احساس اسے زاروقطار رلا رہا تھا۔

''ارے! اچھا دیکھیں۔ یوں نہ روئیں۔ آپ جہاں کہیں رہتی ہیں میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔''

نیلم نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس وقت وہ کسی پر بھی بھروسا کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔

''شکریہ!'' وہ یک لخت چپ ہوئی۔ ''میں چلی جاؤں گی۔''

''اس حالت میں؟'' انہوں نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

''جی۔ آپ جائیں۔''

''ایز یو وش!'' انہوں نے کاندھے اچکائے اور اپنے بریف کیس کی جانب بڑھ گئے۔

''اسے ٹھوک بجا کر انہوں نے ایک نگاہ سیڑھی اترنے کی کوشش کرتی نیلم پر ڈالی پھر اوپر جانے لگے۔ اچانک ہی نیلم کو عباسی صاحب کا خیال آیا تھا۔ وہ اب تک فلیٹ میں موجود تھے۔ اس شخص کے جانے کے بعد اگر وہ پھر سے آ جائے تو۔

''سنیے!'' وہ بے اختیار انہیں پکار بیٹھی۔

''جی!'' وہ آخری سیڑھی پر تھے۔

''آپ مجھے۔ بس۔ پہنچا دیں۔ پلیز۔'' اس کے لہجے میں ندامت اور التجا تھی۔

''آف کورس'' وہ پلٹ آئے۔ ''میں نے پہلے ہی کہا تھا۔''

''ان کی مدد سے اس نے بمشکل باقی کی سیڑھیاں پار کیں۔ ہر سیڑھی پر اس کی کراہ پہلے سے زیادہ بلند ہوئی۔

''دراصل لفٹ بھی خراب ہے ناں۔ ورنہ اتنی تکلیف نہ ہوتی آپ کو۔''

''جی!'' اس نے سر ہلایا۔

''کہاں جانا ہے آپ کو؟ میرے پاس گاڑی ہے۔ میں پہنچا دیتا ہوں۔''

''شکریہ۔ مجھے بس ٹیکسی پکڑوا دیں۔ میں چلی جاؤں گی۔''

اسے سوٹ میں ملبوس، اس ویل مینرڈ شخص سے بھی خوف آ رہا تھا۔

"اچھا۔ میں چوکیدار سے کہتا ہوں۔ وہ آپ کو ٹیکسی لا دے گا آپ یہیں ٹھہریں۔"

اسکے لہجے میں بے پناہ نرمی تھی۔ نیلم کو ایک لمحے کے لیے اپنے خیالات پر شرمندگی ہوئی۔

تھوڑی ہی دیر میں چوکیدار ٹیکسی لے آیا۔

"بہروز صاحب نے آپ کے واسطے منگوایا ٹیکسی؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں لالہ۔"



لنگڑاتی ہوئی جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو اماں، مریم اور ریشم حیران پریشان صحن میں کھڑی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر مریم اور ریشم لپک کر اس تک پہنچیں۔

"نیلو۔ نیلو کیا ہوا ہے۔" دونوں نے اسے تھام لیا۔

"کچھ نہیں۔ موچ آ گئی ہے۔" وہ ان کا سہارا لے کر وہیں چارپائی پر بیٹھ گئی۔ "فیکٹری کی سیڑھیوں پر پاؤں پھسل گیا تھا۔

"اتنی دیر کہاں رہیں۔" اماں نے پوچھا۔

لہجے میں خفگی نمایاں تھی۔ ہر چند کہ ان کے چہرے پر اب تک پریشانی برس رہی تھی۔

"آفس میں کام زیادہ تھا۔" اس نے بے اختیار نظریں چرالیں۔ "پھر موچ کی وجہ سے بھی۔ تکلیف کی وجہ سے بھی وہیں بیٹھی رہی۔"

"پڑوس میں فون ہی کر دیا ہوتا۔ آدھا خون خشک ہو چکا ہے میرا۔ اب نفل پڑھوں مانے ہوئے۔ مریم اس کے پیر کی سنکائی کر کے پٹی وغیرہ باندھ دو۔"

وہ اندر جاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"اماں! ہلدی چونا باندھ دوں؟" مریم اس کے سوجے ہوئے پیر کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"ہوں!" وہ صحن پار کر چکی تھیں۔

"توبہ ہے نیلو۔ آج تو آپ نے جان ہی نکال دی۔" ریشم اسکے قریب بیٹھ گئی۔ "ناصر بے چارہ نجانے کہاں ڈھونڈتا پھر رہا ہوگا آپ کو۔"

"ناصر؟" وہ چونکی۔ "وہ کہاں گیا ہے؟"

"اماں نے بھیجا تھا آپ کا پتا کرنے۔ اب تو آتا ہی ہوگا۔"

"اُفوہ۔ بے چارہ۔" وہ کوفت کا شکار ہوئی تھی۔



نہا دھو کر اس نے ہلکی کڑھائی سے مزید گہرا نیلا لباس زیب تن کیا تھا اور آئینے سے پوچھ رہی تھی کہ وہ کیسی لگ رہی ہے۔
دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی وہ چونک اٹھی۔
"کون ہے؟"
"اگلے ہی لمحے دروازہ کھول کر آمنہ اندر داخل ہوئی تھی۔
"ارے آمنہ۔" وہ مسکرا کر آگے بڑھی۔ "تم کب آئیں؟"
"کافی دیر ہو گئی ہے۔ امی نے بتایا تم نہا رہی ہو۔ انتظار طویل ہو گیا تو میں نے سوچا خود دیکھ کر آؤں۔ کہاں کی تیاری ہے؟"
"پھر وہ اس کا سراپا دیکھنے لگی۔
"میں بھلا کہاں جاؤں گی۔" وہ شگفتگی سے ہنس دی۔ "آج الماری صاف کی تو یہ جوڑا ہاتھ لگا۔ جب سے شادی ہوئی ہے، بہت سے کپڑے جوں کے توں رکھے ہیں۔ کہیں آنا جانا تو ہوتا ہے نہیں۔ میں نے سوچا گھر میں ہی پہن لیا کروں۔"
"بالکل ٹھیک سوچا تم نے۔" وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ "ایسے ہی بن سنور کر رہا کرو۔ کتنی پیاری لگ رہی ہو۔"
"شکریہ۔" وہ شرارت سے ہنس دی۔
آمنہ نے غور سے اس کے گالوں پر کھلتے گلاب، ہونٹوں پر چٹکتی کلیاں اور آنکھوں میں چمکتی جوت دیکھی۔
"بھائی جان کب آئیں گے؟" وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی تھی۔
"پتا نہیں۔" وہ بے پروائی سے کہہ کر ڈریسنگ ٹیبل پر بکھری چیزیں درست کرنے لگی۔
"پتا نہیں؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "پھر کس کو پتا ہوگا۔"
"تم کس کے ساتھ آئی ہو؟ مومنہ کہاں ہے؟"
آمنہ کو اپنی بات کا نظر انداز کیا جانا شدت سے محسوس ہوا۔
"ریاض کے ساتھ آئی ہوں۔ بلکہ وہی لائے ہیں اصرار کر کے۔ میں تو مارے حیرت کے بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔"
"حیرت کی کیا بات ہے؟" وہ ہنستے ہوئے اس کے برابر آ بیٹھی۔ "ان کا بھی جی چاہ رہا ہو گا اپنی بیگم کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے نکلنے کا۔"
"بیگم کی ایسی قسمت کہاں۔" وہ زیرلب بولی۔ "نجانے کیا جی چاہ رہا تھا ان کا۔"
شبنم یکلخت خاموش ہوئی تھی۔ آمنہ اس سے کبھی کبھار کوئی ایسی بات کر جاتی تھی جو اسے شش و پنج میں مبتلا کر دیتی تھی۔ نا معلوم اس کے دل میں کیا تھا۔ آیا وہ شبنم کو اپنی ازدواجی زندگی کی الجھنوں اور پریشانیوں کا باعث سمجھ رہی تھی یا انجانے میں وہ سب کچھ بول جاتی تھی جو اسے نظر چرانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ شبنم سمجھ نہیں پائی تھی۔
"تم کیا سوچنے لگیں؟" آمنہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔ "چلو نیچے چلتے ہیں۔"

"آں۔" وہ اپنی سوچوں سے باہر آئی۔ ہاں۔ ہاں۔ چلو!"

"نیچے ریاض بھائی، چچی جان کے پاس بیٹھے تھے، مومنہ ان کے بازوؤں میں مچل رہی تھی۔

"السلام وعلیکم بھائی جان!" اس نے کچن کی طرف جاتے جاتے محتاط انداز میں انہیں سلام کیا تھا۔

"ارے بھئی وعلیکم السلام!" وہ کھل اُٹھے۔ "ارے یہاں تو آؤ۔ ایسی بھی کیا بے رخی۔"

"چائے لے کر آتی ہوں!" اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

جانتی تھی کہ ابھی ان کی بے تاب نظریں اس کے بے سنورے وجود کا بڑی تیزی سے جائزہ لینا شروع کر دیں گی۔ یوسف سے انتقام کے اندھے جذبے سے مغلوب ہو کر کھیل تو اس نے شروع کر دیا تھا۔ لیکن اب آمنہ کا معصوم، بے ضرر وجود اس کی راہ میں حائل ہو رہا تھا۔ اس کی سوال کرتی نظروں کا جواب دینے کی ہمت وہ خود میں خود نہیں پاتی تھی۔

یوسف سے سخت نفرت کرنے کے باوجود وہ آمنہ سے اپنی قلبی لگاؤ کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ چائے کے ساتھ بسکٹ اور مٹھائی لے کر وہ کچن سے نکلی تو چہرے پر سنجیدگی کی گہری چھاپ تھی۔ ریاض بھائی کی طواف کرتی نظروں کا اس نے قطعاً کوئی نوٹس نہ لیا۔

"کیا بات ہے امی!" ریاض بھائی چچی کی طرف رازدارانہ انداز میں جھکے۔ "ساس بہو میں کوئی نوک جھونک چل رہی ہے کیا؟"

"کیا مطلب؟" چچی نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"دیکھیے نا۔ یہ اپنے چہرے پر کیسی سنجیدگی طاری کیے بیٹھی ہے جیسے سخت ناراض ہو۔"

"مٹھائی لیجیے بھائی جان!" اس نے ان کے مذاق کو نظر انداز کر کے پلیٹ بڑھائی۔

"ارے بھئی شبنم۔ تم ایک ذرا مسکرا دو۔ خدا کی قسم اس چہرے کے ساتھ یہ مٹھائی مزا نہ دے گی۔ کیا ہم سے کچھ خطا ہوئی ہے۔ بھئی آمنہ! پوچھو ذرا اپنی کزن سے؟"

"آپ تو اس بے چاری کے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔" آمنہ اس کے قریب آ بیٹھی۔ "اتنی خاطر داری کر تو رہی ہے آپ کی۔ ناراض کیوں ہونے لگی۔"

"ہمیں یہ خاطر داریاں نہیں چاہئیں۔ میزبان ملنسار اور خوش مزاج ہو تو سادہ پانی بھی مزا دیتا ہے۔"

وہ مصر تھے کہ کسی طرح وہ انہیں مسکرا کر، لگاوٹ بھری نظروں سے دیکھے۔ لیکن آج وہ اپنے دل پسند کھیل سے اکتائی ہوئی تھی۔ یوں بھی کچھ دنوں سے دلچسپیوں کا مرکز تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے ریاض بھائی کے انداز و اطوار سے الجھن محسوس ہو رہی تھی۔

"کیا پکاؤں چچی جان؟" وہ وہاں سے اُٹھنے کا بہانہ چاہ رہی تھی۔

"آلو گوشت کا سالن بنا لو اور صبح میں نے چنے اُبالے تھے۔ وہ ڈال کر چاول بنا لو۔ آمنہ سلاد رائتہ وغیرہ دیکھ لے گی۔"

نہیں نہیں۔ میں خود کر لوں گی۔" وہ اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔ "ایسا کون سا کام ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں سب تیار ہو جائے گا۔ آپ لوگ باتیں

کریں۔ کتنے دن بعد تو وہ آئی ہے۔"

ریاض بھائی کی پیاسی نظروں سے بچ کر وہ کچن میں چلی آئی۔۔

کھانا پکانے میں مگن ہوئی تو اسے وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ اونچا سا جوڑا کیے، دوپٹہ ایک طرف رکھ کر وہ جھکی ہوئی ڈبے سے چاول نکال رہی تھی۔

اپنی پشت پر کسی چیز کے سرسرانے کا احساس ہونے پر وہ جیسے پتھر سی ہو گئی۔ یکدم اس نے پلٹ کر دیکھا ریاض بھائی شرارت سے مسکرا رہے تھے۔

"یہ کیا حرکت تھی۔" اس کا انداز جارحانہ تھا۔

"شش شش۔" انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر صحن میں کھلتی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"آواز جاتی ہے باہر!"

"آپ!" اس کا جی انہیں موٹی سی گالی دینے کو چاہا۔ پھر وہ ضبط کر گئی۔

دوپٹہ اٹھا کر اوڑھا اور چاول تل کے نیچے رکھ دیے۔ ان کی جانب سے رُخ موڑے وہ بدستور ان کے جانے کی منتظر تھی۔

"شہورانی!" انکی آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ "یہ بے رخی، بے گانگی کیسی۔ ہم تمہاری ایک مسکراہٹ دیکھنے کیلئے بے تاب ہیں اور تم۔"

"آپ کا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا" وہ بھی ویسی آواز میں بولی۔ "جائیں یہاں سے۔"

"تم ایک بار اپنی دلنواز نگاہوں سے دیکھو میں ابھی چلا جاتا ہوں۔" انہوں نے پھر اسے چھونے کی کوشش کی۔

"آمنہ!" وہ دفعتاً بلند آواز میں بولی تھی۔ "ذرا ادھر آنا۔"

"ریاض بھائی کرنٹ کی طرح باہر نکل گئے۔

"کیا بات ہے بھابی!" آمنہ چند لمحوں بعد مسکراتی ہوئی آئی تھی۔

"ذرا یہ نمک چکھ لینا سالن میں میں ہمیشہ زیادہ کر دیتی ہوں۔" وہ اطمینان سے چاول دھو رہی تھی۔



ہاسپٹل سے گھر آئے اسے تیسرا دن تھا۔ یہاں آ کر اسے علم ہوا تھا۔ مہناز کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی۔ اگلے ماہ اس کی شادی تھی۔ گھر میں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ ہر کوئی مصروف نظر آتا تھا۔

اسے لگتا تھا، وہ نظر انداز کی جا رہی ہے۔ کسی کے پاس اس کے لیے وقت نہ تھا۔ کسی نے اس سے کچھ نہ پوچھا تھا۔ سب نارمل انداز میں گفتگو کرتے تھے آپس میں بھی اور اس سے بھی کسی نے اسے اسپیشل توجہ کا حق دار نہ سمجھا تھا۔ ایسے میں جب سب کے بیچ بیٹھی وہ اچانک ہی خود کو مجرم تصور کرنے لگتی سو چپکے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آتی تھی۔

اس وقت بھی سب ہال میں جمع تھے، سیماب اور مہناز کینالا گز پر سجی عروسی ملبوسات دیکھ رہی تھیں۔ مختلف ملبوسات پر مختلف تبصرے ہو رہے تھے۔ عاصمہ چچی اور راشدہ بیگم دوپٹوں پر بیل ٹانک رہی تھیں۔ عدنان، عمران اور کاشف اپنے ہنسی مذاق میں مگن تھے۔ اسے سب کے بیچ اپنا وجود شدت سے گراں گزرنے لگا۔ اتنا خوشی بھرے ماحول میں اپنے اُجڑے ہوئے دل کے ساتھ وہ خود کو بہت ان فٹ لگی۔

''الماس۔ کہاں جا رہی ہو بیٹی؟'' عاصمہ چچی نے اس کا چپکے سے اُٹھ کر جانا محسوس کر لیا تھا۔

''بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں چچی۔ ذرا آرام کر لوں۔'' وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی فاصلہ طے کرتی وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

لائٹ آن کیے بنا، اندھیرے کمرے میں چلتی وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ دونوں پٹ وا کر کے اس نے باہر کی جانب دھکیل دیے۔ رات کی رانی کی خوشبو میں بھیگا نرم ہوا کا ایک جھونکا اندر چلا آیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

''کسی کو میری ضرورت نہیں۔ کسی کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میرے ہونے نہ ہونے سے کسی کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔''

اس پر قنوطیت کا شدید دورہ پڑا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں اپنے بال جکڑ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اتنا کا بت بہت بلندی سے گرا تھا۔ وہ چور چور ہو رہی تھی۔

اگلی ہی دستک کے بعد کسی نے دروازہ اندر دھکیلا تھا۔ وہ یک لخت خاموش ہو گئی۔

''الماس؟''

وہ عثمان خان تھے، انہوں نے لائٹ آن کر دی تھی۔ اور اب دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے اسے دکھ سے دیکھ رہے تھے۔

دونوں ہاتھوں سے اپنے بال جکڑے، بھیگے ہوئے چہرے اور پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ وہ بالکل کوئی دیوانی لگ رہی تھی۔

''الماس۔'' وہ اندر چلے آئے۔ ''کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے؟''

وہ بے حد نرمی سے دریافت کر رہے تھے۔

''زندگی تباہ ہو گئی ہے میری۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''آپ پوچھتے ہیں کیا ہوا ہے؟''

''چلیے آپ کی بات مان بھی لی جائے تو آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ زندگی کا وہ حصہ جو ابھی آپ کی دسترس میں ہے، بالکل محفوظ حالت میں آپ کی درست اور متوازن طرز فکر کا منتظر ہے۔ اس طرح تنہائی میں رو رو کر آپ اسے بھی تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔''

''میری دسترس میں؟ کیا ہے اب میری دسترس میں!'' وہ آزردگی سے بولی۔

''میں اب اندھیروں میں بھٹکتی ایک بدروح کی مانند ہوں۔ کوئی فیصلہ اب میری دسترس میں نہیں۔ میرے اپنے لوگوں نے ایک ذرا سی غلطی پر مجھے جس طرح سے راندہ درگاہ کیا ہے، ایسا تو کوئی دشمنوں کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔''

''نہیں الماس! ایسا نہیں ہے۔ دراصل آپ ہر بات کو بہت گہرائی میں جا کر محسوس کر رہی ہیں۔ شدید قسم کی حساسیت محدب عدسے کے

مانند ذرا سی بات کو بھی بہت بڑا کر کے دکھاتی ہے۔ آپ اپنی اس جذباتیت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں۔ سب لوگ آپ کے اپنے ہیں، چاہتے ہیں آپ کو، محبت کرتے ہیں آپ سے۔"

"اچھا!" وہ یکدم ہنس دی اور پھر ہنستی چلی گئی۔

"ایک بات تو بتائیں، آپ ہمیشہ سے ہی اتنی مہارت سے جھوٹ بولتے آئے ہیں۔ یا اب بولنے لگے ہیں۔"

"میں نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔ "مصلحتاً بھی نہیں، اس وقت بھی میں نہایت سچائی سے یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔"

"پھر بتائیں۔ آپ بھی تو میرے اپنے ہیں۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔ "آپ بھی اب تک چاہتے ہیں مجھے؟ محبت کرتے ہیں مجھ سے؟" وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بول رہی تھی۔

"عثمان یک لخت خاموش ہو گئے۔ ایسے لمحات ان دونوں کے درمیان پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔

"بولیں۔ بولتے کیوں نہیں۔" وہ چیختے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"ہاں!" وہ قدرے توقف کے بعد ہموار لہجے میں بولے تھے۔ "میں اب بھی چاہتا ہوں آپ کو، محبت کرتا ہوں آپ سے۔ اور شاید ہمیشہ کرتا رہوں، آپ کی تمام تر بے وقوفیوں، حماقتوں کے باوجود میں کبھی اپنے دل سے آپ کی محبت نکال پھینکنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔"

وہ اس کی نگاہ میں نگاہیں ڈالے مضبوط لہجے میں کہہ رہے تھے۔ الماس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"جھوٹ۔ جھوٹ بولتے ہیں آپ۔ ورنہ رضا سے طلاق کے بعد آپ مجھ سے شادی سے انکار کر کے میری تحقیر نہ کرتے۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

"آپ سے محبت کرنا میری مجبوری ہے۔" وہ کھڑے ہو گئے۔ "لیکن؟"

"انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ الماس نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

"لیکن کیا؟"

"آئی ایم سوری۔" میرے جذبات، میری محبت بے حد خاص ہے۔ صبح صادق کو چلتی نرم رو صبا کی مانند۔ ان میں کسی قسم کی امپیورٹی۔ کوئی کھوٹ برداشت کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔ میں انسان ہوں الماس، فرشتہ نہیں۔ ایک مخلص، بے ریا چاہنے والے کی حیثیت سے آپ کی ہر خطا معاف کرنے کا مجھ میں حوصلہ ہے۔ لیکن ایک شوہر کی حیثیت سے اپنی بیوی کے ماضی کو نظر انداز کرنے کا ظرف میں خود میں نہیں پاتا۔ آپ کو چاہنا نہ چاہنا میرے اختیار میں ہے۔ اور میں کوئی بھی ایسا فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔ جو بعد میں ہم دونوں کو ایک کبھی نہ بجھنے والی آگ میں دھکا تا رہے۔ شوہر کی حیثیت سے شاید میں آپ سے ویسی محبت نہ کر پاؤں جیسی ابھی آپ کے لیے میرے دل میں ہے۔"

"جھوٹ۔ جھوٹ بولتے ہو تم۔" وہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ "وہ مرد ہی کیا جس میں عورت کی خطاؤں کو معاف کر دینے کا حوصلہ نہ ہو۔ تم مجھ

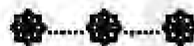
سے محبت نہیں کرتے۔ انتقام لینا چاہتے ہو مجھ سے مجھے یوں قطرہ قطرہ پگھلتا دیکھ کر خوشی ہوتی ہے تمہیں۔ کیونکہ ایک مرتبہ میں نے تمہیں ریجیکٹ کر کے کسی اور کو اپنا لیا تھا۔ اسی لیے آج تم مجھے ریجیکٹ کر کے دلی طمانیت حاصل کر رہے ہو۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تم ہی میری ہر خوشی کے قاتل ہو۔ پہلے مجھ سے زبردستی منگنی کر کے اپنی ناپسندیدہ شخصیت مجھ پر تھوپی۔ گھبرا کر میں نے رضا کی قربت میں پناہ لی تو وہاں بھی تم نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ اپنی سازشوں کے جال بچھا کر ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور اب۔ اب میری بے بسی کا تماشا دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہو اور مجھے نہ اپنانے پر ایکسکیوز کرتے ہو۔ یو جنٹلمین فراڈ، دھوکے باز۔ آئی ہیٹ یو۔ آئی ہیٹ یو۔"

"وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔"

"آپ کے دلی جذبات کا اظہار مجھے پسند آیا۔" بہت دیر خاموش رہ کر وہ تلخی سے بولے، اتنا تو اندازہ ہوا کہ واقعات اور حادثات آپ کی طرز فکر کو تبدیل کرنے اور آپ کی سوچ کی سطح کو بلند کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ حالانکہ زندگی میں پیش آنے والا ایک تلخ حادثہ بھی انسان کی پوری شخصیت تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن آپ آج بھی اپنی اسی پست، سطحی سوچ کے ساتھ حالات و شخصیات کو پرکھتی ہیں۔

دوسرے آپ کو انسان سمجھتے ہیں اور اسی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ اور آپ ایک دیوی بنی جھوٹی عظمت اور پرستش کی طلبگار ہیں۔ اپنے اس خود ساختہ خول سے باہر نکلیں الماس بی بی۔ خدا بننے کی کوشش میں بسا اوقات انسان، انسان بھی نہیں رہتا۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ کمرے سے نکل گئے تھے۔"

"ہونہہ۔" اس نے سر جھٹکا۔ 'آئے تھے اپنی جھوٹی ہمدردی اور بلند ظرفی کا مظاہرہ کرنے میں سب کی ہمدردیاں دیکھ چکی ہوں۔ سب کے ظرف آزما چکی ہوں۔ مجھے سب سے نفرت ہے۔ سب سے!"



"صبا!"

وہ اوندھی لیٹی تکیے پر سر رکھے کسی گہری سوچ میں تھی جب نجمہ خاتون نے اندر جھانکا۔

"جی امی!" وہ سیدھی ہوئی۔

"تمہارا فون ہے۔"

"اس سے پیشتر کہ وہ فون کرنے والے کا نام دریافت کرتی، وہ جا چکی تھیں۔ گہری سانس بھر کر وہ بیڈ سے اتری۔ دونوں ہاتھوں سے بال درست کرتی باہر کی جانب بڑھ گئی۔

"ہیلو۔"

"دانیال بات کر رہا ہوں۔" دوسری جانب سے سنجیدہ آواز ابھری۔ "کیسی ہیں آپ؟" وہ چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گئی۔

"جی ٹھیک ہوں!" بالآخر وہ بولی تھی۔

"خفا ہوں گی!"

"کس سے؟" وہ انجان بنی۔

"ایک بے وقوف، جذباتی سے بندے سے۔" وہ ہولے سے ہنسا تھا۔ "پلیز صبا معاف کر دیں۔" وہ خاموشی سے کھڑی ہونٹ چباتی رہی۔

"دیکھیں صبا! وہ کچھ دیر اس کی جانب سے کسی بات کا منتظر رہنے کے بعد بولا تھا۔ "اس روز غصے میں، میں نجانے کیا کچھ بول گیا۔ گھر آ کر جب دماغ ٹھنڈا ہوا تو مجھے ایک بات کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ یہ کہ منگنی کی رسم لاکھ کسی اہمیت کی حامل نہ سہی۔ اس سے فریقین کو کچھ فائدہ ضرور حاصل ہوتے ہیں۔ شادی ہونے تک دو انسان ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خوبیوں، خامیوں، کمزوریوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ پھر شادی کے بعد اتنی پرابلم نہیں ہوتی۔ ایڈجسٹمنٹ آسان ہو جاتی ہے۔ اب دیکھیے نا، آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا میری خامیوں کا۔ بے پناہ جذباتی، بے حد شدت پسند، ٹوٹ کر چاہنے والا، اور ویسی ہی بے پناہ چاہت کا خواستگار، یہی میری خوبیاں ہیں، یہی میری خامیاں ہیں۔ ایک خوبی اور بھی ہے۔ میرا غصہ بس چند لمحوں کا ہوتا ہے۔ پھر دل کا آئینہ ایک دم صاف ہو کر جگمگانے لگتا ہے اور جس پر غصہ کرتا ہوں اس کی محبت میرے دل میں دو چند جاتی ہے۔ آپ میری بات سن رہی ہیں نا؟"

"اسے دوسری جانب چھائی گمبھیر خاموشی سے کچھ گمان گزرا۔

"جی!" وہ آہستگی سے بولی۔

"تو میں کہہ رہا تھا صبا! مجھے جان لیں۔ سمجھ لیں۔ پھر آپ کو مجھ سے اتنی شکایت نہ ہوگی۔"

"میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی دانیال صاحب۔" وہ کچھ دیر بعد بولی۔ "جو لوگ چند لمحوں کے غصے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ یہ کیسے سوچ

لیتے ہیں کہ جب ان کا دل صاف ہوگیا تو پھر سب کچھ ٹھیک، پہلے جیسا ہوگا۔ سارے لفظ بادل کی طرح نہیں ہوتے کہ جب برس گئے تو مطلع صاف ہوگیا۔ کچھ الفاظ تیر کی طرح دل میں ترازو ہو جاتے ہیں۔ کبھی نہ نکلنے کے لیے۔ اور آپ نے درست کہا۔ منگنی فریقین کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ اسی لیے بیشتر منگنیاں بہت کم عرصہ رہتی ہیں۔"

"اوہ۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "تو آپ اس وجہ بدگمان ہیں!"

"میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا دانیال صاحب۔ میرے لیے میری ذات کا اعتبار بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کوئی مجھ پر شک کرے، میرے کردار پر کیچڑ اچھالے، میری برداشت سے باہر ہے۔"

"صبا! آپ سمجھتی کیوں نہیں، محبت میں شدت پسند انسان، بہت مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ کا جھکاؤ کہیں اور ہو، یہ تصور ہی میرے لیے سوہان روح ہے۔"

وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ ایسے انسان کے ساتھ زندگی گزارنا کس قدر مشکل ہوتا ہے، اسے پورا اندازہ تھا۔

"ایک مرتبہ پورے طور پر میری بن کر دیکھیں۔ میں آپ کو کتنی محبت دوں گا، آپ اندازہ نہیں کرسکتیں۔"

"آپ چاہتے ہیں، میں پوری دنیا سے کٹ جاؤں؟"

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔ پھر بولا۔

"صبا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے آپ کے وہ پڑوسی بالکل پسند نہیں ہیں۔ میں مسٹر شہروز کا نام سن کر اتنا چڑ جاتا ہوں اور بس! آپ اپنی سہیلیوں سے ملیں، ان کے گھر آئیں جائیں، مجھے اعتراض نہیں۔ لیکن...!"

"دانیال صاحب!" اس نے بڑے ضبط سے کام لیا! "میں ایک بار پہلے بھی اس رشتے کی وضاحت کرچکی ہوں، جو میرے اور شہروز کے بیچ ہے۔"

"مجھے یاد ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں صبا! میرے دل میں اس کے لیے ایک عجیب طرح کی جیلسی ہے، اور میں اس پر قابو نہیں پاسکتا!" وہ مکمل سنجیدگی سے بولا۔

وہ بے بسی سے لب کھول کر رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ کیا کہے۔

"ہاں۔ ایک بات اور۔" وہ یکایک خوشدلی سے بولا۔ "میں نے پاپا سے بات کی ہے کہ میں اب مزید انتظار نہیں کرسکتا۔ میری شادی کر دیں۔ بس فوراً اور وہ تو تیار بیٹھے تھے۔ فٹافٹ مان گئے۔ عنقریب ممی، پاپا آپ کے گھر آرہے ہیں۔ تیاریاں شروع کردیں۔"

صبا کا دل یکایک تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟"

"جو کیا اچھا کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا ہمارے درمیان دوسرے لوگوں کی وجہ سے غلط فہمیاں جنم لیں اور اختلافات ہوں۔ بس اتنا طے

کرلیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام کریں گے، پھر دیکھیں، زندگی کیسے ہنسی خوشی بسر ہوتی ہے۔"

"وہ جواباً خاموش رہی۔

"اچھا۔ میں فون بند کررہا ہوں۔ بس اتنا بتادیں، اب کوئی ناراضی تو نہیں؟" وہ شگفتگی سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"تھینک یو۔ او کے۔ خدا حافظ۔"

اس نے فون رکھ دیا تھا۔ صبا ریسیور تھامے بڑی دیر تک کھڑی رہی۔

"صبا بیٹی!" نجمہ خاتون نے اسے پکارا تھا۔

"جی!" وہ چونک کر مڑی۔

"ہو گئی بات؟"

"کیسی بات امی!"

"کوئی ان بن خفگی؟"

اسے فوری طور پر جواب نہ سوجھا۔ وہ سر جھکا کر رہ گئی۔

"دیکھو بیٹی میں نے آج تک تم سے کبھی کسی سلسلے میں جواب طلبی نہیں کی، کبھی کوئی روک ٹوک نہیں کی، کبھی اپنا کوئی فیصلہ تم پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی، کیونکہ مجھے ہمیشہ تم پر اور اپنی تربیت پر مان رہا ہے، اور آج بھی ہے۔ تم میری آنکھوں کی روشنی ہو۔ لیکن صبا! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ اپنی اولاد کو بالکل لیگر پاتے ہوئے بھی سمجھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

صبا! مجھے بارہا محسوس ہوا ہے۔ دانیال شہروز کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے ذکر پر اس کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی ہے۔ تمہارا اس سے آزادانہ میل جول اسے کھٹکتا ہے۔ میں جانتی ہوں بیٹی، شہروز اور تم کتنے اچھے دوست ہو۔ ایک دوسرے کو کتنی اہمیت دیتے ہو۔ لیکن صبا، جہاں ساری عمر کی رفاقت کا سوال ہو، وہاں کبھی کبھی نہ چاہتے بھی بہت سی عزیز دوستیوں سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ ازدواجی زندگی کو خوشگوار رکھنے کے لیے عورتوں کو بسا اوقات اپنے والدین تک سے منہ پھیرنا پڑ جاتا ہے۔ لیکن ایسا کرنا پڑتا ہے۔ ایسا کرنے میں عورت کی بھلائی ہوتی ہے۔ مجبوری ہوتا!"

"جی امی!" اس کی آواز بھیگ گئی تھی

"تمہارے ابو۔ بہت خوش ہیں اس رشتے سے۔ دانیال انہیں بے حد عزیز ہو چکا ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ انہیں اگر تم دونوں کے بیچ کسی دراڑ کی خبر ہوئی تو انہیں بہت صدمہ ہوگا بیٹی۔ سمجھدار بیٹیاں ماں باپ کے فیصلوں کا مان رکھتی ہیں۔"



"شبنم بیٹی!" چچی اسے صحن میں کھڑی پکار رہی تھیں۔

جوڑوں میں درد کی وجہ سے وہ بہت کم سیڑھیاں چڑھتی تھیں، اس لیے جب بھی انہیں شبنم کی ضرورت ہوتی وہ صحن میں کھڑی ہو کر پکارا کرتی تھیں۔ سارا محلہ ان کی آواز سنا کرتا۔

اسے نیند کے سلسلے کو توڑنے میں بہت دشواری ہوئی تھی۔ بوجھل پلکوں کو بار بار جھپکتی وہ کمرے سے نکل کر پہلی سیڑھی تک آئی۔

"جی! کیا بات ہے چچی جان!"

"سو رہی تھیں؟ خیر وہ میں ذرا پڑوس میں جا رہی ہوں۔ منیرہ کے ہاں بیٹی ہوئی ہے، اسے دیکھ کر آؤں تم نیچے آ جاؤ۔ دروازہ لگا لو۔"

اسے سخت کوفت ہوئی۔ اس بھری دوپہر میں بھلا منیرہ کی بیٹی کو دیکھنے جانا ایسا کیا ضروری تھا۔ اس کی اتنی اچھی نیند خراب ہو گئی تھی۔

بوجھل قدموں سے سیڑھیاں پار کر کے وہ نیچے آئی اور وہیں بچھے تخت پر بیٹھ گئی۔

"میں ابھی آ جاؤں گی۔ پڑوس کا معاملہ ہے نا، وہ کہیں گے، پیسے دینے کے مارے نہیں آئی، اس کی ساس سے بھی منہ پھٹ۔ جہاں ملاقات ہوئی، کوئی نہ کوئی شکوہ اٹھا مارتی ہے۔" وہ چادر لپیٹتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"اب سو روپے دے کر گلو خلاصی ہو گی، ارے، ہمارے ہاں بھی ساتھ خیریت کے بچہ ہوا تو ہم بھی وصولیں، وہ سے دے کر بیزار ہو گئے۔"

وہ باہر نکلتے نکلتے بھی بول رہی تھیں۔

وہ بیزاری کی کیفیت میں وہیں لیٹ گئی۔ نیند اب تک مکمل طور پر سوار تھی۔ اس کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں۔

"ششش۔ ششش۔ سنیے!"

کوئی سرگوشی میں اس کے سر پر ہوئی تھی۔ وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھی۔

تم!

اپنے قریب انیس کو پا کر وہ سخت خوفزدہ ہو گئی۔

"کیا بات ہے۔ کیوں آئے ہو؟" وہ سرک کر تھوڑا سا پیچھے ہو گئی۔

"میں ملنے آیا ہوں" وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ "آپ اکیلی ہیں نا۔"

"ہاں!" اس نے سر ہلایا۔

پھر اس نے دروازے کی سمت دیکھا۔

"جاؤ چلے جاؤ۔ کوئی بھی آ سکتا ہے۔" اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"آپ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ ناراض ہو گئی ہیں؟ پھر گھر بھی نہیں آئیں۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو۔ میں بھلا کیوں تمہیں خط لکھوں گی۔ کیوں آؤں گی تمہارے گھر۔"

اس کا موڈبانہ انداز دیکھ کر اس کا خوف قدرے زائل ہو گیا۔ وہ قدرے تحمل سے بولی۔

"دیکھیں ناراض نہ ہوں۔" وہ لجاجت سے بولا۔ "میں تو۔ میں تو۔"

"میں کہہ رہی ہوں ناں جاؤ۔" وہ بولی۔ "کوئی آ گیا تو نجانے کیا ہو۔ تمہاری تو ہڈیاں سرمہ کر دیں گے محلے والے۔"

"میں ڈرتا نہیں ہوں" اس کی بات پر اس نے سینہ اکڑا لیا۔ "صرف آپ کا خیال ہے۔"

"اچھا بابا!" اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "اب جاؤ بھی۔"

"پہلے ایک وعدہ کریں۔ کل شام کو چھت پر آئیں گی۔"

"کیوں؟" اس نے ابرو چڑھائے۔

"صرف ایک جھلک دکھلانے کے لیے۔ آئیں گی نا۔" وہ مچلا۔

"اچھا آؤں گی۔ اب تم جاؤ۔"

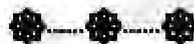
"وعدہ کریں۔"

"ہاں وعدہ۔" اس نے سر ہلایا۔

وہ باہر نکلا تو اس نے لپک کر کنڈی لگائی پھر دروازے سے پیٹھ لگا کر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

"چھت اور بالکنی سے آنکھ مچولی تو ٹھیک تھی۔ کبھی کبھار ایک آدھ سلام داغ دیتا تھا جسے وہ مسکرا کر قبول کیا کرتی تھی۔ لیکن آج تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔

وہ بہت دیر تک اس واقعے کے زیر اثر رہی



اسے تین دن سے سخت بخار تھا۔ پیر کی سوجن کسی طور کم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ تکلیف کی شدت سے بخار نے الگ آ لیا تھا۔

"آج وہ ناصر کے ساتھ جا کر چوڑوں کے ڈاکٹر سے پٹی کروا اور بخار کی دوا لے کر آئی تھی دوا کا ہی اثر تھا کہ وہ دوپہر سے سو رہی تھی۔ اور اب شام ڈھلنے کو تھی۔

"بجو بجو۔"

"مریم کے ہلانے پر اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔

"ہوں۔ کیا ہوا؟"

"کوئی صاحب آئے ہیں۔ آپ سے ملنے!"

"ہیں؟" نقاہت کے مارے اس کا برا حال تھا۔ "کیا؟"

"کوئی صاحب آئے ہیں، آپ کی فیکٹری سے، میں نے ڈرائنگ میں بٹھا دیا ہے۔" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ غائب دماغی سے اسے گھورنے لگی۔

"بجو۔ بجو۔" ریشم اچھلتی ہوئی آئی۔ "پتا ہے وہی انکل آئے ہیں۔ آپ کے پاس۔ جنھوں نے اس دن آئس کریم کھلائی تھی۔"

"وہ ایک دم سنبھل گئی۔

"عباسی صاحب؟ کہاں ہیں؟ کیا کہا ان سے؟"

"بیٹھے ہیں اندر۔ بلا رہے ہیں آپ کو۔"

وہ بے حد پریشانی کے عالم میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔



اماں کی کھلی سی چادر میں خود کو لپیٹ کر وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

عباسی صاحب کونے میں رکھی کرسی پر بیٹھے سگریٹ پھونک رہے تھے۔ اسے دیکھ کر جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"نیلم!"

"اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ پچھلے تین چار دن سے وہ اپنی سوچوں میں مسلسل اس شخص پر لعنت بھیج رہی تھی اور خدا کا شکر گزار تھی جس نے اسے ایک شیطان سے بال بال بچایا تھا۔

"کس لیے زحمت فرمائی؟" اس کا لہجہ انتہائی سرد تھا۔

"نیلم......پلیز! بیٹھ کر بات کرو۔"

"مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ بہتر ہوگا، آپ یہاں سے چلے جائیں۔" اس کا انداز جوں کا توں برقرار تھا۔

"نیلی! شرمندگی، تاسف اور پچھتاوے کی آگ میں جو پہلے ہی جل کر راکھ ہو گیا ہو۔ اس پر یوں اپنی نفرت اور سرد مہری کے کوڑے مت برساؤ۔" وہ انتہائی آزردگی سے کہہ رہے تھے۔ "میں مانتا ہوں تمہارا رویہ برحق ہے تمہیں میرے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کرنے کا حق ہے۔ لیکن خدا یا ایک بار بیٹھ کر تسلی سے میری بات سن لو۔ مجھے ایک بار اپنا مافی الضمیر بیان کر لینے دو پھر میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

ان کے لہجے میں اتنا دکھ اور اتنی اداسی تھی کہ نیلم نہ چاہتے ہوئے بھی میکانکی انداز میں بیٹھ گئی۔

"جو کہنا ہے ذرا جلدی کہیے۔ میرے بھائی آتے ہی ہوں گے اور میں نہیں چاہتی، ان کا آپ سے سامنا ہو۔ مجھ سے آج تک کوئی مرد اس طرح ملنے نہیں آیا۔"

"اس مہربانی کا شکریہ۔" وہ قدرے ممنونیت سے بولے، "نیلی......"

"میرا نام نیلم ہے۔" وہ ان کی بات کاٹ کر قدرے تلخی سے بولی۔

"اوہ!" وہ قدرے گڑبڑا گئے" میں کہہ رہا تھا......"

اسی لمحے چائے کی ٹرے اٹھائے ریشم اندر داخل ہوئی تھی۔اس کے پیچھے مریم تھی۔

"السلام علیکم۔" دونوں نے بڑے مودبانہ انداز میں انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم....ارے بھئی......اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔کیوں زحمت کی۔"

"ارے.....انکل آپ!" ریشم انہیں پہچان کر یکایک خوشی سے بولی۔"تو آپ آئے ہیں۔آپ نے مجھے پہچانا؟۔"

"کیوں نہیں۔" وہ مسکرائے۔"اتنی کیوٹ سی لڑکی کو بھلایا جا سکتا ہے۔"

"پتا ہے مریم! ایک دن میں اور بجو شاپنگ کرنے گئے تھے تو انہوں نے ہمیں واپسی پر گھر ڈراپ کیا تھا اور اتنے اچھے سے ریسٹورنٹ میں آئس کریم کھلائی تھی۔"

"اچھا!" مریم متاثر نظر آئی۔

"نیلم بیٹھی خفت سے ہونٹ چباتی رہی۔اسے ریشم کا تعارف ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

مریم عباسی صاحب کے لیے چائے نکالنے لگی اور ریشم انہیں بسکٹ اور سموسے پیش کرنے لگی۔

"دراصل یہ پہلے کبھی بتائے بغیر اتنے دن غیر حاضر نہیں رہیں۔" وہ ریشم سے مخاطب تھے۔"میں سوچ رہا تھا کہ نجانے کیا بات ہوگی۔ آج یہاں سے گزرا تو خیال آیا، پتا کرلوں۔"

ان کے دل میں چور تھا جب ہی اپنے آنے کی وجہ بیان کر رہے تھے۔ ہرچند کہ ریشم اور مریم کو قطعاً ضرورت نہیں تھی یہ جاننے کی کہ کیوں آئے ہیں۔

پھر بھی نیلم ان کی وضاحت پر قدرے مطمئن ہوگئی تھی۔اسے علم تھا اماں اس سے تو نہیں البتہ ان دونوں سے ضرور استفسار کریں گی۔

"جی۔بجو پچھلے کچھ دن سے بیمار ہیں نا۔بخار اتر ہی نہیں رہا تھا۔" مریم نے آہستگی سے کہا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟۔" وہ نرمی سے اس سے مخاطب ہوئے۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ اسی لٹھ مار انداز میں گویا ہوئی۔

"پھر کل آرہی ہیں ناں؟"

"وہ تذبذب کے عالم میں ہونٹ چبانے لگی۔ان سے تو وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ ان کی صورت دیکھنے کی روادار نہیں ہے۔لیکن مریم اور ریشم کی موجودگی میں وہ کیا کہے۔اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔اگر وہ اثبات میں جواب دیتی تو عباسی صاحب مزید کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے اور اگر انکار کرتی تو دونوں تعجب سے شکل تکتیں۔

دیکھوں گی سر! اگر طبیعت ٹھیک ہوئی تو۔" اس نے روکھے سے لہجے میں کہا۔

"ماشاءاللہ اب تو کافی ہشاش بشاش نظر آرہی ہیں۔" انہوں نے ماحول کو شگفتہ کرنا چاہا۔

"جناب! یہ تو آپ کی آمد کا اثر ہے۔" ریشم نے اپنی ازلی بے وقوفی سے کام لیا۔ "مگر تو پیلا زرد چہرہ لیے پڑی تھیں۔ کسی سے بات ہی نہیں کر رہی تھیں۔ ہم سب تو پریشان ہو اٹھے تھے۔"

"فکر نہ کریں۔ اب یہ بالکل چاق و چوبند ہو جائیں گی۔" انہوں نے واقعی ریشم کی بات پر اپنی مرضی کا مطلب اخذ کیا تھا۔ وہ کھل اُٹھے تھے۔

نیلم نے خفگی سے ریشم کو گھورا۔

"اچھا چلو، اب اندر جاؤ کھانے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ ڈیڈی آتا ہوگا۔" اس نے سرد لہجے میں اسے جیسے تنبیہ کی تھی۔

"پھر آرہی ہو نا کل؟" وہ بڑے اشتیاق سے اس کی سمت متوجہ ہوئے۔

یوں جیسے ان کے درمیان کوئی بات ہی نہیں ہوئی جیسے کسی معمولی سی غلط فہمی کا ازالہ ہو گیا ہو۔

"جی نہیں۔ میں نے جاب چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" اس کی نظریں دیوار پر جمی تھیں۔ "میں آپ جیسے شخص کے ساتھ قطعاً کام نہیں کرنا چاہتی۔"

"نیلم! خدارا۔ مجھے غلط مت سمجھو۔ یقین جانو، میں تمہیں ہرگز کسی برے ارادے سے وہاں نہیں لے کر گیا تھا۔ میں نے ہمیشہ تمہاری پاکیزگی کو قابل احترام جانا ہے۔ بس اچانک مجھے کیا ہو گیا تھا، میں خود نہیں سمجھ پایا۔ شاید...... شاید۔ دل کے نہاں خانوں میں چھپی تمہاری محبت نے کسی نازک لمحے میں عیاں ہو کر مجھ پر غلبہ پا لیا۔ میری قوت فیصلہ، میری عقل مفلوج ہو کر رہ گئی۔ بس اتنا خیال رہا کہ تم میری ہو صرف میری، ہمارے بیچ کوئی دوری نہیں، کوئی فاصلہ نہیں۔ بس وہ چند لمحے ہی تھے نیلم! اور...... اور...... یہ سچ ہے کہ تم اس وقت اتنی خوبصورت، اتنی پرکشش لگ رہی تھیں کہ میری جگہ کوئی فرشتہ بھی آسمان سے اترا ہوتا تو خود پر قابو نہ رکھ سکتا۔"

نیلم نے خفگی سے انہیں دیکھا۔

"انسان کو فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے سر۔ کیونکہ انسان کو خدا نے عقل سلیم سے نوازا ہے۔ اور۔ میں اگر آپ کی بات مان بھی لوں کہ آپ کا پہلے سے ایسا کوئی ارادہ نہ تھا تب بھی آئندہ کے لیے میں آپ پر کبھی اعتبار نہ کر پاؤں گی۔"

"تمہارا اعتبار لوٹانا میرا کام ہے۔ انسان کو سنبھلنے کے لیے ایک ٹھوکر کافی ہوتی ہے۔ میں خود اپنی نظروں میں گر گیا ہوں۔ اب ساری عمر اپنا آپ بلند کرنے کی کوشش میں گزرے گی۔"

نیلم خاموش بیٹھی اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔

"ایک بار مجھے دل سے معاف کر دو۔ معاف کر کے تو دیکھو۔" وہ سراپا التجا بنے ہوئے تھے۔

نیلم کے دل پر چھائے نفرت اور کدورت کے بادل صاف ہونے لگے۔

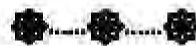
"میں کوشش کروں گی۔" اس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

"اوہ...... نیلی...... یو آر گریٹ۔"

"وہ جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں صاف کرنے لگے۔ نیلم کو حیقتاً ان پر ترس آنے لگا۔

"میں، میں کل تمہارا انتظار کروں گا۔ آؤ گی نا؟۔"

جاتے جاتے وہ پوچھ رہے تھے۔ نیلم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔



"صبا!"

"اس نے پلٹ کر دیکھا اور پھر چند لمحے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس کے سامنے الماس کھڑی تھی۔ زرد رنگت، سیاہ حلقے، ستا ہوا چہرہ...... جیسے الماس سے ملتی جلتی کوئی اور لڑکی تھی۔ لیکن نہیں۔ اس سے ملتی جلتی لڑکیاں بھی بڑی خوبصورت ہوا کرتی تھیں۔

"الماس۔" وہ اس کے گلے لگی تو اس کی آواز بھیگ گئی۔ "یہ کیا حالت بنائی ہے اپنی؟" وہ بنا کسی جواب کے بے جان بت کی مانند کھڑی رہی۔ اس کے انداز میں صبا کی سی گرم جوشی نہیں تھی۔

صبا نے الگ ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"بیمار رہی ہو؟۔"

"ہوں!" اس نے سر ہلایا۔ "یہ بتانے کے لیے بھی مجھے خود آنا پڑا ہے۔ تم تو کسی کی خیریت معلوم کرنے کی روادار نہیں ہو۔"

"وہ شکوہ کرتے ہوئے وہیں پڑی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ صبا نے گھاس پر پڑا ہوا پائپ اٹھا کر کیاری میں ڈالا اور پھر آ کر اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

"ہاں۔ تمہارا شکوہ بجا ہے الماس! لیکن کیا کروں۔ امی نے جب سے شادی کی تیاری شروع کی ہے، میرا کہیں آنا جانا مشکل ہو گیا ہے۔ خود بھی لگی رہتی ہیں، مجھے بھی لگائے رکھتی ہیں۔"

"شادی؟" الماس چونکی، "تمہاری؟۔"

"صبا جھینپ کر ہنسنے لگی۔

"اور اس گھر میں کون شادی کر سکتا ہے؟۔"

"الماس محض زیر لب مسکرا دی۔"

"ملے ہوئے اتنے دن گزر جاتے ہیں کہ خبریں بھی عجیب لگتی ہیں۔" صبا ہنس کر بولی۔

"ہاں شاید۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"خیر۔ تم اپنی سناؤ۔ کیا ہو گیا تھا تمہیں؟ اس قدر کمزور ہو گئی ہو، میں تو لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک کر رہ گئی۔ لگتا ہی نہیں کہ الماس ہو۔ ایسا بھی کیا ہو گیا تھا؟" الماس گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"کیا بتاؤں صبا! کیا گزری ہے مجھ پر، یوں لگتا ہے سارا زمانہ محض میرا ہی دشمن ہو گیا ہے۔"

"تمہارے گھر والے راضی نہیں ہوئے، رضا کیا کہتا ہے؟"

الماس استہزائیہ انداز میں ہنس پڑی۔

"رضا؟ اس نے تو جو کہنا تھا، کب کا کہہ چکا۔ اب تو باقی لوگوں کی باری ہے۔"

"پھر ہنسنے لگی۔ صبا ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ اس کی ہنسی نارمل نہیں تھی۔ وہ اسے کوئی دیوانی لگنے لگی۔"

"الماس!" اس نے بے حد خوف زدہ انداز میں اسے پکارا۔ "کیا ہوا ہے؟ بتاؤ مجھے۔"

"کچھ خاص نہیں ہوا۔" اس نے کاندھے اچکائے۔ "اور.....اور۔ مجھے کوئی غم نہیں ہے جو کچھ بھی ہوا۔" قدرے توقف کے بعد وہ بولی۔

"رضا نے مجھے طلاق نامہ بھجوا دیا تھا۔ اور میں پریگنینٹ تھی۔"

"اوہ گاڈ!" صبا پر جیسے سات آسمان آگرے۔

"پھر میرا ابارشن ہو گیا۔ اور بس۔ کہانی ختم۔" وہ پھر ہنسی۔

صبا دکھ اور تاسف سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اتنا کچھ ہو گیا تھا اس کی عزیز ترین دوست کے ساتھ اور وہ بے خبر رہی۔ اسے بے انتہا شرمندگی محسوس ہوئی۔

"کہاں کھو گئی ہو۔" الماس نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ "میں نے کہا ناں جو کچھ بھی ہوا، مجھے اس کی ذرا پروا نہیں۔ تم بے وجہ اتنا محسوس کر رہی ہو۔"

"ہاں۔" صبا نے گہری سانس بھر کر سوچا۔ "تمہیں پروا نہیں ہے جب ہی تو تم سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچا ہو گئی ہو۔ یہ پیلی رنگت، یہ بے ترتیب سانسیں، یہ ابنارمل ہنسی۔ شاید وہی لوگ ایسے ہو جاتے ہیں جنہوں نے کبھی کسی کی پروا نہ کی ہو۔"

"یہ دیکھو۔" الماس نے پرس میں ایک آف وائٹ لفافہ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔

"کیا ہے؟" صبا نے چونک کر اسے اٹھایا تھا۔

"کارڈ ہے۔ مہناز کی شادی کا۔ اسی لیے تو آئی ہوں۔ ورنہ تم سے بھی ملنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

صبا کارڈ پڑھ رہی تھی۔ اس کی بات پر اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیوں؟ ناراض تھیں؟"

"نہیں۔ ناراض تو میں کسی سے بھی نہیں ہوں۔" وہ کیاریوں میں کھلتے گلاب دیکھنے لگی۔ "اور کسی سے ناراض ہو کر بھی کوئی کیا کر لیتا ہے

اور تم سناؤ۔"

وہ یک بیک بات بدل کر بولی۔

"کتنی تیاریاں ہو گئیں شادی کی۔ ڈیٹ ویٹ فکس ہوئی۔"

"ارے ابھی نہیں۔" صبا ہنس پڑی۔ "ابھی تو تیاریوں کی بھی ابتدا ہے۔"

"ہوں۔" اس نے پہلی مرتبہ غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "خوش لگتی ہو؟ خوبصورت اور بھی ہو گئی ہے دانیال صاحب لک کر گئے ہیں۔"

صبا متانت سے مسکرا دی۔ کچھ کہنا اس نے مناسب نہ سمجھا۔

"اور۔ وہ۔ فیروز صاحب؟ محو ہو گئے یادداشت سے؟" اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

صبا نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ الماس جیسی بھی تھی، کم از کم اسے طعنے دینے کی عادت نہ تھی۔ اسے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی اجنبی لگی۔

"اب کیا ذکر۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "یہ بات تو اب میں خود سے بھی نہیں کرتی۔"

"اچھا کرتی ہو۔" وہ اطمینان سے بولی" یہ بات تمہیں اب خود سے کرنی چاہیے۔ اور ویسے بھی اب تم ایک اور مرد سے وابستہ ہو اور یہ مرد۔ توبہ..... بلا کے شکی اور کینہ پرور ہوتے ہیں۔ عورت کے ماضی کی ایک جھلک انہیں نظر آ جائے، ساری زندگی کے طعنے تشنے عورت کا مقدر ہو جاتے ہیں تم کبھی دانیال کو فیروز کے بارے میں بتانے کی کوشش نہ کرنا۔"

"بتانے کو میرے پاس ہے ہی کیا الماس! اور دانیال۔ اس سے تو مجھے ابھی سے خوف آتا ہے۔ وہ بہت پوزیسیو نیچر کا آدمی ہے۔ اسے تو شہروز کا یہاں آنا پسند نہیں، حالانکہ وہ جانتا ہے میں اسے سگے بھائیوں کی طرح عزیز رکھتی ہوں۔"

"اچھا!" الماس نے حیرت کا اظہار کیا۔ "تو اس نے ابھی سے تم پر پابندیاں لگانی شروع کر دیں؟"

"کہتا ہے اسے مجھ سے بے حد محبت ہے۔" صبا اداسی سے ہنس دی۔ "میرا جھکاؤ کہیں اور ہو اسے گوارا نہیں۔"

"وہی روایتی مردوں والی محبت۔" الماس نے نخوت سے ناک سکوڑی۔ "ایسی محبت کسی نے چاٹنی ہے۔ محبت تو اعتبار کا، اعتماد کا نام ہے۔ وہ ابھی سے تم پر شک کرنے لگا۔"

"دراصل شہروز کا اسٹائل بھی قدرے مختلف ہے نا۔ بالکل بے تکلف سا۔ بے دھڑک منہ میں آئی بات کہہ دینے والا۔ نجانے کب دانیال کو اس کی کوئی بات بری لگ گئی۔"

"خیر۔ اب تم کوشش کرو اس کا دل صاف کرنے کی۔ یہ مرد بڑے کینہ پرور ہوتے ہیں۔ اونٹ کی طرح۔ شادی کے بعد اسی بات پر وہ تمہاری زندگی عذاب بنا دے گا۔"

"ایسا تو مت کہو الماس!" صبا خوفزدہ ہو گئی۔ "میں تو ویسے ہی ڈرتی رہتی ہوں۔"

"یہ لو۔"

"الماس نے پرس میں سے ایک اور کارڈ نکالا اور پین سے اس کا نام لکھنے لگی۔

"یہ دانیال ہاشمی کا کارڈ ہے۔ میری طرف سے دینا ملک مجھے اس کا فون نمبر دو۔ میں فون پر بھی تاکید کروں گی۔ تم دونوں ساتھ آنا۔ ابھی سے انڈر اسٹینڈنگ پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ بعد میں بھی تمہارے کام آئے گا۔"

"رہنے دو الماس!" صبا کو الجھن ہوئی۔ "میں اس کی موجودگی میں ایزی فیل نہیں کرتی۔"

"کہہ رہی ہوں ناں۔ ابھی سے ایک دوسرے کو سمجھو۔ تم نہیں جانتیں یہ کتنا ضروری ہے۔"

اس نے کارڈ اس کے سامنے ڈال دیا۔



"لگتا ہے اس مرتبہ اپنے شہروز صاحب ٹاپ کریں گے۔" حیدر نے گنا چوستے ہوئے شہروز کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"ہائیں۔" سلطان نے حیرت سے حیدر کو دیکھا۔ "میرا خیال ہے یہ اس سال کی سب سے احمقانہ پیشن گوئی ہے۔ یعنی تمہیں پورے ڈیپارٹمنٹ میں کوئی اور نظر ہی نہیں آیا جو تم نے اٹھا کر اس گدھے کا نام لے دیا جو سمسٹر کی ڈیٹ آنے کے بعد نوٹس مانگتا پھرتا ہے۔ ہائے۔"

"آخر میں وہ پیٹھ پر پڑنے والے گنے کی ضرب سے مجروح ہو کر بلبلایا تھا۔

سمسٹر کی ڈیٹ آنے کے بعد نوٹس مانگنا کوئی بری بات نہیں۔" وہ اسے گنا رسید کر کے شان بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔ "قابل اعتراض بات کیا پارٹ آنے کے بعد نوٹس مانگنا ہے۔ جیسا تم کرتے ہو۔"

سارے گروپ نے قہقہہ بلند کیا تھا۔

سلطان نے برا سا منہ بنایا۔

"اور رہی بات ٹاپ کرنے کی تو وہ اپنے شہروز صاحب کریں گے ہی۔ سنا ہے فائنل کے اعزاز میں جو الوداعی تقریب منعقد کی جا رہی ہے اس میں کئی دل چسپ مقابلے بھی رکھے گئے ہیں۔ کھانے کا مقابلہ بھی ہے۔ اور اسی مقابلے کی بات کر رہا تھا۔"

"اگلی ضرب حسب توقع اس کا مقدر تھی۔ وہ بھی ہائے کر کے رہ گیا۔

"کس نے دیا ہے اس کو یہ گنا؟" اس نے بھنا کر پوچھا تھا۔

"یار۔ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم پر پابندی لگنی چاہیے۔" علی پوائنٹ کی طرف بڑھتے لڑکیوں کے گروپ کو دیکھ کر زیر لب مسکرا کر بولا تھا۔

"ہائیں۔ وہ کیوں؟" سلطان کو سخت اعتراض ہوا۔

"یار اگر تعلیم ضروری ہی ہے تو گھر بیٹھ کر حاصل کریں۔" اس نے مزید کہا۔

"وضاحت کرو۔"

"ارے یار! بے چاریاں اتنی گرمی، دھوپ، دھول، مٹی سے نبرد آزما کر حال سے بے حال ہو جاتی ہیں۔ دیکھا نہیں۔ جب یہ ایڈمیشن

فارم جمع کرانے آتی ہیں تو کمروں پر کیا بہار ہوتی ہے۔ گورے گورے، گلابی گلابی، فریش فریش چہرے۔ کیسی ٹھنڈک بخشتے ہیں آنکھوں کو۔ اور یہی چہرے جب فائنل میں پہنچتے ہیں تو انہیں دیکھ کر بیزاری ہوتی ہے۔ یہ اعلیٰ تعلیم لڑکیوں کا حسن نچوڑ کر رکھ دیتی ہے اور لڑکیوں میں اگر حسن نہ ہو تو یہ دنیا کس کام کی؟"

"بلے بلے" سلطان نے دھپ اسے رسید کی۔ "کیا کام کی بات بتائی ہے۔ اب ہم تیرے لیے ڈھونڈیں گے کوئی ایسی لڑکی جسے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی ہوا چھو کر بھی نہ گزری ہو۔ جس نے گھر پر نورانی قاعدہ ختم کیا ہو اور جس کے چہرے پر نا خواندگی کا نور ہو۔"

"چشنے والوں میں سب سے اونچی آواز خود علی کی تھی۔

شہروز گتا ایک طرف رکھ کر ٹشو پیپر سے منہ صاف کر رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ نے ایک چہرے کو اپنی گرفت میں لیا تھا۔

سفید چادر لپیٹے، کتابیں سینے سے لگائے وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں پوائنٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ بجلی کی تیزی سے اٹھ کر لپکا تھا۔

"ارے اس کو کیا ہوا؟" حیدر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"لڑکیوں کی طرف جا رہا ہے۔ شاید پٹنے کا ارادہ ہے۔" علی نے سادگی سے تبصرہ کیا۔

"ایکسکیوزمی...... نہ ہونے والی بھابی صاحبہ"

اس نے واقعی اس کو جا لیا تھا اور اب اس کے سامنے کھڑا دانت پیستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ریشم نے چونک کر اپنے سامنے کھڑے اس نوجوان کو دیکھا جس کا چہرہ اندرونی جذبات کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا اور جس کے عزائم جارحانہ معلوم ہوتے تھے۔ وہ اسے پلک جھپکنے میں پہچان گئی۔ خوف سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"کک۔ کیا بات ہے۔" وہ بمشکل ہکلائی۔

"جی کرتا ہے تمہاری بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کو کھلا دوں۔ کیا حق پہنچتا تھا تمہیں ہمارے گھرانے کی خوشیاں ملیامیٹ کرنے کا۔ ہماری آرزوؤں، امیدوں کو روندڈالنے کا۔"

"میں آپ کو نہیں جانتی۔" وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئی۔

"مگر میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اپنی شادی کی رات گھر سے بھاگ جانے والی ایک بدکردار لڑکی۔" اس کا سانس بری طرح پھول گیا۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا ریشم؟" اس دوران اس کی دوست مڑ کر واپس آئی تھی۔

"یہ۔ یہ پتا نہیں کون ہیں۔" وہ ہکلائی۔

"آؤ۔ پوائنٹ نکل جائے گا۔"

وہ اس کا بازو تھام کر لے گئی۔

شہروز کو جیسے کسی نے بلندی پر سے دھکا دیا تھا۔

"ریشم! ریشم! ریشم!۔"

وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔

"نہیں! ۔اس کا نام ریشم کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو غزالہ تھی۔ غزالہ! میں دھوکہ نہیں کھا سکتا یہ وہی چہرہ تھا بالکل وہی۔ میری آنکھیں جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں۔ یہ وہی تھی وہی۔"

"شہروز!" سلطان نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"آں۔ ہاں!" وہ چونکا۔



اس نے دروازہ کھولا۔ یونس بھائی کا چمکتا چہرہ روبرو تھا۔

"السلام علیکم۔" وہ ایک طرف ہو گئی۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔" خوشی سے ان کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔

"خیریت تو ہے بھائی جان؟۔"

"ارے بڑی خوشی کی خبر ہے۔ پھپھی بن گئی ہو۔" انہوں نے ایک چپت اس کے سر پر لگائی۔ "بیٹا ہوا ہے۔"

"اوہ! مبارک ہو۔"

"خیر مبارک۔ بھئی امی جان کہاں ہیں؟۔" وہ اندر کی طرف بڑھ گئے۔

"وہ وہیں تخت پر بیٹھ گئی۔ خوشی کی خبر تو تھی لیکن اس کے اندر نجانے کیا ٹوٹا تھا۔ عجب احساس زیاں ہوا تھا۔ ساری خوشیاں دوسروں کا مقدر کیوں تھیں۔ وہ کیوں ازل سے محروم قرار دی گئی تھی؟ اس نے کیا جرم کیا تھا؟ یہ سزا اس کا نصیب کیوں بنائی گئی تھی؟ اصل مجرم کون تھا۔ وہ ہر سمت سے حملہ آور ہوتی تلخ سوچوں کا مرکز تھی۔

"خدا خیر کرے۔ نصیب اچھے کرے۔" وحیدہ بیگم شاداں و فرحاں ٹوکری اٹھائے برآمد ہوئی تھیں۔ "ارے میرا ابھی کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ میں نے بھی خوشی کی گھڑیاں دیکھیں۔ ارے بچی۔ سنا تم نے۔ پوتا ہوا ہے میرا۔"

"جی۔ مبارک ہو۔" وہ آہستگی سے بولی۔

اس وقت نجانے کیوں وہ عجب سی تنہائی محسوس کر رہی تھی۔

"خیر مبارک۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"میں جا رہی ہوں یونس میاں کے ساتھ۔ شام کو یوسف کے ساتھ تم بھی آ جانا۔ ویسے یونس نے اسے فون کر دیا ہے۔"

"جی!"

"اچھا بیٹی۔ دروازہ بند کر لو۔"

وہ دونوں باہر نکل گئے۔ وہ بت بنی وہیں تخت پر بیٹھی رہی۔ ناخن سے تخت کی سطح کو کھرچتی وہ اپنی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اسے کیا ہو رہا تھا۔ کس شے کی محرومی نے اس ملال کو جنم دیا تھا۔ کیا چاہتی تھی وہ؟

بچہ؟ بچہ؟ یا محض اپنے ہونے کا احساس۔

ہاں، شاید وہ اپنے وجود کا احساس چاہتی تھی کہ وہ بھی ہے۔ اس کی بھی مکمل ذات ہے۔ اس کی بھی خواہشات ہیں۔ وہ بھی سوچ سکتی ہے، مانگ سکتی ہے، دے سکتی ہے۔

"ہے کوئی سمجھنے والا؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ "یوسف اتم نے مجھے تباہ کر دیا۔ تباہ کر دیا۔ اتنا بے قیمت تو نہ تھا میرا وجود کہ اسے کسی اور سے انتقام لینے کے لیے استعمال کیا جاتا۔ اتنی ارزاں تو نہ تھی۔ محرومیوں کے اس سمندر میں مجھے دھکیل کر کیا مل گیا تمہیں۔ کیا تسکین حاصل کرتے ہو مجھے یوں تنہا جلتا، سلگتا دیکھ کر۔"

"روتے روتے اس نے سر اٹھایا پھر آنسو پونچھ کر کھڑی ہو گئی۔

"زندگی کی خوشیوں میں میرا بھی حصہ ہے۔ اگر یہ دنیا مجھے نہیں دے گی تو میں چھین لوں گی۔ میں خوش رہنا چاہتی ہوں۔ کسی بھی قیمت پہ۔"

وہ ایک عزم کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

چند لمحوں بعد وہ مشعل جو الٹی گھر سے نکل رہی تھی۔ پچھلی سڑک کے کونے پر انعم کا جنرل اسٹور تھا۔ وہ کتنی ہی بار درخواست کر چکا تھا کہ وہ ایک بار آ کر اسے مل جائے۔



"نیلم! بہت خفا ہو۔"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ عباسی صاحب اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ پھر فائل کی جانب متوجہ ہو گئی۔

پچھلے تین دن سے وہ یونہی سر جھکا کر اپنا کام کرتی رہتی تھی۔ نظر اٹھا کر ان کی جانب دیکھتی بھی نہ تھی۔ انہوں نے بھی خود سے اسے مخاطب نہ کیا تھا۔ بس کام کی بات کرتے تھے اور "مس نیلم" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

آج تین دن کے بعد انہوں نے اس طرح پکارا تھا۔

"جی سر! کوئی کام ہے؟" اس نے بڑے اجنبی انداز میں پوچھا۔

''کیا تم خود کو مجھے معاف کر دینے پر آمادہ نہیں پا تیں نیلی؟'' وہ آزردگی سے پوچھنے لگے۔

''مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں جس پر آپ مجھ سے معافی طلب کریں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہہ کر سر جھکا لیا۔

''دل سے بھلا پاؤ تو بات بھی ہے۔ نیلم! تم بھی مجھے نہ سمجھ پائیں۔ تم سے تو مجھے بڑی امیدیں تھیں۔ تمہیں تو میں نجانے کیا سمجھ بیٹھا تھا۔ مجھے مایوس نہ کرو۔''

''سر! کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں؟'' وہ ہونٹ بھینچ کر بولی۔

عباسی صاحب ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔



''امی!'' فیروز تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا نیچے آیا تھا۔

عفت خانم نے ہاتھ میں پکڑی ٹرے جنا باجی کو تھما دی۔

''یہ لو جنا۔ باقی کے مٹر چھیل لو۔ آدھے فریز کر دینا، آدھے گوشت میں ڈال لو۔''

''امی۔'' وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔

''بولو بیٹے!'' وہ اس کی سمت متوجہ ہوئیں۔

''امی۔ میری کال آ گئی ہے۔ ٹریننگ کے لیے پشاور جانا ہے چھ ماہ کے لیے۔ پھر میری پوسٹنگ ہو جاتی ہے۔''

''اچھا! اللہ کا شکر ہے۔'' وہ مسکرا دیں۔ ''کب جانا ہے؟''

''بس ہفتہ بھر میں۔''

''چلو۔ اللہ بہتر کرے گا۔ جتنی محنت تم نے کی ہے اس کا اجر ملنے کا وقت آ گیا ہے۔''

''کیا باتیں ہو رہی ہیں چپکے چپکے۔'' شہروز ریکٹ گھماتا اندر چلا آیا۔ ''ماں بیٹا کیا سازشیں کر رہے ہیں۔''

''تمہارے خلاف بھڑکا رہا ہوں امی کو۔'' وہ مسکرایا۔ ''کہ جلدی سے اس کی شادی کر دیں۔''

''اچھا؟'' اس نے پاس بیٹھی جنا کے سامنے رکھی ٹرے سے مٹھی بھر کر مٹر اٹھا لیے۔ ''تو بھڑکا بے بھائی۔ امی جان! خدارا بھڑک اٹھیں۔ ورنہ ان دونوں بڑے بھائیوں نے مجھے تو کنوارا مارنے کا ارادہ باندھا ہوا ہے۔''

''خدا نہ کرے۔'' عفت خانم نے اسے گھورا۔ ''میرے تینوں بیٹوں کی خوشیاں خدا مجھے دکھائے اب خیر سے دونوں کے سر پر ایک ساتھ سہرا سجے گا۔ میں نے طے کر لیا ہے۔''

''لیجیے۔'' اس نے بے چارگی سے فیروز کو دیکھا۔ ''ابھی بھی دونوں ارے امی جان! خیر سے آپ کا تیسرا فرزند ارجمند بھی عمر عزیز کے چھبیسویں سال میں قدم رنجہ فرما چکا ہے۔ کچھ اس کے بارے میں بھی سوچیے۔''

"کسی قابل ہو جاؤ۔ اسی دن بارات لے جاؤں گی تمہاری۔ جہاں کہو گے۔" وہ مسکرا دیں۔

"کس کی بارات جا رہی ہے بھئی۔" بہروز احمد بریف کیس اٹھائے اندر داخل ہوئے تھے۔

"السلام علیکم امی جان!" وہ ماں کے قریب بیٹھ گئے۔

"وعلیکم السلام جیتے رہو۔" وہ مسکرائیں۔ "یہ شہروز مجھے اپنی عمر بتا رہا ہے۔ اس کا خیال ہے اب یہ شادی کے لائق ہو گیا ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے اس کا خیال۔ بے حد مناسب!" انہوں نے شہروز کی کمر ٹھونکی۔ "ڈھونڈیں اس کے لیے اچھی سی لڑکی۔"

"ارے یہ کام آپ لوگ مجھ پر چھوڑ دیں۔" وہ جلدی سے بولا تھا۔ "آپ کہاں تکلیف کریں گے۔" سب ہی ہنس دیے۔

"فیروز، بہروز احمد کو اپنی ٹریننگ کے بارے میں بتانے لگا۔

"بس پھر کچھ دن ایک برائٹ فیوچر تمہارا منتظر ہے۔" وہ مسکرائے تھے۔

"پھر ہو جائے اسی خوشی میں ہمہ وسا ڈنر۔" شہروز چہکا۔ "امی جان اور جمنا بائی کی مشترکہ پیشکش کے طور پر؟"

"کیوں نہیں ضرور۔" عفت خانم خوش دلی سے بولیں۔

"پڑوسیوں کو بلائیں گے۔" وہ مزید خوش ہوا۔

"صبا کو؟" عفت خانم نے ہنس کر پوچھا۔ "ہاں ضرور، بلکہ اس کی امی کو بھی کہہ کر آتا۔ بڑے دن ہو گئے ان سے ملے ہوئے۔"

"شہروز ان کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ غور سے بھائی کا چہرہ دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جس نے صبا کے ذکر پر مسکرا کر سر جھکا لیا تھا اور جس کے چہرے پر ایک اور ہی چمک اتری تھی۔ اور وہ خود کو "کیفیات و جذبات کا لاشیا" سمجھتا تھا، حیرت زدہ سا رہ گیا تھا۔

"تو کیا بھائی۔" وہ سوچ رہا تھا۔

❀......❀......❀

"ہیلو۔ہیلو۔" اس نے کچن کے دروازے میں سے منہ اندر کیا تھا۔

"کون؟" کیبنٹ بند کرتی نجمہ خاتون نے مڑ کر دیکھا۔ "ارے شہروز بیٹا! آؤ۔"

"السلام علیکم آنٹی۔" وہ بے تکلفی سے اندر داخل ہو گیا۔ "صبا کہاں ہیں۔"

"صبا!" انہوں نے لمحہ بھر کو تامل کیا۔ "ہاں۔وہ.....شاید سو رہی ہے۔"

"اس وقت؟" اس نے حیرانی سے گھڑی دیکھی۔ "ان کے سونے کا دورانیہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے آنٹی! صبح، دوپہر، شام، رات وہ کس وقت جاگ رہی ہوتی ہیں؟"

اسی لمحے صبا اندر داخل ہوئی تھی۔

"امی! میں۔" اس کی بات اس کے لبوں میں ہی رہ گئی۔

"لیجیے۔محترمہ کا ذکر ہوا اور یہ وہاں نہ پہنچیں۔ناممکن سی بات لگتی ہے۔ارے بھئی، اس سلسلے میں تو بڑی کہاوتیں ہیں۔"

"تم۔کب آئے۔" وہ نجانے کیوں چور سی بن گئی تھی۔

"بس ابھی۔" وہ ٹوکری میں سے سیب اٹھا کر جھاڑ پر رگڑنے لگا۔ "جب آپ سو رہی تھیں۔"

"نہیں میں تو پڑھ رہی تھی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"پھر آنٹی کو غلط فہمی ہوئی تھی۔" وہ سیب کھاتے ہوئے بولا۔

"اور بیٹا! تمہاری امی کیسی ہیں۔کیا حال ہے ان کا۔اتنا عرصہ ہو گیا ان سے ملے ہوئے۔" نجمہ خاتون نے بات بدلی تھی۔ "ان سے کہنا کبھی کبھار آ جایا کریں۔"

"فی الحال تو انہوں نے آپ کو دعوت بھیجی ہے۔" وہ مسکرایا۔ "کل رات کا کھانا آپ لوگ ہمارے گھر کھائیں۔"

"اچھا! کس سلسلے میں؟" وہ مسکرائیں۔

"بس یونہی۔مل بیٹھنے کے سلسلے میں۔ویسے فیروز بھائی جا رہے ہیں نا پشاور ٹریننگ کے لیے۔تو ہم لوگوں نے سوچا ان کے جانے سے پہلے ایک چھوٹی سی تقریب ہی منعقد کر لی جائے۔"

"ماشاءاللہ۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"پھر آ رہی ہیں نا آپ۔" وہ مڑا تھا۔

اپنے پیچھے صبا کو نہ پا کر وہ حیران رہ گیا۔

"ارے۔ابھی تو یہیں تھیں یعنی بداخلاقی کی حد ہو گئی۔"

نجمہ خاتون شرمندہ سی ہنسی ہنس دیں۔وہ بذات خود شہروز اور اس کی فیملی کو بے حد پسند کرتی تھیں اور اکثر ان لوگوں کی شرافت اور اعلیٰ

خاندان کی تعریف کیا کرتی تھیں۔ لیکن بیٹی کی مجبوری کو بھی سمجھ رہی تھیں بلکہ یہ خود ان کی ہدایت کا نتیجہ تھا۔

"کہاں گئیں؟ ان کے کمرے میں دیکھ لوں؟" وہ ان سے اجازت طلب کرنے لگا۔

"دیکھ لو۔" وہ قدرے تذبذب کے بعد بولیں۔

"بیٹی کا گریز بخوبی سمجھ رہی تھیں لیکن خود اتنے اچھے، پیارے سے لڑکے کا دل توڑنے کی ان میں ہمت نہ تھی۔ وہ اس کے کمرے کی سمت بڑھ گیا تھا۔ دروازے پر دستک دے کر وہ جواب کا منتظر تھا۔ "صبا! میں آسکتا ہوں؟" کوئی جواب نہ پا کر وہ قدرے بلند آواز میں بولا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے؟ ناراض ہیں؟" وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔

"نہیں تو۔" اس نے نظریں چرالیں۔

"پھر؟ اندر آنے کو نہیں کہیں گی؟"

"چلو۔ باہر چلتے ہیں۔"

"رہنے دیں۔ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا کہ کل آپ ہمارے گھر آئیں گی؟" وہ بجھ سا گیا۔ نجانے خود اس نے کیا سمجھا تھا۔

"کوشش کروں گی۔"

"اچھا۔ اللہ حافظ!" وہ وہیں سے پلٹ گیا۔

"اللہ حافظ!" اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔

دو آنسو اس کی پلکوں پر آ گئے تھے۔



"نیلم!"

"وہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی تھی۔ اماں کی آواز سن کر چونک کر اٹھ بیٹھی۔

"اماں۔ آئیں بیٹھیں۔"

"تھک گئی ہو؟" انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں۔ یہ تو روز کا معمول ہے۔ اب تھکنا کیسا۔" وہ اماں کی آمد پر دل ہی دل میں حیران ہو رہی تھی۔

"یونس میاں کے بیٹا ہوا ہے۔ وحیدہ بیگم نے مٹھائی بھجوائی ہے۔ تمہارے آنے سے کچھ دیر قبل یوسف آئے تھے۔" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"اچھا! پھر ہو آئیں آپ بھی ان کی طرف۔" وہ کچھ لمحے خاموش رہ کر گویا ہوئی۔ "کیا دیں گی؟"

"پیسے ہی دوں گی۔ دینے کا مسئلہ نہیں ہے۔" وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

"نیلم کی نظروں میں استفہام تھا۔

"وہ استفسار کریں گی۔ یوسف میاں کے سلسلے میں کیا جواب دوں؟"

"اماں!" وہ بے کلی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔ "میں ساری بات کر تو چکی ہوں۔ اب اور کیا چاہتی ہیں آپ مجھ سے؟"

"نیلم! بیٹی۔ یہ کوئی اتنا مسئلہ نہیں ہے جسے تم نے زندگی اور موت کا معاملہ بنا لیا ہے۔ تمہاری انا تمہاری بہن کی خوشیوں سے بڑھ کر ہے تمہارے لیے؟"

"بات انا کی نہیں ہے اماں!" وہ تڑپ اٹھی۔ "آپ مجھے یہ بتائیں، جو شخص آپ کی ایک بیٹی کو زندہ در گور کیے ہوئے ہے، کیا گارنٹی ہے کہ وہ دوسری کو بہت خوش رکھے گا؟ اماں، وہ بہت شدت پسند شخص ہے۔ کیا اب تک کے حالات و واقعات سے آپ کو اندازہ نہیں ہو سکا؟ مجھے اس کے جنون اور انتقام پسند طبیعت سے خوف آتا ہے۔ کیا میرے یہاں ہوتے ہوئے شبنم کو یہاں نہیں لایا جا سکتا؟"

"اس نے شبنم کو طلاق دینے کی شرط یہی رکھی ہے کہ تم اس سے شادی پر رضامند ہو جاؤ۔ پھر مجھے اس میں کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ مسئلہ تو بعد میں بھی بے چاری شبنم کو ہی ہونا ہے۔ نہ جانے پھر کب تک وہ قسمت کھلنے کے انتظار میں بیٹھی رہے گی۔ تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ آج میں نے اس سلسلے میں یوسف میاں سے بھی بات کر لی ہے۔ انہوں نے مجھے مطمئن کر دیا ہے۔ تم خوش رہو گی نیلم! یقین کرو۔"

وہ خاموش بیٹھی لب چباتی رہی۔ وہ جانتی تھی، اماں، شبنم کو بے حد چاہتی تھیں۔ اس کی محبت نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور وہ ہر قیمت پر اس کی رہائی چاہتی تھیں اور نیلم جانتی تھی۔ یہ قیمت اس نے ادا کرنی تھی۔

"ٹھیک ہے اماں!" اس نے آزردگی سے سر جھکا لیا۔ "میں جانتی ہوں میں نے آپ کو بہت دکھ دیے ہیں۔ حالانکہ خدا گواہ ہے، میں نے ہمیشہ آپ کی اور اپنی بہنوں کی خوشیاں چاہی ہیں۔ پھر بھی حالات نے مجھے ہمیشہ آپ کی نظروں میں قصوروار اور قابل نفرت ٹھہرا دیا ہے۔ اگر اپنے وجود کی قربانی دے کر مجھے آپ کی نظروں میں سرخروئی حاصل ہو سکتی ہے تو یونہی سہی۔"

"آپ کا جو دل چاہے کیجیے۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔

"نیلم!" اماں نے اسے گلے لگا لیا۔ "مجھے غلط نہ سمجھ میری بچی! تو بھی میری اولاد ہے۔ تجھے بھی میں نے اپنے پیٹ سے پیدا کیا ہے۔ مجھے تجھ سے نفرت نہیں ہے۔ بس تیرے ضدی پن سے ذرا پریشان رہتی تھی میں۔ لیکن آج تو نے میری ہر شکایت دور کر دی ہے۔ میرا مان رکھ لیا۔ یقین رکھ، ماں کا کہا مان کر تو بہت خوش رہے گی۔"



اندر بڑے ہال میں نکاح ہو رہا تھا۔ گھر کے تمام افراد اندر تھے۔ اور باہر لان میں بچھی کرسیوں پر بیٹھی اکا دکا مہمانوں کے درمیان بیٹھی الماس کسی گہری سوچ میں تھی۔

"بڑی سادگی سے کر رہے ہیں یہ لوگ۔" کسی مہمان خاتون کی آواز تھی۔

"ہاں۔ کہہ رہے ہیں۔ دولہا والوں کا اصرار ہے۔ کہ سب کچھ اسلامی طریقہ پر ہوگا۔ نہ جہیز کا لین دین ہوگا۔ نہ سلامیوں کا کوئی چکر ہوگا۔ انتہائی سادگی سے نکاح اور رخصتی ہوگی۔ حق مہر شرعی ہوگا۔ ارے ہمارے پردے رکھنے کے طریقے ہیں۔ ورنہ کرنے والے کب کسی کی سنتے ہیں۔"

کسی نے تفصیلاً جواب دیا۔ غالباً وہ الماس کی وہاں موجودگی سے بے خبر تھیں۔ ویسے بھی اس کی ان خواتین کی جانب پشت تھی۔

"اصل میں ان لوگوں کا اپنا تو کچھ ہے نہیں۔ سب کچھ چچا کا ہے۔ تو جب سے چھوٹی والی نے اپنا کوئی چکر چلایا ہے، چچا کا دل برا ہو گیا ہے۔ اب وہ نہیں کچھ کرنے کے۔"

"سنا ہے، اس نے کسی گویے سے نکاح کر لیا تھا؟"

"پتا نہیں بہن! جتنے منہ اتنی باتیں۔ سننے میں تو یہ بھی آیا تھا کہ عثمان خان کسی پرائیویٹ اسپتال میں اس کا بچہ ضائع کروا کر آئے ہیں۔ بڑی آوارہ سی لڑکی ہے۔"

"اس کا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا۔ اتنے تلخ ریمارکس، ایسی زہریلی کٹیلی باتیں وہ کب کچھ سننے یا برداشت کرنے کی عادی تھی۔ ایک کہنے والے کو دس سنایا کرتی تھی۔

لیکن آج اس میں اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ وہ وہاں سے اٹھ کر چلی جاتی۔ قدموں سے جیسے جان نکل گئی تھی۔ اسے تو علم بھی نہ ہوا کب اس کی حماقتوں کے چرچے گلی کوچوں میں پھیل گئے وہ تو بے خبری میں، بنا دیکھے بھالے آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔

ایک بت کی طرح ساکت بیٹھی وہ کانوں میں گونجتے فقرے سن رہی تھی۔ جب اس کی نگاہ سامنے سے آتی صبا پر پڑی اس کے عقب میں دانیال ہاشمی اپنی تمام تر وجاہتوں کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ الماس اٹھ کر ان کی جانب بڑھ گئی۔

"ہیلو صبا!" اس نے صبا کا رخسار چوما "بہت انتظار کرایا۔"

"یہ، دانیال ہی دیر سے آئے۔" صبا قدرے شرمائی ہوئی تھی۔ "میں تو تیار تھی۔"

"الماس نے ان دونوں کو ایک نظر دیکھا، بلاشبہ بڑی خوبصورت جوڑی تھی۔

چوڑی دار گرین پاجامے اور جالی کے رائل بلیو کرتے دوپٹے میں ملبوس صبا بڑی نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کا سلونا رنگ آج خوب دمک رہا تھا، کانوں میں پڑے آویزے جب ہلتے اس کے رخساروں پر روشنی سی بکھیر دیتے۔

دانیال ہاشمی سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس تھا۔ گوری رنگت اور ستواں ناک کے ساتھ وہ ایک نظر میں بڑا اکھڑ اور خود پسند لگتا تھا۔

"آیئے دانیال صاحب! میں آپ کو اپنے بھائیوں اور کزنز سے متعارف کراتی ہوں۔" وہ اس سے مخاطب ہوئی۔

"چلیے!" وہ خوش دلی سے اس کے ساتھ ہولیا۔

وہ اسے اپنی ہمراہی میں لے کر لان کے دوسرے حصے کی طرف بڑھ گئی۔ چلتے چلتے اس نے کن انکھیوں سے اپنے ساتھ ساتھ چلتے اس دراز قامت وجیہہ شخص کو دیکھا نجانے اس کے دل کو کیا ہونے لگا۔

"ایسا کیا ہے تجھ میں صبا؟ جو تجھے یہ حسین دلکش نوجوان تمام تر شدتوں کے ساتھ چاہنے کے لیے مل گیا ہے، اور مجھ میں کیا کمی تھی جو مجھے ایک بے قیمت شخص ٹھکرا کر چلا گیا۔ انسانوں سے زیادہ طاقت ان کے نصیبوں میں کیوں رکھ دی خدا نے..... ہر شخص کا مقدر اس کی صورت جیسا کیوں نہیں ہوتا؟ ہونا چاہیے۔"

"عدنان......" اس نے پاس سے گزرتے عدنان کو روک لیا "ان سے ملو، دانیال ہاشمی صبا کے منگیتر اور عنقریب ہونے والے شوہر!"

"اس کی زبان سلگنے لگی۔

"السلام علیکم۔" عدنان بڑے تپاک سے ملا۔

"ان کو کمپنی دو، بور نہ ہونے دینا۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔" دانیال مسکرایا "یہ کام میں نے سیکھا ہی نہیں۔"

ان دونوں کو چھوڑ کر پلٹ کر صبا کے پاس چلی آئی۔

"نکاح ہوگیا۔"

"ہاں بس کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"تم میرا خیال نہ کرو الماس! اندر جاؤ، تصویریں وغیرہ بن رہی ہوں گی۔"

"جس شخص کے ہاتھ میں کیمرہ ہے نہ وہ میری صورت دیکھنا پسند کرتا ہے نہ میں اس کی، اس لیے جانے دو کوئی اور بات کرو..... اور وہی کیا گھر میں اب کوئی بھی میری صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا۔" وہ بولی۔

"الماس!" صبا اسے دیکھ کر رہ گئی "کیوں اس قدر تلخ ہوگئی ہو؟"

"میرے پاس دانیال ہاشمی جیسی کوئی مٹھائی نہیں ہے شاید اس لیے۔" وہ دیوانوں کی طرح ہنسی "ویسے اگر تم تھوڑی دیر پہلے آئی ہوتیں تو میں تمہیں کچھ مہمان خواتین کی بڑی مزے دار گفتگو سنواتی۔ پھر تم خود بہتر طور پر میری تلخی کو سمجھنے کے قابل ہو جاتیں۔"

"لوگوں کا کیا ہے۔" صبا آہستگی سے بولی۔ "لوگ تو ہمیشہ ہی دوسروں کو پستیوں میں دھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تمہیں خود سنبھلنا ہوگا، ہاتھ پاؤں چھوڑ کر خود کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوگی تو اپنی ذات کے گہرے گڑھوں میں ہمیشہ کے لیے مقید ہو جاؤ گی سنبھلنے کی کوشش کرو الماس!"

"وہ پھر کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن خاموش ہوگئی۔ سرخ شرارے میں ملبوس مہناز کو سیماب اور مہوش اسٹیج کی طرف لے جا رہی تھی۔ سب لوگ

اسی جانب متوجہ ہو گئے۔

"بڑی خوبصورت لگ رہی ہے مہناز، ہے نا۔" صبا نے تبصرہ کیا" کہاں سے تیار ہوئی ہے؟"

"گھر میں ہی تیار کیا ہے سیماب نے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"رئیلی بڑا لُک آیا ہے؟"

" وہ خاموش بیٹھی لب کاٹتی رہی ایک وقت تھا اس کی وجہ سے مہناز کا کہیں رشتہ طے نہیں ہو پاتا تھا جو بھی آتا، اس کا خواہش مند ہو بیٹھتا تھا، اسی پر فریفتہ ہو جاتا۔

آج وہ ایک اندھیرے گوشے میں خود کو چھپائے بیٹھی تھی اور مہناز روشنیوں سے چمکتے اسٹیج پر جلوہ افروز تھی۔ سب لے سر اور ہے تھے اور اس کا کوئی طلبگار نہ تھا۔

"خدا نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا......" اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ "میں اتنی بری بھی نہیں تھی۔"



گاڑی گیٹ کے آگے رکی تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ رخصتی میں اتنی دیر ہو گئی تھی اور پھر الماس نے ان دونوں کو زبردستی روکے رکھا تھا۔ صبا بے حد پریشان ہو رہی تھی۔

"میں اندر چلوں؟ دیر ہو جانے پر معذرت طلب کرنے؟" وہ اسٹیرنگ پر دونوں بازو رکھے قدرے آگے کو جھکا ہوا بڑی شرارت سے اس کی پریشان صورت دیکھ رہا تھا۔

"جی......؟ جی نہیں۔ اب آپ جائیں، بہت دیر ہو گئی ہے۔" وہ اترنے لگی۔

"سوچ لیں، ڈانٹ تو نہیں پڑے گی۔" وہ جان بوجھ کر جیسے اسے روک رہا تھا۔

"نہیں! امی ابو نے مجھے خود آپ کے ساتھ بھیجا ہے مکمل اعتماد کے ساتھ ڈانٹ تو نہیں پڑے گی بس مجھے ہی شرمندگی سی ہے۔"

"اچھا......! ویسے ایک بات ہے۔ یہ شرمندگی بڑی سوٹ کرتی ہے آپ پر۔"

صبا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہ وقت تھم نہیں سکتا صبا؟ ایسا نہیں ہو سکتا تم نہ جاؤ۔ یہیں اسی طرح، میرے مقابل بیٹھی یوں ہی لب کاٹتی رہو؟ ویسے یہ غریب کیا کہتے ہیں تمہیں......اتنا ظلم کرتی رہتی ہو ان کے ساتھ۔"

"اس کا لہجہ۔ صبا کی ہتھیلیاں بھیگ گئیں۔

"اللہ حافظ۔" وہ جلدی سے نیچے اتر گئی۔

"اللہ حافظ۔" وہ ہنس کر سیدھا ہو گیا تھا۔

وہ گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو وہ گاڑی بڑھا لے گیا۔

اندر مجمہ خاتون اس کی منتظر تھیں۔

"امی دیر ہوگئی نا۔" وہ جھجک سی گئی تھی۔

وہ مسکرا دیں۔

"ہاں اس طرح کی تقریبات میں دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔"

"ابو کہاں ہیں؟ ناراض تو نہیں ہیں؟" ان کا موڈ بحال پا کر سکون سے بیٹھ گئی۔

"نہیں بیٹی! وہ کیوں ناراض ہونے لگے؟ تھک گئے تھے، اسی لیے جلدی سونے چلے گئے۔ میں جب شہروز کے ہاں سے آئی تو وہ اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔"

وہ جوتے اتارتے اتارتے رک گئی۔

"وہ لوگ میرا پوچھ رہے ہوں گے۔" آہستگی سے اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں...... عفت خانم تو بار بار استفسار کر رہی تھیں۔ میں نے کہا اتفاق سے آج ہی اس کی عزیز ترین دوست کے ہاں بھی تقریب تھی۔ وہ وہاں چلی گئی۔"

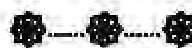
"شہروز کیا کہہ رہا تھا؟" اسے شہروز کے ساتھ کی جانے والی زیادتی کا احساس تھا۔

"شہروز بے چارہ تو چپ چپ سا تھا۔ زیادہ بول نہیں رہا تھا جیسا کہ وہ باتونی ہے کھانا کھایا اور چلا گیا۔"

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اور بھی کسی نے اس کا پوچھا تھا یا نہیں...... کسی کی آنکھوں میں اس کے انتظار کی چمک تھی یا نہیں، کسی کا چہرہ اسے نہ پا کر بجھ گیا تھا یا نہیں۔

"لیکن وہ کچھ بھی نہ پوچھ پائی اٹھ کر جوتے ہاتھ میں اٹھائے اور ننگے پیر کارپٹ پر چلتی باہر نکل گئی۔ رات بڑی دیر تک اسے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی نجانے کیسے کیسے خیالات اسے پریشان کر رہے تھے۔

کبھی شہروز کو سوچتی، کبھی الماس کو، کبھی دانیال ہاشمی کا خیال آتا اور کبھی وہ عکاظ فضل اپنی ساری مضبوطی کے ساتھ اس کے مقابل جم جاتا۔



شبنم، چچی کے پاس بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھی۔ ساتھ ہی کبھی کبھار ایک نظر سامنے والی چھت پر بھی ڈال لیتی تھی۔ وہ چھت پر موجود تھا۔ کبھی ٹہلنے لگتا تھا، کبھی آ کر چھوٹی سی منڈیر پر اچک کر بیٹھ جاتا۔ دو مرتبہ اسے اشارے سے چھت پر آنے کا کہہ چکا تھا، لیکن عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا اور چچی اس وقت اس کا چھت پر جانا پسند نہیں کرتی تھیں۔

"یوسف بھی آفس سے آ چکے تھے۔ نہا دھو کر، چائے کا کپ تھامے ان دونوں سے قدرے فاصلے پر رکھی کرسی پر بیٹھے اخبار میں گم تھے۔

شبنم کا جی چاہتا تھا، وہ انیس کو دیکھ لیں اور اس کی شبنم میں دلچسپی کو بھانپ لیں انہیں احساس ہو کہ ان کی حسین، جوان بیوی کو چاہنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ اسکے دل میں بھی حسد اور نفرت کے شعلے بھڑک اٹھیں، وہ بے دھڑک بار بار سامنے چھت پر نگاہ ڈال کر مسکرا رہی تھی۔

اسی وقت دروازہ کھول کر اماں اندر داخل ہوئی تھیں، ناصر ان کے ہمراہ تھا۔

"اماں۔" وہ بے اختیار اٹھ کر ان کے سینے سے جا لگی۔ "خیال آ گیا بیٹی کا۔"

"مجھے تو جیسے پھر تیرا ہی خیال رہتا ہے میری بچی۔" انہوں نے اس کی پیشانی چومی "ٹھیک تو ہے؟۔"

"جی رہی ہوں!۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

اماں کو دیکھ کر دل بے قرار ہو اٹھا تھا۔

"غم نہ کر..... تیری خوشیوں کے لیے ہی آئی ہوں" انہوں نے جیسے سرگوشی کی تھی۔

وہ حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر اماں آگے بڑھ کر وحیدہ چچی اور یوسف سے علیک سلیک کرنے لگیں۔ اس نے ناصر کو گلے سے لگا لیا۔

"اتنا بڑا ہو گیا ہے میرا بھائی، مجھے تو خبر بھی نہیں ہوئی۔"

"آپ آتی جو نہیں ہیں ہمارے گھر، ہم لوگوں سے ناراض ہیں آپ شبنم آپی؟۔"

شبنم نے اس کی پیشانی چوم لی۔

"میں تو دنیا سے خفا ہوں میرے چاند..... زندگی سے روٹھی ہوئی ہوں۔"

وہ پلکوں کی نمی کو چھپاتی کچن میں گھس گئی۔ اماں کی آواز سننے کے لیے درمیان والی کھڑکی کھول لی تھی۔

"کب آ رہی ہے ثریا واپس؟۔" اماں پوچھ رہی تھیں۔

"چھلہ نہا کر ہی آئے گی میرا تو جی چاہ رہا تھا اپنے پوتے کو اٹھا کر لے آؤں۔" چچی ہنسیں۔

"ایسا خوبصورت ہے، چاند جیسا مکھڑا ہے۔ بالکل میرے یونس پر گیا ہے..... ثریا کا تو ایک نقش نہیں لیا۔"

"نہیں، اب ایسی بھی بات نہیں۔ ثریا ماشاء اللہ خوبصورت لڑکی ہے۔ اس پر پڑتا تب بھی اچھا ہی ہوتا۔" اماں بولیں۔

"پتا نہیں۔" چچی جل گئیں "ہمیں تو کبھی نہیں لگیں وہ خوبصورت، یونس میاں ہی مر مٹے تھے۔ میں تو راضی نہ تھی۔"

"شادی کے معاملے میں بچوں کی پسند کو ہی اولیت دینی چاہیے وحیدہ!۔" اماں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"زبردستی کے جو معاملے تھے ان کے نتیجے تمہارے سامنے ہیں، ایک پورا خاندان جیسے آگ کی لپیٹ میں ہے۔"

"ضد تو تمہاری اپنی بیٹی کی تھی زبیدہ!" چچی قدرے تامل کے بعد بولیں "خیر اب کیا دہرانا گزری باتوں کو، آمد کی کہو۔"

"خوش خبری لے کر آئی ہوں..... نیلم مان گئی ہے۔" اماں کے لہجے میں خوشی تھی۔

شبنم کے ہاتھوں میں بڑے کانپ گئی، کپ آپس میں ٹکرا کر چھنک اٹھے۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔

"اچھا......!" چچی کے لہجے میں کوئی گرم جوشی نہ تھی۔ مجبوری کا گہرا احساس تھا۔

"سچ کہہ رہی ہیں چچی جان۔" یوسف کی آواز میں فتح کا خمار تھا۔ "نیلم نے ہاں کر دی؟"

"ہاں بس اب جلد از جلد سارے مراحل طے کر لو، میں اپنی بیٹی کو یہاں سے لے جانا چاہتی ہوں۔" اماں کی آواز بھرا گئی۔

شبنم دم بخود کھڑی تھی۔ چائے ابل ابل کر چولہے پر گر رہی تھی۔ چھن چھن کر آوازیں اس کے ارد گرد پھیل رہی تھیں۔ لیکن اسے مطلق احساس نہ تھا۔

"تو ڈراما ختم ہوا۔" وہ تلخی سے سوچ رہی تھی۔ "ہیرو ہیروئن ہنسی خوشی مل جائیں گے۔ پچھلے دکھ، پچھتاوے، رنجشیں بھلا کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں گے...... اور میں نقصان ہی نقصان، خسارے ہی خسارے اپنے دامن میں سمیٹ کر اپنی ماں کی دہلیز پر جا بیٹھوں گی، جہاں پھر کبھی کوئی خواب میری آنکھوں میں نہ اترے گا...... کبھی کوئی امید میرے دل میں سر نہ اٹھائے گی۔ ساری عمر ان دونوں کو ہنستا مسکراتا دیکھوں گی اور جل جل کر ایک دن میرا وجود راکھ میں تبدیل ہو جائے گا۔



الماس ناشتے کی میز پر تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔

سامنے رکھے ہوئے انڈے اور دودھ کے گلاس کو خالی خالی نظروں سے تک رہی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے وہ ناشتے میں یہ دونوں چیزیں مانگتی تھی اور جب نسرین خالی برتن اٹھانے آتی تو ابلا ہوا انڈہ سالم پلیٹ میں موجود ہوتا اور دودھ کا گلاس ویسے ہی لبالب بھرا ہوتا اور وہ اٹھ کر جا چکی ہوتی تھی۔

گھر میں اس کے سوائے سب جلدی اٹھ کر ناشتہ کرنے کے عادی تھے، وہ بارہ بجے پہنچ آتی تو ٹیبل خالی ملتی۔

کوئی دھیرے سے اس کے مقابل رکھی کرسی پر آ کر بیٹھا تھا۔ الماس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"آپ گئے نہیں؟" اس نے عثمان خان کو دیکھ کر حیرت سے دریافت کیا۔

"جا کر واپس آ چکا ہوں۔" وہ مسکرائے "تین بجے ایک آپریشن ہے پھر جانا ہے۔ کیا بات ہے الماس! ناشتہ کیوں نہیں کر رہی ہیں؟"

"جی نہیں چاہ رہا۔" وہ بے دلی سے بولی۔

"بری بات ہے...... آپ بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ کھانے پینے کا دھیان رکھا کریں۔" وہ دھیرے سے ہنس دی۔

"میں...... خاص طور پر ایک چیز دکھانا چاہ رہا تھا آپ کو......" انہوں نے ہاتھ میں رول کیا ہوا اخبار ٹیبل پر رکھ دیا۔

"کیا......؟" وہ چونکی۔

"پتا نہیں آپ کو یہ خبر دیکھنی درست ہے یا نہیں، لیکن پچھلی ملاقات پر آپ نے غصے کے عالم میں مجھ سے کچھ باتیں کہی تھیں...... جو کچھ آپ

کے دل میں تھا۔ آپ نے کہا تھا..... مجھے وہ باتیں بہت تکلیف دیتی رہی ہیں اس لیے میں یہ خبر خصوصی طور پر آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔"

"کیا کہا تھا میں نے جس سے آپ کو تکلیف ہوئی؟" اس نے روکھے سے لہجے میں پوچھا۔

"آپ نے کہا تھا..... "وہ لمحہ بھر کے لیے رُکے" کہ میں نے جان بوجھ کر آپ کو رضا کا نہ ہونے دیا۔ جبراً..... بقول آپ کے.....
سازشوں کے جال بچھا کر آپ کو رضا سے علیحدہ کر دیا کیونکہ میں آپ سے انتقام لینا چاہتا تھا۔"

وہ خاموش بیٹھی، ناخن سے میز کی سطح کھرچتی رہی۔ اس نے ان کی باتوں کی تردید کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ وہ حقیقتاً ایسا ہی سمجھتی تھی۔

"میرا خیال ہے، آپ کو یہ دیکھنا چاہیے۔"

انہوں نے اچانک اخبار کھول کر اس کے آگے ڈال دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں نے آپ کو خوش دیکھنا چاہا ہے۔ میری جانب سے اپنا دل صاف کر لیجیے۔" وہ مڑ کر باہر نکل گئے تھے۔

اس نے تعجب سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا پھر اخبار اٹھا لیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ رضا مراد کی تصویر مع ایک بڑی خبر کے لگی تھی۔ وہ جلدی جلدی خبر پڑھنے لگی۔

لڑکیوں کی تصاویر اور ٹیپ شدہ فون کالز کے ذریعے بلیک میلنگ کے جرم میں اسے گرفتار کر لیا گیا تھا، اس کے پاس سے بڑی تعداد میں ایسا مواد ضبط کیا گیا تھا۔

خطوط، تصاویر، کیسٹیں اور ٹیلی فون نمبرز پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیے تھے۔ کسی اعلیٰ افسر کی بیٹی کو ٹریپ کرنے کے چکر میں وہ خود ٹریپ ہو گیا تھا۔

"اوہ گاڈ۔"

اس نے اپنا سر تھام لیا۔

"اسکے پاس تو میرے بھی فوٹو گرافس ہوں گے..... میری ٹیپ شدہ کالز بھی ہوں گی..... اگر یہ سب کچھ منظر عام پر آ گیا تو..... اوہ....."

وہ گھبراہٹ کے عالم میں کھڑی ہو گئی پھر تیزی سے عثمان خان کے کمرے کی طرف بڑھی۔

"میں اندر آ سکتی ہوں۔"

دروازہ کھلا تھا وہ وہیں رک کر پوچھنے لگی۔

"آئیں!" انہوں نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں سے اسے دیکھا۔

وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

"کیسے؟ مجھ سے شکایت دور ہوئی آپ کی؟" سنجیدگی سے پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے وہ پوچھنے لگے۔

"وہ..... عثمان....." وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔ "اگر اس کے پاس میری....."

''خفت سے اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا تھا، وہ بات مکمل نہ کر سکی۔

''بے فکر رہیں، آپ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ میں سب کچھ پہلے ہی ہینڈل کر چکا ہوں۔ ویسے آپ یہ بھی پوچھ سکتی تھیں کہ اگر وہ ایک بلیک میلر تھا تو اس نے آپ کو بلیک میل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟'' ان کے انداز میں بلا کا اطمینان تھا۔

الماس نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس پہلو پر تو اس نے غور ہی نہ کیا تھا۔

''آئی ایم سوری الماس..... مجھے دیر ہو رہی ہے پھر بات کریں گے۔''



صبا بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھیں، جب فون کی بیل نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔

''صبا بیٹی! فون سنو.....'' نجمہ خاتون کچن سے کہہ رہی تھیں۔

''جی امی۔''

وہ اٹھ کر فون تک آئی۔

''ہیلو۔'' بڑے لاابالی سے انداز میں اس نے کہا۔

''ہیلو..... السلام علیکم! صبا بات کر رہی ہیں؟'' بڑا شائستہ لہجہ تھا۔

وہ لمحہ بھر میں آواز پہچان گئی، اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

''جی۔'' اس نے تھوک نگلا ''کون صاحب؟''

بے حد انجان بن کر اس نے پوچھا تھا۔

''فیروز بات کر رہا ہوں۔''

کتنے خوب صورت انداز میں بولتا تھا۔ صبا کا دل عجیب سی لے میں دھڑکنے لگا۔

''فرمایئے۔''

''صبا! آپ آئیں نہیں ہمارے گھر، ہم لوگ انتظار ہی کرتے رہ گئے۔'' لہجے میں بڑی خوشبو تھی۔

''کیوں کرتے رہے انتظار..... کیوں؟ اب کیوں کرتے ہو میرا انتظار، جب تمہاری سمت سفر کرتے کرتے میرے پیروں میں آبلے پڑ گئے اور تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں پتھرا گئیں اور تمہارے اردگرد کھڑی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر میں نے خود کو لہولہان کر لیا۔ اب یہ شوق آمیز لہجہ، یہ بے قرار انداز، یہ خوشبودار لفظ کہاں تھے؟ اب میرے منتظر ہو؟ کیوں؟''

اس کا پورا وجود سلگنے لگا۔

''جی میں ایک تقریب میں گئی ہوئی تھی۔'' اس نے خود پر قابو پا کر قدرے خشک لہجے میں کہا تھا۔

"بہر حال میں مایوس ہوا، میں...... نجانے کیوں...... جانے سے قبل ملنا چاہتا تھا آپ سے۔"

"مردوں پر کوڑے برساتے ہو، لاشوں کی بے حرمتی کرتے ہو شرم نہیں آتی تمہیں۔" اس کے گالوں پر نمی اتر آئی تھی۔

"کیوں؟" بڑے سرد سے پن سے اس نے پوچھا "کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے؟"

"پتا نہیں حبا...... مجھے آپ سے یہ سب کچھ کہنے کا کوئی حق ہے بھی یا نہیں لیکن میرا دل چاہتا ہے ایک بار آپ سے یہ سب کچھ کہہ دینے کو، آپ کا شکریہ ادا کرنے کو، آپ مجھے ملامت کیجئے گا، نہ میری باتوں کو کوئی غلط معنی پہنائیے گا۔"

"کیوں سنوں میں وہ سب کچھ جو کہنے کو تمہارا دل چاہتا ہے۔ تم نے کب وہ سب کچھ سنا تھا جس نے ایک مدت تک میرے دل میں رہ کر زخم ڈال دیے ہیں۔"

اس نے کہنے کا ارادہ کیا لیکن پھر خاموش رہی نجانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔

"صبا! زندگی پر میرا اعتبار لوٹانے کا شکریہ میں بڑا مجروح شخص تھا، میرے جذبات احساسات، خیالات، سب کچھ زخم زخم تھا۔ آپ نے مجھے روحانی طور پر سہارا دیا ہے میری بیمار روح کا علاج کیا ہے زندگی پر میرا اعتبار لوٹا دیا ہے۔ میں دن میں کئی مرتبہ خیالوں میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں...... میرا جی چاہتا تھا ایک مرتبہ آپ کے مقابل بیٹھ کر یہ سب کچھ کہوں...... اسی لیے میں کل آپ کا منتظر تھا...... لیکن خیر......!"

"لیکن میں نے ایسا کیا کیا ہے؟" وہ بوجھل آواز میں بولی۔

وہ ہولے سے ہنس دیا۔

"بعض لوگ اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ ان کی اچھائی، ان کی عظمت اندر مقید کسی بیماری کسی برائی کو تحلیل کر دیتی ہے یوں جیسے کبھی کوئی بیمار تھا ہی نہیں، شاید اچھے لوگوں کو خود اس بات کا احساس نہ ہو پاتا ہو لیکن بہر حال مسیحائی کا ہنر انہی میں چھپا ہوتا ہے۔ میرے اندر ایک گرہ لگی ہوئی تھی۔ صبا وہ آپ نے کھولی ہے چاہے آپ کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو کل میں جا رہا ہوں۔ واپس لوٹوں تو شاید آپ یہاں نہ ہوں، اس لیے سوچا شکریہ مبارکباد بھی دے ڈالوں، بعد میں موقع ملے نہ ملے۔"

"کیوں آئیں گے نہیں؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا۔

"کیوں نہیں؟" پھر وہ بولا تھا۔ "آپ بلائیں گی...... تو ضرور آؤں گا۔"

"اس کی آواز کی کسی لہر میں، لہجے کی کسی پرت میں، ہلکا سا درد تھا...... یا شاید حبا کا وہم تھا۔

"اچھا...... اللہ حافظ......!" اس نے اچانک ہی ریسیور رکھ دیا تھا۔

"اللہ حافظ......" وہ دیر تک ریسیور کو گھورتی رہی تھی۔



رات دو بجے کا وقت تھا۔

شبنم بڑی آہستگی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تھی۔ لمحہ بھر کو اس نے چچی کے کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر ان کے خراٹے سنے۔

پھر اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سیاہ چادر میں خود کو لپیٹا اور دروازہ کھول کر گلی میں نکل آئی۔

سامنے والے گھر کا دروازہ اسے کھلا ہوا ملا تھا، وہ بڑی احتیاط سے اندر داخل ہوئی۔ صحن کے کونے میں بنی سیڑھیاں چڑھ کر وہ چھت پر پہنچ گئی۔ چھت کے کونے میں ایک سرخ شعلہ سا روشن تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی اس تک پہنچ گئی۔

''آ گئیں جانم.....!'' اس نے سگریٹ زمین سے مسل کر بجھا دی اور اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔

''فردوس آپا کہاں ہیں.....؟'' اس کے انداز میں قدرے گھبراہٹ تھی۔

''فکر نہ کرو، چائے میں دو گولیاں نیند کی ڈال کر دی ہیں انہیں، وہ لمبی تان کر سوئی ہوئی ہیں۔'' اسکے انداز میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔



آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا اور ہوا قدرے خنک اور خوش گوار تھی۔ نجانے کیا بات تھی۔ اس رات میں، شبنم کو وہ اپنی زندگی کا حاصل لگنے لگی۔ زندگی کے جلتے، تپتے صحرا میں وہ رات جیسے کسی گلستان کا ٹکڑا تھی۔

ایک بھرپور مردانہ چاہتوں کے مکمل اظہار کے ساتھ اس کے روبرو تھا۔ اسے چاہ رہا تھا، سراہ رہا تھا۔ بس اتنا ہی تو چاہا تھا اس نے اپنی زندگی سے، اتنا ہی مانگا تھا قسمت سے، یہی ایک خوشی تھی جس کی طلب اس نے کی تھی۔

آنکھیں موند کر اس نے اپنا سر اس کے شانے سے لگا دیا۔

''انیس!''

''ہوں کہو۔'' اس نے ایک ہاتھ سے اس کے بال سنوارتے ہوئے مخمور لہجے میں کہا۔

''مجھے چھوڑ تو نہ دو گے؟''

''کبھی نہیں، ہم ہمیشہ، ایسے ہی انہی جذبوں کے ساتھ ملتے رہیں گے۔''

وہ تھوڑا سا پیچھے سرک گئی۔

''نہیں انیس! ایسے نہیں، ان راہوں پر چلتے چلتے میں تھک چکی ہوں، جن کے آگے کوئی منزل نہیں، جس کا کوئی سرا نہیں۔ میرے پیروں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ میں پناہ چاہتی ہوں۔'' اس کی آواز بھیگ گئی۔

''نجانے کیا کہہ رہی ہو۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔ ''میرے پلے تو کچھ بھی نہیں پڑا۔''

''مجھ سے شادی کر لو انیس! مجھے ہمیشہ کے لیے اپنا لو۔ مجھے تمہارے جیسے مرد کا ساتھ چاہیے۔ جو مجھ سے محبت کرے، مجھے میرے ہونے کا

اعتبار دے سکے۔ ایک پاکیزہ، معطر، خوش و خرم زندگی گزارنے کا اعتماد دے سکے۔ تم یقین کرو، میں بہت اچھی ہوں، اندر سے میں بہت نرم ہوں، خوش اخلاق اور خدمت گزار۔ بس ایک مرتبہ مجھے اپنا لو میں تمہارے پیروں کی دھول بن کر رہوں گی۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔" اس نے پھر اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا "تم جذباتی ہو رہی ہو بھول رہی ہو کہ تم شادی شدہ ہو۔ تمہارا شوہر ہے، گھر ہے، دیکھو شیوا محبت کرنے والوں کو ان جھوٹے رشتوں اور بندھنوں سے بہت اوپر ہونا چاہیے۔ ان کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ ہم الگ الگ ایک دوسرے کے رہیں گے، یہی محبت ہے۔ یہی چاہت ہے۔"

"نہیں انیس نہیں۔ میں یہ جھوٹی، منافقانہ زندگی نہیں گزار سکتی۔" اس نے پوری شدت سے سر ہلایا۔

"ہم مجبور ہیں جانو، کیا کر سکتے ہیں۔ قسمت نے ہمیں کچھ عرصہ پہلے ملایا ہوتا تو بات مختلف ہوتی۔ لیکن اب تو ہم اسی طرح مل سکتے ہیں۔ اس معاشرے کے کچھ رواج ہیں، کچھ تقاضے ہیں۔"

"اگر یوسف مجھے چھوڑ دیں، تو تم مجھے اپنا لو گے نا؟" اس نے بڑی آس سے پوچھا۔

"اوہ اس سے بڑھ کر میری خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے تم میری ہو جاؤ اور بھلا مجھے کیا چاہیے۔"

"بس تو ہمارے درمیان کوئی دوری نہیں، ہمارے ایک ہونے میں کوئی شے حائل نہیں ہو سکتی۔"

"کیا مطلب؟" اسے تعجب ہوا۔

"یوسف جلد ہی مجھے طلاق دینے والے ہیں۔ وہ میری بہن سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں مجھے چھوڑنا ہوگا۔ میں یہاں سے اپنی ماں کے گھر چلی جاؤں گی۔ وعدہ کرو انیس! وعدہ کرو۔ تم اپنی ماں کو پھر میرے گھر بھیجو گے نا؟"

"وہ بے حد بے تاب ہو رہی تھی۔ خوشیاں جیسے جگنوؤں کی طرح اس کے ارد گرد بکھری ہوئی تھیں اور وہ جلد از جلد انہیں اپنی مٹھی میں قید کر لینا چاہتی تھی۔ کوئی قفس تھا جس میں وہ قید تھی اور اب اس کا دروا ہوا ہی چاہتا تھا۔

"بولو نا انیس! تم خاموش کیوں ہو؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا "بولو نا۔"

"ہاں ہاں جانم! ٹھیک ہے۔" اس نے اسے مضبوطی سے تھام کر خود سے لگا لیا "یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ ہم ایک ہو سکتے ہیں اور جلد ہو جائیں گے، میں تمہیں ضرور اپناؤں گا۔ اب ان باتوں کو کچھ دیر کے لیے بھلا دو، دیکھو رات کس قدر خوب صورت ہے۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے ضائع کیوں کریں۔ کوئی اچھی سی بات کرتے ہیں۔ جو اس رات کو مزید خوبصورت بنا دے۔ مکمل کر دے۔"

"وہ ہولے سے ہنس دی۔ آنکھیں موند کر طمانیت سے آنے والے دنوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ دل، جو نجانے کب سے کسی زخمی پرندے کی مانند سینے کی چٹان پر سر ڈالے کراہے ہی چلا جاتا تھا۔ آج شانت تھا۔ روح پر کیف فضاؤں میں تیر رہی تھی۔ وہ خوش تھی۔ بے حد خوش۔ آج اس کے کاندھوں پر کوئی بار نہ تھا۔ اس کے وجود کے سارے زخم مندمل ہو گئے تھے۔ اسے کوئی بات یاد نہ تھی۔ بہن کی خود غرضی، شوہر کی بے وفائی، قسمت کی بے رحمی، اس نے ایک محبت کے سہارے بڑے حوصلے سے سب کچھ فراموش کر دیا تھا۔ ایک نئی زندگی کی ابتداء کرنے چلی تھی۔ یکدم اسے

عجیب سا احساس ہوا۔

"انس! انس۔"

"شبو ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں نا۔"

"ہاں لیکن ابھی نہیں۔" یک لخت اس کے سارے حواس بیدار ہو گئے۔ وہ خوفزدہ ہو گئی۔

"دیکھو شبو! نصیب میں پھر ایسا سہانا وقت آئے نہ آئے۔ بھول جاؤ سب کچھ فراموش کر دو، ہر شے کو بس میں ہوں اور تم ہو۔"

"انس۔" وہ بے بس ہو کر سسکنے لگی۔

ہم ایک دوسرے کے ہی ہیں شبو! ہمیں ایک ہونا ہی ہے۔" وہ اسے بہلا رہا تھا۔ اچانک ہی فضا میں تیز سیٹی کی آواز گونجی تھی۔ وہ دونوں گھبرا کر الگ ہو گئے۔ گلی سے چوکیدار گزر رہا تھا۔

"میں چلتی ہوں انس!" اس کی جان میں جان آئی۔ "چار بج رہے ہیں چچی جان اٹھتی ہی ہوں گی۔"

"اس نے چادر اٹھا کر فٹافٹ خود کو لپیٹا۔

"شبو!" اس نے چادر کا کونا تھاما۔ "پیاس بھڑکا کر جا رہی ہو۔ خدارا کچھ دیر رکو۔"

"پھر آؤں گی انس! گھر کا دروازہ کھلا ہے۔"

چوکیدار نے پھر سیٹی بجائی تھی۔ انس نے گھبرا کر چادر چھوڑ دی۔

وہ لپک جھپک سیڑھیاں اتر گئی تھی۔



مہناز گھر آئی ہوئی تھی۔ بھاری کام والا پرپل سوٹ پہنے وہ خوب دمک رہی تھی۔ ہنسی کی پھوار تھی کہ تھمنے کا نام نہ لیتی تھی۔ جیسے ہی مہناز کو نجانے کیوں ہر ہر بات پر ہنسی آ رہی تھی۔ سیماب، عدنان، عمران، مہوش، کاشف، سبھی اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ عدنان مسلسل بوڑھی خواتین کے انداز میں اس کی سسرال سے متعلق سوالات کر رہا تھا، جن کے جواب دیتے ہوئے وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھی۔

بڑے صوفے پر راشدہ بیگم اور عاصمہ چچی بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ اپنی باتیں چھوڑ کر ان لوگوں کی جانب متوجہ تھیں۔

"وہ کونے میں بیٹھی بظاہر میگزین دیکھ رہی تھی، لیکن اس کا دھیان ان ہی لوگوں کی طرف تھا۔ ایک آگ سی تھی جو رہ رہ کر اندر بھڑک رہی تھی۔ ان لوگوں کا مزاحیہ باتیں اور قہقہوں کا طوفان اسے جلا کر راکھ کیے دے رہا تھا۔ نجانے کیوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سب مل کر اسے چڑا رہے ہیں۔ اسے تنگ کر رہے ہیں، اس کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، ہاتھ میں تھاما میگزین پرزے پرزے کر کے ان لوگوں پر بکھیر دے۔

"الماس!" دفعتاً عاصمہ چچی نے اسے مخاطب کیا۔ "بیٹی! تم کیوں الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جاتی ہو۔ بہن گھر آئی ہے۔ تم بھی پاس آ کر بیٹھو۔

اس سے باتیں کرو۔"

"جی شکریہ!" سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس نے میگزین ایک طرف ڈالا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی "میرے پاس ان فضول باتوں کو سننے اور ان پر منہ پھاڑ کر ہنسنے کی فرصت نہیں ہے۔ میں ذرا باہر جاؤں گی۔"

"چپلوں میں اپنے نازک پیر پھنساتے ہوئے، وہ کسی کی جانب دیکھے بغیر باہر نکل گئی تھی۔

"اچھی بھلی لڑکی کو نجانے کیا ہو گیا ہے۔" عاصمہ چچی نے تاسف سے سر ہلایا۔

"اپنے اعمال ہیں جو بندے کو ہنساتے بھی ہیں اور رلاتے بھی ہیں۔" راشدہ بیگم قدرے تلخی سے بولیں۔ "جو بویا ہے اس نے اس کی فصل تو کاٹنی ہی ہے۔"

تھوڑی دیر کے لیے وہ سب خاموش ہو گئے تھے۔

وہ بڑی تیزی سے اپنے کمرے میں آئی تھی۔ بالوں کو برش کر کے اس نے پرس اٹھایا اور پھر باہر کی جانب بڑھ گئی۔

اس کا ارادہ رکشہ یا ٹیکسی وغیرہ لینے کا تھا۔ لیکن عثمان خان کو گاڑی اسٹارٹ کرتا دیکھ کر وہ ان کی جانب چلی آئی۔

"بیٹے آپ کہاں جا رہے ہیں؟" قدرے جھک کر وہ پوچھ رہی تھی۔

"آپ کو کہاں جانا ہے؟" وہ رسانیت سے مسکرائے۔ "خیر بیٹھ جائیں۔ جہاں بھی جانا ہے میں چھوڑ دوں گا۔"

"ٹھیک ہے!" وہ دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

وہ گاڑی نکال کر سڑک پر لے آئے۔ پھر اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

"خیریت؟ اس قدر پریشان کیوں لگ رہی ہیں؟"

"وہ جو غائب دماغی سے ہونٹ چبا رہی تھی، چونک اٹھی۔

"میں، میں بھلا کیوں پریشان ہونے لگی۔ نجانے آپ مجھے یہ بات کیوں جتاتے رہتے ہیں۔" وہ بڑی رکھائی سے بولی تھی۔ عثمان خان دھیرے سے مسکرا دیے۔

"ایسا نہیں ہے الماس آپ بڑی بدگمان ہیں۔"

"وہ باہر دیکھنے لگی۔

"کہاں جائیں گی؟"

"کہیں بھی اتار دیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ حیران ہوئے۔

"کہاں کا ارادہ کر کے نکلی تھیں آپ؟"

"محض فرار کے ارادے سے نکلی تھی۔" وہ تلخی سے مسکرائی لوگوں کا مذاق اڑاتی نظروں سے فرار، چڑاتے ہوئے قہقہوں سے فرار۔"

"چچ چچ۔ مقام افسوس ہے۔ اپنے بہن بھائیوں، ماں تک سے اتنی بدگمان ہو چکی ہیں آپ الماس! خدارا اپنی سوچ بدلنے کی کوشش کیجیے۔ کوئی کیوں آپ کا مذاق اڑانے لگا۔ کیوں چڑانے لگا آپ کو سب آپ کے اپنے ہیں۔ محبت کرتے ہیں آپ سے، آپ کا دل بہلانے کی کوشش کرتے ہیں، زندگی کی طرف لانا چاہتے ہیں آپ کو اور آپ برگشتہ ہوتی جاتی ہیں۔"

"ہونہہ۔ یہ جھوٹے بہلاوے اپنے پاس رکھیں عثمان صاحب! میں سب سمجھتی ہوں۔ دودھ پیتی بچی نہیں ہوں میں۔"

"میرے خیال میں ایک دودھ پیتی بچی بھی اپنوں کو پہچان لینے کی تمیز رکھتی ہے۔ محبت اور نفرت میں امتیاز کر لیتی ہے۔ آپ کے پاس تو دودھ پیتی بچی جتنی بھی عقل نہیں۔"

وہ برہم ہو گئے تھے۔

"جی ہاں۔ عقل کل کا مالک خدا نے آپ کو بنایا ہے، جانتی ہوں میں۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔

"یہ طنز کس خوشی میں؟" انہوں نے اس پر ایک خفگی بھری نظر ڈالی۔

"یہ طنز نہیں ہے۔ خراج تحسین ہے۔" وہ مسکراتی رہی "ٹھیک ہی تو ہے۔ یہ آپ کی زبردست پلاننگ ہی تو تھی جس نے مجھے ایک فراڈ شخص سے محفوظ رکھا، مجھے بلیک میل ہونے سے بچایا، خاندان کی عزت محفوظ رکھی۔"

"مجھے افسوس ہے میں خاندان کی عزت محفوظ نہ رکھ سکا!" شاید ان کا حوصلہ جواب دے گیا تھا ورنہ طنز اور طعنے ان کا شیوہ نہ تھے۔

"گاڑی روک دیجیے!" غصے سے اس کی آواز کانپ گئی۔

"جہاں اترنا ہے اس جگہ کا نام بتائیں۔ ورنہ مجبوراً میں آپ کو گھر واپس چھوڑ کر آؤں گا۔"

"مجھے یہیں اتاریں۔ آپ مجھ پر کوئی اختیار نہیں رکھتے۔"

"تسلیم!" وہ تلخی سے ہنسے۔ "لیکن مجھے اتنا علم ہے کہ آپ بھی خود پر کوئی اختیار نہیں رکھتیں۔ بے حد "بے اختیار" قسم کی خاتون ہیں اس لیے مجھے بہر حال اپنی ذمہ داری پوری کرنی ہے۔"

"عثمان خان!" وہ چیخی۔

پھر وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رو دی۔ انہوں نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔

"الماس!" پھر وہ قدرے نرمی سے بولے۔ "آئی ایم سوری معذرت چاہتا ہوں۔ نجانے کیوں اتنا غصہ آ گیا تھا۔ پلیز، مجھے معاف کر دیں۔ مجھے آپ کا دل دکھانا نہیں چاہیے تھا۔" وہ خاموشی سے چہرہ صاف کرنے لگی۔

"سوری۔" پھر وہ بولی "غلطی میری ہے۔ میں نے بے وجہ ایسا موضوع چھیڑا۔ آپ مجھے مارکیٹ چھوڑ دیں۔ مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔"

"وہ ایک گہرا سانس بھر کر سیدھے ہوئے تھے۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے انہوں نے ایک نظر اس کے تنے تنے چہرے پر ڈالی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

"رضا مراد کی اصلیت کا ہم لوگوں کو جس وقت علم ہوا، آپ جذبات میں بہت آگے جا چکی تھیں۔" پھر وہ دھیرے دھیرے بولنے لگے۔" آپ سے کچھ کہنا، کچھ سمجھانے کی کوشش کرنا قطعی بے سود تھا۔ کیونکہ آپ کسی سے بھی کچھ سننے پر تیار نہ تھیں۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں، ہمیں باقاعدہ پلاننگ کرنی پڑی تھی کہ وہ از خود پیچھے ہٹ جائے۔ آپ کو چھوڑ دے۔ اس کو ایسا کرنا پڑا۔ آپ کی کچھ ریکارڈ شدہ گفتگو اور کچھ تصویریں تھیں اس کے پاس۔ ان کی قیمت بابا جان کو ادا کرنی پڑی اور معاملہ صاف ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے الماس کہ ہم لوگوں کو بالکل اندازہ نہ تھا کہ آپ پر کمٹمنٹ ہیں۔"

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے۔

"اگر ہمیں علم ہوتا تو شاید ہم حالات کو کچھ اور رخ دینے کی بھرپور کوشش کرتے کیونکہ ہم سب آپ کا بھلا چاہتے تھے۔ ہمارے پیش نظر محض آپ کی ذات تھی۔ کہیں آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے، آپ کوئی چوٹ نہ کھا بیٹھیں۔ ہم سب یہی چاہتے تھے۔ لیکن آپ اس آگ کی جانب اتنا بڑھ چکی تھیں کہ بچاتے بچاتے بھی دامن جلا بیٹھیں۔ ہو سکتا ہے آپ اب بھی یہی کہیں کہ آپ کے ساتھ اچھا نہیں ہوا لیکن ایک بات کا یقین رکھیں الماس! ہم سب نے آپ کا بھلا چاہا تھا۔"

"بس یہیں روک دیں۔" وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں یہاں اتروں گی۔"

عثمان خان نے شاپنگ پلازا کی عمارت پر نظر ڈالی اور گاڑی روک دی۔

"کیا میں انتظار کروں؟" وہ پوچھ رہے تھے۔

"نہیں میں چلی جاؤں گی۔"

وہ نفی میں سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔

"اب کس انتظار کی بات کرتے ہو عثمان خان؟ تم تو مجھے خالی ہاتھ لوٹا چکے ہو۔"



"سر یہ دیکھ لیں۔" سر پہ دوپٹہ جمائے وہ بڑی سنجیدگی سے ان کے مقابل کھڑی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی فائل ان کی جانب بڑھاتے ہوئے اس کی نگاہ مخمل پر تھی۔

"بیٹھیں مس علی!"

انہوں نے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ وہ بادل نخواستہ ٹک گئی۔ عباسی صاحب فائل کی ورق گردانی کرنے لگے۔

"آپ بہت محنت سے کام کرتی ہیں مس علی! مجھے ایسی ہی سیکریٹری کی ضرورت تھی۔"

"تھینک یو سر۔" وہ مخمل کی سطح پر آڑی ترچھی لکیریں بنانے لگی۔ "ویسے مجھے کچھ کہنا تھا سر!"

"جی جی کہیے!" وہ فوراً ہمہ تن گوش ہوئے۔

"میں شاید اس مہینے کے آخر تک ریزائن کردوں!"

"نیلم۔" وہ اچانک ہی پریشان ہو اٹھے۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا پھر مجھ سے کچھ خطا ہوئی ہے؟ آخر آخر تم بھلا کیوں نہیں دیتیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے سر!" وہ ہولے سے مسکرائی "دراصل میری شادی ہو رہی ہے؟۔"

"اوہ!" وہ یک لخت کرسی کی پشت سے ٹک گئے "تو یہ بات ہے"

نیلم نے ان کے بے ساختہ انداز پر نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کا چہرہ بالکل تاریک ہو گیا تھا۔ آنکھیں کسی ویران غار کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔

"پوچھ سکتا ہوں کون ہے وہ خوش نصیب؟۔" ان کے لہجے میں تلخی اور قدرے سفاکی تھی۔ نیلم گھبرا سی گئی۔

"سر! میں نے بتایا تھا آپ کو اپنے کزن کے متعلق۔"

"اوہ! بہت خوب تو گویا وہی حضرت ہیں آپ جن سے شدید نفرت میں مبتلا تھیں۔" وہ ہنسے۔ "میں محض اپنی ماں کی وجہ سے اس اندھے کنویں میں چھلانگ لگانے پر تیار ہوئی ہوں۔" وہ قدرے خفگی سے بولی۔

ان کو بھلا کیا حق تھا کہ وہ اس کی ذاتی زندگی میں مداخلت کرتے، اس میں ٹانگ اڑاتے۔ لیکن وہ بھول رہی تھی یہ حق اس کا اپنا عطا کردہ تھا۔ اس نے خود اپنی زندگی کی کتاب کے بارے اوراق ان کے سامنے بکھرائے تھے۔ اب اگر وہ اس تحریر کو باآواز بلند پڑھ رہے تھے تو وہ کیسے اظہار ناراضگی کر سکتی تھی۔

"میں آج بھی ان حضرت کے متعلق وہی خیالات رکھتی ہوں سر!" پھر وہ آہستگی سے بولی۔ "لیکن بعض اوقات انسان بہت مجبور ہو جاتا ہے۔ جیسے آپ اپنی ماں کی وجہ سے اپنی پسندیدہ ہستی کو چھوڑ کر ایک ناپسندیدہ عورت سے شادی پر مجبور ہو گئے تھے۔"

"ہاں!" انہوں نے کچھ دیر اس کی بات پر غور کیا پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔ "ہم کچھ بھی کر لیں تقدیر اپنے لکھے ہوئے فیصلے ہم پر مسلط کر ہی دیتی ہے۔ تم درست کہتی ہو نیلی! بہر حال مبارک ہو تمہیں! تمہاری تقدیر کا یہ فیصلہ۔ میرے دل پر جو بھی گزرے، میں تمہیں دعا ہی دوں گا۔ تم نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا لیکن خیر جانے دو میں تمہیں کوئی بات بھی یاد نہیں دلاؤں گا ہمیشہ تمہاری خوشیوں کے لیے دعا گو رہوں گا ہر چند کہ میرا دل، میرا دل اپنی بربادی پر ماتم کناں رہے گا۔"

وہ آبدیدہ ہو گئے۔ انہوں نے جلدی سے جیب سے رومال نکالا اور آنکھوں پر رکھ لیا۔

"یقین کرو نیلی! میں نے تمہیں بڑی تمناؤں سے چاہا تھا، دل کی گہرائیوں سے تمہیں اپنا سمجھ بیٹھا تھا۔ وہ اس دن والی حرکت انہی بے اختیار، منہ زور جذبوں کا نتیجہ تھی۔"

نیلم بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ اچانک ہی اس کا دل ان کی طرف سے پوری طرح صاف ہو گیا تھا۔ وہ اس سے کس قدر مخلص تھے۔ اس پر

انکشاف ہوا تھا۔

"سراسر۔" اس سے بولا نہ گیا۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا، انہیں کن الفاظ سے تسلی دے۔ ان کے زخمی دل پر کون سا مرہم رکھے۔ وہ بے حد بکھرے ہوئے لگ رہے تھے اور ان کو سمیٹنا اب اس کے اختیار میں نہ تھا۔

"سر! مجھے احساس ہے آپ کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔" پھر وہ آزردگی سے بولی۔ "مجھے آپ کی محبت اور آپ کے خلوص کا اعتراف ہے۔ کئی موقعوں پر آپ نے مجھے سہارا دیا ہے۔ میرا حوصلہ بڑھایا ہے۔ ہمت بندھائی ہے۔ مجھے اعتراف ہے سر۔ میں بھی آپ کو بھول نہیں پاؤں گی۔"

"نہیں نیلی! ایسے مت کہو۔" انہوں نے سر ہلایا اور اس کی سمت دیکھے بغیر بولے۔ "اب تم ایک نئی زندگی کی ابتداء کرنے چلی ہو، دل میں کوئی ناسور نہ پکنے دینا۔ ہم جیسے حرماں نصیب یاد رکھنے کے لیے نہیں بھلا دینے کے لیے ہوتے ہیں۔ خوش رہنا، جو تمہارے ساتھ ہو، اسے اپنی بھرپور توجہ اور محبت دینا۔ کسی بات کو دل سے لگا کر نہ رکھنا۔"

اسی لمحے کوئی دستک دے کر اندر داخل ہوا تھا۔

عباسی صاحب نے پلک جھپکتے میں میز پر رکھا چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر لگا لیا۔

"ٹھیک ہے مس علی! آپ جا سکتی ہیں۔"

وہ بڑے مصروف انداز میں با آواز بلند گویا ہوئے تھے۔ وہ اٹھ کر اپنی ٹیبل پر چلی آئی۔



دوکان پر زیادہ رش نہ تھا۔ وہ تقریباً فارغ ہی تھا جب بیس، اکیس برس کا ایک اوباش سا نوجوان اندر داخل ہوا۔

"راجہ!" وہ سیدھا اس کی طرف آیا تھا۔ "تم ہی راجہ ہو نا؟"

"ہاں!" اس نے نظروں میں الجھن بھر کر اسے دیکھا۔

"تم کون ہو؟"

"مجھے نثار کہتے ہیں۔" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا "تم سے ایک ضروری کام ہے۔ کہیں چل کر بات کر لو۔"

"وہ مالک کو بتا کر دوکان سے نکل آیا۔ دونوں ایک قریبی پارک میں چلے آئے تھے۔

"بات دراصل یہ ہے دوست۔" نثار ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کہ مسئلہ تمہارے محلے کی ایک لڑکی کا ہے اور یاروں نے بتایا ہے کہ اس کام میں ہاتھ ڈالنے کے لیے تم سے بہتر کوئی بندہ نہیں ملے گا۔ تم ہماری مدد کرو اور ہم سے رقم لے لو۔"

"مسئلہ کیا ہے؟ کون لڑکی ہے؟ کیا کرنا ہے؟" وہ تھوڑا الجھا ہوا تھا۔

"ریشم ہے اس کا نام۔ پانچ بہنیں ہیں۔ باپ سر پر نہیں ہے۔ بھائی بھی کچھ عرصہ پہلے ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو چکا ہے۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔" راجہ پلک جھپکتے میں لڑکی کو پہچان گیا تھا" آگے کہو!"

"اس لڑکی نے ٹھیک میری بہن کی مہندی والی رات اپنے کسی یار کے ساتھ مل کر میری بہن کو اغوا کروایا تھا۔ جواب میں اب یہی کرنا ہے اسے اٹھوانا ہے۔"

اس لڑکی نے؟"۔ راجہ کو حیرت ہوئی تھی۔

"وہ تو بہت چھوٹی ہے ابھی اس طرح کا کام کیسے کرسکتی ہے؟ اور پھر وہ تو بڑا شریف گھرانہ ہے۔"

"ارے چھوڑ دیار!" نثار نے نفرت سے ذمین پر تھوکا۔ "میں اچھی طرح جانتا ہوں ان شریفوں کو۔ یہ بات طے ہے کہ میری بہن کے اغوا میں اس لڑکی کا ہاتھ ہے۔ کم ہے یا زیادہ، یہ پتا کرنا ہے مجھے۔ ہر حال میں معلوم کرنا ہے کہ میری بہن کہاں ہے؟ کس حال میں ہے۔ شرافت کی زبان میں تو اس سے پوچھ کر دیکھ لیا ہے اب اگلی تیزی کرنی ہوگی۔"

"ہوں!" وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"اب دیکھو میں نے پہلے کبھی ایسا کام کیا نہیں ہے۔ میرا ایک دوست ساتھ ہوگا لیکن وہ بھی کچا ہے۔ تمہارا بڑا نام سنا تھا اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں، اب بولو ساتھ دو گے"

"ہوں۔" وہ تنکا چباتے ہوئے ہنوز گہری سوچ میں تھا۔ "لڑکی کو لے کر کہاں جاؤ گے؟"

"اس کا انتظام ہے۔ ایک نسبتاً غیر آباد علاقے میں میرے دوست کا ایک ٹھکانا ایسا ہے جہاں اسے رکھا جا سکتا ہے۔ ایک یا دو راتیں، یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ کتنی جلدی زبان کھولتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ تنکا پھونک سے اڑا کر ہاتھ جھاڑنے لگا" مجھے منظور ہے۔ کچھ حساب تھے جو چکانے تھے آج تمہاری شکل میں میرا انتظام میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہے۔"

"کیسے حساب؟" نثار نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی۔

"دل جل رہا ہے برسوں سے۔ آبلے پڑے ہیں میری روح پر۔ تڑپ رہا ہوں نجانے کب سے۔ اب موقع ہاتھ آیا ہے ان جلتے شعلوں پر پانی ڈالنے کا۔"

"لڑکی کا ہی معاملہ ہے نا؟"

"ہاں، بڑی بہن ہے اس کی۔" وہ نفرت بھرے لہجے میں بولا تھا۔ "بہت چاہا تھا میں نے اسے، بہت۔ لیکن اس نے میرے نازک جذبوں کو اپنے غرور کی جوتی تلے مسل دیا۔ میری ماں اور خالہ کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔ کتنے ارمانوں سے میں نے انہیں منگنی کی انگوٹھی دے کر بھیجا تھا، میرے ارمانوں کو اس نے ذلت کی کیچڑ میں لپیٹ کر میرے منہ پر دے مارا۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے۔" نثار زیر لب مسکرایا تھا۔ "بس تو پھر اس سے بہتر موقع تمہیں پھر نہیں ملے گا۔"

''میں نے سوچا ہوا تھا، جس دن اس کی شادی ہوگی اسے گولیوں سے بھون کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کروں گا۔ اس کا عروسی لباس، اس کا کفن بنادوں گا۔'' جذبات کی شدت سے راحیہ کا سانس پھول گیا تھا۔

''ارے یار! ایسی بے وفا لڑکیوں کے پیچھے بندو پھانسی تھوڑا ہی چڑھتا ہے۔'' نثار نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''انہیں تو زندہ ہی دفنانا چاہیے زندہ! سمجھ رہے ہونا میری بات؟''

''ہوں۔ پھر کب کا ارادہ ہے؟'' وہ اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔

بہت جلد۔'' نثار نے مٹھیاں بھینچیں۔ ''میرا رواں رواں اس لمحے کا منتظر ہے!''

''بس پھر ترتیب دے لو پروگرام۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''



ڈھیروں سے لدی پھندی وہ لوگ اندر داخل ہوئی تھیں۔

''صبا! جلدی کرو، چائے بنالاؤ۔ تھکن سے برا حال ہو گیا ہے۔'' نجمہ خاتون نے ہاتھ میں پکڑے پیکٹ صوفے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''بہن بیٹھیں نا!''

''پھر وہ فوراً ہی مسز ہاشمی کی جانب متوجہ ہو گئی تھیں۔

صبا بھی چیزیں وہیں رکھ کر کچن کی سمت بڑھ گئی۔

''اس بے چاری کو آپ نے آتے ہی کچن میں گھسا دیا۔ وہ بھی تو تھکی ہوئی آئی ہے۔'' مسز ہاشمی مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''ذرا سانس ہی لے لیتی۔''

''ارے اس عمر میں کہاں تھکن کا احساس ہوتا ہے۔'' نجمہ خاتون ہنسنے لگیں۔ ''اس عمر میں تو بچیاں شاپنگ کر کے فریش ہو جاتی ہیں اور پھر اپنی شادی کی خریداری۔''

دونوں خواتین ہنس دی تھیں۔

''بچی کا پتا نہیں، بہر حال یہ بچہ واقعی تھک گیا ہے!'' دانیال نے اندر آتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ لوگوں نے سارا شہر ایک دن میں کھنگال ڈالا۔ کچھ کل پرسوں کے لیے بھی بچا لیا تھا۔''

''ابھی تو صرف زیورات اور عروسی لباس ہی لیے ہیں، لینے کو تو پوری لسٹ پڑی ہے۔ آخر مجھے اپنے اکلوتے بیٹے کی بری تیار کرنی ہے کوئی مذاق تو نہیں ہے نا۔'' مسز ہاشمی خوش دلی سے گویا ہوئی تھیں۔

''صرف!'' اس نے بے ہوش ہونے کی اداکاری کی۔ ''آج کی شاپنگ کے ساتھ ''صرف'' کا اضافہ ہو سکتا ہے ممی؟''۔

''یہ تو شادی سے پہلے کی شاپنگ ہے بیٹا جی!'' وہ دل کھول کر ہنسیں۔ ''شادی کے بعد تمہیں علم ہوگا شاپنگ کیا ہوتی ہے۔ ابھی وقت ہے

پریکٹس کرلو!"

"نجمہ خاتون، ماں بیٹے کی گفتگو سن کر مسکرا رہی تھیں۔

صبا چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی تو چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"ویسے صبا بیٹی! تمہاری پسند لاجواب ہے۔ اتنی اچھی اور نفیس چیزیں پسند کی ہیں تم نے کہ دل خوش ہو گیا۔"

"مسز ہاشمی کپ تھامتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ وہ ہولے سے مسکرا دی۔

"میں نے تو پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ ساری بری تمہاری پسند سے ہی بنواؤں گی۔ پہننا، اوڑھنا تمہیں ہے۔ پسند بھی تمہاری ہی ہونی چاہیے۔"

چائے کا کپ تھماتے ہوئے اس کی نگاہ پل بھر کے لیے دانیال سے ٹکرائی تھی۔ وہ آنکھوں میں خوشیاں بھرے اسے تک رہا تھا۔ صبا کے گالوں میں جیسے لہو بھر گیا۔ بھری محفل میں دانیال کا یوں بے تابی سے تکنا اسے بڑا عجیب محسوس ہوتا تھا۔

کال بیل بجی تو سب ہی چونک اٹھے

"میں دیکھتی ہوں۔" نجمہ خاتون اٹھنے لگیں۔

"ارے آنٹی آپ بیٹھیں۔" دانیال انہیں ہاتھ کے اشارے سے روکتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ "میں کس مرض کی دوا ہوں۔"

"سیٹی بجاتا ہوا وہ باہر نکل گیا تھا۔

"ماشاء اللہ بڑا فرمانبردار، نیک بچہ ہے۔" نجمہ خاتون لہجے میں مٹھاس بھر کر بولی تھیں۔ "اللہ نظر بد سے بچائے۔

"زیادہ تعریفیں نہ کریں اس کی۔" مسز ہاشمی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ "اتنا بھی "نیک" نہیں ہے یہ۔ پتا چل جائے گا آپ کو!"

"السلام وعلیکم۔" دانیال کے ساتھ اندر آتی الماس نے ہولے سے سلام کیا تھا۔

"ارے الماس تم!" صبا اٹھ کر اس سے لپٹ گئی۔ "اچھا ہوا تم آ گئیں۔ میں تمہیں بہت مس کر رہی تھی۔ آؤ بیٹھو۔"

صبا نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے مسز ہاشمی کے قریب بٹھا دیا اور اس کا تعارف کروانے لگی۔

"آنٹی! یہ میری بہت پیاری دوست ہے۔ الماس اور الماس تم تو آنٹی کو جانتی ہی ہو۔"

"ہاں!" وہ آہستگی سے بولی۔ "منگنی کی تقریب میں ملی تھی میں ان سے۔"

"بہت کمزور ہو گئی ہو بیٹی!" نجمہ خاتون اس سے مخاطب تھیں۔ "کیا بیمار رہی ہو؟"

"جی!" مختصر کہہ کر وہ خاموش ہو گئی تھی۔

صبا نے اس کی کیفیت کو خاص طور پر محسوس کیا۔ وہ بڑی گم صم سی نظر آ رہی تھی۔ نجانے کس موڈ میں یہاں آئی تھی۔

"آؤ الماس! تمہیں شاپنگ دکھاتی ہوں۔" وہ اسے لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ہم لوگ ابھی ابھی تو آئے ہیں بازار سے۔"

''اچھا!'' وہ اس کے ساتھ بولی۔ ''کوئی خاص خریداری ہے؟''۔

''دیکھ لو!'' وہ دھیرے سے مسکرادی تھی۔

دونوں کونے میں ڈھیر کیے پیکٹس کے پاس آکر گداز قالین پر دھرنا دے کر بیٹھ گئی۔ صبا اسے ملبوسات اور زیورات دکھانے لگی۔

''اوہ گاڈ! یہ تو بہت خوبصورت ہے۔ کس کی چوائس ہے؟''۔ وہ کندن کے خوب صورت سیٹ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''سب کی مشترکہ پسند ہے!''

''جھوٹ بالکل جھوٹ!'' دانیال ہاشمی بھی وہیں چلا آیا اور ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''خالصتاً ان کی اپنی پسند ہے جہاں ہے جو کسی دوسرے کو کچھ پسند کرنے دیا ہو۔''

''الزام تو نہ دیں!'' صبا مسکرادی تھی۔ ''آپ کی اپنی ضد تھی۔''

''ضد میری ہو سکتی ہے۔ پسند تو تمہاری ہی ہے نا۔ کیوں مس الماس کیسی چوائس ہے آپ کی فرینڈ کی؟'' ۔ وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''لاجواب!''

''میں نے اپنے بارے میں پوچھا تھا!'' وہ جھک کر سرگوشی میں گویا ہوا۔

پھر صبا اور وہ ہنس دیے۔

''آپ کو یہ خوش فہمی کیسے ہوئی کہ آپ صبا کی پسند ہیں؟'' ۔ الماس بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

دانیال یک دم خاموش ہوا تھا۔ صبا بھی لمحہ بھر کے لیے پزل ہو گئی۔ نجانے الماس کا مقصد کیا تھا۔

''خوش فہمی کیا، یقین ہے ہمیں۔'' پھر وہ آہستگی سے گویا ہوا تھا۔

''الماس طنز سے ہنس دی۔ صبا نے پریشانی سے اس کی سمت دیکھا وہ کیا چاہ رہی تھی، کس دھن میں تھی، صبا سمجھ نہ پائی۔

دانیال اگلے ہی لمحے وہاں سے اٹھ گیا تھا۔



وہ بیٹھی اماں کے سر میں تیل ڈال رہی تھی۔

کتنے عرصے کے بعد یہ وقت آیا تھا جب وہ اپنی ماں سے قریب ہوئی تھی۔ ان کی خدمت کر رہی تھی۔ تیل وہ اماں کے سر میں لگا رہی تھی لیکن سکون اسے مل رہا تھا۔ بڑا لطف آ رہا تھا۔ ریشم اور مریم کونے میں بیٹھی کسی اداکار کا انٹرویو لے کر پڑھ رہی تھیں۔ انعم پاس بیٹھی ہوم ورک کر رہی تھی۔

دروازے پر قدموں کی چاپ ابھری تو وہ سب ہی متوجہ ہو گئی تھیں۔ اندر آنے والا ذکی تھا۔

''السلام علیکم۔'' وہ اندر آکر اماں کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا! کہاں تھے دو دن سے؟" اماں نے نیلم کو پرے کر کے بال سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں رہتے ہو دو دو دن؟ ماں کو پوچھنے کی فرصت نہیں ہے تمہیں؟"

نیلم نے ایک نظر سر جھکا کر بیٹھے ہوئے بھائی پر ڈالی اور تیل کی شیشی بند کرنے لگی۔

"لینے آیا ہوں آپ کو۔" وہ پہلو بدل کر بولا تھا۔ "چلیں میرے ساتھ!"

"شیشی بند کرتی نیلم کے ہاتھ رک گئے۔ ریشم اور مریم بھی چونک کر اس کی سمت متوجہ ہوئی تھیں۔

"میں چلوں؟" اماں خود حیرت زدہ تھیں۔ "کہاں؟"

"میرے گھر۔" وہ قدرے مضطرب تھا جیسے جو کچھ کہنے جا رہا تھا وہ دشوار ہو۔ "میں نے، اماں میں نے شادی کر لی ہے۔"

"ایک بم تھا جو ان سب کے سروں پر پھٹا تھا۔ منہ کھولے، سکتے کے عالم میں وہ سب کی سب اس کا منہ تک رہی تھیں۔

"کیا؟ کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟" اماں حواس باختہ ہو کر بولی تھیں۔ "یہ یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں اماں! میں نے اپنے پروفیسر کی بیٹی سے شادی کر لی ہے۔ دو دن میں وہیں تھا۔"

"بھائی؟" نیلم کے لب ہلے۔

"وہ بے یقینی سے بھائی کی صورت تک رہی تھی۔ یہ وہ بھائی تھا جس کو کسی قابل بنانے کے لیے اس نے اپنی زندگی سے خوشیوں کا حصہ نکال کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔ جس کے کاندھوں پر اپنا سارا بوجھ ڈال کر بے فکر ہونے کے خواب وہ نجانے کب سے آنکھوں میں سجائے بیٹھی تھی۔ جسے وہ ہر صبح وہ اس امید کے ساتھ دیکھتی تھی کہ آج وہ گزرے کل سے مختلف اور بڑا نظر آئے گا۔ آج وہی بھائی بڑی بے مروتی سے اپنی ماں کو "اپنے" گھر لے جانے کے لیے آیا تھا۔

"تو اتنا بڑا ہو گیا بیٹا؟ سارے فیصلے خود کر لیے؟ ماں، بہنوں کو تو نے کسی قابل نہیں جانا؟" اماں اب تک عالم حیرت سے باہر نہ نکلی تھیں۔

"میں کیا کرتا اماں! کیا کرتا؟" وہ تلخی سے بولا۔ "حالات نے مجھے اتنا مجبور کر دیا کہ مجھے یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔ کس طرح رو رو کر، گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا میں، نہ میرے پاس کتابوں کے پیسے ہوتے تھے نہ کپڑوں کے، نہ بسوں، ٹیکسیوں کے، بچ رہتی ہی کیا تھیں مجھے؟ ان پیسوں میں ایک زندہ شخص کا گزارا ہو سکتا تھا؟"

"اب کون سا خزانوں کے منہ کھل گئے ہیں تم پر؟" وہ ناگواری سے بولی۔

"بہت کھاتے پیتے لوگ ہیں وہ۔" اس کا لہجہ بدل گیا۔ "اکلوتی بیٹی ہے ان کی معذور ہے، چل نہیں سکتی۔ انہوں نے پیش کش کی تھی مجھے، کہ اگر میں ان کی بیٹی کو سہارا دوں تو وہ مجھے سپورٹ کریں گے۔ میری باقی پڑھائی کے اخراجات بھی وہ اٹھائیں گے اور پھر عمدہ سے عمدہ جاب بھی دلائیں گے۔ انہوں نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔"

"بیٹا نہیں، گھر داماد!" اماں تلخی سے بولیں۔ "ایسا داماد جو کتے سے بھی بدتر ہوگا۔ تو نے خود کو بیچ ڈالا ہے زلفی! اچھا کیا ہے تو نے اپنے اس لمبے چوڑے وجود کو، اپنی شرم کو، غیرت اور وقار کو۔ ماں بہنوں کے خوابوں کو۔ ارے! کتنی امیدیں تھیں ہمیں تجھ سے۔ کیا کیا آس لگائے بیٹھی تھیں تیری بہنیں تجھ سے۔ ہمارا ہر ارمان تجھ سے منسوب تھا۔ تو نے خود کو بیچتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ تجھ پر دوسروں کا بھی حق ہے۔ تو اپنا سودا آپ نہیں کرسکتا۔ ہماری زندگیوں کا سرمایہ بھی تو ہے۔ تو نے کیوں اتنی خود غرضی دکھائی بیٹے۔"

اماں زاروقطار رونے لگیں۔

"نہیں تھی اتنی ہمت میرے اندر اماں! نہیں تھی۔" وہ منہ پھیر کر بولا۔ "وقار بھائی بن جانے کا حوصلہ نہیں تھا مجھ میں۔ میں تھک چکا تھا۔ ایک سایہ دار شجر نظر آیا تو بیٹھنے میں عار نہ جانا میں نے۔ بڑا سکون ملا ہے اماں مجھے۔ سارے دلدر دور ہو گئے ہیں۔"

"تو جا پھر اپنے اس تخل سرسبز کے پاس۔ یہاں اس تپتی دھوپ میں کیا لینے آیا ہے؟" اماں چیخیں۔

"اسماء نے کہا ہے اگر میں چاہوں تو اپنی ماں کو ساتھ رکھ سکتا ہوں۔" وہ نظریں چرا کر بولا۔ "اس کی بھی ماں نہیں ہے نا......"

"تو یہ سمجھ کر آج سے تیری بھی کوئی ماں نہیں ہے ناخلف! یہ جوان بہنیں تجھے نظر نہیں آتیں۔ کن کے سہارے چھوڑ رہا ہے انہیں؟"

"یہ جو ہیں نا ان کے پاس۔"

"یہ؟ وہ کیا مرد ہے؟ وہ لڑکی نہیں؟ بجائے اس کے کہ بہن کو سہارا دیتا، اس کا بوجھ اٹھا کرتا اور اس کو بے آسرا کرنے چلا آیا ہے۔ جا دفع ہو جا۔ میں سمجھوں گی، وقار کے ساتھ میں نے تجھے بھی دفنا دیا ہے۔"

"اماں!" وہ دکھ سے بولا۔ "میری مجبوری کو سمجھو، یونہی نہیں میں نے ایک پینتیس سالہ، اپاہج عورت سے خود کو وابستہ کرلیا ہے۔ میری آنکھوں میں بھی کچھ سپنے تھے جنہیں میں نے ہمیشہ کے لیے بجھا دیا ہے۔ میں اب حالات سے مزید نہیں لڑ سکتا تھا اماں! جوان بہن کی کمائی کھاتے مجھے بھی شرم آتی تھی۔"

"ہاں بیٹا! ضرور آتی ہوگی۔ اس لیے بجائے خود کچھ کمانے کے اب تو سسر اور بیوی کی کمائی کھائے گا۔"

"اماں خدا کے لیے ایسے نہ کہو۔ میرے ساتھ چلو۔ مجھے یقین ہے، میں کچھ دنوں میں اسماء کو منالوں گا پھر ان سب کو لے جاؤں گا۔ اس کا گھر بہت بڑا ہے۔ ہم سب بہت آرام سے رہیں گے۔ ان کی شادیاں بھی بہت اچھی طرح دھوم دھام سے کریں گے۔"

"تیری بیوی کے ٹکڑے کھانے سے پہلے ہم سب تھوڑا تھوڑا زہر کھالیں گے زلفی!" اماں گلوگیر لہجے میں بولیں۔ "خدا میری بچی کو سلامت رکھے، ہمیشہ خوش رکھے۔ مجھے اس کے ہوتے تجھ جیسے بیٹے کی ضرورت نہیں، نہ میری بیٹیوں کو تجھ جیسا بھائی چاہیے۔ تو جا کر بیوی سے راتب مانگ کر کھا اور اس کے پیروں میں پڑ کر سو رہ۔"

وہ سب اس کی جانب سے منہ پھیرے بیٹھی تھیں۔ اماں نے ان سب کے جذبات کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کر دی تھی۔



"تم بھی چلتیں تو اچھا تھا۔" وحیدہ چچی ٹوکری میں سامان رکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"یہ آمنہ کے سسرال والے ان باتوں کا بڑا دھیان کرتے ہیں۔ کون آیا، کون گیا، کس نے کیا دیا۔ اب یہ موقع ایسا ہے کہ وہ ایک ایک چیز کو نظر میں رکھیں گے۔ ساس نے کیا دیا، دیورانی نے کیا دیا۔"

وہ خاموشی سے بستر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

وحیدہ چچی، یونس اور یوسف آج ثریا کو لینے کے لیے جا رہے تھے۔ چچی اور یونس بھائی نے بہت اصرار کیا تھا کہ وہ بھی ساتھ چلے لیکن اس نے بڑی رکھائی سے معذرت کر لی تھی۔ اب بھلا وہ کس لیے ان لوگوں کی خوشی میں شریک ہوتی۔ وہ یہاں چند دن کی مہمان تھی کچھ "قانونی کاروائی" ہوتی اور وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتی۔ پھر وہ کیوں مسئلوں میں خود الجھاتی کہ آمنہ ثریا یا اس کے گھر والے کیا سوچیں گے اور کیا نہیں۔

سو وحیدہ چچی کی تیاریوں پر سرسری نظر کرتی وہ محض ان لوگوں کے گھر سے جانے کی منتظر تھی۔

اس کا ارادہ ان کے جانے کے بعد انیس سے ملنے کا تھا۔ اندر ہی اندر وہ بے تاب ہو رہی تھی مگر بظاہر اطمینان سے بیٹھی تھی۔

"دروازہ اچھی طرح بند کر لینا اور بیٹی! ذرا دھیان سے رہنا۔ آج کل بڑے چور اچکے گھروں میں بہانے بہانے سے گھس رہے ہیں۔"

"کھانا ہم لوگ وہیں کھائیں گے تم تردد نہ کرنا۔ بھوک لگے تو انڈہ وغیرہ تل کر کھا لینا۔" یہ بات بھی وہ پہلے سے جانتی تھی اس لیے اس نے جواب میں ہوں ہاں کرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اب اسے یہ گھر اور اس کے مکین کراہیت کی حد تک برے لگنے لگے تھے۔ وہ جلد از جلد ان کی صورتوں کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دینا چاہتی تھی وہ یہاں سے بہت دور چلے جانا چاہتی تھی اور اس کے لیے آج پھر انیس کو یاد دہانی کرانی تھی۔

وہ اس سے کوئی مضبوط، نہ ٹوٹنے والی قسم لینا چاہتی تھی۔ کوئی اعتبار کی انتہاؤں کو چھوتا عہد، یقین کی حدوں سے گزرتا دلاسا چاہتی تھی، جو اس کے ہر وسوسے کو ختم کر دیتا۔ اس کی بے قراریوں کا خاتمہ کر دیتا۔ اسے مکمل اعتبار آ جاتا کہ عنقریب اچھوتی خوشیاں اس کی دسترس میں آنے ہی والی ہیں۔

ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد وہ کافی دیر تک سوچتی رہی کہ انیس سے رابطے کا کیا ذریعہ ہونا چاہیے۔ آیا وہ خود اس کے اسٹور تک جائے یا پھر کسی بچے کے ذریعے اسے پیغام بھجوا دے اور وہ چلا آئے۔

"حقیقت تو یہ تھی کہ اکیلے گھر میں انیس کو بلاتے ہوئے اسے ایک عجیب طرح کا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس رات والی کہانی اسے پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھی۔ تنہائی پا کر اس کا بہکنا اور عین موقع پر اس کا خود کو بچا کر چلے آنا سب کچھ پوری طرح اس کے ذہن میں تازہ تھا اور اب وہ کوئی رسک لینے کے لیے تیار نہ تھی۔ اسے انیس کی بے پناہ چاہت کا یقین تھا۔ لیکن اس چاہت کے تقاضوں کو فی الوقت پورا کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

وہ کافی دیر تک غور کرتی رہی۔ وہ بہرحال ایک مرد تھا۔ بھرپور، تندرست و توانا مرد۔ اسکے کمزور وجود کی اس کے آگے کوئی حیثیت نہ تھی۔

سوچ، بجھ کر اس نے خود اسٹور تک جانے کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی اور فی الوقت کسی کے واپس آنے کا امکان نہ تھا۔ وہ گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے اطمینان سے تالا ڈال کر جا سکتی تھی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر اس نے خود کو ایک بڑی سی سیاہ چادر میں لپیٹا اور تالا اٹھا کر صحن میں چلی آئی۔

ذہن میں ہونے والی ملاقات اور گفتگو کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس نے بڑی بے دھیانی کے عالم میں دروازہ کھولا تھا۔ باہر کھڑے ریاض بھائی کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے وہ سکتے میں آ گئی۔

"ارے بھئی ایسے کیا گھور رہی ہو۔" انہوں نے اسے دیکھ کر ہنسی نکالی۔ "کیا پہچانتی بھی نہیں ہو؟ ہیں؟"

"آپ!" وہ لمحہ بھر میں سنبھل گئی تھی۔ "سب لوگ آپ کے گھر ہی گئے ہیں۔ آپ یہاں کیسے؟"

"تم کہاں جا رہی ہو؟" انہوں نے اس کا جائزہ لیا۔

"میں؟" شپٹا کر رہ گئی۔ "میں ذرا سامنے والوں کے جا رہی تھی۔ اکیلے میں جی گھبرا رہا تھا سوچا فردوس آپا سے مل آؤں۔"

"چلو اب تمہارا جی نہیں گھبرائے گا۔" وہ اطمینان سے اندر آنے لگے۔ "ہم آ گئے ہیں۔" اسے مجبوراً راستہ دینا پڑا تھا ورنہ وہ اسے پکڑ کر ایک طرف کر دیتے۔

"ریاض بھائی! گھر میں کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلی ہوں۔ میں نے بتایا نا، سب لوگ آپ کی طرف گئے ہیں۔" خود پر قابو کر اس نے بمشکل رسانیت سے کہا تھا۔

"ہاں، ہاں۔ ذرا ایک کام ہے پھر ہم بھی چلے جائیں گے۔" انہوں نے اخلاق سے گردن ہلائی۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اندر کی جانب قدم بڑھانے پڑے۔

"بیٹھیں۔" وہ انہیں برآمدے میں لے آئی تھی۔

"اندر بیٹھیں گے ہم۔ یہاں تو گرمی ہی ہے۔" وہ کمرے میں گھس گئے۔

شبنم کو سخت طیش آیا۔ نجانے وہ کس لیے عین سوتے پر ٹپک پڑے تھے۔ کھولتی ہوئی وہ ان کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔

"فرمایئے!" اس نے بڑے لٹھ مار انداز میں کہا تھا۔

"کیا بات ہے شبو! اس قدر اکھڑا پن؟" انہوں نے شاکی نظروں سے دیکھا۔ "یہ انداز بدلے بدلے سے کیوں ہیں تمہارے؟"

"ریاض بھائی! مجھے کہیں جانا ہے آپ جانتے ہیں اور پھر یوں اکیلے گھر میں یہ مناسب نہیں لگتا۔" اس نے حتی الامکان لہجہ ٹھنڈا کیا۔

"اچھا؟ پہلے تو تم بہانے ڈھونڈتی تھیں تنہائی میں ملنے کے۔ اب کیا ہوا ہے؟"

"کیا بکواس ہے۔" وہ بھنا گئی۔ "مجھے کسی پاگل کتے نے کاٹا ہے جو میں آپ سے تنہائی میں ملنے کے بہانے ڈھونڈوں گی۔ آپ برائے مہربانی اپنی آمد کا مقصد بیان کریں۔ فضول باتیں نہ کریں۔"

"واہ شہوارانی واہ!" وہ بڑے طنز سے گویا ہوئے۔

"کتنا بہا دائیں دکھانے کے لیے کوئی اور تماشائی مل گیا ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے تمہارے تیور ہی بدل گئے ہیں۔ پہلے ابھی باتوں پر تم دل کھول کر ہنسا کرتی تھیں، ناز و انداز کے تیروں سے جگر چھلنی کروا لتی تھیں اب ہم اور ہماری باتیں فضول ہو گئیں۔ تمہارے پاس دو گھڑی ساتھ بیٹھنے کے لیے بھی وقت نہیں ہے اور ہم ہیں کہ تمہارے عشق میں دیوانے ہو چکے ہیں مرے جا رہے ہیں۔ ذرا موقع ملتا ہے اور تمہیں دیکھنے کے لیے، نظروں کی پیاس بجھانے کے لیے چلے آتے ہیں۔ بیوی بچی کو بھلا بیٹھے ہیں، بتاؤ تو سہی، کون لایا ہے اس اسٹیج پر ہمیں؟"

"آپ کا اپنا پاگل پن!" وہ منہ پھیر کر نفرت سے بولی۔ "بیوی بچی کو بھلا دینے کا ذکر کس شوق سے فرما رہے ہیں آپ۔ ڈوب مرنا چاہیے شرم سے آپ کو اور آپ جیسے ہر مرد کو۔ گھر میں موجود نعمتوں کو چھوڑ کر کتوں کی طرح ادھر ادھر منہ مارتے پھرتے ہیں۔ تقدس کے سارے جذبے، احترام تمام رشتے آپ لوگوں نے اپنے اندر مار دیے ہیں اور اب آپ کے جسموں سے ان مرے ہوئے، گلے سڑے جذبوں کی بدبو پھوٹتی ہے۔ آپ کے لیے کوئی عورت ماں نہیں، بہن نہیں، ہر عورت کو بازاری سمجھتے ہیں، جو آپ کی خوشامد اور ستائش کے چند بولوں کے عوض ہر وقت، ہر لمحہ اپنا آپ بیچنے کے لیے تیار ہو۔ کس لیے آئے ہیں یہاں؟ کیا سمجھ کر آئے ہیں؟ کیا خیال ہے آپ کا میرے بارے میں؟ یہ کہ میں اگر اپنے شوہر کی بے توجہی کا شکار ہوں تو آپ جیسے حرص و ہوس کے مارے ہوئے شخص کو اپنا ہمدرد جان لوں گی؟ یا یہ کہ میں کوئی بہت سستی سی بازاری عورت ہوں جو تنہائی میں آپ کے چند بولوں کے عوض وقتی لمحات کا لطف اٹھاؤں گی اور پھر آپ اپنی راہ چل دیں گے اور میں اپنی؟ بولیں کیا سوچ کر آئے ہیں آپ اس وقت یہاں؟"

وہ انتہائی غیض و غضب کے عالم میں تھی۔ ریاض بھائی کی ساری ہوا نکل گئی تھی۔ منہ کھولے، احمقوں کی طرح وہ اس کی شکل تک رہے تھے۔

"ریاض بھائی! کچھ خدا کا خوف کریں۔ کبھی ضمیر کے آئینے میں اپنی یہ بگڑی ہوئی، نفرت انگیز، گھناؤنی شکل دیکھیے۔ اپنی آنکھوں میں، کھا جانے والے ان حرص و ہوس کے لپکتے شعلوں کو دیکھیں اور بہن اور بھابی کے مقدس و محترم رشتوں میں بندھی عورتوں کو دیکھ کر اپنے منہ سے ٹپکتی رال پر غور کریں، یقین جانیں آپ خود اپنے آپ سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور سنیے! وہ جو چند دن میں آپ سے ہنس کر، مسکرا کر بولی ہوں، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں آپ کے "بے پناہ عشق" میں مبتلا ہو گئی تھی یا میرے اندر کوئی چور گھڑی تھی، ہرگز نہیں وہ محض ایک جذبہ انتقام تھا۔ ایسا انتقام جو میں انجانے میں ہر ایک سے لے رہی تھی۔ خود سے، یوسف سے، آپ سے، آمنہ سے، ہر کوئی میرے انتقام کی زد پر تھا لیکن وہ وقتی سودا تھا جو سر میں سمایا تھا۔ انکشاف کے چند لمحے گزرے اور میں نے جانا کہ میں اپنی بربادی کا کسی معصوم اور بے گناہ شخص سے انتقام نہیں لے سکتی۔ اس کا مجھے حق نہیں ہے اور یہ کہ آپ کا یا آمنہ کا گھر برباد کر دینے سے میرا دل آباد نہیں ہو سکتا۔ آمنہ کی آنکھیں خون کے اشک بہائیں گی تو میری آنکھیں ٹھنڈی نہیں ہوں گی۔ بس، یہ جان کر میں اس راہ پر قدم رکھنے سے پہلے ہی پلٹ آئی۔ مجھے آپ جیسے انسانیت کے درجے سے گرے ہوئے شخص سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی، چاہے میری دس بار شادی ہو اور ہر بار مجھے یوسف سے بھی بدتر شخص ملے۔ آپ جیسے کسی بندے سے تعلق استوار کرنے سے پہلے

میں سو بار خودکشی کروں گی سمجھے آپ؟۔"

"ریاض بھائی کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو کی ایک بوند نہ نکلے۔ وہ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے اٹھ کر چپکے سے دروازے کی سمت بڑھے تھے۔

"سنیے!" اس نے کڑک دار آواز میں انہیں مخاطب کیا۔ وہ سہم کر رک گئے۔

"ایک بات اور سنتے جائیں۔" اس کا لہجہ قدرے نرم تھا "عورتوں کو گھر کے کونوں میں پڑی بے جان چیز سمجھنا چھوڑ دیں۔ میری مثال پر غور کیجیے گا۔ شوہر کی توجہ نہ ملنے پر، انتقاماً ہی سہی، میں نے ایک غلط بات کو صحیح جانا تھا۔ ایسے انتقامی جذبات کسی بھی عورت سے کسی بھی مرحلے پر پیدا ہو سکتے ہیں۔ جس قدر آسانی سے، آپ کو اپنی پیاس بجھانے کے ذریعے دستیاب ہو جاتے ہیں اتنی ہی آسانی سے گھر میں جلتی، کڑھتی، اپنی نظرانداز کی جانے والی ہستیوں کا ماتم کرتی عورتوں کو بھی انتقام کے وسیلے مل جایا کرتے ہیں۔ عورت کو ٹھیک راہ پر رکھنا مرد کا کام ہے اور یہ وہ سرکش، ضدی، ہٹ دھرم مزاج مخلوق ہے جسے غصے، سختی اور بے جا روک ٹوک سے قابو نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صرف محبت سے، پیار سے اور اعتبار و یقین سے مانتی ہے۔ ہر اس مرد پر جو اپنی بیوی کو پاک، راست باز، باعصمت دیکھنا چاہتا ہے، لازم ہے کہ اپنے اندر بھی یہی خصوصیات پیدا کرے۔ سمجھے آپ؟"

"ریاض بھائی کوئی جواب دیے بنا، سر جھکا کر باہر نکل گئے تھے۔ وہ کچھ دیر کھڑی اپنی پھولی ہوئی سانس کو قابو میں کرتی رہی پھر چادر اتار کر وہیں بیٹھ گئی۔ اس کے اپنے لفظوں نے اس کے دل پر اثر کیا تھا۔ اس نے کہیں بھی جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔



"صبا بیٹی! ذرا یہاں آؤ۔"

نجمہ خاتون کی خوشی میں ڈوبی ہوئی آواز پر وہ چونکی تھی جلدی جلدی چپلیں اڑاتی وہ باہر نکل آئی

"جی امی؟" ان کے ہاتھ میں موجود پیکٹ کو بغور دیکھتی وہ قریب چلی آئی تھی۔

"یہ کیا ہے؟۔"

"کارڈز چھپ کر آ گئے ہیں۔ تمہارے ابو ابھی ابھی لائے ہیں۔ لو دیکھو کس قدر خوبصورت ڈیزائن ہے، کتنا منفرد۔"

صبا نے خاموشی سے کارڈ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ آدھا سفید، آدھا سنہری کارڈ تھا، جو بڑے دلکش انداز میں وا ہوتا تھا۔ واقعی ڈیزائن بے حد خوبصورت اور منفرد تھا۔ کارڈ پر اس کا نام، دانیال ہاشمی کے نام کے ساتھ جگمگ، جگمگ کر رہا تھا۔

"تمہارے ابو کی پسند ہے۔ کیسا ہے؟۔"

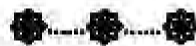
"بہت اچھا، خوبصورت ہے۔" اس نے آہستگی سے کہہ کر کارڈ انہیں واپس کر دیا۔

"اچھا ذرا وہ لسٹ تو نکال لاؤ۔ دیکھیں تو سہی، کس کس کو کارڈ دے کر آنا ہے۔ یہ کام بھی کچھ آسان نہیں۔ کتنے ہی دن نکل جائیں گے۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بڑے مصروف انداز میں گویا ہوئی تھیں۔ خوشی اور اطمینان کا اظہار ان کے ایک ایک انداز سے

ہوتا تھا۔

صبا ہولے سے مسکرا دی۔ نجانے ماؤں کو بیٹیاں جلا وطن کرنے کا اتنا شوق کیوں ہوتا ہے؟ وہ کافی دیر تک وہیں کھڑی کسی سوچ میں گم رہی۔ کارڈ پر آنے والی تاریخ پڑھ کر اس کا دل کسی نا معلوم سے خوف سے دھڑکنے لگا۔ عجب سی بے قراری لگ گئی تھی۔ بس اتنے سے دن وہ اور اپنی تھی؟ پھر کیا ہونا تھا؟ ایک نئے گھر، نئے ماحول، نئے لوگوں سے وابستہ ہونا کتنا مشکل امر ہے۔ لڑکیاں کیسے یہ پل صراط عبور کرتی ہیں۔ خدا نے عورت کو کتنا عظیم حوصلہ عطا کیا ہے۔



"ہیلو شہروز!" بڑے دن بعد اس نے رابطہ قائم کیا تھا۔ اس کی آواز سن کر آنکھوں میں خود بخود پانی اتر آیا تھا۔

"کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں جی، خیریت سے ہوں۔" اس کا لہجہ قدرے اجنبی تھا "آپ سنائیں؟"

"ناراض ہونا۔" وہ دھیرے سے ہنس دی۔ "لیکن مجھے پتا ہے۔ یہ محض اداکاری ہے۔ تم مجھ سے ناراض ہو ہی نہیں سکتے۔"

"اچھا!" وہ ہولے سے ہنسا، ہاں ایسے ہی کچھ وہم سے مجھے بھی تھے لیکن صبا! ہم لوگ بہت خوش فہم ہیں۔" نجانے آپ ہی آپ کیا کچھ سوچ لیتے ہیں دوسروں پر کیسے کیسے مان قائم کر لیتے ہیں لیکن۔"

"شہروز!" وہ بات کاٹ کر دکھ سے بولی۔ "ایسے بات نہ کرو مجھ سے۔ دیکھو، مہمان سے ایسے بات نہیں کرتے۔ کچھ دن بعد۔"

"ہاں!" اس نے گہری سانس بھری تھی۔ "مبارک ہو آپ کو۔ آنٹی آج ہی کارڈ دے کر گئی ہیں۔ آپ تو اتنی بے مروت ہیں کہ ڈیٹ فکس ہونے کی مٹھائی تک دینے نہیں آئیں۔ جھوٹے منہ نہ پوچھا۔ اس پر کہتی ہیں، ناراض بھی نہ ہو، شکوہ بھی نہ کرو۔ آخر ہمیں کس قصور کی سزا مل رہی ہے؟" وہ بولتا ہی چلا گیا تھا۔

"بس شہروز! نہ پوچھو تو بہتر ہے۔" وہ ہولے سے بولی "لڑکیاں بے چاریاں بڑی مظلوم ہوتی ہیں۔ مرضی سے جینے کا کوئی حق، کوئی اختیار نہیں رکھتیں۔ بیٹھے بٹھائے انہیں علم ہوتا ہے کہ انہیں اب کسی اور کے اشاروں پر چلنا ہے۔ اپنی خوشی سے زیادہ کسی اور کی خوشیوں کا احترام کرنا ہے۔"

"اوہ!" وہ چیسے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کی بات سمجھ گیا تھا۔ "تو آپ نے ایک مرتبہ کہا تو ہوتا صبا! کچھ بتایا تو ہوتا۔ میں نے نجانے کتنی مرتبہ آپ کو مشکل سے دو چار کیا ہوگا۔ ہے نا!"

"نہیں! تم میرے بہت پیارے سے بھائی ہو۔" اس نے ہنس کر بات ٹالی "تم کلوتے۔"

"مجھے افسوس ہو رہا ہے صبا! میں واقعی بے وقوف ہوں۔ سب ٹھیک کہتے ہیں۔ بہرحال آئندہ بہت دھیان دوں گا۔ آپ کی عزت اور ناموس میرے لیے ہر شے سے بڑھ کر ہے اور آپ سے وابستہ ہر شخص میرے لیے قابل احترام ہے۔"

"شکریہ میرے بھائی!" وہ ممنونیت سے بولی۔ "یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا میں نے تمہاری ناراضگی کا خیال نجانے کب سے مجھے تکلیف دے رہا تھا۔ ایک اذیت میں مبتلا تھی میں۔"

"نہیں صبا! میں کبھی آپ سے ناراض نہیں ہو سکتا۔ آپ نے ٹھیک کیا تھا۔"

"اب تو آؤ گے نا شادی میں؟"

"ضرور آؤں گا۔ آپ کیا سمجھ رہی تھیں۔" وہ ہنس دیا۔

"ناراضگی میں بھی اپنے بھلے برے کا خیال رکھتا ہوں۔"

"اچھا سنو!" اس نے لمحہ بھر تامل کیا تھا۔ "وہ امی نے ایک اور کارڈ بھی دیا ہو گا تا سادہ!"

"ارے ہاں یاد آیا۔ وہ کس کا ہے؟ آنٹی کہہ رہی تھیں صبا نے بھجوایا ہے۔"

"شہروز!" وہ دراصل۔"

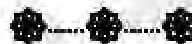
"اوہ!" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا۔ "ٹھیک ہے صبا! میں بھائی کو پوسٹ کر دوں گا۔"

"شکریہ!" اس نے لب بھینچ لیے۔

"پھر وہ دونوں ہی خاموش ہو گئے۔ جیسے کہنے کے لیے کچھ اور نہ بچا ہو۔ جیسے اچانک ہی کچھ کھو جانے کا ٹوٹ جانے کا تکلیف دہ احساس دونوں کو ہوا تھا۔

"اچھا شہروز! خدا حافظ۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ یہاں دونوں کی آخری گفتگو تھی۔



کام ختم کر کے وہ وقت سے پہلے اپنی سیٹ سے اٹھ گئی تھی۔

"سر!" لفافہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے وہ قدرے افسردہ سی تھی۔

"جی!" عباسی صاحب نے سر اٹھایا۔

"یہ کیا ہے مس علی؟"

"میرا استعفیٰ ہے سر! میں جاب چھوڑ رہی ہوں۔ میں نے بتایا تھا نا آپ کو۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ اس کا ہاتھ مسلسل بڑھا ہوا تھا اور وہ نجانے کیا سوچنے لگے تھے۔

"سر پلیز!" اس نے انہیں متوجہ کیا۔

"تو نیلی!" انہوں نے گہری سانس بھر کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی۔ "بالآخر یہ وقت آ ہی گیا۔ کس قدر خوفزدہ تھا میں۔ کتنا عجیب لگ رہا ہے تمہیں کبھی نہ دیکھنے کا تصور! آہ!" وہ خاموشی سے لب کاٹتی رہی۔

"کتنے سکون آور ہوتے تھے یہ چند گھنٹے، جو تمہاری ہمراہی میں گزرتے تھے۔ میری زندگی روشن ہو جاتی تھی۔ اب پھر مجھے انہیں اندھیروں میں لوٹ جانا ہے۔ تمہارے کزن کی قسمت پر رشک کر رہا ہوں نیلی!"

"سر! آپ کا گھر آپ کا منتظر ہے۔" اس نے بھی وہ سب کچھ کہہ دینے کا سوچا جو نجانے کب سے اس کے دل میں تھا۔

"آپ کی بیگم ان لفظوں کی زیادہ حقدار ہیں۔ وہ بھی ایک خاتون ہیں، ان کے سینے میں بھی ایک عورت کا دل دھڑکتا ہے اور کوئی عورت ظالم اور کٹھور نہیں ہو سکتی۔ ذرا سی توجہ اپنے گھر، اپنی بیگم، اپنی بیٹیوں پر دے کر دیکھیں پھر آپ کو احساس ہوگا، حقیقی خوشیاں کیا ہوتی ہیں۔"

وہ دھیرے سے ہنس دیے۔"

"ایک آخری خواہش پوری کرو گی میری نیلی؟"۔

"اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"بیوی سے ملو گی میری؟"۔"

"میں۔" وہ متذبذب کا شکار ہو گئی۔ "لیکن سر!"

"میری بڑی بیٹی کی سالگرہ ہے آج۔ گلشن والے اپارٹمنٹ میں۔ میری بیوی اور دونوں بیٹیاں وہیں ہیں۔ ذرا دیر کو میرے ساتھ چلو۔"

"نہیں سر!" وہ گھبرا کر بولی تھیں۔ "میں گھر جاؤں گی۔ میں اماں سے جلد آنے کا کہہ کر آئی تھی۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ دھیرے سے ہنس دیے۔

"ایک بار تمہارا اعتبار کھو چکا ہوں، اب کبھی یہ یقین دوبارہ حاصل نہ کر پاؤں گا۔ بس یہی خواہش تھی میری نہ پوری کرنا چاہو تو بھی تمہاری خوشی۔"

وہ انتہائی آزردہ دکھائی نظر آرہے تھے۔ بار باران کی آنکھوں میں نمی ابھرتی تھی۔

"سر!" اس کو حد درجہ تاسف محسوس ہوا۔ "میں پھر کبھی مل لوں گی آپ کی بیگم سے۔"

"پھر کبھی؟ نہیں نیلم! ہرگز نہیں۔" انہوں نے سختی سے اس کی بات روکی۔

"یہ بات یاد رکھنا ہم آج کے بعد کبھی بھی، کہیں بھی نہیں ملیں گے۔ تم ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے جارہی ہو پرانی زندگی کی ہر ہر یاد کو ذہن سے کھرچ کر پھینک دینا۔ تمہاری خوشیوں کی بقا کے لیے یہ نہایت ضروری ہے نیلی!"

نیلم حد درجہ متاثر ہوئی۔ وہ واقعی اس سے بے حد مخلص تھے۔

"ٹھیک ہے سر! پھر میں آج ہی آپ کی بیگم سے مل لیتی ہوں۔" اس نے ایک فوری فیصلہ کیا۔

"سچ!" ان کی آنکھیں چمک اٹھیں "چلو گی میرے ساتھ؟"۔

"جی!" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "چلیے۔"

گاڑی تیزی سے ہموار سڑک پر رواں دواں تھی۔ اس کا ذہن مختلف قسم کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اپنی ہی ذہنی الجھنوں میں گرفتار وہ باہر گزرتے مناظر کو بڑی بے دھیانی کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ کس سوچ میں گم ہو۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اس پر ایک نگاہ ڈالی۔ نیلم چونک پڑی تھی۔

"نہیں کچھ بھی نہیں۔" اس نے گہری سانس بھری۔

"پچھتا رہی ہو۔" وہ ہنسے۔

"کس بات پر؟" وہ انجان بنی۔

"ساتھ چلے آنے پر ایک بار پھر۔" وہ مسکرا رہے تھے۔

نیلم کو عجیب سی الجھن کے احساس نے آگھیرا۔ وہ حد سے زیادہ خوش نظر آرہے تھے۔ اس طرح کی خوشی ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ ان کی ایک ایک ادا سے ایک خمار سا چھلکتا محسوس ہو رہا تھا۔

"بہت خوش لگ رہے ہیں آپ؟" وہ پوچھ بیٹھی "ایسی بھی کیا بات ہوئی؟"

"ہاں میں خوش ہوں۔" انہوں نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔ "بہت خوش اور وجہ تم جانتی ہو۔"

"کیا؟ آپ کی بیٹی کی سالگرہ ہے، اس لیے؟"

"سالگرہ!" انہوں نے قہقہہ لگایا تھا "ہاں سالگرہ یہ وجہ بھی ہے۔ لیکن اصل وجہ تم ہو، نیلی تم!"

"میں؟" اس کا دل عجیب طرح سے دھڑکنے لگا تھا "میں کس طرح؟"

"وہ مسکرانے لگے۔

"تم ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے والی ہو۔ ایک شخص سے تمہاری ذات وابستہ ہونے والی ہے۔ تمہاری راہوں میں پھول کھلنے کے موسم آ پہنچے ہیں اور اور یہ ہماری آخری ملاقات ہے نا نیلی؟"

"اس نے الجھن آمیز نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔ عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگے تھے وہ ان کے پیچھے فلیٹ میں داخل ہوتے ہوئے اسے ایک انجانے خوف نے آگھیرا تھا۔ اس کا جی چاہا، وہ واپس پلٹ جائے لیکن راستے مسدود ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ان کے فلیٹ کے دروازے پر کھڑی تھی۔

"یہ کیا؟"

"انہیں دروازہ ان لاک کرتا دیکھ کر وہ چونک اٹھی تھی۔

"یہاں کوئی نہیں ہے؟ آپ تو کہہ رہے تھے۔"

"کم آن نیلی۔"

"دروازہ دھکیلنے کے ساتھ ساتھ وہ اس کا بازو پکڑ کر اندر لے آئے۔

"سب لوگ آنے والے ہیں۔"

پھر پلٹ کر انہوں نے دروازہ لاک کر دیا اور آگے بڑھ کر لائٹیں جلانے لگے۔

"اور کوئی آئے نہ آئے، کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل بات تمہاری ہے اور تم آ چکی ہو۔"

نیلم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ عباسی صاحب کے سارے انداز بدل چکے تھے۔ اور اس کا دل چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا کہ وہ ایک مرتبہ پھر اندھی چڑیا کی مانند شکاری کے جال میں آ پھنسی ہے۔

"سر! سر! یہ سب کیا ہے؟" خشک ہوتے ہوئے حلق کے ساتھ اس نے بمشکل کہا "میں نے اعتبار کیا تھا آپ پر۔"

"بہت برا کیا۔" وہ کوٹ اتار کر صوفے پر پھینکتے ہوئے بولے "بہت برا کیا۔ تم لڑکیوں کی سب سے بڑی خامی یہی ہوتی ہے۔ اجنبیوں پر آنکھیں بند کر کے بلا کسی وجہ کے اعتبار اور جس لڑکی میں یہ خامی ہو اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

"یہی نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے دیوار سے جا لگی تھی۔

"میں نے بہت کوشش کی تمہیں رام کرنے کی۔ بہت محنت کی تم پر اور تم میری محنتوں کا کوئی صلہ دیے بنا یوں اطمینان سے جا رہی تھیں۔ اتنا عرصہ میری نیندیں اڑائے رکھیں تم نے نیلی صاحبہ! اتنا بڑا امتحان لیا میرے صبر کا اور پھر تو ازے بغیر کسی اور پر عنایات کی برسات برسانے چلی تھیں۔ کچھ تو حق بنتا ہے ہمارا تم پر ہاں!" وہ اس کے قریب آ پہنچے تھے۔

اس نے سختی سے آنکھیں بھینچ لیں۔

"مجھے جانے دیں پلیز! جیسا آپ نے مجھے سمجھا ہے، میں ویسی نہیں ہوں۔" اس کی آواز عاجزی سے بھیگ گئی۔

"یہی تو اٹریکشن ہے تمہاری جان من! تم بہت الگ قسم کی ہو۔"

نیلم نے خوف سے ڈوبی ہوئی آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ چہرے پر کریہہ مسکراہٹ سجائے وہ اس کے نہایت قریب تھے آج اس چہرے کے تمام خول اترے ہوئے تھے۔ سنجیدگی، متانت، بردباری کوئی ایک ماسک بھی نہ تھا۔ عباسی صاحب اپنے اصل، بھیانک روپ میں اس پر جھکے ہوئے تھے۔

اس لمحے اس نے جانا کہ مرد کے کتنے روپ ہو سکتے ہیں۔ زندگی کی ہر تلخ حقیقت اس پر آشکار ہونے لگی تھی۔

اس کی سسکیاں نکلنے لگیں۔

"آپ کو خدا کا واسطہ ہے، مجھے جانے دیں۔"

"تمہیں جانا ہے۔" وہ سفاکی سے مسکرائے۔ "کچھ دیر بعد ہمیشہ کے لیے جانا ہے۔"

"اے خدا! ہر جانب سے مایوس ہو کر اس کے دل نے دہائی دی تھی" میرے اعمال نامے میں اگر ایک نیکی بھی ہے تو مجھے اس کا صلہ دے دے۔ میرے مالک مجھے بچا لے، مجھے بچا لے۔"

اسی لمحے دروازے میں چابی گھومنے کی آواز آئی تھی۔ عباسی صاحب ایک جھٹکے سے علیحدہ ہو کر مڑے تھے۔ نیلم تڑپ کر ان سے دور چلی گئی۔ دروازہ کھول کر جو ہستی اندر داخل ہوئی تھی، اسے دیکھ کر عباسی صاحب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ نیلم دیوانوں کی طرح دوڑتی ہوئی اس تک پہنچ گئی۔

"زارا! زارا! خدا کے واسطے مجھے اس وحشی درندے سے بچا لو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔"

"ڈونٹ وری۔" عباسی صاحب کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے اس نے نیلم کا بازو تھپکا۔ "ریلیکس ہو جاؤ۔ کچھ نہیں ہوتا۔"

"تمہیں ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی۔" وہ دانت پیس رہے تھے۔

"ہمت کی بات مت کرو عباسی! یہ ہمتیں، یہ جرأتیں تمہاری ہی بخشش ہیں، اور ہاں میں نے پولیس کو بھی فون کر دیا ہے۔ کسی بھی لمحے یہاں ریڈ ہو سکتا ہے، بھاگنے کی کوشش فضول ہے۔"

"یو بلڈی بچ۔" اس کا چہرہ تاریک ہوا تھا۔

اگلے لمحے اپنا کوٹ اٹھا کر وہ دروازے کی سمت اندھا دھند لپکے تھے۔ زارا اور نیلم ایک طرف نہ ہو جاتیں تو وہ انہیں روندتے ہوئے گزر جاتے۔

"وہ تو بھاگ گیا۔" وہ تھر تھر کانپتے ہوئے بولی۔

"بھاگنے دو۔" زارا اطمینان سے بولی۔

"لیکن لیکن زارا! پولیس۔ میں پولیس کا سامنا نہیں کر سکتی۔" اس کے حواس کسی طور پر قابو میں نہیں آ رہے تھے۔

"پریشان نہ ہو۔ پولیس نہیں آئے گی۔ میں نے تو محض اس کو یہاں سے بھگانے کے لیے ایسا کہا تھا۔ تم جلدی سے اپنا حلیہ درست کرو۔

پانی والی ہو۔ میں تمہیں گھر چھوڑ دیتی ہوں۔" اس کا کپکپاتا وجود دیکھ کر وہ بہت نرمی سے بولی۔

"نیلم اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو میری بہن الماس نے تمہیں کتنا غلط سمجھا۔ تمہاری محبت کو ہمیشہ نظرانداز کرتی رہی۔ اگر آج تم نہ آتیں تو......"

آگے اس سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔

"تو تو ایک اور زارا وجود میں آجاتی!" وہ گہرے دکھ سے بولی تھی۔

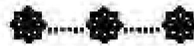
"کچھ دیر بعد اس نے اپنے بکھرے بال سمیٹے اور چادر لپیٹ کر اس کے ہمراہ وہاں سے نکل گئی۔ نیچے اس کی گاڑی موجود تھی۔

"تمام راستہ وہ دونوں تقریباً خاموش رہی تھیں۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھیں۔ اس کا گھر آیا تو وہ چونک اٹھی۔

"اندر آؤ نا پلیز!" نیلم نے جیسے التجا کی تھی۔

"نہیں آج نہیں لیکن آؤں گی ضرور۔ کل یا پرسوں کبھی بھی۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔

"خدا حافظ!" پھر وہ گاڑی بڑھا لے گئی۔



الماس بڑی دیر بعد فون تک آئی تھی۔ کافی دیر سے اس کی آواز سننے کی منتظر صبا مایوس ہو کر ریسیور رکھنے ہی والی جب الماس نے آ کر ریسیور اٹھایا۔

"جی! الماس بات کر رہی ہوں۔"

"اس کی تھکی تھکی آواز پیس پر ابھری تھی۔

"الماس! میں صبا ہوں، کیسی ہو؟"

"ہوں ٹھیک ہی ہوں۔ تم سناؤ۔" وہ پژمردہ سی لگتی تھی۔

"کارڈ تو مل گیا ہوگا۔ یاددہانی کے لیے فون کیا ہے۔ تم کو ضرور آنا ہے۔" وہ تاکیدی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ہاں!" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ "کارڈ مل گیا تھا۔ کون سی تاریخ ہے بھلا؟"

"وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"سترہ۔" صبا کے انداز میں اس کا فطری شرمیلا پن عود کر آیا تھا "پندرہ کی مہندی ہے بارہ تاریخ کو مایوں اور تم نے روز آنا ہے رونق رہی ہوتا؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔" اس کا انداز کسی بھی دلچسپی سے عاری تھا "یہاں مجھے کون سے مل جوتے ہوتے ہیں۔ اتنی فارغ ہوتی ہوں کہ

مرجانے کو جی کرتا ہے۔ ہر روز اٹھ کر تمہارے گھر آ جایا کروں گی۔ دیکھنا ہی ہے۔ یہاں نہ سہی وہاں سہی!"

"الماس!" صبا سنجیدہ ہو گئی "یہ کیسا روگ لگا بیٹھی ہو۔ بالکل بجھ کر رہ گئی ہو۔ نہ وہ حسن رہا نہ وہ انداز۔ یہ حالت کب تک طاری رکھو گی خود پہ۔ باہر نکلو نا اس کنڈیشن سے۔"

"کیسے؟ کس طرح؟" وہ قدرے تلخی سے بولی "جب کوئی شخص کسی گہرے گڑھے میں گر جاتا ہے ناصبا! تو وہ خود سے باہر نہیں نکل سکتا۔ جب تک کوئی مضبوط ہاتھ اس کی مدد کو نہ آئے۔"

"کتنے مضبوط ہاتھ تمہاری مدد کو تیار ہوں گے الماس! ایک مرتبہ آنکھیں کھول کر تو دیکھو۔"

"جانے دو صبا کچھ اور بات کرو!"

"اگر تم اجازت دو تو۔"

وہ جانے کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ جھجکا کر رہ گئی۔

"ہاں بولو!" الماس سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔

"میں عثمان سے بات کر کے دیکھوں۔"

"صبا۔" وہ یکلخت پھنکاری تھی۔ "اب میں عزت نفس سے اس قدر بھی عاری نہیں ہوں، جتنا تم نے سمجھا۔ لعنت بھیجتی ہوں میں اس پر اور اس جیسے ہر دو غلے، منافق شخص پر اور تم نے کیا سوچ کر یہ بات کی تم نے۔

تم سمجھتی ہو ہمدردی، رحم اور محبتوں کو ترس ترس کر بھکارن بن چکی ہوں، اس درجہ گر چکی ہوں کہ ایک بار پھر اس شخص کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو جاؤں گی جو کئی مرتبہ مجھے دھتکار چکا ہے؟ بہت غلط سمجھا ہے تم نے صبا، بہت غلط۔ ایک دانیال ہاشمی تمہیں ہل رہا ہے تو شاید تم یہ سمجھنے لگی ہو کہ اب دنیا میں دوسری کسی لڑکی کے لیے کچھ نہیں بچا، یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ ایسے ہزاروں دانیال ہاشمی آج بھی میری ایک جنبش ابرو کے منتظر ہوں گے۔"

"او، اٹس او کے الماس اٹس او کے!" اس کی آواز لرزنے لگی تھی "بہت غلط مطلب اخذ کیا ہے تم نے میری خلوص اور میری محبت کو کتنے آرام سے تم نے یہ سب کچھ کہہ ڈالا ہے الماس جو میں سوچنا بھی چاہوں تو نہیں سوچ سکتی۔ تم نے مجھ سے یہ سب کچھ کہا؟ تم ذہنی طور پر اتنی تھکن کا شکار ہو۔"

وہ خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس بھر رہی تھی۔ اس سے جواب میں کچھ بھی نہ بولا جا سکا۔

"میرا صرف اتنا مطلب تھا الماس کہ ایک دوست کی حیثیت سے اگر میں تمہارے کسی کام آسکتی تو یہ میرے لیے بڑی مسرت کی بات ہوتی۔"

کچھ دیر بعد وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

"اس لیے میں نے چاہا کہ کسی طرح ان غلط فہمیوں کا خاتمہ ہو سکے جو تمہارے اور عثمان خان کے درمیان ایک نہ نظر آنے والی دیوار کی طرح کھڑی ہو گئی ہے۔ خدانخواستہ میں نے ان سے تمہارے لیے رحم اور محبت کی بھیک نہیں مانگی تھی۔ نجانے تم کیا سمجھ بیٹھیں۔ بہر حال! میرے

الفاظ سے اگر تمہیں اس وجہ تکلیف پہنچی ہے تو میں معافی چاہتی ہوں۔"

"اٹس آل رائٹ صبا!" وہ آہستگی سے بولی۔ "اچھا خدا حافظ۔"

"تم آؤ گی نا الماس؟" وہ اس کے انداز سے خوفزدہ تھی۔

"ہاں ضرور!" اس کا لہجہ بدستور خشک تھا۔

دوسری طرف سے صبا نے ہولے سے ریسیور کریڈل پر ڈالا تھا۔ جبکہ وہ ریسیور تھامے بڑی دیر تک کھڑی رہی۔ آنکھوں کو قدرے سکیڑے، کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں مرکوز کیے وہ جانے کیا کیا سوچے جا رہی تھی۔

"تو بالکل بجھ کر رہ گئی ہوں میں؟ نہ وہ حسن رہا نہ وہ انداز ادنہہ! تم کیا جانو صبا بی بی! حسن کیا ہوتا ہے یہ وہ دولت ہے جو تم اگر چاہو بھی تو مجھ سے چھین کر اپنے وجود پر نہیں سجا سکتیں شاید بہت خوش گمان ہو گئی ہو ایک دانیال ہاشمی کی رفاقت کیا نصیب ہوئی۔ تم اپنا آپ بھول کر ہواؤں میں اڑنے لگیں۔ بھول گئیں کہ کس طرح ایک معمولی شخص نے تمہیں اور تمہاری محبتوں کو ہوا کے رخ پر سوکھی مٹی جان کر ایک پھونک سے اڑا دیا تھا۔ کیسے ٹھکرا دیا تھا۔ تمہیں مذاق بنا دیا تھا تمہاری چاہتوں کو، کیسے دل ہتھیلی پر رکھ کر اس کے عشق میں دیوانی بنی پھرا کرتی تھیں۔ کیسی آہیں بھرا کرتی تھیں اس کے فراق میں اب سب کچھ بھول بھال کر کسی اور کے دل کی دنیا بسانے جا رہی ہو اور مجھے شوگر کوٹڈ گولیوں کی صورت میں ہمدردی کے پھاہوں میں لپیٹ لپیٹ کر تلخ حقیقتیں پیش کر رہی ہو۔ بس اتنا ہی فرق ہے نا مجھ میں اور تم میں کہ میرا ماضی چھپا نہ رہ سکا اور تم نے اپنے کرتوتوں پر معصومیت اور راست بازی کی نقاب ڈال لی۔

ہمدردی کی، لگاوٹ کی ہونہہ!"

الماس..... نفرت اور حقارت سے سوچے جا رہی تھی۔



وہ الگنی پر کپڑے ڈالنے اوپر آئی تھی۔ کل شام سے وہ اسے چھت پر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اسے کوئی بہانہ سوجھتا ہی نہ تھا۔ جب سے ثریا آئی تھی، کام بہت بڑھ گیا تھا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کام اس کے سر پر لگا ہی رہتا تھا۔

آج اس نے صبح سے ہی کپڑوں کا ڈھیر لگایا ہوا تھا۔ بار بار دھلے ہوئے کپڑے کی بالٹی لیے وہ چھت پر آئی تھی لیکن انیس کا کچھ پتا نہ تھا۔

تمام کپڑے الگنی پر ڈال کر اس نے خشک کپڑے اکٹھے کیے اور ایک بار پھر مایوسی سے سامنے چھت پر نگاہ کی۔ اگلے ہی لمحے وہ کھل اٹھی۔ وہ موجود تھا۔

کپڑے چھوڑ کر وہ منڈیر تک چلی آئی۔ چند لمحوں میں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ اس نے بے تابی سے خط کو کھولا اور جلدی جلدی نظریں دوڑانے لگی۔ محض چند سطریں تھیں جو اس نے سیکنڈوں میں پڑھ ڈالیں۔

لکھا تھا کل رات ڈیڑھ بجے سے دو کے درمیان میں تمہارا منتظر رہوں گا۔ دروازہ کھلا چھوڑ دوں گا۔ سیدھی چھت پر چلی آنا کوئی بہانا نہیں چلے گا۔

تمہارا انیس۔

اس کی بے تابیوں کے جھاگ بیٹھ گئے۔ ہونٹوں کو اضطراری کیفیت میں دانتوں سے کاٹتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر تحریر پر نگاہ کی اور کاغذ کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں اڑا دیے۔

کس قدر بے چین اور مضطراب تھی وہ پچھلے کئی دنوں سے۔ ثریا آ چکی تھی اور اب اماں کسی بھی دن اسے لے جانے کے لیے آنے والی تھیں۔ وہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جاتی اور اس کی جگہ نیلم یہاں آ جاتی۔ ایسے میں وہ انیس کی جانب سے، کسی یقین دہانی کی، کسی وعدے کی منتظر تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی، کہ ان کا آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہوتا تھا۔ اور وہ تھا کہ اس کی بات سمجھ ہی نہیں پاتا تھا۔ محض وقتی لمحات کو رنگین کرنے کی بات کرتا تھا اور اس کے خدشات اور وہمات کو ہنسی میں اڑا تا رہتا تھا۔

اسے غصہ آنے لگا۔ وہ جانتی تھی، وہ رات کو کسی طور پر موقع نکال کر چلی بھی جاتی تو بھی انیس اپنی ہی راگنی گاتا رہتا۔ وہ اس سے کیسا یقین چاہتی تھی، کن الفاظ میں اپنی تسلی کرنا چاہتی تھی، اس سے اسے سروکار نہ ہوتا۔ وہ محبت کے قصوں اور رات کے حسن کی باتیں کرتا رہتا۔

”لیکن کل ایسا نہیں ہوگا۔“ اس نے آخر کار فیصلہ کر کے عزم سے سوچا ”جب تک وہ میری بات آرام اور اطمینان سے سن کر مجھے کوئی جواب نہیں دے گا۔ میں بھی اس کی کوئی بات نہیں سنوں گی۔

فیصلہ کر کے اس نے کپڑوں کا ڈھیر اٹھایا اور سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ صحن میں ثریا اپنے بیٹے کو نہلا کر کپڑے پہنا رہی تھی۔ شبنم نے کپڑے ایک طرف رکھے اور سستانے کے لیے اس کے قریب بیٹھ گئی۔۔

”تھک گئی ہو گی۔ صبح سے لگی ہوئی ہو۔“ ثریا نے بچے کو گرم کپڑے میں لپیٹتے ہوئے اسے مسکرا کر دیکھا۔

”نہیں ایسی کوئی خاص تھکن تو نہیں ہوئی۔“ اس نے دیوار سے ٹیک لگائی ”میں تو فارغ بیٹھ بیٹھ کر اکتا گئی تھی۔ کوئی کام ہی نہیں ہوتا تھا۔

جب سے تم واپس آئی ہو رونق سی ہو گئی ہے۔ دل تو لگا رہتا ہے نا!"

"امی بتا رہی تھیں۔" ثریا نے قدرے توقف کیا تھا" کہ تم"

"ہاں!" وہ اطمینان سے بولی۔ "میں چند دنوں میں چلی جاؤں گی۔ یوسف سے باضابطہ طور پر علیحدہ ہو کر۔ پھر یہیں آ جائیں گی۔"

"شبنم!" ثریا نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا" سچ سچ بتاؤ۔ کیسا لگ رہا ہے تمہیں؟ افسوس ہو رہا ہے یا۔"

"سچ بتاؤں؟" وہ ہنس پڑی۔ "بالکل ایسا لگتا ہے ثریا! جیسے کوئی قیدی عمر قید کاٹنے کے بعد اپنی رہائی کا حکم سنے۔ کوئی بے بس پرندہ برسوں کسی پنجرہ میں مقید رہ کر اچانک خود کو کھلی فضا میں محسوس کرے۔ یقین ہی نہیں آتا۔"

"اسی بات پر تو مجھے حیرت ہے۔

شبنم مسکرا دی۔ اب وہ اسے کیا بتاتی۔ یہ خوشی یوسف سے علیحدگی ہو جانے کی نہیں تھی۔ یہ خوشی اور اطمینان تو ایک نئی زندگی کے خیال نے اسے بخشا تھا۔ یہ امنگ امنگ میں تیرتی سرمستی تو انمس کے بے پناہ اظہار محبت کی پیدا کردہ تھی۔

اب بہت جلد اس کا بھی ایک گھر ہوگا۔ ایک چاہنے والا شوہر، ایک اعتماد سے پر، بے خوف زندگی ہوگی۔ یہ احساس اس کی رگوں میں تازہ خون بن کر دوڑنے لگا تھا۔ یوسف سے علیحدہ ہونا یا نیلم کا یوسف کی زندگی میں شامل ہونا اب اس کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتا تھا۔

"کیا سوچنے لگی ہو؟" ثریا نے اس کے چمکتے ہوئے چہرے پر نگاہ جما کر پوچھا تھا۔

اس کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ مسکرا دی۔

"سوچ رہی ہوں، بعض باتوں کی وضاحت کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ ورنہ میں تمہیں ضرور بتاتی کہ میں اتنی خوش کیوں نظر آتی ہوں......"

ثریا کچھ سمجھنے، کچھ نہ سمجھنے والی کیفیت میں مبتلا ہو کر اپنے بچے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

❀......❀......❀

"امی حضور! یہ بھائی کا پتا کہاں لکھا ہے؟"

شہروز بڑے مصروف انداز میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تھا۔

عفت خانم نے سلائیاں روک کر اسے دیکھا۔ ہاتھ میں کارڈ اور چہرے پر بے چینی تھی۔ وہ قدرے سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ وہ مسکرا دیں۔

"ایسا کیا کام پڑ گیا بھائی سے۔" انہوں نے سلائیاں اور اون کا گولا ایک طرف رکھ دیا۔

"یہ کارڈ پوسٹ کرنا تھا صبا کی شادی کا۔" اس نے بہت چاہا تھا کہ اندر کی اداسی لہجے میں نہ آنے پائے۔ لیکن وہ بھی اس کی ماں تھیں۔

"کیا بات ہے۔ بڑے سنجیدہ سنجیدہ ہو رہے ہو۔ اداس اداس سے۔" وہ مسکرا دیں" سہیلی کی جدائی کا غم ہو رہا ہے۔"

وہ اداسی سے مسکرا دیا تھا۔

کملی کی جدائی کا غم نہیں ابی حضور! کملی کو گھر نہ لا سکنے کا۔ خیر جانے دیں۔"
"وہ زبان دانتوں میں دبا گیا۔ جذبات کی رو میں بہہ کر نجانے کیا کچھ منکشف کرنے جا رہا تھا۔
"بتائیں ناں کہاں لکھا ہے بھائی کا پتا؟"
"شہروز کے پاس ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولیں "فیروز اپنی کسی ڈائری میں لکھ گیا تھا۔ دیکھ لو، اس کی ٹیبل پر کہیں ہوگا یا اس کا فون نمبری درج ہوگا۔ لیکن بیٹا! ابھی تو وہ گیا ہے۔ کہاں آپائے گا صبا کی شادی پر۔"
"یہ تو ان پر منحصر ہے نا۔ میرے ذمے جو کام لگایا گیا ہے، وہ مجھے تو کرنا ہی ہے۔" وہ دوبارہ سیڑھیاں پھلانگ گیا تھا۔ عفت خانم کچھ سوچنے لگی تھیں۔ کبھی کبھی شہروز کا کوئی جملہ سوچ کے کتنے ہی دوران پرواز کر جاتا تھا۔
"اور جب فیصل کا کارڈ ہمارے گھر آ ہی گیا ہے تو پھر فیروز کے لیے علیحدہ کارڈ کی کیا ضرورت پڑ گئی خاص طور سے۔"
وہ اکثر ذہنی طور پر الجھ جاتی تھیں۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے انہوں نے ایک سانس بھر کر دوبارہ صفائی شروع کر دی تھی۔
وہ فیروز کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ لائٹس آن کر کے اس نے ایک نظر شیلف میں ترتیب سے رکھی کتابوں پر ڈالی پھر میز کی جانب متوجہ ہو گیا۔
درازوں میں اس کی کچھ ڈائریاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ وہ سب کی سب ڈائریاں نکال کر لاپروائی سے ورق الٹ الٹ کر دیکھ کر رہا تھا۔ یکایک اس کے ہاتھ تھم گئے۔ نظر کا دھوکا تھا یا واقعی اس نے ایک نام خوش خطی سے لکھا دیکھا تھا۔ اس نے تیزی سے صفحے پلٹ کر تلاش کیا اور پھر دنگ رہ گیا۔
کتنے رنگوں سے صفحے پر جابجا "صبا" لکھا ہوا تھا۔ اس نے کپکپاتی انگلیوں سے مزید کچھ اوراق پلٹے۔ ایک جگہ درج تھا۔
رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے۔
"میری بیمار روح کا علاج کرنے والی مسیحا، میرے اندر پکتے ناسور کو اچھا کر دینے والی مری مونس! امری مریم، تیری نذر کرنے کے واسطے میرے پاس کچھ نہیں۔ تجھے دینے کے لیے کچھ سوچوں تو ہر سوچ مایوس لوٹ جاتی ہے۔ تیرے شایان شان میرا دل نہیں۔ تیرے قابل میری محبتیں نہیں۔ مجھے معاف کر دے۔ میں نے تجھے مایوس لوٹایا۔"
شہروز حیرت کے سمندر میں غوطے لگاتا، صفحے پلٹتا گیا۔ جابجا جملے درج تھے، اشعار تحریر تھے اور یہ سب کس کے نام لکھا گیا تھا، قطعاً واضح تھا۔

"بھائی! بھائی اتنے گہرے ہو کہ سمندروں کی گہرائیاں کم پڑ جائیں تمہارا دل ہے یا کائنات؟ اتنا وسیع، اتنا بڑا؟ لیکن ایسا کیوں کیا تم نے؟ جسے؟ جسے دیوی مان کر پوج رہے ہو، وہ خود داسی بن کر آئی تھی۔ تمہارے قدموں کی دھول مانگی تھی اس نے اپنی مانگ سجانے کے واسطے۔ تم نے اپنے کٹھور پن سے اس کی آنکھوں میں خوں رنگ آنسو بھر دیے اور یہ محبتوں کا خزانہ چھپائے رکھا۔ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ بھائی!"

وہ پتھر کے بت کی مانند ساکت بیٹھا تھا۔ یہ کیسی حقیقت منکشف ہوئی تھی اس پر۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔



"نیلو! آپ کی کوئی دوست آئی ہیں۔" مریم گیلے ہاتھ پونچھتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی۔ نیلم صندوق میں سے کپڑے نکال کر ارد گرد بکھرائے بیٹھی تھی۔ چونک کر متوجہ ہوئی۔

"میری دوست کون؟"

"پتا نہیں کوئی ماڈرن سی خاتون ہیں۔ عجیب سی۔" مریم کے انداز میں بھی الجھن تھی۔

"او، زارا تابش؟"

"نیلم کے ذہن نے فوراً ہی کام کیا۔

"اچھا تم یہ کپڑے سنبھالو، میں۔"

"اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ زارا چلتی ہوئی اسٹور روم کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"ہیلو کیا مصروفیت پھیلائی ہوئی ہے بھئی؟" وہ بڑے بے تکلفانہ انداز میں مخاطب تھی۔ نیلم جھینپے ہوئے انداز میں ہنس دی۔

"کچھ بھی نہیں۔ بس ذرا پرانے کپڑے نکال کر دیکھ رہی تھی۔"

"پرانے؟ یہ کپڑے تو ان چھوئے لگتے ہیں۔ لگتا ہے چپکے چپکے سسرال جانے کی تیاریاں ہیں۔ کیوں؟" وہ وہیں بیٹھ کر کپڑوں کو الٹنے پلٹنے لگی۔

نیلم ہولے سے مسکرا کر رہ گئی۔

"اگلے مہینے نکاح ہے ناہید کا اس لیے!" مریم نے کپڑے سمیٹتے ہوئے سادگی سے وضاحت کی تھی۔ "اماں کہہ رہی تھیں۔ کچھ جوڑے ہی لو۔ وہی دیکھ رہی تھیں نیلو!"

"او اچھا۔ اللہ مبارک کرے۔"

"آؤ نا اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔" نیلم نے موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے فوراً ہی اسے وہاں سے چلنے کے لیے کہا۔

وہ نہیں چاہتی تھی، زارا اس سلسلے میں مزید کچھ دریافت کرے۔ اور جواب میں اسے پوری رام کہانی سنانی پڑ جائے۔

"ہاں چلو۔" وہ کسی خیال سے چونکی تھی۔

نیلم نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ میک اپ سے ڈھکے ہوئے چہرے پر جانے کن خیالات کا سایا لہرایا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے گم صم ہوئی تھی۔

''کیا پیو گی۔ چائے، شنڈا یا کھانا؟ کھانے کا وقت ہے نا!''

''نہیں کھانا وانا کچھ نہیں۔ بس چائے پیوں گی اور کچھ دیر تمہارے ساتھ بیٹھوں گی۔'' نیلم نے مریم کو چائے بنانے کو کہا اور واپس اس کے پاس چلی آئی۔

''کب تک ارادے ہیں یہاں سے بوریا بستر گول کرنے کے۔'' وہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

''بس اگلے ماہ یا شاید کچھ دن اور لگ جائیں!'' وہ آہستگی سے بولی۔

''یہ کیسا جواب ہے؟ کوئی تاریخ وغیرہ فکس نہیں ہوئی اب تک؟'' نیلم پہلو بدل کر رہ گئی۔ اب وہ اسے کیا کیا بتاتی۔ کس کس بات کی وضاحت کرتی۔

''ویسے خوش قسمت ہو نیلم جان!''

''زارا شاید اپنے ہی کسی دھیان میں تھی۔ اس نے نیلم کا جواب نہ دیا محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ اپنی ہی دھن میں مگن کہہ رہی تھی۔

''عرفان عباسی جیسے شخص کے چنگل سے نکل کر باحفاظت، باعصمت اپنا گھر بسانے چلی ہو۔''

''میں تمہارا جتنا بھی شکریہ ادا کروں زارا! کم ہے تمہارا یہ احسان عظیم ہمیشہ ہمیشہ میرے کاندھوں پر رہے گا۔'' وہ ممنونیت سے بولی تھی۔

''نہیں نیلم! ایسے نہ کہو!'' وہ اداسی سے مسکرا دی۔ ''یہ تو میرے اپنے دل کا بوجھ ہے جسے ہلکا کرتی پھرتی ہوں میری روح اتنی زخمی ہے، اتنی مجروح کہ صحت یاب ہو ہی نہیں پاتی۔ کسی طور آرام آتا ہی نہیں۔ تمہیں بچا کر میرے اپنے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ برسوں بعد پر سکون گہری نیند سوئی ہوں۔''

وہ دھیرے دھیرے سے کہہ رہی تھی۔

''ایسا کیا دکھ ہے تمہیں؟'' نیلم اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

''وہی دکھ ہے نیلم! جو چند دن قبل تمہاری ذات کا ناسور بھی بن سکتا تھا۔'' اس نے گہری سانس بھر کر کہا۔ ''کچھ سال قبل میں عرفان عباسی کے کمرے میں اسی ٹیبل پر ٹکٹکی تھی جو تمہارے لیے مخصوص تھی۔''

''اوہ!'' نیلم حیرت زدہ رہ گئی۔

''ہاں۔ کتنی بار میں نے چاہا تم کسی طور مجھ سے بات کرلو۔ جو میں تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں وہ سمجھ لو لیکن نجانے کیوں تم مجھ سے اس قدر بدگمان رہیں!''

''پتا نہیں!'' اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا ''شاید تمہارا انداز ایسا تھا۔''

"ہاں! جانتی ہوں۔" وہ قہقہہ مار کر ہنس دی۔ "بگر نظر آتی ہوں میں کردار باختہ لگتی ہوں نا میں ہوں ہی ایسی نیلم! میں ہوں ایسی۔"
ہنسنے کے باوجود وہ اپنی آنکھوں کی نمی نہ چھپا سکی تھی۔ نیلم نے بے ساختہ اس کے ہاتھ تھام لیے۔
"ایسا مت کہو زارا! تم تو بہت عظیم، بہت بلند۔ میرے لیے تم اس دنیا کی سب سے اچھی عورت ہو۔"
"میں اچھی تھی نیلم!" اس نے گہری سانس بھر کر کہا تھا؟ بہت اچھی تھی۔ بالکل تمہاری طرح نرم رو، نرم گفتار، پاکیزہ، باعصمت لیکن میرا المیہ یہ ہے کہ مجھے کسی زارا تابش نے آکر نہیں بچایا۔ نئی نئی گھر سے نکلی تھی اور شدید ضرورت کے تحت یہ کوالٹی تو جس عورت میں ہو اس کی خوشبو مرد کو دس گز کے فاصلے سے محسوس ہوتی ہے اور پھر بھلا شکاری اپنا شکار نہیں پہچانیں گے تو اور کون پہچانے گا۔ میرے بار گرد بھی جال بنے جاتے رہے اور میں، میں ان میں پھنستی رہی۔ ہر نئے لیٹرے کو ایک نیا مسیحا جان کر اپنا دکھ کہتی رہی۔"
"اس کا چہرہ اندرونی اذیت کے احساس سے مسخ ہونے لگا۔
"یہ عرفان عباسی شاندار پرسنالٹی کا مالک، ویل ایجوکیٹڈ شخص بھلا مجھ جیسی عورت پر مہربان ہو جاتا۔ کیسی ناممکن سی بات تھی۔ جب یہ بات ممکن ہوئی تو مجھے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہ آیا۔ میں آنکھیں بند کر کے اس کے بتائے ہوئے رستوں پر چل پڑی۔ جو کچھ یہ کہتا گیا، میں مانتی گئی۔ اس نے اپنی ناکام ازدواجی زندگی کی جھوٹی کہانی سنا کر میری ہمدردی سمیٹی، مجھ سے لطف و عنایات کی برسات کی بھیک مانگی تاکہ اپنی صحرائی زندگی میں خوشی کے چند پھول کھلا سکے۔ میں قطرہ قطرہ برس گئی۔ خالی ہو گئی اور جب خالی ہوئی تو اس نے ایک ٹھوکر مار کر مجھے اپنی زندگی سے باہر پھینک دیا۔"
آنسو اس کے چہرے پر روانی سے بہنے لگے اور آواز بند ہونے لگی لیکن وہ بولتی رہی۔
"میں نے اپنا حق مانگا۔ رو کر، گڑگڑا کر لیکن وہ پتھر کا بے جان بت بن گیا۔ جانتا تھا، میں ایک غریب، مجبور، لاچار لڑکی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، اپنی بربادی کا فسانہ کسی سے نہیں کہہ سکتی کہ میرے سر پر نہ ماں کا سایہ ہے نہ باپ کا اور مجھ سے چھوٹی چار بہنیں ہیں جن کا بوجھ مجھے اٹھانا ہے۔"
گہری سانس بھر کر اس نے آنسو پونچھے تھے۔
"اور وہ ہمیشہ ایسی ہی لڑکیوں کا انتخاب کرتا ہے جن کے ہاتھ اس کے گریبان تک نہ پہنچ پائیں، جن کا کوئی مضبوط سہارا نہ ہو جو اپنی عزتوں کے خوف سے اس کے ظلم و ستم کی داستان کسی سے نہ کہہ سکیں۔ فیکٹری میں کتنی ہی غریب لڑکیاں ہیں جو اس کے دام میں پھنسی ہیں اور جنھوں نے اپنے ہونٹوں پر قفل ڈالے ہوئے ہیں۔ لیکن نجانے کیوں، تمہیں بربادی کی سمت بڑھتا دیکھ کر خود پر قابو نہ پا سکی۔ میں نے طے کر لیا تھا، تمہیں اس درندے سے بچانا ہے۔ مجھے اچھی لگی تھیں۔ بہت اچھی!"
"میں ایک مرتبہ پہلے بھی اس کے جال سے نکل بھاگی تھی۔" نیلم نے تاسف سے کہا اور مقام افسوس ہے کہ دوسری مرتبہ بھی اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئی۔"
"وہ بہت عمدہ اداکار ہے نیلم جان!" زارا تلخی سے ہنسی "تم سی معصوم لڑکیاں کہاں اس کے رموز و اسرار کو سمجھ سکو گی۔ میں کتنی بار اس کی

باتوں میں آئی، مجھے تو اپنی حماقتوں کی تعداد بھی یاد نہیں۔ اس نے اپنے فلیٹ کی ایک چابی مجھے دی ہوئی تھی اور صرف ایک اشارا کرتا تھا۔ میں اڑ کر اس تک پہنچ جاتی تھی۔

"نجانے کن نا آسودہ خواہشوں کا انتقام لیتا ہے وہ۔" نیلم نفرت سے بولی۔

"نا آسودہ؟" زارا ہنسی ایک مرتبہ اس کے گھر جا کر اس کی بیوی سے ملو۔ تمہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔ ایک بے پناہ حسین بیوی اور دو پیاری پیاری بیٹیوں کے ساتھ وہ ایک خوشگوار اور کامیاب زندگی گزار رہا ہے۔ جہاں کسی محرومی کا گزر تک نہیں۔"

"تم نے اس کی بیوی کو نہیں بتائے اس کے کرتوت؟" نیلم غصے سے پہلو بدل کر رہ گئی۔

"ارے نیلم جان! ابھی تم نے دنیا دیکھی نہیں۔" زارا نے گہری سانس بھری" وہ بے چاری بھی ایک عورت ہے اور عورت کا مقدر ازل سے ابد تک محض ایک لفظ درج ہے۔ سمجھوتہ، سمجھوتہ اور سمجھوتہ۔ عرفان عباسی کا پورا نامہ اعمال بھی اگر اس کے سامنے پیش کر دیا جائے تو وہ اپنی آنکھیں بند کرلے گی کہ اس کا ایک خوب صورت مکمل گھر ہے اور دو نوجوان لڑکیاں ہیں ایک لمبی عمر ہے۔"

دونوں نے ایک ساتھ ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"اب؟" نیلم نے اس کی جانب دیکھا۔ "اب کیا سوچا ہے تم نے اپنے بارے میں؟ یہ جھوٹا خول کیوں چڑھا رکھا ہے خود پر؟"

"جھوٹا؟" وہ تعجب سے ہنس دی۔ "اب تو یہی سچ ہے نیلم، یہی میرا سچ ہے اور میں چاہتی ہوں، میں ایسی ہی نظر آؤں جیسی میں حقیقت میں ہوں جب لوگ مجھے برا کہتے ہیں، برا کہتے ہیں تو مجھے خوشی ہوتی ہے کہ میں عرفان عباسی نہیں ہوں، ریاکار نہیں ہوں، منافق نہیں ہوں، دھوکا نہیں دیتی۔"

وہ خیالوں میں گم بول رہی تھی اور نیلم حد درجہ تاسف سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔



"صبا بجی! دانیال کا فون ہے۔ سن لو آ کر۔"

مجمہ خاتون کمرے میں جھانک کر کہتی ہوئی پلٹ گئی جوڑوں کی پیکنگ کرتی صبا نے زبان دانتوں میں دبالی۔

"تو پانچ سے دن رہ گئے ہیں۔ موصوف سے صبر نہیں ہوتا!" وہ قدرے جھنجلا سی گئی "کتنی شرم محسوس ہوتی ہے امی سے، کیا سوچتی ہوں گی امی بھی۔"

وہ بے دلی سے چلتی فون تک آئی تھی۔

"ہیلو صبا بات کر رہی ہوں۔" بڑی آہستگی سے اس نے کہا۔

"جی جناب کیسے مزاج ہیں!" وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔

"شکر ہے خدا کا۔ کیسے یاد کیا۔" وہ مسکرائی تھی۔

"یاد کرنے کے لیے کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں۔"

"اور آپ سنائیں۔ آپ کا وقت کیسے گزرتا ہے؟"

"بس یونہی لڑکیوں کو تو شادی سے پہلے ہزار کام ہوتے ہیں۔ کبھی کپڑوں میں کوئی کام نکل آتا ہے۔ کبھی کسی اور چیز میں امی مصروف رکھتی ہیں۔"

"ہوں! گویا تمہارے پاس وقت نہیں ہے کسی کو یاد وہ کرنے کے لیے۔ یہی بات ہے نا۔"

صبا لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی۔ جملے تو وہ شگفتہ شگفتہ بول رہا تھا یا بولنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اس کے انداز میں سنجیدگی تھی۔ وہ کھنچا کھنچا سا لگتا تھا۔

"کیا بات ہے۔" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ "کوئی پریشانی ہے؟"

"اس نے دوسری جانب قدرے توقف کیا تھا۔

"نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں۔" پھر وہ گہری سانس بھر کر بولا۔

"ایک بات کتنے دنوں سے پریشان کر رہی ہے مجھے۔ ذہن میں چبھ رہی ہے۔"

"کون سی بات۔" وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔

"اس دن الماس آپکی فرینڈ نے مجھ سے ایک عجیب سی بات کہی تھی یہ کہ مجھے یہ خوش فہمی کیوں ہونے لگی کہ میں آپکی پسند ہوں۔ کہا تھا نا!"

"اس کا لہجہ اس قدر عجیب تھا کہ صبا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ نجانے کیسا شخص تھا وہ کن باتوں کو پکڑتا تھا اور ان پر اس درجہ غور کرتا تھا۔

چند دن بعد وہ اس شخص کے مکمل تصرف میں جانے والی تھی۔ یہ خوف اس کے حواس منجمد کرنے لگا۔

"کیا بات ہے صبا؟" تم خاموش کیوں ہو گئیں۔"

''جی!'' وہ چونک اٹھی۔ ''میں سوچ رہی تھی پتا نہیں کب الماس نے ایسا کہا اور آپ نے اتنی سی بات کو دل سے لگا لیا۔ الماس کو تو عادت ہے ایسے مذاق کرتے رہنے کی۔''

''الفاظ اس کے حلق میں اٹکنے لگے تھے۔

''اتنی سی بات؟ مذاق؟ شٹ!'' وہ قدرے غصے سے بولا۔ ''یہ اتنی سی بات نہیں ہے صبا! اور نہ مذاق میں کہی جا سکتی ہے۔ کہنی ہی نہیں چاہیے۔ جہاں دو افراد کی زندگیوں کا سوال ہو وہاں ایسے مذاق نہیں ہوتے۔''

''کمال ہے دانیال!'' اس نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔ ''آپ آپ تو بہت زیادہ حساس ہیں۔ ذرا ذرا سی باتوں کو اس درجہ محسوس کریں گے تو زندگی کیسے گزرے گی ہم ایک دوسرے سے وابستہ ہونے جا رہے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنا چاہیے۔ دوسروں کی باتوں پر دھیان کیوں دھریں؟''

''نہیں صبا! میں نظر انداز کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' اس کا لہجہ قطعی تھا۔ ''اپنی دوست کو سمجھانا، مجھ سے بات کرتے ہوئے خصوصاً تمہارے بارے میں لفظوں کو سنبھال کر برتے۔ میں، میں اپنی ہونے والی بیوی کے معاملے میں یقیناً شدت پسندی کا مظاہرہ کروں گا۔''

صبا کا دل پانی پانی ہونے لگا۔

''صبا!'' پھر وہ نرم لہجے میں بولا تھا ''صبا! میں تمہیں خالص دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہر معاملے میں، میں چاہتا ہوں تمہارا انگ انگ پاک ہو، صاف ہو تم پاکیزہ اور شفاف نظر آؤ اور میرے لیے تمہاری محبت شدید اور خالص ہو۔ اس میں کسی دوسرے کے لیے کوئی گنجائش نہ نکلتی ہو۔ اتنی بھی نہیں کہ کسی کو مذاق میں بھی کچھ کہنے کا موقع مل سکے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا!''

''جی!'' آواز اس کے حلق میں ہی گھٹ گئی تھی۔

''آئی لو یو صبا! آئی رئیلی لو یو۔'' اس کے انداز کی تمام نرمیاں لوٹ آئی تھیں۔ لیکن صبا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کے وجود کو کسی شکنجے میں کس رہا ہو۔



شبنم جھکی ہوئی تخت پر بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

''اوہ السلام علیکم!'' وہ یک لخت سیدھی ہو گئی تھی۔

''وعلیکم السلام۔'' ان کی صورت پر عجیب سے تاثرات رقم تھے۔

''کیسی ہیں فردوس آپا! آئیں، یہاں بیٹھیں!''

وہ جلدی جلدی ثریا اور اس کے بچے کے کپڑے ہٹانے لگی۔

''نہیں یہاں نہیں۔'' انھوں ادھر ادھر دیکھا تھا۔ ''تمہاری ساس کہاں ہیں؟''

"امد ہیں بلاؤں؟" اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

"نہیں!" انہوں نے قدرے تامل کیا۔ "مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ لیکن اکیلے میں۔ مناسب سمجھو تو اپنے کمرے میں چلی چلو۔"

شبنم کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ان کا جبر انداز سمجھا رہا تھا کہ وہ کیا بات کرنے آئی تھیں۔ مارے شرمندگی کے اس سے زبان کھولنا محال ہو گیا۔

"آئیں اوپر چلیں۔"

وہ ان کو لے کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

کمرے تک ان کی رہنمائی کر کے وہ چائے بنانے کے خیال سے پلٹی تھی جب انہوں نے اسے آواز دے لی۔

"بات سنو شبنم! کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چند باتیں کروں گی اور چلوں گی۔"

"جی!" وہ ہتھیلیاں مسلتی ہوئی ان کے سامنے بیٹھ گئی "کہیں فردوس آپا!"

"دیکھو، اتنا تو مجھے یقین ہے کہ تم انکار نہیں کرو گی جو کچھ میں کہوں گی، وہ تمہیں تسلیم کرنا ہوگا کیونکہ شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تم انعم سے ملتی ہونا کچھ عرصے سے۔ تم دونوں۔"

"جی جی!" اس کا سر جھک گیا۔ "وہ فردوس آپا در اصل میں ہم دونوں۔"

الفاظ کسی طور پر اس کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس کے تو خواب خیال میں بھی نہ تھا کہ کبھی کوئی ایسا موقع بھی آئے گا۔ وہ اس طرح بطور مجرم کٹہرے میں کھڑی ہوگی اور اپنی صفائی میں کہنے کے لیے اس کے پاس ایک لفظ نہ ہوگا۔

"بیٹی!" وہ بڑے افسوس سے بولی تھی؟ "تم شادی شدہ ہو اتنا بھی نہ سوچا شادی شدہ عورت کے لیے تو بدنامی ایسا سیاہ داغ ہوتی ہے جو زندگی کے ایک ایک انچ میں زہر بھر دیتی ہے۔ کچھ بھی نہیں بچتا۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ آگ ہر شے کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔"

"فردوس آپا!" اس کی آواز بھرا گئی "میں شادی شدہ نظر آتی ہوں لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔"

"حقیقت کچھ بھی سہی۔ فی الوقت میں تمہاری حقیقت جاننے نہیں تم پر چند حقیقتیں عیاں کرنے آئی ہوں۔ عورت ہوں، ماں ہوں، خدا سے ڈرتی ہوں۔ تمہیں برا نہیں کہوں گی۔ جو تمہارے دل میں ہے وہ تم جانو۔ میں تو صرف اتنا کہوں گی بیٹی تم آگ سے کھیل رہی ہو۔"

"آپا! آپا! یقین کریں۔" وہ لجاجت سے بولی ہمارے دلوں میں برائی نہیں ہے۔ ہم دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میرے شوہر چند دن میں مجھے طلاق دے دیں گے کیونکہ وہ میری بڑی بہن سے نکاح کے خواہش مند ہیں یہ جبری بندھن چند دن اور ہے پھر میں ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاؤں گی۔"

وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی تھیں۔

"میں کوئی خراب کردار کی عورت نہیں ہوں آپا! جو شوہر کے ہوتے ہوئے تفریحاً دوسرے مردوں پر ڈورے ڈالوں۔ میں تو اپنی تمام سچائیوں کے ساتھ آپ کے بیٹے کی زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں آپ کے آگے مجھے اس خوشی سے محروم نہ کریں۔ میرے

سا پر ہاتھ رکھ دیں۔ ساری عمر آپ کے پیر دھو دھو کر پیوں گی میں۔"

"بیٹی! خوشی کے دھوکے میں بڑے عظیم دکھ کو گلے لگانے چلی ہو تم!" وہ بے تاسف سے بولی تھیں۔

شبنم نے چونک کر سر اٹھایا۔

"ارے وہ بد بخت، نالائق اس قابل ہی کہاں ہے کہ اسے تمام سچائیوں کے ساتھ کوئی عورت ملے۔ وہ تو چند روزہ جھوٹے بندھنوں کا قائل ہے۔ بھونرے کی طرح شاخ شاخ گھومتا پھرتا ہے۔" حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

"آپ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپا؟"

"تمہارے قصے اس گلی کے ہر اوباش کی زبان پر ہیں۔ اپنے ہر یار کو شریک راز کر رکھا ہے اس نے۔ کل میں نے خود اس کی گفتگو سنی۔ شاید آج رات تم دونوں کی ملاقات طے ہے۔" شبنم کا سر گھٹنوں سے جا لگا۔

"اتنا کھوں گی بیٹی! حیا اور عصمت عورت کا اصل گہنا ہے۔ اسے انیس جیسے نالائقوں کے سپرد ہرگز مت کرنا۔ تمہاری زندگی میں محرومیاں ہیں تو بھی ہمت اور صبر سے کام لو۔ خدا ضرور اچھا اجر دے گا۔"

وہ کھڑی ہو گئی تھیں۔

"جو میرا فرض تھا، وہ میں نے پورا کیا۔ آگے تم خود با اختیار ہو، سمجھدار ہو۔ اپنی حفاظت آپ کرنا سیکھو بیٹی! جو متاع عمر بھر کام آئے، اسے یوں ہر راہ چلتے کے سپرد نہیں کر دیتے۔"

وہ پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔ فردوس آپا اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر نکل گئیں۔



اذیت و کرب کا ایک سیلاب تھا جس میں اس کا وجود ایک کمزور تنکے کی مانند بہا جا رہا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے کے قریب تھیں۔ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہوئی جا رہی تھی۔ اتنا دھوکا!! اتنا فریب!! اتنی ریاکاری!

یا خدا! تیری دنیا اب تک کس چیز پر قائم ہے؟ زمین، آسمان، سورج، چاند ستارے اب تک کیسے اپنے اپنے مقام پر موجود ہیں؟ ہر شے تہہ و بالا کیوں نہیں ہو جاتی۔؟

"ساری رات وہ یہی سوچتی رہی تھی۔ فردوس آپا جو تلخ حقائق اس پر عیاں کر گئی تھیں، انہوں نے اس کی نس نس میں زہر گھول دیا تھا۔ وہ قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ فنا ہو رہی تھی۔

بڑی مشکلوں سے اس کی آنکھ لگی تھی لیکن ذہنی حالت کی خرابی نے نیند میں بھی اسے چین نہ لینے دیا۔ خیالات آسیب بن کر اس کی آنکھوں میں اتر آئے۔ کبھی وہ یوسف کو ایک خوفناک بلا کے روپ میں اپنا پیچھا کرتے دیکھتی، کبھی ریاض بھائی کا چہرہ کسی مکروہ درندے کے جسم پر لگا نظر آتا رہا اور جب دس ہاتھ پیروں والی ایک عجیب الخلقت مخلوق نے انیس کا چہرہ لگا کر اسے اپنے شکنجے میں کسنے کی کوشش کی تو ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس کا سارا بدن بری طرح سے اکڑا ہوا تھا اور اسے مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔ بڑی دیر تک وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے در و دیوار کو تکتی رہی پھر چادر ہٹا کر بستر سے اتر آئی۔

سورج کی روشنی کھڑکی کے پردے سے چھن کر اندر آ رہی تھی۔ اس نے پردہ ہٹا کر کھڑکی کھول دی اور کھلی کھڑکی میں کھڑی بڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی۔ سوچوں کا لاوا دماغ سے پگھل پگھل کر اس کے شانوں میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کا جسم جلنے لگا۔ تنفس کی رفتار حد درجہ تیز ہو گئی۔

یکایک ایک فیصلہ کر کے وہ مڑی تھی۔ باتھ روم میں جا کر اس نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارے اور چہرہ خشک کیے بنا باہر نکل آئی۔ بڑی تیزی سے الماری سے چادر نکال کر وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔

نیچے باورچی خانے میں گرم گرم چائے کی خوشبو نکل رہی تھی۔ شاید چچی اندر تھیں۔ یونس اور ثریا کے کمرے کا دروازہ ابھی بند تھا اور یوسف نجانے کہاں تھے۔

وہ کسی کی بھی موجودگی اور غیر موجودگی کی پروا نہ کرتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔ گلی میں معمول کے مطابق چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ وہ کسی بھی جانب دھیان دیے بغیر تیر کی طرح سیدھی اس کے اسٹور پر جا پہنچی۔

وہاں چند افراد موجود تھے۔ انیس کسی کا سامان شاپر میں ڈال رہا تھا۔ اسے یوں بے جھجک سیدھا اپنی جانب آتا دیکھ کر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ عین اس کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔ اس کا ہر ہر انداز غیر معمولی تھا۔

"جی، جی کیا چاہیے؟" انیس چند لمحوں کے لیے ہراساں ہوا تھا۔

محلے کے دو تین افراد وہاں موجود تھے۔

"کیا کیا بیچتے ہو، کس کس دام پر؟ اور خریدتے کیا کیا ہو؟ سوداگر ہو یا سوداگر کے روپ میں لٹیرے ہو، ڈاکو ہو بولو؟"

اس کی آواز بلند اور لہجہ حد درجہ مستحکم تھا۔ دونوں ہتھیلیاں پوری مضبوطی کے ساتھ کاؤنٹر پر ٹکائے وہ ایک ٹک اس کے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے تھی۔

معاملہ انیس کی توقعات کے اس قدر برعکس تھا کہ چند لمحوں تک وہ کسی ردعمل کا اظہار تک نہ کر سکا۔ پریشان ہو کر دکان پر کھڑے افراد کے چہرے تکنے لگا۔

"کیا معاملہ ہے بیٹی؟ سودے سلف میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے کیا؟" کسی معمر شخص نے اس سے پوچھا تھا۔

"یوسف صاحب کے گھر سے آئی ہیں۔" کسی نے دبی آواز میں کہا تھا۔

"ہاں اچھا اچھا سنا تو تھا۔" ایک اور سرگوشی ابھری تھی۔

وہ بڑی تیزی سے ان لوگوں کی جانب مڑی تھی۔

"ہاں سنا ہوگا۔ آپ لوگوں نے ضرور سنا ہوگا۔ اس سے پہلے بھی کئی افسانے سنے ہوں گے کیونکہ اس جیسے لٹیرے، شکاری ہر گلی کے ہر موڑ پر پھندے لگائے بیٹھے ہوتے ہیں جن میں مجھ جیسی بچانے کتنی عورتیں اب تک پھنسی ہوں گی اور پھنستی رہیں گی۔ لیکن آپ لوگوں کا کام صرف سننا، دیکھنا اور انجان بن جانا ہے اور وقت آنے پر صرف اور صرف عورت کو مورد الزام ٹھہرا کر طعنوں کی بارش سے لہولہان کرنا ہے۔ ملامتوں، لعنتوں سے سنگسار کرنا ہے۔ اس جیسے اوباش، عزتوں کے لٹیرے چمکتی نظریں اور صاف پیشانیاں لیے کسی اگلے شکار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ مجرم محض میں یا یہ نہیں، آپ لوگ بھی ہیں جن کی آنکھوں میں کہانیاں اور ہونٹوں پر قفل ہوتے ہیں۔" اس کا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔

"خاتون! اپنے حواسوں میں تو ہیں۔ مجھے تو کسی دورے کا شکار لگتی ہیں۔" وہ معمر آدمی برامان کر بولا تھا۔

"ہاں، ہاں۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب!" بری طرح سے گھبرائے ہوئے انہیں کوئی بات سوجھی تھی "امی بتاتی ہیں یہ خاتون نارمل نہیں ہیں یہ، یہ پاگل ہیں۔ کوئی انہیں گھر چھوڑ آئے۔"

"ہاں پاگل ہوں میں، پاگل ہوں جو تم جیسے شخص سے اپنی ہر امید کو وابستہ کیا، تیری ست رنگی باتوں میں بھیگ کر دنیا کی بدصورتیوں کو بھلانے چلی تھی، ایک لٹیرے کو اپنی پونجی، اپنی دولت کا محافظ بنا کر خوش تھی۔

اس کی آواز بھیگ گئی۔

"اور تم سب لوگ صحیح الدماغ ہو، عقل مند ہو، جو مجھ سی عورتوں کا تمسخر اڑاتے ہو، ہماری کہانیاں بناتے ہو، ہمیں راندہ درگاہ قرار دیتے ہو۔ میں پاگل ہوں۔" یکایک وہ دونوں کاؤنٹر کے بیچ لگا چھوٹا سا تختہ ہٹا کر دکان میں گھس گئی اور انہیں کا گریبان پکڑ کر اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔

"تم کیوں نہیں لٹتے، تم کیوں محفوظ رہتے ہو، تمہاری دنیا کیوں تہہ و بالا نہیں ہوتی، تمہارے قصے کیوں نہیں بنتے، تمہاری کہانیاں کیوں نہیں دہرائی جاتیں کیونکہ تم مرد ہو، حاکم ہو، مختار ہو تم خدا ہو اس دنیا کے؟"

انہیں نے اس کے پے در پے حملوں سے گھبرا کر اس کے ہاتھ تھامنے کی ناکام سی کوشش کی لیکن وہ ایک جنون کے عالم میں تھی۔ اندر رکھی اشیاء اٹھا اٹھا کر اس نے انہیں پر پھینکنا شروع کر دیں۔

"تمہارا تماشا کیوں نہ بنے۔ تم کیوں نہ بدنام ہو۔ کیوں نہ گلی گلی ڈھنڈورا پیٹا جائے۔ تمہارے منہ پر کیوں نہ تھوکا جائے۔ خوشیوں کا قتل عام کرنے والے، کسی کی آرزوؤں، امیدوں کا گلا گھونٹنے والے، کسی کی معصومیت، اعتماد، بھروسے کا جنازہ نکالنے والے۔ غاصب، قاتل، لیٹرے۔" کتنے ہی لوگ اسٹور کے آگے جمع ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا پورا محلہ امڈ آیا۔ لیکن اسے ہوش تھا نہ کسی کی پروا۔

"شبنم! شبنم دیوانی ہو گئی ہو۔"

"کسی نے پیچھے سے آکر اسے بڑی مضبوطی سے تھاما تھا۔

آواز پہچان کر وہ بے سدھ سی ہو گئی تھی۔ وہ یوسف تھے۔ گہرے گہرے سانس بھرتی وہ ان کے بازو سے سر ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

"ارے میاں! گھر کا خیال رکھو۔ بیوی کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔" ایک بڑے میاں پیچھے سے مشورہ دے رہے تھے۔

وہ اسے لے کر لوگوں کے بیچ سے نکلتے چلے گئے۔ ہر جانب سے فقرے اور عجیب و غریب الفاظ تیز سرگوشیوں کی صورت میں ان پر برس رہے تھے وہ کسی معمول کی مانند، ساکت ذہن کے ساتھ ان کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔

"سنبھالیں اسے۔"

انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی اسے وحیدہ چچی پر تقریباً پھینک دیا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ بے طرح گھبرا گئیں "کہاں سے لا رہے ہو اسے؟"

"بھرے بازار سے لا رہا ہوں۔ جہاں یہ اپنی عزت کی نیلامی لگوا رہی تھی۔ ہمارے خاندان کے منہ پر کالک مل رہی تھی۔ جہان بھر میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا اس نے۔"

"تمہارا منہ ہے ہی اس لائق کہ اس پر نظر پڑتے ہی تھوک دیا جائے۔" وہ بپھر کر مڑی "تمہارا، تمہارے جیسے ہر مرد کا۔ میں کیا کالک ملوں گی اس منہ پر یوسف صاحب! تمہارا چہرہ، تمہارا دل، تمہارا ذہن تمہارے وجود کا ہر ہر حصہ سیاہ ہے۔ کالک زدہ ہے۔"

"بند کرو کواس اپنی۔" وہ دانت پیس کر غرائے "منہ توڑ دوں گا تمہارا۔ زبان کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

"یوٹی یوٹی کر دو میری لیکن اس سے میری آواز نہیں دبا پاؤ گے۔ میرا رواں رواں پکارے گا کہ میری بربادی کے ذمہ دار تم ہو، قصوروار تم ہو۔"

"ہوا کیا ہے؟" یونس بھائی بھی کمرے سے نکل آئے تھے۔

"ہونا کیا ہے۔" انہوں نے دانت پیسے۔ "جوانی سر چڑھ کر بول رہی ہے اس کی۔ اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے اس کا اصلی چہرہ پوری طرح بے نقاب ہو گیا ہے۔ مجھے تو نجانے کب سے شک تھا اس پر۔ پہلے آمنہ کا خیال کر کے مصلحتاً خاموش رہا تھا اور اب محلے والوں کی باتوں پر کان لپیٹے رہا، یہ سوچ کر کہ چند دنوں کی بات اور ہے پھر یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفعان ہو جائے گی۔ لیکن بالآخر یہ اپنی نحوست پورے محلے میں پھیلا کر جا رہی ہے۔"

"تمہاری سزا تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ تم اس سے زیادہ کچھ سنتے!" وہ چلائی۔ "میری دنیا جیسے تم نے تباہ کی۔ تمہاری بہن کی زندگی بھی یونہی پامال ہوتی۔ ساری زندگی سلگتے، جلتے لیکن میں تمہاری طرح اپنا قلب سیاہ نہ کرتی۔"

"امی!" وہ حمیدہ چچی کی جانب مڑے تھے۔ "اس منحوس ناگن کو کل ہی اس کے گھر پہنچائیں۔ معاملہ برداشت سے باہر ہو چکا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو، میرے ہاتھوں اس کا قتل ہو جائے!" وہ بات مکمل کر کے باہر نکل گئے۔

"تم قتل کر چکے ہو مجھے۔ فنا کر ڈالا ہے میری ہستی کو تم نے۔ آگ لگا چکے ہو میری خوشیوں کو۔ اور کیا کرو گے، اور کیا کرو گے یوسف صاحب تم۔"

وہ دیوانوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

ثریا اور وحیدہ چچی سے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

❀.....❀.....❀

اس دن کی آخری کلاس لے کر وہ سکون کا سانس بھرتی باہر نکل آئی تھی۔ کاریڈور سے گزرتے ہوئے وہ لائبریری میں بیٹھ کر بقیہ نوٹس مکمل کرنے کا ارادہ باندھ رہی تھی۔

"ریشم!"

"کسی کے پکارنے پر اس کے قدم تھم گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک شناسا سا چہرہ تھا۔ اس نے چند لمحے دماغ پر زور ڈالا۔ اتنے میں وہ قریب آ چکا تھا۔

"مسز! آپ ریشم ہی ہیں نا؟"

"جی ہاں، آپ؟"

دفعتاً اسے یاد آ گیا۔ یہ لڑکا اس کے پڑوس میں ہی رہتا ہے۔ کئی مرتبہ آتے جاتے سامنا ہوتا تھا۔

"میرا نام راجہ ہے۔ میں ذوالفقار کا دوست ہوں۔ آپ کے سامنے والی لین میں رہتا ہوں۔"

"جی، جی میں نے پہچان لیا ہے۔"

"اسے پوری طرح سے یاد آ گیا تھا۔ اس کی ماں اور خالہ کافی دن نیلم کے لیے ان کے ہاں چکر لگاتی رہی تھیں۔

"مجھے اماں نے بھیجا ہے۔ آپ کی اماں نے۔ وہ ذرا حوصلے سے کام لیجئے گا۔"

"اس نے قدرے توقف کیا۔ ریشم کے اعصاب یک بیک تن گئے۔

"کیا بات ہے؟" اس نے سفید پڑتے چہرے کے ساتھ پوچھا تھا۔

"اصل میں ذوالفقار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

"میرے خدا!" اس نے بے اختیار دیوار تھامی تھی۔

ہاتھ میں پکڑی کتابیں فرش پر بکھر گئی تھیں۔

"بڑی زخمی حالت میں اسے گھر لائے ہیں۔ میں نے ہی ڈاکٹر وغیرہ کا بندوبست کیا ہے لیکن، کچھ امید نہیں کی جا سکتی۔"

ریشم نے حلق سے اٹھنے والی چیخوں کا گلا گھونٹنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"اماں نے مجھے بھیجا ہے کہ میں آپ کو گھر لے آؤں۔ چل کر مل لیں ان سے!"

"نہیں نہیں۔" وہ بے اختیار رونے لگی۔ "یہ حادثے ہماری ہی قسمت میں کیوں لکھے گئے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے ایسا!"

"حوصلے سے کام لیں مسز! دعا کریں دعا۔" اس نے بڑے خلوص سے تسلی دی تھی۔ "چلیں جلدی گھر چلیں!"

"اس نے ٹوٹتے شانوں اور بکھرتے حوصلوں کے ساتھ اپنی کتابیں اٹھائیں اور اس کے پیچھے چل دی۔

وہ سعید عمران نے کر آیا تھا۔ ریشم کے لیے پچھلا دروازہ وا کر کے وہ خود اگلی سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ وہ بوجھل دماغ کے ساتھ خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت اس کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ دماغ کسی سوچ کو گرفت نہ کر رہا تھا۔ کسی منظر کا کوئی مطلب نہ سوجھ رہا تھا۔

یونیورسٹی کی حدود سے نکل کر کچھ دور جا کر گاڑی رک گئی۔ تب بھی اسے خبر نہ ہوئی۔ وہ اپنے دکھ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اچانک ہی پچھلے دونوں دروازے کھلے تھے۔ دونوں جانب سے دو لڑکے گاڑی میں بیٹھے تو وہ حواسوں میں آئی گاڑی پوری رفتار سے آگے بڑھی تھی۔

اس نے بدحواسی سے دائیں بائیں گردن گھما کر دونوں لڑکوں کو دیکھا اور پھر پوری طرح ہوش میں آ گئی۔ غزالہ کے بھائی کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔

"کیا..... کیا بات ہے؟ کہاں لے جا رہے ہو مجھے.....؟" وہ سخت دہشت زدہ ہو گئی تھی۔

"جنت میں!" وہ خباثت سے ہنسا۔

"نہیں نہیں، گاڑی روکو خدا کے لیے۔" وہ چیخنے لگی تھی۔

"چپ کر کے بیٹھو ورنہ!" نثار کے ساتھی نے اچانک ہی ریوالور نکال لیا تھا۔ اس کا جسم برف ہو گیا۔ وہ دونوں ہاتھ گالوں پر رکھ کر وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

"خدا کا واسطہ مجھے جانے دو۔ مجھ سے تم لوگوں کی کیا دشمنی ہے۔ میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔"

"کہا نا۔ خاموش رہو۔" تیسرے لڑکے نے اس کی کمر میں ریوالور کی نالی چبھوئی۔

اچانک ہی قریب سے گزرتی بائیک پر ایک شناسا چہرہ دکھائی دیا تھا۔ ریشم کے دماغ نے پلک جھپکنے میں کام کیا تھا۔

"بچاؤ۔"

"اس نے اپنی تمام تر قوتوں کو مجتمع کر کے چیخ ماری تھی۔ ان تینوں کو قطعاً اندازہ نہ تھا۔ کہ وہ ایسی کوئی حرکت اچانک کرے گی۔ ایک لمحے کے لیے وہ بوکھلا کر رہ گئے۔ پھر نثار نے پوری قوت سے ریوالور اس کے سر پر مارا۔ وہ چکرا کر رہ گئی۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

"چادر ڈھانپ دو اس پر۔" اگلی سیٹ پر سے راجہ نے ہدایت کی "لٹا دو سیٹ پر!"

"جگہ کہاں ہے۔" نثار جھنجلایا "تم گاڑی روکو۔ میں اگلی سیٹ پر آ جاتا ہوں۔ اس کو لٹا دیتے ہیں تا کہ نظر نہ آئے۔"

راجہ نے گاڑی روکی۔ نثار دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ لیکن اس سے قبل وہ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھتا، پیچھے سے ایک بائیک پوری رفتار کے ساتھ مٹی اڑاتی اس کے قریب آ رکی۔

"اے رکو۔"

بائیک سے اترتے لڑکے نے بڑی تڑی سے اسے مخاطب کیا تھا۔

وہ رکنے کے بجائے بڑی پھرتی سے گاڑی میں بیٹھنے لگا۔ راجہ نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ لیکن اتنی دیر میں دونوں لڑکے ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔

ایک نے راجہ کو باہر گھسیٹ لیا۔ دوسرے نے نثار کو۔

"کہاں لے جا رہے ہو لڑکی کو؟ ہاں؟۔"

"تم سے مطلب؟۔" نثار نے تیزی سے کہا۔

دوسرے ہی لمحے ان کا تیسرا ساتھی بھی اتر آیا تھا۔

"حیدر۔ سنبھل!"

"شہروز نے حیدر کو پیچھے سے ہونے والے حملے کی بروقت اطلاع دی تھی۔ وہ پانچوں بری طرح لڑ گئے تھے۔ لاتوں اور گھونسوں کا آزادانہ استعمال ہونے لگا۔

شہروز اور حیدر باقاعدہ ورزش کرنے والے، کھاتے پیتے گھرانوں کے صحت مند نوجوان تھے۔ جب کہ وہ لوگ کافی اناڑی قسم کے غنڈے تھے۔ جلد ہی مار کھانے لگے تھے۔

اسے ہوش آیا تب بھی بڑی دیر تک اس کے حواس قابو میں نہ آئے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور جہاں ہے وہاں تک کیسے پہنچی۔ اٹھ کر بیٹھی تو گاڑی سے باہر کا منظر اسے مزید دہشت زدہ کر گیا۔ وہ آپس میں بری طرح گتھم گتھا تھے۔

ریشم بدحواسی میں دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

اچانک ہی ایک اور گاڑی قریب آ کر رکی اور اس میں سے شہروز اور حیدر کے گروپ کے باقی لڑکے بھی نکل آئے۔

"نثار۔" راجہ حلق پھاڑ کر چلایا تھا۔ "نکال ریوالور۔"

نثار نے ریوالور نکال کر اندھا دھند چند فائر کر ڈالے۔ شہروز کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ گولی اس کی پنڈلی چیرتی نکل گئی تھی۔ وہ بے اختیار پیچھے گرا۔

ان غنڈوں کے لیے اتنا موقع غنیمت تھا۔ برق رفتاری سے گاڑی میں بیٹھ کر وہ ہوا ہو گئے۔ وہ سب دوست شہروز کی جانب متوجہ ہو گئے۔ جب کہ وہ بہتا ہوا خون دیکھ کر ایک بار پھر بے ہوش ہو گئی تھی۔



اسے ہوش آیا تو بڑی دیر تک وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ کہاں ہے۔ آہستہ آہستہ ساری باتیں یاد آ گئیں تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھ گئی۔ ایک کراہ اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے سر کی طرف گیا جو پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ جہاں ریوالور کی ضرب لگی تھی وہاں گومڑ سا ابھر آیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سر دبانے لگی۔

پھر بے اختیار ہو کر اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ نہایت سلیقے اور سادگی سے سجا ہوا خوب صورت سا کمرہ تھا۔ وہ حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"اسی لمحے دروازہ کھول کر عفت خانم اندر داخل ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں تسبیح لیے وہ قدرے فکر مند نظر آ رہی تھیں اس پر نگاہ پڑی تو بے اختیار مسکرا دیں۔

"ارے بیٹی! شکر ہے تم اٹھیں تو۔ اب کیسی طبیعت ہے؟" وہ اس کی جانب بڑھ آئیں۔

"جی میں ٹھیک ہوں، لیکن میں ہوں کہاں؟ آپ کون ہے؟" بڑی نحیف و نزار آواز میں وہ پوچھ رہی تھی۔ عفت خانم مسکرا دیں۔

"ڈرو نہیں، اپنے ہی گھر میں ہو، یوں سمجھو اللہ کے ہاتھوں میں ہو۔ دودھ پیو گی؟"

"میں، میں گھر جاؤں گی!" اس نے تھوک نگلا۔

"ہاں ہاں۔ تم اپنا پتا بتاؤ۔ میں ابھی چھوڑ آتی ہوں۔ تمہارے گھر والے بھی فکر مند ہوں گے۔ فون نمبر کیا ہے تمہارا؟"

"جی ہمارے گھر فون نہیں ہے۔ آپ پڑوس میں فون کر دیں۔ وہ لوگ میسج دے دیں گے۔" عفت خانم مسکرا دیں۔

"چلو پھر پڑوس کا نمبر ہی بتاؤ۔"

وہ نمبر بتا رہی...... تھی جب دروازہ کھول کر بہروز احمد اور شہروز احمد داخل ہوئے۔ شہروز کے ہاتھ میں اسٹک تھی اور وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔

"آ گئے تم لوگ۔ شکر ہے خدا کا۔ کیا کہا ڈاکٹر نے؟" عفت خانم بڑی فکر مندی سے شہروز کی سمت بڑھیں۔

"سب خیریت ہے۔ ٹانگ اور ٹانگ کی ہڈی بالکل سلامت ہے!" وہ بشاشت سے مسکرایا۔ "بس زخم بھرنے میں چند دن لگیں گے۔ تب تک مابدولت فراغت ہی فراغت سے ہیں۔ کیوں بھائی جان؟"

"خدا بچائے ایسی فراغت سے!" وہ خفگی سے بولی "میرا تو دل ہی بند ہو گیا تھا خون دیکھ کر خدانخواستہ گولی۔"

انہوں نے جھرجھری لے کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"خدا تم لوگوں کو اپنی امان میں رکھے۔ خدا سب کو محفوظ رکھے۔"

"آنٹی! میں گھر جاؤں گی۔" وہ بیچ میں منمنائی تھی۔

"شہروز آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ گھر آ کر سب سے پہلے ماں سے تصدیق کروا چکا تھا کہ آیا یہ وہی لڑکی ہے یا نہیں جس سے بھائی کی منگنی ہوئی تھی۔

''ان کے انکار سے حریدا الجھن میں مبتلا تھا۔ مہندی والی رات جو کچھ آنکھوں نے دیکھا تھا۔ اسے بھلا کس طرح فراموش کر سکتا تھا۔

''بیٹی! تم اپنے پڑوس کا نمبر دو اور گھر میں کسی کا نام بتاؤ۔ میں ابھی فون کر کے تمہارے گھر والوں کو مطلع کرتی ہوں۔ اب بے چاروں کا بھی پریشانی سے برا حال ہوگا۔ شام ڈھلنے کو ہے اور تم ابھی تک گھر نہیں پہنچیں۔''

ریشم نے جلدی جلدی انہیں نمبر بتایا۔ اماں کا دھیان کر کے اس کا دل یک لخت بیٹھ سا گیا تھا۔ عفت خانم کمرے سے نکلیں تو بہروز احمد کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگے۔

''کیا دشمنی تھی ان لوگوں کی آپ سے؟'' وہ نرم لہجے میں پوچھ رہے تھے۔ ''کیوں آپ کو اغوا کرنے کی کوشش کی انہوں نے؟''

''اسے بے اختیار رونا آ گیا۔

''میں نہیں جانتی۔ جب سے غزالہ گھر سے بھاگی ہے۔ اس کا بھائی میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ کہتا ہے اس کی بہن کے فرار ہونے میں میرا ہاتھ ہے۔ حالانکہ خدا گواہ ہے۔ مجھے بالکل علم نہیں کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ گئی ہے۔''

''غزالہ؟ فرار؟'' بہروز بڑے زور سے چونکے تھے۔ ''پلیز! مجھے پوری بات بتائیں۔'' اس نے روتے آنسو پونچھتے، کبھی سسکیاں لیتے تمام قصہ ان کے روبرو بیان کر دیا۔ دونوں بھائی معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

''ہوں! تو یہ وہ لوگ ہیں۔'' پوری بات سن کر وہ بولے تھے۔ ''تعجب ہے! بظاہر اس قدر سادہ اور شریف نظر آنے والے لوگوں کا اندرونی حال یہ ہے۔ میرا خیال ہے شہروز! اس لڑکے کو سبق ملنا چاہیے اس حرکت پر۔ کسی شریف لڑکی کی آبرو کو کیا سمجھا اس نے ایک معصوم کو کب سے ہراساں کر رہا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں بھائی۔ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر پہلی فرصت میں ان لوگوں کو گرفتار کروائیں۔ اس زمین کا بوجھ ہیں یہ لوگ۔''

''میں ذرا ایک فون کرتا ہوں۔ انہیں مہلت نہ ملے تو اچھا ہے۔'' وہ اٹھ کر باہر نکل گئے تھے۔ وہ خاموش نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ ململ کے سیاہ دوپٹے میں اس کا گلابی چہرہ رونے کی وجہ سے متورم ہو رہا تھا۔ بھاری پپوٹے، چھوٹی سی ناک، بھرے بھرے لب وہ بے حد پاکیزہ اور معصوم لگ رہی تھی اور وہ ایک عرصے سے اس چہرے ان نقوش سے نفرت میں مبتلا تھا۔

ریشم کو بھی کمرے میں پھیلی تنہائی اور خاموشی کا پوری طرح سے احساس ہو رہا تھا۔ وہ کسی ایسی بچی کی طرح نظر جھکائے باادب بیٹھی تھی جو پہلی مرتبہ قاعدہ اٹھائے استاد کی خدمت میں پیش ہوئی ہو اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں مارتا نہیں ہوں۔ ڈانٹتا بھی نہیں ہوں۔ کچھ بھی نہیں کہتا۔ آپ ڈر کیوں رہی ہیں؟''

''جی؟'' وہ نظروں میں حیرت بھر کر اسے دیکھنے لگی۔

''دراصل وہ جو ایک آدھ مرتبہ یونیورسٹی میں آپ سے بدتمیز کر بیٹھا۔'' وہ غلط فہمی پہنچی تھی آپ مجھ کو گئی ہوں گی!''

"جی!" وہ پھر نظریں جھکا گئی۔

"پھر بھی معذرت چاہتا ہوں۔ معاف کردیں!"

"کوئی بات نہیں۔ آپ تو میرے محسن ہیں۔" وہ بڑی سادگی سے بولی۔ "اگر آج آپ نہ ہوتے تو نجانے۔"

"میں نہ ہوتا۔ کوئی اور ہوتا۔ دراصل خدا مدد کرتا ہے۔ وسیلہ تو کوئی بھی بن سکتا ہے۔"

وہ پھر الجھن میں گرفتار ہو کر اسے دیکھنے پر مجبور ہوئی۔ شہروز کو اس کی صورت دیکھ کر ہنسی آ گئی۔

"اگر آپ مجھے ذرا دیر کے لیے رک کر اصل صورت حال سے آگاہ کر دیتیں تو میں کیوں بار بار آپ کا پیچھا کرتا۔ آپ تو مجھے دیکھ کر یوں بھاگی تھیں گویا میرے سر پر سینگ اور دانت تھوڑی تک ہوں۔"

وہ خجل سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر سیدھا ہو گیا تھا۔

آپ کو تو تنگ کرتے بھی ترس آتا ہے۔" بڑی آہستگی سے اس نے کہا تھا۔ تھوڑی دیر میں عفت خانم اور بہروز احمد بھی وہاں آ گئے تھے۔ جتنا اس کے لیے پھل اور دودھ لے آئی تھی جو عفت خانم نے بڑے اصرار سے اسے پلایا۔ وہ منع کرتی رہی لیکن وہ پھل بھی کاٹ کاٹ کر اس کے آگے رکھتی رہیں۔

آخر میں بہروز احمد ایک مرتبہ کھنکھارے بھی تھے اور وہ خاصا خجل ہو کر بغلیں جھانکنے لگا تھا۔ قریباً آدھے گھنٹے میں نیلم اور مریم وہاں پہنچ گئی تھیں۔ دونوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"ریشم میری جان!" نیلم نے اسے بازوؤں میں بھرا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"بجو! بجو آج میں مر جاتی بجو۔"

"ہم سب مر جاتے ریشم!" اس کی آواز بھرا گئی۔ "آدھے مرے ہوئے ہیں۔ پورے مر جاتے۔ کیسی قسمتیں لکھوا لائے ہیں اوپر سے آزمائشیں پوری ہو نہیں چکتیں۔ امتحان ختم ہی نہیں ہوتے!"

"ہماری کیا دشمنی ہے کسی سے بجو! لوگ کیوں ہمارے پیچھے پڑ جاتے ہیں!"

"ہماری دشمنی سب سے ہے ریشم! ہمارے سر پر کوئی سائبان نہیں ہے۔ اور جن کے سر کھلے ہوتے ہیں۔ ان کا تو آسمان دشمن ہوتا ہے۔" وہ بھی لاچاری سے رونے لگی تھی۔

"جن لڑکیوں کے باپ نہ ہوں اور بھائی جن بہنوں سے منہ موڑ لیں اور غربت جن کے آنگن میں پر پھیلائے بیٹھی ہو ان سے دشمنی کی اجازت سارے جہان کو مل جاتی ہے۔ نہ رو میری بہن نہ رو۔"

خود زار و قطار روتے ہوئے وہ اس کے آنسو پونچھ رہی تھی۔

"بس کرو بیٹی! یوں دل چھوٹا نہیں کرتے۔ تقدیر کو یوں برا نہیں کہتے۔ آزمائشیں سب کے حصے میں آتی ہیں۔ خدا پر بھروسا ہر حال میں رکھنا

چاہیے!"

"عفت خانم اسے سمجھانے لگیں۔ کمرے میں موجود ہر شخص ان بہنوں کی گفتگو سے متاثر نظر آ رہا تھا۔

"آپ لوگ بالکل فکر نہ کریں۔ وہ لڑکے بچ نہیں پائیں گے۔ جلد ہی آپ ان کی گرفتاری کی خبر سنیں گی۔"

بہروز احمد بڑی نرمی سے مخاطب تھے۔ نیلم نے نظر بھر کر انہیں دیکھا پھر وہ انہیں پہچان گئی۔ یہ وہی نرم خو شخص تھا جس سے عباسی کے فلیٹ کی سیڑھیوں پر وہ ٹکرا گئی تھی۔ جس نے اسے گھر تک پہنچانے کا بندوبست کیا تھا۔

بہروز احمد کی نگاہوں میں شناسائی کے رنگ تھے۔ وہ بڑی دیر سے اسے گھور رہے تھے۔

"بہروز بیٹا! بچیوں کو گھر تک چھوڑ کر آؤ۔" عفت خانم ان سے مخاطب تھیں۔



پورا گھر بقعہ نور بنا تھا۔ ہر شے گویا جھلملا رہی تھی۔ بے تحاشا روشنیوں نے ہر چیز میں رنگ بھر دیے تھے۔ جان ڈال دی تھی۔

صبا پیلا جوڑا پہنے، بڑے انہماک سے ہاتھوں پر بیل بوٹے بنتے دیکھ رہی تھی۔ ماہر بیوٹیشن کے ہاتھ بڑی تیزی سے چل رہے تھے اور اس کے ہاتھوں کی ہر ہر حرکت صبا کے ہاتھوں میں رنگ بھر رہی تھی۔ گلاب کھلا رہی تھی۔

"صبا!" کسی نے بڑی آہستگی سے پکارا تھا۔

"وہ چونک اٹھی۔

ہلکے سبز آرگنزا کے سوٹ میں الماس اس کے مقابل تھی۔ سفید موتیوں کے گلوبند اور آویزوں نے اس کے چہرے کو چاند بنا دیا تھا۔

صبا اٹھ کر اس سے لپٹ گئی۔

"شکر ہے تم آ گئیں تو۔ میں تو ڈر رہی تھی۔ کہ کہیں میری واحد، اکلوتی، پیاری سی دوست ناراض تو نہیں ہو گئی۔"

"بھلا ایسی بھی کیا بات ہوئی تھی۔" وہ قدرے سنجیدہ تھی۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو الماس۔" صبا نے مسکراتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔ "ایک تل لگا لو، کہیں کسی کی نظر ہی نہ لگ جائے۔"

"نظر تو لگ چکی!" وہ بے فکری سے قریبی کاؤچ پر نیم دراز ہو گئی۔ "اب کچھ نہیں ہوتا۔ تم مہندی لگواؤ۔ تمہارے سسرالی آتے ہی ہوں گے۔"

"صبا نے اس کے اکھڑے اکھڑے سے انداز محسوس کیے اور خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

"یہی کپڑے پہنے رہو گی؟" الماس نے ماحول کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے خود ہی پوچھا تھا۔

"ہاں مایوں کا جوڑا شادی والے روز ہی بدلتے ہیں۔ آج وہ لوگ دوپٹہ لائیں گے۔ رسموں کے لیے وہی اوڑھنا ہے۔"

کچھ ہی دیر میں دولہا والے مہندی لے آئے تھے۔ ان کی جانب سے کافی خواتین اور لڑکیاں تھیں۔

ہر چند کہ سارا انتظام لان میں تھا لیکن اس رونق کو پورے گھر میں محسوس کیا جا سکتا تھا۔ الماس بھی لان میں چلی آئی تھی۔ وہ بے حد خوشگوار رات تھی۔ پورا چاند، ٹھنڈی ہوا اور فضا میں بکھری رات کی رانی کی دلفریب مہک۔

ایک نسبتاً تنہا گوشے میں کھڑی وہ کچھ سوچتی رہی۔ ایسی باتیں پہلے کبھی اسے بالکل اٹریکٹ نہ کرتی تھیں۔ جب عثمان خان یا صبا ماحول کی کسی خوبصورتی کی نشاندہی کرتے، اسے سراہتے تو اسے بہت حیرت ہوا کرتی تھی۔ وہ صرف اپنی ذات کی خوبصورتیوں میں گم رہتی تھی۔ لیکن اب اسے اردگرد کی چیزیں محسوس ہونے لگی تھیں۔ اپنی ذات کا خالی پن تکلیف دینے لگا تھا۔ اپنی محرومیوں کا احساس کچوکے لگانے لگا تھا۔

"السلام وعلیکم! یہاں اکیلے کیا سوچا جا رہا ہے؟" کوئی بڑے قریب سے مخاطب تھا۔

"الماس بے طرح چونکی۔ رواسلک کے کرتا شلوار میں ملبوس دانیال ہاشمی اس کے مقابل کھڑا تھا۔

"اوہ آپ، وعلیکم السلام۔ مبارک ہو بھئی۔ بالآخر یہ ساعتیں بھی آن پہنچیں جن کے لیے اتنا انتظار کیا آپ نے۔" گہرا سانس بھر کر وہ مخاطب ہوئی تھی۔

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔ الماس نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ وہ بے حد جاندار، زندگی سے لبالب بھرا ہوا لگ رہا تھا۔ تر و تازہ اور شگفتہ۔ یہ دلکشی کس خوشی کی مرہون منت تھی۔ وہ جانتی تھی۔ اسے اپنا عکس زہریلا ہوتا محسوس ہونے لگا۔

یہ شخص، یہ اتنا شاندار شخص، اتنا قیمتی شخص یہ تو اس کی تلاش تھا۔ اسے تو اس کے لیے ہونا چاہیے تھا۔

"ہاں ساری دنیا جلاتی ہے۔ تم بھی جلانے آ ؤ گے۔" وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔

"نہیں، میں قطعاً افسردہ نہیں۔" اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ "دراصل میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں صبا نے اپنے بے چارے پڑوسیوں کو انوائٹ بھی کیا ہے یا نہیں۔ کوئی دکھائی نہیں دیتا!"

دانیال ہاشمی کے چہرے نے جس تیزی سے رنگ بدلے تھے اسے اس نے بخوبی محسوس کیا تھا۔

"آپ!" اس کا چہرہ کھنچ گیا تھا۔ "آپ اکثر ذکر کرتی ہیں ان "پڑوسیوں" کا۔

"میں۔" وہ ہنس دی۔ "ارے ایک زمانہ تھا۔ صبا کو ان کے ذکر کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ گھنٹوں تو وہ ٹیرس پر کھڑی رہتی تھی۔"

"کیوں۔؟" اس کا رنگ سرخ پڑ رہا تھا۔ "مسٹر شہروز کو دیکھنے کے لیے"

"شہروز؟" الماس چونکی۔

"پھر دفعتاً اسے یاد آیا۔ صبا نے بتایا تھا کہ دانیال، شہروز سے حد درجہ خائف رہتا ہے۔ اس کا نام سننے کا روادار نہیں۔

"ہاں شہروز!" بڑے اطمینان سے بولی تھی۔ "اصل میں جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ آپ دھیان مت کیجیے گا۔ چھوٹی عمروں میں سبھی ادھر ادھر نظر مار لیتے ہیں۔ ویسے بے چارہ آج آیا نہیں۔ شاید کمرے میں بند الیسے گانے سن رہا ہو۔"

اس نے خود ہی اپنی بات پر ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔

"آپ بالکل مائنڈ مت کیجیے گا۔ اور صبا سے استفسار کرنے نہ بیٹھ جائیے گا پہلی ہی رات کو۔" وہ پھر ہنسی۔ "وہ میری خبر لے گی کہ کیوں اس کی پول پٹی کھولی میں نے۔ آپ کس سوچ میں پڑ گئے۔ میں نے کہانا، سب چلتا ہے۔ اصل حقیقت تو شادی کے بندھن کی ہے۔ یہ چھوٹے موٹے رومانس کس کی زندگی میں نہیں ہوتے۔"



لمحہ بھر کے لیے شبنم نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا سراپا غور سے دیکھا۔ محض ایک رات اور ایک دن نے اسے کتنا بدل دیا تھا۔ اسے واضح طور پر محسوس ہوا۔

بکھرے الجھے بال، متورم آنکھیں، مزرد چہرہ، وہ برسوں تک کھلا ہوا گلاب لگتی تھی اور آج برسوں کی بیمار نظر آرہی تھی۔

"شبنم بیٹی!" تھوڑی دیر قبل وحیدہ چچی اوپر آئی تھیں۔ "تم اپنا سامان اکٹھا کرلو تو میں تمہیں گھر چھوڑ آتی ہوں۔"

"وہ پھوپھی بستر کے قریب کھڑی اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی تھیں۔

"اور پھر اب تمہارا یہاں سے فوری طور پر چلے جانا ہی بہتر ہے۔ اسے ہاں اسے طول دینے سے کیا حاصل۔ جب کوئی رکھنے پر ہی راضی نہیں اور اب تو تمہاری بہنانے بھی ہاں کر دی ہے۔"

"یوسف میاں نے طلاق تو لکھ دی ہے کاغذات تیار کروا رہے ہیں۔"

وہ قدرے توقف کے بعد بولی تھیں۔

"اب تم خود سمجھ لو تمہارا یہاں سے فوری چلے جانا ہی بہتر ہے۔ سامان اکٹھا کرلو۔ میں ٹیکسی منگوا لیتی ہوں۔"

وہ اس کے بے جان پڑے وجود پر ایک نگاہ ڈال کر باہر نکل گئی تھیں۔ ہر چند کہ انہوں نے بے حد نرم گفتار رہنے کی اپنی سی پوری کوشش کی تھی لیکن ان کے لہجے کی سرد مہری اور بے اعتنائی چھپائے نہ چھپتی تھی اور پھر اس میں ان کا بھی کیا قصور تھا۔ آخر کو اس کا کردار کھل کر ساری دنیا کے سامنے آ گیا تھا۔ بھلا کون تھا جو اس سے ہمدردی کرتا یا محبت جتاتا۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ نجانے کس جرم کی سزا بھگتی تھی اس نے۔ کتنے بے کیف دن، کتنی بوجھل راتیں اس نے یہاں بنا کسی قصور کے کاٹی تھیں۔

ایک سرد آہ بھر کر اس نے اٹیچی بند کیا۔ پھر اسے یاد آیا۔ وہ اپنے زیورات رکھنا تو بھول ہی گئی تھی۔ وہ اس نے کون سے قرض اتارنے تھے جو اپنا کچھ چھوڑ کر جاتی۔ وہ لاکر کی چابی ڈھونڈنے لگی۔

ذرا سی تلاش کے بعد الماری کے اوپر خانے کے کونے میں رکھی چابی اسے مل گئی۔

لاکر کھول کر اس نے اپنے زیورات کے ڈبے نکالے اور بے دھیانی نظر ان پر ڈال کر لاکر بند کرنے لگی۔ تب ہی نجانے کتنی تلخ یادیں اس کے ذہن پر دستک دے گئیں۔

یوسف کی ڈائریاں لاکر میں پڑی تھیں۔ اسے یاد آ گیا۔ ان ڈائریوں میں ماہ و سال کے حساب تحریر تھے۔ ملاقاتوں کی باتوں کے دن اور تاریخیں لکھی تھیں۔ نیلم کی تصاویر تھیں اور اس کے فراق میں لکھی گئی تحریریں تھیں۔ عرصہ ہوا یہ ڈائری اس کے ہاتھ لگی تھی اور وہ لفظ لفظ پڑھ کر جل گئی، سلگی تھی۔

"بہت معصوم بنتی ہو بیگم! یہ تمہارا اعمال نامہ ہے۔ تمہارے منہ پر ماروں گی اسے۔ اپنی شادی کا تحفہ سمجھنا میری جانب سے۔"

"اس نے ڈائریاں نکال لیں۔ ایک نظر ڈالنے کی غرض سے اس نے سرخ جلد والی ڈائری کھول لی تھی۔ ورق الٹتے الٹتے یکا یک وہ سکتے کی سی کیفیت میں آ گئی۔ اس پر انکشاف کے کتنے در وا ہونے لگے۔ وہ پڑھتی ہی چلی گئی۔ وہ قرب و فراق کے فسانے، وہ ہجر کی داستانیں تو قصہ پارینہ تھیں۔ یوسف کی نئی سوچ، نیا چہرہ اس کے سامنے آ رہا تھا۔

"تو لڑکی نہیں پتھر ہے۔ دیوی نہیں، ایک بے جان مورتی ہے جس کے سینے میں دل نہیں جذبات نہیں۔ تجھے میرے احساسات کی پروا نہیں نہ سہی، میں نے بھی قسم کھائی ہے۔ تیرا غرور پاش پاش کر کے رہوں گا۔ بہت انا ہے تجھ میں۔ یہی انا ناگن بن کر عمر بھر تجھے ڈسے گی۔ بے رحم حسینہ! تو میری دسترس میں آئے گی اور ضرور آئے گی اور ساری عمر تڑپے گی۔ میں تجھے معاف نہیں کر سکتا۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پڑھتی گئی۔

"آج میں نے اسے فون کیا۔ کتنی منتیں کیں، کس قدر التجائیں کیں، اپنا آپ اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ لیکن وہ اندھی، بہری اور گونگی بن گئی ہے۔ میں نے اسے کس قدر چاہا تھا، آج میں اس سے اتنی ہی نفرت کرتا ہوں۔ لیکن اسے میری بننا ہوگا۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔ پھر میں اسے ساری زندگی اپنے قرب کے لیے ترساؤں گا۔ تب اسے اندازہ ہوگا۔ تڑپنا کس کو کہتے ہیں!"

"پھوپھو، وحیدہ چچی اور ثریا سر جوڑے سرگوشیوں میں معروف تھیں۔ یوسف اندر کمرے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے باورچی خانے میں داخل ہو گئی۔

چھریوں والے خانے سے اس نے لیے پھل والا، تیز دھار چاقو نکالا اور اپنی انگلی پھیر کر اس کی دھار دیکھی۔ لمحہ بھر میں اس کی انگلی خون سے رنگین ہو گئی تھی وہ اٹھی اور چاقو پیچھے چھپا کر باہر نکل آئی۔

یوسف نے اسے اس وقت دیکھا جب وہ ان کے سر پر پہنچ گئی۔ پلک جھپکتے میں اس نے چاقو سر سے بلند کر کے ان پر حملہ کر دیا۔

"کمینے، درندے کتنوں کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ بتا کتنوں کی زندگیاں عذاب بنائے گا۔ بول۔؟"

"یوسف بری طرح چیخ رہے تھے۔ چاقو کی تیز دھار نے انہیں جگہ جگہ سے زخمی کر دیا تھا۔

"ایک میں کافی نہیں تھی تیرے انتقام کی آگ سرد کرنے کے لیے۔ ابھی اس لاڈو کے لیے تجھے اور وجود درکار ہیں۔" اس پر دیوانگی طاری تھی۔ جب تک یونس، وحیدہ چچی اور ثریا نے اسے قابو کیا، وہ بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔

"امی! یہ دماغی صدمے سے پاگل ہو گئی ہے۔ اسے فوراً اس کے گھر پہنچا کر آئیں۔ میں یوسف کو ہسپتال لے کر جاتا ہوں۔"

"یونس ماں کو ہدایت دیتے ہوئے یوسف کو سنبھال کر باہر نکل گئے تھے۔ وہ بے ہوش ہو کر ثریا کے بازوؤں میں جھول رہی تھی۔



صبا ابھی ابھی تیار ہو کر پارلر سے لوٹی تھی۔

ڈارک میرون بھاری کام والا شرارہ اور بھاری زیورات اسے عجب ملکوتی حسن عطا کر رہے تھے۔

"ماشاءاللہ۔"

"اسے کمرے میں لا کر بٹھایا گیا تو مجمہ خاتون نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

"میری بیٹی کسی دیس کی ملکہ لگ رہی ہے۔"

"وہ دیس کہیں دولہا بھائی کا دل تو نہیں!" کوئی لڑکی شرارت سے بولی تھی۔

صبا کے لبوں پر خوبصورت سی مسکراہٹ اتر آئی۔

"آنٹی! پہلے تو کسی فوٹو گرافر کو بھیج دیں۔ ان کے لیے اچھے اچھے کلوز اپس ہو جائیں۔"

"جلدی جلدی یہ کام نپٹا لو بیٹی! مجھے وقت پر ہال میں پہنچنا ہے۔" وہ کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

"السلام علیکم۔" کسی نے دروازے سے اندر جھانکا تھا۔ "اندر آ سکتے ہیں جناب!" صبا نے بے اختیار گردن موڑ کر دیکھا اور مسکرا دی۔

شہروز سر اندر کیے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا رہا تھا۔

"آؤ نا، وہاں کیوں کھڑے ہو؟"

"دراصل ہاتھ میں کچھ چیز ہی ایسی ہے۔ آپ ڈر نہ جائیں۔" وہ بیساکھی کے سہارے لنگڑاتا اندر آیا۔ صبا سہم کر سیدھی ہوئی تھی۔

"ہائے شہروز! یہ کیا ہوا؟"۔

"بس! کچھ نہ پوچھیں۔" وہ کراہا "آپ کی شادی کے پرمسرت موقع پر بھنگڑا رقص پیش کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ کوئی اور پارٹنر فوری طور پر دستیاب نہ ہو سکا تو مجبوراً جنا کو راضی کیا۔ اس بے چاری کا لاچہ پہننے کا پہلا پہلا موقع تھا۔ سنبھل نہ سکی۔ اس کا پیر پھسلا میری ٹانگ پر لگا اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے!"

صبا بے اختیار ہنس دی تھی۔

"یہ لڑکا اسی ایک کام میں تو ماہر ہے۔ باتیں بنانے میں!"

"پیچھے سے آتی حفصہ خانم کہہ رہی تھیں۔ صبا بے اختیار کھڑی ہو گئی۔

"السلام علیکم آنٹی!"

"وعلیکم السلام!" انھوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔ "ماشاءاللہ خدا نظر بد سے بچائے۔ دائمی خوشیوں سے نوازے۔ آباد رکھے!"

"آنٹی! کیا ہوا ہے انہیں۔۔؟" صبا صوفے پر بیٹھے شہروز کو دیکھ کر فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔ عفت خانم نے اسے مختصر الفاظ سے گزرے دن کی روئیداد سنادی۔

"اسی لیے ہم لوگ کل تمہاری مہندی کی رسم میں بھی شریک نہ ہو سکے۔" وہ کہہ رہی تھیں۔ "اس کی ٹانگ بہت درد کر رہی تھی۔ پھر میرا جی بھی نہ چاہا اس کو اس حال میں چھوڑ کر آنے کو۔ آج تو یہ شام سے ہی تیاری پکڑ کر بیٹھ گیا کہ میری اکلوتی کزن کی شادی ہے۔ میں تو ضرور جاؤں گا۔"

"آج اگر یہ نہ آتا تو میں خود لینے آجاتی اس کو۔" صبا مسکرا دی۔ "ایک ہی تو میرا بھائی ہے پھر اس نے جھگڑا بھی ڈالنا ہے۔ کیوں شہروز۔۔؟"

"ابھی کہہ کر تو دیکھیں۔" اس نے سرد آہ بھری، "مجال نہیں جو انکار کر جاؤں۔ ایسا "دھنگڑا بھنگڑا" پیش کروں گا کہ تماشائی اَش اَش کر اٹھیں گے!"

"باجی!" بجنا گوٹے کناری کے سوٹ میں ملبوس اندر داخل ہوئی تھی "فیروز بیٹا آئے ہیں۔"

"فیروز؟" عفت خانم کو حیرت ہوئی "وہ آ گیا ہے؟۔"

"ہرا بھائی آ گئے!" شہروز نے بڑی عجلت میں اٹھنے کی کوشش کی تھی۔

دونوں ماں بیٹا آگے پیچھے باہر نکل گئے تھے۔ صبا گم صم سی بیٹھی رہ گئی۔

تو وہ حسب وعدہ آ پہنچا تھا۔ اس کی خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے۔ شہروز نے کہا تھا کہ بھائی کا آنا مشکل ہے۔ لیکن وہ آیا تھا۔ عین وقت پر پہنچ گیا تھا۔ اسے اپنا کہا یاد تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ نجانے یہ کیسا تعلق تھا۔ یہ کیسا رابطہ تھا۔ اس بندھن کو وہ کبھی خود بھی نہ سمجھ پائی تھی۔

"بیوٹی فل! یقین نہیں آتا یہ تم ہی ہو!"

صبا نے چونک کر پلکیں اٹھائی تھیں۔ سیاہ، چمکتی جالی کے سوٹ میں ملبوس الماس اندھیرے میں جلتی شمع کی مانند دلکش اور جاذب نظر لگ رہی تھی۔

"الماس!" صبا نے بے اختیار اس کے ہاتھ تھام لیے "بہت اچھی لگ رہی ہو!"

"جانے دو۔" وہ مسکراتی ہوئی اس کے قریب بیٹھ گئی "آج کا دن تمہارا ہے۔ تمہارے آگے کسی کا چراغ نہیں جلتا۔ آج دیکھتے ہیں معانیال ہاشمی صاحب سب کے سامنے دل پر قابو کیسے رکھتے ہیں۔ سچ صبا! بے ہوش نہ ہو جائیں وہ!"

"کچھ ہی دیر میں شہروز بھی اندر آ گیا۔ اب وہ قدرے سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"بھائی آ گئے ہیں۔" اس نے صبا کو بغور دیکھتے ہوئے کہا "صرف اور صرف شادی میں شریک ہونے کے لیے کل صبح واپس چلے جائیں گے۔"

صبا نظریں جھکا کر اپنی ہتھیلیوں کو دیکھنے لگی۔ کتنی شدت سے وہ چاہتی تھی کہ یہ نام، یہ شخص اسے اجنبی لگنے لگے۔ لیکن ایسا ہوتا نہ تھا۔ وہ

شناسا کیوں لگتا تھا۔؟ اس سے ایک بے نام سا رشتہ کیوں محسوس ہوتا تھا؟ یہ رشتہ درد کیوں دیتا تھا؟، وہ بہت سے سوالوں میں گھر گئی تھی۔ شہروز اب الماس سے لگا ہوا تھا۔ اس کے تیکھے لہجے اور چبھتی باتوں کی قطعاً پروانہ کرتے ہوئے مسلسل اس سے مصروف گفتگو تھا۔

لیکن صبا کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ ان لوگوں کی باتیں نہ سن رہی تھی۔

"صبا بیٹی!" نجمہ خاتون کارڈلیس تھامے اندر آئی۔ "یہ فون ہے۔" ان کے چہرے پر فکرو پریشانی کے آثار اس قدر گہرے تھے کہ وہ چونکے بنا نہ رہ سکی۔

"کس کا فون ہے امی؟" اس نے کارڈلیس تھامتے ہوئے ایک نگاہ ماں کی شکنوں سے پریشانی پر ڈالی۔

تمہاری ساس کا۔" وہ آہستگی سے بولی تھیں۔

"ہیلو، السلام علیکم آنٹی!" وہ بڑی الجھن میں گویا ہوئی تھی۔

"وعلیکم السلام بیٹی! کیا تمہاری دانی سے کوئی بات ہوئی تھی کل یا صبح۔" وہ آواز سے ہی حواس باختہ لگ رہی تھیں۔

"جی میں کچھ نہیں آنٹی! کیسی بات؟ میری تو ان سے تقریباً ہفتہ ہو گیا، بالکل بات نہیں ہوئی!"

"میرا مطلب ہے۔ کوئی جھگڑا لڑائی؟۔"

"جی۔" اس کا دل نہایت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں کو پسینے میں ڈوبا ہوا محسوس کیا "نہیں بالکل نہیں کیا ہوا ہے آنٹی"

"یہ بتاؤ بیٹی! یہ شہروز کون ہے؟ کیسے جانتی ہو تم اسے۔؟" وہ اسے مسلسل ہراساں کر رہی تھیں۔

"پڑوس میں رہتا ہے۔ بڑے اچھے تعلقات ہیں ہمارے۔" اس نے تھوک نگلا تھا "کیا بات ہے مجھے بتائیں کیا ہوا ہے؟"

"بیٹی کیا کہوں۔ کیسے کہوں۔ عزت پر بنی ہوئی ہے۔ جان جسم سے نکلتی محسوس ہو رہی ہے۔ دانی...... دانی صبح سے غائب ہے۔؟"

"جی!۔" وہ سکتے میں آ گئی۔

"ایک خط چھوڑ گیا ہے۔ جس میں تحریر ہے کہ تمہاری کسی شہروز نامی لڑکے سے کمٹ منٹ ہے۔ اس لیے تمہاری شادی اس سے کر دی جائے۔ بیٹی! مجھے بتاؤ اصل معاملہ کیا ہے۔ دانیال سے کس نے یہ سب کچھ کہا۔ کیا تم نے اس سے کبھی مذاق میں کچھ کہا تھا وہ تو بہت غصیلا اور شدت پسند لڑکا ہے۔ غصے میں آ کر انتہائی قدم اٹھا لیتا ہے پھر بعد میں پچھتاتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ وہ وہ آج نہ آئے۔ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے۔ کچھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ مجھے بتاؤ بیٹی کوئی بات ہے تو۔"

"آنٹی! آنٹی!"

"اس کے حوصلے جواب دے گئے۔ لب کپکپانے لگے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسے ایک گولا سا حلق میں اٹکتا محسوس ہوا۔

اسی لمحے نجمہ خاتون کی ہمراہی میں توقیر صاحب تیزی سے اندر داخل ہوئے تھے۔

"ابو!" صبا پر جیسے سمندر کا پانی بھر گیا تھا۔

اس کا جی چاہا وہ مر جائے۔ کسی ایسی جگہ جا کر چھپ جائے جہاں کسی کی نگاہیں اس تک نہ پہنچ پائیں۔ کسی کی آواز نہ آئے۔ وہ اندھی اور بہری ہو جائے۔ اس کا دماغ مفلوج ہو جائے۔ کچھ تو ہو ایسا کہ وہ اس شرمندگی اور ذلت سے بچ پائے جو اس کا مقدر ہونے چلی تھی۔

"ہیلو۔" توقیر صاحب نے اس سے کارڈلیس لے لیا تھا۔ "جی توقیر بات کر رہا ہوں!" ان کی ایسی آواز اور ایسا لہجہ صبا نے اپنی زندگی میں کبھی نہ سنا تھا۔ آنسو روانی سے اس کا چہرہ بھگونے لگے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں محترمہ! ہماری زندگیوں کا سوال ہے۔ عزت کی بات ہے۔ آخر میری بیٹی کا جرم کیا ہے۔"

"آہ" صبا نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

ایک باپ کس طرح ان الزامات کا سامنا کرتا۔ اس کے دل کو کتنی ٹھیس پہنچی، وہ بخوبی سمجھ سکتی تھی۔

"جی۔" وہ سکتے کے عالم میں رہ گئے تھے۔ "سوچ سمجھ کر بولیں بیگم ہاشمی، میں...... میں اپنی بیٹی کو اچھی طرح سمجھتا ہوں مجھے مان ہے اس پہ۔"

وہ بول رہے تھے لیکن اس کے لہجے میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔

"آپ کا بیٹا! اسکی سوچ، اسکی طرف آپ ہی کو مبارک ہو۔" کانپتی ہوئی آواز میں وہ گویا تھے۔ "میں آج اپنی بیٹی کو اس عروسی جوڑے میں دفن تو کر سکتا ہوں لیکن اس جیسے شخص کے حوالے نہیں کروں گا۔ اب وہ سو بار بھی میری دہلیز پر ناک رگڑے تب بھی نہیں۔ میری بیٹی میرا غرور ہے۔ میں ایسے شخص سے اسکی زندگی وابستہ کرنے چلا تھا جو اس کے کردار پر شک کرتا ہے۔ اب اگر آپ کا بیٹا لوٹ بھی آئے تو بارات لانے کی زحمت مت کیجیے گا۔ ان لوگوں کو جواب میں خود دے لوں گا وہ میری بیٹی ہے، میری حیات! کوئی فالتو بوجھ نہیں جسے کسی گندے نالے میں پھینک دوں۔"

"صبا کے معطل ہوتے حواسوں نے بس اتنا ہی کام کیا تھا۔ اس نے صوفے سے پشت لگائی پھر اس کا سر برابر بیٹھی الماس کے کاندھے سے جا لگا۔

"صبا! صبا!" الماس نے اس کے گال تھپتھپائے تھے۔

"یہ آپ نے کیا کیا۔" نجمہ خاتون زار و قطار رو رہی تھیں۔

"جو کچھ کیا۔ ٹھیک کیا۔" انہوں نے ایک گہری نظر سامنے والے صوفے پر مجرم بنے بیٹھے شہروز پر ڈالی تھی۔

عفت خانم سکتے کے سے عالم میں بیٹھی تھیں۔ ہر کوئی دم بخود تھا۔

"آج کا دکھ اتنا نہیں ہے نجمہ! جتنا آنے والے دنوں میں اس کو مل سکتا تھا۔ جو لڑکا اتنا شکی مزاج اور شدت پسند ہو، وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔"

"لیکن...... لیکن لوگ۔ مہمان۔ میں کس سے کیا کہوں۔" وہ پوری جان سے کانپ رہی تھیں۔

"امی! ذرا باہر آئیں۔" شہروز، عفت خانم کو اشارہ کرتا باہر نکل گیا تھا۔

عفت خانم اس کے پیچھے باہر نکل تھی۔

"امی اس کے گھر یہ مشکل ہم لوگوں کی وجہ سے آئی ہے۔ میری وجہ سے۔ اب۔ اب آپ کو ایک فیصلہ کرنا ہے فوری طور پر!"

"عفت خانم ہونق بنی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"ان کی عزت اپنے گھر کی عزت بنالیں۔ صبا کو فیروز بھائی کے لیے مانگ لیں۔ ابھی اسی وقت!"

"یہ کیا کہہ رہے ہو شہروز! ایسا کیسے ہوسکتا ہے اور پھر فیروز کا تمہیں علم ہے۔"

"امی! امی! جو کچھ میرے علم میں ہے، وہ آپ نہیں جانتیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، اس موقع پر بھائی ہرگز انکار نہیں کریں گے۔ امی! یاد کریں ایسا ہی ایک وقت ہمارے گھرانے پر بھی آیا تھا۔ کیا عالم تھا وہ! آج وہی مشکل ان لوگوں پر آن پڑی ہے۔"

صوفے پر بیٹھی الماس پر گویا سکتہ طاری تھا اور ہوش وحواس سے بیگانی صبا کو کچھ علم نہ تھا کہ تقدیر نے اس کے ساتھ کیسا دلچسپ کھیل کھیلا تھا۔



بے حد سادگی سے سجا کمرہ چاروں طرف رکھے پھولوں کی خوشبو سے معطر ہو رہا تھا۔

وہ بیڈ پر بیٹھی ایک حیرت کے عالم میں تھی۔ کیا ہوا، کیسے ہوا، کیونکر ہوا۔ کچھ یاد ہی نہیں آتا تھا۔ سب کچھ دھواں دھواں سا تھا۔ جیسے کسی حیرت کدے میں چلتی چلی جارہی ہو اور جب وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کے مقابل آبیٹھا تو صبا کی حیران نگاہیں اس کے چہرے پر تھم گئیں۔

"یا خدا! خواہشیں ہتھیلی پر اتریں تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟ ایسا!" اس نے دھڑکتے دل پر بے اختیار ہاتھ رکھا تھا۔

"صبا!" وہ بے حد نرم لہجے میں مخاطب تھا "کبھی خواہشوں کو اچانک چاند بن کر ہتھیلی پر اترتے دیکھا ہے۔"

صبا نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ ہاں! دیکھا ایسا ہی بندھن تھا۔ کوئی غیر معمولی تعلق تھا جو سوچیں یوں ٹکراتی تھیں۔

"صبا! میری خواہش چاند بن کر میرے سامنے آبیٹھی ہے۔ کیسے یقین کروں؟ بتائیں!"

"صبا کو بھی چہار جانب روشنیاں، خوشیاں چمکتی نظر آرہی تھیں۔

فیروز احمد نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما تو اس نے بے حد اطمینان وسکون سے اپنا سر اس کے شانے پر ٹکا دیا۔ آج زندگی کی ہر خوب صورت شے اس کی اپنی تھی۔



"بھابھی! میں آجاؤں؟"

"آئینے کے مقابل بیٹھی، بال سلجھاتی صبا کے ہاتھ تھم گئے۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ اندر جھانک رہا تھا۔

"آؤنا۔ وہاں کیوں کھڑے ہو؟" وہ مسکرا کر مڑی تھی۔

وہ اندر آگیا۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اس کو بغور دیکھنے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' صبا جھینپ کر مسکرا دی تھی۔

''یہ چمک دیکھ رہا ہوں جو محض تین چار دنوں میں اس رخ کو روشن کر گئی ہے۔'' وہ شوخی سے گویا ہوا تھا۔ ''سوچتا ہوں، وہ تو فیروز بھائی شادی کے دوسرے دن ہی واپس چلے گئے تھے تو یہ حال ہے، جو وہ رک جاتے تو آپ تو اب تک ٹیوب لائٹ بن گئی ہوتیں۔ کیوں؟''

''بکو مت!'' وہ جھینپ گئی۔ ''جو منہ میں آتا ہے۔ کہتے رہتے ہو!''

''امی شکر کیجیے جو جو دماغ میں آتا ہے وہ نہیں کہتا۔ ورنہ تو لوگ میری بات سننا چھوڑ دیں۔''

''وہ تو میں جلدی ہی چھوڑنے والی ہوں۔'' وہ اطمینان سے پھر برش بالوں میں پھیرنے لگی تھی۔

''چار دن ہوئے ہیں شادی کو اور تم میرا آدھا دماغ کھا چکے ہو۔ میں تو سوچتی ہوں، فیروز کے آنے تک میں بغیر دماغ کے نہ رہ جاؤں۔''

''بس یہی صلہ ہے میری ریاضتوں کا!'' وہ خفا ہو گیا۔ ''ہمیں گدھا کہا جا رہا ہے۔''

''میں نے کب کہا؟'' وہ حیران ہوئی۔

''گھاس پھونس تو وہی کھاتا ہے نا اشارۃً تو کر دیا آپ نے۔''

''شہروز!'' اس نے آنکھیں نکالی تھیں۔ پھر وہ دونوں ہی ہنس دیے۔

''اچھا اب ذرا سنجیدگی سے میری بات سنیں۔'' وہ سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ ''بڑی اہم بات کرنے آیا ہوں اور دیکھیں مذاق نہیں اڑانا میرا۔''

''اوہ!'' صبا نے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔ ''ایسی بھی کیا خاص بات ہے بھئی جو شہروز صاحب سنجیدہ ہونے چلے ہیں۔''

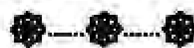
''وہ بھابی اصل میں۔'' وہ جھینپ رہا تھا۔ ''میں نے بتایا تھا ناریشم کے متعلق!''

''اوہ!'' صبا نے معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ ''پھر؟''

''پھر یہ کہ ولیمے کی تقریب میں ان لوگوں کو بھی انوائٹ کر لیں ناں۔ اب امی جان سے میں کیا کہوں، وہ مہمانوں کی لسٹ تیار کر رہی ہیں اور انہیں وہ لوگ یاد ہی نہیں۔''

''اچھا بابا! کہہ دیتی ہوں آنٹی سے اور کچھ؟''

''اور ...... اور یہ کہ اگر آپ کو بھی وہ پسند آئے تو امی سے بات کر لیجیے گا۔'' وہ جھپاک سے کمرے سے نکل گیا تھا۔



''بیجا!'' شبنم نے بڑی دیر تک اس کا چہرہ دیکھتے رہنے کے بعد کہا تھا۔

اس کے منہ میں تو الہ رکھتی نیلم کے ہاتھ تھم گئے۔

''ہاں بولو، بولو نا!'' وہ بے حد محبت سے پوچھ رہی تھی۔

''بیجا جو بھی تمہارا دل دکھائے نا۔ تم مجھے بتانا، میں میں بہت ماروں گی اسے جان سے مار دوں گی!''

"اچھا ٹھیک ہے۔ یہ لو کھانا کھاؤ!" اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"اسے کھانا کھلا کر وہ برتن رکھنے کے بہانے کچن میں چلی آئی اور پھر سنک کے پاس کھڑی ہو کر رو دی۔

"بجو۔" پیچھے سے ریشم اور مریم بھی آ گئی تھیں "فکر نہ کریں بجو! آپی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا ناں، معمولی سا شاک ہے، جلد اپنے حواسوں میں لوٹ آئیں گی شاید ان کے لاشعور میں یہ خوف بیٹھ گیا ہے کہ انہوں نے یوسف بھائی کو مار ڈالا ہے۔"

"مار دیتی تو اچھا تھا۔" وہ نفرت سے منہ پھیر کر بولی۔ "ایسے شخص کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ہمارے گھر کی خوشیوں کو کھا گیا ہے وہ۔"

"شکر ہے کہ وہ بچ گئے ورنہ ہماری آپی نجانے کہاں ہوتی جیل میں یا پاگل خانے میں۔"

"خدانہ کرے۔" وہ سہم کر بولی تھی۔

"بجو" ناصر اندر آیا تھا۔ "مہمان آئے ہیں۔ کافی سارے لوگ ہیں۔ اماں آپ لوگوں کو بلا رہی ہیں۔"

"مہمان؟" تینوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی سمت دیکھا۔ یکے بعد دیگرے وہ تینوں کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

اندر عفت خانم، صبا، شہروز، اور بہروز احمد موجود تھے۔

"السلام علیکم۔" تینوں نے ایک ساتھ ہی سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام جیتی رہو۔" عفت خانم نے محبت سے ان کی جانب نظر کی تھی۔ "آؤ بیٹیو، بیٹھو!"

"ماشاء اللہ ایک سے بڑھ کر ایک چاند صورت موجود ہے آپ کے ہاں۔" پھر وہ اماں سے ہنس کر مخاطب ہوئی تھیں "جی چاہ رہا ہے ایک آدھ چرا کر لے جاؤں۔"

ان کی بات پر سب ہی ہنس دیے تھے۔ انہوں نے بھی بہت سوچ سمجھ کر کہا تھا۔ صبا انہیں شہروز کی پسندیدگی کا اشارہ دے چکی تھی۔ پھر وہ بہروز کے لیے نیلم کو بھی بغور دیکھ رہی تھیں۔ اپنا سارا بوجھ انہیں سرکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایسی سلیقہ مند، چاند چہرہ، باادب بہوؤں کا تصور ان کے لیے بڑا خوش کن تھا۔

"شادی تو اس قدر عجلت میں ہوئی کہ بیان ناممکن ہے۔" وہ کہہ رہی تھیں۔ "البتہ ولیمہ ہم نے قدرے تاخیر سے کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ عزیز، رشتے دار، سب ہی شریک ہو سکیں اور پھر میرا بیٹا بھی ٹریننگ پر گیا ہوا ہے۔ اس لیے ہمیں کافی مہلت مل گئی۔ اب اگلے جمعے کو ان شاء اللہ ولیمے کی تقریب ہے آپ سب نے ضرور آنا ہے۔"



صبا نے اپنا کہا پورا کیا تھا۔ ابھی وہ لوگ تیار ہوئی ہی تھیں کہ باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

"بجو! لگتا ہے انہوں نے گاڑی بھیجی ہے۔" چہکتی ہوئی ریشم خوش خوش باہر کی سمت دوڑ گئی تھی۔

نیلم اور مریم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا دیں۔ ریشم کی بے تابیاں انہیں بہت کچھ سمجھا رہی تھیں۔ جس قدر رچی جان سے وہ تیار ہوئی

تھی، وہ بے حد حسن خیز تھا۔ اور پھر اس دن انھوں نے شہروز کی آنکھوں میں بہت کچھ پڑھا تھا۔

"نیہا" وہ پھولے سانس کے ساتھ واپس لوٹی تھی "وہ، وہ آئے ہیں۔"

"وہ کون؟" اس نے مسکرا کر بہن کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھا۔

"شہروز احمد" اس کی نظریں خود بخود جھک گئی تھیں۔

نیلم اور مریم ہنس دیں تو وہ جھینپ کر باہر نکل گئی تھی۔

تقریب کا انتظام بہت شاندار طریقے سے کیا گیا تھا۔ ہر سمت روشنیوں کی بہار پھیلی ہوئی تھی۔ ڈارک گرین شرارہ سوٹ میں ملبوس اور راسلک کے گرے کرتے میں ملبوس کلا وہ لگائے تبریز احمد ساتھ ساتھ بیٹھے ہر نگاہ کو بھلے معلوم ہو رہے تھے۔

"کیسی جناب! ہماری بھابھی کیسی ہیں؟" ریشم اسٹیج کے سامنے کھڑی ان دونوں کو دیکھنے میں منہمک تھی جب کسی نے قریب سے سرگوشی کی۔ وہ اچھل ہی پڑی تھی۔

"جی بہت اچھی۔ بہت پیاری!" وہ نظر جھکا کر بولی۔

"میں نے بھابھی سے کہا ہے۔ میرے لیے بھی ان ہی خصوصیات کی حامل کوئی خاتون تلاش کریں۔ کیا خیال ہے مل جائے گی نا؟" وہ معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا رہا تھا۔

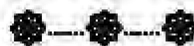
"جی!" وہ نظر جھکا کر رہ گئی۔

"ویسے ایک راز کی بات بتاؤں آپ کو۔" وہ رازداری سے گویا ہوا۔ "بہروز بھائی نے بھی اپنے لیے ان ہی خصوصیات کی حامل خاتون کا مطالبہ کر دیا ہے۔ اور والدہ محترمہ نے اسے تسلیم بھی کر لیا ہے۔ بلکہ انھوں نے تو لڑکی بھی دیکھ ڈالی ہے۔ وہ دیکھیں وہ جو آف وائٹ سوٹ میں سوبر سی خاتون بیٹھی ہیں نا، جن کی شکل آپ سے ملتی جلتی ہے۔"

"نیہا؟" اسے حیرت ہوئی تھی۔

"جی وہی، جلد ہی انہیں بھائی جان کے لیے مانگنے آ رہے ہیں ہم لوگ۔ امی اور بھابی نے کہا، اچھا ہے ایک ہی گھر میں دونوں کام نپٹ جائیں۔ تو کیا خیال ہے؟"

وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔ ریشم کچھ دیر اس کی بات پر غور کرتی رہی پھر سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔



الماس کی نظروں نے پیروں کو بھگو کر جاتی لہروں کا دور تک پیچھا کیا تھا اور کتنے عرصے سے ہر روز وہ یونہی جاتی ہوئی لہروں کو دیکھنے آ جاتی تھی۔ انہیں دیکھ کر اسے ایسا لگتا تھا کہ وقت جا رہا ہے، کبھی نہ لوٹنے کے لیے اور لہریں لوٹ کر پھر آتی تھیں لیکن جو وقت زندگی سے نکلتا تھا وہ پلٹ کر نہ آتا تھا۔

"تنہائی، احساس زیاں، احساس جرم۔ مسلسل وہ چند مخصوص کیفیات کا شکار رہتی تھی اور اسے لگتا تھا زندگی یونہی گزر جائے گی۔ ہر کوئی ہنستا بولتا اس کے قریب سے گزر جائے گا اور یونہی تنہا ریتیلے ساحل پر بیٹھی رہ جائے گی۔ کوئی اس کے لیے نہ رکے گا۔ کوئی اس کا ہاتھ تھامنے پر آمادہ نہ ہوگا۔

"اور یہی میری سزا ہے۔" اس نے خود کلامی کی

حبا کی شادی کے بعد اور اک کے کتنے ہی در اس پر وا ہوئے تھے۔ اس نے جانا تھا کہ معجزے اب بھی ہوتے ہیں لیکن صرف اچھے صاف دل، شفاف نظر لوگوں کے لیے۔ اور اس نے جانا تھا کہ ہر کوئی اپنے حصے کی خوشیاں اور اپنے حصے کے دکھ پاتا ہے۔ اس لیے دوسروں کی خوشیوں میں جلنا اور دوسروں کے دکھوں پر خوش ہونا عبث ہے۔

اس نے دانیال ہاشمی کو اپنانے کے کتنے جتن کیے تھے لیکن اس نے اسے بری طرح سے دھتکار دیا تھا

"تم اس دنیا کی سب سے قابل نفرت مخلوق ہو۔" اس نے کہا تھا "تم۔ تم شیطان ہو جو بہکاوے کر خوشیاں لوٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نے تمہاری باتوں میں آکر ایک معصوم لڑکی کا دل توڑا۔ یہ احساس مجھے عمر بھر سکون سے سونے نہ دے گا اور تم سمجھتی ہو، اب میں تمہاری زلفوں کا اسیر ہو سکتا ہوں۔"

اور جب حبا نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھلے دل سے معاف کر دیا تھا اور وہ بہت روئی تھی۔

تب اس نے جانا تھا کہ ظرف کیا ہوتا ہے کھلا دل، کھلا ذہن کیسا ہوتا ہے اور جن کو یہ نعمتیں حاصل ہوں۔ تقدیر ان پر کس طرح مہربان رہتی ہے۔ وہ جان گئی تھی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا۔ یہ اس کے اپنے اعمال کی سزا تھی اور وہ مطمئن تھی۔ وہ جانتی تھی اس کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔ ایک طویل قید تنہائی، ایک عمر بھر کا انتظار اس نے کھلے دل سے اپنی سزا قبول کر لی تھی۔



تیار ہو کر نیلم نے ایک نظر آئینے پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

''اماں! میں جا رہی ہوں۔''

اماں اس کے قریب آئیں اور اس پر دم کر کے اس کی پیشانی چوم لی۔

''خدا میری بچی کی حفاظت کرے۔''

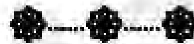
ماتھے پر چمکتا بوسہ لے کر وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

پر اعتماد، پر عزم قدموں کے ساتھ ابھی نجانے کتنا فاصلہ طے کرنا تھا لیکن وہ زندگی کو پورے طور پر جان چکی تھی۔ اسے گزارنے اور برتنے کا بہت سا حوصلہ اس کے اندر جمع ہو گیا تھا۔ بہنوں کی خوشیوں اور ماں کی دعاؤں نے اسے بہت بہادر، بے حد مضبوط بنا دیا تھا۔

''اور جب سے شبنم، بہروز احمد کی ہوئی ہے میرے تمام بوجھ ہلکے ہو گئے ہیں۔'' اس نے سوچا تھا ''یہ ایک ایسا بوجھ تھا جو دن رات میرے شانے توڑتا تھا۔ یہ احساس کہ میں نے انجانے میں ہی سہی اپنے حصے کے دکھ اس کے نام کیے ہیں، سیاہ ناگ بن کر میرے سینے پر بیٹھا رہتا تھا۔ اور جب میں نے اپنے حصے کی خوشیاں اس کے نام لکھیں، میری روح ہر آلودگی سے پاک ہو گئی۔ میرا روم روم چمکنے لگا۔ یہی چمک میرا اثاثہ، میری آن ہے۔

''اور ابھی بہت سا سفر طے کرنا ہے۔ بہت سے ادھورے کام پورے کرنے ہیں۔ لیکن میں بالکل تازہ دم اور پر امید ہوں۔ بہنوں کی خوشیوں اور ماں کی دعاؤں کے سہارے میں بہت دور تک جا سکتی ہوں اور مجھے یقین ہے۔ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی موڑ پر خوشیاں میری بھی منتظر ہوں گی۔ میرے حصے کی خوشیاں، جو مجھے ہی ملیں گی۔

میری آس کے تمام دیے ابھی روشن ہیں!



ختم شد